اللہ اکبر

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

کا

ماہوار علمی رسالہ

مکتبہ نور الرحمن

Checked 1966-67

درمطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ طبع شد

قیمت سالانہ للعہ

فہرست مضامین

جلد ۱ جمادی الاولیٰ ۲۳ جنوری ۱۹ ع نمبر ۱

AC 1

جامعہ ملیہ اسلامیہ
کتب خانہ ملیہ
علیگڈھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریب

جس طرح جامعہ ملیہ نے ہمیشہ داد و تحسین یا عام پسندیدگی و پذیرائی کے خیال سے علحدہ ہو کر محض اپنے مساعی کی تکمیل اور اپنے فرائض کی ادائگی کو اپنا نصب العین قرار دیا اسی طرح جامعہ یا اُس کے متعلقین نے محض رسمی طور پر کسی چیز کو اختیار نہیں کیا۔ مثلاً نصاب تعلیم میں ایسی چیزیں بھی آپ کو نظر آئیں گی جو بالعموم دوسری درسگاہوں میں داخل نصاب ہیں یا تقسیم اوقات، طریق امتحانات اور دوسری ضروری چیزوں کو آپ جامعہ اور دوسری یونیورسٹیوں میں مشترک پائیں گے۔ لیکن یہ اس لئے نہیں کہ وہ ہر تعلیم گاہ کا شعار ہے بلکہ خود ان کا وجود بھی ہمارے جامعہ کے لئے فی الحال ضروری سمجھا گیا ہے اور اس لئے ان کو اختیار کیا گیا۔

ہر دار العلوم کی یہ بھی قدیم سنت ہے کہ اس کا ایک مخصوص علمی رسالہ ہو لیکن جامعہ ملیہ نے اس کو اُس وقت تک ضروری نہیں سمجھا کہ طلبہ کے علمی ذوق، مشاغل تصنیف و تالیف کی تربیت، اور جامعہ کی علمی زندگی کی تدریجی ترقی کے ساتھ خود رسالہ کا وجود بھی مسئلہ ارتقا کے عالمگیر اثر سے پیدا نہ ہو جائے۔ چنانچہ تقریباً ایک سال تک طلبائے جامعہ اپنے رسالہ "جوہر"* کو قلمی نکالتے رہے۔

* یہ وہ رسالہ ہے جو اپنی مخصوص علمی و ادبی خوبیوں کے لحاظ سے آج بھی قابل زیارت ہے لیکن افسوس کہ مجلس جوہر اس کو کتب خانہ جامعہ ملیہ کی نذر کر چکی ہے اور ہمارے مہتمم صاحب کتب خانہ سے کسی قلمی چیز کا معدود کتب خانہ سے باہر حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریب

جس طرح جامعہ ملیہ نے ہمیشہ داد و تحسین یا عام پسندیدگی و پذیرائی کی
خواہش کے خیال سے علیحدہ ہو کر محض اپنے مساعی کی تکمیل اور اپنے فرائض کی ادائیگی کو اپنا نصب العین قرار
دیا اسی طرح جامعہ یا اس کے متعلقین نے محض رسمی طور پر کسی چیز کو اختیار نہیں کیا۔ مثلاً نصاب تعلیم
میں ایسی چیزیں بھی آپ کو نظر آئیں گی جو بالعموم دوسری درسگاہوں میں داخل نصاب ہیں، یا تقسیم
اوقات، طریق امتحانات اور دوسری ضروری چیزوں کو آپ جامعہ اور دوسری یونیورسٹیوں میں
مشترک پائیں گے۔ لیکن یہ اس لئے نہیں کہ وہ ہر تعلیم گاہ کا شعار ہے بلکہ خود ان کا وجود بھی ہمارے
جامعہ کے لئے فی الحال ضروری سمجھا گیا ہے اور اس لیے ان کو اختیار کیا گیا۔

ہر دار العلوم کی یہ بھی قدیمی سنت ہے کہ اس کا ایک مخصوص علمی رسالہ ہو لیکن جامعہ ملیہ نے
اس کو اس وقت تک ضروری نہیں سمجھا کہ طلبہ کے علمی ذوق، مشاغل تصنیف و تالیف کی مقبولیت،
اور جامعہ کی علمی زندگی کی تدریجی ترقی کے ساتھ خود رسالہ کا وجود بھی مسئلہ ارتقاء کے عالمگیر اثر میں
پیدا نہ ہو جائے۔ چنانچہ تقریباً ایک سال تک طلبائے جامعہ اپنے رسالہ "جوہر"* کو قلمی نکالتے رہے

* یہ وہ رسالہ ہے جو اپنی مخصوص علمی و ادبی خوبیوں کے لحاظ سے آج بھی قابل زیارت ہے، لیکن افسوس
کہ مجلس جوہر اس کو کتب خانہ جامعہ ملیہ کی نذر کر چکی ہے اور ہمارے مہتمم صاحب کتب خانہ سے کسی قلمی چیز کا حدود
کتب خانہ سے باہر حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

اور اس طرح وہ تمام اسباب جو ایک علمی رسالہ کی اشاعت کے لئے ناگزیر ہوتے ہیں خود بخود فراہم ہوگئے
جن کی موجودگی میں مجلس تعلیمی کو رسالہ "جامعہ" کی طبع و اشاعت کی منظوری دینا ضروری ہوگیا۔ اس
عرصہ میں شعبہ تصنیف و تالیف کی گزشتہ یک سالہ کوششوں کے نتائج بھی ظاہر ہونے لگے تھے اور
آیندہ کے لیے بھی تنظیم و ترتیب کے ابتدائی مدارج سے فراغت حاصل ہو چکی تھی لہذا اس رسالہ
کا اس شعبہ کو ذمہ دار قرار دینا زیادہ دشوار نہ ہوا اس اعتبار سے غالباً یہ عرض کرنا بجا ہوگا
کہ رسالہ "جامعہ" جو بفضل خدا آج آپ کے ہاتھوں میں ہے کسی رسمی ضرورت یا خارجی اثر سے نہیں
بلکہ خود ہی عالم وجود میں آیا ہے، گویا

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

اور یہ جامعہ ملیہ جیسے تعلیمی مرکز کے لئے ہرگز قابل تعجب بھی نہیں۔

"جامعہ" کے متعلق اسقدر عرض کرنا ضروری ہے کہ اگرچہ یہ رسالہ شعبہ تصنیف و
تالیف کے زیر نگرانی شایع ہوگا لیکن یہ طلبہ جامعہ ملیہ ہی کا رسالہ ہے، انھیں کا ہاتھ اسکی
ترتیب و تہذیب میں، انھیں کی کوششیں اس کی طبع و اشاعت میں، اور انھیں کی کاوش و
محنت اس کے علمی و ادبی مضامین میں نظر آئیگی۔

نور الرحمن

شذرات

[illegible] رسالہ [illegible] دو نمبروں میں شعر العجم پر محمود شیرانی صاحب پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور کی تنقید شایع ہوئی ہے اور یہ سلسلہ غالباً ابھی ایک عرصہ تک جاری رہے گا۔ کیونکہ ابھی صرف دورِ غزنوی میں فردوسی تک بحث کی گئی ہے۔ زیادہ تر واقعات، تواریخ و رجال کی غلطیاں دکھائی ہیں اس لئے تصنیف کے نقائص تو قابل تسلیم معلوم ہوتے ہیں مگر ان سے مصنف کا استخفاف جائز نہیں ہو سکتا جن کتابوں کی بنا پر شعر العجم کے اغلاط دکھائے گئے ہیں قریب قریب وہ سب یا تو تالیف شعر العجم کے وقت تک شایع ہی نہیں ہوئی تھیں یا مؤلف تک پہنچی نہ تھیں یا غیر زبانوں میں تھیں۔ اس لحاظ سے تصنیف میں ہزار عیب سہی، مصنف کو خاطی قرار دینا ویسا ہی ہے جیسے کسی طالب علم ہیئت جدید کا جدید دوربینوں اور نئے مشاہدوں اور تجربوں کی بنا پر قدیم نظام فلکی کے لئے بطلیموس پر استہزا کرنا۔ آئندہ اشاعت میں اس تنقید پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ نظر کی جائیگی۔

تلک مہاراشٹر ودیاپیٹھ

دیگر قومی درسگاہوں کی طرح یہ یونیورسٹی بھی ترک موالات کے سلسلہ میں عالم وجود میں آئی۔ اس کا بنیادی مقصد "نہ صرف مہاراشٹر اعظم کی دیگر قومی درسگاہوں کے ساتھ اتحاد عمل پیدا کرنا بلکہ وید، ہندی علم ہیئت اور فلسفہ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک مرکز قایم کرنا" رکھا ہے۔ اس کی ضروریات فی الحال یہ ہیں:-

۲ لاکھ	یونیورسٹی کے قیام کے لئے
۵ لاکھ	ایک رصدگاہ کی تعمیر کے لئے
۳ لاکھ	طلبا کے دار الاقامہ کے لئے

رصدگاہ کے لئے زمین سر جگناتھ مہاراجہ نے عطا فرمائی ہے۔

احاطۂ مدراس میں اشاعت ہندی

ہندی پرچار (مبلغین ہندی) کی ترقی کی رپورٹ پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دکھن

میں اس زبان کی اشاعت کے لئے کس سرگرمی سے کوشش کی جا رہی ہے۔ رپورٹ مذکور سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اندھرا، تامل اور کرآلا کے صوبوں میں ۴۰ مرکز ہیں اور ۲ ہزار طلبا ان مبلغین کی ماتحت ہندی سیکھتے ہیں یہ تعداد ان کے علاوہ ہے جو خارجی طور یا نج کے طور پر پڑھتے ہیں اس کا آغاز مہاتما گاندھی جی کی ان کوششوں سے ہوتا ہے جنہیں موصوف نے ۱۹۱۸ء میں ہندی ساہت سمیلن (انجمن ترقی ہندی) کے سالانہ جلسہ بمقام اندور کیا تھا۔

شانتی نکیتان

ڈاکٹر ایم ونٹرنٹز مشہور فاضل مشرقیات شانتی نکیتان کے زمرہ اساتذہ میں شامل ہو گئے ہیں اور فی الحال ایک سال تک طلبا کو علوم سنسکرت کی تحقیق میں درس دیں گے مہابھارت آپ کا خاص موضوع ہوگا۔

لازمی تعلیم

نومبر ۱۹۲۱ء میں مجلس مدارس نے بمبئی میونسپل کارپوریشن کو ۱۹۲۴-۲۵ء تک شہر میں مفت و جبریہ تعلیم جاری کرنے کی ایک اسکیم پیش کی ہے۔ سال زیر بحث کے عرصہ میں ۵ نئے مدارس کھولے گئے اور اب مجموعی تعداد مدارس کی ۲۹۸ ہو گئی اور طلباء کی تعداد ۳۲۲۱۱ سے بڑھ کر ۴۰۰۶۲ ہو گئی۔ کل مصارف ۱۵۹۱۲۹۸ روپیوں سے ۱۹۶۳۵۷۳ روپے ہو گئے۔

اسی سلسلہ میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ صوبہ متحدہ میں مفت جبریہ تعلیم کا آغاز سب سے پہلے مرادآباد اور بریلی سے ہوا ہے۔

راجپوتانہ یونیورسٹی

الہ آباد یونیورسٹی کے قواعد کی حال میں جو ترمیم ہو رہی ہے اس کی وجہ سے اجمیر، جے پور، جودھ پور کے ملحقہ کالجوں کی حالت نازک پڑ گئی ہے۔ اس بناء پر راجپوتانہ کے بعض حامیان تعلیم اس کوشش میں ہیں کہ خود راجپوتانہ میں ایک یونیورسٹی قایم کی جائے۔ اس کے لئے ایک وفد وہاں کے راجگان اور والیان ریاست کی خدمت میں جائے گا۔ ان کا خیال ہے کہ نصف مصارف

رنمنٹ کے ذمہ اور نصف کے کفیل والیان ریاست ہوں۔...

ی اقوام گزشتہ جنگ عظیم نے دنیا کے ہر حصہ کو متحرک اور ہر خفتہ بخت قوم کو بیدار کر دیا ہے جس کا ثبوت
ف ممالک سے مختلف صورتوں میں ظاہر ہوا ہے۔ ایشیا اور یورپ کا تصادم گو ابھی دور ہی
لیکن مقابلہ کے ابتدائی لوازم پیدا ہوتے جاتے ہیں اور زمانہ کے نبض شناس اپنے اپنے خیال
کے مطابق آیندہ کے متعلق پیشین گوئی پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ لیکن اس جدوجہد کے بعض نمایاں
پہلو بالخصوص دلچسپ ہیں۔ مثلاً امریکہ سے اطلاع ملی ہے کہ وہاں کے قدیم باشندوں میں اندر ہی
اندر ایک عجیب بیداری اور احساس پیدا ہو رہا ہے جو کسی طرح متمدن اقوام سے کم نہیں ہے۔ ابھی
حال میں مسٹر ڈ ٹو بلیر کے قلم سے ایک تصنیف شایع ہوئی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کے حبشی
باشندوں کے اخبارات و رسائل کی تعداد ۵۰۰ ہے جن میں سے سب سے بڑے اخبار کی اشاعت
۶۰ ہزار روزانہ کے قریب ہے اور ان کے چھوٹے اخبارات بھی مقامی اور جماعتی اصلاح میں مصروف
ہیں۔ یہ اخبارات و رسائل متحدہ طور پر حبشی اقوام بھی آزادی کی کوشش کر رہے ہیں اور ایک
عظیم الشان سلطنت افریقہ میں قایم کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔

ریاست بڑودہ ریاست بڑودہ کی تعلیمی ترقی کا حال اخبارات اور رسائل میں اکثر شائع ہوتا رہتا ہے لیکن اس
کی صنعتی ترقی کے متعلق ہمارے ملک میں کافی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا گیا جو موجودہ حالات میں کچھ
زیادہ قابل تعجب بھی نہیں ۱۹۲۲-۲۳ء کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اس ایک سال کے دوران
میں ریاست کی طرف سے ۲۲½ لاکھ روپیہ مندرجہ ذیل کارخانہ جات کو بطور امداد دیا گیا۔
(۱) دو سمنٹ بنانے کے کارخانے (۲) ایک پارچہ بافی کا کارخانہ (۳) ایک تیل نکالنے کا
کارخانہ۔ اس امداد کے علاوہ آٹھ درخواستیں اور منظور کی گئیں مثلاً (۱) کم قیمت پر بہم رسانی آب
(۲) ریلوے لائن کے متصل زمین کی منظوری، (۳) کارخانہ کے لئے نئی سڑک کی تعمیر (۴) چار
کارخانوں کے لئے قانون حصول آراضی کا نفاذ
رپورٹ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ چھ کارخانے سالِ رواں میں جاری کئے گئے حالانکہ

گزشتہ سال ہی دس کارخانے جاری ہو چکے تھے ان دس کارخانوں کی بابت جو سال گزشتہ میں
جاری ہوے تھے محکمہ صنعت و تجارت ظاہر کرتا ہے۔ کہ نو کارخانے خوب ترقی کر رہے ہیں۔
ساتھ ہی چند ناکام کوششوں کا ذکر بھی اس رپورٹ میں ہے مثلاً ناناکا کارخانہ شکر سازی جس میں
کافی نقصان ہوا اور اب اُس میں کچھ کام نہیں ہوتا۔ اسی طرح چینی مٹی کے کارخانے نے کوئی ترقی
نہیں کی مکھن بنانے کے متعدد کارخانے قایم کئے گئے مگر اُن میں سے اس وقت صرف چند باقی ہیں۔
کیمیاوی طریقہ سے لکڑی کا تیل نکالنے اور مچھلیوں کو محفوظ کرکے دیگر حصص ملک میں بھیجنے کے لئے
بھی یہ محکمہ کوشش کر رہا ہے اور ممکن ہے کہ اگر کامیابی ہو تو یہ دونوں چیزیں بڑودہ کے عظیم الشان ذریعہ
تجارت قرار پائیں۔

بہمارے نامہ نگار امید ہے کہ جامعہ کے صفحات میں یورپ کے اکثر تعلیمی مرکزوں کے دلچسپ حالات اور اطلاعات
بھی شایع ہوتے رہیں گے اور اس کے متعلق جو خاص انتظامات کئے گئے ہیں اونہیں فی الحال اسی
قدر کامیابی ہوئی ہے کہ جرمنی کی دو تازہ ترین تحریریں "مکتوب جرمنی" کے نام سے شایع کی جاتی
ہیں۔ جو حالات حاضرہ، صنعتی و علمی تعلیم اور اکثر مفید و اہم واقعات پر نہایت ہی معتبر شہادت ہے
اگر ہم کو اس مقصد میں کامیابی ہوئی تو امید ہے کہ جامعہ کی یہ خصوصیت ایسا خوشگوار اضافہ ہوگا جو
عام طور سے پسند کیا جاے گا۔

مطبوعات جدیدہ ہر ملک کی مطبوعات جدیدہ حکومت کے پاس جاتی ہیں جنکو وہ ایک کتب خانہ میں محفوظ رکھتی
ہے اور اس طرح ہر متمدن ملک میں ایک سرکاری کتب خانہ محض اون کتابوں سے طیار ہو جاتا
ہے جو ہر سال تقریباً ہزاروں کی تعداد میں اس ملک میں شایع ہوتی رہتی ہیں۔ ہندوستان میں
بھی کثیر التعداد کتابیں مختلف زبانوں میں شایع ہوتی رہتی ہیں اور وہ حکومت ہند کو بھیجی بھی جاتی
ہیں لیکن ہماری علم دوست گورنمنٹ بجائے ہندوستان میں کتب خانہ قایم کرنے کے اون تمام
مطبوعات کو انگلستان بھیجدیتی ہے تاکہ وہ انڈیا آفس اور اہل انگلستان کی دولت علمی میں مزید
اضافہ ہو۔ یہ وہ واقعہ ہے جس پر انصاف پسند انگریز بھی افسوس و تعجب کرتے ہیں جیسا کہ منت
نہال سنگھ سے کلکتہ لائبریری کے مہتمم نے شکایت کی۔

شذرات

تنقید شعرالعجم رسالہ اردو کے پچھلے دو نمبروں میں شعرالعجم پر محمود شیرانی صاحب پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور کی تنقید شایع ہوئی ہے اور یہ سلسلہ غالباً ابھی ایک عرصہ تک جاری رہے گا۔ کیونکہ ابھی صرف دور غزنوی میں فردوسی تک بحث کی گئی ہے۔ زیادہ تر واقعات، تواریخ و رجال کی غلطیاں دکھائی ہیں اس لئے تصنیف کے نقائص تو قابل تسلیم معلوم ہوتے ہیں مگر ان سے مصنف کا استخفاف جائز نہیں ہو سکتا جن کتابوں کی بنا پر شعرالعجم کے اغلاط دکھائے گئے ہیں قریب قریب وہ سب یا تو تالیف شعرالعجم کے وقت تک شایع ہی نہیں ہوئی تھیں یا مؤلف تک پہنچی نہ تھیں یا غیر زبانوں میں تھیں۔ اس لحاظ سے تصنیف میں ہزار عیب سہی مصنف کو خاطی قرار دینا ویسا ہی ہے جیسے کسی طالب علم ہیئت جدید کا جدید دوربینوں سے مشاہدوں اور تجربوں کی بنا پر قدیم نظام فلکی کے بانی بطلیموس پر استہزا کرنا۔ آئندہ اشاعت میں اس تنقید پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ نظر کی جائیگی۔

تلک مہاراشٹر ودیاپیٹھ

دیگر قومی درسگاہوں کی طرح یہ یونیورسٹی بھی ترک موالات کے سلسلہ میں عالم وجود میں آئی۔ اس کا بنیادی مقصد "نہ صرف مہاراشٹر اعظم کی دیگر قومی درسگاہوں کے ساتھ اتحاد عمل پیدا کرنا، بلکہ ویدک، ہندی علم ہیئت اور فلسفہ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک مرکز قایم کرنا" رکھا ہے۔ اس کی ضروریات فی الحال یہ ہیں:۔

۲ لاکھ	یونیورسٹی کے قیام کے لئے
۵ لاکھ	ایک رصدگاہ کی تعمیر کے لئے
۳ لاکھ	طلبا کے دارالاقامہ کے لئے

رصدگاہ کے لئے زمین سرجگناتھ مہاراج نے عطا فرمائی ہے۔

احاطۂ مدراس میں اشاعت ہندی

ہندی پرچار (مبلغین ہندی) کی ترقی کی رپورٹ پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دکھن

میں اس زبان کی اشاعت کے لئے کس سرگرمی سے کوشش کی جا رہی ہے۔ رپورٹ مذکور سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اندھرا تامل اور کرالا کے صوبوں میں ۴۰ مرکز ہیں اور ۳ ہزار طلبا ان مبلغین کی ماتحت ہندی سیکھتے ہیں یہ تعداد ان کے علاوہ ہے جو خارجی طور یا نجی کے طور پر پڑھتے ہیں اس کا آغاز مہاتما گاندھی جی کی ان کوششوں سے ہوا ہے جنہیں موصوف نے ۱۹۱۸ء میں ہندی ساہتہ سمیلن (انجمن ترقی ہندی) کے سالانہ جلسہ بمقام اندور کیا تھا۔

شانتی نکیتان

ڈاکٹر "این دنٹر نسٹز" مشہور فاضل مشرقیات شانتی نکیتاں کے زمرۂ اساتذہ میں شامل ہو گئے ہیں اور فی الحال ایک سال تک طلبا کو علوم سنسکرت کی تحقیق میں درس دیں گے مہابھارت آپ کا خاص موضوع ہوگا۔

لازمی تعلیم

نومبر ۱۹۲۱ء میں مجلس مدارس نے بمبئی میونسپل کارپوریشن کو ۱۹۲۵-۲۶ء تک شہر میں مفت و جبریہ تعلیم جاری کرنے کی ایک اسکیم پیش کی ہے۔ سال زیر بحث کے عرصہ میں ۵ ۲ نئے مدارس کھولے گئے اور اب مجموعی تعداد مدارس کی ۲۹۸ ہو گئی اور طلباء کی تعداد ۳۲۲۱۱ سے بڑھ کر ۴۰۰۶۲ ہو گئی۔ کل مصارف ۵۹۱۲۹۸ روپیوں سے ۱۹۶۳۵۷۳ روپے ہو گئے۔

اسی سلسلہ میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ صوبہ متحدہ میں مفت جبریہ تعلیم کا آغاز سب سے پہلے مرادآباد اور بریلی سے ہوا ہے۔

راجپوتانہ یونیورسٹی

الہ آباد یونیورسٹی کے قواعد کی حال میں جو ترمیم ہو رہی ہے اُس کی وجہ سے اجمیر جے پور جودھ پور کے ملحقہ کالجوں کی حالت نازک پڑ گئی ہے۔ اس بناء پر راجپوتانہ کے بعض حامیان تعلیم اس کوشش میں ہیں کہ خود راجپوتانہ میں ایک یونیورسٹی قایم کی جائے۔ اس کے لئے ایک وفد وہاں کے راجگان اور والیان ریاست کی خدمت میں جائے گا۔ ان کا خیال ہے کہ نصف مصارف

گورنمنٹ کے ذمہ اور نصف کے کفیل والیان ریاست ہوں۔

حبشی اقوام گزشتہ جنگ عظیم نے دنیا کے ہر ذرہ کو متحرک اور ہر خفتہ بخت قوم کو بیدار کر دیا ہے جس کا ثبوت مختلف ممالک سے مختلف صورتوں میں ظاہر ہوا ہے۔ ایشیا اور یورپ کا تصادم گو ابھی دور ہی لیکن مقابلہ کے ابتدائی لوازم پیدا ہوتے جاتے ہیں اور زمانہ کے نبض شناس اپنے اپنے خیال کے مطابق آیندہ کے متعلق پیشین گوئی پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ لیکن اس جد وجہد کے بعض نمایاں پہلو بالخصوص دلچسپ ہیں۔ مثلاً امریکہ سے اطلاع ملی ہے کہ وہاں کے قدیم باشندوں میں اندر ہی اندر ایک عجیب بیداری اور احساس پیدا ہو رہا ہے جو کسی طرح متمدن اقوام سے کم نہیں ہے۔ ابھی حال میں مسٹر ڈ فو بلیر کے قلم سے ایک تصنیف شایع ہوئی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کے حبشی باشندوں کے اخبارات و رسائل کی تعداد ۵۰۰ ہے جن میں سے سب سے بڑے اخبار کی اشاعت ۶۰ ہزار روزانہ کے قریب ہے اور ان کے چھوٹے اخبارات بھی تعلیمی اور جماعتی اصلاح میں مصروف ہیں۔ یہ اخبارات و رسائل متحدہ طور پر حبشی اقوام بھی آزادی کی کوشش کر رہے ہیں اور ایک عظیم الشان سلطنت افریقہ میں قایم کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔

ریاست بڑودہ ریاست بڑودہ کی تعلیمی ترقی کا حال اخبارات اور رسائل میں اکثر شایع ہوتا رہتا ہے لیکن اس کی صنعتی ترقی کے متعلق ہمارے ملک میں کافی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا گیا جو موجودہ حالات میں کچھ زیادہ قابل تعجب بھی نہیں ۱۹۲۱-۲۲ء کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اس ایک سال کی دوران میں ریاست کی طرف سے ۲۴½ لاکھ روپیہ مندرجہ ذیل کارخانہ جات کو بطور امداد دیا گیا۔

(۱) دو سمنٹ بنانے کے کارخانے (۲) ایک پارچہ بافی کا کارخانہ (۳) ایک تیل نکالنے کا کارخانہ۔ اس امداد کے علاوہ آٹھ درخواستیں اور منظور کی گئیں مثلاً (۱) کم قیمت پر بہم رسانی آب (۲) ریلوے لائن کے متصل زمین کی منظوری (۳) کارخانہ کے لئے نئی سڑک کی تعمیر (۴) چار کارخانوں کے لئے قانون حصول آراضی کا نفاذ

رپورٹ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ چھ کارخانے سال رواں میں جاری کئے گئے حالانکہ

گزشتہ سال ہی دس کارخانے جاری ہو چکے تھے ان دس کارخانوں کی بابت جو سال گزشتہ میں جاری ہوئے تھے محکمہ صنعت و تجارت ظاہر کرتا ہے۔ کہ نو کارخانے خوب ترقی کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی چند ناکام کوششوں کا ذکر بھی اس رپورٹ میں ہے مثلاً ناٹا کا کارخانہ شکر سازی جس میں کافی نقصان ہوا اور اب اُس میں کچھ کام نہیں ہوتا۔ اسی طرح چینی مٹی کے کارخانے نے کوئی ترقی نہیں کی مکھن بنانے کے متعدد کارخانے قائم کئے گئے مگر ان میں سے اس وقت صرف چند باقی ہیں۔ کیمیاوی طریقہ سے لکڑی کا تیل نکالنے اور مچھلیوں کو محفوظ کرکے دیگر حصص ملک میں بھیجنے کے لئے بھی یہ محکمہ کوشش کر رہا ہے اور ممکن ہے کہ اگر کامیابی ہو تو یہ دونوں چیزیں بڑودہ کے عظیم الشان ذریعہ تجارت قرار پائیں۔

ہمارے نامہ نگار امید ہے کہ جامعہ کے صفحات میں یورپ کے اکثر تعلیمی مرکزوں کے دلچسپ حالات اور اطلاعات بھی شایع ہوتے رہیں گے اور اس کے متعلق جو خاص انتظامات کئے گئے ہیں اونہیں فی الحال اسی قدر کامیابی ہوئی ہے کہ جرمنی کی دو تازہ ترین تحریریں "مکتوب جرمنی" کے نام سے شایع کی جاتی ہیں۔ جو حالات حاضرہ صنعتی و علمی تعلیم اور اکثر مفید و اہم واقعات پر نہایت ہی معتبر شہادت ہے اگر ہم کو اس مقصد میں کامیابی ہوئی تو امید ہے کہ جامعہ کی یہ خصوصیت ایسا خوشگوار اضافہ ہوگا جو عام طور سے پسند کیا جائے گا۔

مطبوعات جدیدہ ہر ملک کی مطبوعات جدیدہ حکومت کے پاس جاتی ہیں جنکو وہ ایک کتب خانہ میں محفوظ رکھتی ہے اور اس طرح ہر متمدن ملک میں ایک سرکاری کتب خانہ محض اون کتابوں سے طیار ہو جاتا ہے جو ہر سال تقریباً ہزاروں کی تعداد میں اس ملک میں شایع ہوتی رہتی ہیں۔ ہندوستان میں بھی کثیر التعداد کتابیں مختلف زبانوں میں شایع ہوتی رہتی ہیں اور وہ حکومت ہند کو بھیجی بھی جاتی ہیں لیکن ہماری علم دوست گورنمنٹ بجائے ہندوستان میں کتب خانہ قایم کرنے کے اون تمام مطبوعات کو انگلستان بھیجدیتی ہے تاکہ وہ انڈیا آفس اور اہل انگلستان کی دولت علمی میں مزید اضافہ ہو۔ یہ وہ واقعہ ہے جس پر انصاف پسند انگریز بھی افسوس و تعجب کرتے ہیں جیسا کہ سنت نہال سنگھ نے کلکتہ لائبریری کے مہتمم سے شکایت کی۔

سیاسی انقلابات

کا اثر

علوم ایران پر

جس طرح چوٹ سے ٹھنڈے پتھر سے شرارے نکلتے ہیں اسی طرح حوادث کے صدمات سے دماغ کا جوہر کھلتا ہے۔ مختلف اقوام کا اختلاط خواہ وہ فاتح و مفتوح ہی کی حیثیت سے کیوں نہ ہو بوسیدہ دماغوں میں تازگی اور فرسودہ قویٰ میں زندگی بخشتا ہے۔ اسی لئے سیاسی انقلاب ہر ملک اور ہر قوم میں علمی، معاشرتی، تمدنی، مذہبی اور زندگی کے تمام شعبوں میں انقلاب کا باعث رہا ہے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے۔ مگر ایران میں یہ سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔

ساسانی عہد تک ہم ایران میں کوئی قابل ذکر آثار علمیہ نہیں پاتے۔ ان کا جوہر قابل انکے دماغوں میں پڑا سوتا رہا۔ یکایک فتح اسلام نے انکے جوہر کو حرکت دیکر بیدار کر دیا۔ انہوں نے عہد اسلام میں وہ ذہنی کارنامے دکھائے جن سے آج تک اکثر لوگوں کو یہ دھوکا ہوتا ہے کہ یہ صدیوں کی مشق دماغی کا نتیجہ ہیں۔ مگر تاریخ اس قیاس کی تائید نہیں کرتی۔ دراصل ایرانی دماغ کی یہ خصوصیت امتیازی ہے کہ خارجی تحریک و اختلاط سے متاثر ہو کر محیر العقول بہیں سر کر لیتا ہے۔

تاریخ ایران میں اس خیال کی تائید میں متعدد نظیریں ملتی ہیں۔ عہد قبل الاسلام کی موہوم و مشتبہ تاریخ سے قطع نظر کریں اور اسلام کے بعد سے آج تک کی صرف واضح و محقق تاریخ پر نظر کریں جب بھی یہ حقیقت صاف طور پر منکشف ہو جاتی ہے۔

(۱) عہد فتح اسلام عربوں کی فتح ایران سے عباسیوں کے عروج تک ظاہر ہے کہ اس عہد کی تمام و کمال اسلامی حرکات علمیہ کا سہرا انہیں کے سر رہا۔ اگرچہ ایک غیر زبان (عربی) ان کے افکار علمیہ کا وسیلہ رہی۔ مگر اس بار کے باوجود کوئی شعبہ علم و فن ان کے دسترس سے نہ بچ نہ رہا۔ پروردۂ عجم حکومت عباسیہ کے انحطاط

کے ساتھ عجم کی دماغی جولانیوں میں بھی انحطاط شروع ہوگیا۔ تمام ادبیات ایران میں ایک قصیدہ گوئی اور بھٹی کی گرم بازاری تھی۔ اسی میں موشگافیاں اور نکتہ پردازیاں ہوتی تھیں۔ عربی تصانیف کا بازار ماندہ پڑ گیا۔

۲۔ عہد ایلخانی | ۶۱۵ھ ۱۲۱۹ء تا خت چنگیزی سے لیکر ۶۶۴ھ ۱۲۶۵ء ہلاکو کی موت تک تقریباً آدھی صدی کی مدت مغلوں کی شمشیر بے نیام نے بظاہر کوئی تعلق لگا نہ رکھا۔ سلطنتیں مٹائی گئیں۔ کتب خانے جلائے گئے اہل دول لوٹے گئے۔ علما بے دریغ نذر تیغ ہوئے۔ با ایں ہمہ یہ سیلاب انقلاب اُترنے کے بعد ویران اور بلند افتادہ زمینوں کو جو آبیاری سے محروم تھیں شاداب و سرسبز کر گیا۔ فارسی زبان کی بہترین کتابیں اسی عہد میں تصنیف ہوئیں۔ بغداد ۱۲۵۸ء میں غارت کیا گیا اور تاریخ طبقات ناصری مولفہ منہاج سراج ۱۲۶۰ء میں تالیف ہوئی۔ خود ہلاکو خاں کے نمک خوار مورخ عطا ملک جوینی نے اسی سال چنگیز خاں کی سیرت و تاریخ خاندانی پر بے نظیر کتاب تاریخ جہاں کشا تمام کی۔ ہلاکو کے چہیتے وزیر دستیر نصیر الدین طوسی نے بغداد کی لوٹ سے چار لاکھ جلد کتابیں جمع کرکے ان کی مدد سے پروفیسر براؤن کے شمار کے مطابق فلسفہ مذہب، ریاضی، طبیعیات اور ہیئت پر چھپن کتابیں مدون کیں۔ مشہور خطاط یاقوت اسی زمانہ ۶۶۷ھ ۱۲۶۸ء میں فوت ہوا۔ فارسی میں عروض پر بہترین کتاب المعجم فی معاییر اشعار العجم۔ مولفہ شمس قیس اسی وقت کی تالیف ہے۔ شعرا میں کمال اسمٰعیل، جو ۱۲۳۷ء میں مغلوں کے ہاتھ سے شہید ہوئے، شیخ فریدالدین عطار جو بقول جامی ۶۲۷ھ ۱۲۲۹ء میں انھیں کی وحشت کا شکار ہوئے۔ مولانا رومی اور سب سے بڑا ایرانی شاعر حکیم شیخ سعدی اسی کشت انقلاب کی پیداوار ہیں۔ صوفیائے کرام میں شعرا مذکورین کے علاوہ شیخ نجم الدین کبریٰ "ولی تراش" جو انھیں کے ہاتھ سے ۶۱۸ھ ۱۲۲۱ء میں شہید ہوئے سعدالدین حموی متوفی ۶۵۰ھ ۱۲۵۲ء نجم الدین دایہ متوفی ۶۵۴ھ ۱۲۵۶ء شیخ شہاب الدین سہروردی متوفی ۶۳۲ھ ۱۲۳۵ء اسی دور کی یادگار ہیں۔

(۴) عہد تیموری

۱۳۳۶ء میں ایلخانی مغل خاندان (اولادِ ہلاکو) کے آخری فرمانروا ابوسعید کی وفات اور تیمور کی پیدائش سے لیکر ۱۴۰۵ء تیمور کی موت تک ستر سال کا زمانہ طوائف الملوکی، خانہ جنگی، اور سب سے اسی سے شروع ہوا اور خونریزی و ستم رانیوں پر تمام ہوا۔ بااین ہمہ تاریخ ایران کا یہ نشیب و فرد بھی زبان فارسی کے بہترین شعرا اور بلند پایہ مصنفین کے لئے خاص طور پر ممتاز ہے۔ بقول صاحب مطلع السعدین۔
"جہاں پنجاہ سالہ عہد تیموری نے فارسی کے درجن بھر جلیل القدر شعراء پیدا کئے وہاں ۲۴۲ سال کی طویل حکومت صفوی باہمہ جاہ و جلال و طاقت و جبروت چھ شاعر بھی ایسے پیدا نہ کر سکی جن کی شہرت ان کے زاد بوم سے باہر نکلی ہو"۔ آسمان شعر کے درخشاں ستارے خواجہ حافظ شیرازی، ابن یمین، خواجو کرمانی، سلمان ساوجی عبید زاکانی، کمال خجندی، مغربی تبریزی اسی طوفانی افق میں طلوع ہوئے۔ عربی میں تصنیف کرنیوالے ایرانی علامہ سعد الدین تفتازانی صاحب مطول و مختصر، السید الشریف الجرجانی صاحب کبری و صرف میر، ابوطاہر فیروزآبادی صاحب قاموس بھی اسی دور کے یادگار ہوئے۔

علمی ترقی کی یہ رفتار عجم کو پھر نصیب نہ ہوئی۔ دماغی قوی اشمست ہوتے ہوتے معطل سے ہوگئے۔ نقلی شاعری (تغزل) کے سوا کوئی ذہنی حرکت تمیز طور پر نظر نہیں آتی۔ اس حالت کو کچھ سے زیادہ صدیاں گذر چکیں۔ انکے علمی کارنامے دفتر پارینہ ہوگئے۔ ان کی شاعری قصۂ ماضی بن چکی۔ دنیا ان کی مزید علمی جدوجہد سے مایوس ہوچکی۔ یہاں تک کہ چودہویں صدی

چودہویں صدی

ہجری کے آغاز میں چند وقت شناس اور صاحب دل محبان وطن نے ایران سے باہر نکل کر اخبار نکالے، رسالے اور کتابیں شائع کیں جن سے اپنے ہم وطنوں کے دلوں کو گرمانے کی کوشش کی۔ ان میں ایک اخبار اختر تھا جو قسطنطنیہ سے نکلتا تھا۔ اور ٹرکی کے پردیسی ایرانیوں کے جوش ملی کے بل پر چلتا تھا۔ اس کے بعد ارمنی اہل قلم نظام الدولہ ملکم خان نے ۱۳۰۸ھ میں لندن سے ایک اخبار قانون نکالا۔ یہاں سے

ایران کے انقلاب جدید کا عہد شروع ہوجاتا ہے مالسی نظام الدولہ اور سید جمال الدین افغانی کی مساعی کی بدولت ایران کے مستبدانہ طرز حکومت کا احساس عام ہوگیا یکم مئی ۱۸۹۶ء کو ناصر الدین سید افغانی کے ایک شاگرد مرزا کرمانی کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ نظام الدولہ کے اخبار قانون ہی نے آیندہ انقلاب کے لئے راستہ صاف کر دیا۔ اسی کی بدولت ۱۸۹۱ء میں "رعایت تمباکو" کے خلاف شورش کامیاب ہوئی۔ اور یہ کامیابی انقلاب جدید کا پہلا زینہ ثابت ہوئی۔

اس سیاسی کشمکش کے صدقے میں فارسی لٹریچر نے بھی ہاتھ پاؤں نکالے قانون نے ایک جدید سیدھے سادے اور موثر اسلوب بیان کی بنیاد ڈالی جس نے اسے ہر دلعزیز بنا دیا جدید اصطلاحات مثلاً قانون تنظیمات (اصلاحات) اصول اوارہ (نظام حکومت) وغیرہ وضع کر کے زبان فارسی میں جاری کردیں جہاں اس نے ایران کی سیاسی بیداری میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔ وہاں فارسی زبان کی ملداری میں بھی سب سے زیادہ اعانت کی۔ اس کے بعد ۱۳۱۱ھ میں کلکتہ سے حبل المتین اور قاہرہ سے حکمت جاری ہوا۔ مگر مصر کے ثریا اور پیرورویش ان سب سے آگے بڑھ گئے۔

ان وطن پرستوں نے اخبار نویسی کے علاوہ کتابیں بھی شائع کیں جن کے اثرات دوگانہ تھے ایک طرف قوم کو سیاسی نیند سے جگا دیا۔ دوسری طرف زبان کو ایک خاص قدرت بخشی ان میں بھی نظام الدولہ

---

[۱] پروفیسر براؤن صاحب اس سلسلہ میں ہمیں یہ لطیف نکتہ بتاتے ہیں کہ وطن۔ ملت حریت وغیرہ الفاظ کے موجودہ معانی سے جو پہلے مفقود تھے اول اول عثمانی ترکوں نے مشرق کو روشناس کیا "جوان ترکوں" کے سرآمد شناسی آفندی (متوفی ۱۸۷۱ء) ضیا پاشا (متوفی ۱۸۸۰ء) اور کمال بے (متوفی ۱۸۸۸ء) نے اپنے تمام سیاسی اور ادبی خیالات جدیدہ فرانس سے اخذ کئے۔ کمال بے نے جو مدبر و ماہر سیاست ہونے کے علاوہ شاعر اور ڈراما نویس بھی تھے ان تینوں الفاظ کو جدید مفاہیم کے ساتھ صرف ترکی ہی نہیں بلکہ تمام ممالک اسلامیہ میں جاری کر دیا ظاہر ہے کہ وطن کے اصل معنی مولد کے تھے۔ اب ایک قوم کے مسکن اور اس کے حقوق کے مفہوم پر حاوی ہے۔ لفظ ملت پہلے ہم مذہب جماعت یا دین کے معنی تک محدود تھا اب ایک ہم وطن ہم زبان یا ہم سلطان قوم کے مفہوم میں بولا جاتا ہے۔ اسی طرح لفظ حریت پہلے ذاتی غلامی کا ضد تھا اب قومی آزادی حقوق کے معنی دیتا ہے۔ یہ الفاظ اس قدر مقبول اور شائع ہوئے کہ جنوری ۱۹۱۲ء میں جو محبان وطن تبریز میں دار پر چڑھائے گئے وہ "زندہ باد وطن! زندہ باد وطن!!" کا کلمہ رٹتے ہوئے قربان ہو گئے۔

کے سیاسی رسائل قابل ذکر ہیں۔ جو بصورت مسودہ شاہ کے درباریوں، مدبروں اور تمام اکابر کے ہاتھوں سے گذر کر تمام ایران میں عام ہوگئے۔ ان کے ساتھ ہی نظام الدولہ نے حروف تہجی کی اصلاح کے لئے رسائل مسمی مبدء ترقی اور شیخ و وزیر تصنیف کئے۔ اپنے ایجاد کردہ حروف تہجی کی اشاعت و نشر کی غرض سے اس نے انہی حروف میں کئی کتابیں شایع کیں۔ اس عہد کی کارآمد کتابوں میں سیاحت نامہ ابراہیم بیگ خاص طور پر قابل ذکر ہے جس میں ایک ایرانی تاجر آقا زین العابدین مقیم روس نے ایک فرضی سیاح ابراہیم بیگ کی سیاحت ایران کے پیرایہ میں اہل وطن کو عبرت کے تازیانے لگائے ہیں۔ اسے حبل المتین کلکتہ نے شائع کیا اور انقلاب آتیہ کی محرکات میں ایک عظیم الشان تحریک ثابت ہوا۔ اس سلسلہ میں سرجان ماریر کی کتاب حاجی بابا اصفہانی کا ترجمہ فارسی جو ایرانی معاشرت و تمدن کی ہجو ملیح ہے کچھ کم نتیجہ خیز نہ رہا۔ اسی طرح ایک فرانسیسی رسالہ کا ترجمہ سالنامہ ۱۳۱۲ھ کے شائع ہوا اور نصیر الدین شاہ کے حکم سے تلف کر دیا گیا۔

نومبر ۱۹۰۶ء میں اعلان مشروطیت کے بعد کثیر التعداد اخبار مجلس، ندائے وطن، صبح صادق وغیرہ جاری ہوئے ہجو ملیح، پھبتیوں اور ظریفانہ مضامین کے علاوہ خزاں رسیدہ گلستان شاعری میں عجیب و غریب شگوفہ کاریاں اور جدت طرازیاں کی گئیں۔ پرانی بساط سخن الٹ دی گئی اور نئی بساط بچھا دی گئی۔ قدیم طرز کی فرسودگی سے اس قدر نفرت ہوگئی کہ تمام شعرائے متقدمین کے قصائد غزل ان کی نظر میں ہیچ و پوچ نظر آنے لگے۔ شہید حریت مرزا آقا خاں کرمانی نے شاہنامہ کے تتبع میں سالار نامہ نظم کیا۔ اور اسکے دیباچہ میں اپنی جدت طرازیوں کی معذرت میں طرز قدیم کا یوں استخفاف کیا ہے[1]۔

"قدیم شعراء و فصحاء فارسی کی مضمون آفرینی اور اثر خیزی میں کسی کو کلام نہیں۔ نہ اُن کے کلام کی شوکت و شکوہ میں کوئی شبہ ہی۔ اکثر متاخرین کے شعر کی شوخی اور دل آویزی

[1] صحافت و شاعری ایران جدید از پروفیسر براؤن۔ دیباچہ مترجم ص۱۱

بھی مسلّم ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے شعرا و ادبا کی تصانیف سے کس قسم کے اثر مترتب
ہوتے رہے ہیں اور ان کے تخم کیسے برگ و بار لائے ہیں! اُن کے مبالغہ اور غلو نے
قوم کے سادہ دلوں میں باطل کا تخم بو دیا۔ اُن کی مدح سرائی اور چاپلوسی نے سلاطین ایران
کے وزرا کو خود پرستی سے سرشار کر کے انواع و اقسام کی بیہودگیوں میں مبتلا رکھا،
اُن کے فلسفہ اور تصوف کا نتیجہ صرف یہی نکلا کہ وحشیانہ کاہلی و غفلت عام ہو گئی اور طفیلیوں
اور بھیک منگوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی۔ اُن کی غزل سرائیوں کا نتیجہ ہمارے نوجوانوں
کے اخلاق کی تخریب اور بے حیائی و رندی کی تعلیم کے سوا اور کیا نکلا! ان کی ہجووں
کا نتیجہ بے غیرتی، بے حیائی اور بیہودہ سرائی کی ترویج کی صورت میں ظاہر ہوا۔

اگر ہم شعرائے اسلام اور ان کے ممدوحین کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو جائیگا
کہ ابو نواس اور اس جیسے دوسرے شعرا کی مدیحہ خوانی ہی نے خلفائے عباسیہ کو مے نوشی،
روز خوابی اور دوسری برائیوں میں مبتلا کر دیا۔ عنصری، رودکی، فرخی اور ان جیسے اور شعرا
کے قصائد ہی نے خاندان سامان و غزنین کو تباہ و برباد کیا۔ عراقی اور مغربی جیسے شعرا کے
فلسفہ الٰہیات ہی نے نکمے، اپاہج، درویش پیدا کر دئے۔ انوری، ظہیر فاریابی، کمال اصفہانی
کی خوشامدوں اور چاپلوسیوں ہی نے ایسے ناکارہ، ظالم اور مغرور فرماں روا پیدا کئے۔
سعدی اور ہمام جیسے شعرا کے عاشقانہ اشعار ہی نے جوانان فارس کے اخلاق کا ناس کیا۔
سوزنی سنائی وغیرہ کی ہجووں نے بے حیائی اور جرائم کو اس قدر عام کیا۔ خاقانی جیسے شعرا
کی قابل نفرت دقت پسندی اور موشگافی ہی نے مرزا مہدی خاں (مورخ نادر شاہ)، عطا
ملک جوینی (مؤلف تاریخ جہاں کشا) اور صاحب وصاف حضرت کو بے معنی لفاظی اور لغو سخن
بافی کا مرتکب کیا۔ صبا کی خودستائی، شہاب کی موشگافی اور قاآنی کی کلاہ جلی و علی قلی (قوافی
قصیدہ مدح) نے آج ایرانی شرفا کے دلوں سے نیکی کی رغبت اور بدی کی نفرت دھو کر انھیں
بے شمار گناہوں اور ضلالتوں میں غرق کر رکھا ہے۔

"شاعری کا صحیح مصرف اور جائز اثر یہ ہی کہ سامعین کے دلوں کو متہیج کرکے ان کے جذبات رحم کو حرکت دے۔ اُن کے خیالات میں ذکاوت پیدا کرے۔ ساتھ ہی ان کو نیکی پرہیزگاری اور اعتدال کی طرف مائل کرے، نہ کہ بیہودگی، بدکاری اور دنارت کی طرف"

اس میں شک نہیں کہ مرزا آقا خاں کا تمام شعرا فارسی کو ایک لاٹھی سے ہانک دینا صریح مبالغہ اور انصاف کا خون کرنا ہی۔ ان میں سے دو ایک ایسے بھی گزرے ہیں جنھوں نے اپنے کلام سے قوم اور ملک کے اخلاق سدھارنے کی کوشش کی ہی۔ شیخ سعدی کی ہزلیات کی نسبت جو چاہیں کہہ لیں۔ مگر گلستاں بوستاں کے فیض سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ بایں ہمہ مرزا کی نکتہ چینی من حیث المجموع کلمہ حق ہے۔

پروفیسر براون صاحب نے اپنی متذکرہ بالا کتاب میں فارسی زبان میں "تمناے مخصوص از قارئین کرام" کے عنوان سے ایک تمہید لکھی ہے۔ جس میں ایران کی جدید شاعری کی خصوصیات امتیازی پر عالمانہ رائے زنی فرمائی ہی۔ یہاں ہم ان کی خاص عبارت فارسی کا اقتباس ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں تاکہ وہ پروفیسر موصوف کی قدرت زبان فارسی کی داد بھی دے سکیں۔

"اگر درست دقت کنیم خواہیم دید کہ این اشعار جدیدہ دارائے دو صفت ممتازہ است کہ در ادبیات قدیمہ موجودہ نبودہ و بہماں نسبت شاید تاثیر آتش در طبقۂ عامہ بیشتر باشد۔

اولاً از حیث موضوع۔ موضوع اشعار قدما تقریباً عبارت بود از مدائح پادشاہان و بزرگان و غزلیات و اخلاق و فلسفہ و تصوف۔ وانچہ راجع باوضاع و احوال معاشیہ برشتۂ نظم درآمدہ و اندیشۂ کم است۔ اگرچہ ہمیں ادبیات مدار افتخار ابدی ایران بودہ و زبان فارسی را تا امروز نگاہ داشتہ است۔ و لے از جہت تاثیر خارجی در اوضاع اجتماعی مردم گویا چنداں ثمر ندادہ است۔ زیراکہ دائرۂ انتشار آں محدود و تقریباً منحصر بطبقۂ عالیہ و عالمۂ ملت بودہ و فوائدش تعمیم نداشتہ است۔

"تجارب تاریخی جریان اوضاع اجتماعی ملل دریں قرون اخیرہ بخوبی نشان میدہد که موثر حقیقی درگردانیدن چرخ حیاتِ اجتماعی یک ملت عامہ یعنی طبقات اواسط و اوانی آں ملت است۔ وچنانکہ امواجے کہ روئے دریا را بتلاطم آوردہ و بزرگ ترین کشتیہا را بازیچۂ طوفان خود می سازد۔ ہمانا امواجے است کہ از قعر دریا و از طبقات پائین آں بالا مے آید۔ ہمیں طور است در انقلابات سیاسی۔ انقلابے کہ ثمرہ خوب میدہد انقلابیست کہ در سایہ جنبش طبقۂ عامۂ ملت بظہور رسد، والا انقلابے خواہد بود نارس و نا ہنگام و کلی کہ مانند امواجِ سطحی دریا ہرگز آں قوت را نخواہد داشت کہ بنائے استبداد و خرافات مترا کم چندیں قرن را از بیخ براندازد۔ ازیں رو طبقۂ عامۂ ملت بیشتر از طبقات دیگر باید منظور نظر ارباب سخن و واعظین و مخصوصاً شعراء ادبا باشند . ... وما سے بینیم کہ ادباء و شعراء عصر حاضر پے بدیں نکتہ بردہ اند۔ یعنی ابکار معانی را ازاں دائرہ محدود بیروں آوردہ و خوان الوان نظم را بیش خاص و عام گسترده طبقۂ عامہ ا ازاں برخوردار کردہ اند۔ و اغلب موضوعات ایں ادبیات را از وقائع یومیہ و راجع بمسائل معاشی و اجتماعی گرفتہ اند کہ ہر یک از افراد ملت مے تواند بدوں صعوبت درک نماید۔

"ثانیاً از حیث اسلوب نیز ایں ادبیات جدیدہ یک تازگی و اہمیت مخصوصے دارد و آں این است کہ در اغلب اشعاریکہ دریں دور جدیدہ سرودہ اند حقیقت را بلباسے اینکہ ہمہ کس بتواند فہم نماید در لباس ہزل و مزاح جلوہ دادہ اند و با یکے از پردہ ہائے موسیقی ہم آہنگ ساختہ اند تا بآسانی قبول عامہ بہم رساند۔

"بدیہی ست کہ شخص ہر قدر دارائے اخلاق حمیدہ و تہذیب نفس باشد بازو سے راشنیدن عیوب خود بے پردہ چنداں خوش آیند نخواہد بود حقیقت گوئی در وے تاثیرے چنداں نخواہد کرد۔ ولے در شکل ہزل و مزاح آنرا میل و رغبت خواہد خواند و البتہ بے تاثیر ہم نخواہد ماند۔ ......"

نمونہ پروفیسر موصوف نے اپنی تصنیف متذکرہ بالا میں عہد مشروطہ کے بوالہواور شاعری کا جو نمونہ جمع کیا ہے ۔ اس میں سے ہم مختصر اقتباس ہدیۂ ناظرین کر کے دکھانا چاہتے ہیں کہ ایران کے اس سیاسی انقلاب نے اصلی شاعری پر کیا اثر ڈالا جس سے ہم اہل ہند بے خبر ہیں ۔ اردو شاعری فارسی شاعری کی پیرو ہونے کی حیثیت سے اسی نئی شاہ راہ میں بھی اس کے نقش قدم پر چلنے کی بجائے اب تک باستثنائے قلیل پرانی لکیر پیٹے جاتی ہو. امید ہے کہ ہمارے شعرا خصوصیت کے ساتھ توجہ فرمائیں گے ۔

بعض ترکمانی جو روسی رعایا تھے روسی ایرانی سرحد قاچان (واقع خراسان) سے آصف الدولہ کی چشم پوشی سے کچھ نوجوان لڑکیوں کو پکڑ لے گئے ۔ اخبار صور اسرافیل نے جون ۱۹۰۸ء کی اشاعت میں طفلس کے ایک ہوٹل میں روسیوں اور ترکمانیوں کے حضور میں ان بیکس قاچانی لڑکیوں کے ناچ اور نغمۂ ہم آہنگ کا یوں فرضی نقشہ کھینچا ہو ۔ کس قدر مؤثر طرز ہے !

(ایک لڑکی)	(سب مل کر)
بزرگان جنگی مست غرورند	خدا کسے فکر ما نیست
ز انصاف و مروت سخت دورند	خدا کسے فکر ما نیست
رعیت بے سواد و گنگ و کورند	خدا کسے فکر ما نیست
ہفدہ و ہژدہ و نوزدہ و بیست	اے خدا کسے فکر ما نیست
فلک دیدی بما آخر چہا کرد	خدا کسے فکر ما نیست
ز خویش واقربا ما را جدا کرد	خدا کسے فکر ما نیست
جفا بیند کہ با ما این جفا کرد	خدا کسے فکر ما نیست
ہفدہ و ہژدہ و نوزدہ و بیست	اے خدا کسے فکر ما نیست
نیم بوم ما بس جاں فزا بود	خدا کسے فکر ما نیست

ہوایش روح بخش وغم زدا بود	خدا کسے فکر ما نیست
وے در واکہ ہجر ش در قضا بود	خدا کسے فکر ما نیست
ہفدہ و ہژدہ و نوزدہ و بیست	اے خدا کسے فکر مانیست
مگر مردان مارا خواب بردہ	خدا کسے فکر مانیست
غیوران وطن را آب[1] بردہ	خدا کسے فکر مانیست
کہ اغیار آب از احباب بردہ	خدا کسے فکر مانیست
ہفدہ و ہژدہ و نوزدہ و بیست	اے خدا کسے فکر مانیست
کہ خواہد بردتا مجلس پیامم	خدا کسے فکر مانیست
کہ اے دل بردہ تا دادہ کامم	خدا کسے فکر مانیست
چرا شد محو از یادِ تو نامم	خدا کسے فکر مانیست
ہفدہ و ہژدہ و نوزدہ و بیست	اے خدا کسے فکر مانیست

روسی اور ترکمانی تماشائی اپنی اپنی زبانوں میں " زندہ باد حسینان فارس "۔" زندہ باد آصف الدولہ "۔ "زندہ باد وزارت ایران" کے نعرے بلند کرتے ہیں۔

ذیل کی نظم مجتہد شیخ فضل اللہ مخالف شروطیت کی غداری و ملک فروشی صدائے نیلام کے طرز میں اخبار نسیم شمال مورخہ ۱۲ر جولائی ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی۔

حاجی ! بازار رواج[2] ست رواج	کہ خریدار ؟ ہراج[3] ست ہراج
من فروشم ہمۂ ایراں را	عرض ناموس مسلماناں را
رشت و قزوین و قم و کاشاں را	بخرید ایں وطن ارزاں را
یزد و خوانسار ہراج است ہراج	کہ خریدار ؟ ہراج است ہراج

---

[1] غیرت و حرمت [2] گرم [3] نیلام

طبل و شیپور علم را کے میخا[1] د؟ | شیر و خورشید رقم را کے میخاد
تخت جمشید جم را کے میخا د؟ | تاج کے مسند جم را کے میخاد
اسپ و افسار ہراج است ہراج | کو خریدار؟ ہراج است ہراج

مسند ہم تخت کیان را بگرد | مے زنم مسند جم را بہ علو
میکشم قاب خورش را بہ جلو | مے خورم قیمہ[2] پلو قسمہ چلو
رشتۂ خورش[3] الحراج است ہراج | کو خریدار؟ ہراج است ہراج

گرز اسلام بشد قسطلع اثر | در باگشت بجیلاں محشر
در تبریز ارش[4] کرد مقر | ہر چہ شد شد بجہنم بہ سقر
فوج افشار ہراج است ہراج | کو خریدار؟ ہراج است ہراج

جد مرحوم شہ از عمر و داد | بغدہ شہر زقفقاز بہ داد
آنچہ از مال پدر ماندہ زیاد | میفروشد ہمہ را باد اباد
ہمہ یکبار ہراج است ہراج | کو خریدار؟ ہراج است ہراج

ذیل کی نظم محمد علی شاہ کے عزل اور اس کے چھوٹے فرزند سلطان احمد شاہ کی تخت نشینی کے موقع پر نسیم شمال مورخہ یکم اگست ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی چند شعر ہدیہ ناظرین ہیں شاہِ نو سے خطاب ہے۔

اے شہنشاہ جواں شیران جنگ آور نگر، در نگر، عالمے دیگر نگر
ملتے را راحت از مشروطہ سرتا سر نگر، در نگر عالمے دیگر نگر
در معارف دشمنان علم را نابود کن، جود کن جہل را مفقود کن
وقت تنگ و رخش لنگ و سختیِ معبر نگر در نگر عالمے دیگر نگر

---

[1] میخواہد [2] نشان قومی ایران [3] آمدگی [4] پلاؤ [5] چلاؤ [6] روس

پارلمان را از وکیلان صحیح آباد کن، داد کن، ملتے را شاد کن
خائنیں را زود کن اخراج، بر مصنف نگر، در نگر، عالمے دیگر نگر
مدتے با شیخ[1] رفتی، با حریفاں ساختی، تاختی، دیدی آخر باختی
حال در روزِ بعد از نیست را زیں بد تر نگر، در نگر، عالمے دیگر نگر
سینہ کو باں شیخنا گوید بزاری در جلو، کو چلو لخ چہ شد حزا پلو
کو فسنجن کو متنجن، جائے شربت تر نگر، در نگر، عالمے دیگر نگر

ملک الشعرا بہار مشہدی کی مندرجہ ذیل نظم جو قیام مشروطیت کا نغمہ شادی ہے اخبار ایران نو مورخہ ۲۴ راگست ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی۔ چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

مے دہ کہ طے شد دوران جان کاہ	آسودہ شد ملک الملک للہ
شد شاہِ نور اقبال ہمراہ	کوس شہی کوفت بر رغم بدخواہ
شد صبح طالع طے شد شبانگاہ	الحمد للہ، الحمد للہ
پس مستبدین سختے جہیدند	گفتند سختے، سختے شنیدند
ناگہ ز ہر سو شیران رسیدند	آں روبہاں بازوم درکشیدند
شد طعمہ شیر، مکار روباہ	الحمد للہ الحمد للہ
بختِ سپہدار[2]، فرخندہ بادا!	سردار اسعد[3] پائندہ بادا!
صمصام ایمان برندہ بادا!	ضرغام دیں را دل زندہ بادا!
کافتاد از ایشاں بدخواہ در چاہ	الحمد للہ الحمد للہ

ذیل کی نظم بھی ایران نو مورخہ ۱۲ رفروری ۱۹۱۱ء میں "لاہوتی کرمان شاہی" کے نام سے لوری کے طرز میں شائع ہوئی کس قدر دلپذیر اور موثر اسلوب ہے۔

---

[1] مجتہد شیخ فضل اللہ نوری الصدر مخالف انقلاب۔ [2] کمر حسنہ سپہدار لشکر نشت۔ [3] سردار اسعد بختیاری اور ضرغام السلطنت بختیاری فتح طہران ۱۹۰۹ء کے سربرآوردہ ہیرو تھے۔

لام لاے لاے لاے وہ صدا ہے جو بچوں کو تھپکیوں کے ساتھ دی جاتی ہے۔

آمد سحر و موسم کار است بالام لالے — خوابِ تو دگر باعث عار است بالام لالے

لاے لاے بالا، لاے لاے — لاے لاے بالا، لاے لاے

جنگ است کہ مردم ہمہ در کار و تو در خواب — اقبال وطن بستہ بکار است بالام لالے

برخیز و سوے مدرسہ بشتاب — لاے لاے بالا، لاے لاے

خاکِ تنِ آباے تو با خونِ شہیداں — بر گرد تو زاں خاک حصار است بالام لالے

گردید عجین مادر ایراں — لاے لاے بالا، لاے لاے

تو کودک ایرانی و ایران وطن تست — جاں را تن بے جیب بکار است بالام لالے

تو جانی و ایراں چو تنِ تست — لاے لاے بالا، لاے لاے

برخیز گلشو رو تو در حفظِ وطن کوش — اے تازہ گل ایراں نہ چہ عار است بالام لالے

پس جامۂ عزت بہ بدن پوش — لاے لاے بالا، لاے لاے

جائے تو نہ گہوارہ بود جاے تو زین است — اے شیر پسر وقت شکار است بالام لالے

برخیز کہ دشمن بکمیں است — لاے لاے بالا لاے لاے

مگذار وطن قسمت اغیار بگرد د — باآنکہ وطن را چو تو یار است بالام لالے

ناموس وطن خوار بگرد د — لاے لاے بالا، لاے لاے

مندرجۂ ذیل نظم نسیم شمال بابت دسمبر ۱۹۱۰ء میں "قوقولیقو" (مرغ کی بانگ ککڑوں کوں") کے عنوان سے شائع ہوئی۔ منتخب بند نقل کئے جاتے ہیں۔

میخواند خروسے بشبستاں۔ قوقولیقو — میگفت کہ اے فرقۂ مستاں۔ قوقولیقو

کوبهن و کور ستم و بتاں۔ قوقولیقو — آوخ[1] کہ خزاں زد بگلستاں۔ قوقولیقو

---

[1] افسوس

فریاد ز سرمائے زمستاں - توتولیقو

خوں گریہ کند مزرعہ بر حال دہاتی — سوز د جگر سنگ بہ احوال دہاتی
عریاں و برہنہ ہمہ اطفال دہاتی — اے واے ز بدبختی دہقاں - توتو لیقو

فریاد ز سرماے زمستاں - توتولیقو

اُف باد بایں زندگی و طالع منحوس — تُف باد بایں غیرت و ایں دفتر معکوس
افسوس کہ تبریز شدہ دستخوش روس — قزوین شدہ جولانگہ روساں - توتولیقو

فریاد کشیدند خرد ساں - توتو لیقو !

کو بلخ و بخارا و چہ شد خیوہ و کابل — کو ہند و سمرقند و چہ شد بابل و زابل
کو نقطۂ قفقاز و چہ شد آں چمن گل — ایں بحر خزر بود ز ایراں - توتولیقو !

فریاد ز سرماے زمستاں - توتو لیقو

ہے ہے بخروشید کہ بازاول کار است — شیرانہ بخوشید کہ ہنگام شکار است
مردانہ بکوشید کہ دشمن بحصار است — زیر لگد افتادہ خروساں - توتو لیقو

کافر بجا خاک مسلماں - توتولیقو

یہ عامیانہ طرز سخن ہمارے پنچ اخباروں نے کم وبیش برتا ہے مگر وہ اکثر حد متانت سے اس قدر دور جا پڑے ہیں کہ طبقۂ خواص میں قبولیت حاصل نہ کر سکے ۔ تازہ ایرانی طرز شاعری سے ہیں یہ سبق ملتا ہے کہ طبقۂ عوام الناس کو متاثر کرنے کے لئے جہاں عامیانہ اصناف و اسالیب اور ظریفانہ لہجہ کی ضرورت ہے وہاں یہ لحاظ بھی ضروری ہے کہ کلام حد متانت سے نکل کر قعر سفاہت و دنارت میں نہ جا پڑے ۔ ورنہ اصل مقصود فوت ہو جائے گا ۔

محمد مسلم - ایم اے
ایم - او - ایل

سیاست بین الاقوامی

علم الانسان کے مطالعہ کرنے والے پر یہ حقیقت ہرگز پوشیدہ نہیں کہ جماعات و اقوام انسان کی ترتیب اُن کے مخصوص اوصاف و خصائل مماثلت اخلاق و جذبات تعلقات نسلی شرکت لسانی و اعتقادی غرض کہ زندگی کا ہر شعبہ دیگر مادی اشیاء کی طرح تغیرات خارجی سے اثر پذیر ہوتا ہے۔

ارتقائے انسانی کی کڑیوں کو بغور دیکھنے سے صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ انسان خارجی اثرات کا بندہ ہے۔ ایک سطحی نظر کو اس کی طبیعت میں تلون معلوم ہوگا۔ نہیں۔ یہ تلون نہیں بلکہ یہ حالت اس امر کی بدیہی دلیل ہے کہ وہ گرد و پیش کے حالات سے بیزاری ظاہر کرتا ہے اور ہمیشہ ایک مقصد کے در پے رہتا ہے جس کا سلسلہ اسی طرح غیر مختتم و نا متناہی رہے گا۔ انسان سے میری مراد انسان کی ہیئت اجتماعیہ ہے۔ چونکہ قومیں بھی منزل ارتقا پر اسی طرح غیر محسوس و غیر مرئی طریقہ سے گامزن ہوتی ہیں جس طرح فرد اپنی منزل حیات کی مختلف حالتوں سے گذرتا ہے۔

اس مختصر تمہید سے میرا مطلب یہ ظاہر کرنا ہے کہ انسان کی طرح اقوام و ملل کے لئے بھی یہ امر بالکل طبعی ہے کہ ہمیشہ ایک مقصد کے حصول کے لئے سرگرم کار رہتی ہیں اور تبدیلی و انقلاب کی آرزو ہمیشہ ان کے سینہ میں مخزن رہتی ہے۔ چنانچہ یہی نیرنگیاں اور انقلابات نظام تمدن کے جزو لاینفک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ قوانین حیات اجتماعی کے ہر شعبہ پر عمل پیرا ہیں۔ نظام مدنی کے سیاسی پہلو کو لیجئے۔ ازمنہ سابقہ میں یونانیوں کا سیاسی مقصد اور مدنظر "امارت بلدی" کے حصول کے بغیر اور کسی ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ ارسطو اپنی مشہور کتاب "سیاسیات" میں لکھتا ہے کہ حکومت کا اصل منشاء رعایا کو اطمینان و امن کی زندگی بسر کرنے کا موقعہ دینا اور اپنے فرائض انصاف

اور دیانت داری سے انجام دینا ہے۔ اور یہ فرائض بصورت احسن اسی حالت میں انجام دیے جا سکتے ہیں جب حاکم و محکوم میں بالواسطہ تعلق ہو یعنی رعایا کا ہر فرد بآسانی اپنے حقوق کی نگہداشت کرا سکے۔ وہ اپنی ہمسایہ قوموں کی حالت پر افسوس کرتا ہے اور ایران کی سلطنت کی طرف اشارۃً کہتا ہے کہ جس مملکت کا رقبہ اس قدر وسیع اور آبادی اس قدر زائد ہو وہاں رعایا کی داد خواہی اس کی دانست میں ایک امر محال ہے۔ اس کا خیال بالکل درست تھا کیونکہ اس کے زمانہ تک دنیا میں طریق نمایندگی و نیابت کا انکشاف نہ ہوا تھا اور حکومتوں کے دستور اساسی میں یہ طریق رائج نہ تھا۔

یونانیوں کی "امارت بلدی" بہت عرصہ تک قائم نہ رہ سکی، تمام دنیا میں بڑے بڑے رقبوں اور آبادیوں کی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ فرماں روا مطلق العنان ہوتے تھے تا آنکہ اسلام کا ظہور ہوا۔ اسلام نے اپنے سیاسی و عمرانی معاملات میں مجلس شوریٰ پر بہت زور دیا، لیکن جب مسلمانوں کی حکومت کی توسیع ہوئی تو اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار باقی نہ رہا بجز اس کے کہ ایک حکمراں جو مطلق العنان ہو جس کا اقتدار تمام عالم اسلامی تسلیم کرے وہ اس شیرازہ کی حفاظت کرے اور اس کو انتشار سے بچائے۔ چنانچہ امیر ابن معاویہ نے یہی کیا۔ طریق نیابت اس زمانہ میں بالکل ناممکن تھا ممالک کی وسعت ذرائع آمد و رفت کا فقدان ایسے اسباب تھے جنھوں نے لوگوں کے دماغوں میں اس خیال کو آنے تک نہ دیا۔

انھیں حالات کے بعد جب یورپ اپنے خواب غفلت سے ہوشیار ہوا، برق و بخار کی ایجاد نے ذرائع آمد و رفت میں آسانی پیدا کی، حکمرانوں کی دراز دستیوں نے لوگوں میں اپنے حقوق کا احساس پیدا کیا اور انتظام ملکی میں ان کو بھی اپنی شرکت کا خیال پیدا ہوا غرض کہ ان چند در چند اسباب سے سترھویں صدی عیسوی میں انگلستان میں طریق نیابت کی ابتدا ہوئی۔ اب "قومی حکومت" کا زمانہ شروع ہوا جو اب تک جاری ہے "قومی حکومت

کے تکلم میں دنیا کے لئے امن و راحت کا پیام تھا۔ اشتراک زبان، اشتراک وطن اور اشتراک اغراض اقتصادی "قومی حکومت" کے لئے ضروری قرار دئے گئے۔ محکوموں نے بھی آزادی کی جد و جہد شروع کر دی کیونکہ ان کے اور ان کے حکومت کرنے والوں کے اغراض و مقاصد میں قطعی تضاد تھا۔ اس منتہائے نظر یعنی "قومی حکومت" کی خاطر تمام دنیا میں ایک کشمکش برپا ہو گئی۔ جن آزاد ملکوں کو "قومی حکومت" کی نعمت عظمیٰ حاصل تھی ان کو بھی امن نصیب نہیں ہوا۔ اور یہ سب یعنی موجودہ جارحانہ وطن پرستی کا نتیجہ تھی۔ اغراض و مقاصد کے تصادم نے اب نہایت ہی ہولناک شکل اختیار کر لی۔ یعنی جس حرکت میں انگلستان کا مفاد پنہاں ہے وہ یقیناً فرانس کے لئے مضرت رساں ہے، ایک ملک کی اقتصادی ترقی اس کے ہم معنی ہے کہ ہمسایہ قوم تباہ و برباد ہو، تجارت کی گرم بازاری کے لئے لازم قرار پایا کہ ان ممالک کو جو صنعتی ترقی کے میدان میں اپنے دوسرے معاصرین کے دوش بدوش نہیں ہیں اور جن ممالک نے اس منزل میں ابھی قدم ہی رکھا ہے اُن کو بھی "تجارتی مقابلہ" کے آلہ کے ذریعہ سے نقصان پہونچایا جائے اور ہمیشہ کے لئے ان کے حوصلے پست کر دئے جاویں۔ اس کو "تجارتی یا جارحانہ قوم پرستی" کہا جاتا ہے۔

یہ خیال کہ تمام دنیا ایک ہی حکمراں کے زیر نگیں ہو اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود تاریخ انسانی۔ مذکورہ بالا حالات نے اس خیال میں از سر نو زندگی پیدا کر دی۔ قدرۃً لوگوں کا رجحان اس طرف ہونے لگا کہ دنیا میں ایسی متحدہ طاقت قائم کی جائے جو کمزور اور غیر ترقی یافتہ اقوام کے حقوق خود اختیاری کو محفوظ و مامون رکھ سکے۔

واقعات ماحول کے موثرات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں مختلف انکشافات کا ہونا برق و بخار کی ایجاد، تجارت کی گرم بازاری مختلف ممالک کے مختلف اللون اور اور مختلف اللسان باشندوں کا آپس میں خلط ملط نیز ساتھ ہی ذرائع آمدورفت کی سہولت مدنی زندگی کے مختلف شعبوں میں گوناگوں تصادم

اغراض واقع ہوتا' ان سب اسباب نے بین الاقوامی قوانین کی تدوین کی طرف توجہ منعطف کرائی۔ اس زمانہ میں یورپ کے بحر سیاست میں جو بلاکی طوفان خیزی ہوئی اور متعدد جنگوں کا یکے بعد دیگرے یورپ کو سامنا کرنا پڑا ان واقعات نے حکما و فلاسفہ یورپ کے ذہن میں یہ خیال اور بھی راسخ کر دیا کہ آپس میں اطمینان و عافیت سے زندگی بسر کرنے کے لئے ایک ایسے دستور اساسی کی ضرورت ہے جس کو تمام قومیں تسلیم کرسکیں۔

ہالینڈ کے مشہور مقنن گروشیس نے قوانین بین الاقوامی کے اصول اساسی منضبط کئے۔ ان اصول کے مبادیات ہی میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ دنیا کی تمام حکومتیں ایک مستقل آزاد حیثیت رکھتی ہیں' سیاست ملکی میں ہر حکومت کو اختیار کلی حاصل ہوگا کہ اپنی قومی روایت کے مطابق جس طرح چاہے حکومت کرے۔ سیاست بین الاقوامی کے لحاظ سے مفاد عالم کی خاطر اپنا ذاتی فائدہ قربان کر دینا پڑے گا۔ اور اس میں تمام وہ امور داخل کئے جاوینگے جن کا بالواسطہ تعلق تمام ممالک کے اغراض سے ہے مثلاً اسلحہ یا سامان جنگ کی تعین تحدید' قیام امن' استیصال جنگ وغیرہ۔

ان قواعد وضوابط کو قوانین کہنا حقیقت کے سراسر خلاف ہوگا۔ قوانین سے کسی حکومت کے وہ احکام مراد ہیں جن کے تسلیم کرانے کے واسطے حکومت اپنی قوت مادی بھی استعمال کرسکے۔ اگر ان اصول وضوابط کو قوانین کہا جاسے تو اس سے مراد یہ ہوگی کہ ان کی عدم تعمیل کے موقعہ پر ان کے تسلیم کرانے کے لئے ایک قوت موجود ہے حالانکہ جب سے تعلقات بین الاقوامی کے استحکام کا غلغلہ بلند کیا گیا ہے اب تک ان قوانین کے تسلیم کرانے کی غرض واحد کے لئے ہر کسی مستقل مادی طاقت کا انتظام نہیں کیا گیا ہے۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جن حکما وفلاسفہ کے دماغ میں پہلے ایسے قوانین وضع کئے جانے کے خیالات پیدا ہوئے ان کا مطمح ذہنی دنیا کی تمام قومیں اور حکومتیں نہیں نہ صرف یورپ کی متمدن اور ترقی یافتہ قومیں۔ چنانچہ انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں

...ہیں کہ ایک عدالت بین الاقوامی قائم کی گئی جس میں وہی اقوام شریک ہوئیں جو فاتح
دیگر ممالک کی غاصب تھیں۔ یعنی ایک جماعت قائم کی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ غیر ترقی یافتہ
...ممالک کے بانٹنے اور تقسیم کرنے میں آپس کے تصادم کے خطرہ کو ہمیشہ کیلئے مٹا دیا جائے۔

اٹھارویں صدی عیسوی سے قبل پاپائے روم یورپ کی حکومتوں کے معمولی تنازعات
فیصلہ کیا کرتے تھے، لیکن انیسویں صدی میں یورپین اقوام کے تعلقات کی پیچیدگی کی وجہ سے
...ایسی عدالت کے قیام کی ضرورت محسوس ہونے لگی جو ان معاملات میں غیر جانبدار فیصلہ
...سکے۔ چنانچہ مقام ہیگ میں ایک عدالت قائم کی گئی۔ اسی باب میں مختلف حکومتوں کے
...بین متعدد عہد نامے ہوئے کہ اپنے آپس کے تنازعات کو اس عدالت کے فیصلہ پر چھوڑ دینا چاہئے
...ء میں امریکہ نے دنیا کی چوبیس حکومتوں سے اسی باب میں معاہدہ کیا ہے کہ وہ معاملات
...حکمت عملی کے ذریعہ طے ہو سکیں گے اس بین الاقوامی عدالت کے سپرد کئے جاویں گے
...برطانیہ فرانس جرمنی اٹلی وغیرہ کے نمایندوں نے اس معاہدہ پر دستخط ثبت کئے ہیں۔ اس
عہد نامہ کی وقعت جو اقوام یورپ کی نظر میں تھی گذشتہ جنگ عظیم نے بخوبی ظاہر کر دی۔ اس
عہد نامہ کی ایک شرط خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ وہ اہم معاملات جن کا بالواسطہ تعلق فریقین
میں سے کسی کی ملکی آزادی' قومی عزت' اور خودداری و وقار سے ہوگا اس عدالت بین الاقوامی
کے پاس فیصلہ کی غرض سے نہیں بھیجے جا سکتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عدالت کا وجود و عدم تقریباً برابر ہو گیا۔
ہر حکومت کو اختیار کلی باقی رہا کہ جس معاملہ کو چاہے جتنی اہمیت دے۔ یعنی جنگ کے سدباب
کے لئے یہ عدالت بھی قاصر رہی چونکہ اس کے پاس اپنے فیصلہ کو تسلیم کرانے والی کوئی قوت نہ تھی

جنگ عظیم شروع ہونے سے قبل سیاسیات بین الاقوامی کی یہ کیفیت تھی۔ دوران جنگ
میں اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ یہ جنگ گویا نفس جنگ کا ہی خاتمہ کن ثابت ہوگی لیکن اختتام
جنگ پر ان تمام فلسفیانہ اور خوش اعتقادانہ امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اور یہ معلوم ہوا کہ یہ
جنگ اس سے بھی زیادہ ہولناک اور مہیب جنگوں کا پیش خیمہ ہے۔ یقیناً اس خیال کی صحت

میں کلام نہیں ہے لیکن ان فرضی خطروں کی وجہ سے نہیں بلکہ اس ذریعہ سے اپنے مقاصد کو سریع الحصول بنانے کی خاطر اتحادیوں کے نمائندوں نے ۲۸۔ اپریل ۱۹۱۹ء میں ایک معاہدہ کیا جس کی غرض وغایت دنیا میں امن وامان قائم کرنا تھی ۔ اس طرح لیگ اقوام کی نیاد پڑی ۔ لیگ کی خاص کارکن جماعتیں چار ہیں ۔

(۱) مجلس ۔ جس کے ممبر تمام ممبران لیگ ہونگے ۔

(۲) کونسل ۔ جس میں صرف اتحادیوں کی ممبر شامل ہوسکیں گے ۔ اس جماعت کی خاص ذمہ داری یہ ہوگی کہ ان معاملات کی تفتیش وتحقیق کرے جن کا تعلق اس کی بندار میں سیاست بین الاقوامی سے ہے ۔

(۳) سکریٹریٹ ۔ جو اسٹاف اور ایک معتمد عام پر مشتمل ہوگی ۔ معتمد عام کونسل کی کثرت آرا سے منتخب کیا جاویگا ۔

(۴) عدالت بین الاقوامی ۔ یہ ان معاملات پر غور کرے گی جو کونسل اس کے پاس اظہار رائے کی غرض سے بھیجے اور تنازعات پر فیصلہ بھی صادر کریگی ۔

لیگ کا صدر مقام جنیوا ہوگا ۔ اگرچہ اس لیگ کے معاہدہ کے مبادیات میں بظاہر کردیا گیا ہے کہ قیام امن استیصال جنگ اور غیر ترقی یافتہ ممالک کی مدافعت اس لیگ کے مقاصد اولین ہیں ۔ لیکن ایسی دفعات بھی ہیں جن کی وجہ سے لیگ طاقتور قوموں کے ہاتھ میں اپنے غلبہ وتسلط کی پالیسی اختیار کرنے کے لئے ایک زبردست آلہ بنگئی ہے ۔ چند ایسی دفعات ذیل میں پیش کی جاتی ہیں (۱) لیگ کو ممبران میں سے کسی حکومت کو فرمانروائی تفویض کرنیکا اختیار ہوگا جب تک وہ ملک جس کو فرمانروائی تفویض کی گئی ہے اپنی ذمہ دار حکومت قائم کرنے کی اہل ہوجائے اس ممبر لیگ کو چاہئے کہ نظام تمدن کے اصول پر اس ملک کے لوگوں کو کاربند کرائے ۔ (۲) اگر ممبران لیگ میں سے کسی میں تعلقات کی کشیدگی پیدا ہونے کا خطر ہو تو حتی المقدور لیگ مفاہمت باہمی کی کوشش کرے گی لیکن کسی معاملہ میں ہاتھ ڈالنے سے

قبل مجلس و کونسل کی متفقہ رائے کی ضرورت ہوگی۔

(۳) ممبران لیگ پر واجب ہے کہ مسئلہ متنازعہ فیہ کو عدالت کے فیصلے یا کونسل کی تفتیش کے لئے پیش کریں اور اس وقت تک جنگ شروع نہ کریں جب تک کہ عدالت کا فیصلہ یا کونسل کی تحقیقاتی رپورٹ شائع ہوئے تین ماہ نہ گذریں۔

موجودہ حالت میں لیگ زبردست اقوام کی خواہشوں اور منصوبوں کو پورا کرنے کے لئے ایک آلہ کار ہے۔ حکم بردار ی کے یہی معنی ہیں کہ تسلط و استیلاء کے مذموم حرکات کو خوش نما لباس میں ظاہر کیا جائے۔ دیگر دفعات سے صاف عیاں ہے کہ لیگ اسی وقت تک ان قوموں کی نظروں میں وقیع ہے جب تک کہ اپنی ذاتی غرض پر ٹھیس نہیں لگتی۔ بوالعجبی ملاحظہ ہو۔ لیگ نے اپنی غایت الغایات قیام امن قرار دی ہے' اسی کی خاطر تمام ممبران لیگ سے سالانہ مقررہ رقم بین الاقوامی اخراجات کے لئے وصول کی جاتی ہے۔ ہندوستان کو بھی بہ حیثیت ممبر سالانہ رقم اوا کرنی ہوتی ہے۔ ان رقوم کے ناجائز استعمال کی توضیح کے لئے ایک حال ہی کا واقعہ کافی روشنی ڈالے گا۔ جب قسطنطنیہ پر ترکان احرار نے تسلط کر لیا اسی دوران میں مالٹا سے دو برٹش جنگی جہاز قسطنطنیہ روانہ ہوگئے۔ صرف ان افواج اور جنگی جہازوں کی نقل و حرکت میں تقریباً ایک لاکھ پونڈ خرچ ہوئے۔ یہ رقم برطانیہ نے اپنے ذاتی خزانہ سے نہیں خرچ کی بلکہ یہ اخراجات بین الاقوامی نوعیت کے لحاظ سے لیگ کے خزانہ عام سے خرچ کئے گئے۔ چونکہ یونان لیگ کا ممبر ہے اور جو صرف لیگ کے ایک ممبر کی کمک و اعانت کی خاطر کیا جا ے اس کا بار لیگ کے خزانہ عام پر پڑنا چاہئے یہ جنگ زرگری دنیا کو محض دھوکا دینے کے لئے کیجا رہی ہے۔

دنیا میں ایسا اکثر ہوا ہے کہ وہ تعلیمات جو بنی نوع انسان کے لئے نافع اور سودمند تھیں اپنی مسخ شدہ صورت میں بیحد مضرت رساں ثابت ہوتی ہیں۔ بعینہ یہی حال لیگ اقوام کا ہے۔ بین الاقوامی تعلقات کا استحکام' بنی نوع انسان کی مرفہ الحالی' اور قیام امن و صلح مقاصد

تھے۔ گروشیس اور اس کے رفقا جن کے قوانین بین الاقوامی کا بانی کہا جاتا ہے۔ ان قوانین کی تدوین ہی سے ایک حقیقت شناس کو پتہ چل سکتا ہے کہ یورپ بھی عرصہ سے اپنی حالت سے بیزار ہو چلا ہے۔ انقلابات ذہنی انقلابات مادی کا پیش خیمہ اور مقدمہ ہوا کرتے ہیں۔ اگر ماضی کا علم مستقبل کے لئے رہنمائی کرسکتا ہے تو ارتقائے عالم کا یہی تقاضا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسی "دولت متفقہ" قائم ہو جس میں دنیا کے تمام ممالک کے نمائندے شریک ہوں۔ اس "دولت متفقہ" کو ان معاملات میں جن کا تعلق بین الاقوامی مفاد سے ہو اپنی قوت حاکمہ و قوت نافذہ کے استعمال کرنے کا پورا اختیار ہوگا۔ کیونکہ جب تک قوت نفاذ کسی سیاسی جماعت کی حمایت اور پشت پناہی پر نہ ہو اس کی مثال اس نعش کی سی ہے جس میں روح نہیں۔ میں اس خیال سے متفق نہیں کہ فطرت انسانیہ اس قدر نیک اور سلیم الطبع واقع ہوئی ہے کہ وہ بغیر کسی خارجی قوت و طاقت کے استعمال کے نیکی اور خیر کی طرف مائل ہوتی جاویگی۔ یہ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے اور واقعات کے سراسر خلاف ہے۔ جب تک دنیا میں حرص کے بندے موجود ہیں اس وقت تک کم از کم اپنی مدافعت ہی کی خاطر مادی قوت ناگزیر ہے۔ اس "دولت متفقہ" کی بنا فلسفیانہ تخیلات پر نہ ہوگی بلکہ واقعات پر۔ اور اگر اس کو متحد و منتظم مرکز بنانا مقصود ہے تو یہ فرض اوّلین ہوگا کہ مادی فلاح و بہبود کو پیش نظر رکھا جائے، کیونکہ افراد کی طرح اقوام بھی صرف تخیلات اور وجدانی کیفیات پر زندہ نہیں رہ سکتیں۔

سب سے زیادہ ضروری یہ امر ہے کہ ایک ایسی ذہنی حالت پیدا کی جائے جسکو بین الاقوامی ہونے سے تعبیر کیا جاسکے، ایک سیاست داں اور علم النفس کے ماہر کا کیا خوب قول ہے کہ "ہماری اشیا بہ نسبت ہمارے ذہنوں کے زیادہ بین الاقوامی ہیں" کسی ملک کے دہقان کے لباس اور دیگر ضرورت زندگی پر اگر نظر ڈالیئے تو معلوم ہو کہ بکثرت چیزیں ان ممالک کی ہیں جن کے نام سے بھی وہ نابلد ہے۔

اس ذہنی حالت کے فقدان کے دو اسباب ہیں۔ دنیا میں یا حاکم اقوام ہیں یا محکوم، حاکم اقوام کی حریصانہ پالیسی نے ان کو اتنا کوتاہ نظر بنا دیا ہے کہ صرف اپنے مفاد و اغراض چاہے ان سے

دیگر اقوام کو سراسر نقصان ہو اسکے پیش نظر رہتے ہیں۔

محکوم اقوام میں غلامی کی وجہ سے حد درجہ تنگ نظری موجود ہے۔ اس لئے بین الاقوامی مواخات اور تمام بنی نوع انسان کی برادری قایم کرنے سے پیشتر تمام انسانی بستیوں کا فطرتی حق ہے کہ آزادی حاصل کریں۔ اس کے بعد ہماری محبت اپنی قومیت کے جزرافی حدود تک ختم ہو جانے میرے نزدیک آزادی حاصل کرنے کا مقصد اپنے حقوق کی نگہداشت کے علاوہ یہ ہونا چاہئے چونکہ ایک قوم غلامی کی وجہ سے بنی نوع انسان کی عام خوشحالی میں اضافہ نہیں کر سکتی اس لئے اس کا آزادی حاصل کرنا فرض اولین ہے۔ یعنی آزادی بھی بذاتہ ایک اور بڑے مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ ممکن ہے کہ لوگوں کو اس تخیل کے صورت عمل اختیار کرنے میں شبہات ہوں۔ زمانے کا رجحان بجائے خود ایک معلم ہونا چاہئے۔ ابھی حال ہی کا ذکر ہے کہ ہندوستان کے چند لیڈروں کو "اتحاد ایشیا" قایم کرنے کا خیال پیدا ہوا ہے۔ اس اتحاد سے ایشیائی حکومتوں کا نہیں بلکہ باشندوں کا اتحاد مراد ہے۔ یہ اتحاد گویا اپنے اغراض و مقاصد میں لیگ اقوام کے بالکل خلاف ہوگا۔ لیگ کا مقصد یہ ہے کہ غیر ترقی یافتہ ممالک سے سیاسی و اقتصادی فائدہ حاصل کرنے میں آپس کے تصادم کو حتی المقدور بچایا جاوے۔ اس "اتحاد ایشیا" کا یہ مقصد ہوگا کہ ایسی صورت حالات پیدا کرنی چاہئے جس کے ذریعہ سے سیاسی و اقتصادی محکومیت سے نجات حاصل کی جائے

جیسا کہ میں بتلا چکا ہوں یہی "اتحاد ایشیا" مختلف حالات کی وجہ سے مختلف صورتیں اختیار کرتا ہوا قوانین فطرت کے تابع اس "دولت متفقہ" کی شکل میں ظہور پذیر ہوگا جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ موجودہ جابرانہ "قوم پرستی" کے طلسم ٹوٹنے سے میری مراد اس اقدام کی طرف ہی جو زمانہ غیر مرئی طور پر کر رہا ہے۔

یوسف حسین خاں

متعلم جامعہ ملیہ اسلامیہ
علی گڑھ

مسئلہ تاوانِ جنگ

عہدنامہ ورسیلز کی رو سے اتحادیوں کو جرمنی سے مندرجہ ذیل نقصانات کے لئے تاوان حاصل کرنے کا استحقاق ہے۔

(۱) ان نقصانات کی تلافی جو سویلین مجروحین یا مقتولین کو اس جنگ میں پہونچے۔ اس تلافی میں بم بری یا بحری حملے، ہوائی جہاز کے ذریعے اور ہر طرح کے دیگر نقصانات شامل ہیں۔

(۲) ان نقصانات کی تلافی جو سویلین مقتولین یا ان کے پسماندگان کو بذریعہ بیرحمانہ سلوک یا تشدد کے جرمنی یا اس کے حلیفوں کی طرف سے پہونچے۔ (اس تلافی میں صحت اور جان کے وہ تمام نقصانات شامل ہیں جو قید، جلاوطنی، شہر خالی کرانے، سمندر پر روک رکھنے اور جبریہ محنت لینے میں بیعوض تنخواہ پہنچے ہیں)

(۳) ان نقصانات کی تلافی جو سویلین مقتولین اور ان کے پسماندگان کو جرمنی یا اس کے حلیفوں کی طرف سے اپنے ملک یا مقبوضہ و مفتوحہ صوبجات میں ہوئے ہیں جن میں صحت و عزت وغیرہ کا نقصان بھی شامل ہے۔

(۴) ان نقصانات کی تلافی جو جنگی قیدیوں کو کسی قسم کی بدسلوکی سے پہنچے ہیں۔

(۵) ان نقصانات کی تلافی جو دول اتحادی اور ان کے شرکاء کے فوجی اور بحری مجروحین مقتولین یا اس کے پسماندگان کو بہ صورت پنشن یا معاوضہ زرِ جان کو دئیے جاتے تھے پہونچے ہیں۔ ان رقموں میں سے ہر ایک موجودہ عہدنامہ کے عمل میں آنے تک ادا کر دینی ہوگی اور ان رقوم کا تعین اس شرح سے ہوگا جو اس وقت فرانس میں تھی۔

(۶) اس امداد کی قیمت بھی جو اتحادی حکومتوں اور ان کے شرکاء کی طرف سے جنگی قیدیوں، ان کے خاندانوں اور پسماندگان کو دی گئی ہے، ادا کرنی ہوگی۔

(۷) اس بھتے کی ادائیگی بھی جو اتحادی حکومتوں اور ان کے شرکاء کی طرف سے بھرتی شدہ یا فوجی اشخاص کو یا ان کے خاندان اور پسماندگان کو ملتے تھے، جرمنی کے ذمہ ہوگی۔ ان رقوم کی شرح

ادائیگی کا تعین فرانس کے اہم نقصانات کی شرح سے ہوگا۔

(۸) ان نقصانات کی تلافی جو سویلین کو جرمنی یا اس کے حلیفوں کے جبریہ محنت لینے اور مناسب
اجرت نہ دینے کی وجہ سے ہوئے ہیں۔

(۹) ان تمام منقولہ و غیر منقولہ اشیاء کے نقصانات کی تلافی جو اتحادیوں یا اُن کے شرکاء میں سے
کسی ایک کی ملک ہیں۔ یا اس سے وہ سامان جنگی یا بحری کشتی ہے جو جرمنی یا اُس کے حلیفوں نے
ہوائی حملہ کے ذریعہ سے یا خشکی و بحری طریقہ پر برباد کیا ہے۔

(۱۰) ان تمام نقصانات کی تلافی جو جرمنی یا اُس کے حلیفوں نے سویلین آبادی سے بصورت تاوان
و جرمانہ وغیرہ لیا ہے۔

مذکورہ بالا نقصانات کے لئے رقوم کی تعین "کمیشن تاوان جنگ" کے متعلق کر دی گئی
اور بہ حقیقت ہر شخص پر جس کو اقتصادیات او مالیات سے کچھ بھی تعلق ہے ظاہر ہے کہ اگر اس رقم
کا صحیح تخمینہ کیا گیا تو اس کی ادائیگی جرمنی کی قوت سے یقیناً باہر ہوگی۔

علاوہ بریں وظائف کی ادائیگی کا مطالبہ جو کل رقم کا نصف شمار کیا جاتا تھا وہ پریسیڈنٹ
ولسن نیز دوسرے آزاد خیال اور غیر متعلق ناقدین کے نزدیک اس سمجھوتہ کے منافی تھا جس کی
بنا پر جرمنی نے التوائے جنگ قبول کی تھی، امریکہ کے اعتراضات کو فرانس اور برطانیہ نے ناجائز
قرار دیکر وظائف کے تقویت کی تجویز آخر الذکر کے ذمہ کر دی جس کا مقصد غالباً مسٹر لائڈ جارج
کے لئے سنہ ۱۹۱۸ء کے انتخاب عام میں ووٹ حاصل کرنا تھا حالانکہ بالآخر شرائط صلح کی حقیقت
سے ہم سب آگاہ ہو گئے تھے اور بہر طور اس پر مقرر ہے کہ ان کو زیادہ معتدل بنانا چاہیئے، یہاں
تک کہ مئی سنہ ۱۹۲۱ء میں ہم سب لوگ اس پر متفق ہوئے کہ تاوان جنگ کی جملہ رقم ۶۶۰۰،۰۰۰،۰۰۰
پونڈ مقرر کی جائے جو ۳۰ سال کے دوران میں متفرق اقساط میں ہر سال واجب الادا ہوگی،
یہ جانتے ہوئے کہ یہ مقدار بھی جرمنی کی امکانی حدود سے متجاوز ہیں۔

جرمنی نے بہت کچھ نقد اور جنس کی صورت میں ادا کر دیا صلحنامہ پر دستخط کرنے کے بعد سے

موسم گرما ۱۹۲۱ء میں اُس نے کامیابی کے ساتھ وہ رقم بھی فراہم کرلی جس کی ادائیگی کا عہد
اس نے مئی ۱۹۲۱ء کے اقرار نامہ میں کیا تھا، متفرقات کی پہلی سالانہ قسط ستمبر میں واجب الادا
تھی وہ صرف جنس پر مشتمل تھی، لیکن سال کے اختتام پر حکومت برلن کی طرف سے اقساط
سہ ماہی مقررہ اور متفرقات کے لیے جو جنوری اور فروری میں واجب الادا تھیں عدم
استطاعت ادائیگی کا اعلان کر دیا گیا، اس اثنا میں مارک کی قیمت میں تخفیف شروع
ہوگئی تھی، غرضیکہ جرمنی کی مالی مشکلات سے متاثر ہو کر جس کو حکومت ہائے فرانس اور برطانیہ نے پہلے
پیرس کے مقام پر دسمبر کے مہینہ میں پھر مارچ میں کینز کے مقام پر باہم مشورہ کیا، اور یہ
طے پایا کہ جرمنی کو ۱۹۲۲ء میں قدرے مہلت دی جائے اور اس دوران میں اس سے صرف
۳۶,۰۰۰,۰۰۰ پونڈ نقد اور ۲۰,۰۰۰,۰۰۰ پونڈ جنس کی صورت میں ادا کرنے کو کہا جائے،
یہ رقم اس کی نصف ہے جس کی ادائیگی کے لیے مئی ۱۹۲۱ء کے اقرار نامہ کے مطابق اُس سے
وعدہ لیا گیا تھا، اس رعایت کے عوض میں جرمنی سے کہا گیا کہ وہ اپنی مالیات کو بہتر حالت
میں منظم کرے، دوسرے اخراجات میں تخفیف کرے، ایک ملکی قرضہ کے لیے انتظام کرے،
کوئی ایسی تجویز عمل میں لائے جس سے ملکی سرمایہ کی برآمد رُک سکے اور کمیشن تاوان جنگ
کے اختیارات میں اور وسعت کی اجازت دے کہ وہ "کمیٹی آف گارنٹیز" کے ذریعہ سے
تمام انتظامات کی خبر گیری کر سکے جرمنی نے پہلے تو احتجاج کیا اور توقف بھی لیکن رفتہ رفتہ
اتحادیوں کی تمام تجاویز تسلیم کر لی گئی اور جدید انتظام کے مطابق جولائی تک ماہواری
قسطیں ادا کرتی رہی لیکن اتحادیوں کے تمام مراعات اور جرمن حکومت کی اپنے فرائض سے
عہدہ برآ ہونے کی مخلصانہ کوششیں ایک اہم خطرہ کو باز رکھنے میں کامیاب نہ ہوئیں جنگ کے
زمانہ میں ایک پونڈ کے بیس مارک ملتے تھے، مئی ۱۹۲۱ء میں ۲۴۰ مارک کی ایک گنی ملنے
لگی، اگست میں اس کی قیمت ۳۰۰ مارک ہوگئی اور ستمبر کے آخر تک ۴۰۰ مارک ہوگئی، پھر
اکتوبر کے آخر میں ۷۰۰ اور نومبر میں ۱۱۰۰ ہوگئی۔ شروع جون ۱۹۲۲ء میں مارک کی قیمت

تھا ۔۔۔ ۳۰ تھی لیکن مہینے کے آخر میں ۱۹۰۰ تک پہنچ گئی۔ پھر جولائی کے پہلے ہفتہ میں ۴۰۰ ہو اور
اگست کے پہلے ہفتہ ۔۔ ۳۲۰۰ ہو گئی۔ مارک کی قیمت گر جانے کی وجہ جس قدر آسان ہے اسی قدر
واضح بھی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جرمنی کا قدم بھی آسٹریا ہی کی طرح پھسلتا جا رہا ہے قبل
اس کے کہ وہ تاوان جنگ کی ادائیگی واقعتاً شروع کرے۔ موسم بہار سنہ ۱۹۲۱ء کے فیصلہ کے
مطابق تاوان جنگ کی رقم یاد ہوگا کہ ۶۰۰۰۰۰۰۰۰۰ پونڈ مقرر کی گئی تھی۔ ۴۔ اگست کو
دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے سر رابرٹ ہارن نے فرمایا تھا کہ ابتدائے جنگ سے اب تک
جرمنی نے اتحادیوں کو ۱۰۷۰۰۰۰۰۰ پونڈ نقد اور ۳۰۰۰۰۰۰۰۰ پونڈ جنس کی صورت میں ادا
کیا ہے۔ آخر الذکر رقم ۱۶۰۰۰۰۰۰ پونڈ کے قیمتی جہازوں کوئلہ اور دوسری چیزوں پر مشتمل ہے
اور ۱۲۵۰۰۰۰۰ پونڈ مفتوحہ علاقوں میں حکومت کے املاک کی قیمت ہے۔ اس کے علاوہ چند
اور چھوٹی چھوٹی رقمیں بھی شامل ہیں۔ علاوہ ۱۵۴۰۰۰۰۰ پونڈ کے جو اس طرح پر وصول کئے گئے جرمنی
نے ۳۸۰۰۰۰۰ پونڈ اس قرض کے تصفیہ کے لئے ادا کی جو جنگ شروع ہونے سے پہلے
باشندگان جرمنی کے ذمہ اتحادیوں کا باقی رہ گیا تھا۔ اس مد میں جرمنی کا کل قرضہ ۴۳۰۰۰۰۰۰
پونڈ ہے، اس سال اگست کے مہینہ تک ۲۰۰۰۰۰۰ پونڈ ماہوار کے حساب سے یہ قرضہ آسانی
ادا ہو رہا تھا، لیکن اگست کے مہینہ میں مارک کی قیمت زیادہ گر جانے کی وجہ سے حکومت برلن
کو واجب الادا قسط میں تخفیف کے لئے درخواست کرنی پڑی، فرانس نے تخفیف کرنے سے
صاف انکار کیا اور اور اپنے اختیارات کو کام میں لانے کی دھمکی دی اور اس طرح اُن
پیچیدہ معاملات کو جو مسٹر پائنکارے اور مسٹر لائڈ جارج کو اپنی ملاقات کے وقت لندن میں
درپیش تھے اور بھی الجھا دیا۔ اس رقم کی قلت اُن امداد کے مقابلہ میں جن کی وصولیابی
کا یقین برطانوی اور فرانسیسی باشندوں کو دلایا گیا تھا، اس خیال کے لئے اور بھی تقویت

* موجودہ معاملات میں فرانس کے جرمنی علاقوں پر قبضہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مارک کی قیمت [illegible] گر گئی
یعنی اس وقت ۴۰۰۰۰ فی پونڈ ہے۔ مترجم

محض ثابت ہوئی کہ جرمنی کی مشکلات جن کا اندازہ مارک کی قیمت گر جانے سے کیا جاتا ہے وہ محض ایک مبالغہ آمیز بناوٹ ہے تاکہ قرض خواہ اس کو دیوالیہ سمجھ کر دہوکہ کھا جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ جرمنی بہت کچھ اس مسئلہ کو حل کر سکتا تھا اگر وہاں ایک مستحکم مرکزی حکومت قائم ہوتی جو حکومت کے مختلف محکموں اور ملازمت عالیہ میں مالی انتظامات کرنے کے قابل ہوتی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ کچھ تجار اور اکثر ماہرین مالیات نے ایسے طریقے اختیار کئے جس سے جرمنی کے اعتماد کو مزید صدمہ پہنچا حالانکہ ان کی اپنی جیبیں بھر گئیں، لیکن جرمنی کی مالی تباہی کے وجوہات زیادہ تر اس صورت حال سے پیدا ہوئے جو جنگ کا نتیجہ ہے اور جس کی نزاکت صلحنامہ ورسیلز کے ان دفعات سے اور بھی بڑھ گئی جن کا تعلق تاوان جنگ سے ہے۔

جرمنی کی مالی تباہی کی حقیقی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کو اتنی کثیر رقمیں ادا کرنی پڑیں بلکہ اس کے ذمہ اتنی بڑی رقم کا واجب الادا ہونا جس کی ادائگی ناممکن ہے۔ جرمنی مقروض ہے اور اس کا بار اس کی قوت سے کہیں زیادہ ہے جرمنی کو تیار شدہ مال باہر بھیجنا پڑتا ہے تاکہ ان خام اشیاء کی قیمت ادا کرے جس میں سامان خورد و نوش بھی شامل ہوتا ہے۔ شروع سال میں جرمن حکومت نے یہ اندازہ کیا تھا کہ درآمد برآمد سے ۱۰۰,۰۰۰,۰۰۰ پونڈ زائد تھی اور اغلب تھا کہ کچھ عرصہ تک تجارتی حالت یوں ہی رہیگی۔ مئی سنہ ۱۹۲۱ء کے فیصلہ کے مطابق جرمنی کو ہر سال ۱۰۰,۰۰۰,۰۰۰ پونڈ نقد اور برآمد کا ۲۶ فی صدی متفرقات کی صورت میں ادا کرنا پڑیگا جس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کو اپنی پوشیدہ برآمد یا اپنے اعتماد، یا دوسرے ذرائع سے کچھ رقم زائد فراہم کرنا پڑیگی تاکہ وہ موجودہ نظام عمل پر قائم رہکر ۲۰۰,۰۰۰,۰۰۰ پونڈ سالانہ سے کچھ فاضل رقم یا ۴۰۰ کاغذی مارک فی پونڈ کے حساب سے ۸۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰ مارک غیر ممالک سے سامان سکہ اور دوسری قیمتی اشیاء خریدنے کے لئے مہیا کرے، یہ سچ ہے کہ جرمنی نے واجب الادا تاوان کا کوئی حصہ بھی پورا ادا نہیں کیا اور بڑی بڑی تعداد میں کاغذی مارک کو طبع کرا کر غیر ممالک میں فروخت کیا تاکہ جو کچھ فائدہ اس طرح حاصل ہو اس سے اپنی تجارتی اور سیاسی ضروریات کو پورا کرے۔ اس نے

موجودہ حالت میں تاوان جنگ کی ادائیگی کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ تمام دنیا کے ممنونوں کو مارک خریدنے
پر آمادہ کیا حالانکہ اب اس کی کوئی قیمت نہ رہی تھی خوب طبع کرنے میں لگے رہیں۔ کثیر التعداد مارک
کا مختلف ممالک میں بکنا، اور آئندہ ملکی ادائیگی کا خوف یہ وجوہات تھیں جن کی وجہ سے مارک کی
قیمت اس قدر زیادہ اور تیز رفتاری سے گر گئی اور اس کا نتیجہ وہی ہوا جس کو "مارک کی پرواز" کہتے
ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی والے اپنے سرمایہ کو اپنے ہی وطن کی تجارت میں لگائیں، انہوں نے
فاضل رقم کو بیرونی ممالک میں منتقل کر دیا اور اگر بیرونی ممالک سے انہوں نے کچھ حاصل کیا تو اس کو بھی وہیں
اپنے اپنے خاندان والوں کے لئے جمع رہنے دیا تاکہ ٹیکس سے بچیں اور جب کوئی افتاد پڑے تو تہی دست
نہ رہیں۔ علاوہ بریں بنک اور تجارتی کارخانہ اپنی دولت کی حفاظت اور غیر ممالک پر اپنا اعتماد قائم رکھنے
کے لئے مجبور ہو گئے کہ بیرونی ملکوں کو کثیر تعداد میں جمع رکھیں، اس کو کسی طرح پر بھی عیاری اور چالاکی
نہیں کہا جا سکتا، بلکہ انسانی فطرت کا ایسی حالت میں یہی اقتضا ہے اور جس کے اثرات آسٹریا میں بھی
آج انہیں اسباب کی بنا پر نظر آ رہے ہیں، وہ بداخلاقیاں جو سکوں کی مقررہ قیمت کے گر جانے سے عموماً
رونما ہوتی ہیں اس کا اثر جرمنی "مالیات" میں اسقدر ہے جتنا کہ آسٹریا میں۔ جرمنی کی تجارتی
خوشحالی کے قصہ سننے میں آتے ہیں، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہاں بیروزگاری بالکل نہیں ہے، ان کی تجارتی
مرکزوں میں چہل پہل ہے، بڑی بڑی تعمیرات کے لئے تجاویز شدہ پیش کی جا رہی ہیں اور رفاہ
عامہ کے لئے سڑک، ریل اور بندرگاہوں میں ترقی اور مرمت کے کام شروع ہونے والے ہیں، پھر یہ
دریافت کیا جاتا ہے کہ یہ تمام حالات کہاں تک اس بیان کے مطابق ہیں کہ جرمنی مالی نقطہ نظر سے آخری
سانسیں لے رہا ہے۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ دنیا کو محض فریب میں ڈال رہی ہے لیکن
نہیں! یہ دھوکا نہیں ہے بلکہ اگر جرمنی اس انہماک اور تیزی سے سامان تیار کر رہی تو کچھ تو اس لئے
کہ بیرونی تجارت سے زیادہ فائدہ کی توقع ہے اور کچھ اس لئے کہ ملکی ضروریات کو پورا کرے اس سبب
کہ ہر قوم جس کے سکہ کی قیمت گر جائے وہ قدرتی طور پر یہی چاہے گی کہ اپنے نقد سرمایہ کو کسی چیز یا
گراموفون سے لیکر عمارات تک میں لگا دے بجائے اس کے کہ قیمت گرنے کے لئے بنکوں میں پڑا

رہنے دیا جائے" اور یہ واقعات صحیح ہیں تو جرمنی کی تجارتی کارگزاریاں "مارک" کی قیمت گرنے کی ایک مزید علامت ہے کہ مارک کی قیمت کا کوئی اعتبار نہیں رہا ہے اور اس صورت میں دولت غیر ممالک میں منتقل کیا جا رہا ہے۔ بیروزگاری کا نہ ہونا بھی انہیں اسباب پر مبنی ہے کہ جن کی وجہ سے مزدوروں کی تعداد سنہ ۱۹۱۹ء میں سکہ کی قیمت گر جانے کے بعد بہت بڑھ گئی تھی۔

مارک کی گذشتہ تباہی سے پہلے بھی برلن کے علاوہ ہر جگہ یہ محسوس کیا جاتا تھا کہ اگر جرمنی کو کافی مہلت نہ دی گئی اور موجودہ تاوانی تصفیہ کو قابل عمل صورت میں مرتب نہ کیا گیا تو جرمنی کبھی اپنے قرض کی ادائگی کے قابل نہ ہوگی اپریل اور مئی کے مہینہ میں جنوا میں محض موسیو پائنکارے کی وجہ سے یہ سوال نہیں اٹھایا گیا تھا۔ لیکن جون میں تاوانی کمیشن' کی دعوت پر مختلف اقوام کے ماہرین مالیات کی ایک کمیٹی اس امر پر غور کرنے کے لیے منعقد کی گئی کہ جرمنی تاوان جنگ ادا کرنے کے لیے بیرونی ممالک سے قرضہ حاصل کر سکتی ہے۔ اس کمیٹی کی طرف سے باقاعدہ کوئی رپورٹ شائع نہیں کی گئی اس لئے مذکورہ کمیٹی نیز تاوانی کمیشن کے جلسوں کی کارروائیوں سے یہ صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ تاوان جنگ کی تخفیف بہر حالت میں ایک ضروری شرط ہے قبل اس کے جرمنی غیر ممالک سے قرضہ کی درخواست کرے اور دوسری طرف فرانس کسی قسم کی تخفیف پر اس وقت تک تیار نہ تھا جب تک کہ امریکہ اور برطانیہ اُس کے قرضہ میں تخفیف نہ کریں گی۔

بہر حال کچھ تو ضرور حاصل ہوا اور فرانس نے وعدہ کیا کہ وہ بعض حالات میں قرضہ جرمنی میں آخری بار ایک معقول رقم کی تخفیف پر غور کرنے کو تیار رہے گی۔ فرانس کے فیصلہ میں سب سے بڑا خیال اپنی باقی مشکلات کا تھا۔ ہم لوگوں نے ہمیشہ اپنے میزانیہ کو تاوان جنگ کے شمار کے بغیر تیار کیا یہ سمجھ کر کہ اگر اس سلسلہ میں کچھ وصول ہوا تو وہ نعمت غیر مترقبہ ہوگی لیکن فرانس نے اپنی دولتمندی کا انحصار جرمنی پر رکھا اور خطرہ میں پڑ گیا، وہ اپنے اخراجات کو اس امید پر بڑھا رہا کہ عنقریب "مرہائن" اُس پار سے بہت بڑی دولت اس کے خزانوں میں ڈھلنے والی ہے۔

سنہ ۱۹۲۳ء میں فرانس کے اخراجات قریب قریب ....۰۰۰ پونڈ تھے اور اسی قدر اس کی

آمدنی بھی تھی۔ بجٹ ۱۹۲۲ء کے لیے اخراجات کا تخمینہ ۴۴۰،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ ہے اور آمدنی کا کل تخمینہ ۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ کیا گیا ہے۔ اس طرح ۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ کی کمی واقع ہوئی ہے۔ سال رواں میں بھی غالباً اسی قدر کمی واقع ہو۔ لیکن اگر یہی ایک معاملہ ہوتا تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ فرانس اپنے اخراجات ملکی میں رفتہ رفتہ ایک حد تک تخفیف کر کے برطانیہ کی طرح ٹکس میں اضافہ کر دے تو تمام مشکلات حل ہو جائیں اور آمد و خرچ میں توازن قائم رہے۔ لیکن اصل معاملات کچھ اور ہیں جس سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

حکومت فرانس بڑی بڑی رقمیں خرچ کرتی جا رہی ہے جس کا شمار میزانیہ میں کہیں نہیں کیا گیا ہے۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ فرانس نے التوائے جنگ سے ابتک ۰۰۰،۰۰۰،۲۰۰،۱ پونڈ واپس ملنے کی امید میں خرچ کیا ہے۔ اور سرکاری تخمینہ کے مطابق یہ امید کیجاتی ہے کہ اس کو ۰۰۰،۰۰۰،۴۴۰،۲ پونڈ تباہ شدہ علاقوں کی مرمت اور مقتولین جنگ کے معاوضہ کے لئے ادا کرنا پڑیگا۔ علاوہ اس رقم کے جو ہر سال وظائف میں خرچ کی جاتی ہے اور جو آجکل ۴ ملیرڈ یا ۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ کے برابر ہے جس کو اگر اصل کی صورت میں تبدیل کیا جائے تو ۰۰۰،۰۰۰،۶۰۰،۱ پونڈ کے برابر ہوگی۔ یہ رقم صلحنامہ کے مطابق جرمنی سے وصول ہو سکتی ہے اسی لیے فرانسیسی مضمون نگار ہمیشہ اس رقم کو قرضہ جرمنی میں شمار کرتے ہیں۔ غرض اندازہ کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۱۹۲۳ء میں واپس ملجانے والے اخراجات مجموعۃً ۰۰۰،۰۰۰،۴۰،۵ پونڈ ہونگے جبیں اگر ۰۰۰،۰۰۰،۰۰ پونڈ میزانیہ کی کمی بھی شامل کردی جائے تو فرانس کو ۰۰۰،۰۰۰،۶۲۰ پونڈ قرض لینا پڑیگا بشرطیکہ جرمنی سے تاوان جنگ وصول نہ ہوا۔

غرض اجمالی طور پر اس اہم مسئلہ کا یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے کہ فرانس تباہ شدہ علاقوں کی مرمت کے لیے بڑی بڑی رقمیں خرچ کرنے پر مجبور رہے۔ حالانکہ اس کے نزدیک انصافاً یہ بار جرمنی کی گردن پر ہونا چاہیئے تھا۔ جرمنی موجودہ حالات میں اس بار کو اٹھانے کے لیے اپنے کو معذور سمجھتا ہے۔ آسٹریا کی طرح جرمنی کے تباہی و بربادی کے آثار جن کے نتائج کا کسی کو علم

نہیں، فرانس کا اپنے قرضہ کی گرانباری سے معاندہ طرزِ عمل اور اپنے تاریک مالی مستقبل کا روح فرسا خیال، اور اپنے غیر منصفانہ رویہ کا احساس نیز اس پر غصہ اور خفگی باوجود فتحمندی کے اس قدر بے بسی کا عالم ہے، سب صحیح۔ لیکن ہمارے نزدیک باوجود ان تمام واقعات کے فرانس کو اپنے داخلی اخراجات کے بار کو اپنے ہی کاندھوں اٹھانا چاہیے۔

(شفیق الرحمن قدوائی متعلم جامعہ ملیہ)

(ماخوذ از لونڈ ٹیبل)

ہندوستانی تعلیم کا مرکز

ذیل کا مضمون ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے وہ خیالات ہیں جو مسئلہ قومی تعلیم پر ایک مدت کی غور و فکر کے بعد اپنی یونیورسٹی کے متعلق انہوں نے تقریباً پانچ سال قبل ظاہر کیے تھے اور جو بعد میں ایک رسالہ کی شکل میں شایع ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں قومی تعلیم ابھی تک تجربہ کے حدود سے آگے نہیں بڑھی ہے اس لیے ان ضروریات پر بار بار توجہ کرنا ہمارا پہلا فرض ہے جن کی نسبت ڈاکٹر ٹیگور نے سطور ذیل میں اشارہ کیا ہے۔

(۱)

اس مضمون میں میں جس مسئلہ پر بحث کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں تعلیم کا نصب العین کیا ہونا چاہیئے؟

ناظرین کو اخیر مضمون تک منتظر رکھنے کی بجائے میں توضیح کرنے سے پیشتر اس سوال کا جواب ابتدا ہی میں مختصر طور پر دے دینا چاہتا ہوں۔ ہر قوم کا فرض ہے کہ دنیا کی روشنی دور کے لئے اپنے حصہ کے طور پر اپنی شمع دماغ روشن رکھے۔ کسی قوم کا چراغ گل ہو جانے کے یہ معنی ہیں کہ ضیافت گاہ عالم میں وہ اپنی جگہ سے محروم کر دی گئی۔ جس کے پاس کوئی روشنی نہیں وہ بدنصیب تو ضرور ہے لیکن بہت ہی بدقسمت ہے وہ قوم جو اسے کبھی رکھنے کے باوجود اب اس سے محروم ہو گئی ہے یا اسے دماغ سے

بالکل محو کر دیا ہے۔

ہندوستان اس بات کا ثبوت دے چکا ہے کہ اس کا اپنا ایک دماغ ہے جس نے مسائل زندگی کو اپنی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہندوستانی تعلیم کے یہ معنی ہیں کہ ہندوستان کے اس دماغ کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ صداقت معلوم کر سکے اور اس کو اپنا بنا سکے اور اس کو اس طرح پر ظاہر کرے کہ صرف وہی اُسے کر سکتا ہے۔

اس غرض کے لیے سب سے پہلے ہندوستان کے دماغ کو ایک نقطہ پر لانا اور آپ اپنا حقیقت شناس بنانا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے اساتذہ سے صحیح معنوں میں تعلیم قبول کر سکتا ہے، اپنے معیار کے مطابق فیصلہ کر سکتا ہے اور اس فیصلہ کو اپنی قوت اجتہاد سے عمل میں لا سکتا ہے۔ تمام انگلیوں کا لینے اور دینے وقت دونوں حالتوں میں متحد رہنا ضروری ہے۔ چنانچہ جس وقت ہم ہندوستان کے منتشر دماغ کو یکجا کر سکیں گے اسی وقت ان میں داد ستد دونوں قوا موجود ہوں گے —— اور روح پرور پانی کا بہکر نکلجانا جس سے نیچے کی زمین خشک رہجائے، بند ہوجائے گا۔

ایک دوسری بات یہ ہے کہ تعلیم کا ایک بڑا اہم جزو یہ ہونا چاہیئے کہ فضا اجتہادی اور اختراعی مشاغل سے معمور رہے اس بنا پر ہماری یونیورسٹی کی ابتدائی غرض علم کا تعمیری کام ہونا چاہیئے۔ اشخاص بہم پہنچانے چاہئیں اور انھیں علمی تحقیق و تفتیش کے لیے پورا موقع دیا جانا چاہئے اور تعلیم دریا کے بہاؤ کی طرح ضروری اور آزادہ رو ہو۔ تعلیم صرف اسی وقت قدرتی اور مفید ہو سکتی ہے جبکہ وہ زندہ اور بڑھتے ہوئے علم کا نتیجہ ہو۔

آخری امر یہ ہے کہ تعلیم کو ہماری زندگی کے معاشی، علمی، روحانی اور معاشرتی ہر پہلو سے مَس ہونا چاہیئے اور ہماری درسگاہوں کو ہماری سوسائٹی کے اندر ہونا چاہیئے تاکہ وہ اتحاد عمل کی زندہ کڑیوں سے وابستہ رہیں۔ کیونکہ حقیقی تعلیم وہ ہے جو ہمیں یہ بتائے کہ ہر قدم پر ہماری تعلیم و تربیت کو ہمارے ماحول سے تعلق ہے۔

(۲)

اس وقت تمام ہندوستان میں موجودہ طرز تعلیم سے ایک عام بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ اس کو بدلنے کے لیے متعدد بار خواہش کی جا چکی ہے۔ ہمارے قومی دماغ میں ایک احساس پیدا ہو چلا ہے جس سے نئی نئی درسگاہیں کھل رہی ہیں اور جدید تجربے عمل میں لائے جا رہے ہیں مگر چونکہ انسان کی خواہش بہت زبردست ہوتی ہے اور وہ اُس کے پورا کرنے میں اس قدر عجلت سے کام لیتا ہے کہ بسا اوقات مقصد کی تعیین میں اس جذبہ کو صحیح طور پر کام میں لانا دشوار ہو جاتا ہے۔

ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کی دماغی نشو و نما اسی موجودہ طریقہ تعلیم کے احاطہ میں ہوئی ہے۔ ہم اس کے ہمہ تن گرویدہ ہو گئے ہیں اور ہمارے دماغ میں یہ خیال جم گیا ہے کہ یہ طریقہ کبھی بدل نہیں سکتا۔ ہمارا تخیل اس احاطہ سے باہر پرواز کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا اور نہ ہم اس سے باہر ہو کر کوئی رائے قایم کر سکتے ہیں۔ ہم میں اس قدر ہمت و دلیری نہیں کہ ہم یہ کہہ سکیں کہ اس کی بجائے کوئی دوسرا طریقہ رائج کیا جائے کیونکہ خود ہماری ذہنی و دماغی زندگی بھی تو اسی طریقہ تعلیم کا نتیجہ ہے جس کی حمایت و توصیف کرنا ہمارے لئے قدرتی امر ہے۔

تاہم اس اطمینان پر بھی ہمارے دل میں ایک کانٹا سا کھٹکتا ہے جو ہمیں چین سے سونے نہیں دیتا۔ جس وقت یہ اندرونی خلش زور کرتی ہے ہم اپنی بے چینی کا کوئی خارجی سبب بتلانے لگتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ہماری تعلیم میں صرف یہ نقص ہے کہ ہمارے کامل قبضہ و اختیار میں نہیں۔ کشتی دریا میں چلنے کے قابل ہے لیکن اس کو تباہی سے بچانے کے لیے پتوار ہمارے ہاتھوں میں ہونا چاہیے۔ ابھی حال میں قومی اسکول اور یونیورسٹیاں قایم کرنے میں صرف اس خیال سے بہت کچھ کوشش کی گئی ہے کہ جس چیز کی ہمیں اشد ضرورت ہے وہ خارجی آزادی ہے۔ ہم یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ ہمارے اخلاق یا حالات کی جس کمزوری نے ہم کو نقل اتارنے پر آمادہ کیا وہی ہمارا پیچھا اُس وقت بھی نہ چھوڑے گی جب ہماری آزادی محض خارجی ہوگی کیونکہ اس وقت ہماری یہی آزادی غیر ملکی تعلیمگاہوں کے نقل اتارنے میں ہوگی اور اس سے گویا مشین سے تیار شدہ بیجان یونیورسٹی بنے گی اور وہ بھی ایسی جو ایک خراب مشین سے تیار ہوئی ہو۔

اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ وہ جماعت جو بازی میں ہار جاتی ہے اپنی شکست کا سبب باہم ایک دوسرے کی غلطی پر محمول کرتی ہے۔ اسی طرح ہمارے اس بیمار طریقۂ تعلیم میں ہم دو فریق یعنی ہمارے انگریزی حکام اور ہم خود ایک دوسرے کی الزام دہی کا وہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ الزام ہم دونوں پر برابر برابر عائد ہو پھر بھی فریق ثانی سے اس کے حصۂ غلطی کے متعلق جھگڑنا میرے نزدیک غیر مفید سا ہے ہمارے لئے جو بات سب سے ضروری ہے وہ اس کا جاننا ہے کہ اس خامی میں جس کے ہم شاکی ہیں ہمارا حصہ کس قدر ہے۔

جن لوگوں کو شدروں کی حالت پر ترس آتا ہے وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کو اس ذلت آمیز حالت میں رکھنے کے ذمہ دار صرف برہمن ہی ہیں لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ یہ کہنا شدروں کے حق میں اس سے زیادہ مفید ہے کہ اس ذلت کے ذمہ دار وہ خود ہیں کہ انہوں نے برہمنوں کو تذلیل و تحقیر کا موقع دیا۔

چنانچہ اس معاملہ میں ہم کو اپنے فریق مخالف کا خیال دل سے نکال دینا چاہیئے۔ ہم کو اپنی کمزوری کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ اس خیال میں دیوانے ہو گئے کہ ہمیں صرف لکڑی کی بدشکل ٹانگوں کی ضرورت ہے صرف اس وجہ سے کہ ہم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ کھڑے ہونے کے لئے ہماری ٹانگیں نہیں ہیں۔ میں نے ایسا ہی واقعہ ایک ایسے بدنصیب شخص کا سنا ہے جو ایک بار دریا کے تھوڑے سے پانی میں ڈوب گیا۔ محض اس سبب سے کہ اس نے یہ سمجھ لیا کہ وہ اپنے ڈوباؤ سے آگے بڑھ گیا ہے۔

جونہی ایک یونیورسٹی کا خیال ہمارے دماغ میں آتا ہے اسی وقت کیمبرج، آکسفرڈ اور دیگر یورپین یونیورسٹیوں کے خیالات سے ہمارا دماغ بھر جاتا ہے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری نجات اسی میں ہے کہ ہر ایک کے عمدہ اجزا چن کر ایک مکمل یونیورسٹی بنائیں ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ یورپین یونیورسٹیاں یورپ کی زندگی کے زندہ اجزا ہیں جہاں پر ہر ایک کی نشو و نما قدرتی طور پر ہوئی ہے موجودہ فن جراحی میں ناک کان یا کوئی اور عضو اگر کٹ جائے تو دوسرے شخص کے چمڑے سے اس کی مرمت ہو سکتی ہے لیکن دوسروں کے متفرق اعضاء کو ملا کر ایک پورا آدمی بنا کر کھڑا کر دینا سائنس کی دسترس سے نہ صرف موجودہ زمانہ میں بلکہ آئندہ بھی باہر رہے گا

یورپین یونیورسٹی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ہمارے نگاہوں کے سامنے آتی ہے یہی سبب ہے

کہ ہمیں اس کے علاوہ اور کسی دوسری یونیورسٹی کا خیال بھی نہیں آتا۔ یہ دیکھ کر کہ میرے ہمسایہ کے ہاں کشا
جوان بیٹا ہے قدرتاً میرے دل میں یہ رشک پیدا ہوتا ہے کہ کاش میرے دل میں بھی ایک بیٹا ہوتا لیکن اگر
حقیقتاً میری یہ آرزو ہے کہ جوان بیٹا فوراً پیدا ہو جائے تو اس عجلت میں میں کسی شخص کو پکڑ لوں گا جو
قد و قامت ویسا ہی رکھتا ہو لیکن وہ میرا لڑکا تو نہ ہوگا بے صبری کے ساتھ نتائج کا انتظار کرنا اور نقل اتارنے
کی کمزوری ان دونوں باتوں نے ہمارے دل میں یہ غیر فطری خواہش پیدا کر دی ہے کہ قومی یونیورسٹی
ابتدا ہی سے خوب آب و تاب کے ساتھ قائم ہو یہی سبب ہے کہ ہماری کوششیں اکثر ضائع جاتی ہیں یا اگر کچھ
ثمرات نکلتے ہیں تو ان کی مثال مٹی کے ان خوبصورت پھلوں کی سی ہے جو جسامت رنگ و روپ اور شکل
و شباہت میں قدرتی پھلوں کی مانند ہے لیکن انہیں کھانا تو ایک طرف، دانت سے کاٹنے کے قابل بھی نہیں۔
یہ یونیورسٹیاں جن سے ہمارے ملک کی توقعات وابستہ ہیں مثل اُن اُبالے ہوئے انڈوں کے ہیں جن سے بچے
نکلنے کی امید کرنا عبث ہے۔

صرف ہمیں نہیں بلکہ یورپین حضرات بھی اس امر کو فراموش کر بیٹھے ہیں کہ ان کی یونیورسٹی کی ترقی ان
کی قومی ترقی کے ساتھ ساتھ ہوئی ہے۔ اور اس کی مادی شان و شوکت ابتدا ہی سے نہ تھی نیز اس شان
و شوکت کو یونیورسٹی کی اصلی روح سے کوئی تعلق نہیں۔ بیشک وہ وقت آگیا ہے۔ جبکہ وہ اس بات کو
بھول جائیں کہ ان کی تعلیمی ترقی کے اصلی باعث خانقاہوں کے وہ غریب راہب تھے اور ایک وہ زمانہ
تھا جبکہ طلبہ بیشتر غربت و افلاس کی زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن جب وہ ان امور کو بھی فراموش کر دیں
گے کہ ہندوستان جیسے غریب ملک میں ہماری یونیورسٹیوں کے مادی ساز و سامان ہماری حیثیت سے زیادہ
نہ ہونے چاہئیں اور اصل جگہ کم کر کے سامان خارجی بڑھا کر ہمارے اسکول اور کالجوں کی تعداد کم سے کم تر
نہ کرنی چاہیئے، تو اسی وقت ہماری قوم کی تباہی لازمی ہے۔

میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ کھانا اور کھانے کے لئے برتن دونوں چیزیں انسان کے لئے ضروری ہیں۔
لیکن جب کھانے کی کمی ہو تو ظروف میں بھی کفایت شعاری کرنی ضروری ہوتی ہے۔ سامان تعلیم کو اتنا
گراں کر دینا کہ حصول تعلیم دشوار ہو جائے ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص منہ پیٹ کے لیے تھیلیاں خریدنے

میں اپنے سارے روپیے صرف کرتے۔

ہم مشرقیوں کو اپنے سارے زندگی کے مسائل آپ حل کرنے ہیں۔ ہم نے حتی الامکان اپنے عام دنیا میں کو ناقابل برداشت نہیں بنا رکھا ہے اور اس کا باعث خود ہمارے ملک کی آب و ہوا ہے۔ ہم کو دیواروں سے زیادہ روزن کی ضرورت ہے۔ ہمارے لباس میں جولا ہے کی کرگہ سے زیادہ ہوا اور روشنی کو دخل ہے آفتاب ہمارے لئے گرمی پیدا کرنے کے وہ سامان خود مہیا کرتا ہے جو دوسرے مقامات میں غذا سے پیدا کئے جاتے ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ افلاس کوئی اچھی چیز ہے لیکن سادگی لوازمات عیش سے کہیں بہتر ہے۔ جس سادگی کی طرف میں اشارہ کرتا ہوں کہ وہ افراط اور فضول خرچی میں کمی کا نام نہیں بلکہ وہ کمال انسانی کی ایک علامت ہے جب بنی نوع انسان میں آجاتی ہے اس وقت تمدن کی تمام خرابیاں دور ہو جاتی ہیں یہ سادگی کا ہی کا فقدان ہے کہ ہماری ضروریات زندگی اس قدر کمیاب اور گراں ہو گئی ہیں۔

متمدن دنیا میں بہت سی چیزوں نے مثلاً کھانا، پینا، عیش و آرام، تعلیم و تہذیب، حکومت و عدالت نے اپنی اپنی مناسب حیثیتوں سے زیادہ اہمیت اختیار کر لی ہے مہذب انسانوں پر اس کا بار ضرورت سے زائد ہے، اور ان کے اُٹھانے میں وہ تدبیر کی بجائے طاقت یا بہ الفاظ دیگر عقل کی بجائے بازو سے کام لیتے ہیں۔ ان کی مثال اس دیو ہیکل کے ہاتھ پاؤں مارنے کی سی ہے جو ابھی اپنے ڈبا ؤ سے نکلا ہے لیکن تیرنا نہیں جانتا۔ وہ اپنی بے سود کوششوں سے تالاب کا تمام پانی گدلا کر رہا ہے لیکن ساتھ ہی اس کے وہ اس خیال سے خالی بھی نہیں کہ اس اظہار زور و قوت میں کچھ تدبیر کی بھی ضرورت ہے۔

مغرب میں جب سادگی آجائے گی اس وقت کاروبار، عیش و آرام، تعلیم و تعلّم سب آسان ہو جائیں گے۔ یہ کب ہوگا؟ اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اسوقت تک ہم کو بزرگوں کو یہ پند و مواعظ سنتے رہنا چاہیئے کہ "اعلی تعلیم سر بہ فلک عظیم الشان عمارتوں ہی میں ہو سکتی ہے"!

یہ کہنا کہ ظاہری ساز و سامان تہذیب کے نتائج ہیں اور ان سے چشم پوشی کرنا غریب ہونا ہے، میں اسے اچھی طرح سمجھتا ہوں اگرچہ یورپ ہمیشہ اس کے لیے کوشاں رہا ہے لیکن اب تک اس نے

اس مقصد زریں کو نہیں پایا پھر ہم اپنی راہ تحصیل میں روڑے کیوں ڈالیں۔ مغرب ہوئے بغیر یہ ایک مسئلہ ہے جسے ہر شخص کو اپنے مذاق طبیعت کے مطابق حل کرنا چاہیئے لیکن جب ہم مغربی تعلیم قبول کرنے کیلئے باہر سے ہمیشہ تیار رہتے ہیں تو مذاق طبیعت کا اپنے پر بجبر پیدا کرنا اور بھی برا ہے۔

ہمارے اساتذہ کے اس رویہ نے شاگردوں کے دماغ پر برا اثر ڈالا ہے اور ظاہری ساز و سامان کی تلاش میں ہم اصل روح سے بیخبر ہو رہے ہیں۔

(۳)

جب بنگال میں قومی مجلس تعلیم (نیشنل کونسل آف ایڈوکیشن) کا سنگ بنیاد رکھا جا رہا تھا اس وقت میں نے اس کے ایک سرگرم کارکن سے پوچھا کہ آیا در اصل تم کو یقین ہے کہ ایک یونیورسٹی کا عظیم الشان درخت مع اپنے شاخ و برگ کے ایک دن کے اندر وجود میں آسکتا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ "اگر ایسا نہ کیا جائے تو ملک کی توجہ مبذول کرنے میں کامیابی نہ ہوگی، لہذا اس کو مکمل صورت میں ابتدا ہی سے پیش کرنا چاہیے" بہر حال یونیورسٹی اسی صورت میں پیش کی گئی، ملک کی توجہ بھی اس جانب منعطف ہوئی قوم نے روپیوں کی تھیلیاں کھول دیں غرض کسی چیز کی کمی نظر نہ آتی تھی بجز ایک "صداقت" کے — وہ "صداقت" جو ادنیٰ شروعات کو حقیر نہیں سمجھتی جو اپنے شاندار مستقبل کو معمولی طریقے پر رہ کر چلنے سے نہیں شرماتی۔ وہ نقلی درخت بار آور ثابت ہونے کی کوشش کے باوجود خشک ہو کر اس قدر کمزور اور بے ثبات نظر آتا ہے اور اس میں اتنے برگ و بار بھی نہیں ہوتے کہ خود کو دھوکا دے سکے نہیں اس بات کو بخوبی ذہن نشین کرلو کہ کسی شخص کے یونیورسٹی کی بنا ڈالدینے اور کسی کے زیر اختیار رکھنے سے وہ اس کی ملک نہیں ہوجاتی۔

اب اس کے بعد یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ ہمارے دماغی بے چینی کا آخر سبب کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ کوئی سو برس ہوتے ہیں کہ ہم انگریزی مدرسے میں داخل ہوئے اور اب تک اس سے نکلنے کے لائق نہ ہوسکے ہم ہمیشہ متعلم کے متعلم ہی رہے ہم نے وہاں جا کر ذہنی پناہ لی جیسے ہم اجودھیا دان میں۔ اور اندیشہ ہے کہ یہ پناہ گیری کہیں دائمی نہ ہوجائے۔

کوئی شخص اب تک یہ نہیں بتا سکا کہ زندگی کیا شے ہے؟ کیونکہ جب اس کی تعریف کرنے کے لئے اس کے اجزاء کی تقسیم کی جاتی ہے تو زندگی ان سے کہیں زیادہ فائق اور بالاتر نظر آتی ہے۔ زندگی جو کچھ پیدا کرتی ہے وہ ان مادی اجزاء سے بلحاظ قدر و قیمت کہیں زیادہ ہے جن سے وہ مرکب ہے۔ زندگی صرف مختلف مواؤں اور اجزاء کے مجموعہ کا نام نہیں ہے جنہیں یہ اپنی غذا کے طور استعمال کرتی ہے اس بنا پر ہمارا دماغ بھی اپنی زندگی کے لحاظ سے اُن معلومات اور تربیت سے جو وہ حاصل کرتا ہے کہیں بڑھ کر۔ حقیقی تعلیم وہی ہے جو دماغ کو ایک زندہ شے تسلیم کرتی ہے اور جس کے ذریعے سے دماغ جتنا حاصل کرتا ہے اس سے زیادہ مقدار و اوصاف دونوں میں پیدا کرنے کے قابل ہو سکے لہذا ہم کو اپنی تعلیم کا فیصلہ اسی معیار پر کرنا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہم نے اس زمانے میں جسقدر حاصل کیا اُس سے زیادہ پیدا کیا ہے یا نہیں اور کوئی ایسی چیز بھی اختراع کی ہے جسے ہم اپنی کہہ سکیں؟ جب کوئی قوم دنیا کے لیے ایک بار ہو جاتی ہے اور اپنے فرائض کا معتدبہ حصہ ادا نہیں کرتی تو یہ اس قوم کو لیے موت سے بھی بدتر ہے کیونکہ اس دوامی الزام میں پستے رہنا انسان کے لئے نہایت ہی ناقابل برداشت مصیبت ہے۔ رہا ہمارے متعلق تو اس بارے میں اپنی یونیورسٹیوں سے جسقدر حاصل کیا اس سے زیادہ دینا تو درکنار ہم نے اس کے برابر بھی ادا نہیں کیا ہے۔ ہم نے بڑے بڑے الفاظ اور فقرے رٹ لیئے عمدہ ضرب الامثال اور اقوال یاد کیے لیکن اس کے بعد ہم کیا ہوئے محرر، یا ڈپٹی کلکٹر، وکیل، یا ڈاکٹر!

ڈاکٹر یا طبیب ہونا کوئی ادنیٰ پیشہ نہیں ہے لیکن ہمارے ڈاکٹر اور اطبا، آجکل ملک کے ہر صوبے و شہر اور قصبہ و قریہ میں طبابت کر رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر بہت مشہور بھی ہیں اور خوب روپیہ پیدا کرتے ہیں لیکن اُنھوں نے اب تک کوئی ایسا نیا مسئلہ یا اصول ایجاد نہیں کیا جس سے فن طبابت میں کچھ بھی اضافہ ہو سکے اسکول کے طالبعلم کی طرح مجرب نسخے جو انہوں نے سیکھے تھے عمل میں لائے لیکن جب متعلم معلم نہ بنے گا تو ہماری مردہ علوم و فنون کو زندہ کرنے کون آسکے گا؟

تاہم میں اسے تسلیم نہیں کر سکتا کہ یہ حالت ہمارے قوائے فطری کی موروثی خامی یا نقص کی بنا پر ہے۔ زمانہ سلف میں ہمارے یہاں فن طبابت بڑے عروج پر تھا تمام ملک میں اس کی مختلف شاخیں پھیلی ہوئی تھیں اس سے کم از کم یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت ہمارے دماغ کو علوم و فنون کے ساتھ ایک زندہ تعلق تھا، اُس وقت ہم صرف طوطے کی طرح رٹ نہیں لیا کرتے تھے بلکہ خود اپنے مشاہدات اور تجربات حاصل کرتے تھے ہم مبادیات و نظریات کی تحقیق و تفتیش کرتے اور انھیں مختلف شعبہائے زندگی میں استعمال کرتے تھے۔

ہماری یہ ذہانت اور جرأت کیا ہوئی؟ ہم علم کا بار گراں کندھوں پر رکھے ہونے کے باوجود اسقدر پھونک پھونک کر او رڈر ڈر کر قدم کیوں رکھ رہے ہیں؟ کیا اس وجہ سے کہ ہم غلام بننے کو لیے پیدا ہوئے تھے۔ اور اس لئے کہ اغیار کے علمی بار تلے ہمیشہ دبے رہیں۔ ؟ نہیں ہرگز نہیں۔ باوجود اس قلت مواقع اور نقائص تعلیم کے جو اجزائے زندگی سے یکسر محروم ہے، سائنس میں سر جگدیش اور سر پرفولا چندر جیسی گراں بہا ہستیاں اور ڈاکٹر سی جیسے لائق اور فاضل شخص پیدا ہوگئے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہماری قوم میں ابھی قوت اجتہاد و اختراع فنا نہیں ہو چکی ہے۔ بلکہ یہ شین جیسے طریقۂ تعلیم اور عدم حوصلہ افزائی کی وجہ سے کچل دی گئی ہے۔

(باقی آئندہ)

سعید انصاری۔ متعلم جامعہ ملیہ

مکتوب جرمنی

(۱)

برلن

۱۹ دسمبر سنہ ۲۲ء

نرخ مبادلہ | آپ لوگ اخبار میں صرف نرخ مبادلہ دیکھکر یہاں کے مصارف کے گھٹنے بڑھنے کا کوئی اندازہ نہ کریں نرخ مبادلہ اور قیمت اجناس میں اگرچہ چولی دامن کا ساتھ ہے لیکن دونوں میں گھٹاؤ بڑھاؤ میں یکساں نسبت نہیں رہتی دوسرے یہ کہ قیمتیں اتنی تیزی کے ساتھ نہیں بڑھتیں جتنا کہ نرخ مبادلہ۔ مثلاً گزشتہ دو ہفتہ کا حال آپ کو سناؤں اوائل دسمبر میں مارک کا نرخ یہاں کم وبیش ۴۰ اور ۴۲ ہزار مارک فی پونڈ تھا یہ صورت یہاں کمیشن تاوان جنگ (REPORATION COMMISSION) کے آنے کے بعد سے برابر بتدریج پیدا ہو رہی تھی۔ لیکن اس کمیشن کے آنے کے ساتھ ہی قیمتیں نہیں بڑھیں دکانداروں نے انتظار کیا، عام مقولہ ہے کہ "تیل دیکھو تیل کی دہار دیکھو" جب مارک برابر گرتا گیا تو دسمبر کے دوسرے ہفتہ میں قیمتیں ایک دم بڑھا دی گئیں اور جب بڑھیں تو دفعتہً دوگنی سہ گنی ہوگئیں۔ دوکانداروں اور کارخانوں نے یہ سمجھکر کہ مارک کا یہ تدریجی تنزل جاری رہے گا اب اپنی نئی قیمتوں کو اس مفروضہ پر مقرر کیا کہ مارک کا نرخ ۵۰، ۶۰ ہزار فی پونڈ ہوگیا ہے قیمتوں میں اس اضافہ کے چند روز بعد ہی اطلاع ملی کہ امریکہ جرمنی کو ایک معتدبہ قرضہ دینے کے لئے تیار ہے اور اس کی گفت وشنید ہو رہی ہے۔ مارک اسی روز ۳۸ ہزار ہوگیا، دوسرے روز ۳۰ ہزار اور آج تو ۲۴ ہزار ہے۔ لیکن کیا دکانداروں نے اپنی قیمتوں میں تخفیف کر دی؟ نہیں دکاندار پھر تیل کی دہار دیکھ رہا ہے۔ اگر مارک کی یہ ترقی جاری رہی تو ضرور تخفیف کرے گا لیکن یہ تخفیف اس نسبت سے نہ ہوگی جس سے مبادلہ میں فرق پڑا ہے آپ جانتے ہوں گے، اجرت کی طرح قیمت بھی جس طرح بڑھنے میں جھجکتی ہے اس سے زیادہ تخفیف میں متردد ہوتی ہے۔ غرض یہ کہ آپ لوگ

پانیر میں نرخ مبادلہ بڑھ کر یہاں کے اخراجات کے گھٹنے بڑھنے پر ذرا جلد حکم نہ لگائیں۔ یہاں کی معاشی کیفیت اس درجہ پیچیدہ ہے کہ چند روز قبل بھی کوئی صحیح اندازہ کرنا بہت مشکل ہے لیکن اس تمام گفتگو کا مقصد یہ نہیں کہ یہاں خرچ زیادہ ہے۔ بہت بڑھنے پر بھی یہاں جتنے مصارف ہیں ان میں یہاں کی سی تعلیم دراصل کوڑیوں کے مول ہے۔ مثلاً سنئے کہ اس گرانی اور مبادلہ کے اُتار چڑھاؤ کا اثر مجھ پر کیا پڑا۔ نومبر میں ہمارے فیملی[1] والوں نے رہنے اور کھانے کے لئے ہم سے ایک پونڈ (۱۵ روپیہ) فی کس وصول کیا تھا۔ گرانی جو ہوئی اور قیمتیں دوگنی سہ گنی ہو گئیں تو اس مہینہ میں دو پونڈ (۳۰ روپیہ) کا مطالبہ ہے۔ لیکن یورپ میں رہنے اور کھانے پر اگر ۳۰ روپیہ ماہوار صرف ہو گئے تو کون بہت ہیں۔ میں یاد کرتا ہوں کہ آتے وقت بمبئی میں ہوٹل والے کو محض قیام کے لیے ۵ روز میں ۱۵ روپیہ دینے پڑے تھے تو کس قدر متعجب ہوتا ہوں۔

خیر یہ تو طویل داستان ہے۔ میں جزئیات میں پڑے بغیر یہاں کے مصارف کے متعلق اپنی رائے بتا دوں تو بہتر ہے۔ میری رائے میں ہر شخص جو یہاں آئے اُسے ۶ پونڈ (۹۰ روپیہ) ماہانہ کا انتظام یقیناً کر لینا چاہیئے۔ بہت ممکن ہے کہ اس سے کم خرچ میں وہ کئی مہینہ یہاں گزارے لیکن تمام زمانہ قیام کو اگر مدنظر رکھا جائے تو اوسط یہی پڑے گا۔ جو اسباب یہاں کی زندگی کو ارزاں بنا رہے ہیں ان کی ذرا سی مخالف رفتار ہی اس کو گراں بھی کر سکتی ہے اور پھر یہ نہایت غیر متوقع طور پر عمل پیرا ہونے لگتے ہیں۔ میں نے ہر شخص کے مصارف کے متعلق یہی مشورہ دیا ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ مشورہ صحیح ہوگا۔ یہاں یہ مصارف ادبی تعلیم کے لئے ہیں صنعتی تعلیم کے لیے آئندہ خط میں لکھوں گا۔

[1] جس خاندان میں آج کل میرا قیام ہے۔

(۲۱)

برلن

۲ جنوری ۱۹۲۳ء

صنعتی تعلیم جرمنی میں صنعت کی تعلیم کے لیے بہترین انتظام یہاں کے ٹکنکل ہائی اسکول میں ہوتا ہے
یہ دراصل یہاں کی صنعتی یونیورسٹیاں ہیں جن میں تقریباً ہر صنعت درجۂ تکمیل تک سکھائی جاتی ہے،
یونیورسٹی میں اول تو اکثر صنعتوں کی تعلیم ہوتی نہیں اور جن کی ہوتی بھی ہے مثلاً انجینیرنگ اس میں
بھی ٹکنکل ہائی اسکول کی سند یونیورسٹی پر ترجیح رکھتی ہے۔

مختلف صنعتوں کے لئے مختلف مدت کا کورس ہے جو دریافت کرنے پر معلوم ہو سکتا ہے۔ البتہ
مجھے دباغی کے متعلق کچھ معلومات اس لئے ہیں کہ ایک حیدرآبادی صاحب اس میں داخلہ کا
انتظام کر رہے تھے انھوں نے یہ بتلایا تھا کہ ٹکنکل ہائی اسکول میں تین سال کا کورس ہے اور ٹکنکل ہائی اسکول
نے ان سے سو پونڈ سالانہ بطور فیس کے طلب کئے ہیں یہاں صنعتی تعلیم کی فیس پونڈ اور ڈالر میں مقرر
ہو گئی ہے اور مقابلۃً بہت گراں ہے، رنگ سازی کے متعلق معلوم کرکے آئندہ کسی خط میں لکھوں گا
داخلہ میں کسی ڈگری کی سخت قید نہیں ہاں ایف اے پاس ہوں تو اچھا ہے آسانی ہوگی۔

یونیورسٹی یہاں یونیورسٹی میں علوم کی صرف ایک ڈگری ہے یعنی پی۔ ایچ۔ ڈی، اس کے لئے یونیورسٹی
میں اوسطاً ۳ سال قیام ضروری ہے، اگرچہ یہاں کی یونیورسٹیوں میں یہ مدت کی قید اس قدر سخت نہیں
جتنی کہ انگلستان میں ہے، اساتذہ کے اختیارات زیادہ ہیں اور ان کی سفارش پر اس مدت میں
تخفیف بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن صرف اس وقت کہ طالب العلم نے اپنے مضمون پر کوئی تصنیف تیار کر
لی ہو اور استاد اس سے مطمئن ہو، امتحان کا قاعدہ یہ ہے کہ ایک خاص مضمون منتخب کرکے
اپنے استاد کی زیر نگرانی اس پر ایک محققانہ تصنیف کرنی پڑتی ہے اس کے علاوہ دو مضمون اور
لینے ہوتے ہیں جن میں سے ایک فلسفہ ہوتا ہے ان دو مضامین کا معیار بہت بلند نہیں ہوتا لیکن
پھر بھی آسان نہیں ہیں۔ تصنیف کے موضوع پر عالمانہ اور محققانہ مطالعہ مطلوب ہوتا ہے۔

اس لیے یہ امید کرنا کہ اس تین سال کی مدت میں تصنیف بآسانی ناممکن ہے غلط ہوگا۔ اکثر تین سال بلکہ اس سے زیادہ ہی زمانہ ڈگری کے لئے درکار ہوگا۔ پھر کم سے کم چھ ماہ زبان سیکھنے کے لیے درکار ہیں تاکہ آدمی لکچر سمجھ سکے، گویا ہر آنیوالے کو ڈھائی چار سال کے لئے یہاں سے پہلے ہی تیاری کرنا چاہیے۔ (د) داخلہ کا معاملہ تو یونیورسٹی میں پہلے بی۔ اے کی قید تھی، امسال ایف اے بھی داخل کر لئے گئے ہیں، جامعہ کا بی اے یا ابتدائی امتحان بشرطیکہ صداقت ناموں میں یہ درج ہو نہ یہ ایف اے کا مرادف ہے داخلہ کے لئے کافی ہوگا۔ بعض حضرات دریافت کرتے ہیں کہ جرمنی زبان کی شرط ہے یا نہیں؟ جناب یہ ہندوستان نہیں جہاں کی تعلیم میں سب شرطیں ہیں سوا ہندوستانی زبان جاننا شرط نہیں! یہاں تمام لکچر جرمن میں ہوتے ہیں، تصنیف "جرمن زبان میں ہوتی ہے" حوالہ کی کتابوں کا تقریباً سارا ذخیرہ جرمن میں ہے۔ پھر جرمن زبان کی شرط نہ ہونا کیا معنی؟

یہ مقام مسرت ہے کہ اب ہندوستانی بھی جرمنی آنے کا خیال کر رہے ہیں، لیکن بس دعا یہ ہے کہ وہ لوگ یہاں آنے کا قصد کریں جن کے خیالات اور ذہن کی نشو و نما اگر مکمل نہیں تو تقریباً مکمل ہو چکی ہو۔ ہر شخص کا یہاں آنا ممکن ہے کہ اس کے لئے واپسی پر کچھ کما لینے کا ذریعہ ہو جائے لیکن قومی اور ملکی حیثیت سے گویا اُن کا ہاتھ سے بالکل نکل جانا ہے۔ میں جس وقت یہ لکھ رہا ہوں تو میری آنکھوں کے سامنے ان کثیر التعداد ہندوستانی نوجوانوں کی شکلیں ہیں جو جرمنی میں صرف اپنا پیسہ اور وقت ہی نہیں برباد کر رہے ہیں بلکہ اپنی حرکتوں سے اپنے اخلاق کو ہمیشہ کے لئے فنا اور اپنے ملک کی آبروریزی کر رہے ہیں۔ اسلئے وہ لوگ جو صرف یہاں کے مصارف کی کمی کے خیال سے آنا چاہتے ہیں وہ بہتر ہے کہ نہ آئیں۔ ہاں جن لوگوں نے اپنے لئے کوئی مقصد سوچ لیا ہے اور اب اسکے حصول میں یہاں کی ارزانی کی وجہ سے سہولت پیدا ہو گئی ہے تو وہ بیشک اس صورت حال سے فائدہ اٹھائیں، میں اپنے پچھلے خط میں یہاں کے مصارف کے متعلق تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔

راستہ راستہ اور ضروریات کے متعلق میرا تجربہ یہ ہے کہ پی۔ او لائن سے نہ آئیں۔ لائیڈ ٹرسٹینو سے یا کولمبو سے جو جہاز ہیمبرگ آتے ہیں اُن سے آئیں، اگر مضبوط آدمی ہیں تو تیسرے درجہ کا سفر کر سکتے ہیں

تکلیف ضرور ہوتی ہے لیکن روپیہ بہت بچتا ہے یعنی تقریباً ۰ ۸ پونڈ جو یہاں سال بھر کے واسطے خرچ کے لئے ممکن ہے کہ کافی ہو جاسے ورنہ چھ مہینہ میں تو شک نہیں سامان بہت نہ لائیں دو سے زیادہ سوٹ کی یہاں کوئی ضرورت نہیں لہذا اچھے مضبوط کپڑے کے بنوں وہیں سلوالیں یا یہاں آکر ایک خریدلیں دو ایک ٹوپی ہی بنوا لائیں، رات کے پہننے کے لئے معمولی چار یا پانچ جوڑے کپڑے لائیں دو چار قمیصیں۔ انہیں بھی کمی کر سکتے ہیں اور یہاں آکر لے سکتے ہیں، پاسپورٹ اور ویزا جرمنی کا پہلے سے حاصل کر لینا چاہئے ورنہ بہت دقت اور پریشانی ہوتی ہے اور بہت ممکن ہے کہ عرصہ تک ادھر اُدھر ٹھوکریں کھانا پڑے۔

مغرب میں مشرقی مبلغ

مولانا صاحب کی تشریف آوری کے متعلق مجھے کوئی اطلاع نہیں ملی اور نہ آپکے یا دیگر مبلغین کے ورود مسعود میں مجھے زیادہ دلچسپی ہے، ہاں یہ خبریں سُنکر دل ہی دل میں کڑھتا ہوں، بھلا جلکے گرد و پیش اور بہت ہی قریب کفر و ضلالت کی کالی سے کالی گھٹائیں چھائی ہوں اور جن کے پیرتلے کی زمین کا ہر ذرہ تعلیم حق کا پیاسا ہو وہ کیوں ہزاروں میل کا سفر کر کے اس مظلوم اور پریشان ملک ہی کو اپنا تختۂ مشق بنانے پر مصر ہیں؟ یہاں کا کفر نہ معلوم ان لوگوں کے لئے کیوں اتنی کشش اپنے اندر رکھتا ہے۔ میں پچھلے دو تین جملے لکھکر سوچنے لگا کہ آپ ان ہی اس نتیجہ پر پہنچینگے کہ اس معاملہ پر میں ایک دُکھے ہوئے دل کی سی آواز دیتا ہوں۔ یہ خیال صحیح ہوگا۔ میں جب ہندوستان سے چلا تھا تو یہ سوچکر چلا تھا کہ بالکل طالب علمانہ زندگی کے چند سال گزار کر اپنے ملک کو واپس آجاؤنگا۔ یہاں آکر میرا یہ خیال اور پختہ ہوگیا۔ یہاں میں نے "مبلغین اسلام" اور مجاہدین فی سبیل اللہ بھی دیکھے اور ملکی معاملات میں سخت سی سخت انقلاب پسند حضرات کو بھی دیکھا لیکن جسے چکھا کڑوا پایا۔ سب اپنی اپنی دال روٹی کی فکر میں ہیں، کوئی تبلیغ کے نام روپیہ وصول کرتا ہے کوئی روس سے ڈگری کی فکر میں ہے کوئی ان سے کیونکر نہیں ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس سی کچھ وصول کرے کوئی کچھ کرتا ہے کوئی کچھ، بیشک خدا کی صفت غفّاری کی قہاری سی زیادہ ہے کہ ان لوگوں کو اپنے نام سے یہ سب کچھ کرنے دیتا ہے۔ تھوڑے دن ہی میں سب حال معلوم ہوگیا، اب میں اطمینان سے اپنے کام میں مصروف ہوں۔ کبھی کبھی فرصت کے وقت اکبر مرحوم کا یہ شعر پڑھ لیتا ہوں ؎

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے ۔ ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر!

رویائے صادقہ

مولوی اقبال احمد صاحب سہیل، ایم اے، ال ال بی، وکیل

شب کہ تھا دل کثرتِ آلامِ دنیا سے فگار
خستگی سے بار بستر ہو رہا تھا جسم زار

فرطِ بیتابی سے آخر ہوگیا پیدا سکوں
کثرتِ فریاد سے چپ لگ گئی انجام کار

کنجِ تنہائی میں آخر مجھکو نیند آہی گئی
بیخودی نے بے حسی کی شکل کر لی اختیار

سوگیا جب میں تو جاگ اٹھے مرے سوئے نصیب
آنکھ لگتے ہی ہوئی روشن نگاہِ انتظار

جیتے جی میں نے وہ دیکھا خواب میں جسکو کبھی
مر کے بھی شاید نہ دیکھے زاہدِ شب زندہ دار

لے گئی مجکو کراچی کی طرف پروازِ شوق
وہ کراچی جس کی شعریت پہ سودیوان نثار

جس کا ہر گوشہ ریاضِ خلد کا پہلو نشین
جس کا ہر ذرہ حریمِ قدس کا آئینہ دار

وہ کراچی جس کا گلشن سنبلستاں در بغل
وہ کراچی جس کا مجلس یوسفستاں در کنار

سبعہ سیارۂ قومی کا دار الابتلا
جاں نثارانِ وطن کا امتحاں گاہِ وقار

جس میں ہیں دو شیرِ حق محبوس زندانِ فرنگ
جلوہ فرما جس میں ہیں سعدین برجِ اقتدار

تا درِ زنداں پہونچکر کیا کہوں جو حال تھا
ہو رہا تھا دل ہجومِ شوق میں بے اختیار

سوئے زنداں پھاڑ کر دامن بڑھا دیوانہ وش
تاکہ ان قدموں پہ جاکر نقدِ جاں کر دوں نثار

بیخودیِ شوق میں ان بیڑیوں کو چوم لوں
حور کا خلخال جن کے حسنِ معنی پر نثار

صورِ محشر سے نہیں کم جن کا شورِ الغیاث
عرشِ اعظم تک پہونچتی رہتی ہے جن کی پکار

دیکھکر میرے جنونِ شوق کی بے تابیاں
حاجبِ زنداں پکارا کون ہے؟ ہاں ہوشیار!

امتحاں گاہِ محبت ہے یہ زندانِ بلا
اس حریمِ فیض میں ملتا نہیں غیروں کو بار

یہ شرف مخصوص ہے اہلِ تقرب کے لئے
خاص ہے منصور و سرمد کے لئے معراجِ دار

عین بیتابی میں جب درباں نے روکا اس طرح
ہوگئیں محرومیِ قسمت پہ آنکھیں اشکبار

چشمِ گریاں کے تصدق! دیدۂ دل کھل گیا — دُھل گیا اشکِ ندامت سے مرے دل کا غبار
ہوگئیں نظارۂ زنداں سے آخر بہرہ ور — میری آنکھیں توڑ کر دیوارِ زنداں کا حصار
دیکھتا کیا ہوں کہ اک گوشہ اسی زنداں کا ہے — جس پہ صدقے ہو رہی ہے باغِ جنت کی بہار
ایک اُطاق دلکشا ہے رشکِ ایوانِ شہی — صدر میں جس کے بچھا ہے ایک تختِ زرنگار ۔
ہو رہی ہے آسماں سے جس پہ بارش نور کی — چار جانب جس کے تھا حفظِ الٰہی کا حصار
مسند آرا اس پہ ہیں دونوں اسیرانِ بلا — جن کے چہروں سے جلالِ خسروی ہے آشکار
جس کو طوقِ آہنی سمجھی تھی چشمِ ظاہری — ہے حقیقت میں وہ ایک فردوس کے پھولوں کا ہار
ہاں مگر سینوں سے اُنکے اُٹھ رہا ہے اک دھواں — جگمگاتے جن میں جگنو کی طرح ہیں کچھ شرار
رقص کرتا جا رہا ہے یہ دھواں سوئے فلک — کوئے لیلےٰ کو چلے جس طرح قیسِ بے قرار
یہ تماشا دیکھکر میں دم بخود سا رہ گیا — اس قدر دلکش تھا یہ نظارۂ آتش بہار
میں بھی جا لپٹا اُسی دودِ فلک پرواز میں — کوئی تنکا جس طرح دوشِ صبا پر ہو سوار
دم زدن میں وہ دھواں القصہ پہنچا تا سپہر — اور پہونچتے ہی کھُلا دروازۂ نیلی حصار
دیکھکر مجکو فرشتوں نے پکارا۔ دور باش! — تو کہاں اے ننگِ ہستی اور کہاں یہ جلوہ زار!
ناگہاں آواز آئی غیب سے آنے بھی دو — نامراد اس در سے پھر سکتا نہیں اُمیدوار!
خود بھی دامن سہی، آخر ہے کس کا ہمرکاب — پھول کے پہلو میں آکر آبرو پاتا ہے خار
گیرودارِ حاجباں سے اس طرح پاکر نجات — میں بڑھا اس دودِ رقصاں کی طرف مستانہ وار
الغرض طے کرکے دم بھر میں حجاباتِ فلک — ساحتِ فردوس میں پہونچا وہ دودِ شعلہ بار
پیشوائی کے لئے تھے یاں ملائک منتظر — محترم مہماں کا ہو جیسے کسی کو انتظار
حوریں کرتی تھیں تصدق اُس پہ گلہائے ارم — اور قدسی کر رہے تھے گوہرِ انجم نثار

آگے آگے دود آہِ مستمنداں محوِ رقص
پیچھے پیچھے قدسی و حور و ملائک کی قطار

اس طرح بابِ اجابت کو چلا اُس کا جلوس
جیسے دار السلطنت میں ہو جلوس شہریار

تا سوادِ لامکاں جس وقت پہونچا یہ دھواں
بزمِ لاہوتی سے آئی اک نسیمِ خوشگوار

اس نسیمِ روح پرور کے اثر سے یہ دھواں
چھا گیا ہر سو فضا میں بن کے ابرِ نوبہار

اور جو تھیں اس آہِ مظلوماں میں کچھ چنگاریاں
مل کے باہم بن گئیں سب ایک برقِ شعلہ بار

دیر تک چھائی رہی یوں ہی وہ رحمت کی گھٹا
گو کبھی تھم تھم کے پڑ جاتی تھی ایک ہلکی پھوار

پھر چلی اک بادِ تند اور جھوم کر برسی گھٹا
اور رہ رہ کر لگی بجلی چمکنے بار بار

دیکھکر یہ برق و باراں کا سماں دل نے کہا
دیکھیں اس آغاز کا ہوتا ہے کیا انجام کار

بارشِ رحمت کا دیکھیں کس پہ ہوتا ہے نزول
کس پہ گرتی ہے یہ بجلی بن کے قہرِ کردگار

کر رہا تھا میں یہی باتیں دلِ بے تاب سے
دفعۃً مجھکو نظر آیا سمرنا کا دیار

دیکھتا کیا ہوں کہ اک ہنگامۂ محشر ہے گرم
آ رہی ہے ہر طرف سے اک صدائے گیر و دار

چار سو سے ہے حصارِ جیشِ ترکی اس طرح
قومِ یوناں کو کہیں ملتی نہیں راہِ فرار

وہ جو بارش ہو رہی تھی آسماں سے نور کی
جس کی ہر اک بوند تھی دراصل دُرِ شاہوار

زینتِ طرّۂ ترکاں ہو رہے ہیں یہ گہر
کر رہا ہے آسماں، گلدستۂ نصرت نثار

بجلیاں یونانیوں پر گر رہی ہیں پے بہ پے
جس سے روشن ہوتی جاتی تھی نگاہِ اعتبار

محوِ نظارہ تھا میں ناگاہ یہ آئی صدا
"ہو گئی صبحِ مسرت سونے والو ہوشیار"

یہ صدا سن کر یکایک میری آنکھیں کھل گئیں،
پھر وہی میں اور وہی ہنگامۂ لیل و نہار

نوائے غم

از رشحات قلم جناب مولانا رضا علی صاحب وحشت

ستم یہ کیا کیا پھر اے دل ناشاد ماں تو نے
کہ چھیڑی عہد ماضی کی غم افزا داستاں تو نے

تری غفلت پرستی نے رکھا محو طرب تجھ کو
سنی گو بارہا بانگ درائے کارواں تو نے

تری تفریح دم بھر کی ترا سرمایۂ عشرت
نہ پایا بے خبر ذوق نشاطِ جاوداں تو نے

سمجھا ہے نفع ضرر بازار ہستی میں
ہوائے سود میں دیکھا فقط روئے زیاں تو نے

تری لائی ہوئی تھی، جو بلا ٹوٹی ترے سر پر
عبث چھیڑا ہے یہ ذکر جفائے آسماں تو نے

کوئی ہمدرد بھی دیکھا؟ کوئی غم خوار بھی پایا؟
سبھوں کو تو سنائی دردوغم کی داستاں تو نے

زبانِ آفرینِ خلق سے کچھ کام بھی نکلا؟
دکھائیں تو زمانے کو بہت نیرنگیاں تو نے

نہ دیکھی کیا کوئی خوبی بہارِ لالہ و گل میں
کہ گلشن سے اڑایا جا کے بس رنگِ خزاں تو نے

مصیبت کیا پڑی تجھ پر کہ گویا دست و پا توڑے
دکھائی سخت کمزوری بوقت امتحاں تو نے

یہی ہوگا کہ آلودہ کریگا خاک اقدس کو
اگر پیدا کیا شوقِ سجودِ آستاں تو نے

ابھرنے کی کوئی صورت نہیں بحر معاصی سے
ڈبویا لا کے مجھکو اے خرد دشمن کہاں تو نے

مجھے تو خود نظر آتا ہی تو اک خاک کا تودہ
گرائی کس پہ برق نالۂ آذر فشاں تو نے

تری فریاد نے کھینچا دل شیخ و برہمن کو
طلسمِ تازہ باندھا وحشت جادو بیاں تو نے

جامعۂ ملیۂ اسلامیہ علیگڈھ

کے

شعبہ تصنیف وتالیف کی شایع کردہ کتابیں

(۱) ازہار العرب - مؤلفہ مولانا سورتی — قیمت غیر مجلد ۸ر

(۲) تاریخ الامت - مصنفہ مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری — قیمت ۰ عمر

(۳) ایضاً (حصہ دوم) — 〃 〃 6

(۴) مبادی معاشیات - از پروفیسر ذاکر حسین خاں صاحب — 〃 〃 عہ

(۵) اخبار الدولتین - از مولانا نیاز فتحپوری — (زیر طبع)

(۶) انتخاب کلام میر - مرتبہ مولوی نور الرحمن بی اے — (〃)

(۷) خطبہ شیخ الہند - (بہ تقریب افتتاح جامعہ) — قیمت ۲ر

(۸) خطبہ مسیح الملک - حکیم اجمل خاں صاحب — 〃 ۲ر

(۹) انتخاب مضامین جوہر - معہ تصویر — 〃 عہر

(۱۰) مجموعہ کلام جوہر - معہ تصویر جس میں بیجاپور جیل کا تازہ کلام بھی شامل ہے — 〃 ۴ر

المشتہر

مہتمم مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڈھ

جامعہ میں صنعتی تعلیم

کے

لئے مندرجہ ذیل شعبے کھلے ہوئے ہیں جن میں طلباء جامعہ خود کام کرتے اور سیکھتے ہیں اور جن کا تیار کردہ مال بہ کثرت باہر بھیجا جاتا ہے۔

۱۔ قفل سازی ۲۔ پارچہ بافی ۳۔ مطبع

شعبہ کے مہتمم سے اوس شعبہ کے سامان اور قیمت کے متعلق گفتگو فرمائیے اور مفصل فہرست طلب کیجئے

المعلن

مہتمم حرفہ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

جامعہ کیلنڈر

مستقل و پائدار چیز ہے خوش نما اور نظر فریب ہونے کے علاوہ عمدہ قومی اشعار کا مجموعہ ہے جو ہر تاریخ کے کارڈ پر لکھے ہوئے ہیں۔
قیمت ۶ر

مطبع ملیہ

ٹائپ اور لیتھو کا کام نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ہوتا ہے نرخ مناسب اور کام قابل اطمینان ہے، بلاک سازی، اور آرٹ پرنٹنگ کا خاص اہتمام ہے۔

منیجر

مطبع ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

مولوی نورالرحمٰن طابع، ناشر، مدیر نے مطبع ملیہ میں طبع کرا کے شعبہ تصنیف و تالیف سے شائع کیا

اللہ اکبر

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

کا

ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ نور الرحمٰن

در مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ طبع شد

قیمت سالانہ للعہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین

جلد ۱ | جمادی الثانی سنہ ۱۳۴۱ھ مطابق فروری سنہ ۱۹۲۳ء | نمبر ۳

شذرات

ہندوستان قومی تعلیم کے مفہوم سے کبھی بھی ناآشنا نہ تھا، بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ ہندوستان میں ہر زمانہ میں تعلیم صحیح قومی اصولوں پر ہوئی ہے، بجز اس عہد تاریک کے جبکہ سیاسی و معاشی دشواریوں اور مختلف معاشرتی مشکلات نے ہر قسم کی قومی خصوصیات کو مٹا دیا ہماری تعلیمی خصوصیات بھی فنا ہو گئیں۔ لیکن گذشتہ ربع صدی سے برابر ملک نے اپنے جادۂ قدیم کی تلاش میں سرگرمی کا اظہار کیا ہے اور اگرچہ ان کوششوں میں خاطر خواہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی لیکن ماہرین تعلیم اس نتیجہ پر ضرور پہنچ گئے کہ موجودہ سرکاری مدارس اور اونکا نصاب قوم میں حقیقی زندگی پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

انہیں ضروریات کا تقاضا تھا کہ گذشتہ سال ملک کے ہر گوشہ سے قومی تعلیم کی صدا اٹھی اور بعض نہایت مخلص محبان وطن نے اپنی زندگی اس عظیم الشان مقصد کے لیے وقف کر دی۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڈھ جس کا افتتاح حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن قدس سرہ کے دست مبارک سے ہوا تھا اور جسکے وجود کی باعث مولانا محمد علی کی ذات گرامی ہے قومی تعلیم کے میدان میں ایک جدید تجربہ ہے لیکن اس حیثیت سے کہ اکثر گذشتہ تجربوں کی مثال جامعہ کے پیش نظر ہے اس تجربہ کو غیر معمولی اہمیت و وقعت حاصل ہے۔ واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ جامعہ کی تعلیمی اسکیم اور بالخصوص ابتدائی منازل کے متعلق

اوسکی تجاویز و نصاب بخصوصیت سے قابل تعریف ہیں۔

ملک میں خودداری، جذبہ وطن پرستی، ایثار و قربانی پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ افراد کو جماعت کے بیجا اثر اور قانون کی ناواجب گرفت سے بچایا جائے، اقتصادی دشواریاں بسا اوقات ذاتی آزادی پر بھی اثر ڈالتی ہیں اور خیالات کو بھی ضروریات کا پابند ہو جانا پڑتا ہے۔ اس اعتبار سے تعلیم کی تکمیل بغیر صنعتی ترقی اور ذرائع آمدنی کی نہایت دشوار ہو جاتی ہے۔ چنانچہ تعلیمی پروگرام کو مکمل نہیں کہا جا سکتا اگر وہ طلبہ کے لئے حرفہ کی تعلیم کا انتظام نہیں کرتا۔ جامعہ نے اس ضرورت کا کافی لحاظ رکھا ہے اور ابتدائی جماعتوں میں حرفہ لازمی مضمون قرار دیا گیا ہے۔

جامعہ کا دوسرا جلسہ تقسیم اسناد ۸ فروری کو منعقد ہوا جسکی روئداد تفصیل کیساتھ اخبارات میں آچکی ہے، خطبۂ صدارت پر بھی معزز جرائد اور ممتاز حضرات نے اظہار رائے کیا ہے۔ حال میں شعبۂ تصنیف و تالیف نے فیصلہ کیا ہے کہ اس خطبہ کا ترجمہ مختلف ہندوستانی زبانوں میں شائع کیا جائے چنانچہ توقع ہے کہ یہ مفید و قابل قدر رسالہ جلد شائع ہو جائے گا۔ اسلئے ضرور نہیں کہ جامعہ اسکو مکمل شائع کرے۔ لیکن اندیشہ ہے کہ داد و تحسین کی بلند آہنگی اور تاریخی و علمی معلومات کی فراوانی کہیں ان اہم مسائل سے ہم کو بے پروانہ بنا دے جن کا ذکر اس خطبہ کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے۔ چنانچہ اس اشاعت میں ہم بجائے اظہار رائے کے خطبۂ صدارت سے بعض اقتباسات پر اکتفا کریں گے جو قومی تعلیم کے نازک و اہم مسئلہ پر قول فیصل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قومی تعلیم کی بحث میں ڈاکٹر رائے نے فرمایا کہ لفظ قومی کا استعمال جہاں تک ممکن ہو احتیاط کے ساتھ کرنا چاہئے۔ مگر بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوتا۔ ہندوؤں کی ایک

با اثر جماعت اسے ویدوں یا کم از کم رامائن و مہابھارت کے شاندار و دلچسپ ہیرے کے مادہ کے مترادف سمجھتی ہے۔ اور مسلمانوں کو یہ لفظ اسلام کے قرون اولیٰ کی یاد دلاتا ہے۔

کسی متوسط درجہ کے تعلیم یافتہ ہندو یا مسلمان سے دریافت کیجئے کہ قومی کے کیا معنی سمجھتے ہو تو جواب میں پریشان خیالات اور بے معنی گفتگو سننا پڑے گی۔ مگر یہ قدامت پرستی، یہ محدود قومیت یہ عہد ماضی کا عشق ہمارے مرض کا علاج نہیں ہماری قومی زندگی کا چشمہ اپنے منبع کو واپس نہیں جا سکتا۔ ہماری ترقی دنیا سے بے تعلقی میں نہیں، بلکہ موجودہ ترقی پذیر دنیا کے ساتھ عملی تعلقات میں مضمر ہے۔ ہم مشرق پر مغرب کے اثر سے انکار نہیں کر سکتے۔ اس حقیقت سے بھی چشم پوشی نہیں کیجا سکتی کہ گذشتہ کئی صدیوں سے یورپ آگے بڑھتا رہا اور ایشیا اپنی جگہ ہی جما کھڑا رہا۔ حکمت خواہ کہیں سے بھی ملے اوسے طلب کرنا شرم کی بات نہیں، حکمت و صداقت حدود کی پابند نہیں ہوتی۔ یہہ تمام اقوام عالم کا مشترک سرمایہ ہے اور جیساکہ میں ابھی بالتفصیل بیان کر چکا ہوں اسلام کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں۔

.... " لفظ قومی کا مفہوم صاف یہ ہونا چاہئے کہ ان تعلیم گاہوں میں جو نصاب پورا کیا جائے اور جو بصیرت حاصل کیجائے وہ ایسی ہو کہ نوجوانان ملک کے دلوں میں قومی عزت نفس کا احساس اور قومی خدمت کی جانب دلی رغبت پیدا کردے۔ ساتھ ہی ایسی تعلیمگاہیں مالی لحاظ سے آپ اپنے پاؤں پر کھڑی ہوں نہ کہ اس غرض کے لئے حکومت کے دست کرم کے محتاج ہوں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ابھی غیر سرکاری ذرائع اتنے کافی موجود ہیں کہ یہ قومی اسکول اور یونیورسٹیاں سرکاری مدارس کی جگہ لے سکتی ہیں۔ یہ تو شاید کبھی بھی ممکن نہ ہوگا۔ لیکن ایسی قومی تعلیمگاہیں جس قدر زیادہ قایم کیجائیں اوسی قدر بہتر ہے۔ ملک کے سامنے یہ علم و حکمت کے ایسے آزاد

مرکز ہوں گے جو ضوابط حکومت کی زنجیروں میں نہیں جکڑی ہوں گی۔"

ڈاکٹر رائے کے خطبۂ صدارت میں ایک ایسی چیز بھی ہاتھ آئی ہے جسکو عرصہ سے ملک ڈھونڈھ رہا تھا اور اخبارات و ماہرین سیاست نے اوسکے متعلق مختلف خیالات قایم کئے تہے۔ لیکن حقیقت پر بہت کم حضرات کو عبور تہا۔ پروہ رالہ میں تو اوسوقت بھی جبکہ سر سنکران نائر نے وزارت محکمہ تعلیم سے استعفادیا اون کے اختلاف و اعتراضات پر گفتگو ہوئی ہوگی لیکن اوسکی اطلاع محرمان اسرار کے علاوہ دوسروں کو کیوں ہونے لگی تھی۔ ڈاکٹر رائے کی صاف گوئی اور حق پرستی کی دلیل ہے کہ انہوں نے اس اہم اطلاع کو جو اون کو کسی خاص ذریعہ سے پہنچی ہوگی عام فائدہ کے خیال سے بالاعلان ظاہر کردیا۔

"حکومت ہند کے معتمد عہدہ دار سر سنکرن نائر سابق وزیر تعلیمات نے لکھا تھا ملاحظہ ہو:—

فیسیں اسقدر بڑہادی گئی ہیں کہ اوس طبقہ کا لحاظ کرکے جو اسکولوں میں تعلیم پاتا ہے حد اعتدال سے بہت متجاوز ہیں۔ جب یہ اعتراض کیا گیا کہ فیس کی اصل رقم بھی غریب طلبہ کے لئے سخت مصیبت کا باعث ہوگی تو جواب ملا کہ ان طلبہ کو ایسی تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ غیر سرکاری مدارس کے منتظمین جو جزناً یا کلاً فیس معاف کردیا کرتے ہیں وہ سرکاری امداد کی تخفیف سے سخت پریشان ہو رہے ہیں۔ بے شبہ ان قواعد کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم کی متوقع عمومیت و وسعت تنگ ہوگئی۔

ثانوی تعلیم کی غیر تشفی بخش ترقی و حالت زار کا اصلی سبب یہ ہی ہے اور چارہ کار ناممکن ہے تاوقتیکہ یا ہم اپنے بچوں کو آپ تعلیم دینے کو تیار نہ ہو جائیں یا غیر سرکاری مدارس کو اتنی وافر امداد نہ دیں کہ وہ قابل معلم مقرر کر سکیں۔ فی الحال ہم ان دونوں

میں سے ایک کے لئے بھی طیار نہیں۔ اس نصب العین کے موافق انگریزی تعلیم صرف خوش حال طبقہ تک محدود رہے گی "

اس امر واقع سے انکار مشکل ہے کہ امور خانہ داری کا انصرام کافی سخت کام ہے۔ مردوں کے دوسرے کام مثلاً مزدوری سے شاید اتنے ہی سخت اور غالباً اس سے کم درجہ پر قرار پائیں۔ حکومت امریکہ نے اس کے متعلق ایک تجربہ کیا ہی جسکی اصل غرض صحیح طور پر یہ دریافت کرنا تھی کہ اون روزمرہ کے کاموں میں جو ہر عورت کو کرنا پڑتے ہیں واقعی کسقدر محنت درکار ہوتی ہے۔ مثلاً بچہ کی پرورش میں کافی محنت و توجہ کی ضرورت ہے۔ سوال یہ ہی کہ اوسکی صحیح مقدار کیا ہے ؟

ماہرین فن نے ایک لکڑی کی گڑیا ایسی طیار کی جو یکسالہ بچہ کے مثل قرار پائے اور اوس کے لئے مندرجہ ذیل کپڑے طیار کئے گئے۔

(۱) ایک قمیض - ۲ - دو پاجامے (ایک بطور بنائین استعمال ہوتا ہے)

(۳) ایک بنی ہوئی صدری۔ ۴۔ موزہ - ۵ - جوتہ۔ ۶۔ ٹوپی۔

ایک عورت نے اس نقلی بچہ کو دو گھنٹہ کے عرصہ میں سات مرتبہ کپڑے پہنائے اور پھر اوتارے۔ اس کام کو کسی خاص عجلت کے ساتھ نہیں بلکہ حتی الوسع بالکل اوسی طرح کیا گیا جیسا کہ معمول ہے جس قدر محنت فی گھنٹہ اس کام میں کرنی پڑے اوسکو کمال صحت کے ساتھ متعین کر لیا گیا۔ اس تجربہ کو اس طرح کیا گیا کہ ایک غسل خانہ کی برابر ایک کمرہ وزنی شیشے کی دیواروں سے بند کیا گیا اور کمرہ کے اندر کی ہوا ٹھیک ٹھیک شدہ آلات سے وزن و پیمایش کرلی گئی۔ ایک نلکی سے آکسیجن ایک مقررہ مقدار میں کمرہ کی ہوا صاف کرنے کے لئے پہنچائی جاتی تھی۔ اب تمام تدابیر کو برقی آلات و دیگر عجیب ایجادات کی مدد سے اس درجہ کمال وصحت کیساتھ انجام دیا گیا کہ جو عورت

اوس وقت معمول کی حیثیت رکھتی تھی اوس کے تنفس کا بھی صحیح تجربہ ممکن ہوگیا۔

بہر حال اصل سوال یہہ دریافت کرنا تھا کہ عورت کے جسم سے کسقدر حرارت لاپید ہوتی ہے اس لیے کہ یہہ ہی وہ صحیح مقدار "محنت" ہے جو انجن کی طرح اوسکو صرف کرنا پڑتی ہے۔ اس طرح یہ معلوم ہوگیا کہ بچہ کے کپڑے بدلنے میں ایک گھنٹے کے محنت میں اس قدر حرارت صرف ہوتی ہو جسقدر کہ برف آب کو ستر دقیقہ مقیاس الحرارت کے پہنچانے میں درکار ہوگی۔

اس تجربہ کے بعد ماہرین فن کا خیال ہے کہ بچوں کو کپڑا پہنانے کا کام ایک حد تک سخت کام تصور کرنا چاہیئے۔ لیکن اون کو یہ بھی اعتراف ہے کہ تجربہ فی الحقیقت مکمل نہ تھا اس لیے کہ لکڑی کا بچہ ساڑھے چار پاونڈ سے کم وزن رکھتا تھا برخلاف اس کے یکسالہ بچہ تقریبًا ۱۵ یا ۱۶ پونڈ وزن رکھتا ہو۔ علاوہ اس کے شاید ان کے خیال میں یہ بھی نہیں آیا کہ جاندار بچہ کپڑے پہننے میں اس درجہ ہاتھ پاؤں چلاتا اور ضدیں کرتا ہے کہ اصل کام کافی دشوار ہو جاتا ہے۔ لہذا ان حرکات کا بھی تجزیہ و تعین ضروری ہے۔ جیسا کہ سائنس داں اور ماہرین فن کا خیال ہو اگر عورت مرد کے مقابلہ میں کم قوت رکھتی ہو تو نتیجہ صاف ہے کہ عورت مرد سے زیادہ کام کرتی ہے۔ بہ اعتبار اوس حرارت کے جو بحیثیت انجن کے اوسکو صرف کرنا پڑتی ہو۔ اس لئے کہ عورت کے کام تو اوسی وقت سے شروع ہو جاتے ہیں جب وہ اپنا بستر استراحت چھوڑتی ہے۔ صبح کو چولہے میں آگ سلگانے سے لیکر اوس وقت تک کہ وہ اپنے بچوں کو سلائے اور خود گھر کی منتشر چیزوں اور سامان کو اون کے مناسب جگہ پر پہنچا کر بند کرے وہ برابر کام ہی کرتی رہتی ہو۔ دوسرے تجربوں سے معلوم ہوتا ہو کہ استری کرنا اور برتن دہونا بھی کافی سخت کام ہیں، لیکن جھاڑو دینا کپڑے دہونا اور زمین لیپنا کہیں زیادہ سخت ہیں۔ برخلاف اس کے ہاتھ سے سینا اور دوسرے

سوئی کے کام جب اسی طرح تجربہ میں آئیں تو معلوم ہوتا ہو کہ بہت بڑے کام ہیں۔

کچھ عرصہ ہوا امریکہ سے ایک انکشافِ جدید کی اطلاع ملی تھی جو اس دورِ ایجاد و اختراع میں بھی بلاشبہ ایک حیرت انگیز اضافہ ہے۔ چونکہ یہ انکشاف بھی لاسلکی تار برقی کے روز افزوں ترقیوں کی ایک نئی مثال ہے اس لئے بیجا نہو گا اگر بعض تازہ تجربوں کا بھی تذکرہ کر دیا جائے۔ گذشتہ سال ٹائمس آف انڈیا بمبئی نے بغیر تار کے ٹیلیفون سے پونا سے خبریں حاصل کرنے میں نمایاں کامیابی دکھائی اور اس کے بعد گورنر بمبئی نے جہاز کے سلسلہ لاسلکی سے متعدد پیغامات حاصل کئے اور دوسرے جہازوں کے بینڈ اور گانے بھی اسی آلہ سے سُنے اور یہ جدید دلچسپ تجربہ کافی کامیاب خیال کیا گیا۔

امریکہ کے ایک اخبار نے اوسی زمانہ میں لکھا تہا کہ "اختلاج اور دوسرے امراض قلب کی تشخیص "لاسلکی تار" کے ذریعہ سے اوس حالت میں بہی ممکن ہے کہ مریض طبی امداد سے کوسوں دور ہو مثلاً بحر اوقیانوس میں۔ اس عجیب و غریب انکشاف کا فخر میجر جنرل جارج اسکوئر۔ افسر اعلیٰ محکمہ لاسلکی امریکہ کو حاصل ہے۔

پارسی علوم اور اسلام

پیشدادیوں، کیانیوں اور ساسانیوں کی حکومت کے افسانے اون کی فتوحات جاہ وجلال، اور عیش وعشرت کے لئے ضرب المثل چلے آتے ہیں۔ جمشید کے جشن اوسکے تخت، جام، آئینہ، انگشتری کی داستانوں نے دربار سلیمانی کی کہانی دلوں سے بھلادی

فسانہا کہ ببازیچہ روزگار سرود   کنوں بسند جمشید وتاج کے بستند

کیانیوں کی طاقت واقتدار اور تہذیب وتمدن پر عام ساسانیوں کے حالات کو قیاس کرکے یہ فیصلہ صادر کردیا جاتا ہے کہ ان کے پاس بھی علوم وفنون کا ایک عظیم الشان ذخیرہ ہوگا، جسے فاتحین مابعد نے غارت کردیا ہوگا۔ چنانچہ اسی وہم پر افراسیاب، اور اسکندر اعظم کے ساتھ فاتحین اسلام پر بھی غارتگری کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ اسی قیاس کی بنیاد پر بعض تذکرہ نویسوں نے پارسی علوم وفنون کی خیالی رفیع الشان عمارتیں کھڑی کرلی ہیں

اس تخیل پروازی میں انگریز مورخین سیاسی اگر بانی نہیں تو شریک غالب کی حیثیت ضرور رکھتے ہیں۔ ان کے اعجاز مسیحی سے صرف ہندوستان کی اسلامی تاریخ نہیں بلکہ تمام تاریخ اسلام کا رنگ روپ کچھ سے کچھ ہوگیا۔ فارسی میں تاریخ ایران پر اگر کوئی سب سے کامل اور مبسوط تالیف ہے تو ایران کے انگریزی سفیر سرجان ملکم کی انگریزی تالیف کا فارسی ترجمہ ہے[1]۔ اس کی زبان سے ذیل کا بیان جو دراصل جدید ایران وعرب میں باہم غلط فہمی ومنافرت کی کوشش کے سوا

---

[1] گورنر بمبئی کے حکم سے میرزا حیرت ایرانی نے ۱۸۶۶ء میں اس کا فارسی ترجمہ کیا تاکہ اتمام کے بعد ایران بھیجا جائے۔ ملاحظہ ہو دیباچہ مترجم۔ مطبوعہ بمبئی ۱۸۷۶ء۔ فافہم

بھی نہیں کوئی تعجب خیز بات نہیں :-

ہریک از مورخین کہ باصدر اسلام معاصر بودہ اند نوشتہ اند کہ متابعین پیغمبر عرب از پائداری و لجاجی کہ ایرانیاں در دفاع ملک و مذہب خویش نمودند چناں در خشم بودند کہ چوں دست یافتند ہر چیز کہ اسباب تقویت ملت و ایشنہ بود مصدمار و ہلاکت ساختند - شہرہا با خاک یکساں و آتشکدہ ہا با آتش سوختہ شد - و موبدانے راکہ مواظب اور دو مباشر خدمات معابد دینی کل بودند از تیغ گزرانیدند - و کتب فضلاے امت اعم از ینکہ علوم مطلق یا تاریخ یا کتب شریعت یا کسانیکہ ایں گونہ کتب در تصرف ایشاں بودہ معرض تلف در آمدند - عرب متعصب در آں ایام بجز قرآں نہ کتابے میدانست نہ میخواست بداند - موبداں را مجوس می نامیدند - ایشاں را ساحرے دانستند و کتب ایشاں را کتب سحرے پنداشتند - و از حال کتب یونان و روم میتواں قیاس کرد کہ کتب ملکتے مثل ایران چہ قدر ازاں طوفاں باقی خواہد ماند؟ [1]

نفس بحث کا اصولی جواب تو آگے چل کر دیا جائیگا - یہاں ناظرین صرف اس قدر ملاحظہ کریں کہ "موبداں را مجوس نامیدند" میں مجوسی آخر کون سی گالی ہی؟ یہ یونانی لفظ میگس سے مشتق ہی جس کے معنی ہیں دانا - اول اول کلدان کے حکیموں اور منجموں کا لقب تھا اس کے بعد مشرق کے حکما، و فیلسوف کے لیے مستعمل ہونے لگا اور قدیم پارسیوں کے پیشواؤں کے لیے ایک تعظیمی خطاب قرار پاگیا - ملکم صاحب کا اسے گالی بنا دینا کس نیت سے ہی محتاج تشریح نہیں

تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی روایتوں کے ضعف اور واقعات رجال و تواریخ کے خلط مبحث کے لیئے محققین میں ضرب المثل ہوگیا ہی - پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی روایات بعد کے تذکرہ نویسوں نے آنکھیں بند کر کے نقل کرلی ہیں - پارسی ادبیات کی غارتگری کا الزام عرب فاتحین پر زیادہ تر مجمل اور غیر معین طور پر لگایا گیا ہی - اگر کسی شخص کے معین نام اور وقت کا حوالہ دیا گیا ہے - تو وہ عبداللہ بن طاہر ہے، جو کوئی بادشاہ نہیں، خود مختار حکمراں نہیں، خلیفہ نہیں، بلکہ خلیفہ المعتصم عباسی کی طرف سے خراسان کا گورنر تھا - اور ۲۴۲ھ

[1] تاریخ ایران سرجان ملکم مطبوعہ بمبئی ۱۸۷۶ء صفحہ ۶۴ و ۶۵

میں وفات پائی۔ دولت شاہ لکھتا ہے۔

"نیز حکایت کنند کہ امیر عبداللہ بن طاہر کہ بروزگار خلفائے عباسی امیر خراسان بود، روزی در نیشاپور نشستہ بود۔ شخصے کتابے آورد و بتحفہ پیش او بنہاد۔ پرسید کہ ایں چہ کتاب است؟ گفت ایں قصۂ وامق و عذرا است و خوب حکایتے است کہ حکما بنام شاہ نوشیرواں جمع کردہ اند۔ امیر فرمود، کہ ما مردم قرآن خوانیم۔ بغیر از قرآن و حدیث پیغمبر چیزے نمی خواہیم ما را ازیں نوع کتابے در کار نیست و ایں کتاب تالیف مغان است و پیش ما مردود است فرمود تا آں کتاب را در آب انداختند و حکم کرد کہ در قلمرو من ہر جا کہ از تصانیف عجم و مغاں کتابے باشد جملہ را بسوزانند۔ ازیں جہت تا روزگار آل سامان اشعار عجم را ندیدہ اند و اگر احیاناً نیز شعر گفتہ باشند مدوّن نکردہ اند۔"

رضا قلی خان مجمع الفصحا میں جو ناصر الدین قاچار کے عہد میں ۱۲۸۴ھ میں تصنیف ہوئی اسی روایت کی بنا پر اشعار عجم کے اتلاف کو نہایت دلیری سے عربوں کے ساتھ منسوب کرتا ہے۔

"ظاہر است کہ اشعار قدیم شعرائے عجم بسبب غلبۂ عرب از میاں رفتہ چنانکہ مشہور است کہ تمام کتب و تواریخ عجمیہ عرب سوختند۔۔۔۔۔۔ از کتب قدیم چیزے بر جا نگذاشتند الا قلیلو کہ پنہاں داشتند۔ چوں مردم را قدغن بلیغ نمودند۔ قاعدۂ سخن فارسی و شعر متروک شد"

منشی محمد حسین آزاد مرحوم کی نوحہ خوانی کے لئے اتنی چھیڑ کافی تھی۔ انھوں نے حسب عادت بلا حوالہ و سند عرب فاتحین کی وحشت کا ماتم کیا ہے۔ ان کا توسن خامہ ہوائی میداں میں یوں طراریاں بھرتا ہے:۔

"ریگستان عرب سے ایک آندھی اٹھی اس کے پیچھے گرجتا بادل بجلی چمکاتا تھا۔۔۔۔۔ خلاصہ یہ کہ ساسانی سلطنت کا اقبال شمشیر اسلام کی قربانی ہو گیا۔۔۔۔۔۔ عالیشان آتش خانے ڈھائے گئے۔ دینی و دنیاوی کتابیں ورق ورق اڑیں اور جلکر خاک در خاک

ہوگئیں۔ اسی وقت میں بیرسے پارسی بنانی وہاں سے بھاگے اور جانوں کے ساتھ دیانوں کو بھی بچالائے...... تحقیق کی نگہیں روتی ہیں اوس گئے وقت پر جو کسی طرح نہیں آ سکتا۔
ان خاندبربادوں کے ہاں بھی تاریخ، اخلاق، افسانے، نظم و نثر سب کچھ ہونگے۔ کیا ان کی عبادتوں کا بھی یہی سیدھا سادہ بے تکلف رنگ تھا۔ افسوس افسوس آج اوس عہد کو کہاں سے لائیں اور جو کچھ فنا ہوگیا کیونکر پائیں کہ دوستوں کو دکھائیں اور کچھ فائدہ اٹھائیں۔
آئیے ہم اس بھیانک منظر کو تاریخ کی روشنی میں دیکھ کر فیصلہ کریں آیا اس کی کوئی اصلیت ہے یا محض انشاپردازانہ طلسم بندی۔ اس بحث کی تنقیح کے لیے ہم نے ذیل کے چار مسائل کی تحقیق کی ہے:۔

(۱) قدیم ایرانی تہذیب اور زبان ہمیشہ سے سامی تہذیب و زبان کے زیر اثر رہی ہے خود ایرانی زبان نہایت ناقص تھی اور علوم کی متحمل نہ تھی۔
(۲) اسلام کی فتح ایران کے وقت ایران دولت علم سے تہی دست تھا۔
(۳) پہلوی اور فارسی کے قدیم ترین نمونے اور ان کی کیفیت و کمیت۔
(۴) عربوں نے اہل ایران اور ان کے علم و مذہب کے ساتھ کیا برتاؤ کیا۔؟

(۱)

تہذیب و زبان ایران پر سامی اثر

ایران قدیم نسلاً ہند و یورپ سے خواہ کچھ ہی واسطہ رکھتا ہو مگر اس کی تہذیب و تمدن کا رشتہ ناطہ عہد قبل التاریخ سے دور جدید تک سامی[1] اقوام کے ساتھ رہا ہے۔ بالخصوص علوم و فنون میں تو ہمیشہ اسے سامی دماغ ہی کا منت کش رہنا پڑا ہے۔ حضرت مسیح سے آٹھ سو سال پیشتر سے جب اشوریہ کلدان اور بابل کی تہذیب و تمدن کے نقارے دور دراز ممالک تک گونج رہے تھے، ایران ان کے اثر سے محفوظ نہ رہا۔ اشوری کتبوں سے ہمیں پتہ ملتا ہے کہ آٹھ سال قبل مسیح سے چھ سو سال قبل مسیح تک تقریباً دو صدی ایران

[1] سامی اقوام میں اہل اشور، کلدانی، یہودی، اہل فینشیا، ارامی، عرب، اہل اتھوپیا (شمالی افریقہ) داخل ہیں۔

ملوک ماہ (اہل میڈیا) کے دور میں اہل اشوز کا قبضہ رہا ہے۔ پھر پیشدادی دور میں ایران غلامی کا جوا گندہ سے اوتار کر نہ صرف آزاد ہو گیا بلکہ ۵۳۹ قبل مسیح تک بابل پر قابض ہو گیا۔ اور سلطنت کلدانی اور شام و فلسطین، ان کے وسیع مفتوحات میں داخل ہو گئے۔ لہذا ایران دو صدی تک بحیثیت مفتوح اور شاید اسی قدر یا کم بحیثیت فاتح سامی تہذیب و تمدن سے متاثر ہوتا رہا۔ پروفیسر براون صاحب پارسی قدیم کی تحقیق اور پہلوی کی تحصیل کے لئے سنسکرت کے مقابلے میں عربی و ارامی کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ تاریخ ایران کے ہر دور میں ایران پر سامی اثر بہت زیادہ رہا ہے۔ آخری ساسانی اور اسلامی دور میں عربی اثر، اس سے پیشتر کے ساسانی اور آخری اشکانی دور میں ارامی، اور اس سے پہلے اشوری[۵]

ارامی تحریر قدیم ایرانی کتبے ہمیں صاف بتاتے ہیں کہ ماہ ملکوں اور پیشدادیوں ہی کے عہد سے ارامی زبان اور تحریر، ارامی علاقوں سے باہر بھی تمام دستاویزوں اور سکوں میں مستعمل تھی۔ مشہور مستشرق پروفیسر نولدیکی کا بیان ہے کہ ارامی زبان مشرق میں، وادی فرات پر اور ارمنی اور کروی پہاڑی علاقوں میں، دجلہ کے جنوب و مغرب میں بولی جاتی تھی۔ بلکہ وہ سارا صوبہ جہاں ارساسیس اشکانی اول (۲۵۰ قبل مسیح) اور ساسانی بادشاہوں کا پایہ تخت تھا ارامی ملک کہلاتا تھا۔ اہل ایران عمدہ طرز تحریر سے ناآشنا تھے اس لئے ان کو ارامی تحریر اختیار کر لینے میں قریب قریب ویسی ہی سہولت تھی، جیسی بعد کو فارسی میں عربی رسم خط کے داخل ہونے سے حاصل ہوئی۔

میخی تحریر ایران میں میخی طرز تحریر نشیبی فرات اور دجلہ کے راستے سے پہونچا جہاں بطرز ایک مدت تک جاری رہا۔ ماہ ملکوں (میڈیوں) اور پیشدادیوں کے عہد کی میخی تحریر نہایت ناقص اور متشابہ الاشکال ہے۔ اس کے لغات کی مجموعی تعداد چار سو سے زیادہ نہیں

---

[۵] ملاحظہ ہو لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد نمبر ۱ باب ۲۔

جہاں جہاں اس ناقص تحریریں لکھے دیکھے گئے ہیں او نیز غالبا اسی نقص کی وجہ سے دتیں اور زبانوں میں ترجمے بھی پائے جاتے ہیں، جن میں سے ایک (سامی) زبان ہوتی ہے دوسری کا پتہ اب تک نہیں چلا۔ بعض اوقات وہ دوسری زبان یونانی ہوتی ہے۔ دوسری دقت یہی طرز تحریر میں یہ تھی کہ یہ چٹانوں اور پتلی پتلی اینٹوں پر کھودنے ہی کے لئے موزوں تھی۔ جب باریک چمڑے بجائے کاغذ کے ایجاد ہوئے تو ان پر یہ تحریر آسانی سے لکھی نہ جاسکتی تھی

پہلوی تحریر آخر دارائے اول کے عہد میں پہلوی، یعنی پارتھیا والوں (اشکانیوں) کا طرز تحریر اختیار کیا گیا۔ مگر اس کا استعمال صرف حکومت کے لئے مخصوص تھا۔ اس تخصیص کا نتیجہ بقول پروفیسر ایتھے یہ ہوا کہ: "پارسی زبان سرعت کے ساتھ زوال پذیر ہو گئی۔ اردشیر سوم (متوفی ۳۳۸ قبل مسیح) کے کتبہ سے فارسی زبان ایک نہایت میلے کچیلے بدنما میں لاوارث سی دکھائی دیتی ہے۔ دوسری طرف پارسی کے دوش بدوش ارامی زبان، مدت درازسے تجارتی اور مشترک زبان کی حیثیت سے تمام ملک میں پھیل گئی تھی۔ اور خوب پھول پھل رہی تھی، خصوصاً حکومتِ ایران کے نصف مغرب کے لئے تمام وثیقے، قانون، اور سرکاری دستاویزیں ارامی زبان ہی میں لکھی جاتی تھیں۔ یہاں کے صوبہ دار اور فوجدار عموماً اپنے سکے اسی زبان میں ڈھالتے تھے۔"

پانچ صدیوں کی خاموشی اسکندر کے فتح ایران کے بعد سے تقریباً ساڑھے پانچسو سال تک ہمیں زبان پارسی کی کوئی تحریر نہیں ملتی۔ جھوٹ یا سچ اس فاتح پر بھی یہی الزام چلا آتا ہے کہ اس نے شرفاء و علماء ایران کو قتل کر دیا، شہر مسمار کرائے، تمام کتابوں کو آگ لگا دی۔ اس کے ساتھ ہی موسیٰ بن عیسیٰ الکسروی خدائے نامہ سے ناقل ہے کہ اسکندر نے اپنے مطلب کی کتب نجوم، طب، فلسفہ، زراعت اسکندریہ اٹھوا لے گیا اور یونانی و قبطی زبانوں میں ان کے ترجمے کرائے۔ اس کے بعد ایران علم سے خالی ہو گیا، اور جلوس اردشیر تک تمام عہد ملوک الطوائف یا اشکانی میں ایران میں کوئی ایسا شخص پیدا نہ ہوا جو علم کو زندہ کرتا یا حکمت کی

کوئی بات سمجھ بھی سکتا۔[۵۱]

یونانی تسلط کے زمانہ میں مصنفین یونان نے جو کچھ ہمارے لئے چھوڑا ہے اوس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکندر نے ایرانی مردوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرکے اور ایرانی عورتوں کو اپنے یونانی سپاہیوں، امیروں اور تمام یونانی باشندوں کے تصرف میں دے کر ایران کی قوم کو یونان میں جذب کر لیا تھا۔ یونانی عصمت فروش عورتیں بھی کثرت سے ایران میں پڑی پھرتی تھیں۔[۵۲] اس تبادلہ اور تجاذب نے ایران کی ہستی من حیث القوم باقی نہ رکھی۔ نہ ان کا خون ایرانی رہا تھا۔ نہ ہڈی، نہ دماغ پھر وہ زبان کیونکر خالص ایرانی باقی رہتی جو زمانہ حکمرانی میں ناقص رہی تھی؟

مذہبی کتاب کھو بیٹھے معلوم ہوتا ہے کہ اشونیکے براہ راست اثر کے زائل ہوتے ہی ایران جہل کی تاریکی میں مبتلا ہوگیا۔ اہل مشرق کو مذہب دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز رہا ہے مگر ایرانی اپنی مذہبی کتاب کی حفاظت بھی نہ کرسکے اور بہت جلد اوستھا کی زبان سے ناآشنا ہوگئے۔ محققین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ساری اوستھا زرتشت کا کلام نہیں۔ بعض تو یہاں تک قائل ہیں کہ اوستھا میں ایک لفظ بھی زرتشت کا نہیں۔ یہ تو شاید مبالغہ ہو مگر اتنا مسلّم ہے کہ یہ ایک مصنف یا ایک عہد کا کلام نہیں، بلکہ جرمن مستشرق گیلڈنر کی تحقیق کے مطابق عہد شاپور دوم یعنی ۳۰۹ تا ۳۷۹ء تک اس میں اضافے ہوتے رہے ہیں۔ اس میں صرف ایک مختصر حصہ گاتھا جو کچھ مناجاتوں کا مجموعہ ہے اغلباً زرتشت ہی کا کلام ہے۔ باقی الحاق۔

پروفیسر براؤن اپنی معرکۃ الآرا تاریخ علوم ایران میں اوستھا کی قدامت پر بحث کرتے ہوئے اسی آرین و سامی تعصب کی نسبت ایک حیرت انگیز حقیقت کو منکشف کرتے ہیں۔

---

۵۱ تاریخ سنی ملوک الارض۔ حمزہ اصفہانی مطبوعہ برلن ۱۸۴۴ء صفحات ۱۰۔ ۲۰۔ ۲۲۔

۵۲ ملاحظہ ہو مضمون پروفیسر ایتھے مندرجہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا تحت "پرشیا" و پروفیسر لڈیکی تحت "پہلوی"

ایک دن میں نے موسیو بلیوی سے اوستھا کے تذکرے کے موقع پر سوال کیا کہ حضرت آپ کے فضلا جو اوستھا کی اتنی قدامت کے مدعی ہیں اپنے دعوی پر کوئی دلیل نہیں رکھتے ؟

انھوں نے جواب دیا "ہاں سب سے بڑی اور کافی دلیل سامی اقوام سے اون کی نفرت اور آریہ نژادی پران کا فخر و مباہات ہے۔ یہودیوں کو آریہ نسلوں پر کسی قسم کی اولیت یا فضیلت دینے سے وہ اس قدر کارہ ہیں کہ زرتشت کے چمکانے کو وہ موسی پر خاک ڈالتے ہیں۔ ایک ہاتھ سے وہ صحف بنی اسرائیل کو دباتے دوسرے ہاتھ سے وہ اوستھا کو اُچھالتے ہیں"

اگر یہ صحیح ہے تو نہایت حسرت کا مقام ہے کہ افسوس جذبۂ نسلی جو دنیا میں بے شمار جرائم کا موجب رہ چکا ہے اوس رفیع منزل کو بھی سالم نہ چھوڑ سکے جہاں ان شہوات ۔ دنیہ کو کوئی دخل نہ ہونا تھا۔

ان متعصب نسلی رکھنے والے مسیحی یا لامذہب مصنفوں سے زیادہ قابل تاسف ہمارے وہ مسلمان اہل قلم ہیں جو اپنی نسلی عصبیت کے جوش میں اپنے مذہب کی روایات تاریخی پر داغ تہمت لگانے اور جھوٹے جذبۂ نسلی پر سچی حرمت دینی کو قربان کرنے میں تامل نہیں کرتے فاعتبروا!

الغرض ہمارے پاس ایران کے عہد عتیق کی تنہا یادگار، اوستھا کے اکیس ابواب میں سے صرف ایک باب مناجات (گاتھا) باقی ہے۔ مگر ہم تمام الحاقات مابعد کو بھی اوستھا میں شامل سمجھیں تو جو لٹریچر ہمارے سامنے پیش ہوتا ہے وہ ایک قوم کی دماغی ترقی کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہونا چاہیے۔ افسوس ہے کہ ہم بلکہ اکثر پارسی حضرات بھی اوستھا کو اصل زبان میں نہیں پڑھ سکتے لہذا پروفیسر براون صاحب کی شہادت پر اکتفا کرتے ہیں۔

"تاریخی حیثیت سے یا زرتشت کے عقائد کا مرقع اور قدیم مذہب کی مقدس یادگار ہونے کے لحاظ سے یہ کیسی ہی کارآمد کتاب ہو مگر نہ تو یہ خوشگوار ہے نہ دلکش۔ میں اپنی نسبت تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایک طرف قرآن کو جوں جوں آگے پڑھتا جاتا ہوں

لطف بڑھتا جاتا ہے اور شوق سے اس کا مطالعہ کرتا اور اوس کے مدعا کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں، دوسری طرف اوستھا کا مطالعہ بدمزگی اور تنفس پیدا کرتا ہے اور یہ کیفیت مزید مطالعہ کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ کچھ لوگ تحصیل زبان تحقیق مذاہب، دریافت آثار قدیمہ کی غرض سے اور بعض لوگ الہامی کتاب سمجھکر بھی اسے پڑھ تو لیا کریں گے۔ مگر مجھے تو یقین نہیں کہ اس کا ترجمہ خواہ کیسا ہی دلچسپ کیا جائے معمولی طبیعت کے کتب بین جو کتابیں دلچسپی کے لئے پڑھا کرتے ہیں، شروع سے آخر تک پڑھنے کی زحمت گوارا کریں گے ؟

دور کہاں جایئے خود اوستھا پر ایمان رکھنے والے مجوسی تھوڑے ہی عرصے میں اوستھا کے سمجھنے سے عاجز نظر آنے لگے۔ نظام الملک طوسی سیاست نامہ میں مزدک کی بحث میں فرماتے ہیں :۔ مزدک گفت مرا فرستادہ اند تا دین زردشت تازہ گردانم کہ خلق معنی ژند و اوستا فراموش کردہ اند۔۔۔۔۔۔ موبداں گفتند ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ در ژند و اوستا سخنان است کہ ہر سخن دہ معنی دارد و ہر موبدے و دانائے را در او قولے و تعبیرے ہست[1]

اس کا سبب تاخت اسکندری کے علاوہ زیادہ تر ایرانی طرز تحریر کا نقص اور اہل ایران کی علم سے بے نیازی تھا۔ عہد اسکندری سے حکمت یونان کی جو کچھ روشنی ایران میں پہونچنے لگی تھی وہ بھی بہت جلد حکومت ایران کے زوال کے ساتھ زائل ہوگئی۔

ارامی پہلوی کا خلط ملط بقول پروفیسر ایتھے سنہ ۱۶۴ء تک یونانی تہذیب تمدن کا نشان ایران سے مٹ گیا اور اس کی جگہ پھر ارامی نے لے لی۔ اسی زبان میں سکّے ڈھالے جاتے تھے۔ ساسانی دور تھا اس عہد میں اہل ایران اپنے طویل خواب جہالت سے کچھ بیدار ہوئے۔ پہلے انسان کو مذہب کی فکر ہوتی ہے۔ انھوں نے دیکھا کہ اوستھا سمجھ میں نہیں

[1] صفحہ ۱۶۷ مطبوعہ پیرس ۱۲

آئی تو موبدوں کو ڈھونڈ کر اون سے پہلوی میں اوستھا کا ترجمہ اور شرح لکھوائی جسے ژند کہتے ہیں بقول پروفیسر گیلڈنر ترجمہ اہل زبان سے ان کی ناواقفیت وجہالت کا پتہ دیتا ہے۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ژند بھی اوستھا کی طرح چیستان بن گئی اور شرح ومتن میں کوئی فرق نہ رہا آخر ژند کا ترجمہ جدید پہلوی میں کرنا پڑا۔ جسے پاژند کہتے ہیں۔

جس پہلوی میں ژند لکھی گئی ہے اور جس میں اردشیر کے کتبے پائے جاتے ہیں اس کی ایک عجیب وغریب خصوصیت یہ ہے کہ لکھتے کچھہ ہیں اور پڑھتے کچھ ہیں۔ تحریر میں کثرت سے ارامی الاصل الفاظ ملتے ہیں جو صرف اسم وفعل تک محدود نہیں بلکہ حروف، اسمار اشارہ ضمائر واعداد تک شامل ہیں۔ مگر پڑھنے والے اسے اور طرح پڑھتے تھے۔ مثلاً نقش رستم میں اردشیر بابکان بانیٔ خاندان ساسانی کا یہ کتبہ جو دو قسم کی پہلوی، کلدانی وساسانی ترجمہ سمیت درج ہے۔

"تپکری زنا مزدیسن بگی ارتخشتر ملکان ملکا ایران منوچتری من یزتان - براپاپکی ملکا"

ترجمہ۔ شبیہ اوس مزدا پرست دیوتا اردشیر شاہنشاہ ایران، دیوتاؤں کی روحانی اصل رکھنے والے شاہ پاپک کے بیٹے کی۔

الفاظ خط کشیدہ ارامی ہیں۔ مگر پڑھنے والے "زنا کو آن، ملکان ملکا کو شہنشاہ، من کو از" براکو پور، اور ملکا کو شاہ پڑھا کرتے تھے۔ اسی طرح لحمہ کو نان، بسرہ کو گوشت، لنفس کو خویش وخود، لک کو تو، لنا کو "اما" (ما) ہنا کو "امی" (این) اب کو "پت" (پدر) پڑھتے تھے۔ ابن المقفع پہلوی میں ایسے الفاظ کی تعداد ایک ہزار بتاتا ہے، اور متشابہات کی مثال یوں دی ہے۔

مثال ذم لک ا نہ من ا ز ا دا ن یکتب گوشت کتب بسرا ولیقرا ہ گوشت	مثلاً اگر گوشت لکھنا ہو تو لکھتے تھے بسرا (بون ۰۰۰۰۰) اور پڑھتے تھے گوشت

على هذا المثال ..... واذا اراد
يكتب نان كتب لما ويقرأ نان
على هذا المثال ...... وعلى
هذا كل شئ ارادوا ان يكتبوه[1]

اگر نان لکھنا ہو تو لکھتے تھے لما (یوں لحم
لسیسہ) اور پڑھتے تھے نان۔ غرض
جو کچھ لکھنا ہوتا تھا اسی طرح لکھتے تھے۔

اسی طرز کا نمونہ کسی قدر انگریزی تحریر میں ملسکتا ہے جس میں پونڈ کے لئے l
لکھتے ہیں جو لاطینی لفظ لبرا Libra کا مخفف ہے اور پڑھتے پونڈ ہیں۔ اسیطرح
ڈینا ریس Denarius کا مخفف d ڈ لکھکر پنس پڑھتے ہیں۔ یا مروجہ
اُردو سیاق کو لے لیجئے کہ [illegible] تمام رقوم بلا استثنا عربی
الفاظ کی مخفف صورتیں ہیں مگر پڑھتے اپنی زبان میں ہیں۔ انگریزی اُردو میں تو ایسی مثالیں
بر سبیل استثنا ہیں مگر پہلوی میں ارامی الفاظ کی بھرمار ہے۔

پانچ زبان اور سات رسم خط

ابن المقفع متوفی ۱۳۹ھ ۷۵۶ء جو مجوسی سے مسلمان ہوا
تھا۔ پہلوی کا بہت بڑا عالم تھا اور بہت سی مہتم بالشان کتابیں پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیں۔
ایران کے متعلق علوم وفنون، مذاہب ورسوم، اور تمام معلومات تاریخی وعلمی کے لئے اس شخص کا
کلام سند مانا جاتا ہے۔ اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران میں پانچ مختلف زبانوں اور
سات مختلف رسم خط کا خلط مبحث تھا۔ اور ہر طبقہ کے لئے علیحدہ علیحدہ زبانیں مخصوص تھیں الفہرست
ابن الندیم سے ہم ان کی تفصیل ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

قال عبد الله ابن المقفع لغات الفارسية
الفهلوية والدرية والفارسية والخوزية
والسريانية۔ الفهلوية فمنسوب
الى فهله اسم يقع على خمسة بلدان

عبد اللہ ابن المقفع کا بیان ہے کہ فارسی زبانیں
یہ ہیں۔ پہلوی جو پہلہ کی طرف منسوب ہے اس
نام کا اطلاق پانچ شہروں اصفہان رے ہمدان
ماہ نہاوند اور آذربیجان پر ہوتا ہے۔ دری

[1] الفہرست ابن الندیم مطبوعہ لیپزگ صفحہ ۱۳۔۱۲

وهي اصفهان والري وهمدان و
ماه نهاوند واذربيجان. اما الدرية
فلغة مدن المدائن........ واما
الفارسية فيتكلم بها الموابذة والعلماء
واشباههم وهي لغة اهل فارس
واما الخوزية فبها كان يتكلم الملوك
والاشراف في الخلوة ومواضع اللعب
واللذة ومع الحاشية. واما السريانية
فكان يتكلم بها اهل السواد والمكاتبة
في نوع من اللغة بالسريانى فارسى۔

مداین کے شہروں کی زباں ہے........
فارسی زبان میں موبد اور علماء وغیرہ کے
قبیل کے لوگ کلام کرتے ہیں اور یہ اہل فارس
کی زبان ہے خوزی سلاطین اور رؤسا کی تنہائی
اور عیش و جشن کی زبان ہے۔ سریانی میں غلام
گفتگو کرتے تھے۔

وقال ابن المقفع للفرس سبعة انواع
من الخطوط فمنها كتابة الدين ويسمى
دين دفتريه يكتبون بها الوستاق و
هذا امثالها........ وكتابة
اخرى يقال لها ويش دبيريه وهي
٣٦٥ حرفا يكتبون بها الفراسة
والزجر وخرير الماء وطنين الاذان
واشارات العيون والايماء والغمز و
ماشاكل ذالك ولم نقع لاحد
قلمها ولا في ابناء الفرس من يكتب
بها اليوم........ وكتابة اخرى

ابن المقفع کہتا ہے کہ اہل فارس کے ہاں
سات تحریریں جاری تھیں ایک دینی رسم خط
جس میں اوستا کے تمام حصص لکھے جاتے تھے
اس کا نمونہ یہ ہے...... دوسری کتابت کو
ویش دبیریہ کہتے تھے۔ یہ ۳۶۵ حرفوں پر
مشتمل تھی۔ یہ سحر شعبدہ فال اور رمز و معمّٰی لکھنے
کے لئے مخصوص تھی۔ اس کا نمونہ میری نظر سے
نہیں گذرا۔ تیسری کتابت میں ۲۸ حروف تھے
دستاویزیں اور وثیقے اسی تحریر میں لکھے جاتے
تھے۔ مہروں، کپڑوں، پردوں، فرشوں، سکوں
پر یہی منقوش ہوتی تھی اس کا نمونہ یہ ہے۔.

يقال لها الكستج وهي ثمانية وعشرون
حرفا يكتب بها العهود والمودية
والقطائع وهذه الكتابة كانت
تنقش خواتيمهم الفرس وطرز ثيابهم
وفرشهم وسكة دنانيرهم
ودراهمهم وهذا مثالها
.... وكتابة أخرى يقال
لها نيم كستج وهذا مثالها
.... وكتابة أخرى يقال
لها الشاه دبيريه وكانت ملوك
الأعاجم يتكلمون بها فيما بينهم
دون العوام ويمنع منها سائر أهل
المملكة حذرا من أن يطلع على
أسرار الملوك من ليس بملك ولم
تقع إلينا۔ وكتابة الرسائل على ما جرى
به اللسان وليس فيها نقط ويكتب
لبعضها بلغة السريانية الأولة التي
يتكلم بها أهل بابل ويقع بالفارسية
وعدد حروفها ۳۳ يقال لها
نامه دبيريه وهام دبيريه۔ وهي
لسائر أصناف المملكة خلا الملوك فقط

.... چوتھی کتابت جس میں ۲۸
حروف تھے طب وحکمت کے لئے مخصوص تھی اسکا
نمونہ یہ ہے .... پانچوی کتابت شاہ
دبیریہ بادشاہوں کی گفتگو کے لئے مخصوص
تھی اور تمام رعایائے ملک کے لئے ممنوع تھی
تاکہ بادشاہون کے راز کھلنے نہ پائیں۔ اس
کا نمونہ میری نظر سے نہیں گذرا ....
چھٹی تحریر نامہ دبیریہ کہلاتی تھی۔ یہ بے نقط
تھی۔ اس کے اکثر الفاظ سریانی میں لکھے جاتے
تھے جو اہل بابل کی زبان تھی اور فارسی میں
پڑھے جاتے تھے۔ اس میں ۳۳ حروف تھے۔
یہ رعایا کے لئے عام تھی اور نمونہ یہ ہے ......
ساتویں تحریر راز سہریہ تھی جس میں سلاطین
اپنے راز کی باتین لکھا کرتے تھے اس کے حروف
اور آوازوں کی تعداد ۴۰ ہے ......
ان سات کے علاوہ ان کی ایک اور تحریر تھی
راس سہریہ جس میں منطق اور فلسفہ لکھے جاتی
تھے اور ۲۴ حروف منقوط تھے۔ اسکا نمونہ
میری نظر سے نہیں گذرا۔ (تم کلامہ)
اسی طرح حمزہ اصفہانی کا بیان ہے کہ
مجوس کی تمام کتب تاریخ محرف وغیر صحیح ہیں۔

وعدد امثالها .... وكتابة
اخرى يقال لها راز سهريه كانت
الملوك تكتب بها الاسرار معمن
يريدون من سائر الامم وعدد
حروفها واصواتها اربعون حرفا
لكل واحد من الحروف الاصوات
صورة معروفة .... ولهم
كتابة اخرى يقال لها راس سهريه
يكتب بها المنطق والفلسفة وهي ۲۴
حرفا وفيها نقط ولم تقع الينا [۵۱]

اس لئے کہ وہ ڈیڑھ سو برس کے بعد ایک زبان سے دوسری زبان میں اور ایک خط سے جو اعداد سے مشابہ تھا دوسرے خط (پہلوی) میں نقل کی گئیں۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک کتاب کے ترجمے مختلف نظر آتے ہیں۔ چنانچہ مجھے ایک خدائے نامہ کے آٹھ مختلف ترجمے ملے [۵۲]۔

اس ناقص تحریر کی دشواریاں خود ساسانی عہد میں محسوس ہوئیں۔ اسی لئے ژند کا ترجمہ پاژند کی صورت میں کرنا پڑا۔ اور اسی سبب ایران کے کتبوں میں پہلوی متن کے نیچے کئی کئی ترجمے پائے جاتے ہیں۔ واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل ایران نے فن تحریر (ارامی) سیکھ تو لیا مگر اس طرح کہ ارامی الفاظ کے صرف نقوش اوتار لیتے تھے۔ اور اون کے معنی اپنی زبان میں سیکھ لیتے تھے ان کے مرادف الفاظ اونکی زباں میں ہوتے بھی ہونگے تو اون کو لکھنا نہ آتا تھا۔ اسلئے بجنسہ ارامی الفاظ لکھتے اور پہلوی میں پڑھتے تھے۔ ایسی تحریریں جیسی دو سطر کتبہ بھی بغیر دو تین ترجموں کے پڑھا جانا متیقن نہ سمجھا گیا ہو کسی لٹریچر کی حامل کیونکر ہوسکتی تھی۔ اسکو فنا ہونا تھا اور فنا ہوگئی۔ اسکے مٹانے کے لئے نہ عربوں کی تلوار کی ضرورت تھی نہ عبداللہ بن طاہر کی آتش زنی و غرقابی کی۔

۵۱ الفہرست ایضاً صفحہ (۱۴)
۵۲ سنی ملوک الارض حمزہ اصفہانی مطبوعہ برلن سنہ ۱۸۴۴ء صفحہ ۹۔

جس طور پر انہوں نے ارامی الفاظ پہلوی میں استعمال کئے ہیں اوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان کے صرف و اشتقاق سے ناواقف تھے۔ کیونکہ وہ "تو" ضمیر حاضر مرفوع کے لئے "لک" ضمیر حاضر مجرور لاوزنا" (پہلوی اا) ضمیر متکلم مرفوع کے لئے "لنہ" (عربی لنا) ضمیر متکلم مجرور استعمال کرتے تھے۔ نوشتن یا نبشتن کیلئے وہ **یلتبون** تن لکھتے تھے۔ گویا یکتبون مادّہ ہے جسمیں تن علامت مصدری لگاکر مصدر بنالیا۔ اسی طرح فارسی میں رشتوں کے ناموں میں دَر (پہلوی تر) مشترک پایا۔ جیسے پدر۔ (پہلوی پتر)، برادر (پہلوی براتر)، دختر وغیرہ۔ انھوں نے باپ کیلئے ارامی اَبَ میں بھی تر لگادیا اور ابتر یعنی پدر لکھنے لگے۔[1] علی ہٰذا القیاس بہتیرے ارامی الفاظ کے طریق استعمال سے یہ قدرتی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ ارامی لٹریچر سے جو یونانی علوم کا حامل تھا بالکل کورے تھے۔ فتح اسکندری سے ساڑھے پانسو سال تک کسی ایرانی علمی تحریر کا پتہ یا تہذیب و تمدن کا نشان نہ ملنا اور یہ حیرت انگیز تاریخی سناٹا زیادہ تر ایران کے اس نقص زبان و تحریر ہی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

زبان کا اثر تہذیب و مذہب پر پروفیسر براؤن نے اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے نکتہ سنجی کی ہے:-

"کیانیوں کے سب سے پچھلے کتبوں کے مطالعہ سے ایک عجیب سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا زبان کے زوال کو قوم کے زوال سے کوئی لطیف واسطہ ہے؟ انگریزی زبان کے فاضلوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اینگلو سیکسن (قدیم انگریزی زبان) کا جنگ ہیسٹنگز[2] (سنہ ۱۰۶۶ء) سے پہلے ہی صحیح لکھا جانا موقوف ہو گیا تھا اور نارمن حملہ سے پہلے ہی حالت زوال

---

[1] ملاحظہ ہو مضمون پروفیسر نولدیکی مندرجۂ انسیکلوپیڈیا برٹیانیکا بہ تحت "پہلوی" ۱۲

[2] یہی جنگ ہے جس کے ساتھ پرانی خالص انگریزی قوم پہلے پہل ایک اجنبی قوم کی محکوم ہوئی اور خارجی زبان تمدن، تہذیب، اور تناسل سے متاثر بلکہ مغلوب ہوکر ہر اعتبار سے ایک مخلوط قوم بن گئی۔ ۱۲

ہی تھی۔ قدیم پارسی زبان کا حال بھی یہی تھا۔ چنانچہ کتبوں کے تحریر میں صیغوں تک کی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ زبان کے زوال کے ساتھ مذہب کے بگاڑ کے آثار بھی شروع ہوگئے۔ دارا کے کتبوں میں اہرمن خدائے واحد و قادر مطلق بتایا جاتا ہے مگر بعد کو وہ متھرا (مہر، سورج) اور اناہتہ (ناہید یعنی زہرہ) کے ساتھ جذب ہوگیا۔

(باقی آیندہ)

محمد مسلم ایم اے

فاسفورس

آپ نے کبھی اندھیری رات میں کسی پُرانے قبرستان یا مزبلے سے گذرتے ہوئے دور سے چنگاری اُٹھتی دیکھی ہوگی۔ کوئی اسے راکس کہتا ہے کوئی روحوں کے چلم پینے سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ اگر اسے دیکھ کر ڈر سے بھاگئے تو وہ راکس پیچھا کرتا ہے اور ڈٹ کر کھڑے ہو جائے تو اپنی جگہ پر پڑا رہتا ہے۔ لیکن درحقیقت نہ یہ راکس ہوتا ہے اور نہ حقّہ پینے والی روحیں بلکہ اسے فاسفورس کہتے ہیں۔

یہ ایک لاک کی مانند غیر فلزی مادّہ ہے جو قدرت میں دوسرے عناصر سے مخلوط افراط سے پایا جاتا ہے۔

لفظ فاسفورس یونانی زبان کا لفظ ہے جو فوس (روشنی) اور فیرو (میں رکھتا ہوں) سے مشتق ہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں لفظ فاسفورس دوسرے معادن بیریم اور کیلسیم سلفائڈ کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ کیونکہ اگر ان دونوں مرکبات کو تھوڑی دیر تک روشنی پہنچائی جائے اور اس کے بعد اندھیرے میں رکھے جائیں تو چمکنے لگتے ہیں۔ اسکے بعد یہی نام فاسفورس کے لئے مخصوص ہو گیا۔ کیونکہ اسے بھی جب تھوڑی دیر تک تیز روشنی پہنچا کر اندھیرے میں رکھیں تو چمکتا ہے۔

انکشاف

کہتے ہیں کہ ہیمبرگ (جرمنی) کا ایک کیمیاگر برینڈ نامی ۱۶۶۹ء میں ایک جوہر کی تلاش میں جو ادنیٰ فلزات کو سونا بنادے پیشاب اور ریت کو مخلوط کر کے مقطر کر رہا تھا کہ اتفاقاً اس عمل سے فاسفورس کا انکشاف ہو گیا۔ اسکے بعد معلوم ہوا کہ کسی نے برینڈ کے انکشاف کا راز ڈی کرنفیٹ کے پاس تیس پونڈ میں

دریافت کر دیا ہے۔ بسنہ ۱۶۷۸ء میں جے۔ کنکل نے اس راز کے معلوم ہونے پر یا بذات خود فاسفورس بنایا۔ کچھ عرصہ بعد رابرٹ بوائل نے سنہ ۱۶۸۰ء میں برینڈ کے طریقہ ساخت کی افواہیں سنکر ادنیٰ طریقہ سے کچھ فاسفورس تیار کیا اسکے بعد کئی اور ماہرین علم کیمیا نے اس کے تیار کرنے کی کوششیں کیں۔ چنانچہ سنہ ۱۷۶۹ء میں جی گاہن نے پتہ لگایا کہ فاسفورس ایک مرکب صورت کیلسیم فاسفیٹ میں ہڈیوں میں موجود ہے۔ سنہ ۱۷۷۱ء میں سویڈن کے ایک کیمیاگر مسمیٰ شیل نے ہڈیوں کی راکھ سے فاسفورس نکالنے کا طریقہ معلوم کر کے شائع کیا۔ اسوقت تک فاسفورس ایک نایاب کیمیاوی عنصر خیال کیا جاتا تھا۔

ماخذ فاسفورس قدرت میں خالص کہیں نہیں پایا جاتا۔ کیونکہ یہ ہوا سے بہت جلد جل اٹھتا ہے۔ مگر آکسیجن اور دیگر بہت سی دھاتوں کے ساتھ کیلسیم فاسفیٹ کی مرکب صورت میں پایا جاتا ہے۔ یہی مرکب ہڈیوں میں ۵۸ فیصدی کی مقدار میں موجود ہوتا ہے۔ یہی شے ہڈیوں کو سخت اور مضبوط بناتی ہے۔ ہڈیوں کا فاسفورس چٹانوں سے آتا ہے بہت سی چٹانیں ایسی ہیں جن میں فاسفورس کی کچھ مقدار ہوتی ہے۔ جب کبھی تیز آندھی چلتی ہے تو ان چٹانوں سے ٹکرا کر ان کا بہت سا حصہ اپنے ساتھ اڑا لیجاتی ہے اور راستہ میں بکھیرتی جاتی ہے۔ چنانچہ اس طریقہ سے فاسفورس میدانوں چشموں اور سمندر میں بھی پایا جاتا ہے۔ جس زمین میں کیلسیم فاسفیٹ ہو وہ بہت زرخیز ہوتی ہے۔ جب ایسی زمین میں کاشت کیجائے تو پودے اپنی نشو و نما کے لئے جڑوں کے ذریعے سے فاسفیٹ حاصل کرتے ہیں۔ اور جب حیوانات ان کو کھاتے ہیں تو کچھ فاسفورس ان کی ہڈیوں اور نسوں میں جمع ہو جاتا ہے اور ان کو مضبوط کر دیتا ہے۔ کچھ تحلیل ہو کر پیشاب سے نکلتا ہے اس طرح یہ فاسفیٹ چٹانوں سے کھیتوں میں اور کھیتوں سے نباتات میں اور نباتات سے حیوانات میں پہنچ جاتا ہے۔ کھاد بنکر پھر زمین میں واپس چلا جاتا ہے۔ چنانچہ بھی

دور تسلسل برابر قایم رہتا ہے۔

جب کوئی جانور مرتا ہے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ اب یہ مردار نوع انسان کے لئے بالکل فائدہ مند نہیں۔ یہ مٹی سے بنا تھا۔ اور مٹی میں جا ملا۔ مگر ماہرین علم الکیمیا کے کیمیاوی اکتشافات نے بتا دیا کہ اس مردار کا ڈھانچہ جو از سرتا پا ہڈیوں کا بنا ہوا ہے دنیا کے لئے بہت مفید ہو سکتا ہے اور ہوگا۔ شیل نے جسکا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں ہڈیوں سے فاسفورس نکالکر ثابت کر دیا کہ جانور مرنے کے بعد بھی بنی نوع انسان کو اس سے زیادہ فائدہ پہنچاتا ہے جتنا حالت زندگی میں پہنچاتا تھا۔ جوں جوں سائنس خصوصاً علم کیمیا نے ترقی کی دنیا میں بسنے والوں کو آسانیاں ہوتی گئیں اور ان کی بہت سی چیزیں جو بیکار ضائع جاتی تھیں کام میں آنے لگیں۔

ہڈیوں کی راکھ

جانوروں کی ہڈیوں میں غیر محرق معدنی مادے اور محرق غیر معدنی مادے ہوتے ہیں۔ چربی اور حیوانی مادہ کو دور کرنے کے لئے ہڈیوں کو کسی محلل دوا کلوروفارم یا ایتھر وغیرہ میں تحلیل کیا جاتا ہی جس سے چربی تو تحلیل ہو جاتی ہے اور خشک ہڈیاں باقی رہجاتی ہیں۔ انہیں میں ایک لیسدار مادہ اور کاربن کی آمیزش ہوتی ہی۔ لیسدار مادہ کو دور کرنے کے لئے خشک ہڈیوں کو دباؤ دیکر اُبلتے ہوئے پانی میں گلایا جاتا ہے۔ بقیہ مادہ تقطیر تخریبی سے صاف کیا جاتا ہی۔ جس سے ہڈیوں کا روغن نکل جاتا ہی اور باقی کیلسیم فاسفیٹ اور کاربن کی آمیزش رہجاتی ہے۔ یہ آمیزش شکر کو صاف کرنے اور اسکے رنگ کو دور کرنے میں استعمال کی جاتی ہے۔ اس عمل میں کاربن صرف ہو جاتا ہے اور بقیہ کیلسیم فاسفیٹ کو جسمیں مادۂ محرق ہوتا ہے لوہے کے ظروف میں حرارت پہنچاکر جلایا جاتا ہی۔ اور ہڈیوں کی راکھ جسمیں تقریباً خالص کیلسیم فاسفیٹ رہ جاتا ہے فاسفورس بنانے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔

فاسفورس کی دو قسمیں ہیں (۱) زرد فاسفورس (۲) سُرخ فاسفورس۔ ایک اور قسم کا سیاہ فاسفورس بھی تیار کیا جاتا ہے۔ مگر بعض ماہرین علم کیمیا کا خیال ہے کہ سیاہ فاسفورس کے موجدوں نے اسکے سیاہ رنگ سے دھوکا کھایا ہے۔ دراصل اسکا سیاہ رنگ ان خارجی کثافتوں کی وجہ سے ہے جو اس میں موجود ہوتی ہیں۔

(۱) زرد فاسفورس ایک سفید چمکتا ہوا غیر معدنی عنصر ہے جو ہوا میں رکھنے سے جلنے لگتا ہے اور کچھ دیر تک ہوا میں رکھنے سے تیز روشنی سے جلنے لگتا ہے۔ اس کے جلنے کا درجۂ حرارت اتنا پست ہے کہ جسم کی حرارت سے اسے آگ لگ جاتی ہے۔ اسلئے استعمال کرتے وقت اسے ہاتھ سے نہیں چھوتے اور اسی وجہ سے اسے بوتلوں میں پانی کے ساتھ رکھتے ہیں۔ زرد فاسفورس کے بخارات بہت زہریلے ہوتے ہیں اور وہ خود بھی ایک زہریلی چیز ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص ایک گرام کا دسواں حصہ کھالے تو مرجاتا ہے

(۲) سُرخ فاسفورس زرد فاسفورس سے بنتا ہے۔ اسکو بنانے کے لئے زرد فاسفورس کو لوہے کے ظروف میں گرم کیا جاتا ہے۔ گرم کرتے وقت ظروف کے مُنہ بند رکھتے ہیں تاکہ ہوا اندر نہ داخل ہوسکے۔ سُرخ فاسفورس زرد قسم سے کیمیاوی طور پر کم طاقتور ہوتا ہے۔ اسکی تصدیق یوں ہوتی ہے کہ جب زرد فاسفورس سُرخ میں تبدیل ہوتا ہے تو بہت سی حرارت خارج ہوتی ہے۔ لہذا عام طور پر کہا جاتا ہے کہ سُرخ فاسفورس میں طاقت محصولہ زرد قسم سے کم ہوتی ہے۔ سُرخ قسم کا فاسفورس زرد کی طرح ہوا میں نہیں جلتا جب تک اسکو ۲۶۰ درجے کی حرارت نہ پہنچائی جاوے یہ زرد فاسفورس کی طرح زہریلا نہیں ہوتا۔

خواص فاسفورس کے موجد نے اسکا انکشاف کرکے بنی نوع انسان پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اسکا بیشتر حصہ طبی اغراض کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اس سے بہت سی مقوی دوائیں بنتی ہیں۔ یہ حیوانات کے بچوں کی ہڈیوں کے نشو ونما کے

حیرت انگیز اثر رکھتا ہے - یہ ان میں ایک لیسدار مادہ پیدا کرتا ہے - اور ایک خالص استخوانی مادہ ان میں فراہم کرتا ہے - اس وجہ سے فاسفورس اکثر اعصابی و دماغی ڈھکی امراض کے لئے نہایت مفید ہے - جلدی بیماریوں کو دور کرنے میں بھی استعمال کیا جاتا ہے فاسفورس کا ایک مرکب ہائی پوفاسفائٹ خالص فاسفورس کی طرح عمل کرتا ہے اور کوئی تکلیف نہیں دیتا - اسوجہ سے ڈاکٹر اس کو پھیپھڑے کے امراض میں استعمال کیا کرتے ہیں -

سُرخ فاسفورس کا بہت بڑا حصہ دیا سلائی کی صنعت میں صرف ہوتا ہے مشہور عالم سیفٹی ماچز (سیاہ سرے والی سلائیاں) اسی سے تیار کی جاتی ہیں - اگر ہم یہ کہیں تو بیجا نہ ہوگا کہ فاسفورس کے موجد نے اس کی ایجاد سے لوگوں کا بہت سا قیمتی وقت اور محنت جو فضول پتھروں اور دھاتوں سے آگ پیدا کرنے میں صرف ہوتی تھی بچائی ہے - زرد فاسفورس چوہوں کے مارنے کے لئے بہت کارآمد زہر کا کام بھی دیتا ہے -

علی احمد متعلم جامعہ ملیہ

ہندوستانی تعلیم کا مرکز

نمبر ۲

(بسلسلہ گزشتہ)

(۴)

شعلہ کی طرح ہر متحرک چیز کی دو صورتیں ہوا کرتی ہیں، ایک چھوٹی اور دوسری بڑی۔ چھوٹی شکل کو ہم آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں، چھو سکتے ہیں۔ لیکن دوسری شکل کے حدود کوئی متعین نہیں ہوتے بلکہ وہ چھوٹی شکل کے اردگرد پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ اسی طرح جب ہم کسی غیر ملکی یونیورسٹی کو دیکھتے ہیں تو ہم کو صرف اسکی چھوٹی شکل یعنی اسکی عمارت اور ساز و سامان اس کے قواعد و ضوابط اور دستور العمل نظر آتے ہیں۔ اسکی (بڑی) صورت ہمارے سامنے نہیں ہوتی۔ لیکن جس طرح ناریل کا گودا کھوپرے کے اندرونی تہ میں ہر چہار طرف پھیلا ہوتا ہے اسی طرح یورپ کی یونیورسٹیاں وہاں کی سوسائٹی، پارلیمنٹ لٹریچر غرض معاشرتی زندگی کے ہر شعبہ میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ وہ نہ صرف اپنے خیالات کو کتابوں کے ذریعہ ظاہر کرتے ہیں بلکہ ان کے زندہ اشخاص ان خیالات کا مقابلہ و موازنہ کرتے ہیں ان کے استاد و شاگرد دونو ایک مشترک رشتۂ دماغی سے منسلک ہوتے ہیں غرض ان کی تعلیم اپنا ایک مستقل ظرف رکھتی ہے جو ان کا دماغ ہوتا ہے، اسکی ایک خاص آمد ہوتی ہے جو ان کی تعلیم و تربیت کا چشمۂ جاریہ ہے، اس سے آبپاشی کے لئے ایک مستقل منبع ہوتا ہے جو ان کی معاشرتی زندگی ہے۔ ان کے دماغ، زندگی اور تعلیم و تمدن کے اس زندہ اتحاد ثلاثہ نے انھیں اس قابل کیا کہ انہوں نے ہر ملک اور ہر زمانہ سے اچھی اچھی باتیں چن لی ہیں اور ان کو اپنی تعلیم و تربیت کا جو ان کے تمدن کی سنگ بنیاد ہے

ایک جزو ضروری بنالیا ہے۔
بخلاف اس کے جن لوگوں کو آجکل کے ہمارے ہندوستانی طلبار کی طرح کتابوں کا سہارا اپنی دماغی ترقی ونمو کیلئے نہیں بلکہ دنیوی فائدہ کی غرض سے لینا پڑتا ہے ان کا مصنوعی غذا پر پرورش یافتہ بچے کیطرح دماغی حیثیت سے بے حس وحرکت ہونا لازمی امر ہے۔ ان کی دماغی نمو رک جاتی ہی کیونکہ وہ ان خیالات کا احاطہ اور عمل جن کے سیکھنے پر وہ مجبور کئے جاتے ہیں نہیں سمجھتے اور اس طرح سے وہ ان تمام خیالات کے تاریخی مفہوم سے محروم ہوتے ہیں اور ان کی اصلی ترقی کے راز سے ناواقف - وہ الفاظ کی سیاہ وسفید لکیروں میں بھولجاتے ہیں۔ وہ نہ صرف غیر ملکی تعلیم وتربیت حاصل کرتے ہیں بلکہ ان کا معیار بھی اپنا نہیں ہوتا۔ یہی نہیں کہ رو یہ ان کا نہیں ہے بلکہ جیب بھی ان کی نہیں۔ ان کے تعلیم کی مثال اس گاڑی کی سی ہی جو انہیں سوار کرنے کی بجائے اپنے پیچھے پیچھے گھسیٹے لئے جاتی ہے۔ یہ منظر نہایت ہی افسوسناک بلکہ بسا اوقات مضحکہ انگیز ہوتا ہے۔
یورپ کی موجودہ تعلیم وتہذیب ہمارے سامنے ہمارے شاستروں کی طرح ایک مخصوص متعین صورت میں آتی ہے، جن پر کسی تنقید ورد وتبصرہ کی ضرورت نہیں صرف اس لئے کہ وہ کتب آسمانی تسلیم کرلی گئی ہیں۔
یہی سبب ہے کہ ہم حق وصداقت کی اصلی خصوصیت کو بھولجاتے ہیں۔ ملکہ وکٹوریہ کی ابتدائے حکومت سے لیکر اسکے عہد وسطیٰ تک اور پھر اسکے بعد تک کا زمانہ انگریزی دماغ کے عروج وترقی کا زمانہ تھا۔ اس عرصہ میں یہ ترقی کے مختلف منازل سے گزرتا رہا ہے مگر ہم جو ہر بات میں انگریزوں سے درس لیتے ہیں، کسی ایک حالت کو متعین طور پر اختیار کرسکتے ہیں۔ اپنے استاد کی حرکت دماغی کے ساتھ ساتھ چلنے سے تو ہم قدرتاً قاصر ہیں بلکہ اکثر ہم ایسا کرتے ہیں کہ ایک حالت سے کود کر دوسری حالت میں چلے جاتے ہیں اور زندگی کی اصل حقیقت کو نظرانداز کردیتے ہیں۔ ہم اپنے عقائد وخیالات کو منتہم اور ان کی افادیت

یا لارڈ اور رسکن کی ذہانت یا چسٹرٹن اور برنرڈ شاہ کے سموں تک محدود رکھتے ہیں لیکن ان کے خیالات اور افعال تعلیم میں جو لازمی تعلقات ہوتے ہیں ہم انہیں یکلخت فراموش کر دیتے ہیں۔ ہمیں اشتباہ پر ناز ہے کہ ہماری تعلیم زمانۂ حال کے مناسب ہے لیکن ہم اس امر کو بھول جاتے ہیں کہ ہر تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو زمانۂ حال سے آئندہ کی جانب لے چلے؛

(۵)

روح کی آمد و رفت صرف ذی روح اشیاء میں ہو سکتی ہے۔ تعلیم و تربیت جو روح و دماغ ہے، انسان ہی کے ذریعہ انسان کو دی جا سکتی ہے۔ کتاب کا رٹ لینا۔ یا درسی تعلیم ہم کو حقیقی ماہر علم نہیں بنا سکتی ہے۔ کتابیں علوم و فنون کا خزانہ ہوتی ہیں جو اس قواعد کے ماتحت جمع کیا ہوتا ہے۔ تعلیم و تربیت سے روح کی ترقی اور نمو ہوتی ہے۔ مغربی یونیورسٹیوں کے طلباء کی تعلیم و تربیت نہ صرف ان کی سوسائٹی ہوتی ہے بلکہ وہ براہ راست اپنے اساتذہ سے حاصل کرتے ہیں۔ خود ان کا آفتاب انہیں روشنی پہنچاتا ہے اور یہ آفتاب استاد و شاگرد کے درمیان اچھے تعلقات کا ہے۔ برعکس اسکے ہمارے پاس چقماق پتھر ہیں جن سے بڑی محنت و جانفشانی کے بعد کبھی کبھی چنگاریاں نکل پڑتی ہیں، پھر بھی روشنی سے کہیں زیادہ تو شور پیدا ہوتا ہے۔ یہ چقماق پتھر کیا ہیں؟ کتابوں کے ملخصات اور ٹھوس قواعد۔

ہماری بدنصیبی اس سے بڑھکر اور کیا ہوگی کہ مغربی یونیورسٹی کے تمام سامان تو ہمارے ملک میں موجود ہیں لیکن اگر کوئی چیز نہیں ہے تو وہ لائق اساتذہ۔ ان کے بجائے ہمارے یہاں کتابی غذا کے داروغہ ہوتے ہیں جن کے ذریعہ دکان کے کاغذی دیوتا آواز دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے طلباء کو ہندوستانی پروفیسروں سے بھی کوئی حقیقی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ اساتذہ دماغی خوراک کو نہایت احتیاط کے ساتھ، دور سے تقسیم کرتے ہیں اور طلباء کے اور اپنے درمیان ملخصات ( ) کی ایک دیوار سی کھڑی کر دیتے ہیں

اس قسم کی غذا نہ تو خوش مزہ ہوتی ہے اور نہ اس سے کوئی قوت پہنچتی ہے۔ یہ گویا زمانہ قحط کی بنی تلی خوراک ہوتی ہے جسکا مقصد کوئی جسمانی فربہی نہیں بلکہ صرف موت سے بچانا ہوتا ہے۔ اس طرز سے اوس تعلیم و تربیت کی امید رکھنی جو انسانی ضروریات سے بالاتر ہو، عبث ہے۔

تا وقتیکہ ہم یہ نہ ثابت کردیں کہ دنیا کو ہماری ضرورت ہے اور ہمارے بغیر وہ نہیں چل سکتی ہے اور جبتک کہ ہم نہ بتادیں کہ ہم دنیا کی تعلیم و تربیت کے بھکاری نہیں، اسوقت تک غیار کے احسانات کے دست نگر ہم ہمیشہ رہیں گے۔ یہ احسانات کبھی تو ہم گریہ وزاری سے، کبھی چاپلوسی کرکے اور کبھی کسی خدمت کے عوض غرض مختلف خوشامدانہ طریقوں سے حاصل کرتے ہیں۔

اگر ہمارے پاس کوئی ایسا عطیہ نہیں جو دوسروں کی نظروں میں قابل قبول ہو تو کسی کو ہماری امداد و اعانت کی کیا پڑی۔ لیکن ہم اسکا الزام کسکو دیں؟ ایسے اشخاص کے لئے جو صرف زندہ رہیں اور پیدا نہ کریں، دنیا میں کہاں جگہ ہے؟ یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ اگر ہم کو کچھ دیا بھی جائے تو ہم اسے باقی رکھ نہیں سکتے۔ ریگستان میں نہیں بلکہ یہ صلاحیت جھیل میں ہے کہ آسمانی عطیہ کو قبول کرے اور اسے باقی رکھے۔ ظرف کی کشادگی کی وجہ سے اسکی آمد و خرچ میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ قاعدہ یہ ہے کہ جسکے پاس کچھ ہے اسیکو دیا جائیگا ورنہ عطیہ اور پانے والے دونوں کی توہین ہوگی۔

لیکن ہم گدائی کے ٹکڑوں پر زندگی بسر کرنے کے ایسے عادی ہیں کہ ہم کو اس حقیقت پر یقین نہیں آتا۔ حقیقی تعلیم حاصل کرنے میں ہم کو ہمیشہ اس قسم کے کھٹکے لگے رہتے ہیں کہ مبادا ہم دنیوی منافع سے ہاتھ دھو بیٹھیں، ہماری محرری کی تیاری میں کہیں تاخیر نہ ہوجائے۔ ایسا نہو کہ ہماری عرضی میں انگریزی قواعد کی غلطیاں رہجائیں۔ تعلیم کو ہمارے ساتھ وہی نسبت ہے جو ایک گاڑی کو گھوڑے کے ساتھ ہوتی ہے اور گھوڑے کو اسکی خدمت کے صلہ میں مالک کی طرف سے کھانے اور رہنے کو ملجاتا ہے۔ لیکن گھوڑے کو گاڑی کے ساتھ وہ آزادانہ تعلق

نہیں ہی جو اسکے آقا کو ہے۔

(۶)

بہتر ہے اگر میں اس موقع پر ایک تاریخی واقعہ بیان کردوں جس سے یہ ظاہر ہو جائےگا
کہ کس طرح ایک یونیورسٹی جو قومی سرزمین پر پیدا ہوئی اور دیسی چولی چلی، چل سکتی ہے
اور ایک مختلف تاریخ کا مضر اثر اس پر کس طرح پڑتا ہے۔

یورپ کے عہد ظلمت، میں جبکہ غیر متمدن قوموں کے حملے سے مشعل رومہ بجھ چکی تھی
تمام مغربی ممالک میں صرف ایک آئرلینڈ تھا جہاں تعلیم و تہذیب کا بازار گرم تھا۔
یورپ کے تمام دیگر حصوں سے طلبا بغرض تعلیم یہاں آتے تھے۔ ہمارے سنسکرت
پاٹھ شالاؤں کی طرح طلبا کے قیام و طعام اور تعلیم و کتب کے لئے کچھ نہ دینا پڑتا تھا۔
راہبان آئرلینڈ نے مذہب عیسوی اور تعلیم و تہذیب کی شمع کو تمام یورپ میں روشن کر رکھا
تھا۔ شارلیمین نے آئرلینڈ ہی کے ایک عالم کلیمنس کی مدد سے پیرس کی یونیورسٹی قایم کی۔
اور بھی بہت سے واقعات ہیں جن سے آئرلینڈ کی تعلیم و تہذیب کا عروج ظاہر ہوتا ہے۔
اگرچہ اس کا اصل مرکز رومہ میں تھا تاہم وہاں سے ایک عرصۂ دراز کی علیحدگی کی وجہ سے
آئرلینڈ کے لوگوں کے دماغ اور بود و باش کا اس تعلیم و تہذیب پر ایک نیا رنگ چڑھ گیا تھا
اور اس میں ایک ایسی روح پیدا ہوگئی تھی جو اپنی خصوصیات کے اعتبار سے یگانہ و بےمثل
تھی علاوہ اسکے ذریعہ تعلیم بھی ان کی مادری زبان تھی۔

جب ڈنمارک اور انگلستان نے آئرلینڈ پر حملہ کیا تو انھوں نے اس سلسلہ میں
اسکے کالجوں میں آگ لگادی، کتبخانوں کو تباہ و برباد کرڈالا، رہبان اور طلبا کو یا تو جان
سے مارڈالا یا منتشر کردیا۔ لیکن باوجود اس تباہی و بربادی کے ملک کے ان حصوں میں
جو خود مختار تھے اور ان آفات سے بچ رہے تھے، تعلیم کا کام ان کی مادری زبان میں
جاری رہا تاآنکہ ملکہ الزبیتھ کے عہد حکومت میں آئرلینڈ پورا فتح ہوگیا اور اس کی تمام

قدیم یونیورسٹیاں مٹ مٹا کر نیست ونابود ہوگئیں، آئرلینڈ کی زبان فضائے تعلیم سے محروم ہوکر ادنیٰ طبقہ کے اِستعمال میں آگئی اور حقارت کی نظروں سے دیکھی جانے لگی، پھر کہیں انیسویں صدی میں جاکر 'قومی اسکول' کے تحریک کی بنا ڈالی گئی۔ اور وہاں کے لوگوں نے اپنے ذوق علم کی بنا پر نہایت سرگرمی سے اس تحریک کا خیر مقدم کیا
ان قومی مدارس کے قائم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ آئرلینڈ کے لوگوں کو اینگلوسیکسن کے نمونہ پر ڈھالا جائے لیکن قدرت نے، خواہ بھلا کیا ہو یا برا، ہر قوم کو اس طرح مختلف الخصایص پیدا کیا ہے کہ ایک کا لباس دوسرے کو پہنایا جائے تو ٹھیک نہیں آتا جب 'قومی اسکول' کی تحریک شروع ہوئی تو ۸۰ فیصدی باشندے اپنی مادری زبان بولتے تھے لیکن وہاں کے طلبا کو جرمانے اور سزاؤں کا خوف دلا کر انہیں اپنی زبان ترک کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اور یہیں تک نہیں بلکہ اون سے اون کی تواریخ بھی چھین لی گئی۔
نتیجہ بالکل وہی ہوا جسکی امید تھی یعنی ملک کے ملک پر ایک دماغی موت آگئی آئرش زبان بولنے والے طلبا، اپنے زندہ ذہنی اور دماغی قوا کو لیکر اسکولوں میں داخل ہوتے تھے لیکن جب ان سے نکلتے تو اس قابل نہوتے کہ کوئی دماغی کام کرسکیں اور نہ ان کو پڑھنے میں ہی کوئی دلچسپی ہوتی۔ اسکا سبب صاف ظاہر ہے۔ طریقہ تعلیم مشین کی طرح تھا، نتیجہ بھی ویسا ہی نکلا۔
ایک ملک کے حالات دوسرے ملک کے مشابہ نہیں ہوا کرتے۔ اگرچہ برطانیہ کی تعلیمی پالیسی آئرلینڈ میں ہندوستان کی تعلیمی پالیسی کے مثل نہ رہی ہو لیکن بہ لحاظ نتیجہ ایک حیثیت سے دونو یکساں تھیں یعنی دونو صورتوں میں دماغ کو نفس تعلیم سے کوئی تعلق نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس امر کو قطعاً نظرانداز کردیا گیا ہے کہ ہم بھی کوئی دماغ رکھتے ہیں۔ ایک نہر کا کھودنا جسمیں متعدد بند وغیرہ ہوں، فن انجنیری کا بڑا کارنامہ ہے اس کام میں کافی مصارف بھی لگے ہیں۔ لیکن جو نقص ہے وہ صرف یہ کہ اس سے ہوکر

پانی نہیں بہتا ہے۔ انجنیر پانی کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں، ہم پانی کا پہلو لیکر انجنیروں کو الزام دیتے ہیں۔ غرض یہ بڑی خلیج خشک رہجاتی ہے۔ میں ان خشم آلود انجنیروں کے یہ گوش گذار کردوں کہ ملک کے قدرتی نشیب میں رکاوٹیں ڈالدی گئی ہیں اور ملک اب اپنا انتقام لے رہا ہے۔

(۷)

تعلیم عام کرنے کے لئے غیر زبان بہتر ذریعہ کبھی نہیں بن سکتی! یہ ایک صدائے حق ہے جسے سنکر غیر ممالک کو نیند آنے لگے گی۔ لیکن ہمارے ملک میں حق گوئی کلمۂ کفر کے مرادف ہے۔ اسے سنتے ہی ہماری سوئی ہوئی طبیعتیں جاگ اٹھینگی۔ اس بناء پر میں یہ مکرر سہ کرر کہنے کو طیار ہوں کہ جبتک ہم انگریزی زبان کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے پر مجبور ہوں گے اسوقت تک دروازہ کھٹکھٹانے اور قفل کھولنے ہی میں ہماری زندگی کا بہترین وقت گذرجائیگا۔ گھر کے اندر کھانا تیار ہی کیوں نہ ہو لیکن داخلہ کی تعویق اور وقت ہماری اشتہا کو مٹا دیں گی۔ اور شدت انتظار سے معدہ کو بھی نقصان پہنچیگا۔ غیر زبان کے ذریعہ خیالات ہم تک بہت دیر میں پہونچتے ہیں۔ کھانا آیا بھی تو کس کام کا، قواعد اور ہجے پر دانتوں کے گھسنے ہی میں کھانے کا مزہ جاتا رہے گا۔

اگر آپ کسی ریگستانی زمین میں درخت لگانا چاہتے ہیں تو آپ کو نہ صرف بیج باہر سے منگانا پڑے گا بلکہ مٹی اور پانی بھی۔ ان تمام دقتوں کے باوجود درخت اپنی طبعی نمو کو پہنچیگا اور اگر پھل لائے بھی تو پختہ نہ ہوں گے۔ یہ مسلّم ہے کہ جو تعلیم ہم اپنی یونیورسٹیوں سے پاتے ہیں، وہ چاہ کندن وکاہ برآوردن کی مصداق ہے۔ ہم کو معلومات کے ساتھ زبان بھی سمندر پار سے منگانی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری تعلیم ہمیشہ اسقدر بیگانہ اور اصل حقیقت سے دور ہے اور بہ لحاظ وقت، صحت ودولت اتنی بیش قیمت۔ پھر جو نتائج ظہور پذیر ہوتے ہیں وہ بھی معلوم۔

پڑھانے کے متعلق جہاں تک میرا تجربہ ہے، طلبا کا ایک معقول حصّہ زبان سیکھنے کی صلاحیت قدرتًا نہیں رکھتا۔

ممکن ہے کہ بعض طلبا تھوڑی بہت انگریزی سیکھکر میٹریکولیشن پاس کریں۔ لیکن اعلیٰ جماعتوں میں تو ان کی بربادی لازمی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی ایسے اسباب ہیں جن کی بنا پر طلبا کی کثیر تعداد انگریزی زبان پر عبور حاصل نہیں کر سکتی۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اس زبان کو ایسے شخص کے لئے جو خالص مشرقی زبان میں غور و فکر کرنے کا عادی ہو، اپنے دماغ میں رکھنا اسقدر ہی دشوار ہے جتنا انگریزی تلوار کو ترکی تیغہ کے نیام میں رکھنا مشکل ہے۔ اسکے علاوہ بہت کم طلبا ایسے ہوتے ہیں جو لایق اساتذہ رکھکر انگریزی زبان سیکھ سکیں۔ غربا کے بچے تو اس سے قطعی محروم ہوتے ہیں۔

ہمارے قدیم روایتی ہنومان کی طرح جنھیں یہ نہ معلوم ہونے کی وجہ سے کہ کس جڑی بوٹی کی ضرورت تھی پورا پہاڑ اکھاڑ لیجانا پڑا۔ ان طلبار کو بھی انگریزی زبان کا صحیح استعمال نہ جاننے کی وجہ سے ساری کتاب طوطے کی طرح رٹنا پڑتی ہے۔ جنکا حافظہ غیر معمولی قوی ہو وہ تو ایسا کر سکتے ہیں لیکن بیچارے اوسط دماغی قوت رکھنے والے طلبا سے یہ امید کب کیجا سکتی ہے؟

سوال یہ ہے کہ کیا ان کثیر التعداد لڑکوں کا جرم جو کسی اتفاقی سبب یا اجنبیت زبان کی وجہ سے انگریزی پر قادر نہو سکیں اسقدر سنگین ہے کہ یونیورسٹی ہمیشہ کے لئے انھیں خانہ بدر کر دے؟ ایک زمانہ تھا جب انگلستان میں چوروں کو بھی پھانسی دیجاتی تھی لیکن یہ تعذیر تو اس سے بھی زیادہ سخت ہے کیونکہ ان طلبار کا انتہائے جرم یہ ہے کہ وہ دھوکا دینے کے قابل نہ تھے! اگر کتاب کپڑوں میں چھپا کر امتحان کے کمرہ میں لیجانا فریب دینا ہے تو یہ بھی کیوں نہ جرم سمجھا جائے کہ طلبا کتاب کی کتاب اپنے دماغوں میں چھپا کر لیجاتے ہیں۔

بہر حال میں اون رہنے والے طلبا کو کوئی الزام دینا نہیں چاہتا جو اپنی خوش قسمتی سے کسی نہ کسی طرح کامیاب ہو جاتے ہیں مگر وہ طلبا جو پیچھے رہ جاتے ہیں جن کے لئے دروازے ہمیشہ کا بند ہو جاتا ہے، ان کے لئے اگر دخانی جہاز نہیں تو کیا ایک چھوٹی کشتی بھی نہیں! یہ کتنی بڑی قومی تباہی ہے کہ ہزار ہا طلبا جو غیر زبان حاصل کرنے کی قدرت نہیں رکھتے لیکن علم سیکھنے کی خواہش ہو اور دماغ بھی پایا ہے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے باز رکھے جاتے ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ اسکے مقابل میں کیا دلیل پیش کیجائیگی۔ لوگ یہی کہیں گے کہ "آپ اعلیٰ تعلیم دیسی زبانوں میں دینا تو چاہتے ہیں لیکن آپ کے پاس درسی کتابیں نہیں ہیں" میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے پاس کتابیں موجود نہیں ہیں لیکن تاوقتیکہ اعلیٰ تعلیم دیسی زبانوں میں نہ دی جائے۔ کتابیں کیسے پیدا ہو سکتی ہیں؟ اگر سکے نہ چلیں تو یہ کیونکر امید ہو سکتی ہے کہ وہ برابر ڈھلتے بھی رہیں گے۔

(باقی آئندہ)

سعید انصاری متعلم جامعہ

آثارِ فراعنۂ مصر

گذشتہ نومبر میں مصر میں جو عظیم الشان انکشاف ہوا ہے۔ اسکی اطلاعات اگرچہ انگریزی اخبارات کے ذریعہ ہندوستان میں آچکی ہیں اور ابتک برابر آرہی ہیں۔ ہم اس کے متعلق مصر کے ایک خاص رسالہ **المقتطف** سے لیکر کچھ تفصیلی حالات علحدہ ایک سوں کی صورت میں شائع کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ایک مضمون بھی ہے جو ان آثار کے تاریخی پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔

اس انکشاف عظیم کا سہرا ماہر علم الآثار مسٹر مورڈ رٹر کے سر ہے کہ عظیم الشان خزانہ شاہی دریائے نیل کے کنارے مغربی جانب مقام اقصر میں دریافت ہوا ہے۔ اس مقام پر ۱۶ برس سے مسلسل ایک محکمۂ آثار و مسٹر کارنروین کے خرچ سے کام کر رہا تھا۔ اگرچہ اس اثنا میں کبھی کبھی کچھ معمولی اشیاء ملتی رہیں، لیکن کوئی عمدہ اور بیش بہا چیز ہاتھ نہ آئی۔ اس کوشش میں بہت سی دقتوں اور صعوبتوں کا بھی سامنا کرنا پڑا، لیکن ان سبکے باوجود بھی اس کام کو کامل استقلال کے ساتھ جاری رکھا۔ یہانتک کہ آج ان کی کوشش اس صورت میں بارآور ہوتی ہے کہ ملوک طبیہ کے قیمتی اور بیش بہا دفینہ کو جو رعمسیس ساوس کے مدفن کے نیچے تھا پالیا، اس انکشاف کے وقت مسٹر کارنروین انگلستان میں تھے، مسٹر کارٹر نے بہت ہی خوشی و مسرت کے ساتھ اسکو اطلاع کی، جو فوراً ہی اس انکشاف کو دیکھنے کے لئے اقصر پہونچا۔ پہلے مسٹر کارٹر نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس دفینہ کے دروازے کو کھولا، اور اس تحفہ خانہ کو صاف کیا۔ جسکے ذریعہ اندر پہونچنے کا راستہ تھا۔ اسکا طول ۲۵ قدم تھا۔ اسکے بعد ایک بند حجرہ ملا۔ لیکن اسپر اس قسم کے نشانات تھے۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ پیشتر بھی کبھی کھولا گیا ہے۔ اور پھر بند کر دیا گیا ہے۔ اس کو

کھولکر پھر حجرے کی تمام چیزوں پر نظر پڑیں۔

اس حجرے میں تین شاہی رتھ ملے، جو بہت ہی خوبصورت سونے کے ملمع کئے ہوئے ہاتھی دانت اور قیمتی پتھروں سے مرصع تھے۔ ان پہیان کے بعض ۔ اوُں کی تصویریں بھی بہت ہی خوبصورتی سے منقش تھیں چند صندوق ملے جپیر بہت ہی خوشنما نقش و نگار تھے۔ ایک ان میں سے ہاتھی دانت اور آبنوس سے مرصع تھا۔ جسپر سنہرے کتبات تھے۔ اور دوسرے پر کچھ عالم سفلی کی باتیں، تیسرے صندوق میں شاہی زیورات تھے۔ جو بہت ہی نازک ولطیف اور خوبصورت کام کے بنے تھے، اسکے علاوہ کچھ تصاویر سنہری کشتیوں کی اور شکار کے بہترین مناظر کی تھیں۔

اسکے علاوہ ایک کرسی تھی، جسکے پاؤں آبنوس کے پایوں کی شکل کے پیروں سے مشابہ تھی، اسکی تمام بناوٹ سے صنعت کا انتہائی کمال ظاہر ہوتا تھا۔ ایک کرسی اور سنہری تھی، جسپر بادشاہ اور ملکہ کی صورتیں بہت ہی خوبی کے ساتھ بنائی گئی تھیں۔

بادشاہ توتنخ آمن کا ایک تخت بھی ملا، جو اپنی خوبصورتی اور قیمت میں تمام ان آثار سے یکتا ہے، جو آجتک دریافت ہوئے۔ یہ سب چیزیں عقیق، لاجورد اور قیمتی فیروزوں سے مرصع ومزین تھیں۔ دو سنہری مورتیں بادشاہ کی تھیں، جو کسی روغن سے پالش کی ہوئی تھیں۔ ہاتھوں میں سنہری رنگ کے عصا تھے دو مورتیں اور اسی کے مقابل بنی تھیں۔

بادشاہ کے چہرے، ہاتھ اور پیروں کے بنانے میں صانع نے اپنا زبردست کمال دکھایا ہے۔ آنکھیں بہت ہی خوبصورت شیشے کی بنی ہوئی ہیں، سر پر گول ٹوپی بنی ہوئی ہے جو بیش بہا جواہرات سے مزین ہے۔ چار رتھ اور تھے، جنکے کنارے سونے اور قیمتی پتھروں سے مرصع تھے، ہانکنے والے کی جگہ پر چیتے کی کھال بچھی تھی اسکے علاوہ اور بے شمار قیمتی چیزیں تھیں دو عصائے شاہی جنمیں ایک قبضہ آبنوس کا اور دوسرا قبضہ خالص سونے کا۔ تخت کے سامنے قدموں کی جگہ پر ایک کرسی بنی ہے، جسپر کچھ شاہی لوگوں کی تصویریں بنی ہیں، یہ

یہ دکھلانے کے لئے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو بادشاہ نے گرفتار کیا ہے اور ان پر بادشاہ کا قدم ہے۔ اسکے علاوہ بہت سی شاہی پوشاکیں تھیں جو سانچوں پر اسطرح آویزاں تھیں جسطرح آجکل ہم درزیوں وغیرہ کی دوکان پر دیکھتے ہیں۔ موسیقی کے بہت سے آلات ملے مصر کی پختہ مٹی کے بہت سے ظروف ملے۔ جنپر بہت ہی خوبصورت کام بنے تھے۔ لطف یہ ہے کہ کچھ کھانے کی بھی چیزیں تھیں، بط وشکار کا گوشت وغیرہ چند قسمیں اس قسم کے نباتات کی بھی تھیں۔ جن کی پتیاں ہمیشہ سرسبز رہتی ہیں۔ ان صندوقوں میں ایک صندوق پیپرس کی لکڑی کا ہے۔ جسمیں بہت سی پوتھیاں ہیں، خیال کیا جاتا ہے کہ اسمیں بہت سے اہم کتبات ہیں۔ جس سے انشاء اللہ اس زمانہ کے واقعات پر روشنی پڑے گی۔

اسکے بعد دوسرے کمرہ کا نمبر آتا ہے۔ اسمیں جسقدر ساماں ملا۔ وہ اسقدر مخلوط تھا کہ اسکی صحیح کیفیت بیاں کرنی مشکل ہے، اثاث البیت۔ سونے کے تخت۔ خوبصورت و نادر صندوق مصری۔ پختہ مٹی کے ظروف وغیرہ وغیرہ، یہ سب ساماں اسطرح گنجان انبار کی صورت میں تھا، کہ گذرنا تک اسمیں سخت دشوار تھا۔ اسمیں بہت سی ایسی چیزیں تھیں جو ہمیشہ رہنے والی ہیں۔ اور بعض کے قریب تلف ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ مسٹر کارٹر کی یہ کوشش ہے کہ یہ سب سامان کسیطرح محفوظ رہے۔ تاکہ اس سے خاطرخواہ فائدہ اٹھایا جاسکے۔

جہاں سے یہ آثار ظاہر ہوئے۔ اسکی ظاہری ہیئیت وصورت سے یہ قطعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدفن اس سے پیشتر بھی کھولا جاچکا ہے۔ ان آثار میں ایک مہر اس زمانہ کی ہاتھ آئی ہے۔ جسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب چیزیں وہ ہیں جو توتنخ آمن کے ساتھ دفن کی گئی ہیں اور اصل مدفن سے ہٹاکر چوروں سے حفاظت کے لئے اوس مقام میں منتقل کردی گئی ہیں دروازوں کے بند کرنے کی کیفیت اور تہ خانہ کی زبردست روک بتاتی ہے کہ وہ چور جو سونے چاندی کی تلاش میں رہا کرتے تھے، اس مقام تک بھی راستہ پا لیا تھا۔ اور

اور چرانے کا ارادہ کر رہے تھے گر گمتیس نہم کی طرف سے اسپر زبردست پہرہ قایم کر دیا گیا اور اسکو دوبارہ خوب مضبوط کر دیا گیا۔ اور یہی انسیت مشہورہ کے شگاف سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے دفینہ ہمیشہ چوروں کی حرص و طمع کا نشانہ رہتے تھے۔ ان خزانوں میں پیشتر کچھ بھی ہو اسوقت بھی جو موجود ہے۔ ارباب تاریخ کو حیرت زدہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ اسمیں شبہ نہیں کہ اس زبردست انکشاف کے ذریعہ مصر کی قدیم تاریخ اور تہذیب و تمدن کے متعلق بہت کافی ذخیرہ معلومات ہاتھ آئیگا۔ جو لوگ اسکے کھلنے کے وقت وہاں موجود تھے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ اس زمانہ کے سب سے عظیم الشان انکشافات میں شمار کیا جائیگا۔ اس کے ذریعہ مصر کی اٹھارھویں سلطنت کے متعلق بہت سے حالات روشنی میں آجائینگے۔

ایک تیسرا آخری حجرہ اور بھی ہے جو ابتک مقفل تھا۔ اور اس کے متعلق خیال ہے کہ یہ خاص شاہی حجرہ ہے اور اس میں بہت عجیب و غریب چیزیں ہاتھ آئینگی۔ اسلئے کہ اس کے سامنے دو مورتیں انھی بادشاہوں کی اس طریقہ پر بنی تھیں کہ گویا اس خزانہ عظیم کی حفاظت کر رہی ہیں۔ مگر اب تازہ اطلاعات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ آخری حجرہ بھی کھل گیا۔ اور واقعی یہ اصلی شاہی خزانہ ثابت ہوا ہے اس میں وہ بیشمار عجائبات و نوادرات ظاہر ہوئے ہیں کہ دنیا اس کو سُنکر حیرت زدہ ہوگی۔ بیش قیمت زر و جواہر کی چیزیں برآمد ہوئی ہیں۔ مگر چونکہ ابھی خبریں متفرق ہیں اور پورے طور سے نہیں آئی ہیں، اسلئے اسپر کچھ لکھنا قبل از وقت ہے۔

سعد انصاری متعلم جامعہ ملیہ

کتب خانہ جامعہ ملیہ

قوموں کی علمی ترقی کا اندازہ ان کے کتب خانوں سے ہوتا ہے۔ آج متمدن ممالک کے کتب خانوں کو دیکھکر عقل حیران ہوتی ہے کہ کہاں کہاں سے کس کس زبان اور کن کن علوم و فنون کی کتابیں کسقدر کثیر تعداد میں اُنہوں نے لاکر فراہم کی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سبق بھی مسلمانوں ہی نے اپنے عروج کے زمانہ میں دنیا کی قوموں کو دیا تھا۔ اندلس اور بغداد کے دارالکتب میں لاکھوں کی تعداد میں کتابیں تھیں۔ خلفاء امراء کے علاوہ علم دوست اشخاص بھی اچھے اچھے ذخیرے کتب کے فراہم کرتے تھے۔

طرابلس شام میں آل عمار نے اپنے دارالکتب میں تیس لاکھ کتابیں جمع کی تھیں اور یہ اوس زمانہ میں جبکہ نہ چھاپہ خانے تھے نہ کتابیں بازاروں میں کوڑیوں کے مول بکتی تھیں۔

سلجوقیوں کے وزیر صاحب بن عباد کو سلطانِ بخارا نے جب اپنے یہاں کی وزارت پر بلایا تو اسنے لکھا کہ میرا یہاں سے وہاں منتقل ہونا آسان نہیں ہے۔ کیونکہ صرف میری کتابوں کے لئے کم سے کم چار سو اونٹ درکار ہونگے۔

افسوس ہے کہ یہ علمی شوق خلف میں کم ہوتا گیا اور ہندوستان میں تو کوئی ایسا کتب خانہ بھی قایم نہ ہوسکا جس کی کتابوں کی تعداد پچاس ہزار تک پہونچ جاتی۔ یہانکے سلاطین اور امراء میں چونکہ علمی ذوق کم رہا اسلئے اُن کی توجہ اسطرف زیادہ نہیں ہوئی۔ اُنکے کتبخانوں میں بیشتر مشہور شعراء کے مذہب و مطلا دواوین یا مثنویاں۔ یا کسی نامور خوشنویس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتاب زیادہ قابل قدر سمجھی جاتی تھی۔ البتہ بعض لوگوں نے جو علمی ذوق رکھتے تھے اپنے استعمال کے لئے اچھے اچھے ذخیرے فراہم کئے تھے۔

جامعہ ملیہ علیگڈھ کی تاسیس کے وقت ہی اسکے بانیوں نے یہ خیال پیش نظر رکھا کہ

اس میں ایک عظیم الشان کتب خانہ بھی قایم کیا جائے۔ کیونکہ اس کے بغیر کوئی جامعہ علمی تحقیقات کے لئے مفید نہیں ہو سکتی۔

لیکن ابتدا میں سیاسی مشاغل کا ہجوم رہا۔ جنکے باعث کتابوں کی فراہمی کی کوشش کا موقع نہیں ملسکا۔ چنانچہ ایک سال گذر جانے کے بعد بھی بجز ان چند کتب کے جو مولانا محمد علی صاحب کی خاص ملکیت تھیں اور کوئی ذخیرہ کتابوں کا یہاں نہیں تھا۔

دوسرے سال کارکنان جامعہ نے اسکے لئے ایک متعدد درخواست شائع کی۔ اور جامعہ کے متعلقین بھی جابجا اس علمی ذخیرہ کی جستجو میں بھیجے گئے۔ اسوقت سے کتابون کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔

ہندوستان میں جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں اہل علم اور صاحبان ذوق کے ذاتی کتب خانے موجود ہیں جن میں نادر علمی کتابیں ہیں اور بعض بعض مقامات پر نایاب کتابوں کے بیش قیمت قلمی نسخے بھی ہیں جو کس مپرسی کی حالت میں پڑے ہوئے روز بروز خراب ہو رہے ہیں۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ جہانتک ممکن ہو ان ذخائر کو اس قومی اور ملی درسگاہ میں لاکر جمع کریں۔ تاکہ یہ کام میں آئیں اور امت اسلامیہ انسے نفع اوٹھائے۔

چنانچہ اسکے لئے کوشش کی جارہی ہے ہندوستان کے اکثر حصص میں جو اس قسم کے کتب خانے بیکار پڑے ہوئے ہیں انکے کھوج لگائے جارہے ہیں۔ بلکہ ان میں سے بعض بعض کی فہرستیں بھی اپنے آدمیوں کے ذریعہ سے مرتب کرائی جارہی ہیں۔

کوشش کا یہ سلسلہ جاری کئے ہوئے تقریباً ڈیڑھ سال کا زمانہ گذرا۔ اسوقت سے اب تک جامعہ میں ہندوستان کے مختلف اطراف سے جسقدر کتابیں موصول ہو چکی ہیں اس کی تعداد یہ ہے۔

عربی	۲۰۰۰	اردو	۱۰۰۰
فارسی	۳۰۰	انگریزی	۳۵۰۰

یہ دکھانے کے لئے گئے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کو بادشاہ نے گرفتار کیا ہے اور ان پر بادشاہ کا قدم ہے۔ اسکے علاوہ بہت سی شاہی پوشاکیں تھیں جو سانچوں پر اسطرح آویزاں تھیں جسطرح آجکل ہم درزیوں وغیرہ کی دوکان پر دیکھتے ہیں۔ موسیقی کے بہت سے آلات ملے مصر کی پختہ مٹی کے بہت سے ظروف ملے، جنپر بہت ہی خوبصورت کام بنے تھے۔ لطف یہ ہے کہ کچھ کھانے کی بھی چیزیں تھیں، بط وشکار کا گوشت وغیرہ چند قسمیں اس قسم کے نباتات کی بھی تھیں۔ جن کی پتیاں ہمیشہ سرسبز رہتی ہیں۔ ان صندوقوں میں ایک صندوق پیپرس کی لکڑی کا ہے۔ جسمیں بہت سی تحریں ہیں، خیال کیا جاتا ہے کہ اسمیں بہت سے اہم کتبات ہیں۔ جس سے انشاء اللہ اس زمانہ کے واقعات پر روشنی پڑے گی۔

اسکے بعد دوسرے کمرہ کا نمبر آتا ہے۔ اسمیں جسقدر سامان ملا۔ وہ اسقدر مخلوط تھا کہ اسکی صحیح کیفیت بیان کرنی مشکل ہے، اثاث البیت۔ سونے کے تخت۔ خوبصورت ونادر صندوق مصری۔ پختہ مٹی کے ظروف وغیرہ وغیرہ، یہ سب سامان اسطرح گنجان انبار کی صورت میں تھا، کہ گذرنا تک اسمیں سخت دشوار تھا۔ اسمیں بہت سی ایسی چیزیں تھیں جو ہمیشہ رہنے والی ہیں۔ اور بعض کے قریب تلف ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ مسٹر کارٹر کی یہ کوشش ہے کہ یہ سب سامان کسیطرح محفوظ رہے۔ تاکہ اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جاسکے۔

جہاں سے یہ آثار ظاہر ہوئے۔ اسکی ظاہری ہئیت وصورت سے یہ قطعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدفن اس سے پیشتر بھی کھولا جاچکا ہے۔ ان آثار میں ایک مہر اس زمانہ کی ہاتھ آئی ہے۔ جسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب چیزیں وہ ہیں جو توتنخ آمن کے ساتھ دفن کی گئی ہیں اور اصل مدفن سے ہٹاکر چوروں سے حفاظت کے لئے اس مقام میں منتقل کردی گئی ہیں دروازوں کے بند کرنے کی کیفیت اور تہ خانہ کی زبردست روک بتاتی ہے کہ وہ چور جو سونے چاندی کی تلاش میں رہا کرتے تھے، اس مقام تک بھی راستہ پا لیا تھا اور

اور چرانے کا ارادہ کر رہے تھے مگر عمتیس انہم کی طرف سے اسپر زبردست پہرہ قایم کر دیا گیا اور اسکو دوبارہ خوب مضبوط کر دیا گیا۔ اور یہی شسیت مشہور کے نشانات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے دفینے ہمیشہ چوروں کی حرص وطمع کا نشانہ رہتے تھے۔ ان خزانوں میں بیشتر کچھ ہی ہوا سوقت بھی جو موجود ہے۔ ارباب تاریخ کو حیرت زدہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ اسمیں شبہ نہیں کہ اس زبردست انکشاف کے ذریعہ مصر کی قدیم تاریخ اور تہذیب و تمدن کے متعلق بہت کافی ذخیرہ معلومات ہاتھ آئیگا۔ جو لوگ اسکے کھلنے کے وقت وہاں موجود تھے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ اس زمانہ کے سب سے عظیم الشان انکشافات میں شمار کیا جائیگا۔ اس کے ذریعہ مصر کی اٹھارہویں سلطنت کے متعلق بہت سے حالات روشنی میں آجائینگے۔

ایک تیسرا آخری حجرہ اور بھی ہے جو ابتک مقفل تھا۔ اور اس کے متعلق خیال ہے کہ یہ خاص شاہی حجرہ ہے اور اس میں بہت عجیب وغریب چیزیں ہاتھ آئینگی۔ اسلئے کہ اس کے سامنے دو مورتیں انھی بادشاہوں کی اس طریقہ پر بنی تھیں کہ گویا اس خزانہ عظیم کی حفاظت کر رہی ہیں۔ مگر اب تازہ اطلاعات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ آخری حجرہ بھی کھل گیا۔ اور واقعی یہ اصلی شاہی خزانہ ثابت ہوا ہے اس میں وہ بیشمار عجائبات ونوادرات ظاہر ہوئے ہیں کہ دنیا اس کو سنکر حیرت زدہ ہوگی۔ بیش قیمت زر وجواہر کی چیزیں برآمد ہوئی ہیں۔ مگر چونکہ ابھی خبریں متفرق ہیں اور پورے طور سے نہیں آئی ہیں۔ اسلئے اسپر کچھ لکھنا قبل از وقت ہے۔

سعد انصاری متعلم جامعہ ملیہ

کتب خانہ جامعہ ملیہ

قوموں کی علمی ترقی کا اندازہ ان کے کتب خانوں سے ہوتا ہے۔ آج متمدن ممالک کے کتب خانوں کو دیکھکر عقل حیران ہوتی ہے کہ کہاں کہاں سے کس کس زبان اور کن کن علوم و فنون کی کتابیں کسقدر کثیر تعداد میں اُنہوں نے لاکر فراہم کی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سبق بھی مسلمانوں ہی نے اپنے عروج کے زمانہ میں دنیا کی قوموں کو دیا تھا۔ اندلس اور بغداد کے دارالکتب میں لاکھوں کی تعداد میں کتابیں تھیں۔ خلفاء و امراء کے علاوہ علم دوست اشخاص بھی اچھے اچھے ذخیرے کتب کے فراہم کرتے تھے۔

طرابلس شام میں آل عمار نے اپنے دارالکتب میں تیس لاکھ کتابیں جمع کی تھیں اور یہ اوس زمانہ میں جبکہ نہ چھاپہ خانے تھے نہ کتابیں بازاروں میں کوڑیوں کے مول بکتی تھیں۔

سلجوقیوں کے وزیر صاحب بن عباد کو سلطان بخارا نے جب اپنے یہاں کی وزارت پر بلایا تو اسنے لکھا کہ میرا یہاں سے وہاں منتقل ہونا آسان نہیں ہے۔ کیونکہ صرف میری کتابوں کے لئے کم سے کم چار سو اونٹ درکار ہونگے۔

افسوس ہے کہ یہ علمی شوق خلف میں کم ہوتا گیا اور ہندوستان میں تو کوئی ایسا کتب خانہ بھی قایم نہ ہوسکا جس کی کتابوں کی تعداد پچاس ہزار تک پہونچ جاتی۔ یہانکے سلاطین اور امرا میں چونکہ علمی ذوق کم رہا اسلئے ان کی توجہ اسطرف زیادہ نہیں ہوئی۔ انکے کتبخانوں میں بیشتر مشہور شعراء کے مذہب و مطلا دواوین یا مثنویاں۔ یا کسی نامور خوشنویس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتاب زیادہ قابل قدر سمجھی جاتی تھی۔ البتہ بعض لوگوں نے جو علمی ذوق رکھتے تھے اپنے استعمال کے لئے اچھے اچھے ذخیرے فراہم کئے تھے۔

جامعہ ملیہ علیگڈھ کی تاسیس کے وقت ہی اسکے بانیوں نے یہ خیال پیش نظر رکھا کہ

اس میں ایک عظیم الشان کتب خانہ بھی قایم کیا جائے۔ کیونکہ اس کے بغیر کوئی جامعہ علمی تحقیقات کے لیے مفید نہیں ہوسکتی۔

لیکن ابتدا میں سیاسی مشاغل کا ہجوم رہا۔ جنکے باعث کتابوں کی فراہمی کی کوشش کا موقع نہیں ملسکا۔ چنانچہ ایک سال گذر جانے کے بعد بھی بجز ان چند کتب کے جو مولانا محمد علی صاحب کی خاص ملکیت تھیں اور کوئی ذخیرہ کتابوں کا یہاں نہیں تھا۔

دوسرے سال کارکنان جامعہ نے اسکے لئے ایک متعدد درخواست شائع کی۔ اور جامعہ کے متعلقین بھی جا بجا اس علمی ذخیرہ کی جستجو میں بھیجے گئے۔ اسوقت سے کتابوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔

ہندوستان میں جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں اہل علم اور صاحبان ذوق کے ذاتی کتب خانے موجود ہیں جن میں نادر علمی کتابیں ہیں اور بعض بعض مقامات پر نایاب کتابوں کے بیش قیمت قلمی نسخے بھی ہیں جو کس مپرسی کی حالت میں پڑے ہوئے روز بروز خراب ہو رہے ہیں۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ جہانتک ممکن ہو ان ذخائر کو اس قومی اور ملی درسگاہ میں لاکر جمع کریں۔ تاکہ یہ کام میں آئیں اور امت اسلامیہ اسنے نفع اوٹھائے۔

چنانچہ اسکے لئے کوشش کی جارہی ہے ہندوستان کے اکثر حصص میں جو اس قسم کے کتب خانے بیکار پڑے ہوئے ہیں انکے کھوج لگائے جارہے ہیں۔ بلکہ ان میں سے بعض بعض کی فہرستیں بھی اپنے آدمیوں کے ذریعہ سے مرتب کرائی جارہی ہیں۔

کوشش کا یہ سلسلہ جاری کئے ہوئے تقریباً ڈیڑھ سال کا زمانہ گذرا۔ اسوقت سے اب تک جامعہ میں ہندوستان کے مختلف اطراف سے جسقدر کتابیں موصول ہوچکی ہیں ان کی تعداد یہ ہے۔

عربی	۲۰۰۰	اردو	۱۰۰۰
فارسی	۳۰۰	انگریزی	۳۵۰۰

کشکول گدائی میں ایک ہی شے کئی گھروں سے بھی ملجاتی ہے۔ یہ تعداد مکررات نکالنے کے بعد ہے ان میں بہت سی نادر و نایاب علمی کتابیں بھی ہیں۔ خاصکر عربی کتب میں بہت سی ایسی ہیں جو بمشکل سے دستیاب ہوسکتی ہیں۔

اس ذخیرہ میں سے بیشتر حصہ ہمدردان قوم اور خیر خواہان امت کا عطیہ ہے۔ اور کچھ حصہ ایسا بھی ہے جسکو ہم نے اپنی فوری ضروریات کے لحاظ سے قیمتاً خرید کیا ہے۔ اس مد میں اس عرصہ میں تقریباً آٹھ ہزار روپیہ ہم صرف کر چکے ہیں۔ دینی کتب عربیہ کی خریداری کے لئے ایک ہزار روپیہ ایک "مرد خدا" کا عطیہ تھا جو ان کے علاوہ صرف ہوا ہے۔

ماہ گذشتہ میں عربی کی جدید تصانیف تقریباً ایک ہزار روپیہ کی مصر سے منگائی گئی ہیں۔ اسی طرح بیروت کی کل مطبوعات وہاں سے خریدی گئی ہیں۔

یورپ میں فارسی کی جسقدر کتابیں چھاپی گئیں ہیں اون کا ایک معتد بہ حصہ آچکا ہے نیز عربی ادب کی بھی وہ کتابیں جو وہاں مطبوع ہوئی ہیں لیپزگ (جرمنی) سے منگائی گئی ہیں لیکن کتب جغرافیہ و تاریخ جو ہمارے قدما کی یورپ میں اور خاصکر گب میموریل کی طرف سے شائع ہوئی ہیں ان کو ہم نہیں منگا سکے ہیں۔ اسلئے کہ جنگ کے بعد سے ان کتابوں کی قیمت ایک سے دس تک بڑھ گئی اور ادہر سرمایہ کی قلت ہے۔

دائرۃ المعارف حیدر آباد کی مطبوعات بھی ہمارے پاس نہیں ہیں۔ لیکن ان کا حاصل ہونا بعض حامیان علم کی توجہ سے بہت آسان ہے۔

فارسی کتابوں کا ذخیرہ ہمارے پاس بہت کم ہے۔ جدید مطبوعات کے لئے خود طہران سے خط و کتابت ہو رہی ہے۔ امید ہے کہ عنقریب ہم وہاں سے ایسا ذخیرہ منگوائیں گے جو مشکل سے ہندوستان میں ملسکیگا۔

قدیم کتب فارسی کے بارے میں ہم کو یہ توقع ہے کہ وہ بلا خریدے ہوئے ہم کو ہندوستان ہی میں ملجائینگی۔ کیونکہ یہاں ان کا عام رواج رہا ہے اور جابجا لوگوں کی

پاس ان کے ذخائر ہیں۔ اسلئے ان کے متعلق ہم اپنے کیسۂ محروزہ کی بہ نسبت کاسۂ دریوزہ پر زیادہ نظر رکھتے ہیں۔

اُردو کی کتابیں بھی بہت کم ہیں۔ ان کی فراہمی کے لئے سخت کوشش جاری ہے۔ ہر مہینے میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ہمارے پیش نظر یہ امر ہے کہ ہم اپنے اس ملکی اور مادری زبان کا جو ہماری جامعہ میں ذریعہ تعلیم بھی ہے جس طرح ممکن ہو مکمل ذخیرہ جمع کریں۔

انگریزی کی کتابوں کی فراہمی کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ کتب خانہ کے اس شعبہ کو مکمل کرنے کے لئے ایک کثیر سرمایہ کی ضرورت ہے۔ ہم کو پورا اعتماد ہے کہ اگر اللہ نے چاہا تو وہ قوم کو امداد کے لئے مستعد کر کے اس مشکل کو آسان کر دیگا۔ لیکن اسمیں دیر ضرور لگے گی۔

قلمی کتابیں ابھی تک کل تین سو کے قریب ہیں۔ لیکن اللہ تعالے نے اگر ہماری کوششوں کو کامیاب کر دیا تو سال آیندہ تک اسکا ایک معتد بہ ذخیرہ ہمارے پاس ہو جائیگا۔ اور ہم آیندہ اسکو بڑھاتے جائینگے جسقدر قلمی کتابیں اسوقت تک آچکی ہیں ان میں سے چند خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ایک نسخہ قاموس کا ہے جو عربی لغت کی مشہور کتاب ہے۔ یہ نہایت دلفریب خط نسخ میں ہے اور کاغذ بھی بہت عمدہ ہے۔ امرا رئیسن کے استعمال میں رہا ہے۔ ان میں سے اکثروں کے دستخط خاص ان کے قلم کے اسکے اوپر موجود ہیں۔

دوسری کتاب جو نہایت قابل قدر یادگار ہے وہ "العروہ لاہل الخلوہ" ہے۔ یہہ خواجہ علاء الدولہ سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کی عربی تصنیف ہے جو تصوف اور کلام میں ہے۔ خواجہ صاحب موصوف شیخ سعدی کے ہمعصر اور مشہور صوفی تھے۔ شیراز کے متصل صوفی آباد کی خانقاہ میں سجادہ نشیں تھے۔ اور ان کے خدمت میں سلاطین عہد حاضر ہوتے تھے۔ یہہ کتاب ابتک کہیں طبع نہیں ہوئی ہے۔ بعض بعض کتب خانوں میں اسکے قلمی نسخے موجود ہیں لیکن ہمارے نسخہ کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ خود خواجہ صاحب موصوف کے قلم کا لکھا ہوا ہے۔

آخر میں انہوں نے یہ ہدایت بھی لکھی ہے کہ اب جو لوگ اس کتاب کی نقل لیں وہ اسی نسخہ سے لیں۔ کیونکہ اس کو تیسری بار میں نے لکھا ہے پہلے نسخوں میں جو کمی یا غلطی رہ گئی تھی وہ اسمیں نہیں ہے۔ یہ نسخہ اچھی حالت میں ہے۔

کتابوں کے علاوہ طلبائے جامعہ کے لئے کتب خانہ میں مختلف ملکوں اور زبان کے رسائل بھی منگائے جاتے ہیں جنکی تفصیل حسب ذیل ہے۔

	عربی	فارسی	اردو	انگریزی	فرانسیسی	جرمن
ہفتہ وار		۱	۳	۱۴	۱	..
ماہوار		۱	۸	۸	..	..
سہ ماہی			۱	۶	-	۱

یہ ان اخبارات کے علاوہ ہیں۔ جنکو طلبا روزانہ دار المطالعہ میں پڑھتے ہیں۔

لیکن یہ جو کچھ ہے ابھی ان خیالوں اور ارادوں کی ابتدا ہے جو اس کتب خانہ کے متعلق ہیں ہمارا مطمح نظر یہ ہے کہ اسکو ایسے بلند معیار پر پہونچائیں کہ ہندوستان کے ارباب ذوق کو علمی اور تحقیقی مطالعہ کا مکمل سامان یہاں ملسکے۔

اس کتب خانہ کی تکمیل میں جو لوگ کوشش کر رہے ہیں وہ حقیقت میں امت کی علمی ترقی کے لئے ایک بار آور درخت لگا رہے ہیں وہ شکریہ سے بے نیاز اور دعا کے مستحق ہیں! اللہ تعالےٰ ان کو جزا دے۔ آمین۔

محمد اسلم
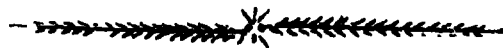
مصر میں تعلیم

گزشتہ و موجودہ حالت

(مصر کے مشہور وطن پرست ادیب جلیل عبد اللہ الندیم کے ایک مقالہ علمیہ کا ترجمہ)

یہ حقیقت ہے کہ پیشوایان ملت اسلامیہ نے ان تمام امور پر غور اور اسباب و علل کو معلوم کرنے کی پوری کوشش کے بعد میدان ترقی میں قدم رکھا، جو قوموں کی ترقی و تقدم کے لئے ضروری ہیں اور جن سے قوموں میں تہذیب کی نشر و اشاعت ہو سکتی ہے۔ اور جو تمدن و شائستگی کے دائرہ کو وسیع کر سکتے ہیں۔ باوجودیکہ اسلام امیتوں کے ملک میں پیدا ہوا تھا۔ پھر انھیں کے ہاتھوں پھیلا۔ اور پھولا پھلا۔ انھوں نے جان لیا کہ ملک کے استوار تھا اور استقلال کے لئے صرف ایک ہی چیز (علم) ہو سکتی ہے چنانچہ یہ سمجھ لینے کے بعد تمام افراد قوم علم کا ذخیرۂ گراں بہا حاصل کرنے میں۔ ہمہ تن مشغول ہو گئے۔ نہ صرف حصول تعلیم ہی کی حیثیت سے علوم کو اپنے زبان میں منتقل اور فراہم کرنے میں اپنی تمام توجہات مبذول کردیں۔ اِس کا یہ نتیجہ ہوا کہ اون کی شان و شوکت انتہائی نقطۂ عروج پر پہونچ گئی۔ اور اس کا آوازہ فضائے عالم میں گونجنے لگا۔ دنیا کی زبردست طاقتیں اور اور طاقتور قومیں اس کی سطوت و جبروت سے دہلنے لگیں اوس سے خوشہ چینی اور طلب امداد کرنے اور اُس کے سایۂ عالمگیر میں پناہ لینے لگیں کوفہ اور بصرہ کے دونوں کالجوں کے دروازے تمام علوم عام کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ چنانچہ اُن سے بکثرت علماء و فضلاء نکلے اور دنیا میں پھیلے۔ سب سے اول یہیں سے خط کوفی عالم وجود میں آیا۔ ادھر مدینہ منورہ کی مسجد نبوی، مذہبی

و دینی تعلیم کا ایک شاندار کلیہ (کالج) بنی ہوئی تھی۔

جس وقت مسندِ خلافت، مدینہ منورہ سے منتقل ہوکر دمشق شام میں آئی تو یہاں بھی اس کا سرکاری کلیہ کھل گیا۔ اور اطراف ملک سے علم و حکمت کے تشنہ کام اس کے لئے شدرحال کرکے آنے لگے نہ صرف دنیا کے مسلمان بلکہ گوشہ گوشہ اور مختلف اقطار سے ایک عالم، مسلمان علماء سے حصول علم اور تعلیم کے لئے آآکر لوٹنے لگا۔ بارگاہِ خلافت نے ضروریات وقت کا لحاظ کرکے مدارس و مکاتب کی تعداد میں بہت اضافہ کردیا۔ کہ دنیا اون کی اقتدار علمی پر فخر و مباہات کرتی تھی۔

دمشق (شام) سے سرزمین عراق کے مشہور شہر دارالسلام بغداد میں پایۂ تخت خلافت منتقل ہوا اور بغداد علم و ادب کا مرقع بن گیا۔ اقتدار و شوکت علیہ بھی سریرِ خلافت کے ساتھ یہاں منتقل ہوآیا۔ خلافۂ عباسیہ نے علمی کوششوں میں اور چار چاند لگا دئے۔ بغداد میں مدارس زیادہ تعداد میں کھل گئے خلفاء عباسیہ نے علم و علماء اور تعلیم و تربیت کی طرف وہ اعتنا فرمائی کہ تمام عالم کو معارف و ادبیات سے معمور و مزین کردیا۔ فتوحات کی وسعت و امتداد کے ساتھ جہاں جہاں عرب جاتے تھے۔ علوم اسلامیہ اور آداب محمدیہ علیہ الصلوٰۃ والتحیہ اور اون کے فنون عقلیہ بھی ساتھ ساتھ پہونچتے تھے۔ تمدن کے مفید اثرات بھی۔ اس طرح عربوں کی رفاقت و معیت میں علوم و معارف کا نور تاباں بھی ایشیا رسے افریقہ پھر سرزمین یورپ میں منتقل ہوکر پہونچ گیا۔ وہ مصر، طرابلس، اسپین (اندلس) پرتگال، بلادمغرب جزائر صقلیہ (سسلی) اور جزائر بحر ابیض تک میں پہونچکر اس نور علم سے چپہ چپہ کو منور کردیا۔ بغداد قاہرہ مصر و دمشق و حلب، تونس و قیروان، فاس و قرطبہ، اشبیلیہ و غرناطہ، مکہ و مدینہ صنعاء (یمن) سمرقند و اصفہان (فارس) دہلی (ہندوستان) او غزنین (افغانستان) وغیرہ جو بڑے بڑے اسلامی شہر اور پایۂ تخت تھے ان میں مدارس و مکاتب کی کثرت اور اون سے فارغ التحصیل طلبہ اساتذہ کی افراط کا یہ عالم ہوا کہ علوم اسلام اس

سرے سے اُس سرے تک عام طور پر پھیل گئے۔

پھر اس تعلیمی شعبہ پر سارا زور صرف نہیں کر دیا گیا۔ بلکہ خلفاء اسلامیہ کی نگاہ علم نواز نے مختلف علوم کی کتابوں کی فراہمی اور ان کو اپنے ملک کی زبان میں ترجمہ کرنے پر توجہ مبذول فرمائی۔ باوجودیکہ اس دور میں مطابع کا وجود نہ تھا۔ صرف خلیفہ حاکم بامر اللہ فاطمی نے ایک لاکھ کتابیں مدرسہ فاضلیہ میں رکھی تھیں۔ ان سرکاری کوششوں کے علاوہ رؤسا و امراء ملک نے بھی احیاء علوم اور تعلیم و تربیت کی اشاعت میں اپنی تمام ہمتیں صرف کر رکھی تھیں اور علمی دلچسپیوں کا یہ حال تھا کہ وہ اپنی تمام آمدنی کتاب کی تیاری اور مدرسہ کی تعمیر کے سوا کسی شے میں صرف نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی علمی یادگاریں اور مٹے ہوئے آثار آج بھی شاہد حال ہیں۔ اس التفات خاص کی بدولت مسلمانوں میں علم کی روح پھنک گئی۔ اور ذوق علم ہر رگ و پے میں بس گیا۔ اور انھیں میں سے نہ صرف شریعت غرا بلکہ آلہیات ریاضیات اور طبیعات کے بڑے بڑے زبردست علماء پیدا ہوئے۔ جنہوں نے دنیا کی تمام وسعت کو اپنے علوم و معارف سے آراستہ کرکے دُلھن بنا دیا۔ اور اپنے آداب و معارف سے اس کو معمور کر دیا۔ جہالت و گمراہی کے لباس کہنہ کو اپنی مذہبی تلوار سے پارہ پارہ کر ڈالا۔

یہ عالم تھا کہ تاتاریوں کا ایک طوفان اٹھا۔ اور عظیم خوفناک سیلاب مشرقی ترکستان سے چلا جسنے مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی امنگوں کو مغلوب کرکے تباہ کر ڈالا۔ اور ان کی علمی ترقیوں کو بُری طرح روک دیا۔ اس سے بڑھکر خطرناک و مہلک فتنہ مسلمانوں کے لئے حروب صلیبیہ کا تھا جسنے ملتِ اسلامیہ اور ملتِ مسیحیہ میں ہمیشہ کے لئے عداوت کا بیج بو دیا۔ اور اقتدار و قوت علمیہ ستم آفرینیوں اور شورشوں کے ذریعہ سے فنا ہونے لگی۔ علم کی روشنی ماند پڑنے لگی، علوم و معارف کا چراغ ٹمٹمانے اور خاموش ہونے لگا۔ آگے چلکر پھر تو قوم ہی میں کچھ لوگ ایسے پیدا ہو گئے۔ جنہوں نے سلاطین وقت میں ریاضی اور فلسفہ کی کتابوں سے بدظنی اور نفرت پیدا کی آخر ان کی جانب سے یہ احکام صادر ہوئے کہ وہ کتابیں جلا دیجائیں

اور جو لوگ ان علوم کی کتابوں سے دلچسپی و شغف رکھتے تھے۔ ان کی تفتیش کی جائے اور گرفتار کر کے اون کو سزائیں دی جائیں یا قتل کئے جائیں۔ حالانکہ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ فلسفہ و ریاضی خود اون کی نہیں بلکہ اسلاف کی مساعی خیر کا نتیجہ اور علماء سابقین کی میراث تھیں اور ائمہ ماضیہ کے ہاتھوں کی لکھی اور انھیں کی تصنیف و تالیف کی ہوئی۔ مثلاً غزالی۔ رازی، فارابی، وغیرہ اس بے راہ روی کا حسرت خیز نتیجہ یہ ہوا کہ علم ایشیا سے رخصت ہو کر سرزمین مغرب (یورپ) میں جا رہا۔ دولت اسلامیہ کا چمکتا ہوا ستارہ قوم کی شدت جہل سے جھلملاتا ہوا ڈوب گیا۔ اور اوس کے رفعت و برکت کو مٹا دینے، اوس کے لباس عظمت کو پارہ پارہ کر دینے والی ہستیاں بکثرت ملک میں پیدا ہو گئیں۔ آخر چار و ناچار ان تمام اسلامی حکومتوں کو دولت عالیہ عثمانیہ کے لئے میدان خالی کر دینا پڑا۔ ابھی صحیح و حقیقی ذوق علم اور علماء کا وجود ملک سے فنا نہیں ہوا تھا۔ ان خلفاء عثمانیہ نے زمام سلطنت ہاتھ میں لیکر مسلک حکمت و تدبر کو اختیار کیا۔ ہزاروں کی تعداد میں مدرسے کھولدئے اور بیشمار طلبہ بہم پہنچا کر انھیں آباد کر دیا حتیٰ کہ صرف ایک مقام بروسہ (بورصہ) کے مدرسہ سے کثیر تعداد میں علماء نکلے۔ جو ملک کے اون متعدد مدارس میں اساتذہ ہوئے جو سلطنت عثمانیہ کی مرہون توجہات تھے (ایدہم اللہ تعالیٰ) سلاطین عثمانیہ کی علم پروری کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سلطان مراد باوجودیکہ خود کچھ لکھا پڑھا نہ تھا۔ مگر اس نے علوم و معارف کے دائرہ کو نہایت وسعت دی۔ اور قاضی زادہ کو علوم ریاضیہ کی تعلیم و تحصیل کے لئے سمرقند بھیجا۔ وہ علوم ریاضیہ جن سے علماء کو بالکل بیر تھا۔ اور جس کو چھوڑ دینے کی وجہ سے ملت اسلامیہ نے اپنی طاقت و اقتدار کو کھو دیا تھا۔ اوس کا شیرازۂ اتحاد پریشان ہو گیا تھا۔ اور اوس کی تہذیب و تربیت بالکل برباد ہو گئی تھی۔ ریاضی و فلسفہ اور علوم دینیہ میں جو شغف عہد اولیں میں تھا۔ اگر وہی بدستور باقی و جاری رہتا تو آج جس علمی اقتدار کا عالم ہوتا اس کے تصور سے بھی عقل انسانی عاجز و مجبور اور قوت متخیلہ معذور رہے۔ آخر ایک والیٔ ملک نے محسوس کیا۔ اور سمجھ لیا کہ تربیت

تعلیم کے بغیر کسی قوم کو اقتدار و ترقی حاصل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اس فرمانروا نے تعلیم کو عام کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ تعلیم کے لئے جن بزرگوں نے ہمت و توجہ صرف کی ہے انکی فہرست میں سب سے پہلے جس کا نام لکھا جائے گا وہ ایک مہمان خداوند منزل جنت یعنی مرحوم محمد علی پاشا خدیو مصر ہیں۔ جس وقت مرحوم محمد علی پاشا ۱۹ محرم سنہ ۱۲۲۹ھ کو مسند حکومت پر متمکن ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ مصر میں تعلیم معمولی نوشت و خواند، اور حفظ قرآن شریف اور چھوٹے چھوٹے مدارس تک محدود ہے۔ کتب فقہ، نحو و حدیث وغیرہ علوم دینیہ یا تو جامع ازہر یا کسی مسجد میں پڑھے پڑھائے جاتے ہیں اور بس۔ مرحوم نے یہ بھی دیکھا کہ ملک کا زیادہ بیشتر حصہ خراب و برباد ہو چکا ہے اور اس کے وسیع حدود میں جہالت عام ہے تو مرحوم نے اصلاح ترتیب و تعلیم اور فرزندان وطن کی تہذیب، اون کی تعلیمی نشو و نما پیدا کرکے کارآمد بنانے پر پوری توجہ سے کام لیا۔ چنانچہ انھوں نے علمی شعبہ پر نظر غور مبذول کی۔ اور اوس کا ایک خاص محکمہ قایم کیا۔ پھر اس کا ایک مستقل قانون منضبط فرما کر بہت قلیل مدت کے اندر (۹۴،) مدرسے اور مکاتب تشیبی و بالائی حصۂ مصر میں کھولدئے جن میں سے گیارہ مدارس عسکریہ امیریہ (سرکاری فوجی مدارس) تھے جو جنگی تعلیمات اور امرا کی اولاد کے لئے مخصوص تھے جن میں اساتذہ، طلبہ، اور دیگر ملازمین ملا کر سب کی تعداد (۵،۹۰) تھی۔ اسی طرح مدارس ملکیہ (عام مدرسے) میں (۶۹۳۳) اور ملک مصر کے حصۂ زیریں میں طلبہ و معلمین ملا کر (۲۵،۵) صرف مدارس امیریہ پر ماہانہ مصارف (۲۶۰۶) پونڈ (۲۱) قرش مصری مصارف ہوتے تھے۔ مدارس عام کا صرفہ ماہانہ (۸۱،) پونڈ ۲۲ قرش تھا۔ اور دفتر تعلیمات کے ماہانہ مصارف کی مقدار (۵۱۱) پونڈ (۳۲) قرش تک پہونچ گئی تھی۔ غرض کل تعلیمات پر (۳۰۹۸) پونڈ ۲۹ قرش مصری کا صرفہ ہوتا تھا۔

اس شفیق و جلیل القدر امیر کے اون احسانات اور عنایات کی تفصیل کے لئے جو اس نے مصر اور باشندگان مصر پر مبذول فرمائی تھیں۔ ہم چند مدارس اور ان کے طلبہ و

واساتذہ وملازمین کی تعداد الگ الگ تشریح کرکے ۱۹۲۵ء کے سالانہ میزانیہ کے لحاظ سے لکھتے ہیں۔

نام مدرسہ	طلبہ کی تعداد	معلمین	دیگر ملازمین	مجموعی ماہانہ مصارف
مدرسۃ الالسن (زبانوں کا مدرسہ)	۱۳۷	۷	۴۲	۱۴۹۴۲ پونڈ
مدرسۃ البیادہ (بمقام دمیاط) پیادہ فوج کا مدرسہ	۳۹۷	۲۲	۹۴	۳۰۴۳۵ "
مدرسۃ المبتدئین بمقام سیدہ	۴۳۴	۱۲	۵۹	۹ ۶۸ "
مدرسۃ الموسیقی (فوجی بینڈ کا مدرسہ)	۱۶۷	۸	۱۵	۶۶ ۱۱ "
مدرسۃ الطب	۲۹۶	۲۴	۱۰۱	۳۵۶۶۵ "
مدرسہ طب بیطری (ڈنگری) وزراعۃ ومساحۃ	۱۱۷	۱۰	۴۰	۲۳۳۳۵ "
مدرسہ توپچیہ (توپ خانہ)	۱۴۵	۱۵۰	۱۴۴	۱۳۸۸۸ "
مدرسۃ السواری (فوجی سوار وتکا)	۶۱۵	۱۳	۳۸۱	۵۷۰۹۳ "
مدرسہ تجہیزیہ (ہائی اسکول)	۶۰۶	۴	۲۸۵	۲۰۷۵۹ "
مدرسۃ العملیات (تشریح الاعضا وعمل بالید کا مدرسہ)	۲۹	۴		۷۳۲۲ "
مدرسہ ہندس خانہ وفن تعمیر (انجینرنگ کا مدرسہ)	۲۱۰	۴	۱۴	۲۱۴۶۰ "
(۱۱) میزان طلبہ ومصارف مدارس	۳۱۵۱	۱۴۳	۱۱۸۹	۲۶۰۶۷۸ پونڈ ماہانہ

مصر کے حصۂ زیریں میں جو قصباتی مدارس تھے اون کو جداگانہ دکھانا طول سے خالی نہیں اسلیے صرف یہ بتا دینا کافی ہوگا کہ مختلف قصبوں میں (۲۸) مدارس قایم ہوئے۔ جن میں کل ماہانہ مصارف (۴۱۱۲۷) پونڈ ہوتے تھے۔ (۴۵۰۹) طلبہ، (۲۴۲) ملازمین اور (۳۳۶) اساتذہ ان میں تھے۔ چنانچہ سررشتۂ تعلیم کے مصارف کی اس سال کل میزان (۱۰۸۶۴) پونڈ اور ۲۰ قرش ہوتے ہیں جو مصر کی تمام سالانہ مالگذاری کا تقریباً بیسواں حصہ ہے۔

جو ذات گرامی دیگر محکموں بالخصوص کثیر جنگی معارف اور بڑھتی ہوئی ضروریات کے ہوتے تمام ملک کے مالگذاری کا بیسواں حصہ صرف تعلیم پر صرف کرے۔ اوسکی دریا دلی۔ علم پروری اور محسن ملک ہونے میں کیا شک ہوسکتا ہے۔ ساتھ ہی اس کا تمام خاندان بھی اپنے وطن عزیز کی ترقی کے لیے دل سے مصروف سعی ہے اور چاہتا ہی کہ قوم نشو و ارتقا کے انتہائی نقطۂ اوج پر پہونچ جائے۔ چونکہ ابتدا میں ملک کے باشندے تعلیم کے نتیجہ بے بہا اور ثمرۂ مفید سے بالکل بے خبر تھے۔ اور اپنی اولاد کو برضا و رغبت مدارس میں بھیجنا نہیں چاہتے تھے۔ لہذا نہایت بے پروائی سے کام لیا۔ مگر جب آگے چلکر انہوں نے دیکھا کہ انہیں میں کے کامیاب افراد نے سرکاری حیثیت سے بہت ترقی کی۔ اور حکومت سے بہت اعزاز و اکرام پایا تب تعلیم سے دلچسپی و رغبت پیدا ہوئی۔ اور اپنے محبوب بچوں کو مدارس میں بھیجنا شروع کیا۔ باوجودیکہ آغاز کار میں محمد علی پاشا کو شدید دشواریوں کا سامنا ہوا۔ اور بالکل خلاف امید حالات رونما ہوئے تکمیل مقاصد میں نمایاں دقتیں نظر آئیں۔ پھر بھی ہر قسم کی تعلیم کی بنیادیں قایم کر دینا انہوں نے طے کر لیا۔ اور ضروری اصلاح غیر ممکن نہ سمجھ کر اوسکو حکومت کی ضروریات میں قرار دیا۔ مکاتب عام میں پہلے تو صرف معمولی نوشت و خواند اور حساب کی تعلیم دیجاتی تھی۔ پھر اون میں کے ترقی کرنے والے ہونہار طلبہ بڑی بڑی شہروں کے مدارس میں بھجوا دیے جاتے تھے۔ تاکہ وہاں کے نصاب وغیرہ کی تکمیل کریں۔ اس صورت سے حکومت کو تھوڑے وقت میں بہت سے ایسے کام کرنے والے ملگئے جن کی تربیت و تعلیم خود حکومت نے اپنے نقطۂ نظر سے کرائی تھی

باشندگانِ ملک کو یہ فوائد حاصل ہوئے کہ اون کی عزیز اولاد نے ملک میں عزت و احترام پایا۔ ترقیاں کیں۔ مشہور اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے حکومت کی نگاہوں میں عزت اور بڑی بڑی تنخواہیں پائیں۔ اس طرح قصبات اور شہروں کے بہت سے گھرانے مادی و علمی فوائد سے مالامال ہو گئے۔ کثرت سے مہذب تعلیم یافتہ کالجوں اور اسکولوں سے نکلے جو معزز عہدہ دار مشاہیر ملک و ناموران زمانہ ہوئے۔ غرض اس صورت سے نہ صرف رعایا بلکہ حکومت کو بھی تربیت و تعلیم کے عام فوائد سے مالامال ہونے کا موقعہ ملا۔

(باقی آیندہ)　　　　(محمد حسین محوی)

غزل

بخیہ گر چاکِ گریباں میں ہی کبتک تارِ سرشک　　پردہ در ہی کسوتِ ناموس کا خارِ سرشک

چشمِ قاتل کی مژہ مضراب سازِ قلب ہے　　نغمہ ہائے بربطِ دل نکلے از تارِ سرشک

اے ہجومِ یاس کچھ تو رحم کر بیمار پر　　دستِ مژگاں کیا سنبھالے حالتِ زارِ سرشک

جوششِ گریہ سے ہی یہ عشق کی تر دامنی　　محفلِ اغیار طعنہ زن بہ گفتارِ سرشک

دیدہ خوابیدہ اہلِ ہوس کیا رو سکے　　چشمِ بیدار و فا محرمِ زا سرارِ سرشک

جوہرِ آئینۂ دل خارِ دردِ عشق و غم　　گلشن نظارہ کی رونق بہ مقدارِ سرشک

تا نہو رسوا مرے گھر آکے وہ اسواسطے　　جادہ تارِ نظر گم ہے بہ گلزارِ سرشک

مجھ کو رونے دو کہ شانِ قہر ہو رسوا ذرا　　یوسفِ عفو صنم ہے رہنِ بازارِ سرشک

ناتواں اطہر کی تربت پر نہ روئے کوئی بھی
عاشق خود وارسے اوٹھتا نہیں بارِ سرشک

رشید اطہر　متعلم جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڈھ

ہنسی

لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح جلد جلد پہلو بدلنا بےچینی کی علامت ہے۔ منہ پھیلا کر رہ جانا تعجب کی علامت ہے۔ تیوری چڑھانا غصہ کی علامت ہے۔ رونا تاریخ کی علامت ہے اُسی طرح ہنسنا خوشی کی علامت ہے اگر کوئی بیچارہ کہے کہ ہنسی صرف بعض صورتوں میں خوشی کی نشانی ہے ورنہ اس سے زیادہ تر اور جذبات وکیفیات کا اظہار ہوتا ہے تو وہ یقیناً مسخرا یا دیوانہ یا فلسفی سمجھا جائیگا اور اوسکی ذات کی اہمیت لوگوں کو اسقدر متوجہ کرے گی کہ اوسکے قول کو مقابلتہً بیوقعت سمجھکر چھوڑ دیا جائے گا۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ ہنسی گوناگوں جسمانی اور دماغی کیفیات کی ترجماں ہوتی ہے۔ سب سے پہلی مثال جو ذہن میں آتی ہے وہ (Hysteria) اختناق الرحم وغیرہ کے مریضوں کی ہنسی ہے اس ہنسی اور خوشی کی ہنسی میں امتیاز کرنے کے لئے قوت مشاہدہ کی باریک بینی کی زیادہ ضرورت نہیں۔ جس نے اس مرض کے شدید دوروں کے وقت مریضوں کے وحشتناک تبسم کو دیکھا ہے یا اون کے ہولناک قہقہوں کو سُنا ہے اوسکے رونگٹے ضرور کھڑے ہوگئے ہونگے۔

بعض لوگ جنہیں ایسے مریضوں کی تیمارداری عرصۂ دراز تک کرنے کا اتفاق ہوا ہے وہ جانتے ہیں کہ دماغ پر اس ہنسی کی ایسی ہیبت مستولی ہوجاتی ہے کہ اسکے بعد کچھ دن تک اچھے بھلے آدمی کے خوشی کے قہقہہ سے بھی ذرا دیر کے لئے بدن میں سنسنی پیدا ہوجاتی ہے۔

وہ لوگ بھی جنہیں (Hysteria) اختناق الرحم ایسے شدید مرض کی نہیں بلکہ معمولی ضعفِ قلب کی شکایت ہوتی ہے اکثر بیجا اور بے تحاشا ہنسا کرتے ہیں۔ ایک

صاحب تھے جو سلام کا، استفسار مزاج کا وقت پوچھنے کا، غرض ہر بات کا جواب ایک دبے ہوئے قہقہے سے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ بہت سے چھوٹے چھوٹے غیر مربوط قہقہوں ہی دیا کرتے جسطرح ایک پتلے منھ کی صراحی میں کپڑا باندہ کر اوس میں سے پانی اونڈیلا جائے ایک بار ممدوح کو لوگوں نے ایک نہایت ثقہ جلسہ کا (واضح رہے کہ ممدوح خود بھی اور ہر اعتبار سے ثقہ تھے) صدر منتخب کیا۔ بیچارے جھجکتے ہوئے صدارت کی کرسی تک پہونچے اور سر جھکائے ہوئے بیٹھ گئے۔ لیکن جب اوٹھکر حاضرین سے خطاب کرنا پڑا تو مرض ضبط پر غالب آگیا اور کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

اسی زمرہ میں دیوانوں کی ہنسی بھی آتی ہے۔ بدقسمتی سے عام طور پر دیوانوں کو ہنسی سے کم ذوق ہوتا ہے لیکن پھر بھی ہنس مکھ سڑی نایاب نہیں ہیں۔ ان کی ہنسی کو خوشی اور شگفتہ دلی سمجھنا محض علمی غلطی ہی نہیں ہے بلکہ ایک دوست کا تجربہ ہی کہ کبھی کبھی انسان پر اسکے سبب ایسے جسمانی شدائد گذر جاتے ہیں کہ اوسے اپنی خطائے اجتہادی کا حق الیقین ہو جاتا ہے۔

مستقل دیوانگی سے قطع نظر کرکے اون صورتوں میں بھی جبکہ کسی تند اور قوی جذبے کا ہیجان یا اسکا اثر عارضی طور پر عقل میں فتور پیدا کردے کبھی کبھی ایسے لوگوں کی بے سبب ہنسی دیکھنے اور سننے والوں کو دہوکا دیجاتی ہے۔ شرابی یا اوسکے مقابلۃً مسکین بھائی افیونی اور چانڈو بازکی زندہ دلی اور خندہ آزمائی کی مثالیں تو بہت ملتی ہیں۔ لیکن غصہ یا رنج سے مغلوب ہوکر دیوانہ وار ہنسنے لگنا اسقدر عام نہیں ہے۔ اگرچہ غصہ اور رنج میں ہنسی آنے کی مثالیں عام طور سے نہیں ملتیں۔ لیکن جس کسی کی نظر سے بہت سے چہرے مختلف قلبی کیفیتوں کا اظہار کرتے ہوئے گذرے ہیں اور اوسنے انہیں غور سے دیکھا ہی وہ جانتا ہی کہ اسکی مثالیں نایاب نہیں ہیں۔ اس سلسلہ میں یہہ خیال بھی دلچسپ ہے مگر تصدیق کا محتاج کہ غصے میں ہنسی جنہیں آتی ہے اون میں زیادہ تر

ورتیں ہوتی ہیں بخلاف اسکے بنچ میں ہنسنے والوں میں مردوں کی تعداد غالب ہے
غصہ میں ہنسی آنے کی مثال میں ایک لطیفہ جسکی حقیقت میں شبہ نہیں نقل
کیا جاتا ہے۔

صوبہ متحدہ کے ایک مشہور کالج میں ایک پروفیسر تھے جنہیں غصہ میں ہنسی آیا کرتی
تھی جہاں جماعت میں لڑکوں کے شور وغل یا کند ذہنی یا بے موقع سوالات (اس
عنوان میں وہ سوالات بھی شامل تھے جنکا جواب پروفیسر صاحب نہ لے سکتے ہوں)
سے ان کی طبیعت منغض ہوئی اور اون کے چہرے پر تبسم نمودار ہوا۔ لڑکے نادان پہلے
ہیں یہ سمجھتے تھے کہ پروفیسر صاحب اون کی ظرافت سے خوش ہوئے اور اپنی حرکتیں
اور شد ومد سے دہراتے تھے۔ مگر جب پروفیسر صاحب کا غصہ بڑھتے بڑھتے خندۂ دندان نما
تک اور لڑکوں کی شرارت طوائف الملوکی تک پہونچتی تھی تو جناب موصوف کو تاب نہیں
رہتی تھی اور لڑکوں پر برق تبسم کے ساتھ سرزنش اور تہدید کا طوفان اس زور شور
سے نازل ہوتا تھا کہ اون کی آنکھیں کھل جاتی تھیں اور وقت گذر جانے کے بعد وہنیں
اپنی غلطی کا احساس ہوتا تھا۔ یہ مثال ضمنی طور پر اس قول کے خلاف شہادت دیتی ہے کہ
غصہ میں ہنسی عموماً عورتوں کو آتی ہے۔ کیونکہ پروفیسر صاحب یقیناً مرد تھے۔

ہماری روزمرہ بول چال میں ایک ہنسی کھسیانی ہنسی کے نام سے مشہور ہے
یہ ایک مرکب جذبہ کو ظاہر کرتی ہے جو غصہ رنج اور شرم سے ملکر بنتا ہے اسکی ایک عمدہ
مثال یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کے تعاقب میں دوڑے اور ٹھوکر کھاکر گرے اور زیادہ چوٹ
نہ آئے تو گرنے والا گرد جھاڑتا ہوا اٹھیگا اور جسکا تعاقب کر رہا تھا اوسکی یا اور دیکھنے والونکی
ہنسی اور اپنی ناکامی اور رسوائی کی ندامت سے کھسیا جائے گا بعض اوقات ایسی
صورت میں وہ اپنی ندامت کو چھپانے کے لیے ہنسنے کی کوشش کرے گا اسی کوشش
کا نتیجہ چہرے کی وہ بگڑی ہوئی اور مضحک قطع ہے۔ جو کھسیانی ہنسی کہلاتی ہے۔

ہنسی کی محرک بعض وقت قوائے دماغی اور ذہنی کی وہ کیفیت بھی ہوتی ہے جو بیوقوفی کہلاتی ہے۔ یہ عجیب بات ہے انسان میں جتنے دماغی اور جسمانی نقصائص ہیں اون سب میں یہ خاص نقص عام لوگوں کے نزدیک زیادہ قابل اعتراض اور قابل شرم ہے۔ حالانکہ اگر غور کیا جائے تو بیوقوفی بھی اوسی طرح ایک قدرتی کمزوری ہے - اور اوسی قدر درگذر کے قابل ہے۔ جیسے لنگڑا ناگر دنیا جسکی سمجھ کا یہ حال ہو کہ کانا ہونے کو اندہا ہونے سے زیادہ قابل افسوس اور قابل ملامت سمجھتی ہے اس طرف ذرا بھی توجہ نہیں کرتی اور بیوقوفی پر علاوہ طرح طرح کے الزامات لگانے کے اسے قابل مضحکہ بھی سمجھتی ہے۔ اسلئے بیوقوف افراد جب کسی بات کو نہ سمجھیں یا غلط سمجھیں تو وہ جانتے ہیں کہ اسکے اظہار سے اون پر ہنسی ہوگی اسلئے بغیر محسوس کئے ہوئے وہ طاعون کے ٹیکہ کے اصول پر دوسرے کی ہنسی کی روک تھام اپنی ہنسی سے کرتے ہیں اور بجائے اپنا عجز فہم ظاہر کرنے کے محض دوسروں کے خوف سے ہر بات کو بخوبی سمجھ جانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ درسگاہوں میں علمی مجلسوں میں بلکہ روزمرہ گفتگو میں بھی بز اخفش کے قصہ کی تجدید اکثر ہوتی ہے فرق اتنا ہے کہ مولانا اخفش کی بکری جناب ممدوح کے فاضلانہ خطبہ کے بعد محض سر ہلا دیا کرتی تھی اور اوسکے ناطق قایم مقام بالعموم اپنی پسندیدگی اور فہم کا اظہار ہنسی سے کرتے ہیں۔ مگر ایسی ہنسی میں عدم وقوف کی کیفیت چہرہ پر اسقدر صاف ہوتی ہے کہ اسکے پہچاننے میں شاذ و نادر ہی غلطی ہو سکتی ہے۔

بعض لوگ شرم کا اظہار ہنسی سے کرتے ہیں ہمارے ہندوستان میں اگر کسی بھولے بھالے شرمیلے نوجوان سے اوسکی شادی کا ذکر کیا جائے تو وہ بالعموم ہنسکر چپ ہو رہتا ہے یہ بحث کہ شروع میں شرم کی کیا گنجایش ہے اس مضمون سے تعلق نہیں رکھتی۔ البتہ یہ مسئلہ ضرور قابل غور ہے کہ شرم کی ہنسی ضعف قلب کی ہنسی کا دوسرا نام ہے یا اسکی نوعیت جداگانہ ہے یا بالفاظ دیگر شرم بھی ضعف قلب کی ایک قسم ہے یا یہ ایک جذبہ کی کیفیت رکھتی ہے۔ یہاں تفصیل سے اسکے موافق اور مخالف دلائل بیان نہیں کئے جا سکتے البتہ شرم اور

ضعف قلب جس کو کسی کم ایک قوی رابطہ ہونے کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ کم عمر نوجوان جنکا قلب زمانہ کے حوادث اور صدمے کا عادی نہیں ہوتا۔ زیادہ ضعیف القلب ہوتے ہیں اور اسی کے ساتھ ان میں حیا بھی زیادہ ہوتی ہے۔ بمقابلہ انکے پختہ کار حضرات جنکے تمام قوی نصف النہار کے نقطہ پر ہوتے ہیں شرم کے جھگڑے میں ضرورت سے زیادہ نہیں پڑتے۔ مگر اسی کے ساتھ انکی مخالف مثال کہنہ سال بڈھے پیش کرتے ہیں۔ جنکا قلب اکثر بچوں کی طرح ضعیف ہوتا ہے۔ مگر بھی شرم و حیا کی قید سے قریب قریب آزاد ہوتی ہیں۔ اس مثال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ضعیف القلبی اور شرم کا ساتھ ہونا ضروری نہیں ہے غرض یہ مسئلہ زیادہ بحث طلب ہے اور یوں سرسری طور پر اس کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔

ابتک ہنسی کی جتنی اقسام کا ذکر ہوا ہے وہ سب سوائے کھسیانی ہنسی کے قدرتی طور پر کسی جسمانی یا دماغی سبب سے ظہور پذیر ہوتی ہیں بخلاف اس کے کھسیانی ہنسی سچی نہیں بلکہ بناوٹی ہوتی ہے اسی قبیل سے فریب کی ہنسی اور اخلاق کی ہنسی بھی ہے۔ جنس کے لحاظ سے یہ دونوں بناوٹ کی ہنسی میں داخل ہیں بلکہ ان کی غرض بھی اس حد تک مشترک ہے کہ دونوں ہنسنے والے کے اصلی خیالات کو پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں فرق اتنا ہے کہ جو فریب دینے کے لئے ہنستا ہے وہ چاہتا ہے کہ دوسرے سے ناجائز فائدہ اوٹھائے اور جو اخلاقاً ہنستا ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ دوسرے کو ناجائز فائدہ پہونچائے یورپ کے کسی قہوہ خانہ (Restaurant) میں یا کسی دوکان میں اگر وہاں کا منتظم اجنبیوں کے ساتھ خوفناک حد تک مہمان نوازی سے پیش آئے اور بات بات پر خوش مزاجی سے قہقہہ لگائے تو اوسکی غرض یہ ہوتی ہے کہ اوسکی نیک دلی پر بھروسہ کرکے اوسکے گاہک اوس کی رائے کو قیمت کے مقابلہ میں قطعی سمجھیں۔ بخلاف اسکے جو لوگ کسی دماغ چاٹنے والے باتونی آدمی کے بے تکے اور بے معنی لطیفوں پر اخلاقاً ہنسیں وہ چاہتے ہیں کہ بجائے اون اسمائے صفات کو زبان پر لانے کے جو اون کے خیالات کی صحیح ترجمانی کرتے وہ اپنی ہنسی سے اوس یاوہ گو کی ہمت افزائی

کریں۔ اِس اخلاق سے ایک فرد کو ناجائز فائدہ ضرور پہونچتا ہو مگر بنی نوع انسان کے آلام و مصائب میں اور ترقی ہوتی ہے۔

بناوٹی ہنسی کبھی زبردستی کی ہنسی بھی کہلاتی ہے مگر زبردستی دو طرح کی ہوتی ہے ایک وہ جو انسان اپنے آپ پر کرے اور دوسری وہ جو کوئی دوسرا اسپر کرے۔ کبھی انسان کو ہنسی نہیں آتی مگر زبردستی ہنستا ہے اور کبھی دوسرا اُسے زبردستی ہنساتا ہے یہ ہنسانا گدگدانے کے ذریعہ سے عمل میں آتا ہے۔ قانون نے ضررجسمانی کو جرم قرار دیا ہی مگر واضعان قانون کا ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوا کہ اِس وحشیانہ ظلم کو روکے حالانکہ دنیا میں اس سے زیادہ ناقابل رحم حالت کسی کی نہ ہوگی جسے اپنے درد دل کا یا کم سے کم پسلی کے درد کا اظہار ہنسی سے کرنا پڑے۔

گدگدی سے ذہن بہ آسانی اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ کبھی کبھی یہ بھی ممکن ہی کہ وہ ہنسی جس کا محرک مندرجہ بالا جذبات میں سے کوئی جذبہ ہو آگے چلکر خوشی کی ہنسی بنجائے۔ مریضوں اور فاترالعقلوں کی ہنسی کو چھوڑکر اور ہر طرح کی ہنسی میں یہ بات ممکن ہے۔ مثلاً کوئی شخص شرم یا اخلاق سے ہنس رہا ہو تو یہ ممکن ہے کہ کچھہ دیر کے بعد اوسے محض اپنی شرم یا اخلاق پر یا کسی اور سبب سے سچ مچ کی ہنسی آجائے۔

ان مثالوں سے یہ اچھی طرح ذہن نشیں ہوتا ہی کہ ہنسی کے آئینہ میں علاوہ مسرت کے اور طرح طرح کے رنگ بھی چمکتے ہیں۔ اب اس ہنسی پر بھی ایک نظر ڈالنا ہی جو حقیقت میں خوشی کا اظہار کرتی ہے مگر یہ پہلے ہی کہدینا چاہیئے کہ جس طرح ہر ہنسی خوشی کی علامت نہیں اوسی طرح ہر خوشی کا اظہار ہنسی سے نہیں ہوتا خصوصاً لطیف دماغی لذات سے جو خوشی ہوتی ہی اوس میں ہنسی کو شاذونادر ہی دخل ہوتا ہی۔ مثلاً جن لوگوں کو فنون لطیفہ سے ذوق ہے وہ جانتے ہیں کہ ایک خوشنما تصویر کو دیکھکر یا ایک دلکش راگ کو سنکر دل کو جو خوشی ہوتی ہے اوس کا اثر بیرونی طور پر کبھی تو مطلق ظاہر نہیں ہوتا کبھی محض چہرے پر

غیر معمولی دلکش آتفاقات اور شاذ و نادر تبسم سے اسکا اظہار ہوتا ہے۔ اور یہ تو کبھی نہیں ہوتا
(کہ موقلم کے اعجاز کو دیکھ کر قہقہہ لگائے) زنقاشی کا دلدادہ بلبل
(کہ نظارے ہنسی سے بے چین ہو جائے) یا سنگتراشی کا شیدا فیثاغورس یا پسیو
اسی طرح بہت سی وجدانی مسرتیں ایسی ہیں جو دل کی حرکت خون کی گردش وغیرہ پر اثر ڈالتی
ہیں۔ لیکن قہقہہ یا تبسم کی شکل میں نمودار نہیں ہوتیں۔

البتہ ادنیٰ درجہ کی خوشی سے جو انسان کو کسی دوسرے کی ذلت یا تکلیف سے یا اپنے
تفوق کے اظہار سے یا محض کسی غیر معمولی چیز کے دیکھنے سے ہوتی ہے ضرور پیٹ میں بل پڑ جاتے
ہیں۔ ایک مثال جو ایک مختلف حیثیت سے پہلے ہی لائی جا چکی ہے اس مطلب کو واضح کر دیگی۔
اگر کوئی سفید پوش مجمع عام میں کیچڑ میں پیر پھسل جانے کے سبب سے چاروں خانے چت
گرے تو چھوٹا بڑا۔ عالم۔ جاہل جس کسی کی نظر سے یہ واقعہ گذرے بیساختہ ہنس پڑے گا۔
اب اگر اس ہنسی کی علت پر غور کیا جائے تو سوائے اسکے کچھ نہیں کہ گرنے والے کی تکلیف یا
ذلت سے لوگوں کو خوشی ہوئی۔ اسی طرح کسی چیز پر محض اسلئے ہنسنا کہ وہ کسی لحاظ سے غیر
معمولی ہے کوئی اعلیٰ جذبہ مسرت نہیں کہا جا سکتا۔ دیکھا گیا ہے کہ بعض موٹے آدمیوں پر لوگ
محض اسلئے ہنستے ہیں کہ اون کا پیٹ آگے بڑھ کر توند کی حد تک پہونچ گیا ہے یا کسیقدر
ٹیڑھا ہو کر پہلو کے ساتھ بجائے زاویہ قائمہ کے (Right angle)
زاویہ حادہ بناتا ہے۔

لیکن نہ ہنسی کے اسباب کی چھان بین سے یہ منشا ہے اور نہ اس تحقیق کے نتیجہ سے
یہ ثابت ہوتا کہ ہنسی بری یا مضر چیز ہے۔ اوس ہنسی سے قطع نظر کرکے جو حقیقت میں خوشی کی
دلیل ہے اور ہنسنے والے کی سچی مسرت کا اثر دوسروں پر ڈالکر انہیں بھی خوش کرتی ہے اور
ابا بعث پیدا ہونے والی ہنسی بھی اکثر فائدہ سے خالی نہیں ہوتی یہ پہلے ہی کہا جا چکا ہے

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

کہ اس قسم کی ہنسی کی حیثیت ابتدا میں کچھ بھی ہو مگر آگے چلکر اکثر یہ خوشی کی ہنسی بنجاتی ہے
اور مصنوعی طریقہ سے بچی مسرت پیدا کردیتی ہے۔ کم سے کم یہ تو ہر شخص تسلیم کرے گا کہ ہنسنے سے
ایک طرح کا "سرور" پیدا ہوتا ہے۔ جو تھوڑے سے نشہ کی کیفیت سے ملتا جلتا ہے۔ انسان
کا دماغ جب کشاکش حیات کے ہنگامہ سے تھک جاتا ہے تو ہنسی اوس کے لئے ہلکی سی ورزش
کا کام دیتی ہے۔ یہ بھی ناممکن نہیں ہے کہ رنج و ملال کے ہجوم میں انسان زبردستی ہنسے اور
یہ ہنسی اسکے ذہن میں خیال پیدا کردے کہ اوس نے اون ناگوار جذبات کو دور کردیا ہے۔ اور
دہوکے میں وہ خوش ہوجائے۔ کم سے کم اتنی شہادت تو ایک بزرگ کے تجربہ سے ملتی
ہے انہوں نے ایک بار پریشانی اور رنج کی حالت میں ایک فلسفی کا مشورہ یاد کرکے مسکرانیکی
کوشش کی تھوڑی دیر کے بعد اونہیں اپنی یہ کوشش ایسی مضحک معلوم ہوئی کہ بے اختیار
ہنس پڑے اور اونکا مقصد حاصل ہوگیا۔

سچ پوچھئے تو ہندوستان کے علمی مذاق کے نوجوان بہت ہی کم ہنستے ہیں جس سے
ان کے دل و دماغ پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ منجملہ اور اسباب کے اس کا ایک سبب یہ بھی ہے
کہ جسمانی ورزش کی کمی ہے اور غور و فکر کی مضر حدتک زیادتی ہے بلکہ غور اور تشویش میں تمیز
نہ کرنے کے سبب سے اون میں کچھ عجیب طرح کی افسردگی پیدا ہوجاتی ہے۔ اور اون کی طبیعت
کبھی ہنسنے کو نہیں چاہتی۔ حالانکہ اگر یہ حضرات دل کڑا کرکے کبھی کبھی زور سے قہقہہ لگایا
کریں تو عجب نہیں کہ یہ آواز طلسم کشا بنکر حزن و ملال کے طلسم کو توڑدے۔

مگر جس طرح ہر چیز کے بُرے استعمال سے اُس کی اچھائیاں بُرائیوں میں تبدیل
ہوجاتی ہیں۔ اسی طرح ہنسی کی زیادتی بھی مضرت سے خالی نہیں۔ زیادہ ہنسنا زیادہ نشہ
کی طرح دماغ کو بیکار کردیتا ہے۔ اگر کسی پیچیدہ مسئلہ پر انسان کو غور کرنا ہو تو ہنسی سے اس
سنجیدگی میں خلل پڑتا ہے جسکی دماغ کو اوسوقت ضرورت ہوتی ہے اسلئے وہ لوگ جن کو
سوائے ہنسنے کے کوئی کام نہیں کچھ دن کے بعد غور و فکر کی قوت کھو دیتے ہیں بلکہ اگر ہنسی

بہت زیادہ بڑھ جائے تو قوت عمل بھی کمزور ہو جاتی ہے کیونکہ عمل کا تعلق خیال اور فکر
ت بہت زیادہ ہو۔

فنون لطیفہ سے ذوق رکھنے والے زیادہ ہنسنے پر فلسفۂ حسن کے معلمین (Aesthetes)
لوگ سے اعتراض کرتے ہیں۔ انکا خیال ہو کہ ہنسنے میں چہرہ کی ہیئت بگڑ جاتی ہے اور
اور تصویر کھینچنے کے قابل نہیں رہتی۔ اگر طوفان خندہ اس حد تک پہونچ جائے کہ انسان کو
پیٹ پکڑ کر لوٹنا پڑے تو ان نازک طبع حضرات کو دیکھنے کی تاب نہیں رہتی۔ یہ ہنسنے
کے لئے بڑی کڑی شرطیں لگاتے ہیں۔ سوکھی ہنسی نہ ہو۔ زیر خندہ نہ ہو۔ ہنسنے میں تمام
جسم نہ ہلے۔ ہنستے وقت بیچ بیچ میں گلے سے بطخ کی آواز نہ نکلے۔ غرض اسی طرح کی
اور قید بند لگا کر انہوں نے ہنسنے کو اتنا مشکل بنا دیا ہے کہ سہولت پسند لوگ رونے کو
اسکے مقابلہ میں زیادہ ترجیح دینگے۔ کیونکہ یہ "پابندے نہیں ہے"

برلن ۷ر فروری ۱۹۲۳ء "عابد"

تنقید

شفق مدراس

ابتک مدراس بنگلور وغیرہ بلا جنوب اقصیٰ کی ادبی جد و جہد زیادہ تر مشاعروں
اور غزلوں کے گلدستوں تک محدود تھی اور ہم اسی کو اردو کے لئے بہت مغتنم سمجھتے تھے
لیکن مقام مسرت ہے کہ اب انکا مذاقِ سخن صحیح رستہ اختیار کر رہا ہے۔ مدراس سے ایک
ماہوار ادبی رسالہ نکلنے لگا ہے جسکے چار نمبر ابتک شایع ہو چکے ہیں۔ اکثر مضامین نثر
اعلیٰ درجہ کے ہوتے ہیں جن پر اردو کے بہترین علمی رسایل فخر کر سکتے ہیں، ان کے ساتھ

ہمیں یہ دیکھکر افسوس ہوتا ہے کہ تغزل کی غیر مستدل محبت جو مشق اُردو کے لئے ابتداءً ضرور مفید ہوتی ہو اس رسالہ کے علمی حسن و جمال کو بگاڑ رہی ہے۔ کاش عام عاشقانہ غزلوں کے لئے گلدستے ہی وقف رکھے جائیں۔ اور علمی رسائل ان سے پاک ہوں۔

یاد ش بخیر شفق کو دیکھکر مرحوم صبح بہار یاد آیا جو اب سے بارہ سال پیشتر مدراس سے بھی دور دراز خالص ہند و ریاست میسور سے کئی سال تک بالاستقلال نکلتا رہا اور نہایت عمدہ حالت میں۔ اس کا مذاقِ سخن بھی نسبتہً بہت اچھا تھا۔ ہمیں توقع تھی کہ اتنی مدت میں ذہنیتاً مدراس ارتقا کی اوس منزل تک ضرور پہنچ جائیگی جو میسور کی بارہ سال قبل کی حالت سے ارفع ہو۔ اور الحمد للہ کہ شفق نے یہ توقع بہت کچھ پوری کی۔ ہم نہایت گرمجوشی کے ساتھ اس نئے معاصر کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور مدیر صاحب سے امید رہتے ہیں کہ حصۂ نظم کے میار کو بلند تر اور مقدار کو کمتر کرینگے۔ طبع زاد ناول جن کے لکھنے میں نوجوان قلم اکثر جادۂ متانت سے بہک جاتے ہیں کم درج ہوں اور اس کے عوض تعلیم یافتہ نوجوانوں کو غیر زبانوں سے مفید مضامین کے ترجمے کی ترغیب دیں۔ کہ یہ کوچہ بہت وسیع ہے اور اس وقت اُردو کی زیادہ خدمت اسی رستے سے ہو سکتی ہے۔ کتابت و طباعت کی طرف زیادہ توجہ کی ضرورت ہے چندہ سالانہ چار روپیہ۔ حجم ۴۵ صفحہ تقطیع ۲۲ × ۱۸ -

"ناقد"

رفتار تعلیم

ماہ فروری کے اخیر ہفتہ میں ایک آل انڈیا تعلیمی کانفرنس بنارس میں ہو رہی ہے جسمیں تمام قومی درسگاہوں اور ان تعلیمگاہوں کے نمایندے جو باوجود سرکاری الحاق کے قومی طریقہ پر تعلیم دے رہی ہیں، مدعو کئے گئے ہیں۔ رائے دینے کا حق صرف اول الذکر کو ہوگا۔ حسب ذیل مسائل زیر بحث ہونگے:۔

(۱) قومی تعلیم کی تعریف اور اس کے اغراض۔ (۲) تنظیم و تربیت۔

(۳) نصاب تعلیم، (صنعتی تعلیم، چرخہ، ہندی اُردو علمی اور سائنٹفک تعلیم، قدیم زبانوں اور جسمانی تعلیم کی کیا حیثیت رکھی جائے اور انکے لیے کونسے طریقے اختیار کیے جائیں؟

(۴) ذریعہ تعلیم۔ (۵) مفت ابتدائی تعلیم (۶) تعلیم دیہات (۷) تعلیم نسواں۔

(۸) تمام ملک کے لئے ایک عام نصاب تعلیم (۹) قومی تعلیم گاہوں کو ہر طبقہ میں مقبول بنانا (۱۰) تعلیمی پروپگنڈا کی تنظیم (۱۱) قومی تعلیم میں مذہب کی حیثیت (۱۲) مختلف دیسی زبانوں میں درسی کتابوں کی تیاری۔

(۱۳) ان درسگاہوں کے تعلیم یافتہ طلبا کے لئے کام کا مسئلہ۔

(۱۴) ایک اچھے اسکول کی درستگی و تیاری۔ (۱۵) ڈسپلن اور اوسکی تعمیل۔

(۱۶) گھر اور مدرسہ میں اتحاد عمل (۱۷) اساتذہ کی حالت میں ترقی دینا۔

(۱۸) کانگریس کی طرف سے ایک ایجوکیشنل سروس کی تنظیم۔

(۱۹) قومی درسگاہوں کا تعلق کانگریس کمیٹیوں سے۔

(۲۰) ایک آل انڈیا تعلیمی جماعت کا تقرر ملک میں قومی تعلیم کی تنظیم یا نگرانی اور مالی اعانت کے لیے اور اسکے تعلقات آل انڈیا کانگریس کمیٹی سے (۲۱) قومی تعلیم گاہوں کا معائنہ۔

(۲۲) قومی تعلیم کی اشاعت کے لیئے ایک ماہوار یا ہفتہ وار اخبار کا اجرار۔

(۲۳) ایک کمیٹی کا فوری تقرر جو ملک میں گشت کرکے قومی تعلیم کے متعلق معلومات فراہم کرے اور اسمیں ترقی کے لئے اپنی تجاویز پیش کرے۔

(۲۴) جو اسناد قومی تعلیم گاہوں سے طلبار کو دیجائیں ان کی رجسٹری اور تمام ہندوستان کی جانب سے ایک منظوری۔

مغربی ممالک میں تعلیم دینے کے آسان سے آسان تر طریقے دن بدن جو رائج ہورہے ہیں اون میں سے ایک طریقہ بذریعہ تصاویر کے ہے۔ خیالی اور روزانہ چشم حالات و واقعات محسوس صورت میں پبلک کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں جن سے اون کا صحیح نقشہ نظروں میں پھر جاتا ہے اور وہی سماں آنکھوں کے سامنے نظر آتا ہے۔ اس طریقے سے نہ صرف طلبا اور اساتذہ کو تعلیم میں آسانیاں بہم پہنچتی ہیں بلکہ ایک کثیر رقم کی بچت بھی ہوتی ہے۔ ابھی انگلستان میں جو مجموعہ تصاویر تیار ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک "رموز قدرت" ہے ایک دوسرے مجموعہ سے گھریلو مکھی کی پوری زندگی انڈے کی حالت سے لیکر بڑی ہونے تک دکھائی گئی ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ موسم سرما میں یہ مکھیاں کہاں غائب ہوجاتی ہیں۔

ہم نے تو ابھی اسیقدر سیکھا ہے کہ اگر اپنے یہاں ممکن نہو تو طلبا باہر کے ممالک میں جاکر تعلیم حاصل کریں اور دوسروں کے خیالات و حالات سے مستفید ہوں لیکن انگلستان کی امپیریل یونین آف ٹیچرز نے غیر ممالک سے تبادلۂ اساتذہ کے لئے ایک اعلان شائع کیا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے مشاہرہ اور سامان رہائش وغیرہ میں ہر قسم کی رعایت ملحوظ رکھی ہے۔

دمشق میں جو عہد اسلامی میں تعلیم و تعلم کا گہوارہ تھا، ایک یونیورسٹی کا افتتاح ہوا ہے
جو جامعہ اسلامیہ شام کے نام سے موسوم ہوگی۔ اسکے جلسۂ افتتاح میں علماء اور دیگر پیشوایان
مذہب، ارکان و اعیان حکومت شریک تھے۔ اعلیٰ کمشنر کا نمایندہ بھی موجود تھا۔ رسم افتتاح
پر اسلامی حلقوں میں بہت کچھ اظہار مسرت کیا جارہا ہے۔

تجربہ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ ہندوستانی طلباء کے لیے جسمانی ورزش پر زور دینا
بے سود ثابت ہوا ہاں اگر تعلیمی روشنی میں اسکے فوائد بتائے جائیں تو ممکن ہے کہ ان کے
نزدیک قابل عمل ثابت ہوں۔

ٹائمز کے کسی گذشتہ اشاعت میں ایک مضمون نکلا ہے جسمیں مضمون نگار نے ورزش کی
تعلیمی اہمیت پر زور دیا ہے۔ موصوف کا قول ہے کہ کھیلوں سے انسان میں قوت فیصلہ اور
استقلال مزاج کے اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔ اعتماد نفس کے بغیر حیت ممکن نہیں۔ اگرچہ کھیل
میں بظاہر قوت جسمانی کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ فائدہ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا
کہ اس سے پابندی قانون، اور اتحاد عمل کی عادت بھی ہوتی ہے۔

"معلم"

کلامِ شاد

درِ دوست پر ہوں جھکائے سر، مرے دل کو شغلِ نیاز ہے
نہ قعود ہے نہ قیام ہے، یہ عجب طرح کی نماز ہے!

جو کہوں تو ختم نہ ہو سکے، جو سُنے کوئی تو غلش رہے
ترے دونوں گیسوؤں کا بیاں مری زندگی سے دراز ہے

کوئی بات اُٹھا نہ رکھی غرض، تھی نگاہِ شوق وہ بدبلا
عجب اس کا کیا جو وہ بخش دے کہ رحیم بندہ نواز ہے

کہیں ایک وعدہ وصال کا جو وفا ہوا بھی تو کیا ہوا!
مجھے حیف اپنی نگہ پہ ہے انھیں اپنے جلوہ پہ ناز ہے

نہیں مدتوں سے وہ ولولہ، دلِ زار سینے میں جل گیا
فقط ایک ڈھیر ہے راکھ کا، نہ وہ سوز ہے نہ گداز ہے

جو کہیں حریف وہ کہنے دے کہ مقام ہی ہے سکوت کا
کہاں ان سمجھیں اہلِ قری اسے کہ یہ شاؔد بانگِ حجاز ہے

جامعۂ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

کے

شعبۂ تصنیف و تالیف کی شایع کردہ کتابیں

(۱) ازہار العرب ۔ مؤلفہ مولانا سورتی — قیمت غیر مجلد ۸ ر

(۲) تاریخ الامت ۔ مصنفہ مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری — قیمت ۸ عہ

(۳) ایضاً (حصہ دوم) ۶ ۸ (حصہ سوم) — " " عہ ۸

(۴) مبادی معاشیات ۔ از پروفیسر ذاکر حسین خاں صاحب — " " عہ

(۵) اخبار الدولتین ۔ از مولانا نیاز فتحپوری — (زیر طبع)

(۶) انتخاب کلام میر ۔ مرتبہ مولوی نور الرحمن بی اے — (")

(۷) خطبہ شیخ الہند ۔ (بہ تقریب افتتاح جامعہ) — قیمت ۲ ر

(۸) خطبہ مسیح الملک ۔ حکیم اجمل خاں صاحب — " ۲ ر

(۹) انتخاب مضامین جوہر ۔ معہ تصویر — " عمر

(۱۰) ترکوں کی کہانیاں — " ۴ ر

المشتہر

مہتمم مکتبۂ جامعۂ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

جامعہ میں صنعتی تعلیم

کے

لئے مندرجہ ذیل شعبے کھلے ہوئے ہیں جن میں طلباء جامعہ خود کام کرتے اور سیکھتے ہیں اور جن کا تیار کردہ مال بہ کثرت باہر بھیجا جاتا ہے۔

قفل سازی ~~پارچہ بافی~~ ~~مطبع~~

شعبہ کے مہتمم سے اوس شعبہ کے سامان اور قیمت کے متعلق گفتگو فرمائیے اور مفصل فہرست طلب کیجئے۔

المعلن

مہتمم حرفہ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

جامعہ کیلنڈر

مستقل و پائدار چیز ہے خوش نما اور نظر فریب ہونے کے علاوہ عمدہ قومی اشعار کا مجموعہ ہے جو ہر تاریخ کے کارڈ پر لکھے ہوئے ہیں۔
قیمت ۶ر

مطبع ملیہ

ٹائپ اور لیتھو کا کام نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ہوتا ہے نرخ مناسب اور کام قابل اطمینان ہے، بلاک سازی، اور آرٹ پرنٹنگ کا خاص اہتمام ہے۔

منیجر

مطبع ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

مولوی نورالرحمن طابع، ناشر، مدیر نے مطبع ملیہ میں طبع کرا کے شعبہ تصنیف و تالیف سے شائع کیا

اللہ اکبر

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

کا

ماہوار علمی رسالہ

مرتبۂ نور الرحمٰن

در مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ طبع شد

قیمت سالانہ للعہ

مطبع شرکت کاویانی برلن

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کو اس کمپنی کے مطبوعات کا مطلق حق فروخت رسول ایجنسی حاصل ہے
اور اصلی داموں پر فروخت ہوتی ہیں

۱۔ سفرنامہ ناصر خسرو مع روشنائی نامہ وسعادت نامہ (فارسی) مصنف چوتھی صدی ہجری کے آخر میں پیدا ہوا تھا۔ اس عہد کے بلاد اسلامیہ کے چشم دید حالات نہایت دلچسپ عبرت آموز ہیں مصنف کی دو غیر مطبوعہ نایاب مثنویاں بھی جو اخلاق اور فلسفہ و حکمت پر ہیں اس میں ضم ہیں۔ سرورق و سرنامہ اصل ایرانی نسخہ کے موافق مطلا ورنگین کاغذ اور چھپائی نظر افروز

۲۔ سنی ملوک الارض والانبیا مولفہ حمزہ ابن الحسن اصفہانی (عربی) جو ۳۵۰ھ میں لکھی گئی۔ انتہائی کاوش کے ساتھ قدیم تواریخ فارس روم یونان مصر عراق شام عرب کے متعلق تمام صحیح و معتبر سنین کی تعیین و تحقیق کی گئی ہے جو شائقین تاریخ کے لیے نہایت دلچسپ و مفید ہے۔

۳۔ تیاتر۔ مرزا ملکم خاں ناظم الدولہ (فارسی) وہی بزرگ ہیں جن کی قلمی و عملی جد وجہد سے ایران دوبارہ زندہ ہوا۔ یہ ان کے تین نثر ڈراموں کا مجموعہ ہے گذشتہ صدی کے نظام حکومت ایران کی ابتری کی تصویر ہے۔ زبان شائستہ اور لڑکوں کے مطالعہ کے لیے بھی موزوں

۴۔ موش و گربہ۔ از عبید زاکانی جو آٹھویں صدی کا مشہور ہجو گو شاعر تھا۔ قصہ تو چوہے بلی کی جنگ کا ہے مگر مقصود ابنائے عصر کی ہجو ملیح ہے جو عہد حاضر پر بھی یکساں چسپاں ہے۔ ہر صفحہ ایک رنگین تصویر سے مزین ہے نظم سلیس و مہذب ہے بچوں کیلیے بھی نہایت موزوں۔ اس کے سارے نسخے ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئے۔ شائقین کو آیندہ ولایتی ڈاک تک تین ہفتے انتظار کرنا چاہیے۔ /۵۰

ملنے کا پتہ:۔ مہتمم مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

جلد | رجب المرجب ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۵ مارچ ۱۹۲۳ء | نمبر ۳

شذرات

انقلاب زمانہ کی سب سے زیادہ عبرتناک مثال حال ہی میں سرزمین مصر میں ظاہر ہوئی ہے جہاں فرعون مصر کے خزائن ودفینہ پر انسانی ہمت وجرأت نے اعجاز موسوی کی طرح قبضہ کیا ہے اور اس راز سربستہ پر فتح پائی ہے جو ہزارہا سال سے وادی نیل کے ایک گوشہ میں فرعونیت مصری جاہ وحشمت کے یادگار کے طور پر دفن تھی۔ فرعون اگر دنیا کی دولت جمع کرنے اور اپنی سلطنت کے لاکھوں مستحق باشندوں کو اُن کے جائز حقوق وذریعہ دولت سے محروم رکھنے کے بعد اپنی فرعونیت کے لیے سازوسامان مہیا کرسکتا تھا تو قدرت الٰہی جو فرعونی قوت وموسوی اعجاز دونوں کا سرچشمہ ہے اپنی برتری کے اظہار کے لیے دوبارہ اُسی قوم کو جو فراعنہ مصر کی جابرانہ حکومت میں نشانہ ستم رہی ہے پھر اُسی دولت کا مالک وقابض بنا سکتی ہے۔ فرعونیت کا یہ انجام اور اُس کی لاش کی یہ رسوائی دنیا میں کوئی نیا واقعہ نہیں۔ لیکن اب اس زمانہ میں اُس ہمت مردانہ اور عزم وثبات کا ظہور ضرور ہو چلا ہے جس کی بدولت یہ عظیم الشان خزانہ سلطنت مصر کے ہاتھ آیا تقریباً ایک ربع صدی کی مسلسل سعی اور ہمت شکن کوشش کے بعد دو انگریزوں نے بالآخر دنیا کی دولت علم تاریخ اور معلومات عامہ میں یہ گرانقدر اضافہ کردیا۔

جمال پاشا مرحوم کے نام سے ایک تازہ تصنیف سیاسیات اسلامی کے متعلق انگلستان کے مشہور ناشر ہچنسن کمپنی کی طرف سے شائع ہوئی ہے جو موجودہ حالات میں کہ کانفرنس صلح ہنوز اپنے مقاصد کی تکمیل نہیں کرسکی ہے اور وہ مسائل جو عالم اسلام کے ہیجان وانتشار کے باعث ہوئے ہیں اس وقت تک آخری صورت نہیں اختیار کرسکے ہیں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ آل عثمان کے کارنامے اور بالخصوص گزشتہ جنگ کے واقعات اپنی نرالی شان کی وجہ سے فسانہ وداستان سے کم دلچسپ نہیں لیکن تاریخی حیثیت سے ان سب کے متعلق رائے قایم کرنا

اس لیے اور بھی دشوار ہو جاتا ہے کہ ان مضامین پر قلم اٹھانے والے بھی "درون خانہ" نہیں بلکہ "بیرون در" کام کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ پھر زبان، روایات، خصوصیات قومی کا فرق، مذہبی نسلی تعصبات، اس کی واقفیت کی راہ میں حائل ہوتے ہیں چنانچہ واقعات کو اپنے اصلی رنگ میں ظاہر کرنا موجودہ لکھنے والوں کے لیے بہت دشوار ہو گیا ہے۔ ایسی صورت میں اگر جمال پاشا مرحوم کے نام سے کوئی تصنیف اُن واقعات کے متعلق شائع ہو جن میں مرحوم کی شرکت محض ایک ناظر و ناقد کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک نامور ہیرو کی طرح رہی ہو تو مسلمانوں کے لیے اس سے زیادہ دلچسپ کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ کچھ خصوصیات اس کتاب میں بھی پائے جاتے ہیں اور چند ابواب مثلاً بغاوت عرب، مسئلہ آرمینیا، دوم جنگ بلقان خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

گزشتہ عالمگیر جنگ کے زمانہ میں مسائل حاضرہ اور واقعات جنگ کے متعلق ہزارہا کتابیں شائع ہوئیں اور اُن میں سے بعض نے خاص مقبولیت حاصل کی اور چند نے دوسری زبانوں میں بھی اپنی جگہ کر لی۔ لیکن ایک بڑی تعداد ایسی تصانیف کی تھی جو مشہور و نامور افسران حکومت کے نام سے شائع ہوئیں مگر اُن میں تحوایت "نسخہ" یا مصلحت جنگ نے کر دی تھی چنانچہ بعض ایسی کتابیں موجود ہیں جن کے ہندوستانی، فرانسیسی اور انگلش ایڈیشن جداگانہ ہیں اور اُن میں مضامین کے اعتبار سے اگرچہ زیادہ فرق نہیں لیکن خیالات کا رجحان اور تحریر کا انداز اکثر جگہ کافی بدل گیا ہے۔ حالانکہ ان کتابوں پر بعض اوقات مصنفوں کے اپنے دستخط اور مہر بھی ہوتی تھیں!

تذکرہ جمال پاشا کے متعلق محبس کی طرف سے کوئی اطلاع اس امر کی نہیں کہ یہ کتاب تصنیف ہے کہ ترجمہ اور شائع کرنے والوں کو کس کی وساطت سے پہنچی۔ لیکن چونکہ دلچسپ اور بعض اہم واقعات کے متعلق جدید معلومات سے پُر ہے اس لیے اُس کے مقالات خاص کے متعلق آیندہ کسی قدر تفصیل سے صفحات جامعہ میں ذکر کیا جائیگا۔ اور امید ہے کہ جلد یہ کتاب علی گڑھ سے

سے اُردو میں شائع بھی ہو جائے گی اس لیے کہ ترجمہ ہمارے دوست نذیر نیازی صاحب بی۔ اے تقریباً مکمل فرما چکے ہیں۔

حقیقت و معرفت کو اس عالم آب و گل سے اس قدر بُعد رہا ہے کہ اب اگر کوئی کوشش ایسی کبھی کرنا [illegible] دنیوی ضروریات اور مادی اشیاء میں تبدیل کیا جائے تو شاید ہمارے "صوفیا" بھی باوجود خرق عادات و کرامات کے قائل ہونے کے اسکو گوارا نہ فرمائینگے ممکن ہے کہ یہ ناپسندیدگی صرف اس وجہ سے ہو کہ وہ اپنے طبقہ کو فضائے لامکاں سے نیچے اُتر کر ان حدود مکانی و آلائش دنیاوی سے قریب آلودہ ہوتے دیکھنا گوارا نہ فرماویں لیکن اس کے علاوہ ایک دوسری وجہ بھی ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ جن واردات سے زبان قلم کو بھی آشنا نہیں کیا گیا ہو اس کو منظر عام پر بے حجاب پیش کرنا خواہ اُس میں اس کرۂ خاک کے بسنے والوں کے لیے فائدہ ہی کیوں نہ ہو ضرور ایسا گناہ ہے جو "مقام تصوف" میں کسی طرح قابل معافی نہیں۔ لیکن ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب اس قسم کی ایک "جرأت رندانہ" ایک صوفی کی طرف سے ظاہر ہوتی ہے جن کے نام سے ایک اشتہار اس مضمون کا شائع ہوا ہے کہ اُنھوں نے لوگوں کی حاجت برآری کے لیے مختلف قسم کے کاموں کے لیے مختلف فیس مقرر کر دی ہیں اور اگر اپنے کام کو معمول کے خلاف عجلت سے کرانا منظور ہو تو اُس کے لیے "ایکسپریس" فیس ادا کرنی ہوتی ہے۔ اسی طرح درخواست کو نہایت مکمل اور باضابطہ عبارت میں پیش کرنا ضروری ہے تاکہ توجہ کے وقت ضروریات کا لحاظ کر لیا جائے اور وقت کا بھی اندار رہے۔

اس طبقہ کے بدنام کرنے والے اگرچہ ہمیشہ سے اپنے اغراض و مقاصد کے لیے نئے نئے ڈھنگ اختیار کرتے رہے ہیں لیکن جس تجارتی شان سے ان سہارنپوری بزرگ نے "دنیائے عمل" میں قدم رکھا ہے وہ محض صوفیوں ہی کے لیے نہیں بلکہ عام دنیا داروں کے لیے بھی عبرت انگیز ہے۔ اور گو ہم کو صاحبان کشف و کرامت کی جناب میں مجال سخن نہیں لیکن

اس موقعہ پر مولانا شبلی کا ایک شعر یاد دلانے کو بے اختیار دل چاہتا ہے۔ وہو ہذا

جمع کر لیجیے غمزوں کو مگر خوبی بزم تو جبھی وہیں تک ہے کہ بازار ہونے پائے !

رسالہ نائینٹینتھ سنچری (لندن) نے ایک مضمون سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کے قلم سے شائع کیا ہے جس میں مضمون نگار نے انگلستان اور مغربی تہذیب میں مذہبی روح کا پتہ لگانے کی ناکام کوشش کی ہے۔ اُن کو اعتراف ہے کہ مذہبیت دنیا کے اکثر امراض و تکالیف کا علاج ہے وہ یہ بھی تسلیم کرتے کہ جب انسان کی ذہنی و مادی ترقی معراج کمال کو پہنچ جائے تو مذہبی نصیبہ اُس کو حاصل ہوتی ہے گویا تب وہ مرتبۂ بلند ہے جو کوتاہ بین و کم فہم اشخاص کے لیے نہیں بلکہ صرف اُس شخص یا قوم کا حصہ ہے جو علم و عمل کے مدارج طے کر چکا ہو اور جو تہذیب و تمدن اور نیز علم و فضل کی آخری منزل پر فائز ہو۔ سر فرانسس حیران ہیں کہ انگلستان کے اخبارات اور رسائل اُس کے ڈرامے نظمیں اور قصے کیوں مذہبی خیالات مسیحیت کی داستان، مبلغوں نامور واعظوں اور عام مذہبی اطلاعات سے مبرا ہیں درآنحالیکہ اون میں مشہور رقاصہ عورتوں کی حالات اُون کی ہر ہر ادا کی تصاویر، عمارات، باغات، حتےٰ کہ گھڑیوں اور کتوں، موٹروں اور گاڑیوں کے متعلق بے شمار صفحات ہوتے ہیں، نیز جنگ آیندہ و گزشتہ معاملات سیاسی، اکتشافات جدید، آلات سائنس تجارت، روپیہ پیسہ اور منڈیوں کے متعلق بھی غیر محدود معلومات روزانہ مہیا کی جاتی ہے ؛ وہ خود ہی (غالبًا اپنی حیرت و استعجاب کو برمحل ثابت کرنے کے لیے) اس واقعہ کی تاویل اس طرح فرماتے ہیں کہ یہ اس لیے ہے کہ عام لوگوں کو مذہب مذہبی لوگوں اور مذہبی باتوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے اون کے نزدیک یہ محض رجحان طبیعت کی وجہ سے ہے ورنہ فی الحقیقت انگریز بھی ایسے ہی مذہبی لوگ ہیں جیسے وہ مسلمان جو پانچوں وقت نماز پڑھتے اور اکثر امور مذہبی کے تذکرہ سے اپنی محفل گرم رکھتے ہیں۔

طرز بیان کا فرق خواہ کچھ ہی ہو لیکن سر فرانسس کا یہ خیال کہ قوم میں قوائے ذہنی و

دماغی کا کامل نشو و نما ہو جائے اور ترقی کے معراج کمال پر پہنچ جائے تب اُس کو مذہب سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے اور گویا وہ مذہبی زندگی کے لیے طیار ہو جاتی ہے بالکل ہی نئی اور انوکھی چیز ہے ایشیا، مذاہب کا گہوارہ ہے اور خود سر فرانسیس نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے لیکن اس فخر سے اگر مذہبی واقفیت پر بھی اثر پڑتا ہے تو یقیناً ایشیا نے اس معاملہ میں جو رائے ہمیشہ سے قایم کی ہے وہ غلط نہیں ہے۔ مشرقی اقوام نے مذہب کو ہر انسان کے لیے خواہ وہ علوم و فنون سے بے بہرہ ہو یا فضل و کمال میں یکتائے روزگار یکساں ضروری قرار دیا ہے اور وہ مذہب کے اصول اولین وحشی اقوام وغیر متمدن ممالک میں بھی کسی نہ کسی شکل میں پاتے ہیں اور ان کے اصلاح کی برابر کوشش بھی کرتے رہتے ہیں۔

اس دور مادہ پرستی کا سب سے زیادہ حیرت انگیز منظر اگر کوئی ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ ہم کائنات میں اب کسی چیز کے حدود متعین نہیں کر سکتے" خواہ وہ عالم کیف سے متعلق ہو یا عالم کم سے۔

اب سے تین صدی قبل بڑے سے بڑا فیلسوف اس خیال پر قانع تھا کہ دنیا میں صرف چار عناصر کی حکومت ہے، لیکن آج تین سو ساٹھ سے زائد عناصر بسیط دریافت ہو چکے ہیں اور کسے خبر ہے کہ کل تک ہر انسان ایک مستقل عنصر نہ ہو جائے گا۔

زیادہ نہیں صرف گزشتہ نصف صدی کے اندر ذرائع سیر و سیاحت میں جو انقلاب ہوا ہے اس پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ہر جگہ ہوائی جہاز "آسمان پیداست" کا مصداق بنا ہوا ہے۔

اب سے قبل یہ دنیا کا نہایت یقینی تجربہ تھا کہ "جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی" لیکن اس زمانہ میں فرانس کا کوئی اسٹیج ایسا نہیں ہے جہاں ایک آدہ عجوزہ جاذب قلب و نظر نہ ہو۔

اور اگر تھایرائڈ گلانڈس کی تبدیلی طول عمر کی بھی ضامن ہو جائے، جیسا کہ حال ہی میں پیرس کے ایک محقق نے دعویٰ کیا ہے تو پھر بتائیے کہ امیر مینائی کا یہ مصرعہ کہ"۔

"تیرہ برس کے سن میں وہ لاکھوں برس ہوئے"

الہامی قرار پائے گا یا نہیں۔

جاپان کی بحری قوت، گزشتہ جنگ کی تاریخ، سائنس کی دنیا، صنعت و حرفت کی ترقیاں، تجارت کی دولت خیزیاں، الغرض ہر ہر چیز ایک غیر محدود وسعت کو پیش کر رہی ہے اور ایک انسان کے لیے نصب العین مقرر کرنا از بس دشوار ہو گیا ہے۔

یہی وہ لہر تھی جس نے یورپ میں جنس نازک کے طبقہ کو بھی "بدعت بیداری" میں مبتلا کر دیا۔ اور اس طرح سب سے پہلے لغت میں لفظ افتراعیہ کا اضافہ ہوا۔

اس وقت ہمیں اس سے بحث نہیں کہ ان افتراعیات نے ابتدائی مدارج ارتقا و مطالبات کیونکر طے کیے۔ بلکہ صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اُن کے "رقص عمل" کا دائرہ اب کس نقطہ کو گرانبار احسان کیے ہوئے ہے۔

قانونی طبقہ میں عورتوں کو جس قدر درخور حاصل ہو گا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اب بنگال و دیگر صوبجات ہندوستان میں بھی یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ ایک عورت کو جو قانون سے اعلیٰ ترین ڈگری حاصل کر چکی ہے عدالت میں آنے اور پیروی مقدمات کی اجازت دی جائے یا نہیں لیکن افتراعیات کے مساعی جمیلہ کا نہایت دل کش پہلو وہ ہے جو انگلستان کے دائرہ بحث و مباحثہ کا جولانگاہ بنائے ہوئے تھا۔ اُن کا یہ مطالبہ کہ سول سروس عہدوں میں انہیں بھی مردوں کی برابر حصہ دینا چاہیے دارالعوام نے بالاتفاق منظور ہی کر لیا اور تمام وہی اختیار و شرائط جو مردوں سے متعلق ہیں عورتوں کے لیے بھی تجویز کیے گئے۔ خیال ہوتا تھا کہ شاید ابھی یہ تجویز صرف انگلستان تک محدود رہے گی، لیکن ہندوستان عرصہ تک کیسے محروم رہ سکتا تھا چنانچہ صوبہ مدراس میں پہلی مجسٹریٹ عورت اپنا اجلاس کر رہی ہے۔

تذکرہ جمال پاشا کے متعلق ابھی بعض خیالات کا اظہار کیا گیا ہے جن سے مترشح ہوتا ہے کہ اس کتاب کی صحیح حیثیت کا اندازہ محض اس امر سے کہ اُس کو حسن نے شائع کیا ہے نہیں ہو سکتا لیکن ہنوز یہ خیالات شائع نہ ہوئے تھے کہ ہمارے ایک معزز معاصر "نگار" کا مارچ نمبر نظر سے

گزرا جس میں معاصر مذکور نے "جمال پاشا کی نوٹ بک کا ایک ورق" مضمون اول کی سُرخی قرار دی ہے۔ اور تمہید میں لکھا ہے کہ۔

"علی احمد شکری جو ترکی کے مشہور صحافی ہیں، جمال پاشا مرحوم کی نوٹ بک کو (جو سیاسی مسائل پر بہترین افکار کا مجموعہ ہے) ترکی سے عربی زبان میں منتقل کر رہے ہیں۔ ابھی تک یہ ترجمہ شائع نہیں ہوا ہے۔ لیکن الہلال مصری نے اس کا ایک حصہ جو ترکی و جرمن اتحاد سے متعلق ہے حاصل کر کے شائع کیا ہے۔"

اس طرح یہ ثابت ہو گیا کہ جمال پاشا مرحوم نے یہ کتاب اول اپنی زبان ہی میں مرتب کی تھی اور جو ترجمے ہوئے اُن کا اصل ماخذ ترکی ہی زبان ہے۔

ڈاکٹر اقبال کی تازہ نظم جس کو مکمل شائع کر دینا بھی اقبال کے اُن مشتاقوں کے لیے ناگزیر تھا جو ان کے انتظار میں پورا سال انتظار میں گزار دیتے ہیں۔ طلوع اسلام کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ "ترجمان حقیقت" کے الفاظ اگر (اصطلاحات تصوف کو چھوڑ کر) شرح و بسط کے متحمل نہیں تو یہ اُن کا وہ حُسن ہے جو شاعرانہ الہامات کے لیے ضروری ہے۔

اقبال سے زیادہ ہم انجمن حمایت اسلام یا خود جناب اقبال کی پابندی وضع کے رہین منت ہیں جن کی بدولت ہم کو طلوع اسلام کا عروج ہندوستان میں نظر آ گیا ورنہ ہندوستان میں جہاں ایک ہی امرتسر ہر نئے اپریل میں نیا جلوہ دکھاتا ہے ہم میں طلوع اسلام جیسے عالم افروز مناظر کے دیکھنے کی تاب ہی باقی نہیں چھوڑتا۔ یہ وہی وجہ ہے کہ اپنی مصیبتوں میں شعاع امید کی خفیف جھلک بھی زندگی کا سہارا معلوم ہوتی ہے۔ غالب نے شاید ایسی ہی دشواریوں اور مصائب سے تنگ آ کر کہا۔

غالب سخن از ہند بروں بر کہ کس اینجا
سنگ از گہ وشعبدہ ز اعجاز ندانست

پارسی علوم اور اسلام

گزشتہ سے پیوستہ

سامی اثر مذہب ایران

ایران قدیم پر سامی اقوام کے اثرات صرف زبان تک محدود نہ تھے بلکہ دین زرتشتی کے غائر مطالعہ سے مغربی نکتہ پردازوں نے خود اوستھا، ژند اور پاژند میں سامی اصنام پرستوں کے عقائد کی آمیزش پائی ہے چنانچہ مہر یشت ۱۳ میں خدای نور متھرا (مہر۔ سورج) کی جو تشریح کی گئی وہ قدیم مسیحی ہے یا بابل سے ماخوذ بتائی جاتی ہے۔ اسی طرح خدائے آب اناہیتا (ناہید۔ زہرہ) کو جس کا بت ارتخشتہ ممنن نے نصب کر کے اس کی پرستش مجوسیوں میں جاری کردی تھی، بابلی دیوی میتا کی نقل کہا جاتا ہے[1]۔ انہیں فضلائے یورپ نے اہل ایران کی بت پرستی کی طرح ان کی توحید پرستی بھی سامی ہی تسلیم کیا ہے۔ آثار عجم کے مشہور ماہر مسٹر طامس نے ۱۸۶۸ء میں حاجی آباد کے تمام پہلوی کتبوں کو شائع کیا۔ اور ان سے یہ مسئلہ ثابت کیا کہ اکثر ملوک ساسانی یہود و نصاریٰ کے رب پر ایمان رکھتے تھے[2]۔

تیسری صدی عیسوی کے آغاز کا مشہور مدعی نبوت مانی جس کی تعلیم و عقائد دسویں صدی عیسوی کے وسط تک ایران میں علانیہ و خفیہ کام کرتے رہے ۲۱۵ء میں بابل میں پیدا ہوا جہاں اس کا باپ ہمدان سے جا بسا تھا، اور بابل ہی میں اس نے پرورش پائی۔ بقول البیرونی یہ ایک شامی مسیحی راہب فادرون کا شاگرد تھا۔ مانی نے جس طرح اپنا مذہب مجوسی اور نصرانی ادیان سے اخذ کیا اُسی طرح اپنا مخصوص رسم خط بھی جس میں اس کے صحیفے مرقوم ہیں سریانی اور فارسی

---

[1] ملاحظہ ہو ژند اوستا از ڈاکٹر میجیل صفحہ ۱۱۰۔۱۱۵ ایلیبرڈ اکٹر ہاگ صفحہ ۱۰۲، ۳۰۳۔۳۰۷ یسنا (اوستا)، باب ۳۵ صفحہ ۲۔

[2] تاریخ علوم ایران پروفیسر براؤن۔ ج ۱

سے استخراج کیا۔ چنانچہ ابن الندیم کا بیان ہے۔ استخرج مانی مذهبا من المجوسیة والنصرانیة وکذالك القلم الذی یکتب به کتب الدیانات مستخرج من السریانی والفارسی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
وھذا المیلیکیون اناجیلھم وکتب شرائعھم[1]

ایران کا تلمذ شام و عراق سے پروفیسر براؤن جرمن محقق کارل بروکلمان سے ناقل ہیں کہ۔

"شام و عراق اسکندر اعظم ہی کے زمانے سے یونانی تہذیب کے زیر اثر تھے۔ پھر شام میں رومیوں اور بازنطینیوں کے اقتدار نے بھی اس تاثر کو جاری رکھا۔ اہل شام طبع زاد تصنیف کی طرف تو زیادہ مائل نہ تھے مگر اجنبی علوم و فنون پر حیرت انگیز طور سے حاوی ہو جاتے تھے چنانچہ شامی خانقاہیں ہیپوکریٹیز اور گیلن وغیرہ تمام نامور مصنفین کے علوم حکمیہ کا مخزن تھیں۔

"ساسانی عہد میں نوشیرواں نے انھیں شامیوں سے استفادہ کر کے ۵۵۰ء میں جندشاپور میں علوم حکمت و طب کی درسگاہ کھولی تھی۔ یہ گویا یونانی و شامی اشجار کا ایک پیوند تھا جو عباسی دور تک بار ور رہا۔

"علوم یونان کا تیسرا مرکز عراق کا شہر حران تھا، جہاں کے باشندے مسیحی آبادی سے محصور رہنے کے باوجود اپنی قدیم سامی اصنام پرستی پر قائم رہے۔ ریاضی اور ہیئت میں یہ خاص مہارت رکھتے تھے۔ زیادہ تر قدیم شامی و بابلی علوم کے حامل تھے، اور تازہ یونانی اثر بھی اسے بلا دیے بغیر نہ رہا۔

"یہ تین ذرائع ہیں جن سے یونانی علوم کے ترجمے عرب تک پہنچے۔ المنصور عباسی کے دربار میں تعلیم گاہ جندشاپور کا ایک طبیب تھا جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ عربی میں طب کی کتابیں ترجمہ کی تھیں۔ ہارون کے زمانے میں مشہور مترجم یوحنا بن ماسویہ خاص منزلت رکھتا تھا یہ سب دیگر حرانی عرب تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(مشیر لغات)

---

[1] الفہرست مطبوعہ لیزگ صفحہ ۱۹۰ ۲

مگر جو ترقی علم و حکمت کی مامون کے زمانے میں ہوئی ہے اور اس کے اور اس کے اخلاف قریب کے
عہد میں جو ترجمے ہوئے ہیں انھوں نے تمام سابق کاموں کو بے وقعت بنا دیا اور ہمارے
پاس اب صرف وہی تودہ گئے ہیں۔"

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ عربوں کو فتح اسلام کے بعد جو کچھ علم و فن ہاتھ آیا وہ زیادہ تر
ان کے سامی النسل بھائیوں ہی کے ذریعے سے، نہ کہ ایرانیوں سے۔ فتح اسکندری کے بعد تقریباً
دس صدیوں تک ایک نوشیرواں کے مدرسہ جندشاپور کے سوا ایران میں کسی تعلیمی حرکت کا پتہ
نہیں ملتا۔ اغلباً یہاں تعلیم و تعلم ارامی زبان ہی کے واسطے سے جاری تھا۔ پہلوی زبان ان علوم
کی متحمل نہ تھی۔ اس ساڑھے تعلیم گاہ کا کوئی فیضان ایرانی دماغ پر تصنیف و تالیف و ترجمہ
یا ایجاد و اختراع کی صورت میں نظر نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ساسانیوں نے رومی اور عرب
فاتحین کی طرح ابتداء جوشِ فتوحات میں اور انتہاءً غفلتِ تعیش میں علم و حکمت میں حصہ لینا کبھی گوارا
نہ کیا۔ اور ۵۵۰ء (زمانہ مدرسہ جندشاپور) اور مابعد تو ایران کے انحطاط کا دور ہے۔ اس تمدنی و
اخلاقی[1] زوال کے زمانے میں ان سے کسب علم کی کیا توقع ہو سکتی ہے؟

علمی و روحانی تنزل برہمنوں اور قرونِ وسطیٰ کے مسیحی پادریوں کی طرح علوم ایران موبدوں
اور دوسرے مذہبی پیشواؤں کے طبقے میں محدود رہے ہیں۔ بقول
پروفیسر براؤن "ساسانی حکومت کے زوال کے زمانہ تک موبدوں کی غفلت ورزی نے

[1] اوستا کے پچھلے حصوں سے قریب ترین رشتہ داروں (بھائی بہن، باپ بیٹی وغیرہ) کے درمیان مناکحت کا جواز
ثابت ہے اور مجوسیوں کا اس پر عمل رہا ہے۔ شاہی خاندانوں میں یہ رسم خصوصیت کے ساتھ جاری تھی۔ چنانچہ خود پارسی روایات
کے مطابق اردشیر بابکان کے باپ ساسان کے (جس سے ساسانی خاندان منسوب ہے) ایک بھائی بہن اردشیر اور
ایک بہن ہما سے تھی۔ ان دونوں بھائی بہنوں کی آپس میں شادی ہوگئی جس سے دارا پیدا ہوا۔ چھٹی اور نویں صدی
عیسوی کے درمیان پارسی قاضی و مفتی ایسی شادیوں کی خاص ترغیب دیتے تھے۔ ملاحظہ ڈاکٹر میجیل کی
کتاب "زرتشت و اوستا و مذہب پارسیان" ۱۲۔

اکثر غیر مذہبی و عقلی علوم کے ساتھ اوستا کے فلسفیانہ و حکیمانہ اجزاء کو بھی دنیا سے مٹا دیا۔

مذہبی اجزاء کو ان کے بابا پادشاہوں کے بخل نے کچھ کم نقصان نہ پہنچایا۔ یہ قبیح رسم اخفا خود زرتشت کے زمانہ سے لیکر نوشیرواں جیسے عاقل پادشاہ کے عہد تک نظر آتی ہے۔ طبری ناقل ہے کہ زرتشت نے ایک کتاب عجیب و غریب خط میں بارہ ہزار گائے کے چمڑوں پر لکھی ہوئی گشتاسب پادشاہ وقت کے حضور میں پیش کی اور اس کے منزل من اللہ ہونے کا دعویٰ کیا۔ بادشاہ نے اسے پایۂ تخت اصطخر میں محفوظ رکھوا دیا اور عام لوگوں کے لیے اس کا مطالعہ ممنوع قرار دیدیا۔ ابن حزم کتاب الملل والنحل میں ایک پہلوی کتاب "خدائے نامہ" کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ پادشاہ نوشیرواں نے شہر اردشیر خرہ کے سوا تمام شہروں میں مذہبی تعلیم روک دی تھی[1]۔ اسی اخفا کی غرض سے مختلف طبقاتِ ملک کے لیے مختلف رسم خط کے تنوع کا حال آپ ابن مقفع جیسے مستند فاضل و عاشق فہلویات کی زبانی ابھی سن چکے ہیں[2]۔

فیضان اسلام | حضرت مسیح علیہ السلام سے تین چار صدی پیشتر ایرانیوں کے جاہ و جلال جرأت و بسالت، فتح و ظفر، تہذیب و تمدن سے انکار نہیں۔ آثار قدیمہ اور یونانی تحریریں جن میں زینوفن کی تحریر سب سے زیادہ مصرح ہے اس حقیقت پر دلالت کر رہی ہیں۔ ہمیں اس سے بھی انکار نہیں کہ عجمیوں نے اموی و عباسی خلافتوں میں علم کی خدمت اور ترویج و اشاعت میں نہتم بالشان حصہ لیا۔ ہمیں اعتراف ہے کہ علوم عقلیہ کے علاوہ خود علوم مذہبی کی خدمت گذاری میں علمائے عجم عربوں سے بہت آگے بڑھ گئے تھے مگر صرف ان مقدمات کی بنا پر یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ اسلامی فتح ایران کے وقت اہل عجم کی گرہ میں زر علم پہلے سے موجود تھا۔

پارسی روایات کے مطابق اسکندر نے جب ایران فتح کیا تو مجوسیوں کی دینی کتابیں تلف کر دیں باقی کتب فلسفہ، نجوم، طب، زراعت وغیرہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اسکندریہ اور یونان کو اٹھوا لیا گیا

---

[1] نیز ملاحظہ ہو مسٹر جے کے نریمان کی کتاب "اثرات ایران بر ادبیات مسلمانان"

[2] دوبارہ ملاحظہ ہو جامعہ بابت فروری

اس طرح ایران کی جو کچھ متاعِ علم تھی مرکزِ علم کو منتقل ہو گئی۔ پانچ صدیوں کی گھٹا ٹوپ تاریکی نے قدرۃً عجم کا دماغ کند بنا کر اسے وحشت و جہالت کی پستی میں گرا دیا۔ اور علوم و فنون تو الگ رہے ادب بھی بھول بھلا گئے۔ ساسانی عہد میں بعض اولوالعزم پادشاہوں نے احیاءِ علوم کی کوشش کی مگر وہ نسبتہً ایسی حقیر ہے کہ مصر و یونان کے مقابلے میں اس کا نام نہیں لیا جا سکتا۔ غرض جہالت کے علاوہ ہمرکابی وقت نے علوم پارسی کو پنپنے نہ دیا۔

مگر جس دن مالدار زبانِ عربی نے اپنے وسیع خزانے سے ان کو لغات دیئے اور لغات کے ساتھ آسان خط مہیا کر دیا، ان کے دماغ کی مہر ٹوٹ گئی اور زبان چل پڑی خود قرآن شریف جو ایک عظیم الشان لٹریچر ہے، اور عربی شاعری کے اعلیٰ نمونے ان کے سامنے آئے۔ چنانچہ محمد عوفی اپنے مشہور تذکرہ لباب الالباب میں لکھتا ہے:-

"چوں آفتاب ملتِ حنیفی و دینِ محمدی سایہ بر دیارِ عجم انداخت لطیف طبعانِ عجم را با فضلا عرب اتفاق محاورہ پدید آمد۔ و از انوارِ فضائلِ ایشاں اقتباس کردند و بہ اسالیب لغتِ عرب وقوف گرفتند و اشعار مطبوع آبدار حفظ کردند۔ چوں از خود رفتند و بر دقائق بحور و دوائر آں اطلاع یافتند... ... ہم بر آں منوال نساجِ صنائعے کہ نتائجِ طبعِ ایشاں بود بافتن گرفتند۔"[1]

عباسیوں کی قدر دانیِ علم نے تمام اقوام کو صلائے عام دی تو شام و عراق کے یہود و نصاریٰ اور ہندی برہمن بابلی مصری یونانی اور ہندی علوم کے خوانِ نعمت سروں پر لیے ہوئے حاضر ہوئے اور عباسی دسترخوان پر چن دیئے۔ عربوں نے اگلے ایرانیوں کی طرح شمشیر زنی اور حکمرانی کے ذوق و شوق میں اس سے پورا حظ نہ اٹھایا۔ مفتوح ایرانیوں کے لیے اپنی ہستی کو برقرار رکھنے اور عربوں کے دوش بدوش کشمکشِ حیات میں ساتھ دینے کے لیے اس کے سوا

---

[1] جلد اول صفحہ ۳۰۔ یہ نایاب کتاب پروفیسر براؤن کی ہمت سے دو جلدوں میں لندن سے ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۶ء میں مع حواشی محمد بن عبدالوہاب قزوینی شائع ہوئی ہے۔ آج دنیا میں یہ فارسی شعرا کا سب سے قدیم و معتبر اور بعد کے تمام تذکروں کا ماخذ ہے۔ ۶۱۸ھ / ۱۲۲۱ء کے لگ بھگ تالیف ہوا۔

کوئی صورت نہیں رہی تھی کہ وہ ملت اسلام کی (جو اب عرب و عجم کے مجموعے سے عبارت تھی) ذہنی خدمت اپنے ذمہ لے لیں اس حوصلہ میں قدرت نے بھی ان کی یہ اعانت کی کہ عرب و عجم دو متضاد دماغوں اور قوموں کے اختلاط سے ایک ایسا قوام تیار کر دیا جس میں عرب کی علمیت اور عجم کی ذہانت مجتمع ہو گئی اسی نکتہ کو پروفیسر براؤن نے یوں ادا کیا ہے :-

"یہ فرض کر لینا کسی طرح صحیح نہیں کہ مسلمانوں کی فتح ایران کے بعد دو تین صدیاں ایران کی ذہنی تاریخ کا سادہ ورق تھیں ۔ اس کے برخلاف یہ نہایت عجیب اور بے نظیر دلچسپیوں کا دور گذرا ہے - عہد قدیم اور عہد جدید کے تداخل، واقعات کی تشکیل اور خیالات کے باہمی تجاذب و اعتدال کا زمانہ تھا - کسی معنی میں بھی یہ جمود یا موت کا زمانہ نہ تھا یہ بالکل صحیح ہے کہ سیاسی اعتبار سے کچھ مدت کے لیے ایران کی علحدہ قومی ہستی رُک گئی - کیونکہ یہ اُس عظیم الشان اسلامی سلطنت میں جذب ہو گیا جو جبل الطارق سے لیکر جیحون تک ، وسیع تھی - لیکن اقلیم دماغی میں اس نے بہت جلد وہ غلبہ حاصل کر لیا جس کا استحقاق اہل ایران کی قابلیت اور فطری جودت و ذکاوت نے اسے دے رکھا تھا[1]"

ہم کسی اور موقع[2] پر بتا چکے ہیں کہ اکثر اوقات سیاسی انقلاب ملک کے حق میں رحمت ثابت ہوتا ہے مختلف اقوام کا اختلاط دماغوں میں تازگی اور فرسودہ قویٰ میں زندگی بخشتا ہے - چنانچہ ایران کا یہ انقلاب بھی اسی قسم کا تھا - ساسانی عہد تک ہم ایران میں کوئی قابل ذکر آثار علمیہ نہیں پاتے اہل ایران کا جوہر قابل ان کے دماغوں میں پڑا سوتا ہے یکایک فتح اسلام نے ان کے جوہر کو حرکت دیکر بیدار کر دیا - اُنھوں نے عہد اسلام میں وہ ذہنی کارنامے دکھائے جن سے آج تک اکثر لوگوں کو یہ دھوکا ہو جاتا ہے کہ یہ صدیوں کی مشق دماغی کا نتیجہ ہیں مگر تاریخ اس قیاس کی تائید نہیں کرتی دراصل ظہور اسلام کے بعد ان کے حیرت انگیز علمی کارناموں کا راز اسی خصائص

---

[1] تاریخ علوم ایران جلد ۱ مقالہ دوم کا آخر حصہ -

[2] مضمون سیاسی انقلابات کا اثر علوم ایران" پر مندرجہ "جامعہ" بابت جنوری گذشتہ صفحہ ،

تحریک واختلاط اور اس کے قدرتی اثرات میں مضمر ہے۔

ایران کا یہی اسلامی عہد وہ عہد ہے اور ایرانیوں کے یہی کارنامے وہ کارنامے ہیں جن پر وہ جس قدر چاہیں ناز کریں، مگر افسوس ہے کہ جدید ایرانی محبان وطن کے سب سے نامور اور محترم افراد بھی اپنی قومی ادبیات میں ایسے محسود روزگار اسلاف پر فخر کرنے کی بجائے افسانۂ کیانی و ساسانی کے خیالی تاریخ کے مسندِ جم اور دُرفش کاویانی پر ناز کیا کرتے ہیں[1]۔

---

[1] ملاحظہ ہوں سیاحت نامہ ابراہیم بیگ مطبوعہ کلکتہ بورڈ صفحہ ۳-۴-۱۱-۱۳-اور قومی نظمیں جو پروفیسر براؤن نے صحافت وشاعری ایران جدید کے نام سے شائع کی ہیں۔

(۴)

قدیم علوم فارسی کی ہیئت کذائی

شاعری | ایرانی شاعری کے آغاز کے متعلق بھی قیاس کے گھوڑے خوب دوڑائے گئے ہیں۔ مگر ہمارا یہی نظریہ شاعری پر بھی صادق آتا ہے۔ کافی لغات، پہلوی سے آسان تر رسم خط، عاملینِ علم کی صحبت، قدردانی، نسلوں کا خلط ملط، ان سب نے مل ملا کر ان کے دماغ پر صیقل سی کر دی۔ ابو العباس مروزی کے قصیدہ (۱۹۰ھ) سے لیکر رودکی تک بڑھ جاؤ صاف معلوم ہوگا کہ فارسی شاعری، بندش اور خیالات کو وہی ابتدائی مرحلے طے کرنا پڑے ہیں جو ہر زبان کو اول اول کرنا پڑتے ہیں۔ دولت شاہ سمرقندی نے قدیم فارسی میں شاعری کے کچھ نمونے پیش کیے ہیں جن سے اس کے وجود کا ثبوت دیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہیں:-

نمبر۱۔ بہرام گور (متوفی ۴۳۸ء) جس نے بقول عوفی عربوں میں تربیت پائی تھی عربی میں شعر کہتا تھا اور فارسی عروض کا بانی ہے، ایک دفعہ شیر کا فادرانہ شکار کرکے فخریہ یہ مصرعہ بول اٹھا ع

منم آں پیل دمان ومنم آں شیر یلہ

دلارام اسکی حاضر جواب محبوبہ نے برجستہ یہ مصرعہ لگا دیا ع

نام بہرام ترا و پدرت بوجبلہ[۱]

---

[۱] مگر عوفی نے دونوں مصرعے بہرام گور ہی کی طرف منسوب کیے ہیں اور شعر یوں نقل کیا ہے ؎

منم آں شیر گلہ منم آں پیل یلہ ؛ نام من بہرام گور و کنیتم بوجبلہ

دولت شاہ نے بہرام گور کے ساتھ اس کی محبوبہ کو بھی عروضی اور بانیِ شعر بنا دیا۔ اس قسم کی حاشیہ آرائی و رنگ آمیزی جو تاریخ پر ستم ہو دولت شاہ سمرقندی کا خاص مذاق معلوم ہوتا ہے۔ ثعالبی نے اپنی غرر و سیر کے صفحہ ۵۵۰ میں اسی شعر کو خرداذبہ سے یوں نقل کیا ہے۔

منم آں شیر شلہ منم آں ببر یلہ ؛ من آن بہرام گور منم آں بوجبلہ

متاخرین کی اصلاحوں نے قدیم نمونوں کی تاریخی اہمیت اور بھی کم کر دی ہے۔

نمبر۲۔ قصر شیریں کی دیوار پر عہد خسرو پرویز (متوفی ۶۲۸ء) کا یہ شعر کندہ پایا گیا تھا جو عہد عضد الدولہ دیلمی تک موجود تھا۔

ہژبرا بگیہاں انوشہ بذی ✤ جہاں را بہ دیدار توشہ بذی

لطف یہ ہے کہ مصرعۂ ثانی بجنسہٖ شاہنامہ میں موجود ہے۔ کیا فردوسی نے یہ مصرعہ قصر شیریں کے کندوں سے اڑایا؟

نمبر۳۔ پہلی صدی ہجری میں ابو حفص حکیم سغدی کا یہ شعر نقل کیا گیا ہے:۔

آہوی کوہی در دشت چگونہ رودا ✤ او ندارد یار بے یار چگونہ بودا

محققین یورپ ان روایات کی صحت میں بہت مشتبہ ہیں لیکن اگر واقعی یہ صحیح بھی ہوں تو ان کا وجود ہی ہمارے دعوے کو بوجہ اتم ثابت کر رہا ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ یہ اشعار کسی مہذب قدیم اور علم آشنا قوم کی تکمیل اور دماغی نشو و نما کا نمونہ ہو سکتے ہیں۔ یا دبستان سخن کے ابجد خواں کی مشق اول کا؟

نمبر۴۔ ۱۹۳ھ میں المامون الرشید عباسی مرو میں داخل ہوا تو بقول عوفی عباس ایک خواجہ زادہ نے اس کی خدمت میں ایک فارسی قصیدہ پیش کیا تھا جس کے صرف چار شعر نقل کیے ہیں:۔

اے رسانیدہ بدولت فرق خود تا فرقدین	گسترانیدہ بجود و فضل در عالم یدین
مر خلافت را تو شائستہ چو مردم دیدہ را	دین یزداں را تو بایستہ چو رخ را ہر دو عین
کس بر این منوال پیش از من چنیں شعرے نگفت	مر زبان پارسی را ہست با ایں نوع بین
لیک زاں گفتم من ایں مدحت ترا تا ایں لغت	گیرد از مدح و ثنائے حضرت تو زیب و زین

فارسی زبان عہد غزنوی سے پہلے صنف قصیدہ ہی سے آشنا نہ تھی، اس پر بندش کی یہ چستی ایک صدی بعد تک بھی کلام فارسی میں نظر نہیں آتی۔ ان وجوہ کی بنا پر روسی فاضل مستشرق موسیو کازیمرسکی ان اشعار کو بہت سے اور اشعار مردیہ کی طرح مشتبہ بتاتے ہیں اور پروفیسر براؤن بھی ان سے متفق ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ عربی قصائد کے تتبع میں اگر کسی طباع فاضل عجم نے کچھ شعر

نظم کر لیے ہوں تو جائے تعجب نہیں۔ رہی بندشس کی چُستی اور صفائی۔ تو اصلاح و تہذیب فارسی تذکرہ نویسوں کی عام خو چلی آتی ہے۔ اصل صورت یقیناً کچھ اور ہو گی لیکن اگر ان کو موجودہ ہیئت میں بھی معتبر تسلیم کر لیا جائے، جب بھی ہمارا دعویٰ ثابت ہے۔ آخری دو شعروں میں شاعر خود اقرار کر رہا ہے کہ مجھ سے پہلے کسی نے یوں فارسی میں شعر نہ کہے اس انداز سے فارسی زبان ناآشنا ہے میں نے آپ کی مدح اس لیے کی ہے کہ اس ذریعے سے اس زبان کی رونق ہو جائے۔

ان اشعار کے آگے خود عوفی کی حسب ذیل عبارت اس خیال کی مزید تائید کر رہی ہے:۔

"امیر المومنین ہزار دینار مرو سے صلت فرمود بہ مزید عنایت و ملاطفت مخصوص گردانید۔ و چوں فضلا آن بدیدند ہر کس طبیعت براو بر گماشت۔ بعد از وے کس شعر پارسی نگفت تا در نوبت آل طاہر و آل لیث شاعرے چند معدود خاستند[1]"

یعنی سلطانی قدردانی کا اثر یہ ہوا کہ ہر شخص فارسی میں شعر گوئی کی کوشش کرنے لگا۔ مگر آل طاہر اور آل لیث (یعنی حنظلہ بادغیسی متوفی ۲۱۹ھ) تک کسی سے فارسی شعر نہ بن آئے۔

کلام عرب کا تتبع

مولانا شبلی مرحوم نے شعر العجم میں فارسی شعراء کی تقلید عربی اور فارسی شاعری کی ابتدائی مشق کے نمونے درج کیے ہیں اور فارسی شاعری پر عربی شاعری کے اثر کے متعلق نہایت دلچسپ اور لطیف بحث کی ہے۔ ہم ذیل میں تغیر ترتیب جا بجا سے منتخب عبارت نقل کرتے ہیں[2]:۔

"اول اول ایرانی شعراء عربی شاعری سامنے رکھ کر شعر کہتے تھے۔ مشق کی ابتدا یہ تھی کہ عربی اشعار کا ترجمہ لفظی کرتے تھے۔ آج بہت سے فارسی قطعے، فرد بلکہ قصیدے موجود ہیں جن کو عام لوگ ایران کا سرمایہ سمجھتے ہیں لیکن درحقیقت وہ عربی اشعار کے ترجمے ہیں۔" اس کے بعد سیف الدولہ کے مشہور قطعہ جس میں قوس قزح کی تشبیہ ہے۔ اور ابو نواس کے مشہور قطعہ کلام اللیل

---

[1] لباب الالباب جلد اول صفحہ ۲۱۔

[2] شعر العجم جلد چہارم صفحہ ۱۴۰ تا ۱۴۳۔

بجوہ القصائد اور دوسرے عربی کلام کے فارسی تراجم کے نمونے لکھا کرتا یا ہے کہ اس پردہ میں
سرقہ شروع ہوگیا۔ عنصری، اسدی، کسائی، منوچہری کے ہاں بہت سے مضامین ہیں جو قطعًا
عرب سے لیے ہیں لیکن چونکہ لوگوں کی نظر کلام عرب پر نہیں ہے۔ اس لیے کسی نے سرقہ یا ترجمہ
نہیں خیال کیا؛ مولانا نے اس قسم کے سرقات کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔
تقلید اس قدر گوارا نہ ہوتی تھی کہ عربی قصائد کے ڈھانچے، ترتیب اور جزئیات تک کی ہوبہو
نقل کی جاتی تھی؛ "عربی قصائد کی تمہید میں اکثر ممدوح یا معشوق کے ملنے کے لیے سفر کرنے کا حال
لکھتے ہیں۔ اور راستی کی سختی، پہاڑوں کی چڑھائی، گھوڑے کی جفاکشی اور گرم رفتاری کے ذکر
سے اسے طول دیتے ہیں، فارسی میں بھی قدیم شعراء کا یہ خاص انداز تھا جو آخر متروک ہوگیا۔۔۔
۔۔۔۔۔۔ امرؤالقیس نے اپنا مشہور قصیدہ معلقہ اس تمہید سے شروع کیا ہے۔

قفا نبک من ذکری حبیب ومنزل ٭ بسقط اللوی بین الدخول فحومل

ساتھیو ٹھہر جاؤ۔ یہ معشوق کا اجڑا ہوا گھر (ڈیرے کا نشان) ہے آؤ معشوق کی یاد میں دو
آنسو بہالیں۔ یہ انداز اس قدر مقبول ہوا کہ ایک مدت تک شعراء قصیدہ کی ابتدا انھیں لفظوں سے
کرتے تھے۔ فارسی شعراء نے بھی اس کی تقلید کی۔ لامعی جرجانی کہتا ہے۔

ہست ایں دیارِ یار، اگر شاید فرود آرم جمل کو ٭ پرسم رباب و وعد یا حال از رسوم و از طلل
جائے ہے بینم خراب، اندر میانِ او سحاب ٭ آتش زدہ گاہ و گہ آب از قوت برق و ہطل
در خانۂ سعدی و سے آنکہ از کفِ آں ہر دوئے ٭ خوردم دو بام اندر و وحئے، اینک زتیم آں در بدل
بانگِ پلنگ آید ہے، فریاد رنگ آید ہے ٭ آشوب سنگ آید ہے چوں گاہ زلزال زقلل
گوئی کجا رفت آں صنم کو بود در عالم علم ٭ خوردہ وہم عذرا بدم بردہ دلِ وامق بدل
برد از دلم صبر و خرد چوں بانگ بر آں ناقہ زد ٭ کا ریم پیش آورد بد۔ لماتولی وارتحل،

منوچہری دامغانی اور معق بخاری نے متعدد قصیدے اس طرز پر لکھے ہیں؛
"شعراء عجم ہر موقع پر اعتراف کرتے ہیں کہ شاعری میں ان کے استاد عرب ہیں

اور اس پر فخر کرتے ہیں۔ منوچہری اپنے ایک ہمعصر پر اپنی ترجیح ثابت کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

من بسے دیوانِ شعرِ تازیان دارم زبر ؛ تو ندانی خواند الا ھبی بصحنک فاصبحینا

سبعہ معلقہ کے ایک قصیدہ کے مطلع کی طرف اشارہ ہے۔ انوری کہتا ہے:۔

شاعری دانی کدامی قوم کردند؟ آنکہ بود ؛ اوّل شاں امرأالقیس آخرشاں بو فراس

اس کے بعد منوچہری، انوری وغیرہ کے متعدد شعروں سے عربی تتبع کی مثالیں دی ہیں

"تلمیحات اکثر عرب کی ہیں۔ مثلاً عشق و عاشقی کے متعلق جتنے الفاظ ہیں۔ ایران میں ہزاروں پری پیکر معشوق گذرے لیکن شاعری نے لیلیٰ کو انتخاب کیا اور اس کو اس حد تک وسعت دی کہ معشوق اور لیلیٰ مرادف لفظ بن گئے۔ لیلیٰ کے علاوہ کہیں کہیں اور کسی کا ذکر آجاتا ہے تو سلمیٰ، عذرا، دعد، رباب کا آتا ہے کہ یہ بھی عرب کے معشوق ہیں۔ اسی طرح عاشقی کا سلسلہ بعینہٖ مجنون تک منتہی ہوتا ہے جس کے لیے حضرت یوسف کام آتے ہیں۔ ازیں قبیل دیدۂ یعقوب، چاک پیراہن، چاہ کنعاں، خواب زلیخا، زندان یوسف، آدم، گندم، طوفان نوح، قربانی اسمٰعیل، بت شکنی خلیل، صبر ایوب، تخت سلیمن، بلقیس، ہدہد، ید بیضا، عصائے موسیٰ، وادی ایمن، شمعِ طور، اعجاز مسیح، شراب طہور، حور، غلمان، ہنگامۂ محشر، صبح محشر، روح القدس وغیرہ اسلامی الفاظ بطور تلمیحات اس کثرت سے فارسی شاعری میں داخل ہیں جن کا شمار نہیں ہو سکتا"

الغرض عجمی طفلِ شعر نے عربی شاعری کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا اور اسی کی گود میں جوان ہوا۔

(باقی آیندہ)

محمد مسلم۔ ایم اے

ہندوستانی تعلیم کا مرکز

نمبر ۳

(۸)

آئرلینڈ کی اس مثال سے دوسرا سبق ہم کو یہ ملتا ہے کہ قدرتی طور پر پانی پہلے ہوتا ہے اس کے بعد مچھلیاں آتی ہیں! اسی طرح یہ لائق اشخاص کا وجود ہی ہے جو طلبا کو اپنے گرد و پیش کھینچ لائیگا بشرطیکہ ان کا مقصد تعلیم حاصل کرنا ہو نہ کہ سند لینا۔

اس قدیم علمی دور میں جب کہ ایسے اشخاص موجود تھے جن کے دماغ خیالات و معلومات سے لبریز تھے، اس وقت نالندا اور ٹکسلا جیسی یونیورسٹیوں کا وجود پانا ایک امرِ قدرتی تھا۔ مگر چونکہ ہم ایسی درسگاہوں سے تعلیم حاصل کرتے ہیں جن کے پیش نظر اہم ترین مقصد تقسیم اسناد ہے، اسی لیے قومی تعلیم گاہوں کے قایم کرنے میں بھی ہماری کوشش غلط مقصد سے شروع ہوتی ہے یعنی یہ کہ طلبا کا خیال ہمارے دماغ میں سب سے پہلے آتا ہے اس کے بعد اساتذہ کی تلاش ہوتی ہے۔ اس کی مثال اس مخبوط الحواس صناع کی سی ہے جو دُم تو بڑی محنت و جانفشانی سے بناتا ہے لیکن یکبارگی اُسے یاد آتا ہے کہ وہ سر کا بنانا بھول گیا۔ ہم اپنے مہمانوں کو دسترخوان پر بلا لیتے ہیں اس کے بعد کھانا پکنے کی فکر کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں مجبوراً ہم کو ظاہری شان و شوکت سے کام لینا پڑے گا۔

جب ہماری فکر و تلاش کا بیشتر حصہ طلبا کی فراہمی میں صرف ہوتا ہے تو اس صورت میں ملک کی توجہ مائل کرنیکا خیال بھی لامحالہ کرنا ہی پڑے گا۔ ایک ہی شب میں طول طویل نصاب تیار کیے جاتے ہیں، غیر ملک والوں کی طرف سے نفرت کے جذبات پیدا کیے جاتے ہیں، مادرِ ہند سے پُرجوش اپیل ہونے لگتے ہیں۔ غرض ملک کے دماغ میں پرلیفانی وانتشار پیدا کرنے کے لیے اس قسم کی تمام مجنونانہ حرکتیں عمل میں آتی ہیں۔

ہم کو چاہیے کہ اپنی دماغی صحت اور تکمیل مقصد کی خاطر نصاب تیار کرنے اور طلبا کی تلاش کا خیال ترک کر دیں اپنے دماغ سے موجودہ تعلیم گاہوں کی متبرک صورتیں نکال دیں۔ اس کے بعد ان لوگوں سے جو دماغی تعلیم و تربیت سے فارغ ہو کر علمی کاموں کے لیے تیار ہیں، یہ درخواست کریں کہ آئیے اور یہاں علمی تحقیق و تفتیش کا کام انجام دیجیے۔ اس طریقہ سے ہماری وہ طاقت جو یونیورسٹی کے قیام کے لیے کافی ہوگی ایک جگہ آکر جمع ہو جائیگی۔ ہم کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ملک کے بہترین دماغ کا یہ اجتماع یونیورسٹی کا اہم ترین مقصد ہے کیونکہ یہ قوم کی لائق ہستیوں کا مرکز ہوگا۔

(۹)

میں نے اکثر یہ کہتے سنا ہے کہ ہندوستان میں علمی حیثیت سے اتحاد پیدا کرنا دشوار کیا تقریباً محال ہے۔ اس کا سبب صرف یہ بتایا جاتا ہے کہ یہاں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں؛

ہر وہ قوم جو ترقی اور عروج حاصل کرنا چاہتی ہے، اُسے بعض دشوار مسائل یا تو خود حل کرنے ہونگے یا شکست اور ذلت برداشت کرنی پڑے گی۔ ہر تہذیب کی بنیاد دشواریوں کی چٹان پر رکھی ہوتی ہے۔ جن کے پاس پانی کے لیے دریا موجود ہیں، وہ بے شک قابل رشک ہیں لیکن جن کے پاس نہیں ہیں۔ ان کو پانی کے لیے گہرے کنوئیں کھودنے ہونگے۔ لیکن ہم کو یہ کبھی خیال نہ کرنا چاہیے کہ مٹی پانی کا کام دے سکے گی صرف اس بنا پر کہ یہ باسانی دستیاب ہو سکتی ہے۔ ہم کو اپنے اختلاف زبان کی دشواری دلیری سے تسلیم کرنا چاہیے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ ایک غیر ملکی زبان محدود تعلیم و تربیت کے لیے کارآمد ہو تو ہو لیکن ایک وسیع تعلیم و تہذیب کے لیے جو بقائے حیات کے واسطے ازبس ضروری ہے، ہرگز مفید نہیں۔

پھر ہم کو یہ ماننا پڑے گا کہ ہندوستان یورپ کے کسی بڑے ملک کی طرح نہیں جسکی ایک زبان ہو بلکہ خود یورپ کی مانند ہے جس میں متعدد قومیں آباد ہیں اور مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ باوجود اس کے یورپ کے اتحادِ ذہنی کے ساتھ اس کا ایک مشترک تمدن بھی ہے جو کسی طرح زبان

کے ایک ہونے پر مبنی نہیں۔

یورپ کے اوائل تہذیب میں تمام ملک کی علمی زبان لاطینی تھی۔ یہ زمانہ آفتابِ بہار کا تھا جبکہ ام تہذیبیں باہم مل کر ایک وجود بن گئی تھیں لیکن یورپ کی دماغی نشو و نما کی تکمیل علمی زبان کے ایک نے سے ظاہر نہیں ہوئی بلکہ جب یورپ کے ہر بڑے بڑے ملک نے اپنی اپنی زبان بنالی اس وقت ورپ میں تعلیم و تہذیب کا حقیقی اتحاد ممکن ہوا اور اسی اختلاف زبان سے یورپ کے علوم و فنون ں قدر وسیع اور گرانبہا ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ حقیقی اتحاد وہی ہے جب تمام قدرتی اختلافات باہم مل کر ایک ہو جائیں۔ مصنوعی اتحاد سے بے حسی اور مردنی چھا جاتی ہے۔ اسکا اندازہ اس سے ہو ہ کہ اگر فرانس، اٹلی، جرمنی، انگلستان ان میں سے ہر ایک اپنی کمائی کا ایک حصہ اس مشترکہ زانے میں نہ ڈالتا تو اس صورت میں یورپ کی تہذیب کو کس قدر نقصان پہنچتا۔ ہم جانتے ہیں کہ جب جرمنی کی تعلیم و تہذیب کا اثر سارے یورپ پر چھا رہا تھا، تو تمام یورپ نے یکزبان ہو کر اسے ایک آفت ناگہانی سے تعبیر کیا۔

ہندوستان کا بھی ایک زمانہ تھا جب یہاں کی علمی زبان سنسکرت تھی لیکن اب خیالات کی نشو و نما کے لیے اس کی تمام دیسی زبانوں کو ترقی دینا چاہیے تاکہ ان کے ذریعہ ان کی بولنے والی قومیں اپنے اختلافات ذہنی کو پورے طور پر ظاہر کر سکیں۔ یہ بات کسی ایسی غیر ملکی زبان کے ذریعہ جسکے اپنے مخصوص طرز و انداز ہوں، کبھی نہیں حاصل ہو سکتی اور اس سے ہماری تخیل اور فکر کی آزادی میں بھی رکاوٹ پڑنی لازمی ہے۔ انگریزی زبان کا استعمال ہمارے دماغ کو خواہی نخواہی مغرب کی جانب لیجاتا ہے جس کی زندگی سے ہم کو کچھ بھی تعلق نہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ ہمارا نخل تعلیم بے ثمر رہ جاتا ہے یا اگر کچھ بار آور ہوتا بھی ہے تو زیادہ نہیں۔ اختلافِ زبان سے ہمیں کوئی اندیشہ نہ ہونا چاہیے بلکہ ہوشیار اس سے رہنا چاہیے کہ اپنی تعلیم کے لیے کسی غیر ملکی زبان کا استعمال نہ کریں جس سے ہمارا چشمۂ علم شروع سے ہی سست رفتار پڑ جائے۔

یہ چنداں قابل لحاظ نہیں کہ ہم انگریزی میں عرضیاں لکھنا ترک کر دیں یا چھوٹی موٹی ملازمتیں

فی الحال ہم کو نہایت افسوس کے ساتھ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انگریزی نے عدالتی زبان ہونے کی وجہ سے ہماری مادری زبان پر ایسا برا اثر ڈالا کہ مؤخر الذکر تعلیم و تہذیب کی زندگی سے نکل کر صرف خانگی بول چال کے لیے رہ گئی ہے۔ یہی سبب ہے کہ حکومت کی تمام کارروائیاں عوام کے لیے ناقابل فہم ہو گئی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے معاملات سلطنت میں بھی حکمراں جماعت سے تعلق قائم رکھنے کے لیے بہت سے انگریزی داں دلالوں کی ضرورت پڑتی ہے میرا خیال ہے کہ دنیا میں ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں حکومت نے محکمۂ زراعت بھی قائم کیا ہے جو کاشتکاروں کے فائدہ کی غرض سے زراعتی معلومات ایسی زبان میں شائع کرتا رہتا ہے جس سے وہ ناواقف محض ہوتے ہیں اور اس ستم ظریفی سے جو جو نقصانات ہوتے ہیں وہ بھی بیچارے کی گردن پر پڑتے ہیں

حکومت نے چند انگریزی عمال کی آسانی کے لیے مصارف کثیر سے یہ انتظام کیا ہے کہ ہر ضروری کاغذ کا ترجمہ دیسی زبانوں سے انگریزی میں کر لیا جایا کرے۔ لیکن تیس کروڑ نفوس انسانی کے لیے قوانین، قانون ساز مجلسوں کی کارروائیاں گورنروں کی تقریریں نیز دیگر امور سرکاری جنکا تعلق ان کی زندگی سے ہے، ایک غیر ملکی زبان کے پردہ کے اندر رکھے جاتے ہیں۔ ہمیں سخت حیرت ہوتی ہے اس مضحکہ خیز نظارے سے کہ مسافروں کی آسانی کی خاطر ہر جگہ اسٹیشنوں کے نام ہندوستانی حرفوں میں لکھے ہوتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ہمارے حکام نے اپنے لیے تمام کام آسان بنا رکھے ہیں لیکن ان لوگوں کے لیے جن پر حکومت کرنے آئے ہیں، سخت دشوار کر دیا ہے۔

ان وجوہ سے ایک خلاف قدرت حالت پیدا ہو گئی ہے یعنی خود ہماری زبان ہماری کامیابی کی سدِ راہ بنی ہے اور ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ میں صرف دکھوے کے ایک ہلکے سہارے پر انگریزی کی تھوڑی بہت واقفیت ہو جانے سے ایک غرور سا پیدا ہو گیا ہے اسی وجہ سے ہم موجودہ طرز تعلیم کے نقائص کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور مسرت آمیز افسوس کے ساتھ ہم روٹی کی بجائے پتھر قبول کر لیتے ہیں۔ ہم کو گورنمنٹ کے ٹیکس نہ صرف روپیوں سے ادا کرنے پڑتے ہیں بلکہ اپنی مادری زبان تعلیم

وتہذیب بھی جن سے ہماری اور وطن کی آیندہ نجات کا انحصار ہے قربان کرنی پڑتی ہے۔

(۱۰)

لہذا ہم کو ہندوستانی تعلیم وتہذیب کے لیے ایک ایسے مرکز کی تلاش کرنی چاہیے جو موجودہ یونیورسٹیوں سے بلکہ اسکولوں اور کالجوں کے علاوہ اُن سے جداگانہ ہو جس طرح دفاتر، عدالتیں، تھانے، جیلخانے، پاگل خانے اور بہت سے لوازمات تمدن ہیں اسی طرح یہ تعلیم گاہیں بھی پڑی رہیں گی اگر ہمارا ملک چاہتا ہے کہ ہمیں اور سایہ حاصل کرے تو اُسے چونے اور گارے کی عمارتوں کو چھوڑ کر زمین پر آجانا چاہیے۔ ہم یہ دلیری کے ساتھ بالاعلان کیوں نہیں کہدیتے ہیں کہ ہم نے تو اپنے زندگی کے نشو ونما اسی طریقہ پر کریں گے جس طرح ویدوں کے زمانہ میں طلبا اپنے اساتذہ کے ساتھ جنگلوں میں حلقے باندھ کر کیا کرتے تھے یا جس طرح بدھ کے عہد میں نالندہ اور ٹکسلا کی یونیورسٹیوں میں، یا اب بھی اس انحطاط کے زمانہ میں ٹول اور پٹھ شالا (مکتب اور مدرسے) میں جمع ہو کر کرتے ہیں۔

ہم کو اُسے یونیورسٹی کے لفظ سے بھی موسوم نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ نام سے بھی ایک طرح کی مشابہت اور تقلید کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ ہم کہیں ایک ایسی مرکزی قوت پیدا کریں جو ملک کے مختلف حصص اور مختلف قرون کے علمی خزانے کھینچ لائے اور اس طریقہ سے ہندوستانی تعلیم وتہذیب کا ایک اعلیٰ اور زندہ حلقہ قائم ہو جائے گا۔

(۱۱)

ایک مرتبہ الہ آباد میں انگریزی اسکول کے ایک طالبعلم سے کہا گیا کہ "دریا کی تعریف کرو"۔ اس ہوشیار چھوٹے لڑکے نے تعریف بالکل صحیح بتائی۔ اس کے بعد جب پھر اس سے پوچھا گیا کہ "تم نے کوئی دریا دیکھا ہے؟" اس بدنصیب نے باوجود دیکہ گنگا وجمنا کے سنگم پر رہتا تھا، جواب دیا کہ "اب تک کوئی نہیں"۔ اس کے دماغ میں ایک دھندلا سا یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اسکی اپنی دنیا جغرافیہ کی علمی دنیا نہیں ہوسکتی۔ آگے چل کر اسے اسکا علم ہوا ہوگا کہ اس کا ملک بھی جغرافیہ میں کوئی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں بھی بڑے بڑے دریا بہتے ہیں۔ لیکن فرض کیجیے کہ یہ اطلاع اسکو نہوتی اور کوئی

غیر ملکی سیاح ایک دن اگر اس سے یہ کہتا کہ اس کا ملک بہت وسیع ہے، ہمالیہ ایک بہت ہی بڑا پہاڑ ہے، سندھ، گنگا، اور برہمپترا لمبے چوڑے دریا ہیں تو اس کا صدمہ اس کے دماغ کا توازن کو کہاں تک قائم رکھ سکتا ہے؟ اور اس حقارت آمیز خیال کے اثر سے جو ایک عرصہ سے اس کو اپنے متعلق تھا، کیا وہ یکبارگی چلا نہ اٹھتا کہ دوسرے ممالک صرف ممالک ہیں لیکن میرا ملک تو فردوسِ بریں ہے۔ دنیا کے متعلق اسکا پہلا خیال اپنی عدم واقفیت کی وجہ سے غلط تھا لیکن دوسرا خیال اس سے بھی برا ہے کیونکہ یہ اس کی حماقت پر مبنی ہے۔

یہی صورت ہمارے ہندوستانی تعلیم وتہذیب کے متعلق بھی پیش آتی ہے۔ دوران تعلیم میں صحیح علم کا موقع نہ ملنے کی وجہ سے ہم فرض کر لیتے ہیں کہ ہندوستان کی کبھی کوئی تعلیم وتہذیب تھی ہی نہیں۔ یا اگر تھی تو بے مثل وبے نظیر۔ اس کے بعد جب کبھی غیر ملک کے پنڈتوں سے اس کی تعریف و مدح کی آواز ہمارے کانوں میں پڑتی ہے، اس وقت ہم خوشی کے مارے بانسوں اچھل جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ دوسرے ملکوں کی تہذیب انسانی ہے لیکن ہماری آسمانی ہے اور خاص بر ہما سے نکلی ہے۔ اس کا نتیجہ بس وہی خود پسندی وخود ستائی ہوتا ہے جو اخلاقاً نہایت معیوب ہے۔

ہم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ خلق مخصوص کا اصول ایک خیال فرسودہ ہے، اور بندگان برگزیدہ کا عقیدہ زمانۂ وحشت کا ہے۔ موجودہ زمانہ میں ہم نے یہ سمجھا ہے کہ کوئی مخصوص صداقت یا تہذیب جو فضائے عالم سے بالکل بے تعلق ہو، کبھی صادق نہیں بن سکتی۔ قیدی جو کنج تنہائی میں محبوس ہو وہی بقیہ دنیا سے بے تعلق ہے نہ کہ دنیا اس سے جو شخص یہ کہتا ہے کہ قدرت نے ہندوستان کو علمی قید تنہائی میں رکھا ہے، وہ اسکی شان وشوکت کے بڑھانے میں کوئی مدد نہیں پہنچا۔

بہرحال اگر ہم کو ہندوستانی تعلیم وتہذیب کا مرکز قائم کرنا ہے تو یہ خیال پیش نظر رکھ کر کوشش کرنی چاہیے کہ ہندوستان کی اپنی ایک تہذیب ہے جس سے سارا عالم مستفیض ہو سکتا ہے۔

میرا دل اس خیال سے لرز جاتا ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ ملک کا ایک طبقہ مجھ سے یہ کہہ رہا ہے کہ ہم کو کوئی عجلت نہیں۔ اگر آپ کو ایسا یقین ہے تو ہم بھی دیکھیں کہ آیا ہماری ہندوستانی تعلیم وتہذیب

یا یہ بہترین ہی یا کم از کم ایسی ہی کہ ہماری تعلیم میں عزت کی جگہ اس کو مل سکے۔
خوش قسمتی سے خدا کے ہاں کسی بہترین شے کا ظلم کرنا روا نہیں۔ بہترین اشیا کے مختلف قسم
ہیں اور ان سب کو ایک تمدن کر چکا ہی۔ لہذا ہم کو بہترین ہونے نہ ہونے پر جھگڑنا نہ چاہیے۔
بے تامل کہا جا سکتا ہی کہ ہماری تہذیب میں بہت سے توہمات اور خامیاں بھی ہیں اور
چونکہ اس کی رفتار رک گئی ہی اس لیے یہ عیوب اور زیادہ نمایاں ہو گئے ہیں۔ مغربی تہذیب
بھی توہمات سے خالی نہیں۔ اس کی سیاسیات و علوم ایسی خامیوں سے بھرے پڑے ہیں لیکن چونکہ
نقل و حرکت کرتے رہتے ہیں اس لیے زیادہ مضر نہیں جس طرح کہ ان کے ہاں ذات پات
کا امتیاز ہی لیکن اس وجہ سے کہ اس میں ہمیشہ نقل و حرکت ہوا کرتی ہی یہ چنداں ضرر رساں نہیں۔
چند سال پیشتر یورپ تمام دنیا کو "تنازع للبقا" کے نقطۂ نظر سے دیکھتا تھا۔ ہم نے بھی ایک
لیکن اطاعت گذار شاگرد کی طرح اس سے یہ فقرہ سیکھا اور اس پر یقین نہ لانا اپنی تعلیم کے
نامکمل ہونے کی علامت سمجھا۔ لیکن یورپ کے اس نظریے میں اب تغیر کے آثار ظاہر ہو رہے
ہیں اور واقعات سے یہ ثابت کیا جا رہا ہی کہ قدرت کے انتخاب میں جو قوت اندر ہی اندر کام
کر رہی ہی وہ ہمدردی اور اتحاد کی ہی۔ انیسویں صدی میں معاشیات کا پیام "مسابقت"
تھا لیکن اب بیسویں صدی میں وہی پیغام "اتحاد عمل" سے بدلتا جا رہا ہے۔ اس سے یہی
ثابت ہوتا ہی کہ رفتار میں جو شے مانع ہو، وہ مضر ہی۔ (ع راحت میں جو مخل ہو کانٹا ہی راہ کا)
ہندوستان کا ایک زمانہ وہ بھی تھا جب اپنی زندگی کے تمام مسائل ہم خود ہی حل کیا کرتے تھے
ہم نہایت بے باکی سے تجربات عمل میں لاتے تھے اور جن نتائج پر ہم پہنچے، صرف اس بنا پر کہ وہ
یورپ سے مختلف ہوتے انھیں نظر انداز نہیں کرتے تھے ان تجربات کی نقل و حرکت برابر جاری رہنی چاہیے
اور انسان کی تفتیشات و تحقیقات کے زمرہ میں شامل کرنا چاہیے۔ ان کو پیچھے رکھ کر اور رسم میں دوسروں
کو بھلا کر اپنے کو بھی مٹا نہ دینا چاہیے۔ ہمارا فرض ہی کہ ان تجربات کو آگے بڑھائیں اور زندگی کے ساتھ
ساتھ چلائیں۔

(باقی آئندہ)

سعید انصاری متعلم جامعہ

ارمغانِ پارسی

از افکار آقای وحید اصفہانی مدیر مجلہ ارمغان

آزاد نیست با ہمہ آزادگی کہ ہست — سروے کہ بر نمی دمد از جویبار خویش
پژمرد برگ گل، چو در ایواں غریب ماند — شاداب بود در وطنِ شاخسار خویش
خشکیدہ شد چو شاخہ بشکستہ از درخت — تا دور شد وحید ز شہر و دیار خویش
ہر جا کہ یار ماست ہمانجا دیار ماست — مقصود ما ز شہر و دیار ست یار خویش

از افکار آقائے مجد الممالک مجدت کردستانی

تا تابے مرا، گذاری ز ہجر یار — پرسی ز حالِ من، چو بر من کنی گذار
ہم از موے تار تواست، تنم ہیچو تارِ موئے — ہم آوازِ گوش تواست فغانم چو تار زار
از آں تار موی تو، کہ مشک تتاری است — شدہ روزگارِ من چو مشک تتار تار
من آں موے تار تار، شمارم تا بحشر — نہ مانند شاعرانش، برم در شعار یار
بکن کہنہ عہد جہل، بنوروز علم نو — شد آن عہد پے سپر چو شد پے سپار یار
زیک سوی لالہ ہا، بکفہا پیالہ ہا — زیکسو چو مطرباں، بہر شاخسار سار
گر آتش پرست نیست، بآئین موبداں — زلال است سبزہ را، چرا در کنار نار

(منقول از مجلّہ ارمغان)

رومۃ الکبریٰ

وادی سپلن کی سرنگ سے دجو دنیا کی سب سے بڑی سرنگ کہی جاتی ہے، ہماری ٹرین ایک گھنٹہ میں گذری اوراب ہم اٹلی کے سرحد کے اندر داخل ہو گئے۔ اطالوی تہذیب و معاشرت کا پہلا نمونہ میلان کے اسٹیشن پر دیکھا جہاں ہم گاڑی بدلنے کے لیے دو گھنٹے ٹھہرے تھے۔ کھانا کھانے کو اسٹیشن کے ہوٹل میں گئے۔ اطالوی سوسائٹی کا وہ پہلا منظر ہمیشہ یاد رہیگا۔ اس شب کو میلان اسٹیشن کے ہوٹل میں جب میں نے سیکڑوں اطالوی مرد و عورتوں کو کھانا کھاتے دیکھا تو معاً یہ رائے قایم ہوئی (یا یوں کہوں کہ میرے خیالات کی تصدیق ہو گئی) کہ یہ قوم جہاں تک عادات و اسباب معاشرت کا تعلق ہے یورپ کی بہت سی اقوام کے مقابلہ میں بہت کم مہذب کہی جا سکتی ہے۔ اُس ہوٹل میں جو منظر دیکھا وہ ایسا تھا کہ اطالوی قوم کو ایک حد تک گندہ کہا جا سکتا ہے۔ ہمارے پاس ہی لوگ بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے اور اس طرح گوشت کے ٹکڑوں کو دانتوں میں لیکر چیرتے اور ہڈیوں کو چباتے تھے کہ بے اختیار یورپ کا عہد وسطےٰ یاد آتا تھا۔ ایک چیز ہمارے ہندوستان کی سوئین کی صورت مگر نمکین، اور ہندوستان کی موٹی سے موٹی سوئین سے بھی بیس گنی زیادہ موٹی، رکابیوں میں بھر بھر کر لائی جاتی تھی اور وہ خدا کے بندے اس شوق سے اُس کو کھاتے تھے کہ گویا ایک نعمت ہے، بعد کو معلوم ہوا کہ ماکارونی ——— اطالوی قوم کا قومی کھانا ہے۔ اور ان کو بہت ہی مرغوب ہے۔ گیہوں آٹا اسکی موٹی موٹی سوئین، بالکل مونج کی رسی کے ٹکڑے، ان میں نمک مرچ پڑا ہوا رکابی سے منہ تک

نگلتے چلے جاتے تھے اور پھر جبڑے بھی چلتے تھے اور ان ٹکڑوں کا ایک حصہ مُنہ کے باہر بھی لٹکتا رہتا تھا جیسے جانوروں کے مُنہ سے گھانس۔ چھُری کانٹا میز پر ہوتا ہی، مگر ان اشیا کا استعمال کچھ برائے نام ہی، سوائے اچھے ہوٹلوں کے جہاں ذرا صفائی کا زیادہ خیال معلوم ہوتا ہی مگر وہ بھی محض اتنا کہ ہم ہاتھ سے کھانے والے لوگ پھر بھی اس کو گندگی اور بدتمیزی سمجھتے تھے! خدا کی پناہ! اُس دن کس قدر مشکل سے چند لقمے کھائے، ہوٹل کی وہ غلاظت اور کھانے والوں کی وہ بدتمیزی دیکھی نہ جاتی تھی۔ یوں سمجھیے کہ ایک طرف دلّی یا لکھنؤ کے شرفا کا دسترخوان اور دوسری طرف کسی سرحدی پٹھان کا گوشت کے ٹکڑوں کو چبانا! یا کچھ اُس سے بھی بدتر۔ میں نے اسی وقت یہ سمجھ لیا کہ یورپ میں سب سے زیادہ بدتمیز قوم اطالوی ہی۔ سُنا تھا کہ حسین قوم ہی مگر ہم نے تو حسن کے آثار بھی کم دیکھے۔ البتہ یہ ضرور دیکھا کہ عورتیں فرانس کی وضع قطع کا مُنہ چڑاتی ہیں! اور ہر جگہ تھیٹروں اور بازاروں میں اس کی کوشش و خواہش نظر آتی ہی کہ فرانس کی نقل اُڑائی جائے۔

ہم میلان سے دوسری گاڑی میں سوار ہو کر صبح کو روما پہنچے۔ ہوٹل پہنچنے کے بعد طبیعت کو بے مزہ کرنے والا پہلا واقعہ تو یہ پیش آیا کہ ہمارا جو سامان بعد کو اسٹیشن سے آیا اُس کو چنگی کے اہلکاروں نے اس بُری طرح کھولا اور دیکھا کہ بعض چیزیں ٹوٹ گئیں، بعض کپڑے خراب ہو گئے اور پھر گودڑ کی طرح بکسوں میں بھر دیئے گئے! تیسری چیز یہ معلوم ہوئی کہ ہوٹل کے ملازمین (حالانکہ وہ ہوٹل ایک اچھا ہوٹل سمجھا جاتا ہی) تقریباً سب کے سب مسافروں کی ناواقفیت سے بہت زیادہ ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اور ہر وقت اس کوشش میں رہتے ہیں کہ جس کسی کی جیب میں ہاتھ پڑ سکے کچھ حاصل کر لیں۔ بعد کے تجربوں نے بتایا کہ اہل اطالیہ، خصوصاً شہری آبادی، عام طور پر بہت طامع ہوتے ہیں!

اب صرف دو چیزیں بیان کرونگا۔ اول روما کے آثار قدیمہ جنکو اچھی طرح دیکھا اور عبرت کی نظر سے دیکھا، دوسرے تُرک احباب کی ملاقاتیں۔

روما کی پرانی دیواروں اور شکستہ عمارتوں پر گویا ہزاروں برس کی تاریخ کندہ ہے۔
اہل نظر اُن آثار قدیمہ میں جن سے سارا شہر بھرا ہوا ہے۔ بہت کچھ دیکھ سکتے ہیں۔ روما کی تاریخ
درحقیقت دُنیا کی تاریخ ہے۔ میں جو کچھ کتابوں میں پڑھ چکا تھا سب اُن آثار کو دیکھ کر تازہ ہو گیا۔
اور ان مقامات کے دیکھنے میں مجھے ایک عجیب لطف آتا تھا۔ جو تاریخی واقعات کتابوں میں
پڑھے تھے وہ گویا نظر کے سامنے تھے۔ سیزر کہاں قتل کیا گیا تھا، انٹونیس نے کس جگہ
کھڑے ہو کر تقریر کی تھی، نیرو نے کن کن عمارتوں کو جلا کر راکھ کیا تھا، سینٹ پیٹرس کہاں
مارے گئے تھے اور کیونکر دفن ہوئے، اگیڈس جس نے قوم گاتھ کے تین لاکھ نفوس کو تہ تیغ
کیا تھا (اس عہد جدید کی خون آشامیوں کے مقابلہ میں وہ قتل عام ایک کھیل ہو گا!)
کس جگہ دربار کرتا تھا، وہ پُل کس موقع پر تھا جس پر ہوریشیس نے پورسینا کی فوجوں کو روکا تھا۔
وغیرہ وغیرہ، پورے ڈھائی ہزار برس کی تاریخ پیش نظر تھی اور خدا یاد آتا تھا! روما کی تاریخ
قدیم کے راز اس کی اینٹوں میں پنہاں ہیں، کوئی پتھر نہیں جس پر خون کے دھبے نہ پڑے ہوں
ہر گھر کسی نہ کسی دردناک واقعہ کی یادگار ہے، ہر پرانا درخت ایک گواہ ہے جس نے بہت سے
خوفناک مناظر دیکھے ہونگے۔ ہر پھول جو اس سرزمین پر اُگا ہوا ہے اس نے مٹی میں جذب ہو جانے
والے خون سے زندگی پائی ہوگی اور وہ جب کھلتا ہے تو گویا کسی نہ کسی قبر پر کھلتا ہے۔
روما الکبریٰ کے بانی دو جنگلی انسان بتائے جاتے ہیں جن کو ایک بھیڑیئے نے پرورش کیا تھا
شہر کے خاص خاص مقامات پر ایک تصویر عام طور پر نظر آتی ہے جس میں دو انسان کے بچے ایک
بھیڑیے کی مادہ کا دودھ پیتے نظر آتے ہیں۔ جانوروں اور انسانوں کے بچوں کے متعلق اس قسم
کی حکایتیں کوئی نئی چیز نہیں ہیں۔ فردوسی نے رستم کے بیٹے کو کوہ البرز کی چوٹی پر عقاب کے گھونسلے
میں پرورش کرایا، نینوا کی سلطنت کے بانی کو اُس کے بچپن میں فاختہ دانہ کھلاتی تھی، خود ہندوستان
میں اس طرح کے بہت سے قصے مشہور ہیں۔ وسط ہند کے گونڈوں کا ایک دیوتا بھی شیر کی صورت لکھا
ہے اور کہا جاتا ہے کہ وہ ایک شیر تھا جس کے تعلقات اس حصہ ملک کے انسانی آبادی سے بہت

عمدہ تھے، غرض یہ کوئی نیا توہم نہیں ہے، مگر اٹلی میں تو رومیلس اور ریمس اور بھیڑیے کی مادہ جا دنکو دودہ پلاتی تھی، قومی تاریخ کا ایک جزو ہو گئے ہیں اور ان کی تصویر ایک قسم کا قومی نشان بھی جاتی ہے۔ حتی کہ ایک دو مشہور عمارتوں کے دروازے پر کٹہروں میں زندہ بھیڑیے بند ہیں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ اطالوی قوم کی "گرگ زادگی" (اگر اس اصطلاح کا استعمال کرنا بیجا نہو) کا قومی نشان ہیں! درحقیقت اہل روما "گرگ زادہ" یا "پروردۂ آغوش گرگ" ہیں یا نہیں، خدا کو معلوم ہے مگر جن لوگوں نے جنگ طرابلس کے حالات پڑھے ہیں وہ ایک حد تک انکی درندگی سے انکار بھی تو نہیں کرسکتے! ریموس اور ریمس کی اولاد بھیڑیے کی خصوصیات سے دو ہزار برس بعد بھی محروم نہیں ہوئی ہے گو اب اُس کے جسم کے لمبے بال باقی نہیں اور صدیوں تک انسانی تہذیب و تمدن کے سایہ میں پرورش پاکر اب اُس کی بہیمیت پر ایک اچھا ملمع ہو گیا ہے۔ تاہم وہ اب بھی کچھ نہ کچھ اپنی دایہ کی روایات کو روشن رکھتے ہیں! رومۃ الکبرے کی سات پہاڑیوں پر آج جو آبادی پھیلی ہوئی ہے اس کا رشتہ عہد ماضی کی بہیمیت سے منقطع ہوا ہو مگر بالکل منقطع نہیں ہوا، کچھ نہ کچھ باقی ہے!

اُن چرواہوں نے دو چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر اپنا گاؤں آباد کرلیا اور قضا و قدر نے ایک ایسی حکومت کی بنیاد ڈال دی جس کے تاجداروں نے صدیوں تک دنیا میں نور و ظلمت کے ہنگامے برپا رکھے۔ جس طرح آدم کی عمر میں پہلی دفعہ عورت نے انقلاب پیدا کیا تھا جس کے تلخ ثمرات آج ہم کو کھانے پڑ رہے ہیں اسی طرح روما کی تاریخ میں پہلی دفعہ ایک عورت نے انقلاب عظیم پیدا کیا، وہ قصہ بہت دلچسپ ہے۔ ایک حسین عورت کا حسن ولیعہد سلطنت کو بے اختیار کردیتا ہے، اور وہ نوجوان رات کو برہنہ شمشیر لیکر اُس عورت کے سرہانے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اس سلطنت کا ولیعہد ہوں، تلوار میرے ہاتھ میں ہے، تیری عصمت آج کی شب مری تلوار پر قربان ہونی چاہیے! اُس عورت کا غرورِ نسوانیت چمکتے ہوئے فولاد سے مرعوب نہیں ہوتا مگر وہ شاہزادے کی بہیمانہ طاقت سے ناچار مغلوب ہوتی ہے اور صبح کو اپنے شوہر اور باپ کے سامنے اپنی رسوائی

کا حال سنا کر خودکشی کر لیتی ہے، اُس کی لاش سامنے پڑی ہے اور بروٹس اُسی چھری کو اُٹھا کر
جس سے ابھی ابھی اُس عورت نے اپنا کام تمام کیا ہے قسم کھاتا ہے اور کہتا ہے "اُس معصوم خون
کی قسم جو اس چھری سے ٹپک رہا ہے، دیوتا مرے گواہ ہیں، میں مغرور تارکوین سے انتقام
لونگا، اُس سے اور اُس کے اہل وعیال سے یہ چھری انتقام لیگی، اور اس چھری کی قسم، اور
اس خون کی قسم آیندہ وہ مغرور اور اس کی اولاد میں سے کوئی اس ملک پر حکومت نہ کر سکیگا"
اب وہ لاش سر بازار رکھی ہوئی ہے- اور ہزاروں انسان آتے ہیں- اور بادشاہ کے خلاف
بغاوت کا حلف اُٹھاتے ہیں، اس طرح ایک خونیں عہد کا آغاز ہوتا ہے اور آخر کار اس خاندان
کا ایک بچہ بھی ملک میں باقی نہیں رہتا- اور اہل ملک اپنی ایک جمہوریہ (جو غالباً اطالیہ کی پہلی جمہوریہ
تھی) قائم کرتے ہیں- یہ دو ہزار برس کا واقعہ ہے اور اُس عورت کا نام آج تک تاریخوں میں
روشن ہے جس کے خون نے سلطنت کی بنیادیں ہلا دیں! آہستہ آہستہ دولت جمع ہوتی ہے اور
روما کی سلطنت کی حکومت کا دائرہ وسیع ہوتا ہے، انسان انسانوں کو غلام بناتے ہیں- اور
غلامی کا وہ ہیبتناک عہد شروع ہوتا ہے- جب لاکھوں انسان کتوں سے بدتر حالت میں مبتلا
ہو گئے یہی عہد تھا جس کے اثرات نے تمام یورپ کو بدترین بہیمیت میں مبتلا کر دیا اور حیوانیت
کی اُن شرمناک خودپرستیوں نے تمام براعظم کو گندہ کر دیا جس کی ایک ادنیٰ مثال اندلس
کی مذہبی عدالتیں تھیں اگر عرب میں اسلام کی روشنی نمودار نہ ہو گئی ہوتی تو شاید آج ساری دنیا
اس غلامی کی زنجیروں میں گرفتار ہوتی! وہ زمانہ تھا کہ حکومت روما کی فتوحات کا سلسلہ یونان
تک پہونچ چکا تھا اور مقبوضہ ممالک سے ہزارہا غلام پابہ زنجیر آتے تھے اور بازاروں میں
ترکاریوں کی طرح فروخت ہوتے تھے- اہل روما یونان کی عظمت اور اُس کے علم وفضل اور
اُس کی صناعیوں کو دیکھ دیکھ کر حسد کرتے تھے، وہ دماغ اون کو نہیں ملا تھا جس نے اہل یونان
کو دنیا کا اُستاد بنایا لیکن روما کو یونانیوں کی ملی عظمت کا بہتر نمونہ بنانے کی خواہش رومیوں
کو ملک گیری پر آمادہ کرتی تھی، رفتہ رفتہ یونان کے بہترین خزانے، صنعت وعلم کے بہترین

ذخائر جو وہاں جمع تھے روما کی فاتح فوجوں کے ذریعہ سے اطالیہ میں لائے گئے اور آج تک موجود ہیں، صرف تنہا مرکس فلوس اپنے صرف ایک حملے کے بعد، تاریخ ہم کو بتاتی ہے کہ منوں سونا اکڑوروں طلائی سکّے ۲۰۰۰ فولادی مجسمے (قدآدم) ۲۳۰ سنگ مرمر کے مجسمے، تصویریں اور صناعی کے بہترین نمونے روما میں لایا۔ اس طرح وہ خزانے جمع ہوئے جنکا ایک عکس پاپا کے عجائب خانہ میں سیلاح کو نظر آتا ہے۔ اطالوی قوم کے اندر جوہر اصلی نہ جب تھا نہ اب ہے مگر اُنھوں نے یونان کی نقل شروع کی اور خوب کی، اطالیہ کی تاریخ کا مطالعہ مجھے اسی نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ بلحاظ شعور اور دماغ یہ قوم کبھی اتنا بلند پایہ نہ رکھتی تھی جتنا کہ اب ظاہر کیا جاتا ہے۔ البتہ اُس نے کسی حد تک یونان کے کمالات کی نقل اُتاری اور اسی سلسلہ میں دوچار ایسے صناع و مصور بھی پیدا کیے جو اپنی مخصوص دماغی قابلیت پر ناز کرنے کا حق رکھتے تھے بحیثیت مجموعی اور از روے انصاف سوائے اس کے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ روما میں سپاہی تھے، اہل علم کبھی نہ تھے، تلوار تھی و قلم نہ تھا، ایک اور قومی خصوصیت اور بھی تھی، وہ معمار تھے اور عمارتوں سے اپنی قومی عظمت جتلاتے تھے، اُن کی نظر میں عظمت کا معیار ہر چیز کی جسامت تھی، یعنی عمارتوں کی خوبصورتی ہو یا نہو مگر اُن کی بلندی، انکا حجم، ان کی محرابوں کی وسعت، اُن کا استحکام، یہ چیزیں تھیں جو قومی فخر و نخوت کی مظہر تھیں۔

ایک فلسفی اگر اس کلیہ کو ثابت کرنے کی کوشش کرے کہ تہذیب و تمدن اور معاشرت، اور ان سب کی دایہ دولت، جس قدر زیادہ بڑھتی ہے اسی قدر حیوانیت اور بداخلاقی بھی ترقی پاتی ہے۔ تو بظاہر یہ دو چیزیں کس قدر متضاد ہیں، مگر فلسفی کے اس کلیہ کو ثابت کرنے کے لیے تاریخی واقعات کا ایک نامتناہی سلسلہ پیش نظر ہے بیسویں صدی عیسوی کے اعلیٰ یورپین تہذیب نے انتہائی بہیمیت کے مناظر دنیا کے سامنے پیش کیے وہ کوئی نئی چیز نہیں، دنیا میں اکثر یہی ہوتا رہا ہے انسان کا تمدن جب زیادہ اعلیٰ اور اس کی معاشرت زیادہ پر تکلف اور اس کے علوم و فنون زیادہ وسیع ہوتے ہیں تو نفس لئیم بھی زیادہ طاقتور ہو جاتا ہے۔ سلطنت روما کی عظمت کا وہ زمانہ جب

دنیا کی نظریں روضۂ الکبری کے دروازوں پر لگی رہتی ہیں وہ مسیحیت کا اسقف اعظم عیسائی دنیا میں دیوتا سمجھا جاتا ہی، دنیا کے خزانے روما کی سڑکوں پر پڑے جھکتے ہیں اور تاجداروں کے سروں کو ادنیٰ سپاہی بے تکلف ٹھکرا دیتے ہیں، وہ زمانہ طاقت، دولت اور تمدن کا بہترین زمانہ کہا جاتا ہے اور عین اسی زمانہ میں بہیمیت اور خونخواری کی بدترین مثالیں موجود ہیں! نیرو کی خون آشامیاں ان خونریزیوں کے مقابلہ میں کچھ بھی نہ تھیں جو مسیحیت کے مرکز پر اس عہد میں رونما ہوئیں۔ جب روما اور اس کے اساقفہ کی بلند اقبالی دنیا میں اپنے ڈنکے بجا رہی تھی۔ دارالسلطنت کی وہ تباہی کچھ بھی نہ تھی جو عہد اول کے تاجداروں کے ہاتھوں عمل میں آئی، اس کے مقابلہ میں وہ آتش زدگی اور خونریزی جس کا دور تہذیب و تمدن میں روما شکار ہوتا تھا بدرجہا زیادہ خوفناک اور عبرت انگیز ہے۔ سولہویں اور سترھویں صدی کی رومن تاریخ اور اب بیسویں صدی کے تمدن کا موازنہ اہل نظر کے لیے کچھ ایسا مشکل نہیں۔ مسیح کے جانشین جو مسند حکومت پر ہنیبال اور نیرو سے کچھ کم نہ تھے اپنی روحانی چادروں کو لاکھوں انسانوں کے خون سے رنگتے تھے اُن کے قبائے تقدیس پر ہوس، عیش پرستی، اور دنیا طلبی کے ایسے دھبے لگتے تھے جو آج تک عیسائی مورخین کے مٹائے نہ مٹ سکے۔ قوموں کی اقبالمندی کی وہ ایک عبرت انگیز مثال ہی کہ مسیحیت کا اسقف اعظم، کبھی شمشیر برہنہ لے کر میدان جنگ میں مسیحی روحانیت کی داد دیتا ہی! اور کبھی روما کی گلیوں میں مُنہ چھپائے بھاگا چلا جاتا ہی! ایک فرد واحد نہیں مسیح کے کم و بیش تیس مسند نشینوں نے اپنی زندگی کا سفر تلوار کی دھار پر ختم کیا۔ ۹۶۰ء سے ۱۰۵۹ء تک پاپائے روما کی رعایا نے جانشین مسیح کے خلاف ۱۶۱ دفعہ بغاوت کی اور دونوں طرف سے تلواریں بے نیام ہوئیں اور خون کے دریا بہے۔ یہ تھی عہد وسطے کی مسیحیت جسکی یادگار آج ایک بوڑھے میاں مسیحیت روما کے گذشتہ اقبال کا داغ کلیجے سے لگائے ویٹیکن (پاپائے روما کا محل) میں بیٹھے ہوئے ہیں (ایک شمع رہ گئی ہی سو وہ بھی خموش ہی!) انکے زندہ ہونے کا بڑا ثبوت بس یہ ہی کہ کبھی کبھی امن اور صلح کے چند کاغذی پیام اُس دُنیا کو بھیج دیتے ہیں جو ان پیاموں کو تلوار کا

کی نوک پر مارتی ہے!

یہ تماشا روما جس کو ہم دیکھنے گئے تھے، قوموں اور ملکوں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والی کتابوں کے اوراق پر اپنی ساری عمر نثار کر دیتے ہیں، لیکن وہی تاریخ تمام وکمال کسی ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے سایہ میں یا کسی ایک شکستہ محراب کے نیچے بیٹھ کر نظر کے سامنے گذر جاتی ہے، میں نے روم کی تاریخ جو کچھ پڑھی وہ کچھ بھی نہ تھی اُس کے مقابلہ میں جو اپنی آنکھوں سے دیکھی! مگر میں تو سفرنامہ لکھ رہا ہوں روم تہ الکبرلے کی تاریخ پر تبصرہ کرنے نہیں بیٹھا - لہذا چند آثار قدیمہ کی مختصر داستان سنکر اس باب کو ختم کیجیے -

(باقی آئندہ)

قاضی عبدالغفار

موت میں عمر ابد، قید میں آزادی ہے

از رشحات فکر مولانا شاد عظیم آبادی

کس سے تاراجیِ گلزار کی فریاد ہے؟ ❊ حیف اے باد صبا وقت کی بربادی ہے

جور صیاد غنیمت ہے اسیروں کے لیے ❊ موت میں عمر ابد، قید میں آزادی ہے

اوس پڑتی ہے تو ہوتے ہیں شگفتہ غنچے ❊ رنج اِس باغ کے اندر سبب شادی ہے

دیکھ گلچیں کی طرف، ایک خزاں ہی کیا ہے؟ ❊ الغرض باغ کی ہر طرح سے بربادی ہے

ظلم کا کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھ قاتل ❊ آگئے خود آپ ہے تو اور تری جلادی ہے

گھر فکر زمانے سے پڑے ہیں میلے
آب دوان میں جو ملے شاد تو استادی ہے

بغاوت عرب

ماخوذ از تذکرہ جمال پاشا

موجودہ عہد اسلامی کا سب سے افسوسناک واقعہ غالباً شریف حسین ملک الحجاز کی بغاوت ہے۔ اس سازش کا باقاعدہ ظہور اگرچہ اس وقت ہوا جب سلطنت عثمانیہ محاربہ عظیم یورپ کی وجہ سے ہر طرف سے دشمنوں کے نرغے میں گھری ہوئی تھی لیکن ہمیں اس امر کو فراموش نہیں کر دینا چاہیے کہ اس جنگ سے کہیں پہلے دول یورپ نہایت کامیابی کے ساتھ ترکوں اور عربوں کے قدیمی مناقشات سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ چنانچہ عالم اسلامی کے تنزل و انحطاط کے ساتھ ہی یہ اختلافات بھی بتدریج وسیع ہوتے چلے گئے حتیٰ کہ عربوں نے نہایت آسانی کیساتھ تمام ان خارجی اثرات کو قبول کر لیا جنھوں نے گزشتہ چند صدیوں سے ملت اسلامیہ کا شیرازہ پریشان کر رکھا ہے۔

خود دولت عثمانیہ بھی ان واقعات سے بیخبر نہ تھی۔ ترکوں اور عربوں کے درمیان کبھی صحیح معنوں میں اتحاد قائم نہیں ہوا اور ظاہر ہے کہ اخوت اسلامی کے صحیح تصور کی عدم موجودگی میں ان دو مختلف انفیت قوموں سے جنکے اعمال و اخلاق میں باہم اس قدر اختلاف واقع ہوا ہے اس کی توقع رکھنا بھی بے سود ہے۔ البتہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ قومی توجہات اور نسلی امتیازات کے علاوہ اور بھی بہت سے عناصر جنکی تفصیل کا بالفعل موقع نہیں اس فتنے کی تہ میں کام کر رہے تھے۔ چنانچہ جس وقت دولت عثمانیہ جنگ میں شریک ہوئی تو عراق و شام سے لیکر اندرون عرب تک ایک وسیع انقلابی تحریک غیر معمولی سرعت سے نشوونما پا رہی تھی۔

سنہ ۱۹۱۴ء کے آخر میں جمال پاشا مرحوم شام و فلسطین کے فوجی عامل مقرر ہوئے اور جس روز وہ دمشق پہنچے اسی دن حلمی بے والی فلسطین نے انکی خدمت میں چند اہم دستاویزیں پیش کیں جو فرانسیسی قنصل خانہ سے دستیاب ہوئی تھیں۔ ان دستاویزوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ بیروت، دمشق اور شام کے دوسرے بڑے شہروں کے سرکردہ رؤسا ترکوں کے برخلاف سازش میں مصروف ہیں

پاشائے مرحوم نہایت معاملہ فہم اور صاحب تدبیر انسان تھے۔ انہوں نے دنیائے اسلام کی عام حالت کا اندازہ کرتے ہوئے اس وقت نہایت تحمل سے کام لیا اور اُن لوگوں کے برخلاف کوئی عملی کارروائی کرنے سے پیشتر اس انقلاب پسند جماعت کے سردار اعظم عبدالکریم الخلیلی سے ملاقات کی۔ چند دنوں کے بعد وہ ڈاکٹر عبدالرحمن مالک المفید، عبدالغنی عریسی مالک المقتبس اور محمد قود علی اس جماعت کے دوسرے سرگرم کارکنوں سے ملے اور انہیں سے ہر ایک کے ساتھ نہایت فراخ حوصلگی سے اس مسئلہ کے متعلق تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ دوران گفتگو میں ایک شکایت سب ہی کی زبان پر تھی اور وہ یہ کہ روپیہ نہیں لیکن پاشائے مرحوم نے جب اس بارے میں ان سے عملاً ہمدردی کا اظہار کیا تو ہر شخص ترکوں کے حسن سلوک اور انکی مروت کا ثنا خواں تھا۔

صرف یہی نہیں بلکہ چند دنوں کے بعد پاشائے مرحوم نے ایک ادبی محفل ترتیب دی جس میں جماعت مصلحین (جیسا کہ ان لوگوں نے اپنا نام اختیار کر رکھا تھا) کے دوسرے افراد کو بھی کثرت سے مدعو کیا۔ دوران جلسہ میں ان لوگوں نے عربوں کی مدح وستائش میں بڑے زور وشور سے قصیدہ خوانیاں کیں اور نحن جنود الله شبان البلاد کے قومی ترانوں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔

جمال پاشا مرحوم نے نہایت اطمینان کے ساتھ اس کارروائی میں شروع سے لیکر آخر تک حصہ لیا اور جب محفل ختم ہو گئی تو انہوں نے ایک پرزور تقریر میں شرکائے بزم سے درخواست کی کہ وہ اس نازک وقت میں جبکہ دنیائے اسلام ہر طرف سے اغیار کی سازشوں کا شکار ہو رہی تھی جماعت میں تفرقہ کا باعث نہوں بلکہ اپنے ذاتی اختلافات کو چند دنوں کے لیے بالائے طاق رکھتے ہوئے ان لوگوں کے خلاف متحد ہو جائیں جو ان کے مذہب وملت کے مشترکہ دشمن تھے۔ پاشائے مرحوم نے انھیں یقین دلایا کہ اگر خلافت اسلامیہ کو ذرا سا بھی صدمہ پہنچ گیا تو اسکے ناخوشگوار نتائج صرف ترکوں کو ہی نہیں بلکہ تمام مسلمانان عالم کو برداشت کرنا ہونگے۔ اس تقریر کا اثر بظاہر سامعین پر نہایت اچھا پڑا چنانچہ ہر شخص نے قرآن اور خدا کا نام لیکر خلیفۃ المسلمین کے ساتھ اپنی وفاداری کا عہد از سر نو مستحکم کیا۔

اسی اثنا میں پاشائے مرحوم کو امیر ابن سعود، ابن رشید، سعید یحیٰی حمید الدین امام یمن اور دیگر رؤسائے عرب و عراق کی طرف سے جن سے انہوں نے حکومت کی امداد و اعانت کی درخواست کی تھی نہایت حوصلہ افزا جواب موصول ہوئے۔ البتہ شریف حسین کا لب و لہجہ قدرے مبہم تھا۔
مزید احتیاط کے لیے پاشائے مرحوم نے شام کی عرب آبادی کا مال و متاع جنگی ضروریات سے بالکل مستثنی کر دیا۔ اس زمانہ میں وہ جماعت مصلحین پر بہت زیادہ اعتماد ظاہر کرتے اور اکثر انکے وطن پرستانہ مظاہروں میں بھی حصہ لیتے تھے جبکہ اس وقت لبنان اور شام کے علاقوں میں ایک اور سازش کا انکشاف ہوا۔ نصاریٰ بعض راہبوں کی سرکردگی میں شام و فلسطین میں ایک فرانسیسی ریاست قایم کرنیکے منصوبے باندھ رہے تھے۔ عربوں کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو ان کے غصے کی کوئی انتہا نہ تھی یہاں تک کہ ۴ جنوری ۱۹۱۵ء کو جب جمال پاشا مرحوم بیت المقدس پہنچے تو وہاں انکی خدمت میں ایک مطبوعہ کتاب پیش کی گئی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ عرب آبادی عیسایان شام کے قتل عام کی فکر میں ہے۔ اس خانہ جنگی کو روکنے کیلیے انہوں نے ایک اعلان شائع کیا جس میں ہر شخص کو تنبیہ کی گئی تھی کہ اس وقت خلیفۃ المسلمین نے صرف انگریزوں اور فرانسیسیوں کے برخلاف جہاد کا حکم دیا ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ عیسایان شام کے جان و مال سے کسی طرح بھی تعرض نہ کریں۔

جنوری ۱۹۱۵ء سے لیکر اپریل ۱۹۱۵ء تک اور کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا لیکن مئی ۱۹۱۵ء میں جمعیتہ مرکزیہ مصر کی طرف سے ترکی حکومت پر ایسے الزامات شائع ہوئے جنھیں دیکھ کر پاشائے مرحوم کو نہایت رنج ہوا۔ چنانچہ انہوں نے ایک دفعہ پھر عبدالکریم الخلیلی کو بلا کر اس مسئلہ پر گفتگو کی۔ عبدالکریم نے جمعیۃ اللامرکزیہ کی اس حرکت پر حیرت کا اظہار کیا اور ان کی غلط فہمیاں رفع کرنے کے لیے خود مصر جانے پر آمادگی ظاہر کی۔

اس وقت شام کا سیاسی مطلع نہایت غبار آلود ہو رہا تھا۔ اتحادی بیڑے دردانیال پر حملہ آور ہو چکے تھے اور شامی افواج کا اکثر حصہ قسطنطنیہ میں موجود تھا۔ اتحادی اگر اس موقعہ کا فائدہ

اٹھاکر شام پر حملہ کرتے تو وہ نہایت آسانی کے ساتھ ترکوں کی تھوڑی سی فوج کو شدید نقصانات پہنچا سکتے تھے۔ دوسری طرف حکومت اطالیہ کی شرکتِ جنگ کی وجہ سے ساحل شام اور بیرونی دنیا کے درمیان تمام سلسلہ ہائے رسل و رسائل منقطع ہو چکے تھے۔ ان حالات کی وجہ سے جمال پاشا مرحوم کو عبدالکریم کے ارادہ سفر سے نہایت درجہ حیرت ہوئی۔

لیکن اب یہ حیرت زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔ جون ۱۹۱۵ء کے آخر میں شیخ اسد شکور قاضی عساکران سے ملے اور دورانِ ملاقات میں بتلایا کہ شام میں انہیں ہر جگہ بغاوت کے آثار نمودار ہیں۔ اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ اس سازش کے متعلق تفصیلی اطلاعات کمال الاسد آفندی سے ملینگی۔ کمال الاسد بیروت کے ڈپٹی تھے اور اس وقت ایک چھوٹے سے گاؤں قانا زامیں مقیم تھے چنانچہ پاشائے مرحوم نے انھیں فوراً بذریعہ تار طلب کیا اور ان سے معلوم ہوا کہ باغیان شام عبدالکریم الخلیلی اور رضا بے الصلح کی سرکردگی میں صیدا اور طائر کے اضلاع میں بغاوت برپا کرنے کی طیاریاں کر رہے ہیں۔

اس خبر کے ملتے ہی عبدالکریم الخلیلی۔ رضا بے اور ان کے شرکائے کار کی گرفتاری کے احکام صادر ہو گئے اور چند دنوں کے بعد تحقیقات سے ثابت ہو گیا کہ کمال الاسد کے الزامات بے بنیاد نہ تھے۔

اسی اثنا میں صیغہ خبر رسانی نے ایک اور دستاویز کو پیش کیا جس سے پاشائے مرحوم کو باغیان شام کی غداری کا یقین ہو گیا یہ ایک خفیہ مکتوب تھا جو شیخ حقی خلف مہتمم مسجد شامی ہاتم کی طرف سے شکری آفندی باغیان شام کے ایک اور سرغنہ کو لکھا گیا تھا۔ اس خط میں بغاوت کے متعلق چند عملی تجاویز پیش کی گئی تھیں اور ان کے متعلق ضروری سوالات کا جواب مانگا تھا۔

ایکطرف یہ واقعات رونما ہو رہے تھے دوسری طرف شریف حسین اور انگریزوں کے درمیان خفیہ خط و کتابت جاری تھی، دونوں سازشوں کی باقاعدہ ابتدا جون ۱۵ء میں ہوئی چنانچہ شریف حسین اور حکومت برطانیہ کے درمیان ملکی حدود کے متعلق تمام امور متنازعہ فیہ کا تصفیہ

جولائی سنہ ۱۹۱۵ء سے جنوری سنہ ۱۹۱۶ء تک آٹھ مراسلوں کی وساطت سے ہوا۔

۱۔ جولائی سنہ ۱۹۱۵ء کے مراسلہ میں شریف حسین نے حکومت برطانیہ کو اس شرط پر فوجی امداد
ـنے کا وعدہ کیا کہ انگریز مشرق میں سابقہ ایرانی حدود سے لیکر خلیج بصرہ تک، جنوب میں سوائے
ـن کے بحر ہند تک، مغرب میں بحیرۂ قلزم سے لیکر مرسینہ تک اور شمال میں مرسینہ اور اڈانہ کو
ـل کرتے ہوئے اس خط تک عربوں کی خود مختار حکومت تسلیم کرلیں جو ۳۷ درجہ طول البلد سے
بکر، ایرانی حدود تک منتہی ہوتا ہے۔

۲۔ ۳۰ اگست سنہ ۱۹۱۵ء کو سر ہنری میکماہن قاہرہ کے برطانوی ریذیڈنٹ نے اس امر کی خواہش
ـہر کی کہ سرحدوں کا مسئلہ بالفعل خارج از بحث سمجھا جائے۔

۳۔ ۹ ستمبر سنہ ۱۹۱۵ء کو سر ہنری نے دفتر خارجہ کو اطلاع دی کہ شریف حسین سرحدوں کے فوری
تصفیہ پر مصر ہے۔ اس کے ساتھ ہی شریف کے مصری نمایندہ کا اعلان بھی ارسال کر دیا گیا جس میں
ظاہر کیا گیا تھا کہ شام کے ان اضلاع میں جو خالص عربی ہیں فرانسیسی اقتدار کی ہر طرح سے مزاحمت
کی جائے گی اور یہ کہ چند ضروری ترمیمات کے علاوہ اہل عرب بالعموم تمام ان ملکی حدود کو تسلیم
کرتے ہیں جو شریف مکہ نے پیش کی ہیں۔

۴۔ ۲۴ اکتوبر سنہ ۱۹۱۵ء کے مراسلہ میں شریف مکہ کو اطلاع دی گئی کہ مرسینہ، الگزینڈریٹا اور
شام کے وہ اضلاع جو دمشق وحلب کے مغرب میں واقع ہیں کسی طرح سے بھی عربی الاصل تسلیم نہیں
کیے جا سکتے لہذا بالفعل انکا مسئلہ خارج از بحث سمجھا جائے۔ البتہ تمام ان رقبوں کے علاوہ
جہاں حکومت برطانیہ کو فرانسیسی مفاد سے تصادم کا خوف نہیں شریف کے مطالبات تسلیم کرلئے
گئے ہیں۔ مزید براں حکومت برطانیہ عربوں کے جذبۂ خود مختاری کو صرف بنظر ہمدردی ہی نہیں
دیکھتی بلکہ انہیں ہر طرح سے عملی امداد دینے کے لیے بھی طیار ہے۔

۵۔ ۵ نومبر سنہ ۱۹۱۵ء کو شریف نے مرسینہ اور اڈانہ کے اضلاع سے دست بردار ہونے کی
اطلاع دی لیکن بیروت اور دوسرے اضلاع کے متعلق اس کا اصرار بدستور جاری رہا۔

۶۔ ۱۳ر دسمبر ۱۹۱۵ء کے مراسلہ میں سرہنری نے شریف سے درسینہ اور دانہ سے دستبردار ہوجانے کا ذکر کیا۔

۷۔ یکم جنوری ۱۹۱۶ء کے مراسلہ میں شریف حسین نے اطلاع دی کہ انگریزی اور فرانسیسی تعلقات میں عدم مداخلت کے خیال سے زمانہ جنگ تک اضلاع لبنان کا مسئلہ ملتوی سمجھا جائے۔ البتہ جنگ کے بعد شریف کو ان اضلاع کے متعلق اپنے مطالبات کو از سرِ نو پیش کرنے کا اختیار ہوگا۔

۸۔ ۳۰ر جنوری ۱۹۱۶ء کے مراسلہ میں سرہنری نے شریف کے اس ارادے کا حوالہ دیتے ہوئے اسے یقین دلایا کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں میں جنگ کے بعد بھی دوستانہ تعلقات قائم رہیں گے۔

ان دستاویزوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ:۔

۱۔ شریف حسین ۱۹۱۵ء کے آغاز ہی میں بغاوت کا فیصلہ کرچکا تھا اور

۲۔ عبدالکریم الخلیلی اور اس کے شہرکائے کار کو شریف کی طرف سے باقاعدہ ہدایات پہنچتی تھیں۔

چنانچہ عبدالکریم الخلیلی اور دوسرے ملزمین کی گرفتاری کے ساتھ ہی اس سازش کی تمام کڑیاں ایک ایک کرکے ملتی گئیں۔ شام و اضلاع شام میں اب گرفتاریوں کی بھرمار تھی۔ جولائی کے آخر میں عبدالکریم اور اس کے رفقا کے مقدمہ کا فیصلہ ہوا اور عدالت نے انھیں موت کی سزا دی، اس کے بعد عبدالغنی الوارثی اور جماعت مصلحین کے دوسرے سرکردہ اراکین اس جرم میں ماخوذ ہوئے۔ ترکی محکمۂ عدالت نے ان لوگوں کے خلاف نہایت احتیاط سے مقدمہ چلایا اور مجوزہ بغاوت کے متعلق تمام ضروری معلومات مرتب کرلیں۔

لیکن شریف حسین اور اس کے بیٹے اپنی سازش کو نہایت ہوشیاری سے انجام دے رہے تھے۔ ستمبر ۱۹۱۵ء میں شریف فیصل قسطنطنیہ پہنچا اور سلطان المعظم کی خدمت میں حاضر ہوکر بڑے خلوص اور لجاجت

ے ...ں وفاداری کا اظہار کیا۔ واپسی میں اس نے بیت المقدس میں بھی ایک پرجوش تقریر کی
...ت ...ی افواج کو یقین دلایا کہ وہ اپنی زندگی اسلام کی راہ میں وقف کر چکا ہے۔ غالباً اس امر
...بیان کرنے کی ضرورت نہ ہوگی کہ اس سے کہیں پہلے وہ اور اس کا فریب کار باپ اپنے
...دمت کو غیروں کے ہاتھ فروخت کر چکے تھے۔

...نوری ۱۹۱۶ء میں فیصل پھر دمشق آیا اور جمال پاشا مرحوم کو مہم سویز کی تیاری میں ہر طرح
...سے مدد دینے کا ارادہ ظاہر کیا۔

فروری ۱۹۱۶ء میں انور پاشا کنعان و سویز کی افواج کے ملاحظہ کے لیے دمشق آئے۔
...جمال پاشا مرحوم کی رائے سے شریف فیصل کے ہمراہ مدینہ تشریف لے گئے۔ اس سفر میں جمال
...ب ھی انکے ساتھ تھے جہاں شریف حسین نے ہر ممکن طریقہ سے اپنی وفاداری کا اظہار کیا۔

...لیکن ابھی انور پاشا قسطنطنیہ واپس پہنچے تھے کہ جمال پاشا کو شریف حسین کی طرف سے ایک
تا... ...س مضمون کا موصول ہوا کہ اگر ترکی حکومت یہ چاہتی ہے کہ دوران جنگ میں میں خاموش رہوں
...تبوک سے لیکر مکہ تک میری خودمختار حکومت تسلیم کر لی جائے اور جماعت مصلحین کے تمام وہ افراد جو
بغاوت کے جرم میں ماخوذ ہیں بغیر کسی شرط کے رہا کر دیئے جائیں۔

...جمال پاشا مرحوم نے جب اس طومار کو دیکھا تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ خود انور
پاشا بھی اس بے سروپا پیغام کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہے۔ شریف فیصل ان دنوں دمشق میں موجود
تھا اور یہ وہ وقت تھا جب شریف علی بے امامت کے دعوے میں والی مدینہ کے اختیارات
...میں دخل انداز ہو رہا تھا۔ چنانچہ پاشائے مرحوم نے فیصل کو طلب کیا اور اس سے پوچھا کہ
آخر یہ کیا معاملہ ہے کہ ایک طرف شریف علی بے اپنے دعوائے امامت سے ناجائز فائدہ اٹھا
...رہا ہے اور دوسری طرف شریف حسین ایسے غیر ذمہ دارانہ تاروں سے حکومت کو پریشان کر
رہا ہے۔ تار کو دیکھ کر شریف فیصل کا رنگ زرد ہو گیا اور اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں جواب
دیا کہ یہ سب ترجمان کی غلطی ہے۔ اس کے بعد اس نے پاشا سے وعدہ کیا کہ اس معاملہ کے

متعلق وہ خود اپنے والد سے خط وکتابت کریگا۔

اس گفتگو کے بعد شریف کے تار کا جواب دیا گیا جس میں لکھا تھا کہ یہ موقعہ خود مختاری کے مطالبات پیش کرنے کا نہیں، ملزمین بغاوت کی رہائی کا مسئلہ سوریا کی حکومت اس امر کا اندازہ نہیں کر سکتی کہ شریف جیسے ذمہ دار انسان کو ان لوگوں کی حمایت کا خیال کیونکر پیدا ہوا؟

پورے ایک مہینہ کے بعد شریف کا جواب موصول ہوا جس میں والئ مدینہ کی شکایات کے علاوہ اس امر پر افسوس ظاہر کیا گیا تھا کہ اس کے حقوق میں ناجائز مداخلت کی جا رہی ہے۔

اس تار سے جمال پاشا مرحوم کو یقین ہو گیا کہ شریف بغاوت پر آمادہ ہے اور وہ اس غرض کے لیے صرف کسی موقعہ کی تلاش میں ہے چنانچہ انہوں نے شریف فیصل کو بلا کر کہا کہ تم صاف صاف الفاظ میں بغاوت کا اعلان کیوں نہیں کر دیتے؟

لیکن فیصل نے دنیا بھر کی لجاجتوں سے پاشا کو یقین دلایا کہ وہ خلیفۃ المسلمین کی اطاعت کو اپنا مقدس ترین فرض خیال کرتا ہے اور بغاوت جیسے خوفناک جرم کا تو اس کے ذہن میں کبھی خیال تک پیدا نہیں ہوا۔

یہ تمام واقعات اپریل ۱۹۱۶ء میں رونما ہوئے۔ اسوقت شریف حسین کے پاس مہم سویز کے ضمن میں پچاس سے لیکر ساٹھ ہزار پونڈ اور اسلحہ اور سامان جنگ کی کافی مقدار موجود تھی۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آغاز جنگ ہی سے شریف حسین مہم سویز کے لیے پندرہ ہزار رضاکار دینے کا وعدہ کر چکا تھا اس بہانے سے ان باغی باپ بیٹوں نے جب بھی موقعہ دیکھا ترکوں سے سامان جنگ اور روپیہ حاصل کرنے میں دریغ نہیں کیا۔ لیکن اب پاشائے مرحوم نے شریف کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر احتیاط سے کام لیا اور وسائل رسل و رسائل کی مشکلات اور دوسری مجبوریوں کے بہانے سے مزید سامان بھیجنے سے انکار کر دیا۔

مئی ۱۹۱۶ء کے وسط میں شریف فیصل جو مہم سویز کے ضمن میں جنوری ۱۹۱۶ء کی ابتدا ہی سے دمشق میں مقیم تھا ایک اور چال چلا ان ایام میں وہ مدینہ واپس جانے کا موقعہ ڈھونڈھ رہا تھا۔ چنانچہ اس غرض کے لیے اس نے جمال پاشا مرحوم سے مجاہدین عرب کی پیشوائی کے لیے

اعلیٰ

مدینہ جا سکیں کیونکہ مطلب کی اس وجہ پر پیش کی کہ اس کا اثر مجاہدین پر نہایت اچھا پڑے گا۔ پاشا مرحوم اگرچہ اس کی نیت کو خوب سمجھتے تھے لیکن انھوں نے اس کو ایک اور موقعہ دیا اور اس کی درخواست منظور کر لی۔

اس پر فیصل کو پھر دمشق سے مسرت کے تمام اشارے پاشا مرحوم نے اپنے عملہ کے افسر علی علی فواد بے کو یقین دلایا کہ اب حجاز میں بغاوت ہوا چاہتی ہے۔

اسی زمانے میں بصری پاشا والی مدینہ نے اطلاع دی کہ شریف حسین کی پُرجوش تقریروں سے ترکی افواج کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ انکو جنگ کے لیے تیار رہنے کا حکم دیدیا گیا اور مزید احتیاط کے لیے فیصل کی واپسی کی بھی اطلاع کر دی۔ بصری پاشا اگرچہ نہایت بہادر اور جفاکش افسر تھے لیکن ان کی ناتجربہ کاری کے خیال سے جمال پاشا مرحوم نے مشہور وطن پرست فخری پاشا کو بھی مدینہ منورہ کی زیارت کے بہانے سے روانہ کر دیا اور یہ ہدایت کر دی کہ بغاوت کے ذرا سے خدشے پر بھی شریف اور اس کے بیٹوں کو گرفتار کر لیں اور باغیوں کے برخلاف فوجی کارروائی شروع کر دیں۔

مدینہ پہنچ کر شریف فیصل نے افسوس ظاہر کیا کہ وہ مجاہدین کے اخراجات سفر کے لیے جنگی روانگی کے تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے ضروری روپیہ لانا بھول گیا۔ اس پر والی مدینہ کو ہدایت کر دی گئی کہ فیصل کا مطالبہ فوراً پورا کر دیا جائے۔ یہ آخری رقم تھی جو مہم سویز کے بہانے سے اس غدار خاندان نے وصول کی۔

۴۔ جون کو بیروت میں فخری پاشا نے بذریعہ ٹیلیفون پیغام بھیجا کہ:۔

"جب سے میں یہاں آیا ہوں شریف فیصل اور علی بے کا رویہ نہایت دوستانہ تھا لیکن آج یکایک حالت بدل گئی ہے۔ شریف علی بے نے پیغام بھیجا ہے کہ شریف حسین کے احکامات کے مطابق رضاکاروں کی تیاری ملتوی کر دی گئی ہے اور اب میرا یہاں قیام بیسود ہے۔ اس کے ساتھ ہی شریف حسین سے دو مراسلے بھی موصول ہوئے ہیں جن میں سے ایک آپ کے نام ہے اور دوسرا وزیر اعظم کی طرف مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں آج رات ہی دیئے

لائن پر حملہ نہ ہو جائے۔ اس خیال سے میں نے تمام ضروری انتظامات کر لیے ہیں آپ کمک جلدی روانہ کیجیے۔

اس پیغام کے پہنچتے ہی پاشا مرحوم نے فہری پاشا کو اطلاع دی کہ وہ ان کو فوجی کمک بھیج رہے ہیں اور اگر مزید فوج کی ضرورت ہو تو فوراً طلب کریں۔

شریف حسین کے دونوں اسلوں میں اس تار کی بنا پر جو اس نے اس سے قبل اپنی خود مختاری کے لیے دیا تھا قطع تعلقات کی اطلاع دیگئی تھی اس کے ساتھ ہی فیصل کا پیغام بھی موصول ہوا جس میں شریف حسین کے احکام کا ذکر کرتے ہوئے اس نے ہم سویز کے دستوں میں حصہ نہ لے سکنے پر معذرت کا اظہار کیا تھا۔

یہ گویا بغاوت کی ابتدا تھی اور جیسا کہ فہری پاشا کا خیال تھا اس واقعہ کے دو ایک روز بعد مدینہ کے شمال میں ریلوے لائن پر حملہ ہو گیا۔

بغاوت کی تاریخ ۱۰ جون ہے لیکن اس کے متعلق شریف کا باقاعدہ اعلان ۲۵ شعبان ۱۳۳۴ھ مطابق ۲۷ جون ۱۹۱۶ء ہوا جس میں بغاوت کے اسباب حسب ذیل قرار دیئے گئے تھے:۔

۱۔ جب سے انجمن اتحاد و ترقی کو اقتدار نصیب ہوا ہے (یعنی ۲۳ جولائی ۱۹۰۸ء سے) اس وقت سے بد انتظامی کا یہ عالم ہے کہ سلطنت کے وقار کے ساتھ ہی ملک کا ایک بہت بڑا حصہ حکومت کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔

۲۔ ان مسلسل جنگوں کی وجہ سے جو اس بد انتظامی کا لازمی نتیجہ ہیں ملک کی تمام آبادی اور بالخصوص باشندگان حجاز کی مفلسی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔

۳۔ اس کے ساتھ شریعت اسلامیہ کا استخفاف بھی ہے۔ چنانچہ قسطنطنیہ میں باوجود شیخ الاسلام اور حکومت کی موجودگی کے ایک اخبار میں آنحضرت کا ذکر جن الفاظ میں کیا گیا ہے وہ ان کی شان سے بہت کمتر ہیں

۴۔ بلکہ اس اخبار نے یہ تجویز بھی پیش کی ہے کہ عورتوں اور مردوں کے مادی حقوق کے خیال سے اسلامی قانون وراثت میں ضروری ترمیم کر دی جائے۔

۵۔ حکومت نے دمشق، مدینہ اور مکہ کی افواج کو جنگ کے بہانے سے پابندی صوم سے آزاد کر دیا ہے۔

۷۔ حکومت کی رو سے خلیفۃ المسلمین کو جو اختیارات حاصل ہیں مجلس کابینہ اور دوسرے شعبوں کے انتخاب میں ان کو بالکل پس پشت ڈالا جا رہا ہے۔

۸۔ واقعہ یہ ہے کہ سلطنت کے تمام انتظامات انور پاشا، جمال پاشا اور طلعت بے کے ہاتھ میں ہیں جن کی مطلق العنانی میں کسی کو دخل نہیں۔

۔۔ چنانچہ اس کا ثبوت اس فرمان سے ملتا ہے جو عدالت مکہ کے قاضی کے نام صادر کیا گیا ہے اور جس میں اسے حکم دیا گیا ہے کہ تمام مقدمات کا تصفیہ صرف ان شہادتوں کی رو سے ہو جو عدالت میں بہم پہنچیں اس کے علاوہ مسلمانوں کی کسی شہادت کا پاس نہ کیا جائے۔ یہ صریحاً سورہ بقرہ کی خلاف ورزی ہے۔

۹۔ مزید برآں۔ امیر عمر الجزائری، امیر عارف الشہابی، شفیع بے المؤید، شکری بے عبدالوہاب (یہ وہی بزرگ ہیں جو اپنی انگریز پرستی کی وجہ سے عبدالوہاب انگلیسی کے نام سے مشہور ہیں) توفیق بے، عبدالحمید الزہراوی، عبدالغنی عریسی اور ان کے رفقا کو سزائے موت دی گئی ہے۔

۱۰۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان کی جائدادیں ضبط کر لی گئی ہیں اور ان کے اعزا و اقربا کو ملک بدر کر دیا گیا ہے۔

۱۱۔ ان لوگوں نے امیر عبدالقادر الجزائری الحسنی کے مشہور بھائی کا مقبرہ بھی برباد کر دیا ہے۔

ان اسباب کو بغاوت کی وجہ قرار دینے میں کہاں تک دیانت سے کام لیا گیا ہے آج اس پر بحث کرنے کی مطلق ضرورت نہیں۔ شریف کی غداری اظہر من الشمس ہے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان شکایات کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے بھی کسی طرح بغاوت کو جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ یہ وہ وجود ہیں جن کے اعلان سے بہت پہلے بغاوت کا ساز باز ہو رہا تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۷ء میں القبلہ مکہ کے ایک پرچہ میں شریف نے خود اس امر کا اعتراف کیا ہے۔

"ابتدائے امارت ہی سے ہمارے پیش نظر صرف ایک مقصد رہا ہے یعنی عرب کی آزادی۔ چنانچہ اس غرض کے لیے ہم نے عرب کے تمام سرکردہ سرداروں سے رابطۂ اتحاد بڑھایا۔ ہم اپنی کوششوں میں

کہانتک کامیاب ہوئے اس کا نتیجہ ہم سے بہتر تو بی معلوم ہو سکتا جبکہ ہم نے اپنے بیٹے عبداللہ کے ماتحت امیر ابن سعود کی امداد کے لیے ایک فوج بھیجی تھی جس پر ترکوں کے ایماء سے امیر ابن رشید نے حملہ کیا تھا۔"

دنیا نے جمال پاشا مرحوم کی سخت گیری کے متعلق جو رنگ آمیزیاں کی ہیں وہ محتاج بیان نہیں لیکن یہ صحیح واقعات ہیں اس بغاوت کے جسے عرب کی خانہ ساز روایتوں نے ترکوں کی "جابرانہ" حکومت کا نتیجہ ٹھہرایا ہے۔

سید نذیر نیازی۔ بی اے

فرعون

توت عنخ امون

مصر کے علمائے آثار عرصے سے اس بادشاہ کے خزانہ کو معلوم کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ اس لیے نہیں کہ وہ کوئی فاتح اعظم تھا جس نے بہت سے ممالک کو تاخت و تاراج کیا ہو، یا کوئی ایسا زبردست مصلح تھا جس نے صنعت و حرفت یا علمی و مادی ترقی کی سطح کو بلند کیا ہو۔ نہیں بلکہ اس لیے کہ انھوں نے اس بادشاہ سے قبل اور بعد کے تمام بادشاہوں کے خزانے معلوم کر لیے تھے، جن کے معلوم کرنے سے اب تک لوگ قاصر رہے تھے، اور اس لیے بھی کہ اس سے پیشتر اس کا خسر بادشاہ اخن اتن ایک بہت بڑے مذہبی انقلاب کا بانی تھا۔ اس نے اہل طیبہ کے معبود آمن کے بجائے نفس آفتاب کو معبود ٹھیرایا تھا، مگر یہ پھر اسی قدیم مذہب پر لوٹ آیا۔ یا اس لیے کہ اس سے قبل کے فرمانرواؤں کے عہد میں، سلطنت مصر اپنے پورے عروج پر تھی، اور اس کے عہد سے تنزل شروع ہو گیا، عراق و شام کے ممالک اس سلطنت کے قبضہ واقتدار سے نکل گئے۔ اس کے خزانے میں جو پیپرس کا صندوق ملا ہے، اُس میں بہت سے کتبات ہیں امید ہے کہ وہ اس مذہبی انقلاب اور سلطنت کے عروج و زوال کو خوب واضح کریں گے۔

یہ خیال صحیح ہے کہ جس کو خدا بلند کرنا چاہتا ہے پہلے اُس کے لیے ایک بلند رتبہ کی ماں پیدا کرتا ہے۔ اخن اتن کی ماں ملکہ تی مصر کی تاریخ میں بہت ہی مشہور ملکہ تھی، یہ شام یا عراق کی تھی، لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اسی ماں کی تربیت تھی جس نے اخن اتن کو آفتاب کی پرستش کی طرف مائل کیا۔ اسکے باپ کا لقب امنحتب ثالث تھا، لہذا اس کو امنحتب رابع ہونا چاہیے تھا، لیکن بجائے اس کے وہ اخن اتن (آفتاب کی زندہ صورت) کے لقب سے ملقب ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شجاعت و استقلال کے جذبات اوسکو ماں سے وراثۃً ملے تھے، لہذا اُس نے قوم کی مخالفت کی چنداں

پروا نہیں کی۔ اگرچہ مذہبی اقتدار تمام تر آمن دیوتا کے پرستاروں کے ہاتھ میں تھا، اس بات نے اُسکی جرأت میں اور اضافہ کر دیا کہ اُسکی بیوی بھی شامی تھی، ماں کے متعلق تو ظاہر ہی کہ وہ آفتاب کی عبادت کرنے والی تھی۔ مگر اُس کا باپ اصلی کاہن تھا۔ اُس کی ماں اور بیوی دونوں کا دربار شاہی میں بڑا اثر تھا، اس لیے کہ اس کا باپ دونوں کو اپنے ساتھ دربار میں بٹھاتا ۔

اُس وقت مصری سلطنت کا رعب و اقتدار بہت ترقی پر تھا، سوڈان سے لیکر جنوب میں اطراف شام تک اور شمال میں عراق تک سب اسی سلطنت میں شامل تھے۔ ایسی سلطنت کے لیے ایک ایسے بیدار مغز فرمانروا کی ضرورت تھی، جو سیاسی و ملکی امور سے دلچسپی رکھتا ہو، تاکہ سلطنت کے عظیم رقبہ کو کامل طور پر اپنے بس میں رکھ سکے۔ مگر اخن اتن کی تمام توجہ و دلچسپی مذہب کے فلسفیانہ مسائل کی طرف تھی، اور مصر کا رجحان بھی اسوقت اسی طرف تھا، علمائے مذہب یعنی کاہنین تمام مذہبی شعائر کو فلسفہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور معبودوں کو اوصاف مادی سے منزہ کرنے کی کوشش میں تھے ایک معبود فتاح کے نام سے تھا جو شہر منف اور نشیبی حصہ مصر کا خدا مانا جاتا تھا اوس کو صنعت و حرفت کا خدا کہتے تھے، چنانچہ تمام صناع و کاریگر اس کی پرستش کرتے تھے اپنے پیشوں میں جو مشکل انکو محسوس ہوتی تھی، اس خدا کے سامنے اس کو پیش کرتے تھے۔ لیکن چونکہ صنعت کی تمام تر کامیابی عقل و دماغ سے وابستہ ہی، لہذا رفتہ رفتہ یہ خیال کیا کہ یہ معبود در حقیقت خداؤں کی عقل ہی، اور یہی تمام کاموں کو انجام دیتی ہی۔

پایۂ تخت جب منف سے مقام طیبہ کو منتقل ہو گیا، تو معبود آمن کی عظمت کو اور فروغ ہوا۔ اس لیے کہ کاہنین یہاں تنہا تھے۔ اہل زوّن ایک دوسرے معبود کی عبادت کرتے تھے۔ یہ وہ مسلمہ معبود ہی جس کی تعظیم و تکریم میں کسی مصری کو کلام نہیں معبود آمن معبود فتاح کے درجہ کو تو پہنچ گیا، لیکن رَا کا رتبہ نصیب نہیں ہوا۔ اس لیے کہ مصری اس کو آفتاب کا ایک رمز تصور کرتے تھے اور اسے شمس کا خدا یا شمسی خدا کہتے تھے قدیم مصریوں کے نزدیک نفس آفتاب کا ایک اور نام اتن تھا۔ اس طرف امنحتب ثالث کے عہد سے لوگوں کی نظر میں

لی ہوئی تھیں جیسا کہ اخن اتن نے یہ اعلان کر دیا کہ اس پر دمی ہوئی ہے کہ لوگوں کو اپنے
قدیم خداؤں کی طرف سے لوٹ آنا چاہیے اور اسے کو اس کا پیغمبر اعظم قرار دیا۔ اور ان کو بجائے
مادی آفتاب کی عبادت کے اس امر کی تعلیم دی کہ اس قوت کی عبادت کرنی چاہیے۔
جو آفتاب سے ظاہر ہوتی ہے یعنی اس کی حرارت جو زمین کی تمام چیزوں کو حیات بخشتی ہے۔
چنانچہ اس وقت سے آفتاب کی جب کوئی صورت بنائی جاتی تھی تو اس کی شعاعیں اس طریقہ پر
بنائی جاتی تھیں کہ گویا ان میں جان ہے بعض کے سروں پر ہاتھ وغیرہ کی شکل ہوتی تھی۔
اخن اتن نے اس لیے خدا کے لیے ایک ہیکل قایم کرنے کی تدبیر کی۔ طیبہ کی زمین
پر ہیکل قصر اور ہیکل کرنک کے درمیان اس کے باپ نے ایک جنت بنائی تھی جس کا نام
فردوس آمون رکھا تھا، اس نے وہاں اس ہیکل کو تعمیر کیا، اور شہر طیبہ کا نام بدل کر شہر بیا اتن
رکھ دیا، اور ہیکل کا نام جم اتن رکھا۔ اخن اتن کے باپ نے کاہنوں کے اقتدار کو کچھ کمزور کر دیا
تھا، اس طریقہ پر کہ رئیس وزرا کو جو کاہنوں کا سردار تھا، معزول کر کے اس منصب پر دوسرے
شخص کو مامور کر دیا۔ اخن اتن نے اس پر اتنی عنایات کیں کہ بلاط کے لوگوں کو اپنی طرف مائل
کر لیا اس کے علاوہ بھی منف اور اون کے کاہنین آمون کے پرستاروں سے مقابلہ کرنے
کے لیے اس کے ساتھ تھے، چنانچہ اس اتحاد سے اخن اتن ان پر غالب آ گیا، اور یہ عزم کر لیا۔
کہ تمام دوسرے معبودوں کو اب نیست و نابود کر دے یعنی ایک ہی وقت میں یہ موحد مادی
اور روحی سب کچھ تھا۔ چنانچہ تمام خداؤں کی عبادت کو فوراً موقوف کر دیا۔ اور کاہنوں کو یہ حکم
دیا کہ وہ مصر کی حدود میں کسی اور خدا کی عبادت نہ کریں۔ یہاں تک کہ ان کے اسما تک کو مٹا
دیا، خصوصاً خدائے آمون کے نام کو اس کے اعوان و مددگاروں نے اسلاف کے خزانوں میں داخل
ہو کر آمون کے نام کو ہر جگہ سے جس طرح بھی اوزاروں وغیرہ سے ممکن ہوا۔ محو کر دیا۔ یہاں تک کہ
اس صورت پر سے بھی مٹا دیا، جس کو اس کے باپ نے قایم کیا تھا، بلکہ باپ کے نام کو بھی صرف اس
لیے مٹا دیا کہ آمون کا نام کسی طرح صفحہ ہستی سے اڑ جائے، لفظ آلہہ جمع کے ساتھ جہاں جہاں تھا اس کو

بھی مٹانے کا حکم دیدیا، جو تھا اپنے نام کا بھی ایک جز آمن تھا اس سبب کو چونکہ اس کا تعلق تھا، لہذا اُس کو بھی بدل کر نیا نام اخن اتن رکھا۔ جب تشدد اس حد کو پہنچ گیا، تو تھیبس بھی اُس کے لیے مناسب نہ تھا اس لیے کہ وہاں اسلاف کی بہت سی نشانیاں موجود تھیں، لہذا دارالسلطنت کی تبدیلی کا ارادہ کرلیا۔ اس کے علاوہ مصر و شام اور بلاد نوبیہ کو صدر مقام قرار دیکر وہاں اتن کے معابد بنانے کا عزم کیا، تاکہ تمام سلطنت مصر میں صرف اسی واحد معبود کی عبادت ہو۔ بلاد نوبیہ کا صدر مقام اور ان کے معبود کو شمالی ممالک کے قریب بنایا۔ شام کے ممالک میں ابتک نہیں معلوم کہ اس نے کہاں بنایا تھا۔ لیکن مصر میں وہ مقام اپنے خاص دارالسلطنت کے لیے منتخب کیا جو قاہرہ اور طیبہ کے درمیان ہے جس کا نام تل العمارنہ ہے، یہاں پر ایک قطعہ زمین کا ایسا ہے، جو جنوب و شمال اور مشرق میں سے تو پہاڑوں سے گھرا ہے، اور مغرب کی طرف دریائے نیل کا کنارہ ہے۔ اس مقام کو اس نے اپنے دارالسلطنت کے لیے تجویز کیا، اس قطعہ کا طول ۱۵ میل اور عرض آٹھ میل ہے۔ اس پورے قطعہ کو اس نے خدائے اتن کے نام پر وقف کر دیا، اس میں تین بڑے بڑے ہیکل اس نے تعمیر کرائے، ایک اتن کے لیے، ایک بیوی کے لیے اور ایک اپنے لیے، قصر اور دوسری خوبصورت عمارات اس کے گرد تھیں، جس وقت اس تعمیر کا کام ختم ہوا، اس نے ایک بڑے جشن کے ساتھ اس کا افتتاح کیا۔

یہ بادشاہ مذہبی خیالات میں اپنے اسلاف سے ذرا زیادہ آزاد خیال اور وسیع النظر تھا وہ اپنے معبودوں کو جبار و قہار تصور کرتے تھے، اور یہ صفات صرف اپنے لیے مخصوص سمجھتے تھے، مگر یہ اپنے معبود کو رحیم و کریم خیال کرتا تھا، اور سارے عالم کے لیے یکساں پرتا ؤ کرنے والا سمجھتا تھا۔ چونکہ اس کے عہد میں تقلید اور اوہام پرستی کی بیڑیاں بہت کچھ ڈھیلی ہوگئی تھیں، لہذا اس کے عہد میں صنعت و حرفت اور دوسری ترقیوں نے کافی عروج پایا۔ شیشہ سازی۔ رنگ ریزی۔ ملمع اور پتھر وغیرہ پر نقش و نگار کا کام اتنا خوبصورت ہوتا تھا، کہ آج بھی ان کو دیکھ کر عقل دنگ رہجاتی ہے، اور بے اختیار ہو کیا ان کے بنانے والوں کو خراج تحسین ادا کرنا پڑتا ہے۔ تصویروں کا اصلی کمال

یہ ہوتا تھا کہ وہ اصلی رنگ روپ میں پیش کی جائیں، ورنہ پسند نہیں کی جاتی تھیں۔ لطیف صنائع و بدائع کے لیے بادشاہ کی طرف سے بہت سے کارخانے بھی تھے۔ شاہی محل کے قریب ایک بہت ہی خوبصورت حوض تھا، جس کی دیواروں پر سنگ خام کا اتنا خوبصورت کام بنا تھا، کہ بنانے والوں کے کمال صنعت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، اس حوض میں دریائے نیل سے رنگ رنگ کی مچھلیاں جمع کی گئی تھیں۔ محکمہ آثار نے جب اس کو پایا تو صاف کرا کے اس کے گرد حفاظت کے خیال سے ایک مضبوط چھت کی عمارت بنا دی تھی، روشنی کے لیے کچھ سوراخ اور زمین سے بلندی پر چند چھوٹے چھوٹے راستے بھی بنا دیئے تھے، جن سے سیاح اس نادر حوض کو دیکھ سکیں لیکن چوروں کی دست برد سے ایسی قیمتی چیزیں کیونکر محفوظ رہ سکتی تھیں، باوجود سخت حفاظت کے بہت سی چیزیں غائب ہو گئیں جو کچھ باقی بچیں ان کو محکمہ آثار نے حفاظت کی خاطر عجائب خانہ میں منتقل کر دیا، اور اس وقت یہ چیزیں برآویزوں میں تختیوں کی صورت میں محفوظ ہیں۔

بادشاہ کی مذہبی دلچسپیوں نے اس کو امور سلطنت سے بالکل غافل کر دیا تھا۔ تخت سلطنت پر جس وقت بیٹھا تھا، حبشیوں نے اسکی اطاعت کا اقرار کیا تھا، وادی فرات کے بادشاہ نے اس کی ماں کو لکھا تھا، کہ وہ اپنی تمام کوشش اپنے بیٹے پر اس بات کے لیے صرف کرے کہ وہ اس سے ویسا ہی خوش رہے، جس طرح اس کا باپ۔ اس بادشاہ نے اخن اتن کے پاس اس کے باپ کی تعزیت کا خط بھی لکھا تھا۔ بادشاہ بابل نے بھی اس کی حکومت کی تائید کی تھی۔ بلکہ بعد میں اس کے بیٹے نے مصر میں آ کر اخن اتن کی ایک بیٹی سے شادی بھی کی، اس کے باپ نے شہزادی کے لیے ایک ہار بھیجا تھا، جس میں ایک ہزار سے زائد قیمتی جواہر گندھے تھے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد حبشیوں کی قوت نے زور پکڑا، اور اس جدید دارالسلطنت میں ان کے سفیر نے آ کر اخن اتن پر بہت ہی عتاب ظاہر کیا کہ اس نے اپنے باپ کے دستور کے خلاف ان سے خط و کتابت کیوں ترک کر دی۔ اس کے بعد حبشیوں نے شمالی شام پر لوٹ مار شروع کر دی، اور فینیقیہ تک پھیل گئے۔ والی جبیل نے اخن اتن سے مدد وغیرہ طلب کی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔

مجبوراً دس سنے اور صیدا آرکے رئیس دونوں نے قسمت پر بھروسا کیا۔ صیدا اسکے رئیس اوکلی نے بھی مصر میں مدد کے لیے لکھا، لیکن کوئی شنوائی نہوئی۔ اخن اتن برابر اپنے خدا کے خیال کی تعمیر میں مصروف رہا طیبہ منف عیلو پولیس ھرموپولیس اور قیم کے شہروں میں اُس نے بہت ہیکل تعمیر کرائے، فضول خیالات اور اوہام کو چھوڑ کر ایک گونہ حقیقت کو حاصل کرنا چاہا لیکن وہ قوم جو مادی زخارف ڈھونڈتی تھی اور طرح طرح کے اوہام کی مطیع تھی، وہ اس بادشاہ کے فلسفیانہ رموز کب سمجھتی، وہ اتنا ضرور سمجھتی تھی کہ بادشاہ نے ایک نیا دین ایجاد کیا ہے رعایا میں سب سے زیادہ آمون کے پرستار اس سے بیزار تھے۔ یہی بددلی کیا کم تھی کہ بلاد شام کے سقوط نے اور سونے پر سہاگے کا کام دیا۔ اب تمام قوم، کاہنین، خصوصاً فوج بہت زیادہ بیزار تھی، اس پر بدقسمتی یہ کہ بادشاہ کے کوئی اولاد ذکور نہ تھی، مجبوراً ایک ساکری نامی امیر پر اعتماد کیا، اس سے اپنی بڑی بیٹی کی شادی کردی، اور اسی کو اپنا ولی عہد بنایا۔ کچھ روز اپنے ساتھ رکھا اس کے بعد زندگی کے دن پورے کرکے اس کے لیے مسند حکومت خالی کردی۔ ساکری نے بہت تھوڑے دن حکومت کی، اور کوئی ایسے کارہائے نمایاں نہیں کیے جو اس وقت قابل ذکر ہوں، اس کے بعد تخت کے جانشین توتنخ اتن ہوا جو اخن اتن کی تیسری بیٹی کا شوہر تھا۔ یہی وہ ہے جس کے خزانے اسوقت دریافت ہوئے ہیں، اس کی ماں کی نسبت مورخین کا اختلاف ہے۔ غالب رائے یہ ہے کہ اُس کی ماں شاہی خاندان سے نہ تھی، بلکہ کوئی لونڈی تھی۔ سلطنت کا یہ دستور تھا کہ تخت کا وارث وہی ہوتا تھا جس کی ماں اوس کے باپ کی قانونی و شرعی بیوی ہو، اس اعتبار سے اُس کو سلطنت نہ ملنی چاہیے تھی، مگر صرف اس لیے یہ مستثنیٰ ہوگیا کہ بادشاہ اخن اتن کی بیٹی سے اس نے شادی کرلی تھی، اس کے عہد میں معبود آمن کے پرستاروں نے پھر زور پکڑلیا، مجبوراً اس کو اپنے خسر کا دارالسلطنت چھوڑ کر طیبہ آنا پڑا۔ پہلے تو کوشش کی کہ اپنے خسر کے عقیدے پر قائم رہے لیکن آخر میں مجبوراً اس سے باز آنا پڑا، یہاں تک کہ پھر نام بھی اپنا توتنخ اتن سے بدل کر توتنخ آمن رکھ لیا۔ دارالسلطنت کی تبدیلی سے تل العمارنہ کی عظمت و شوکت کا انحطاط بھی

شروع ہوگیا، اسکی تجارت و رونق اور چہل پہل گھٹنے لگی، آخر میں۔ ہاں کی اکثر آبادی نے بھی بڑی بڑی عمارتوں کو خالی کرکے دوسرے مقامات پر نقل وحرکت شروع کر دی، چنانچہ تھوڑے عرصہ میں یکلخت شہر ویران ہوگیا۔ ایک ماہر علم الآثار بجران نے مقام کرنک میں ایک لاٹ پائی جس پر اس بادشاہ کے عہد حکومت کے متعلق ایک مختصر سی تحریر منقوش ہے ترجمہ اس کا درج ذیل ہے۔

" بادشاہ توتنخ آمن تخت پر بیٹھنے سے قبل خدایان مصر کے بہت سے معابد جزیرہ اسوان سے لیکر دلتا تک بہت ہی شکستہ اور خراب حالت میں پڑے تھے، لیکن اس کی بدولت وہ پھر از سر نو عمدہ صورت میں تعمیر ہوگئے، شہروں میں ایک نئی رونق اور چہل پہل پیدا ہوگئی۔ بادشاہ ملک کے لیے قواعد وآئین کی ترتیب کا بڑا اہتمام رکھتا تھا۔ دن اور رات کسی وقت رعایا کے فلاح وبہبود سے غافل نہیں رہتا تھا، حکومت کے چھوٹے سے بڑے تمام حالات کی خبر رکھتا تھا اور اُن کی اصلاح کرتا تھا۔ مفید کاموں کا عوض دیتا تھا۔ معبود آمن کے لیے خاص اہتمام کیا، اس کی مورت خالص سونے کی قائم کی، اس کے علاوہ مفتاح معبود طیبہ اور دوسرے خداوں کی صورتیں سونے کی بنوائیں، اور بڑے بڑے عالیشان معابد اُن کے تعمیر کرائے اور اُن کے لیے علیحدہ اوقاف مخصوص کیے، معزز کاہنوں اور مذہبی پیشواؤں کو امراء کی اولاد سے منتخب کیا، سونے چاندی سیسہ پیتل کے مقدس ظروف بنواکر ڈھیر کر دیے، اور مقاموں کو غلام لونڈیوں اور طرح طرح کی غنائم سے جو جنبی ممالک سے آتے تھے، بھر دیا۔ اور معابد کو نہایت ہی قیمتی پتھروں اور دوسری بیش قیمت چیزوں سے مالا مال کر دیا۔ نہایت ہی خوبصورت اور سبک لکڑیوں کی کشتیاں اُن کے لیے بنوائیں جو سونے سے مطلّا ہوا کرتی تھیں، یہانتک کہ نیل کے ساحل پر چمکتی تھیں"۔
مصری اس کے خدمات سے بہت خوش تھے اور سلامتی کی دعائیں دیا کرتے تھے۔

مصر کے عجائب خانہ میں اسوقت بھی ایک خوبصورت مورت جرانیت کے پتھر کی بنی ہوئی موجود ہے جو ۱۹۱۳ء میں کرنک سے دریافت ہو کر گئی ہے جسم کے ضعف اور چہرہ کی صورت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو سل کا مرض ہوگیا تھا، غالباً یہ مرض اس کو ملک اور رعایا کے کاموں میں انہماک

کیوجہ سے ہوا ہو۔ اس بادشاہ نے دس بارہ برس حکومت کی، اس کے بعد اس تخت کا مالک ایک کاہن آئی نامی ہوا جو اخن آتن کی دایہ کا شوہر تھا، اس نے پھر ارادہ کیا کہ اخن آتن کے مذہب کو فروغ دے، لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا۔

اس کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مصر کی اس اٹھارویں سلطنت کے چراغ کو گل ہوس (ملوک الرعاۃ) نے آکر ہمیشہ کے لیے گل کر دیا، اور مصر میں دوبارہ ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈالی، جو سودان سے لیکر فرات کے بلند مقامات تک پھیلی تھی۔

یہ دونوں فرمانروا اخن آتن اور تو ان اخن جس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کو مصر کی قدیم تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ علمائے آثار نے بہت ضخیم ضخیم کتابیں اس خاندان کے حالات میں لکھی ہیں، اس حکومت کے زمانہ ابتدا اور انتہا میں مورخین کا بڑا اختلاف ہے۔

مگر تاہم علی اختلاف الروایات کہا جا سکتا ہے کہ یہ اٹھارویں سلطنت تقریباً ڈیڑھ ہزار برس قبل پیدائش مسیح مصر پر حکمران تھی، اور تقریباً ڈھائی سو برس سے زاید اس کی حکومت قائم رہی۔

سعد انصاری متعلم جامعہ ملیہ اسلامیہ

مطبوعات جدیدہ

مطبع کاویانی برلن

یورپ کے کتب خانے مشرقی جواہرات علمیہ سے مالامال ہیں۔ اب تک ہم اس علمی ورثہ سے ہاتھ دھوئے بیٹھے تھے۔ اور صرف وقتاً فوقتاً علمائے یورپ کے وسیع خوان علم کی زلہ ربائی پر قانع ومطمئن رہتے تھے بلکہ سچ پوچھیے تو ہم نے اپنی اس دماغی تاراجی وافلاس کو کبھی حقہ محسوس ہی نہیں کیا ضرورت تھی کہ ہم اس ضالۃ المومن کو مغرب سے دوبارہ ڈھونڈھ لاتے۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے طلبہ کی علمی جدوجہد غلط طریقے پر لگادی جاتی ہے اور صحیح منزل کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ خدا نے یہ توفیق چند علم دوست ایرانیوں کو دی جنہوں نے دو تین سال سے مطبع کاویانی کے نام سے جرمن دارالحکومۃ برلن میں ایک مطبع اور دارالاشاعۃ قائم کر دیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ یورپ کے کتب خانوں سے فارسی عربی ترکی اُردو وغیرہ کے قدیم قلمی نسخے فراہم کر کے انھیں طبع کیا جائے۔ چنانچہ اب تک مندرجہ ذیل قیمتی نسخے اس مطبع سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان مطبوعات کا کاغذ نہایت نفیس و بیز، ٹائپ اور بیرونی طرز کا چھپائی میں اب تک انگلستان ہالینڈ، جرمنی اور شام و مصر سے عموماً جیسی کتابیں چھپکر نکلتی ہیں ان سے اعلیٰ۔ ان خوبیوں کے ساتھ قیمتیں دوسرے مطبوعات یورپ سے ارزاں۔

(۱) سفرنامہ ناصر خسرو مع روشنائی نامہ و سعادت نامہ

یہ سفرنامہ ایک بار مولانا حالی مرحوم کے زیر نگرانی ہندوستان میں بھی چھپ چکا ہے۔ حکیم ناصر خسرو چوتھی صدی ہجری کے آخر میں پیدا ہوا تھا اور اس لیے اس کا یہ سفرنامہ دو قدیم ترین تصانیف نثر میں سے ایک ہے۔ دوسری تصنیف سیاست نامہ نظام الملک ہے۔ مختلف بلاد اسلامیہ کے حالات جو اس سیاح نے قلمبند کیے ہیں تاریخی نقطۂ نظر سے نہایت مفید ہیں۔ زبان کی شستگی و صفائی زمانہ کے لحاظ سے حیرت انگیز ہے۔ مطبع کاویانی نے بہترین ایرانی نسخہ سے نقل لی ہے اور دوسرے

نسخ سے مقابلہ کرکے صحت کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ اس مجلد کی ایک قابلِ قدر خصوصیت اور ہے نامر کی دو غیر مطبوعہ نادر مثنویاں سعادت نامہ و روشنائی نامہ بھی اس میں ضم ہیں۔ روشنائی نامہ میں اخلاق کے علاوہ فلسفہ و حکمتِ یونان کے دقیق مسائل بھی نہایت صفائی سے بیان کیے گئے ہیں۔ زبان و طرز بیان شیخ فریدالدین عطار سے ملتا جلتا ہے۔ سفرنامہ کا سرورق اور سرنامہ ایرانی نسخہ کے موافق مطلاّ و مذہّب ہے۔ تقطیع ۲۶×۲۰ صفحات ۴۴۴ قیمت سے

(۲) سنی ملوک الارض۔ حمزۂ اصفہانی

حمزہ بن الحسن اصفہانی نے یہ کتاب ۳۵۰ھ ہجری میں مرتب کی تھی جس میں انتہائی کاوش کے ساتھ تواریخ فارس، روم، یونان، مصر، بنی اسرائیل، عراق، شام، عرب کے متعلق تمام صحیح سنین کی تعیین کی گئی ہے۔ قدیم تاریخیں اکثر اہم واقعات کے سنین وقوع نہیں بتاتیں طالب تحقیق کو سخت پریشانی ہوتی ہے۔ لہذا حمزہ کی یہ کتاب طلبۂ تاریخ کے لیے نہایت قیمتی مواد ہے یہ نایاب نسخہ پہلی دفعہ جرمن عالم" جوتوالڈ نے ۱۸۴۴ء میں لیپزک میں طبع کرایا تھا۔ یہ جنس پھر نایاب ہو چکی تھی شرکتِ مطبع کاویانی کا ہمیں ممنون ہونا چاہیے کہ اس نے اسے دوبارہ نہایت اہتمام ونفاست کے ساتھ شائع کیا ہے۔ تقطیع ۱۸×۲۲ صفحات ۱۵۰ قیمت ۸ر

(۳) تیاتر۔ میرزا ملکم خاں

ناظم الدولہ ملکم خاں وہ واجب الاحترام بزرگ ہیں جنھوں نے اپنے اخبار، تصانیف اور عملی جد وجہد سے ایران کو سیاسی بیہوشی سے چونکایا۔ یہ سید جمال الدین افغانی کے رفیق کار تھے تیاتر تین نثر ڈرامے ہیں جو اسی ذاتِ گرامی کی طرف منسوب ہیں اور اس شخص کے نت نئے اسالیب تحریر کے لحاظ سے یہ بالکل مستبعد نہیں۔ شرکت مطبع کاویانی نے ان کو مہیا کرکے خوشنما چھوٹی تقطیع پر شائع کیا ہے۔ یہ گذشتہ صدی کے نظام حکومت ایران کی تصویر اور ہجو ملیح ہے جس

میں ایرانی انشاپردازوں کو یدطولیٰ حاصل ہے۔ یہ ڈرامے نہایت شائستہ حسن و شوق سے معرّا اور لڑکوں کے مطالعہ کے لیے بھی موزوں ہیں۔ حجم ۴۴ صفحے قیمت ۸؍

(۴) موش و گربہ۔ عبید زاکانی

آٹھویں صدی ہجری کے مشہور ہجو گو عبید زاکانی کی یہ مشہور نظم ہے کسی زمانہ میں بمبئی سے باتصویر شائع ہوئی تھی۔ اب مطبع کاویانی نے مخصوص نفاست و حسن کے ساتھ ایک ننھے سے کتابچہ کی صورت میں شائع کی ہے۔ ہر صفحہ ایک رنگین تصویر سے مزین ہے۔ قصہ تو چوہے بلی کی جنگ کا ہے مگر مقصود ابنائے عصر کی ہجو ملیح ہے جو عہد حاضر پر بھی یکساں چسپاں ہے۔ آغاز ان ابیات سے ہوتا ہے:۔

اگر داری تو عقل و دانش و ہوش ٭ بیا بشنو حدیث گربہ و موش
بخوانم من برایت داستانی ٭ کہ در معنائے آں حیراں بمانی

اور انجام ان اشعار پر:۔

جان من پند گیر ازیں قصہ ٭ کہ شوی در زمانہ شاد ہا نا
غرض از موش و گربہ بر خواندن ٭ بدعا فہم کن پسر جانا

استعارہ و تمثیل سے قطع نظر کر کے بھی نظم نہایت سلیس اور بچوں کے مطالعہ شوق کے لیے خاص طور پر موزوں ہے۔ انشاءاللہ جامعہ کی کسی اشاعت قریبہ میں اس عجیب و غریب شاعر کے حالات و کمالات پر مستقل مضمون نذر ناظرین کیا جائیگا۔ قیمت[*] ۵؍

شرکت مطبع کاویانی نے مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کو ہندوستان کے لیے اپنی تمام مطبوعات کا مطلق حق فروخت (سول ایجنسی) دے رکھا ہے یہ چاروں کتابیں اور آیندہ مطبوعات مکتبہ مذکور سے اصل داموں پر ملیں گی۔ "ناقد"

---

[*] یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئی۔ برلن سے زیادہ جلدیں منگوائی گئی ہیں شائقین کو ایک مہینہ انتظار کرنا ہوگا۔ منیجر۔

رفتارِ تعلیم

بدقسمتی سے ہمارے ملک میں آنکھ والوں کی تعلیم کا رونا ہے تو پھر بھلا اندھوں کا کیا ذکر! لیکن آفتاب علم جوں جوں بلند ہوتا جائیگا، ہر خطہ اور ہر طبقہ اس کی روشنی سے مستفید ہوتا جائیگا حال میں (جنوری ۱۹۳۳ء) اندھوں اور بہروں کے لیے کارکنوں کی انجمن کا پہلا جلسہ بمبئی کی وائی ایم۔ سی۔ اے۔ ہال میں منعقد ہوا۔ مسٹر لے۔ کے۔ شاہ جو کلکتہ کے مدرسہ نابینایان کے پرنسپل تھے اس جلسہ کے صدر قرار پائے اس جلسہ میں کانفرنس نے یہ تجاویز پاس کیں کہ گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ اندھوں اور بہروں کے اعداد و شمار مہیا کرے اور کلکتہ اور میسور میں ان کے لیے خاص اسکول کھولے۔

انڈین کرسچین ریویو کے اڈیٹر نے ہندوستانی عیسائیوں کی تعلیم پر یوں رائے زنی کی ہے:۔

"ہماری قوم کے روبرو مسئلہ تعلیم نہایت اہم مسائل میں سے ہے۔ اب تک ہمارا تعلیمی رجحان یہ رہا ہے کہ یورپ یا امریکہ کی تقلید کریں جو لوگ بیرونی ممالک سے تبلیغ عیسائیت کے لیے آئے اُنھوں نے نہایت ایمانداری کے ساتھ لیکن چند غلط فہمیوں کی بنا پر ہمارے لیے وہ طریقہ پسند کیا جسے وہ بہترین خیال کرتے تھے۔ اُنھوں نے یہ نہ دیکھا کہ ہم ہندوستانی ہیں ہمارا گذشتہ تمدن اس قدر درخشاں ہے کہ موجودہ زمانہ میں خرابیاں پیدا ہو جانے کے باوجود آج بھی دنیا میں اسکا ڈنکا بج رہا ہے مغربی تعلیم نے معاشرتی برائیوں کی اصلاح کے عوض حالت بد سے بدتر کر دی۔ سخت ضرورت ہے کہ ہم اپنی تعلیم کو ایسا بنانے کی کوشش کریں جو ان خرابیوں کو دور کر دے۔ یعنی صحیح معنوں میں ہندوستانی تعلیم ہو۔"

الہ آباد یونیورسٹی کی انجمن ہندی نے ایک نہایت اعلیٰ پیمانہ پر خالص ہندی کا کتب خانہ کھولنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ یونیورسٹی کے طلبا اور دوسرے لوگ اس سے ہندی کی تعلیم میں فائدہ اٹھا سکیں۔ انجمن مذکور نے ۵۰ ہزار روپیوں کے عطیہ کی درخواست بھی کی ہے یہ بیرا دوہانی غالباً نامناسب نہ ہوگی کہ گنگا

دیکھنا ہے کہ اس سنٹر پر ہندی و اُردو کا بھی ایک سنگم قائم کیا جائے گا یا علیگڑھ یونیورسٹی اُردو کی جانب بھی ویسی ہی توجہ کریں گے ؟

ہندوستان کے کمیشن کاغذاتِ تاریخی (انڈین ہسٹاریکل ریکارڈس کمیشن) کا پانچواں اجلاس ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی عمارت میں منعقد ہوا۔ گورنر بنگال (لارڈ لٹن) نے جلسہ کا افتتاح کیا۔ آنریبل مسٹر کاٹن نے صدارت فرمائی۔ متعدد مضامین کمیشن کے سامنے پڑھے گئے جن سے بعض اہم تاریخی مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔ ان مضامین میں چند کے عنوانات حسب ذیل ہیں :-
"سورت فیکٹری بعد اورنگ زیب" از پروفیسر جادو ناتھ سرکار "سلاطین مغلیہ کے زمانہ میں تعلیم و ادب کی نوعیت" از مسٹر بینی پرشاد "اکبر کا فوجی نظام" از مسٹر رام پرشاد ترپاٹھی۔ "شایستہ خاں کی آخری وصیت" از خان بہادر سید عبداللطیف۔

اس کے بعد تاریخی کاغذات، دستاویزات و تصاویر کی نمایش ہوئی جن کی کل تعداد ۳۰۰ تھی۔ اور جن میں بعض مشہور حکمرانوں کے فرامین اور وارن ہسٹنگز کا دستخطی خط بھی تھا۔

ہندوستان کی سائنس کانگریس (انڈین سائنس کانگریس) کا دسواں اجلاس جنوری ۱۹۲۳ء کے دوسرے ہفتہ میڈیکل کالج لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ گورنر صوبہ نے افتتاحیہ خطبہ دیا پھر صدر نے اپنا ایڈریس پڑھا۔ اسکے بعد دیگر کارروائیوں کے ساتھ متعدد مضامین پڑھے گئے۔ پروفیسر پریتا سہائی آئینگر نے "گرم ممالک میں پتوں کے گرنے پر" ایک مضمون پڑھا۔ کرنل بیٹی نے اپنے ایک مضمون میں یہ بتایا کہ ساٹھ ستر سال میں ہندوستان کا تمام کوئلہ ختم ہو جائیگا اس لیے ہندوستانی قوم کے لیے ضروری ہے کہ وہ پانی سے برقی قوت پیدا کرنے کے ذرائع پر غور کرے۔ شعبہ علم الانسان (انتھراپولوجی) کے صدر ڈاکٹر بے۔ سی۔ مودی تھے جنھوں نے اپنے ایڈریس میں رسومات و توہمات کے عالمگیر ہونے پر بحث کی۔ علوم زراعت، کیمیا اور نباتات کے شعبوں کے مشترکہ جلسے ہوئے۔ ایک مضمون

"جوار" پر پڑھا گیا جس میں یہ بتایا گیا کہ اس میں بچوں کے لیے غذا تیار کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ طبعیات و ریاضی پر بھی مفید مضامین پڑھے گئے۔ طبعیات کے علاوہ یہ عام شکایت تھی کہ ہندستانی ماہرین علوم کے مضامین کم ہیں اس سے معلوم ہوتا ہی کہ سنجیدہ مطالعہ کی طرف ابھی ہماری رفتار دیگر ممالک کے اہل علم کی بہ نسبت سست ہی۔

رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے ہندوستانی شعبہ کے سامنے ہندوستان کی مردم شماری پر ایک مضمون پڑھکر سنایا گیا۔ فاضل مضمون نگار نے تعلیم یافتہ مرد و عورت کے اعداد حسب ذیل دیے ہیں:

	ابتدا ء صدی میں	سنہ ۱۹۱۱ء میں	حال میں
سال سے اوپر کے ذکور تعلیم یافتہ فی ہزار	۱۲۹	۱۴۰	۱۶۱
اناث تعلیم یافتہ فی ہزار	۹	۱۳	۲۳

اگرچہ یہ اضافہ بھی کوئی قابل اطمینان نہیں لیکن پہلی دہائی کے اضافہ سے نسبتاً غنیمت ہی۔

برٹش انڈیا میں زیر تعلیم طلبا کی تعداد یہ ہی

سنہ ۱۱-۱۹۱۰ء میں	سنہ ۲۲-۱۹۲۱ء میں
۶۳۵۸۰۰۰	۸۳۷۶۰۰۰

دس سال کی مدت میں ۳۳ کروڑ نفوس میں دو لاکھ کا اضافہ کیا ہی؟ دریا میں ایک قطرہ۔

ریاست بڑودہ میں مفت و جبریہ تعلیم کے نتائج اعداد ذیل سے ملاحظہ کیجیے۔

	ذکور	اناث
سنہ ۱۹۲۱ء میں	۱۶۳	۸
سنہ ۱۹۲۱ء میں	۲۱۰	۴۰

برٹش انڈیا میں اس طریقہ تعلیم میں سب سے پہلے بمبئی نے پیش قدمی کی ہے لیکن ابھی تک صفحہ کاغذ سے عمل کی نوبت نہ آئی۔ ع ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔

ایک امر اور قابل دلچسپی ہے وہ یہ کہ ہندو اور مسلمانوں کے بہ نسبت عیسائی تعلیم یافتہ کے اعداد ہمیشہ زیادہ ہوا کرتے ہیں بہ نسبت ہندوؤں سے چارگنی اور مسلمانوں سے پانچ گنی ہوتی ہے۔
اناث کے اعداد میں یہ فرق اور زیادہ نمایاں ہوگیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

	سنہ ۱۹۰۱ء	سنہ ۱۹۲۱ء	
عیسائی	۱۴۷	۲۱۰	فی ہزار
ہندو	۵	۱۶	”
مسلمان	۴	۹	”

بنارس یونیورسٹی کے ایک اجلاس سنیٹ نے یہ تجویز پاس کی ہے کہ امتحان داخلہ میں جواب مضامین انگریزی کے علاوہ ہندی زبان میں بھی دے جا سکتے ہیں۔ اس جلسہ کی پانچویں تجویز یہ ہے کہ "سنٹرل ہندو اسکول کے جو طلبا اس تبدیلی سے فائدہ اٹھانا چاہیں ان کے لیے ہندی ذریعہ تعلیم قرار دیکر اس مقصد کی ابتدا کر دینی چاہیے۔
سنیٹ نے ابھی حال میں ہندی کو انٹرمیڈیٹ اور بی اے کے امتحانات میں اختیاری مضمون کے طور پر اور ایم اے میں ایک مستقل مضمون کی حیثیت سے رائج کیا ہے۔

تبت کی گورنمنٹ نے حکام کے بچوں کے لیے موجودہ طرز پر مدرسے کھولنے کا تصفیہ کیا ہے۔ جیانتسے اس کا مرکز قرار پایا ہے اور تعمیر کا کام بھی شروع کر دیا گیا ہے پہلے صرف ۳۰ طلبا کا داخلہ منظور کیا گیا ہے۔

طلوعِ اسلام

از ترجمانِ حقیقت ڈاکٹر محمد اقبال صاحب

(۱)

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی — افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی

عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا — سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے — تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے — شکوہِ ترکمانی ذہنِ ہندی نطقِ اعرابی

اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل — "نوارا تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی"

تڑپ صحنِ چمن میں آشیاں میں شاخساروں میں — جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیرِ سیمابی

وہ چشمِ پاک بیں کیوں زینتِ برگستواں دیکھے — نظر آتی ہے جس کو مردِ غازی کی جگر تابی

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرّے ذرّے کو شہیدِ جستجو کر دے

(۲)

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا — خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا

کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے — یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

ربود آں ترکِ شیرازی دلِ تبریز و کابل را — صبا کرتی ہے بوئے گل سے اپنا ہم سفر پیدا

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے — کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی — جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے — بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے — کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہہ دے
مسلماں سے حدیثِ سوز و سازِ زندگی کہہ دے

(۳)

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے — یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی — ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا — خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا — تری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی — جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے
جہانِ آب و گل سے عالمِ جاوید کی خاطر — نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے
یہ نکتہ سرگذشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا — کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائیگا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

(۴)

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی — اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا — نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی
میانِ شاخساراں صحبتِ مرغِ چمن کب تک — ترے بازو میں ہے پروازِ شاہینِ قہستانی
گمان آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا — بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی
مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے — وہ کیا تھا؟ زورِ حیدر، فقرِ بوذر، صدقِ سلمانی
ہوئے احرارِ ملت جادہ پیما کس تجمل سے — تماشائی شگافِ در سے ہیں صدیوں کے زندانی
ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دنیا میں — کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

(۵)

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا؟
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ولایت پادشاہی علمِ اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبعِ بلندے مشربِ نابے
دلِ گرمے نگاہِ پاک بینے جانِ بیتابے

(۶)

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے
ستارے شام کو خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے

ہوئے مدفونِ دریا زیرِ دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو بن کر گہر نکلے

غبارِ رہگزر ہیں کیمیا پر ناز تھا جن کو
جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو اکسیر گر نکلے

ہمارا نرم رو قاصد پیامِ زندگی لایا
خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے

حرم رسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے
جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے

زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر پایندہ تر تابندہ تر نکلے

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

(۷)

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا — خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو — اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی — تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے — تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِ زندگانی ہے — نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر — شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے — گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

(۸)

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے — قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی — یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو — ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا — جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی — یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

خروش آموزِ بلبل ہو گرہ غنچے کی وا کر دے — کہ تو اس گلستاں کے واسطے بادِ بہاری ہے

پھر اٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی — زمیں جولاں گہِ اطلس قبایانِ تتاری ہے

بیا پیدا خریدار است جانِ ناتوانے را
پس از مدت گذار افتاد بر ما کاروانے را

(٩)

بیا ساقی نوائے مرغ زار از شاخسار آمد
بہار آمد نگار آمد نگار آمد قرار آمد

کشید ابر بہاری خیمہ اندر وادی و صحرا
صدائے آبشاراں از فراز کوہسار آمد

سرت گردم تو ہم قانون پیشیں ساز دہ ساقی
کہ خیل نغمہ پردازاں قطار اندر قطار آمد

کنار از زاہداں برگیر و بیباکانہ ساغر کش
پس از مدت ازیں شاخ کہن بانگ ہزار آمد

بہ مشتاقاں حدیث خواجۂ بدر و حنین آور
تصرف ہائے پنہانش بچشمم آشکار آمد

دگر شاخ خلیلؑ از خون ما نمناک میگردد
ببازار محبت نقد ما کامل عیار آمد

سر خاک شہیدے برگہائے لالہ مے پاشم
کہ خونش با نہال ملت ما سازگار آمد

"بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم"

جامعۂ ملیۂ اسلامیہ علیگڈھ

کے

شعبۂ تصنیف و تالیف کی شایع کردہ کتابیں

(۱) ازہار العرب ۔ مؤلفہ مولانا سورتی	قیمت غیر مجلد ۸ ر
(۲) تاریخ الامت ۔ مصنفہ مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری	قیمت ۸ عہ
(۳) ایضاً (حصہ دوم) ۶ (حصہ سوم)	" " ۸ عہ
(۴) مبادی معاشیات ۔ از پروفیسر ذاکر حسین خاں صاحب	" " عہ
(۵) اخبار الدولتین ۔ از مولانا نیاز فتحپوری	(زیر طبع)
(۶) انتخاب کلام میر ۔ مرتبہ مولوی نور الرحمن بی اے	(")
(۷) خطبہ شیخ الہند ۔ (بہ تقریب افتتاح جامعہ)	قیمت ۲ ر
(۸) خطبہ مسیح الملک ۔ حکیم اجمل خاں صاحب	" ۲ ر
(۹) انتخاب مضامین جوہر ۔ معہ تصویر	" عہر
(۱۰) ترکوں کی کہانیاں	" ۴ ر

المشتہر

مہتمم مکتبۂ جامعۂ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

فہرست مضامین

جلد ۱ | شعبان المعظم ۱۳۴۲ھ مطابق اپریل ۱۹۲۴ء | نمبر ۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

جلد شعبان المعظم سنہ ۱۳۴۱ھ مطابق اپریل سنہ ۱۹۲۳ء نمبر ۴

راہِ عمل

(برٹرنڈ رسل کی کتاب 'ہیئت اجتماعی کی تعمیر نو' کے آخری باب سے اقتباس)

ہم ذیل میں انگلستان کے مشہور فلسفی اور ریاضی داں برٹرنڈ رسل کی کتاب ہیئت اجتماعی کی تعمیر نو[1] کے آخری باب کا تفصیلی اقتباس درج کرتے ہیں۔ رسل کی خصوصیت امتیازی یہ ہے کہ وہ جہاں فلسفہ اجتماع کا ماہر ہے وہاں ریاضی میں بھی استعداد تام رکھتا ہے۔ اکثر اجتماعیین کی تحریروں میں صفائی اور اہتمام صحت کمیاب ہوتا ہے۔ نفس انسانی کی ترکیب میں اتنے لاتعداد عناصر کی آمیزش ہے کہ ان کی حکیمانہ تجزی کے لیے نہایت مرتب دماغ درکار ہے۔ رسل کا دماغ اس ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ چنانچہ مسائل اجتماعی پر ان سے زیادہ سلجھی ہوئی رائے رکھنے والا اور کوئی شخص یورپ میں مشکل سے ملے گا۔ رسل دار العلوم کیمبرج میں ریاضی کا درس دیتے تھے کہ آغاز جنگ پر جنگ کی مخالفت اور فوجی خدمت سے انکار کے باعث محبوس کر دیے گئے جس کتاب سے ذیل کا اقتباس ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے یہ ان خیالات کا نتیجہ ہیں جو جنگ نے رسل کے دماغ میں پیدا کیے۔ تعمیر نو کے روز افزوں تحریروں میں اس کتاب کو نہایت اہم درجہ

---

[1] Allen & Unwin سے "Principles of Social Reconstruction"

حاصل ہی۔ اور اس کتاب میں نیز اپنی دوسری کتاب آزادی کی راہیں[1] میں جو خیالات مصنف موصوف نے ظاہر کیے ہیں اور انکا جو اثر عام دماغی رجحانات پر ہوا ہی اس کی بنا پر انھیں تعمیر نو کا اخلاقی راہنما کہنا بیجا نہ ہوگا۔

رسل نے ان کتابوں میں محرکات اجتماعی کا ایک بالکل جدید فلسفہ پیش کیا ہی۔ اس جدید فلسفہ میں رسل نے اصول نمو پر بہت زور دیا ہی اس کے نزدیک اعمال انسانی پر ارادہ اور خواہش شعوری کے بہ نسبت ہیجان کا زیادہ اثر ہے۔ چنانچہ اس کے خیال میں وہی نظام اجتماعی صحیح اور عمدہ ہی جس کی ساخت ایسی ہو کہ فطرت انسانی کے ان ہیجانات کو مفید کاموں میں صرف کیلئے اور ضرر رساں اعمال سے محترز رکھے۔ وہ کہتا ہی "صرف یہی کافی نہیں کہ ہم اپنی شعوری آرزوئیں کو بدل دیں، ضرورت اس کی ہی کہ ہماری ہیجانی زندگی میں تغیر پیدا ہو"۔

ایسی جماعت کی ترتیب کے لیے ملکیت شخصی کے اصول میں بڑی تبدیلی کی ضرورت ہی۔ اشتراکیین بھی ملکیت شخصی کو مٹا کر حکومت کی ملکیت قایم کرنا چاہتے ہیں۔ رسل کا رجحان جماعت کے نراجی (Anarchistic) نشو ونما کی طرف ہی۔ وہ حکومت کو ہر چیز کا مالک نہیں بنانا چاہتا۔ اور اس طرح اشتراکیین سے مختلف ہی۔ وہ علوم و فنون کے معاملہ میں حکومت کے اختیارات میں اضافہ کو نہایت مشتبہ نظر سے دیکھتا ہی۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ رسل بالکل نراجی[2] نشو ونما کی طرف ہے اس کے خیال میں حریت کے نقطۂ نظر سے نراجی اصول بہتر ہی اور لوگوں کو کام کرنے پر مائل کرنے کے لیے اشتراکی اصول۔ اور رسل نے اپنی کتابوں میں کوشش کی ہی کہ ان دونوں میں ایک میانہ راستہ نکالے۔ مسائل اجتماعی سے دلچسپی رکھنے والوں کے ان کتابوں کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ کاش دونوں کتابوں کا ترجمہ اردو زبان میں شائع ہو جاتا۔

(ذاکر)

---

[1] Roads to Freedom

[2] Anarchistic

۳

ہم اپنی زندگی میں دنیا کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟

بہت سے لوگ ہیں، مرد اور عورتیں، جو نوع انسانی کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ سب پریشان ہیں اور ان کی قوت کیسی بے وقعت اور کس درجہ قلیل معلوم ہوتی ہے! بالآخر یاس انھیں آ دباتی ہے۔ اور وہ جن میں جذبۂ خدمت سب سے قوی ہوتا ہے، وہی اس احساس بیچارگی سے سب میں زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ اور فقدان امید کے باعث روحانی تباہی کا احتمال انھیں میں سب سے زیادہ ہوتا ہے۔

اگر ہم محض مستقبل قریب کو پیش نظر رکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم جو کچھ کر سکتے ہیں وہ چنداں زیادہ نہیں۔ مثلاً ہمارے لیے غالباً یہ ناممکن ہے کہ ہم جنگ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیں۔ اسی طرح ہم حکومت یا ملکیت شخصی کی مضبوط طاقت کو بھی تباہ نہیں کر سکتے، نہ ہم اسی دم تعلیم میں نئی روح پھونک سکتے ہیں ان معاملات میں اگرچہ ہم خرابی کو دیکھ لیں لیکن سیاسیات کے معمولی طریقوں سے انکا کوئی فوری علاج ممکن نہیں ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ دنیا پر ایک غلط روح کا تسلط ہے اور اس روح میں آج سے کل تک کوئی تغیر نہیں ہو سکتا۔ ہماری امیدیں، ہماری توقعات، کل کے لیے نہ ہونی چاہئیں بلکہ ہمیں اس زمانہ کا خیال کرنا چاہیے جب وہ خیالات جو آج معدودے چند دماغوں میں ہیں پھیل کر اکثریت کا مشترک خیال بن جائیں گے۔ ہم میں اگر جرأت ہے اور صبر، تو ہم وہ خیالات سوچ سکتے اور ان امیدوں کو محسوس کر سکتے ہیں جو جلد یا بدیر انسانوں میں روح پھونکینگی۔ اور جن سے پژمردگی اور مایوسی، قوت اور ولولہ میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس لیے ہمیں جو پہلا کام کرنا ہے وہ یہ ہے کہ خود اپنے ذہن میں صاف طور پر معلوم کر لیں کہ ہم کس قسم کی زندگی کو اچھا سمجھتے اور دنیا میں کسی نوع کی تبدیلی کے آرزومند ہیں۔

زندگی بخش اور حیات پرور خیالات رکھنے والوں کی آخری قوت اس سے کہیں زیادہ ہے جتنی سیاست حاضرہ کی نامعقولیت کے شکار انسانوں کو معلوم ہوتی ہے۔ مذہبی رواداری ایک زمانہ میں چند باہمت فلسفیوں کا محض ایک تخیل تھا نظری حیثیت سے حکومت جمہوری کا خیال کرامول کی فوج کے مٹھی بھر آدمیوں میں پیدا ہوا۔ علاوہ شاہی (رسٹوریشن کے بعد یہ لوگ اسے امریکہ لے گئے، جہاں جاکر یہ جنگ آزادی میں یہ اپنا پھل لایا۔ لافایٹ اور دوسرے فرانسیسی، جو واشنگٹن کے دوش بدوش لڑے تھے۔ اس نظریۂ جمہوریت کو امریکہ سے فرانس لائے، جہاں روسو کی تعلیم سے مل کر یہ انقلاب کی روح رواں بنا۔ اسی طرح اشتراکیت ہے، کہ ہم اس کے محاسن کے متعلق کچھ سمجھیں، اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ یہ ایک بڑی اور نمو پذیر قوت ہے جو سیاسی اور معاشی زندگی کی کایا پلٹ کر رہی ہے۔ یہ اشتراکیت اپنے وجود کے لیے چند منتشر نظریئین کی رہین منت ہے۔ عورتوں پر جبر و تحکم کے خلاف تحریک جو آج ناقابل دفاع ہوگئی ہے اور کامل فتحمندی سے کچھ بہت دور نہیں، یہ بھی اسی طرح چند میری وولسٹانیکرافٹ شیلی، جان اسٹوارٹ مل جیسے غیر عملی متخیلین سے شروع ہوئی۔ خیال کی قوت بالآخر تمام انسانی قوتوں سے بڑی ہے۔ اور جن لوگوں میں صلاحیت فکر اور انسانی ضروریات کے مطابق فکر کے لیے تخیل موجود ہے وہ غالباً کبھی نہ کبھی اپنا مقصد ضرور حاصل کریں گے۔ اگرچہ ظن غالب ہے کہ اپنے جیتے جی ایسا نہ کرسکیں۔

ہاں۔ جو لوگ دنیا کو قوت خیال سے فتح کرنا چاہتے ہیں انہیں فی الحال دنیا کی مدد سے سبکدوش ہونے پر قناعت کرنی چاہیے۔ کیونکہ اکثر لوگ اپنی راہ زندگی پر بلا بحث سے سوال کیے گذر جاتے ہیں، جن عقائد و اعمال کو رائج پاتے ہیں انہیں قبول کرلیتے ہیں، اور محسوس کرتے ہیں کہ اگر ہم دنیا کے مخالف نہ بنیں تو دنیا ہماری معاون بنجائے گی۔ لیکن دنیا کے متعلق ہر نئے خیال کو اس آرام دہ جذبہ تسلیم سے بیر ہے۔ اس کے لیے ایک طرح کی ذہنی

۵

علیحدگی، ایک تنہا قوت، اور داخلی طور پر دنیا اور اس کے آفریدہ مطمح نظر پر حاوی ہونے کی طاقت درکار ہے۔ تنہائی پر تھوڑی سی آمادگی بغیر فکر جدید اور خیالات نو ممکن نہیں۔ لیکن اگر تنہائی اور علیحدگی، جدائی اور انقطاع کی مرتکب ہوئی تو اس کا حصول بے سود ہوگا۔ مثلاً اگر دوسروں سے اتحاد کی خواہش اس علیحدگی کے باعث فوت ہو جائے یا ذہنی تنہائی کے سبب سے دوسروں کی تحقیر پیدا ہو۔ یہ مطلوبہ دماغی کیفیت چونکہ نہایت نازک اور دشوار ہے چونکہ یہ مشکل ہے کہ انسان ذہنی طور پر ذرا الگ ہو لیکن بالکل قطع نہ ہو جائے، اس وجہ سے معاملات انسانی پر بار آور خیال و فکر عام نہیں اور اسی باعث سے اکثر نظریے یا تو محض رسمی ہیں یا بے نتیجہ۔ لیکن ہرچند یہ صحیح فکر کمیاب بھی ہے اور دشوار بھی مگر غیر موثر ہرگز نہیں۔ اور اگر ہم میں دنیا کے اندر نئی امیدوں کے لانے کی خواہش ہے تو ہمیں عدم تاثیر کے خیال سے فکر سے منہ نہ موڑنا چاہیے۔

اگر کسی ایسے سیاسی نظریہ کی تلاش ہو جو کسی موقع پر مفید ثابت ہو سکے تو اس کے لیے ایک خیالی بے عیب دنیا کے اختراع کی ضرورت نہیں، بلکہ حرکت و رفتار کے لیے بہترین راہ اور سمت کا انکشاف ہے۔ ایک وقت میں جو راہ اچھی ہے ممکن ہے بظاہر اس راہ سے بالکل مختلف ہو جو کسی دوسرے وقت صحیح سمجھی جائے۔ مفید خیال وہ ہے جو زمانہ حاضر میں صحیح راہ کا اظہار کرے۔ لیکن صحیح سمت اور راہ کا فیصلہ کرنے میں دو اصول ہمیشہ عائد ہو سکتے ہیں :-

اول یہ کہ افراد اور جماعتوں کے نمو اور حیات کو حتی الوسع ترقی دینی چاہیے۔

دوم یہ کہ جہاں تک ممکن ہو، ایک فرد یا جماعت کی نشو و نما دوسرے افراد یا جماعتوں کو نقصان پہنچا کر عمل میں نہ آئے۔

. . . .

ان دونوں اصول کو پورا کرنے کے لیے ضرورت ہے پہلے تو حیات انفرادی میں ایک وحدت پیدا کرنے کی، اور پھر شخصیت انفرادی کو قربان کیے بغیر حیات اجتماعی اور نیز تمام

دنیا میں اسی وحدت کے وجود کی۔ تاکہ ایک فرد ایک جماعت، یا خود ساری نوع انسانی کی زندگی بہت سے جدا جدا اجزا پر مشتمل نہ ہو بلکہ کسی معنی میں خود ایک کل ہو۔ ایسی حالت میں ایک فرد کی نشو و نما دوسرے کی نشو و نما میں حائل نہیں ہوتی بلکہ اس سے مدد پاتی اور ترقی پذیر ہوتی ہے۔ اور اس طرح مذکورہ بالا دونوں اصول باہم مطابق ہو جاتے ہیں۔

حیات انفرادی میں یہ وحدت ایک مستقل تخلیقی غرض یا غیر محسوس ہیجان سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک مہذب مرد یا عورت کی زندگی میں یہ وحدت پیدا کرنے کے لیے خلقی جبلت کافی نہیں ہوتی بلکہ اس کیلئے ضروری ہے ایک ہمہ گیر غرض، ایک حوصلہ، علمی یا جمالی تخلیق کی کوئی آرزو۔ کوئی مذہبی اصول، یا قوی اور پائدار جذبات اس مرد یا عورت کے لیے یہ وحدت حیات بہت دشوار ہے جسے ایک قسم کی شکست نصیب ہو چکی ہو۔ اور وہ شکست یہ ہے کہ اسکی زندگی میں جو ہیجان (Impulse) حاوی ہونا چاہیے تھا وہ رک کر پامال ہو جاتا ہے اکثر پیشے انسان کو زندگی کے شروع ہی میں اس شکست سے دوچار کر دیتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص صحافت کا پیشہ اختیار کرے تو اسے غالباً کسی ایسے اخبار کے لیے لکھنا پڑے گا جس کی سیاسیات سے وہ نفرت کرتا ہے۔ اس طرح کام سے جو ولولہ اور فخر پیدا ہوتا وہ فوت ہو جاتا ہے، اور اسی کے ساتھ احساس خود داری بھی۔ اکثر طبیب ہیں کہ بلا تھوڑی سی دھوکہ بازی اور دھونس کے کامیاب نہیں ہو سکتے، چنانچہ جو کچھ تھوڑا بہت تجلی ضمیر ان میں ہوتا بھی ہے وہ بھی غارت ہو جاتا ہے۔ سیاسیین اپنی جماعت یا فرقہ کے پروگرام ہی کے پابند نہیں ہوتے بلکہ ساتھ ساتھ اپنے کو بزرگ اور برگزیدہ بھی ظاہر کرنا پڑتا ہے، تاکہ مذہبی خیال والے ساتھیوں کی تسکین ہوتی رہے۔ چنانچہ ہماری انگریزی پارلیمنٹ میں مشکل ہی سے کوئی شخص بلا ریاکاری کے پہنچ سکتا ہے۔ پیشے انسان کے اس طبعی و فطری احساس نفس کی ذرا عزت نہیں کرتے، جس کے بغیر انسان کامل انسان نہیں رہ سکتا۔ دنیا بے رحمی کے ساتھ اس جذبہ کو کوٹ کوٹ کر اس سے نکالتی ہے

اور یہ کیوں؟ صرف اس لیے کہ یہ عبارت ہے خودداری اور خود مختاری سے ؛ اور انسانوں میں خودآزاد رہنے سے زیادہ قوی آرزو دوسرے انسانوں کو غلام بنانے کی ہے - یہ داخلی و نفسی آزادی ایک بیش قیمت جوہر ہے، اور وہ جماعت نہایت ناپسندیدہ اور آرزو کرنے کے قابل ہے جو اسے برقرار رکھے -

انسان میں اصل نمو یہ لازم نہیں کہ کسی خاص عمل سے منع کرنے سے برباد ہو - بلکہ اکثر اس کی تباہی یوں عمل میں آتی ہے کہ اسے کوئی دوسری چیز کرنے پر آمادہ کر دیا جائے - نمو کے لیے تباہ کن وہ چیزیں ہوتی ہیں جو دل کے اندر ان چیزوں میں بے بسی کا احساس پیدا کر دیں جن میں انسان کا ہیجان حیات اپنا ثمرہ دکھانا چاہتا ہے - ان میں بدترین چیزیں وہ ہیں جنھیں قوت ارادی تسلیم کر لیتی ہے - اکثر عدم خود شناسی کے باعث انسان کا ارادہ اس کے ہیجان سے ادنیٰ سطح پر ہوتا ہے - اس کا ہیجان ہوتا ہے کسی قسم کی تخلیق کی طرف، اس کا ارادہ اسے کسی رسمی پیشہ کی جانب لیجاتا ہے جس میں آمدنی اور ہم چشموں میں عزت کافی نصیب ہو ......
اور چونکہ یہ ہیجان عمیق ہوتا ہے اور خاموش، چونکہ وہ چیز جو "عام سمجھ" کے نام سے معروف ہے اس کی مخالف ہوتی ہے، چونکہ اس تہیج کی اتباع اسی وقت ممکن ہے کہ انسان اپنے پوشیدہ احساسات کو بزرگوں اور دوستوں کے عقل و فہم اور دانشمندانہ پند و نصایح کا مخالف بنائے اس لیے سو صورتوں میں سے ۹۹ میں یہ تخلیقی ہیجان جس سے ایک آزاد اور قوی زندگی پیدا ہو سکتی تھی شروع ہی میں کُک کر پامال ہو جاتا ہے - اور یہ نوجوان بجائے خود مختار کاریگر بننے کے ایک آلہ بننے پر راضی ہو جاتا ہے، اب یہ اس مقصد کا پیرو نہیں رہتا جسے اس کی فطرت اچھا جانتی ہے، بلکہ دوسروں کے اغراض کی تکمیل کا ذریعہ بن جاتا ہے - عین جس آن میں کہ اس سے تسلیم کا یہ فعل سرزد ہوتا ہے، اس کے اندر کسی چیز کی موت بھی واقع ہوتی ہے اس کے بعد وہ کبھی کامل انسان نہیں بن سکتا، اس کی پہلی غیر مجروح خودداری اس میں پھر

کبھی واپس نہیں آسکتی، نہ وہ سربلند احساسِ نفس جو باوجود تمام خارجی مصائب و مشکلات کے اس کی روح کے انبساط کا باعث ہوتا الا یہ کہ ان کے خیالات میں کامل تبدیلی یا اس کے طرزِ زندگی میں بنیادی تغیر پیدا ہو جائے۔

خارجی موانع جنھیں قوت ارادی تسلیم نہ کرے، اسقدر ضرر رساں نہیں ہوتے جتنی کہ وہ پوشیدہ ترغیبات جو ارادہ کو بہکا لیتی ہیں۔ مثلاً ممکن ہے کہ عشق و محبت میں کوئی سخت مایوسی نہایت شدید کرب و الم کا باعث ہو، لیکن ایک قوی انسان کو یہ مایوسی وہ داخلی نقصان نہیں پہونچا سکتی جو فرض کر و کہ صرف روپیہ کی خاطر شادی کر لینے سے انسانی روح کو پہونچتا ہے۔ اس لیے کہ اصل چیز کسی خاص آرزو کا حصول نہیں بلکہ وہ سمت ہے، وہ راہ ہے جس کی تکمیل یا حصول کی خواہش ہو، تاثیر کی وہ نوع ہے جو مطلوب ہو۔ چنانچہ جب اصلی ہیجان کی مخالفت قوتِ ارادی کرتی ہے، تو ہیجان اپنے کو بے بس محسوس کرنے لگتا ہے، اور پھر اسمیں محرکِ عمل بننے کی امید باقی نہیں رہتی برخلاف اس کے اگر ہیجان قوی ہے تو خارجی جبر سے بے بسی اور لاچاری کا یہ احساس پیدا نہیں ہوتا۔ ورنہ یوں تو بعض مخصوص آرزوؤں کی پامالی بہتر سے بہتر جماعت میں بھی ناگزیر ہوگی۔ کیونکہ بعض لوگوں کی آرزوئیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر انھیں روکا نہ جائے تو دوسروں پر جبر یا دوسروں کی تباہی انکا نتیجہ ہو۔ مثلاً ایک اچھی جماعت میں نپولین کو اپنا من مانا پیشہ اختیار کرنے کی اجازت نہ ملتی؛ البتہ وہ کہیں مغربی امریکہ میں نئے علاقوں کی دریافت یا آبادی میں اولیت کا شرف حاصل کر سکتا تھا۔ ایک بنک کے محرر کی حیثیت سے وہ خوشی نہ حاصل کر سکتا اور نہ کوئی معقول نظامِ جماعتی اسے محرر بننے پر مجبور کرتا۔

حیاتِ انفرادی کی وحدت چاہتی ہے کہ فرد میں جو کوئی تخلیقی ہیجانات ہوں وہ اس کی زندگی میں پائے جائیں، اور اس کی تعلیم و تربیت ان ہیجانات کی حفاظت کرے اور انھیں بھاتے

جماعتی زندگی کی وحدت کے لیے ضرورت ہے کہ مختلف افراد کے مختلف تخلیقی ہیجانات مل کر سب ایک مشترک زندگی، اور ایک مشترک غرض (جس کا محسوس ہونا ضروری نہیں) کی طرف مائل ہوں، جس سے جماعت کے ہر فرد کو اپنی ذاتی تکمیل میں مدد ملے۔

انسان کے ہیجانات اور آرزوؤں کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں، تخلیقی اور تملیکی۔ ہمارے بعض اعمال اس غرض سے ہوتے ہیں کہ کوئی ایسی چیز پیدا کریں جو ان اعمال کے بغیر موجود نہ ہوتی اور بعض دوسرے افعال وہ ہوتے ہیں جو اُن چیزوں کو حاصل کرنے یا اپنے قبضہ میں قائم رکھنے کے لیے ہیں جو پہلے سے موجود ہیں۔ ہیجان تخلیقی کا اچھا نمونہ فنون لطیفہ کے ماہرین میں ملے گا، اور تملیکی ہیجان کا بہترین نمونہ ملکیت شخصی ہے بہترین زندگی وہ ہے جس میں تخلیقی ہیجانات زیادہ سے زیادہ اور تملیکی کم سے کم کار فرما ہیں۔ . . . . سیاسی اور خانگی زندگی دونوں کا اصول اولین یہ ہونا چاہیے کہ ہر اس چیز کو فروغ دیں جو تخلیقی ہے اور ہر اس آرزو اور ہیجان کو کم کریں جن کا مرکز تملیک ہے۔ بحالات موجودہ حکومت بڑی حد تک تملیکی ہیجانات کا مجسمہ ہے۔ امور داخلی میں یہ امیروں کو غریبوں کے مقابلہ میں بچاتی اور معاملات خارجی میں یہ اپنی قوت کمزور قوموں سے ناجائز کسب فوائد اور دوسری حکومتوں سے مقابلہ و مسابقہ میں صرف کرتی ہے۔ اسی طرح ہمارا نظام معاشی تمام تر تملیک سے متعلق ہے۔ . . . . تعلیم، ازدواج اور مذہب اصلاً تخلیقی ہیں۔ لیکن تملیکی محرکات کی مداخلت نے انھیں اپنی اصلیت سے بہت کچھ دور کر دیا ہے۔ مثلاً تعلیم اس بات کا وسیلہ سمجھی جاتی ہے کہ طلبا کے دماغ میں تعصبات بھر کر موجودہ نظام کو کسی طرح قایم رکھا جائے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ اسے حریت فکر اور آزادی خیال پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا جائے یا جذبات و احساسات حسنہ کی مثال اور ذہنی حوصلہ کی تحریک سے اس تعلیم کو ایک بہتر مطمح نظر پیدا کرنے میں صرف کیا جائے۔ ازدواج میں محبت کے تخلیقی جذبہ کو رقابت کا تملیکی جذبہ پابجولاں رکھتا ہے۔ مذہب کا کام ہونا چاہیے تھا روح کے تخلیقی

منشائے نظر کا آزاد کرنا، اب اس کا کام عموماً حیاتِ جبلی و طبعی کو دبانا اور فکر و خیال کی تہ و بالا کرنی والی قوت کا مقابلہ کرنا ہے۔ الغرض مختلف طریقوں سے خوف نے، جو غیر محفوظ تملیک کا آفریدہ ہے، اس امید کی جگہ لے لی ہے جس کی روح رواں تخلیقی قوت ہے۔

(لہذا) مہذب دنیا کو اگر انحطاط سے بچانا ہے تو اس کے لیے ایک بنیادی تغیر کی ضرورت ہے، یعنی اس کی معاشی ساخت اور اس کے فلسفۂ زندگی دونوں میں تغیر۔ . . . . زندگی کی ترقی یا تباہی میں نظام ہائے معاشی کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ ایک غلامی کو چھوڑ کر، موجودہ نظام صنعتی زندگی کے لیے ان تمام نظاموں سے زیادہ تباہ کن ہے جو کبھی عالم وجود میں آئے ہیں۔ اس میں سے مشینوں کے استعمال اور بڑے پیمانہ پر پیداوار کے اجتماع کا نکالنا تو اب ممکن نہیں اور اس نظام سے بہتر نظام میں بھی یہ باقی رہیں گے۔ اصلاح کی بہترین راہ اس معاملہ میں غالباً صنعتی جمہوریتوں کا قیام اور ان کا اتحاد ہے۔

جب بہت سے لوگ یقین کر لیں تو فلسفہ ہائے زندگی بھی جماعت کی قوت اور اس کی حیات پر بڑا اثر رکھتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں جو فلسفہ حیات سب سے وسیع حلقۂ معتقدین رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی مسرت کے واسطے سب سے زیادہ اہم چیز اس کی آمدنی ہے۔ اس کے دیگر نقائص سے قطع نظر یہ فلسفہ اس لیے اور بھی مضر ہے کہ یہ انسان کا مقصد بجائے ایک عمل کے ایک نتیجہ کو قرار دیتا ہے۔ یعنی بجائے ایک تخلیقی ہیجان کے جو انسان کی انفرادی شخصیت کا پرتو ہو یہ مادی اشیائے لطف اندوزی کو اس کا مقصد بناتا ہے جس میں افراد کی کوئی تفریق نہیں۔ دوسرے فلسفے جو اس سے لطیف تر ہیں، مثلاً وہ جو اعلیٰ تعلیم کے ذریعہ پھیلائے جاتے ہیں، وہ عموماً مستقبل کے بجائے ماضی کو، موثر عمل کے بجائے رویہ اور برتاؤ کو توجہ کا مرکز بنا دیتے ہیں۔ لیکن روایات قدیم اور خزانۂ علم کا روز افزوں بار اٹھانے کے لیے انسان کو ان فلسفوں سے کافی قوت نہ ملے گی۔

دنیا کو ایک ایسے فلسفہ یا ایک ایسے مذہب کی ضرورت ہے جو حیات پرور ہو۔ لیکن انفرادی حیات کیلئے محض حیات کے علاوہ کسی اور چیز کی قدر کی بھی ضرورت ہے۔ جو زندگی بس زندگی کے لیے ہی وقف ہو وہ حیوانی زندگی ہے۔ اس میں کوئی حقیقی قدر انسانی نہیں۔ اور نہ اس میں یہ صلاحیت ہے کہ انسان کو ہمیشہ پژمردگی سے یا اس احساس سے محفوظ رکھ سکے کہ سب کچھ ہیچ ہے۔ اگر زندگی کو کامل طور پر انسانی زندگی بنانا ہے تو اسے کسی ایسے مقصد کا خادم ہونا چاہیے جو کسی نہ کسی معنی میں اس سے خارجی ہو، کوئی مقصد جو مافوق الناس اور غیر شخصی ہو، مثلاً اللہ، یا حق، یا جمال۔

جو لوگ سب سے زیادہ ترقی حیات کا موجب ہوتے ہیں وہ اپنی خاطر زندگی نہیں گذارتے۔ ان کی نظر ہوتی ہے حقیقت کے ایک تدریجی حلول پر، وجود انسانی میں حقیقت ازلی کا جزو پیدا کرنے پر۔ اس چیز پر جو متخیلہ کی نگاہ کو جدال و نامرادی سے مامون اور زمانہ کی ہمہ گیر گرفت سے محفوظ کسی بلندی پر رہتی دکھائی دیتی ہے۔ اس عالم ازلی سے لگاؤ — خواہ یہ ہمارا خیالی عالم ہی کیوں نہ — اپنے ساتھ ایک ایسی قوت اور اپنے ہمرکاب ایک ایسا امن و سکون لاتا ہے کہ ہماری دنیاوی زندگی کی کشاکش اور ظاہری ناکامیاں اسے کبھی کلیتہً فنا نہیں کر سکتیں۔ حقیقت ازلی کا یہی مسرت انگیز تصور ہے جسے اسپی نوزا خدا کی عقلی محبت سے تعبیر کرتا ہے جنھوں نے ایک مرتبہ اسے جان لیا، ان کے لیے یہ ہمیشہ کلید گنج عرفاں ہے۔ ....

اگر ہم اس حقیقت ازلی سے لگاؤ پیدا کریں، اگر ہم اپنی زندگی اس لیے وقف کر دیں کہ اس مصیبت زدہ دکھیا دنیا میں اس حقیقت ازلی کا ایک جزو لے آئیں، تو ہم آج بھی کہ ہر چہار طرف ظلم و غارتگری، جدال و قتال، نفرت و حقارت سے محصور ہیں، اپنی زندگی کو تخلیقی بنا سکتے ہیں......

جو لوگ دنیا کی اس حیات نو کا آغاز کرینگے انھیں تنہائی، مخالفت، افلاس، اور بدنامی سے دوچار ہونا پڑیگا۔ انھیں اس قابل ہونا چاہیے کہ صداقت اور محبت کی قوت کی زندہ تصویر ہوں اور اپنے سینہ کو ایک غیر تسخیر پذیر عقلی امید سے ہمیشہ آباد رکھیں۔ ایماندار رہیں، اور عقلمند۔ بے خوف ہوں، اور ایک مستقل غرض کے تابع۔ ایسے مردوں اور عورتوں کی جماعت پہلے اپنی انفرادی زندگی کی

مشکلات اور پیچیدگیوں پر فتح پائے گی اور پھر کچھ وقت گزرنے پر، اگرچہ شاید زیادہ وقت گزرنے پر جاری دنیا پر ظفریاب ہوگی۔ دنیا کو عرفان اور امید کی ضرورت ہے، اور ہر چند وہ ان کے مقابل جنگ آزما ہو، بالآخر ان کے روبرو اپنا ہدیہ تعظیم پیش کرتی ہی ہے۔ جب قوم گوتھ نے روما کو پامال کر ڈالا آگسٹین مقدس نے اپنی کتاب "مدینۃ اللہ" لکھی اور تباہ شدہ مادی حقیقت کی جگہ ایک روحانی امید پیدا کی۔ آنے والی صدیوں میں گو روما ٹوٹے پھوٹے مکانوں کا ایک قریہ رہ گیا تھا، آگسٹین کی امید زندہ بھی رہی اور زندگی بخش بھی۔ ہم پر بھی لازم ہے کہ ایک نئی امید پیدا کریں اور اپنے خیال سے ایک ایسی دنیا بنائیں جو اس دنیا سے بہتر ہو جو خود اپنے کو قعر تباہی میں ڈھکیل رہی ہے۔ وقت چونکہ برا ہے، اس لیے ہم سے بھی اس سے زیادہ مطلوب ہے جتنا معمولی زمانہ میں ہوتا۔ آنے والی نسلوں کو اس موت سے، جو اس نسل پر آپڑی ہے جسے ہم جانتے اور جس سے ہم محبت کرتے تھے صرف خیال دروں کی دھکتی آگ ہی بچا سکتی ہے۔

خوش قسمتی سے مجھے بہ حیثیت معلم مختلف اقوام کے نوجوانوں سے ملنے کا موقع ملا ہے، وہ نوجوان جن میں شمع امید فروزاں تھی، جن میں وہ تخلیقی قوت موجود تھی جو دنیا میں اس تخیلی حسن کا کچھ حصہ ضرور پیدا کرتی جس کے خیال سے وہ زندہ رہتے تھے۔ ان کو جنگ کا سیلاب بہا لیگیا کسی کو ایک طرف کسی کو دوسری طرف۔ بعض ابتک جنگ آزما ہیں بعض ہمیشہ کے لیے معذور ہوگئے ہیں، اور بعض مرچکے ہیں۔ جو زندہ ہیں ان کے متعلق خوف ہے کہ اکثر میں حیات روحانی کی شمع گل ہو چکی ہو گی، امید کا چراغ بجھ گیا ہوگا، قوت صرف ہو چکی ہو گی، اور آنے والے ماہ و سال اس تھکے ماندے مسافر کے جادہ سفر ہونگے جس کی منزل قبر ہے۔ انکے معلموں میں بہت سے لیسے ہیں جنھیں اس حادثہ المناک کا کچھ احساس نہیں۔ یہ اپنی بے رحم منطق سے ثابت کرتے ہیں کہ ان نوجوانوں کی قربانی کسی بار دغرض مجرد کے لیے ناگزیر تھی۔ چونکہ خود ان کے

آرام میں خلل نہیں پڑا اس لیئے اگر کبھی جذبات کا کوئی آنی حملہ ہوتا بھی ہے تو یہ پھر جلدی سے اپنے آرام و اطمینان میں واپس آجاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن میں حیات روحانی کی موت ہوچکی ہے۔ اگر یہ زندہ ہوتی تو اپنے پہلو میں باپ ماں کی سی محبت لیے ہوئے ان نوجوانوں کی روحوں سے ملنے کے لیے بڑھتی۔ یہ نفس و ذات کی قیود سے آزاد ہوتی، اور ان کی حسرت ناک مصیبت ان کی مصیبت ہوتی۔ پھر کوئی چیز پکار کر ان سے کہتی:۔ "نہیں نہیں۔ یہ ٹھیک نہیں۔ یہ اچھا نہیں۔ یہ فرض مقدس نہیں جس کے لیے شباب کی دمکتی روشنی ماند اور تباہ کی جارہی ہے۔ یہ ہم سن رسیدہ بڈھے ہیں جو گنہگار ہیں۔ ہم نے اپنے جذبات سو، اپنی روحانی موت کی خاطر ان جوانوں کو میدان پیکار میں بھیجا ہے۔ یہ وہاں اس لیے ہیں کہ ہم اپنے دل میں گرمی اور اپنی روح میں ایک زندہ منظر نہ رکھنے کے باعث بھلائی اور رواداری سے زندگی گذارنے میں ناکام رہے۔ آؤ۔ اب ہم اس موت سے نکل آئیں۔ اس لیے کہ دراصل مردہ ہم ہیں، نہ یہ نوجوان جنھوں نے موت کا منہ اس لیے دیکھا کہ ہم جینے سے خائف تھے۔ ان کے تو مردہ جسموں میں ہم سے زیادہ زندگی ہے۔ اور وہ ہمیں تمام آنے والی نسلوں کے سامنے شرم و ندامت کا منظر بنا رہے ہیں۔ چاہیے کہ ان کے مردہ اجسام سے زندگی پیدا ہو اور وہ ہمیں بھی زندہ کرے۔"

ذاکر حسین خاں از برلن

پارسی علوم اور اسلام

(گذشتہ سے پیوستہ)

بھاٹ اور شاعر قدیم پارسی شاعری کی تلاش میں بآربد اور تین چار اور بھاٹوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ عرب شاعر خالد بن فیاض نے جو اول صدی ہجری کے آخر میں گذرا ہے بآربد کا افسانہ عربی میں لکھا ہے۔ بآربد ایک بھاٹ تھا جو خسرو پرویز کو گا بجا کر خوش کیا کرتا تھا۔ یہ نہایت مغلوب الغضب بادشاہ تھا۔ جب کوئی ناگوار بات اس کے کانوں تک پہنچانا ہوتی تو اہل دربار بآربد کی موسیقی اور بول کے ذریعے سے آگاہ کرتے تھے چنانچہ بادشاہ کے شبدیز نام گھوڑے کی موت کی خبر بآربد نے اسے کس طرح گا کر دی ہے خالد نے عربی نظم میں اس کو بتایا ہے۔ مگر عربی میں اس قسم کے چٹکلے اور افسانے بہت ہیں جنکو تاریخی رنگ دیکر دلچسپ اور مقبول طبع بنایا گیا ہے۔ عنترہ کے کارناموں کا پورا افسانہ ہمیر شہر زاد کی کیفیت، الف لیلہ کی بعض تاریخ نما داستانیں۔ حماد الراویہ کی کہانیاں، یہاں تک کہ ہابیل کی موت پر حضرت آدم کا مرثیہ اور ابلیس کا جواب عربی نظم میں موجود ہیں جو بالکل قابل اعتنا نہیں۔ دوسرے اگر بآربد کی اصلیت تسلیم بھی کی جائے تو اس کے بول شعر نہ تھے۔ چنانچہ عوفی کا بیان ہے:۔

"لولاے خسروانی کہ آں را باربد در صورت آوردہ است بسیار است فاما از وزن شعر و قافیہ و مراعات نظایر آن دور است بداں سبب تعرض بیان آں کردہ نیامد"[۵]

درحقیقت بھیٹی اور شاعری دو چیزیں ہیں، الگ الگ۔ اور بھاٹوں کا وجود بجائے تہذیب و تمدن کی علامت کے ہمیشہ اور ہر ملک کی تاریخ میں وحشت و بدویت کی نشانی رہا ہے۔ آجتک غیر مہذب پہاڑی علاقوں میں بھاٹ پائے جاتے ہیں جو قومی افسانے گایا کرتے ہیں۔ اسکاٹ لینڈ کے دور وحشت میں امیروں کے درباروں میں آزاد آوارہ گرد بھاٹ پہنچ

---

[۵] جلد اصفحہ ۲۰۔ لباب الالباب

ہے۔ تے بن کی صحیح تصویر مشہور افسانہ نویس اور قومی شاعر سر والٹر اسکاٹ نے اپنی تصانیف
کی ہے۔ اسی طرح کو ہسار دیلز میں بھی بھاٹ تھے اور سرحدی پٹھانوں میں بھی موجود ہیں
۔۔ موجود تمدن و تہذیب اور علم و ادب سے جو کچھ علاقہ رکھتا ہے محتاج بیان نہیں۔

دولت شاہی روایت

یہی دولت شاہ سمرقندی کی روایت جو آغاز مضمون میں نقل کی جا چکی ہے یعنی عبداللہ بن طاہر گورنر خراسان کی طرف فارسی
کی غارت گری کی نسبت اور صاحب مجمع الفصحا کا کلم کی طرح تعمیم کر کے عام عربوں کی طرف اس وحشت
کو منسوب کرنا اول تو یہ اچھوتا مضمون صرف دولت شاہ کی طبع رسا کا نتیجہ ہے اور دولت شاہ کی نثر
۔۔ ایتوں کی طرح بے سند ہے پھر محمد عوفی اپنے مستند و معتبر تذکرہ لباب الالباب میں، جو خود مجمع الفصحا کا ماخذ ہے،
۔۔ فی خاں مذکور کا بھی ماخذ ہے "باب سوم در معنی اول کسے کہ شعر گفت" "باب چہارم در معنی اول
پارسی کہ گفت" جیسے مستقل باب باندھ کر ان مسائل پر تفصیل سے بحث کرتا ہے۔ آج عام تذکروں
میں اولین اشعار پارسی کے جو نمونے منقول ہیں تقریباً سب کے سب اسی کتاب سے ماخوذ ہیں
گو قصۂ وامق و عذرا اور عبداللہ بن طاہر کا افسانہ کہیں نظر نہیں آتا۔ حالانکہ آل طاہر کا ذکر ان
الفاظ میں موجود ہے:۔

"اگرچہ فیض و انعام ایشاں عام بود فاما ایشاں را در پارسی و لغت دری اعتقادے نبود۔
دراں عصر شعرا در ین فن کمتر خوض کردند۔ اما در عہد میمون ایشاں شاعرے شکر سخن خاست
حنظلہ نام از بادغیس .... [1]"

اس کے بعد حنظلہ بادغیسی اور دوسرے اولین شعرائے فارس کے کلام جمع کیے ہیں۔ اس
مقام کے سوا مثنوی وامق و عذرا کے ذکر کا اور کون سا موقع ہو سکتا تھا؟ عنصری کی تصانیف
کے ضمن میں اس مثنوی کا ذکر بھی آتا ہے مگر وہاں بھی اس واقعہ کا کوئی نشان نہیں۔ پھر
درایۃً یہ ناممکن محض معلوم ہوتا ہے کہ خراسان کے گورنر کے حکم سے ساری دنیا کا فارسی لٹریچر
فنا ہو جائے۔ زیادہ سے زیادہ خراسان میں یہ حکم چل سکتا تھا، باقی ملک ایران میں عبداللہ

---

[1] لباب الالباب جلد ۱ صفحہ ۲۔

کا کیا دخل؟

فارسی اصطلاحات علمیہ سے مغالطہ

پروفیسر آزاد نے سخندان فارس میں پہلوی و فارسی قدیم کی اصطلاحات فلسفیہ کا کچھ نمونہ پیش کرکے پارسی قدیم کی مالداری کا ثبوت دیا ہے اور اپنے مخصوص ادیبانہ طرز میں اس کے فنا پر سینہ کوبی کی ہے۔ مگر حسب عادات اپنا ماخذ بتایا نہ کسی کتاب کا حوالہ دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ ساری اصطلاحات پارسی جن پر ماتم کیا گیا ہے ظہور اسلام سے بہت بعد کی کوشش ہیں۔ کیونکہ اوستھا اور اس کی شرح کے سوا فلسفہ و غیرہ پر فارسی قدیم یا پہلوی میں آج دنیا پر جو کچھ اجزا موجود ہیں وہ چودھویں صدی عیسوی (۱۳۲۳ء) تک کے لکھے ہوئے ہیں ایسی حالت میں فاضل ممدوح کا یہ ماتم اشکِ ہمدردی بہانے کے عوض خندہ ملامت کے لائق ہے۔

ایرانیوں کی حب وطنی نے انھیں ہمیشہ سے غیر مخلوط خالص پارسی کے شیوع کا متمنی اور ساعی رکھا ہے۔ یہ کوشش بے سود یہی عہد فردوسی سے لیکر آج تک وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ہے۔

محمد صالح دربار شاہجہانی کا مصنف تھا۔ اس نے اپنی ایک کتاب عمل صالح میں عربی اصطلاحات عروض کی جگہ خالص فارسی اصطلاحات گھڑی تھیں جن کا نمونہ یہ ہے۔

قصیدہ	کے لیے	چگامہ	تخلص	"	داغ
غزل	"	چامہ[1]	نثر	"	پراگندہ
وزن شعر	"	دم	نظم	"	پیوستہ[2]
ردیف	"	پاوند			

---

[1] فردوسی نے چامہ گبیت کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

[2] فردوسی نے پیوستہ کسی نہ کسی صفت کے ساتھ لاکر اسے نظم کے مفہوم میں مجازاً استعمال کیا ہے۔ جیسے گویا پیوستہ۔ حدیث پیوستہ۔

اخبار روزنامہ ایران سلطانی نمبر ۴ مورخہ ۱۳۲۱ھ ہجری میں نصابِ بوالظفر صادق فراہانی کے نام سے ایک منظوم فرہنگ شائع ہوئی تھی۔ چند لفظ یہ ہیں:—

پاک	کے لیے	یزداں	صراط	کے لیے	چینود
خدا	"	ایزد	بہشت (باغ)	"	مینو
حق	"	ہدہ	افعال مسنون	"	چشب
نبی	"	وخشور	سحر	"	فرہ
شرع	"	آئیں	معجزہ	"	فرہود
نظام	"	دھناو	فاضل دانا	"	فرجاد
عرش	"	گرزماں	کعبہ	"	آباد
کرسی	"	زیرگر	قرآن	"	نوی
ثواب	"	کرفہ	مسجد الاقصیٰ	"	گنگ دژ ہوخت
عذاب	"	بزہ			

مگر محض چند پہلوی الفاظ کی موجودگی سے یہ نتیجہ نکالنا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا کہ یہ زبانِ پہلویِ ساسانی کی اصطلاحات ہیں اور ان کی موجودگی علوم و فنون کی موجودگی پر دلالت کرتی ہے۔ ایسے ہی الفاظ کی بنا پر ایک مدعی تحقیق پادری صاحب نے اسلام کے تمام عقائدِ معاد کو زرتشتی دینیات سے ماخوذ ثابت کیا ہے[۱]۔

پہلوی ادبیات باقیہ پر ایک نظر

اخیر ساسانی عہد کی پہلوی ادبیات بھی جو کچھ آج موجود ہیں، ان کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے

---

[۱] ینابیع الاسلام مطبوعہ ایران جسے سر ولیم میور نے ترجمہ کر کے خوب چمکایا اور اچھالا ہے اس کا نام The Sources of Islam رکھا ہے۔

کہ بجائے تاریخ و مذہب و تمدن ایران پر روشنی ڈالنے کے وہ اسے تاریک سے تاریکتر بنا رہی ہیں ایک طرف اوستھا اور زند کیومرث کو حضرت آدم قرار دیتی ہیں دوسری طرف[1] دساتیر کا بیان ہے کہ کیومرث کے قبل ایک پیغمبر مہاباد گذرا ہے جس سے موجودہ نوع انسان کی نسل چلی ہے اس میں قدیم مجوسیوں کا یہ فلسفہ بھی درج ہے کہ زمانہ بہت دوروں میں منقسم ہے۔ ہر دورے میں ایک خلقت پیدا ہوئی، بڑھی اور پھلی، پھر تدریجاً فنا ہوگئی۔ آخر میں صرف ایک مرد و عورت بچ رہے جن سے آئندہ دورہ چلا۔ وعلیٰ ہذالقیاس مہاباد آخری دورے کا بابا آدم ہے جس نے تمدن کے سارے سامان ایجاد کیے۔ اس کے زمانہ میں دنیا میں بہشت کا امن و عیش میسر تھا۔ مہاباد کے خاندان کے بعد ایک پیغمبر جی افرام نے عنان حکومت سنبھالی۔ اس خاندان کی جسے جیانیاں کہتے ہیں مدت حکومت ایک اسپار سال بتائی گئی ہے، جو ان کے حساب سے ایک ہزار ملین یا دس کروڑ سال کے برابر ہے[2] مورخین یونان پیشدادی یا ان سے پہلے خاندانوں کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔

شاہنامہ فردوسی کو آج ہم محض شاعرانہ افسانہ سمجھتے ہیں لیکن یہ مثنوی بھی بلحاظ واقعات زیادہ تر پہلوی تصنیف کارنامک ارتخشتر پاپکاں (کارنامۂ اردشیر بابکاں) اور خدائے نامک کا چربہ ہے۔ آخر الذکر کتاب آٹھویں صدی عیسوی کے وسط میں ابن المقفع اور دوسرے فضلا کے پانچ چھ مختلف عربی تراجم کے ذریعے سے دنیائے اسلام میں مشتہر ہو چکی تھی اگرچہ اب اصل پہلوی متن نایاب ہے۔ یہ غالباً یزدگرد سوم کے عہد کی تالیف تھی۔ اسی طرح کارنامۂ

---

[1] یہ اوستھا اور زند یا ژند سے بالکل الگ ایک قدیم کتاب ہے جو ۵۹۰ء میں عہد خسرو پرویز میں پہلوی میں ترجمہ ہوئی۔ اس میں شاہان ایران کے نامے یا الہامات ہیں۔ اس کے بیان کے مطابق ایران کے تمام شاہان پیشین خدا کا اوتار تھے۔ زیادہ تر آفرینش عالم سے بحث کی گئی ہے جو اوستھا سے بالکل مختلف ہے۔

[2] تاریخ ایران سر جان ملکم جلد اول باب دوم۔ تاریخ سنی ملوک الارض والانبیا رحمزہ اصفہانی مطبوعہ برلن ۱۳۴۰ھ صفحہ ۱۰۔

اردشیر سنہ ۰۰ کی تالیف بتایا جاتا ہے لہٰذا ان دونوں کتابوں کو پہلوی لٹریچر کا اعلیٰ نمونہ سمجھنا چاہیے۔ کارنامۂ اردشیر دستبرد زمانہ سے بچ رہا ہے۔ جس کا جی چاہے کسی ایک بحث پر اس کارنامہ اور شاہنامہ دونوں تصانیف کو پہلو بہ پہلو رکھ کر سرجان ملکم اور پروفیسر براؤن کی طرح مقابلہ کرلے۔ ان دونوں کے بیان کے مطابق کیومرث کی طرف سے اس کے حریف کے مقابلے میں شیر اور بھیڑیے بھی لڑے اور اس کے دشمنوں کا نام و نشان جہاں سے مٹا دیا۔ جمشید ضحاک، فریدون، زال و رستم، ہفتخوان، اسکندر و دارا کی مشہور بے تکی کہانیوں کی عام شہرت محتاج تکرار نہیں۔

تاریخی قصوں میں رنگ آمیزی جائز ہو تو ہو مگر آج تک کسی نے خود سنین و تواریخ میں مبالغہ جائز نہیں رکھا۔ شاہانِ شاہنامہ کی مدت پادشاہی قابل دید ہے:-

(۱) شاہان پیشدادی۔ جملہ مدت سلطنت ۱۸۳۲ سال		(۲) شاہان کیانی۔ جملہ مدت سلطنت ۷۳۲ سال	
سلطنت جمشید	۱۰۰۰ "	سلطنت کیقباد	۱۰۰ "
" فریدون	۵۰۰ "	" کیکاؤس	۱۵۰ "
" منوچہر	۱۲۰ "	" لہراسپ	۱۲۰ "
		" گشتاسپ	۱۲۰ "
		" بہمن اردشیر دراز دست	۱۱۰ "

طبری، ابومعشر، حمزہ اصفہانی اور دوسرے مسلم مورخین نے بھی پہلوی ماخذوں ہی سے کم و بیش یہی مدتیں نقل کی ہیں۔ ثعالبی نے اپنی تاریخ میں زال و سیمرغ کی داستان نقل کر کے معذرت کی ہے کہ "میں ان افسانوں سے بری الذمہ ہوں۔ اگر تاریخ ایران میں یہ داستانیں یوں ہی علی التواتر بیان ہوتی چلی نہ آتیں تو میں ان کا ذکر نہ کرتا۔ اس زمانہ کی عجیب عجیب باتیں منقول ہیں۔ مثلاً ہزار ہزار سال کی عمریں اور جن و شیاطین کا پادشاہوں کے تابع ہونا وغیرہ"۔ اسی طرح البیرونی جو خود ایرانی نژاد اور محب وطن ہے ہفتخوان رستم کے ذکر

کے بعد لکھتا ہے۔ ولهم فی التاریخ اعمار الملوك وافاعيلهم المشهورة عنهم ما یستنفر عن استماعه القلوب وتمجه الاذان ولا تقبله العقول[۱] یعنی ایرانیوں کی تاریخ میں پادشاہوں کی عمریں اور ان کے کارنامے ایسے درج ہیں جن کے سننے سے دل اکتاتا ہے، نہ کان ان کو گوارا کرتے ہیں نہ عقل قبول کرتی ہے۔ حمزہ اصفہانی اپنی کتاب سنی ملوك الارض والانبیاء میں صاف لکھتا ہے کہ ان کی تمام تاریخی کتابیں محرف اور غیر صحیح ہیں ...... مجبوراً میں نے یہاں بادشاہوں کے صرف وہی حالات مختصراً جمع کر دیئے ہیں جو ان کتابوں میں موجود نہیں۔ باقی فضول باتیں ان کی تمام کتابوں میں بھری پڑی ہیں۔ ان کے خطوط اور وصیت نامے وغیرہ جو کتب تاریخ میں مذکور ہیں ان سے ہم نے اپنی کتاب کو پاک رکھا ہے[۲]۔"

یونانی و پارسی تواریخ میں تناقض

ایران قدیم سے یونان کے تعلقات بہت گہرے رہے ہیں۔ صدیوں حاکم و محکوم کا واسطہ رہا ہے۔ اسکندر ایران کے علوم دین کو تلف کر کے باقی تمام علوم و فنون یونان اٹھوا لے گیا اور یونانی و قبطی زبانوں میں ان کے ترجمے کرائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس عہد کی تاریخ ایران کے لیے دنیا میں بہترین مواد و مواقع یونانیوں ہی کو حاصل تھے۔ چنانچہ قدیم مورخین یونان نے اپنے عصر کے ایران کے جو تاریخی حالات چھوڑے ہیں وہ ہر اعتبار سے ایرانی بیانات سے زیادہ معتبر سمجھے جانے کے لائق ہیں۔ مگر وہ بالاکثر ان پارسی روایات سے متناقض ہیں۔ ثعالبی کا بیان ہے کہ "ہمارے پاس تاریخ ایران کے متعلق دو ماخذ ہیں۔ ایرانی و یونانی۔ ہم جانتے ہیں کہ دونوں میں اختلاف ہے، لیکن صاحب البیت ادریٰ بمافیہ۔ گھر کا حال گھر والا ہی خوب جانتا ہے۔ اس لیے ہم نے یونانیوں کے مقابلے میں ایرانیوں کا زیادہ اعتبار کیا۔" لیکن جب صاحب البیت سیکڑوں اور ہزاروں سال پیشتر کے اسلاف کی مربیانہ داستانیں غلو اور اغراق کے ساتھ بیان کر رہا ہو تو اس کے اس بزرگ ہمسایہ کی شہادت

---

[۱] آثار الباقیہ مطبوعہ لیپزگ صفحہ ۱۰۰

[۲] سنی ملوک الارض حمزہ اصفہانی مطبوعہ برلن ۱۳۴۰ھ صفحہ ۴۳ - [۳] ایضاً

ے بتبہ کہیں زیادہ معتبر قرار دی جائیگی جو اس کے اسلاف کا ہمعصر یا قریب العصر ہو
فن و اقعیت کے اعتبار سے پارسی تاریخوں اور کلیلہ دمنہ جیسی کہانیوں میں چنداں فرق نہیں معلوم
ہوتا۔

محمد اسلم - ایم اے۔

کلام فانی

نتیجہ فکر مولوی شوکت علی فانی بی اے - ایل ایل بی

اب انھیں اپنی اداؤں سے حجاب آتا ہے
چشم بد دور دلہن بنکے شباب آتا ہے

ہجر میں بھی مجھے امدادِ اجل تھی درکار
میری تربت پہ نہ آ تجھسے حجاب آتا ہے

دید آخر ہے اُلٹ دیجیے چہرے سے نقاب
آج مشتاق کے چہرے پہ نقاب آتا ہے

کس طرف جوشِ کرم تیری نگاہیں اُوٹھیں
کون محشر میں سزاوار عتاب آتا ہے

موت کی نیند بھی اب چین سے سونا معلوم
کہ جنازہ پہ وہ غارتگر خواب آتا ہے

جلوہ رنگ ہی نیرنگِ تقاضائے نگاہ
کوئی مجبور تماشائے سراب آتا ہے

ہو گیا خون ترے ہجر میں دل کا شاید
اب تصور بھی ترا نقش بر آب آتا ہے

دل کو اس طرح ٹھہر جانیکی عادت تو نہ تھی
کیوں اجل کیا مرے نامہ کا جواب آتا ہے

ملتی جلتی ہے مری عمر دو روزہ فانی
جی بھر آتا ہے اگر ذکر حباب آتا ہے

رومۃ الکبریٰ

(گذشتہ سے پیوستہ)

سینٹ پیٹرس نیرو - روما کا تاجدار اُس عہد کا ہلاکو تھا تاریخ اس کے خوفناک کارناموں کی تفصیل بیان کرتی ہی جو اس قابل ہی کہ اب تمام یورپ کے دفاتر خانہ میں موٹے حرفوں میں لکھکر دیواروں پر آویزاں کردیجائے۔ ۶۴ء عیسوی میں نیرو نے سارے روما کو جلاکر خاک کر دیا، اور دوسرے برس اپنے لیے ایک سنہری محل تعمیر کیا، جس کی چند اینٹیں ابتک پڑی ہوئی ہیں۔ ۲۷ء میں شاہ ایرین نے دارالسلطنت کا ایک مینار تعمیر کرایا، ۳۱۲ء میں قسطنطین نے اپنے جھنڈے پر صلیب کی شکل بنائی۔ مسیح علیہ السلام کے مشہور حواری سنیٹ پیٹر - کہا جاتا ہی کہ ۴۲ء میں روم آئے تھے، ان کی تعلیمات کا اثر وفات کے ۲۷۰ برس بعد مترتب ہونا شروع ہوا اور قسطنطین نے اپنے عہد میں اُس عبادت گاہ کی بنیاد ڈالی آیندہ مسیحی دنیا کا سب سے بڑا کلیسا سمجھا گیا اور واقعہ یہ ہی کہ شاید آج دنیا میں کوئی مذہبی عمارت اتنی خوبصورت اور اتنی بڑی موجود نہیں۔ لیکن سنیٹ پیٹرس صدیوں کی تدریجی تعمیر کا نتیجہ ہی، شروع میں ایک چھوٹا سا مقبرہ اس مقام پر بنایا گیا جہاں قدیم روایات کے مطابق سنیٹ پیٹر مدفون سمجھے جاتے تھے، اُسی کے پہلو میں نیرو کے عہد جاہلیت کا ایک مندر تھا جو بعد میں منہدم کردیا گیا اس کے بعد ۱۲۵۰ء تک مسیحیت کی یہ پہلی یادگار بدستور قایم رہی لیکن وہ بہت کمزور ہو چلی تھی اور اندیشہ تھا کہ منہدم ہو جائیگی۔ اس زمانہ میں نکولاس پنجم پاپا کی مسند پر متمکن تھا اُس نے نئے نقشے تیار کرانے شروع کیے اور پوپ جولیس دوم نے اس عظیم الشان عمارت کا سنگ بنیاد رکھا جو درحقیقت دیکھنے والے کو محو حیرت کر دیتی ہے۔ پھر بھی یہ عمارت ۱۶۲۶ء تک مکمل نہ ہو سکی جب پوپ اربن ہشتم نے اس کا افتتاح کیا۔ "مقدس سلطنت روم" کا ستارہ اقبال روشن اور بلند تھا اور اس عمارت کے در و دیوار نے عیسائیت کے بڑے بڑے مذہبی حاکموں کے جاہ و جلال کا منظر دیکھا۔

یاب کا [illegible] دوڑنے والے اور اونٹ کی نکیل پکڑ کے چلنے والے پیغمبر (صلے اللہ علیہ وسلم) کے جاں نثار یا
کہ نام نہاد جانشینان مسیح اپنے عہد گذشتہ کے اس جاہ و جلال کے مقابلہ میں کتنی ہی حقارت
سے دیکھیں لیکن عالم مسیحیت میں روحانیت پر تو مسیح کے بعد ہی نفس نیم حاوی ہو چکا تھا۔ وہاں
امارت اور دولت کے کرشمے مسیح کے مسند پر بکھرے ہوئے تھے۔ اسی عمارت کے وسط میں وہ
مقام ہے جہاں روما کے بڑے بڑے تاجدار پوپ کے قدم لیتے تھے اور ان کے ہاتھوں سے
اپنے سر پر رکھواتے تھے، ساری عمارت کی وسعت و بلندی کا اندازہ ایک نظر میں کرنا بالکل ناممکن
ہے۔ وسط کے فرش کا طول و عرض شاید اس طرح کچھ سمجھ میں آئے کہ اگر عہد جدید کا بڑے سے
بڑا جہاز وہاں رکھ دیا جائے تب بھی فرش کا کچھ حصہ خالی رہجائیگا۔ سینٹ پیٹرس کی نشستوں
میں ۰ ۵ ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش بتائی جاتی ہے، اور یہ تخمینہ بہت قرین قیاس ہے۔
چھت کی بلندی کا اندازہ یوں کیجیے کہ اگر وسطی گنبد کے اندر جو برآمدہ چھت سے ملا ہوا بنا ہے
اُس پر کھڑے ہو جائے تو نیچے فرش پر چلنے والے انسانوں کی جسامت بکریوں سے بھی چھوٹی نظر
آئے گی! عمارت کے ہر حصہ میں ایک پوپ کا مجسمہ اور ایک خوبصورت یادگار نصب ہے اور نیچے
تہ خانوں میں اُن جانشینان مسیح" کی لاشوں کے بکس رکھے ہوئے ہیں! بہت سے سقف
اور راہب جو دنیا کے ہر گوشہ سے روما آتے تھے (مورخ نے اُس عہد کے متعلق کہا تھا کہ "دنیا
کی ہر سڑک روم کی طرف آتی ہے!) اور یہاں کی خونریزی میں اپنا خون ملا دیتے تھے، وہ سب
بھی اُن ہی تہ خانوں میں سرداران مذہب کے پہلو بہ پہلو پڑے ہیں! صدر عمارت میں سنہری
شامیانہ کے پاس دیوار میں ایک فاختہ کی تصویر چسپاں ہے، یہ فاختہ مسیحیت کی اصطلاح میں
"مقدس فاختہ" کہی جاتی ہے، مدبرین اپنی اصطلاح میں آجکل اُس کو "امن کی فاختہ" کہتے ہیں،
یہ وہی امن کی فاختہ ہے جو کبھی مسیحی دنیا میں امن قائم نہ رکھ سکی! جنھوں نے سب سے پہلے
اس مقدس فاختہ کا گھونسلا سینٹ پیٹرس میں بنایا اُن کے ہاتھ بھی کہنیوں تک خون میں رنگے
ہوئے تھے۔ میں جب اُس عمارت کی بے مثل صناعیوں کو دیکھتا پھرتا تھا تو میرا خیال بار بار

اس فاختہ کی طرف جاتا تھا کاش کہ جناب پاپا اُس کا پنجرہ لیے ہوئے روم میں نہ بیٹھے رہتے بلکہ اُس کو لیکر ایک دفعہ بلجیم اور فرانس کے اُن میدانوں میں بھی آتے جہاں انسانی ہڈیوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں! مگر غریب فاختہ تو عہد قدیم میں خود اپنے گھر کے اندر امن نہ رکھ سکی، اس عہد کے گناہگار اُس کے پروں کے سایہ کے نیچے کیونکر پہنچیں! اب تو پاپا خود کبھی سال دو سال میں اس عبادتگاہ کے اندر آتے بھی ہیں تو خفیہ سرنگوں کے ذریعہ سے!

ویٹیکن

سینٹ پیٹرس کی سیر کرتے ہوئے ہم پاپائے روما کے ایوان کی طرف جا نکلے، اور معاً یہ معلوم ہوا کہ آج سے دو ہزار برس پہلے کوئی شہر آباد ہوا تھا اُسی میں ہم آج پھل پھر رہے ہیں۔ مجھے یہ ادا بہت پسند آئی کہ پوپ نے اپنے گرد و پیش اپنے عہد جاہ و اقبال کی یاد کو ہر طرح تازہ رکھا ہے۔ وہی چھوٹی چھوٹی اینٹوں کی دیواریں، وہی پرانی قسم کے دروازے اور راستے ہیں، سڑکوں پر وہی اینٹوں کا فرش ہے، سوائے ایک چیز کے کہ عمارت کے اندر بجلی کے تار لگے ہوئے ہیں، کوئی چیز جدید نہیں، حتےٰ کہ پوپ کی مختصر فوج کے سپاہی جو دروازہ پر پہرا دے رہے تھے۔ وہی عہد قدیم کی رنگین وردیاں پہنے ہوئے تھے، اس زمانہ کی گاڑیاں اور موٹریں جو اندر صحن میں کھڑی ہوئی تھیں وہ تو ایسی معلوم ہوتی تھیں کہ گویا کسی تصویر پر بدنما دھبے ڈال دیئے گئے ہوں، اُس سارے منظر سے یہ چیزیں جدا اور بے تعلق معلوم ہوتی تھیں۔ پاپائے اعظم کی صورت نہ دیکھ سکا، لیکن اگر چاہتا تو دیکھنا مشکل نہ تھا اس لیے کہ جو شخص چاہے ملاقات کی درخواست کر سکتا ہے۔ خود پوپ اپنے محل سے باہر کبھی نہیں جاتے سوائے ایک پائیں باغ کے جس میں کبھی کبھی انکا ہوا دار نظر آتا ہے، شہر روما سے انکا کوئی تعلق نہیں اور ان کے محلہ سے سلطنت اٹلی کوئی واسطہ نہیں رکھتی۔ گویا اطالیہ کے موجودہ دارالسلطنت کے اندر ایک چھوٹی سی خود مختار ریاست ہے جس کے سیاہ سپید کا اختیار پاپا کے سوا کسی کو نہیں۔ یہ داستان بھی بہت دلچسپ ہے اور اگر موقعہ ہوتا تو میں اس زمانہ میں اُس کی کچھ تفصیل بیان کرتا، عہد جدید میں وہ "نان کوآپریشن" کی ایک بہت بڑی مثال ہے۔

پاپ نے جو کبھی ساری مقدس سلطنت روم کا مالک و مختار تھا اب اپنے آپ کو ایک محلے کے اندر بند کر لیا ہے اور ہر پوپ معہ اپنے تمام عہدہ داروں اور درباریوں کے سینٹ پیٹرس کی مسند پر بیٹھنے سے پہلے عہد کرتا ہے کہ وہ کبھی اور کسی حال میں غاصب شاہ اٹلی کی حکومت کو قبول نہ کریگا گویا کہ اس دربار کے نزدیک سلطنت اٹلی کا کوئی وجود نہیں۔ جو کچھ ہے پوپ ہے! شاہ اٹلی کی سلطنت کتنی ہی وسیع اور طاقتور ہو گیا کہ یہاں اُس کو کوئی جانتا ہی نہیں!

ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے!

قدیم مسیحیت کا یہ ٹوٹا ہوا مینار ابھی تک سر اُٹھائے کھڑا ہے اور اس کے گرد و پیش ایک نئی دنیا آباد ہے جس پر وہ نفرت کے ساتھ نظر کرتا ہے۔ جناب پاپا جنگل کے اس مور کی طرح ہیں جو ناچا اور کسی نے اُس کو نہ دیکھا۔ سارے مراسم و مشاغل شاہانہ اسی چار دیواری کے اندر جاری ہیں اور جا رہے وہ چند ہی ہوں مگر انکے دربار کے درباری وہی ڈراما کھیلتے رہتے ہیں جو کبھی اس طرح کھیلا گیا تھا کہ دنیا گونج اُٹھی تھی، گو کہ اس تھیٹر کے پردے اب بوسیدہ اور بے رنگ ہو گئے ہیں، اور ایکٹر بھی وہ نہ رہے اور جو ہیں وہ از کار رفتہ ہیں، لباس اور سامان آرائش بھی پُرانا ہو گیا، لیکن پُرانا کھیل تماشہ جاری ہے۔ پاپائے روما کی یہ وضعداری مجھے بھلی معلوم ہوئی! محل کے جو حصے دیکھے جا سکتے تھے اون کو میں نے بہت دلچسپی کے ساتھ دیکھا، لیکن وقت کم تھا اور ہزاروں آثار قدیمہ کو دیکھنا تھا جن کا دامن ساری دنیا کی تاریخ کے ساتھ وابستہ ہے!۔ البتہ ایک چیز کا اور ذکر کر دوں۔ ہم نے سینٹ پیٹرس میں جو تصویریں لگی ہوئی دیکھیں ان سب کو قلمی تصور کیا، بعد کو معلوم ہوا کہ وہ سب رنگین پتھروں سے بنائی جاتی ہیں۔ اس صناعی کو موزیک کہتے ہیں اور اس کا بہت بڑا کارخانہ خود پوپ کے محل میں ہے جس کو ہم نے اچھی طرح دیکھا، درحقیقت حیرت انگیز صناعی ہے۔ معمولی الفاظ میں سمجھانا مشکل ہے کہ پتھر کے ٹکڑوں سے تصویریں اور ایسی خوبصورت تصویریں کہ من و عن قلمی معلوم ہوں، کیونکر بنائی جا سکتی ہیں۔ ہم نے دیکھا صناع اس چابکدستی سے اُن تصاویر کو تیار کرتے تھے۔

کہ اٹلی کے بہترین مصور کی تصویر کو بجنسہ نقل کر لیتے تھے، ہزاروں مختلف رنگ کے پتھر کے ٹکڑے ان کے سامنے رکھے ہوتے ہیں اور ایک چوکھٹے میں کوئی چپکانے والا مصالحہ لگا ہوتا ہے، صناع اُن ٹکڑوں کو اُٹھاتا ہے اور اُس چوکھٹے میں چپکا دیتا ہے، رنگوں کی آمیزش اس خوبی سے کرتا ہے کہ وہ ٹکڑے ملتے چلے جاتے ہیں اور تصویر کا صحیح نقشہ نمایاں ہوتا جاتا ہے ممکن نہیں کہ ٹکڑے غلط لگ جاویں یا تصویر کی رنگ آمیزی ناقص ہو جائے۔

کلوزیم قدیم مسیحیت کے اس دارالسلطنت سے نکل کر ہم کلوزیم دیکھنے گئے۔ کلوزیم کیا ہے۔ آؤ آج سے ایک ہزار ۸ سو چالیس برس پہلے جو دنیا آباد تھی گھڑی بھر کے لیے وہاں بھی چلیں، اور دیکھیں کہ شہنشاہ ٹیٹس کے دارالسلطنت میں کیا ہو رہا ہے؟ کلوزیم کی سیڑھیوں پر اندر کی طرف نشست کی ایک جگہ بھی خالی نہیں وسط میں سب سے بلند شہنشاہ روما اپنے تخت پر ریشم کے شامیانہ کے نیچے متمکن ہے، قرمزی رنگ کا ایک لباس پہنے ہوئے ہے اور دبدبہ قیصری کا یہ عالم ہے کہ سلطنت کا بڑے سے بڑا سردار بھی تخت شاہی کے قریب آنے کی جرأت نہیں رکھتا، نیچے کی سیڑھی پر روم کی "کنواریاں" بیٹھی ہوئی ہیں جن میں سے ہر ایک سلطنت کے لیے ایک ستارہ سعادت ہے، شہنشاہ کے بعد تمام سرداران سلطنت پر فضیلت ان ہی کو حاصل ہے۔ "سن رسیدہ کنواریاں" جنھوں نے اپنی عمر میں بہت سے تماشے دیکھے ہیں خاموش اور سنجیدہ ہیں، لیکن ان میں سے نوجوان لڑکیاں جن کو اس قوم کی توہم پرستی نے عمر بھر کے لیے دنیا سے جدا کر دیا ہے جھکی ہوئی اس خونخوار تماشہ کو دیکھ رہی ہیں جو روم کی قوم کا قومی کھیل ہے! انکا سانس کس قدر جلد جلد آ رہا ہے، ذرا دیکھنا ان کے چہروں کی رنگت کیوں بدل رہی ہے وہ دیکھو نیچے اکھاڑے میں اُس نوجوان کا پاؤں پھسل گیا جو ابھی ابھی شیر ببر پر تلوار کھینچ کر جھپٹا ہے، خون کی کیچڑ اتنی ہے کہ پاؤں کا جمانا مشکل ہو گیا ہے، یہ لو، اس خونخوار بھینسے کی پیٹھ پر ایک دوشیزہ زنجیر دل سے جکڑی ہوئی ہے اور وہ بھینسا اب اُس سورما کی جانب آ رہا ہے جس کے ہاتھ میں ایک تیغہ ہے مگر وہ اس بھینسے کے سینگ نے پہلوان کے سینہ میں شگاف کر دیا، نوجوان کنواری

ہوا گھبرا کر چاروں طرف دیکھتی ہے، دل میں کہتی ہے ہائے کیا اس زنجیروں سے جکڑی ہوئی
تیرہ کو کوئی نہ بچا سکیگا، کیا روما قوم کا کوئی سورما بھینسے کی خونخواری کا مقابلہ نہ کرسکیگا ..
...... اُن کنواریوں کی نشست سے نیچے، روما کے معمر سردار اور منصب دار اپنی ٹھوڑیوں
تلواروں کے دستوں پر رکھے ہوئے "تماشہ" دیکھ رہے ہیں۔ ان کے بعد نیچے کی صفوں میں
دارالسلطنت کے ہزاروں شہری صف در صف بیٹھے ہوئے ہیں۔ اکھاڑے میں خوفناک درندے
بڑے بڑے نوجوان پہلوانوں کو چیر رہے ہیں اور چبا رہے ہیں، جو سورما ابھی ابھی اپنی تلوار چمکاتا
ہوا آگیا تھا درندوں کے تیز پنجوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے! اور ہر کھلاڑی جب اس طرح شکار ہوتا
ہے تو آفرین مرحبا کی ۸۰ ہزار آوازیں، نعرے، اور چیخیں پیہم بلند ہوتی ہیں۔ سب سے آخر
میں اس خونیں تماشے کا آخری منظر! ایک طرف سے اکھاڑے کا دروازہ کھلتا ہے اور چند
دس بیس پچیس نوجوان اور سن رسیدہ عورتیں، دو مرد بلکہ اور بالکل سپید لباس پہنے ہوئے
داخل ہوتی ہیں، معاً دوسرا دروازہ کھلتا ہے اور دس بیس شیر، مست جنگلی بھینسے اور ریچھ نمودار
ہوتے ہیں، یہ تماشہ چند لمحہ کا ہنگامہ ہے، ایک دفعہ پلک ماری چند چیخوں کی آواز آئی، اور تماشا
ہوگیا۔ اب سوائے اُن درندوں کے غرانے کے جنکے مُنہ سے گوشت کے ٹکڑے اور انسانوں
کے ہاتھ پاؤں لٹکتے نظر آتے ہیں، ہر طرف سکوت ہے، درندوں کو گرم لوہے کی سلاخوں سے
دروازے کی طرف ہٹایا جارہا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ ہٹتے جاتے ہیں، دیکھو نا، یہ معلوم ہوتا ہے کہ
بڑے بڑے بلّوں کے مُنہ میں چھوٹے چھوٹے سفید چوہے ہیں، اور اُن سے خون کی دھاریں گر رہی
ہیں۔ آخر شکار ختم ہوگیا، دونوں طرف کے دروازے بند ہوگئے اور اب اکھاڑا خالی ہے، کانوں
پر ہاتھ رکھ لو، پردے نہ پھٹ جاویں، روما ۸۰ ہزار بہادر شہری اِس "تماشہ" کی داد دے
رہے ہیں! شہنشاہ اپنے غلام کی جانب متوجہ ہوتا ہے اور غلام ادب کے ساتھ ایک ہاتھ سینہ پر رکھ
کر مئے ارغوانی کا جام لبریز پیش کرتا ہے، بہادر شہنشاہ جام کو منہ سے لگاتا ہے اور کچھ اس طرح مست
ہو کر پیتا ہے کہ شراب کے چند قطرے اُسی طرح اُس کے مُنہ سے بھی گرتے ہیں۔ جس طرح شیروں کے

منہ سے انسان کا خون بہ رہا تھا! تم پوچھتے ہو یہ سب لوگ کون تھے جنکو شہنشاہ گیتی پناہ نے درندوں
کے دسترخوان پر رکھوا دیا؟ میں ایک مورخ کی زبان سے جواب دیتا ہوں'

یہ سب عیسائی تھے جو مسیح کا پیام لیکر روما میں آئے تھے! تماشہ دیکھ لیا' اب عالم خیال سے واپس
آئے اور اینٹوں اور پتھروں کی اُن سر بفلک دیواروں کو دیکھیے جو روما کے اقبال اور بہادران
روما کے سپاہیانہ (۱) مشاغل کی آخری یادگار ہیں! کلوزیم! اس نام سے رونگٹے کھڑے ہوتے
ہیں، لیکن فلسفی کہتا ہے کہ کلوزیم کے تماشہ دیکھنے والوں کو گالیاں نہ دو! وہ تو اُس عہد کی یادگار
ہے جب انسانیت نے حیوانیت کے حدود سے ذرا ہی قدم آگے رکھا تھا، جسم کے لمبے بال اور
نوکدار ناخن باقی نہ تھے مگر طبائع کے اندر بہیمیت کے بہت سے عناصر ہنوز موجود تھے' اور کچھ کم بھی وہ
عناصر موجود تو اب بھی ہیں' مگر، میں کہتا ہوں کہ ایسے انسانی صورت درندے تو ایشیا میں بستے
تھے' یورپ کے آبا و اجداد کو اس حیوانیت سے کیا نسبت' وہ تو کچھ اور ہی ہوں گے. جنکی اقبالمندی
اور علو ہمتی کی قسم آج تک کھائی جاتی ہے!

عیسائیوں کو ناز ہے کہ انھوں نے مذہب کی خاطر کیسی کیسی سختیاں جھیلی ہیں! اور آخر ساری
دنیا کو مہذب بنا دیا! لیکن آج اگر پاپائے روما کلوزیم میں بے قصور عیسائیوں کے درندوں
کے سامنے ڈالے جانے کا ذکر فرمائیں تو میں عرض کروں کہ عیسائیت کے بہترین زمانہ میں
اسپین احتساب غیر عیسائیوں کے لیے درندوں کی بجائے آگ سے کام لیتی تھی' اتنا ہی تو فرق
ہے! اور اُن آلات عقوبت کا کیا ذکر جن کی تفصیل خود مورخین یورپ نے لکھی ہے!!

شہنشاہ فلیوس وسپاسیانو نے ۷۲ء میں کلوزیم کی بنیاد ڈالی، تاکہ اسکو دربار اور اہل روما
کے لیے تفریح کی ایک عمارت عامہ قرار دیا جائے اور اُس زمانہ کی انسانیت کے معیار کے
مطابق اس میں سپاہیانہ کھیل تماشے (۲) اور بہادری و جرأت کے مظاہرہ ہوا کریں. ۸۰ء میں
شہنشاہ وسپاسیانو کے بیٹے ٹیٹس نے اس عمارت کا افتتاح کیا. تقریب افتتاح اس طرح
منائی گئی کہ تقریباً ۵ ہزار جنگلی درندے اکھاڑے میں چھوڑے گئے اور ہزاروں تو روما -

بن کو اس زمانہ کی اصطلاح گلیڈیٹر Gladiator کہتے تھے) اُن درندوں سے دست بدست مقابلہ کرنے کے لیے اندر داخل ہوئے۔ پھر جو تماشہ اہلِ رو ما نے دیکھا وہ اندازہ تخیل سے باہر ہے! ہزاروں درندے ہزاروں انسانوں کو پھینتے ہوئے ہیں ان کی تلواریں اُن کے جسم میں ان کے پنجے اُن کی کھال میں پیوست ہیں گوشت کے پرزے ادھر اُدھر اُڑ رہے ہیں اور ن کے فوارے تماشائیوں کے صفِ اول تک پہنچتے ہیں ہزاروں انسان اور درندے اس تن فنا ہوئے کہ لاشیں بھی پہچانی نہ جاتی تھیں! الغرض اہلِ روما کے تماشہ گاہ کا افتتاح یوں ل میں آیا! عمارت ایک سو ستر گز بلند ہے اور اس کا محیط ۵۰ اگز ہے۔ دیواروں کا زیادہ حصہ بھی تک محفوظ ہے اور آثارِ قدیمہ کے ماہرین نے ایک چھوٹے سے حصہ کو اسی طرح پھر تیار کر دیا ہے طرح کہ اُن کے خیال میں وہ شہنشاہ ٹیٹس اور اس کے جانشینوں کے عہد میں تھا۔

رومی حمام | مہذب رومن شہری جب کلوزیم کے تماشوں سے سیر ہو جاتا تھا تو اپنا وقت اُن حماموں میں صرف کرتا تھا جن کے نام سے آج تک یورپ کے بہترین حمام منسوب کیے جاتے ہیں، لیکن ان حماموں کے آثار دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ دولت و سطوت و نقش پرستی کے اِس عہدِ جدید میں بھی حمام کی وہ عظیم الشان عمارتیں خواب و خیال سے باہر ہیں، لندن و پیرس کے جو حمام ہم نے دیکھے وہ تو روما کے قدیم حماموں کے مقابلہ میں محض کھلونا ہیں، یہاں تو بہتر سے بہتر متعدد حمام موجود تھے لیکن کراکلا کا حمام عامۃ الناس کے لیے تعمیر کیا گیا تھا جس میں ۲۳ ہزار آدمی روزانہ اور اکثر بیک وقت غسل کرتے تھے، ناشتہ ہر شخص کو مفت ملتا تھا! سینکڑوں سنگ مرمر کے ستون، متعدد بڑے بڑے حوض گرم پانی کے نل، سنگ مرمر کے فرش کی بے مثال پچہ کاری، بیٹھنے کے لیے کرسیاں، چبوترے جن پر لیٹ کر خوشبوئیں ہوا کی جاتی تھیں، وسیع برآمدے جہاں ناشتہ کھایا جاتا تھا، یعنی جب وہ حمام اپنی پوری آرایش کے ساتھ آباد ہو گا تو میں کہہ سکتا ہوں اس کا ہر کمرہ دیوانِ عام اور دیوانِ خاص سے وسعت اور خوبصورتی میں کسی طرح کم نہ ہو گا۔ اور کہنے کو کچھ بھی نہ تھا اہلِ روما کا محض حمام

تھا ! قیمتی پتھروں کے نہانے کے حوض اور "ٹب" اور طشت آج تک پاپائے روما کے عجائب خانہ میں موجود ہیں۔ اور ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان قیمتی پتھروں کے اتنے بڑے ٹکڑے کہاں سے ملے کہ ایک آدمی کی پوری جسامت کے قابل غسل کرنے کا حوض ایک ہی ٹکڑے میں سالم بنا لیا گیا۔ عہد قدیم کی ان عجائبات کو دیکھیے اور حیران رہ جائیے !

قاضی عبدالغفار

لوزان کانفرنس

مغرب کے کارکنانِ قضا و قدر جب کبھی اقوامِ مشرق کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے بیٹھتے ہیں تو ان کی ایک ہاں اور ایک نہیں پر کروڑہا انسان کے سرتن سے جدا ہو جاتے ہیں، پیاسی زمین معصوم انسانوں کے لہو سے سیراب ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ بندگانِ خدا جن کی قسمتوں کا فیصلہ ہونے کو ہے، کبھی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے کہ یہ شاطرانِ مغرب کن کن چالوں سے بازی جیت لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ابھی حال میں مشرقِ قریب کے فیصلے کے لیے جو کانفرنس لوزان میں منعقد ہوئی تھی، ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو اس کی اصل حقیقت و واقعات سے واقف ہیں۔ مضمون ذیل لندن کے ایک معتدل رسالہ ماہنامہ سنچری (مارچ ۱۹۲۳ء) کا ترجمہ ہے جو قارئین "جامعہ" کے لیے بتمامہ درج کیا جاتا ہے۔

(سعید)

اکتوبر ۱۹۱۸ء کے صلحنامہ میں جو بنیادی مسائل تھے اُن میں سے ایک آبنائے کی آزادی اور دوسرے حقوقِ اقوام کے تحفظ کا مسئلہ تھا۔ جو اناطولیہ اور تھریس کے غیر ترکی صوبوں میں تاوقتیکہ (دیکھئے دفعہ ۷) یورپ میں اتحادیوں کا مفاد خطرہ میں نہ ہو یا آرمینی ولایتوں میں بدنظمی نہ پیدا ہو عمل کیا جانے کو تھا۔ اس موقع پر ترکوں نے اس بری طرح شکست کھائی تھی اور اس قدر کمزور اور پست ہمت ہوگئے تھے کہ ان سے تقریباً ہر قسم کے شرائط کا منوانا بہت آسان تھا۔ لیکن پیرس میں دولِ متحدہ کی حرص و آز نے کسی ایسے صلحنامہ کو عمل میں نہ آنے دیا۔

بجائے اس کے کہ اتحادی شرائطِ صلح کے پابند رہتے "انھوں نے قسطنطنیہ، اناطولیہ اور تھریس کے متعدد اضلاع پر قبضہ کرنا شروع کر دیا جو مجوزہ حدود سے باہر تھا حالانکہ کسی حیلہ جوئی سے بھی جو انھوں نے (دفعہ ۷) میں رکھی تھیں وہ ایسا کرنے کے مجاز نہ تھے۔

روس کے یکایک انقلاب ہو جانے کی وجہ سے یہ معاہدۂ جنگ عمل میں آیا جس کی رو سے یہ طے پایا کہ قسطنطنیہ، روس کو دیا جائے مشرقی اناطولیہ کا ایک حصہ خالی کر دیا جائے

اور اپریل ۱۹۱۷ء کا عہد نامہ سنیٹ ماریں بھی ختم ہو گیا جس کی رو سے سمرنا اور ضلع آدالیہ اٹلی کو دیا جانے والا تھا، اور اس وجہ سے قسطنطنیہ اور خطہ ابنائے کا مسئلہ ہنوز زیر تجویز ہی رہا۔ اس وقت عام رجحان یہ تھا کہ دارالخلافہ عثمانیہ کسی یورپی طاقت کو نہ دیا جائے اور اگرچہ مسٹر لائڈ جارج اس حد تک آ گئے تھے کہ قسطنطنیہ اور ایشیائے کوچک ترکوں کو واپس دیدیا جائے، انگلستان اور فرانس دونوں معاہدۂ جنگ سے نجات پا جانے پر شاداں تھے اور ترکی کو مال مفت کی طرح باہمی مفاد کے لیے دول یورپ میں تقسیم کیا جا رہا تھا۔

اختتام جنگ کے قریب یونان کی غیر جانبداری تسلیم کر کے اس میں ایک نئے عنصر کا اضافہ کر لیا گیا اور اس کو مقدونیہ میں فوجی نقل و حرکت کی اجازت دیدی گئی جو ایک حد تک مفید ثابت ہوئی۔ اتنی بات ایم وینزلاس کے لیے کافی تھی کہ وہ مجلس عالیہ (سپریم کونسل) کے سامنے اپنے ناقابل قبول مطالبات پیش کریں یعنی یہ کہ قسطنطنیہ، پورا تھریس، جنوبی البانیہ، ڈاڈ کینیز بندر سمرنا اور اناطولیہ کا کچھ حصہ یونان کو دیا جائے اسے درحقیقت صرف سمرنا اور تھریس کے ملنے کی توقع تھی لیکن وہ وہی مشرقی چال چلا۔ مرکس گرنا یہ تب راضی شود ۔ انگلستان اور فرانس دونوں اس سے خوش تھے کہ ایشیائے کوچک میں اٹلی کا قائم مقام اب یونان ہو گیا ہے لیکن اٹلی نے اس سے اتفاق نہ کیا اور ترکی کے تمام سول اور فوجی ملازمین نے خواہ برطانوی ہوں یا غیر برطانوی اس سے اختلاف کیا کہ ایشیا کا کوئی حصہ یونان کو دیا جائے جس کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ نہ صرف دولت عثمانیہ میں بلکہ تمام اقوام اسلامی میں خطرناک جذبات مشتعل ہو جائیں گے۔ صرف اٹلی کا اختلاف پیرس میں یونان کے مطالبات کو رد کرنے کے لیے کافی تھا۔ لیکن ۱۹۱۹ء میں تمام دول کے نمایندگان نے باوجود اپنے اپنے مقامی تجربہ کاروں کی اختلاف رائے کے سمرنا یونان کو دیدیئے جانے کا تصفیہ کر دیا اور مئی میں یونانی فوجوں نے برطانوی بیڑے کی زیر سرکردگی، جس میں فرانس کا کوئی حصہ نہ تھا، سمرنا پر قبضہ کر لیا اور جلد ہی اندر کی جانب پھیلنا شروع ہو گئے۔

اس یونانی انڈے کا ترکی آشیانے میں رکھا جانا ان مظالم اور قتل و خونریزی، کثیر مال و اسباب کی بربادی اور ترکی میں ایک نئی قومی روح کے پیدا کرنے کا اصلی سبب بن گیا۔ یونانیوں کے ایشیاے کوچک میں رکھے جانے کے مجنونانہ فیصلہ کی تمام تر ذمہ داری مسٹر ولسن اور مسٹر لائڈ جارج پر ہے۔ جس کی تائید ایم کلیمنشو نے بھی با دل ناخواستہ کر دی تھی۔

امریکہ کی طرح ترک بھی دول عظمیٰ میں سے کسی ایک کے یا ٹمی کے (حالانکہ اس کے متعلق شبہ ہی مطلع ہو کر ختم ہو گئے ہوتے لیکن یہ قیاس کرنا کہ ترک کبھی ان لوگوں کے مظالم اور بدنظمیوں کو جو صدیوں تک ان کے غلام رہ چکے ہیں برداشت کریں گے ترکی جذبات کی تحقیر اور ان سے عدم واقفیت ثابت کرنا ہے۔ یونانیوں کا رویہ سمرنا میں جو رہا وہ اب اظہر من الشمس ہے گو دول نے بین الاقوامی اتحادی کمیشن کی رپورٹ کو چھپانے کی ہمیشہ کوشش کی لیکن اس کے شائع ہونے سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ سمرنا میں ترکوں کا یونانی مظالم کی جی توڑ مزاحمت کرنی (جو بالآخر کامیاب ہوئی) معقول وجوہ پر مبنی تھی۔ کوئی اور شے انھیں یورپ کے مقابل میں نفرت اور ہمت کے جذبات سے اس سے زیادہ سرشار نہ کر سکتی تھی۔ لیکن اگرچہ وہ قسطنطنیہ اور تھریس کے قبضہ کو معاہدہ کے خلاف سمجھتے تھے لیکن ان کا تمام تر غیظ و غضب یونانیوں پر اُتر آیا۔

ان جذبات نفرت و حقارت کے ساتھ قوم پرستوں کی جماعت مصطفےٰ کمال کے علم کے نیچے آ گئی اور یہ تجویز پاس کی کہ یا تو ہم مکمل آزادی حاصل کریں گے یا اسی کوشش میں مر جائیں گے یہ ظاہر ہے کہ وہ مخلوط حکومت (کولیشن گورنمنٹ) جو ترکی کے مٹانے پر تلی ہوئی تھی اسی نے اسکی ترقی و عروج کے تخم پاشی بھی کی۔ اس موقع پر حکومت ائتلاف نے یہ کچھ نہ دیکھا کہ آیندہ کیا ہوگا اور آنکھیں بند کیے ہوئے ترکوں کو مردہ سمجھتے رہے۔ اپریل ۱۹۲۰ء میں مجلس عالیہ نے ایک عہدنامہ کے دفعات مرتب کیا جو بعد میں عہدنامہ   کے نام سے موسوم ہوا جس کی رو سے یہ قرار پایا کہ ترک سمرنا اور ایونی یونان کو دیدیں اور دوسری تقسیم کے لیے بھی راضی ہو جائیں اس مرتبہ بھی برطانوی اور فرانسیسی فوجی مشیروں نے ان تجاویز کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور

لائڈ جارج نے ان تمام ہدایات کو پس پشت ڈال کر ترکی کو نقشہ سے مٹا دینے اور ان پر خود ان کے قدیم محکوم قوم سے جو کبھی آپ اپنے اوپر بھی بہتر حکومت کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے حکومت کرانے کی پالیسی اختیار کی۔

معلوم ہوتا ہے کہ بالشویکی عنصر بالکل نظر انداز کر دیا گیا حالانکہ اس کی بخشش امید کی جا سکتی ہے کہ سویٹ کبھی ایسے موقع کو ہاتھ سے جانے دیں گے۔ انھوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور ترکوں سے جو اس وقت از حد ضرور تمند تھے انھوں ہر طرح کی امداد کے فیاضانہ وعدے کیے۔ اگرچہ بالشویزم اصول اسلام کے بالکل منافی ہے اور اگرچہ روس ہمیشہ سے ترکی کا جانی دشمن رہا ہے پھر بھی مصطفےٰ کمال نے سویٹ کے ان وعدوں سے انکار نہ کیا اور سامان جنگ کی اعانت منظور کی لیکن روسی فوج یا بالشو یکی پروپگنڈا قبول کرنے سے قطعی انکار کر دیا یہ نامبارک معاہدہ جسے اتحادیوں کی حرکتوں سے مجبور ہو کر ترکوں نے کیا مارچ ۱۹۲۱ء میں بمقام ماسکو عمل میں آیا اور اگرچہ سلطنت برطانیہ کے لیے یہ معاہدہ خطرات سے پُر ہے ہم نے اسی کو بے کار کرنے کے لیے کبھی کوئی کوشش نہ کی۔ ہم نے یہ بالکل نہیں سمجھا ہے کہ ترکی بیداری دنیای اسلام کی بیداری نہیں بلکہ صرف قومی ہے۔ یہ بذات خود ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں بلکہ ترکوں نے اگر طلع جنبانی میں ذرا بھی کوتاہی کی تو دول ائتلاف میں ان کا روس سے تصادم ہونا زیادہ اغلب ہے۔

اس موقع پر بالشویکوں کے میدان میں اُتر آنے کا اثر ۱۹۲۱ء میں یہ ظاہر ہوا کہ اسلام نے تمام عیسائی حکومتوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ یہ کلام بلاشبہ بالشویکوں اور کسی قدر جرمنوں کا تھا نہ کہ ترکوں کا جنھیں یونانی پیشقدمی کے روکنے سے ہی بہت کم فرصت ملی تھی۔

اگرچہ اتحادیوں نے یہ دیکھ کر کہ ایشیا میں واقعات کی رفتار ان کے حسب خواہش نہیں ہے اس جنگ میں اپنی غیر جانبداری کا اعلان کیا، فرانسیسیوں نے جنھیں سائلیشیا میں بہت سے مصائب کا سامنا کرنا پڑتا تھا، ترکی سے ایم فرینکلن بویان کے ذریعہ ایک جداگانہ معاہدہ کر لیا لیکن اس

سے حالات میں کچھ زیادہ تبدیلی نہیں ہوئی بجز اس کے کہ ترکی کو اپنی ایک تھوڑی سی فوج سے کے
شمال میں استعمال کرنے کا موقع ہاتھ آگیا۔ اور ۱۹۲۲ء میں باوجود فریق جانبداری کے انگلستان
کی یونان نوازی نے ان کی مزید حوصلہ افزائی کی۔ اس وقت تک خود یونانیوں کو اپنی ناکامی کا
احساس ہو گیا تھا اور فروری میں اس بدنصیب ایم گونریس نے ایک خط اس مضمون کا لندن لکھا
کہ مادی امداد فوراً نہ بھیجی گئی تو یونانی فوج فوراً خالی کردے گی، وزیر یونان انگلستان کو امداد
کا ذمہ دار اور مزید براں اپنا اتحادی سمجھتا تھا۔ بہر حال اس خط نے وزارت انگلستان پر تما اثر
بھی تو نہیں کیا کہ مسٹر لائڈ جارج اور ان کے رفقا اس کو پڑھنے کے بعد یاد رکھتے۔
بالآخر امداد کی طرف سے مایوس ہو کر یونانیوں نے اتحادیوں کو اکسانے اور جوش
دلانے کا طریقہ اختیار کیا اور وہ یہ کہ ایشیائے کوچک میں تمام صلحناموں کو پس پشت ڈال کر یونانی
حکومت آیونینہ کے بنانے اور پھر قسطنطنیہ پہ حملے کرنے کے ارادہ کا اعلان کر دیا۔ یہ کسی طرح ممکن
نہ تھا اور یونانی افواج کی شکست اور ترکی افواج کی بابعالی کی طرف پیشقدمی کے بعد ہی جناق کا واقعہ
اور معاہدہ مدینیہ پیش آیا جو لوزان کانفرنس کی تمہید تھی۔ یہ واقعات ناظرین کے دماغ میں بھی
تازہ ہیں اس لیے یہاں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔
کانفرنس بعض عجیب و غریب حالات میں منعقد ہوئی اگرچہ دول وسطی کے ساتھ ترکی نے بھی
شکست کھائی لیکن قوم پرستوں نے جنگ ہمیشہ جاری رکھا۔ اور اگرچہ اس جنگ عظیم میں اتحادیوں نے
شکست کھائی لیکن خود بھی دول اتیلاف کے ایک ممبر دار اتحادی کو شکست فاش دی۔
صلح کی کانفرنسوں میں ایک فاتح ہوا کرتا ہے اور دوسرا مفتوح، لیکن لوزان کی مفتوح جماعت
فاتح کی حیثیت میں تھی۔ اور یہی جماعت فاتح کے شریک نے بری طرح شکست کھائی تھی۔ حاصل تر
کبھی اس حیثیت میں نہ آئے تھے کہ وہ بالکل شکست خوردہ ہیں اور فاتحین جو شرائط چاہیں ان سے
منوالیں۔ معاہدہ سیورے کی ناکامی کے بعد سے دول نے حالات کی اسقدر تبدیلی تو تسلیم کر لی
تھی کہ کانفرنس مصطفےٰ کمال کے ساتھ بحیثیت ان کی درمیانی صلح کن شخص کے منعقد ہو نہ کہ

دول خود فاتح بنکر رہیں۔ باوجود اس کے ترکوں کے ساتھ اس طرح سلوک کیا گیا جس طرح مفتوح دشمن کے ساتھ کیا جاتا ہے تاکہ وہ نہایت عجز و حکم کے ساتھ اظہار پشیمانی کرے ترکوں کی اسکیم یہ تھی کہ ان کے معاہدۂ قومی کی تعمیل کی جائے جس کی رو سے انھیں اپنے حدود کے اندر مکمل خود اختیاری آبادیوں کی آزادی اور غیر ملکی مفاد کا ضروری تحفظ حاصل ہو۔ اتحادیوں کے پروگرام میں بھی انھیں حقوق کے حفاظت کرنی تھی اور اگرچہ اس کا اعلان نہیں کیا گیا لیکن وہ ترکی خود مختاری کو حتی الامکان ملکی وسیاسی دونوں حیثیتوں سے محدود کر دینا چاہتے تھے۔ اس غرض کے لئے انھیں قوم پرستوں کی مادی قوت کا لحاظ رکھنا پڑا جس کے ساتھ بالشویک روس کی غیر محدود اعانت اور جرمنی کی اخلاقی حمایت بھی جو یقیناً لاسین میں اپنا کام کر رہی تھی، شامل تھیں۔ بین الاقوامی قوانین اور اخلاقی اصول کی بنا پر قلیل التعداد آبادی اور حقوق خود اختیاری کی حیثیت سے دول کو ترکی کے یونان پر فتحیابی اور غلبہ بہ لحاظ تعداد کے مطالبات تسلیم کرنے ہی پڑے۔ ان کا پروگرام بالکل عام تھا جیسے انگلستان، فرانس اور اٹلی ہر ایک مختلف نقطہ نظر سے متفق تھے۔ جہاں تک دول ادنیٰ کا تعلق ہے (جن کے مفاد دول عظمیٰ سے کہیں زیادہ متعلق تھے) انھیں کچھ کہنا نہ تھا اور انھوں نے مجبوراً معاملہ کو اپنے بڑے بھائیوں پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ آپ ہی نپٹ لیں۔ بدنصیب یونان کی حالت بد سے بدتر تھی دیگر اقوام کی مداخلت کی وجہ سے تباہی سے بال بال بچا تھا جس کی نمایندگی ایم وینزلاس بے قاعدہ طور پر کر رہا تھا جس نے اپنے کو یونان کی انقلاب پسند حکومت کی طرف سے بلکہ یونانی قوم کے نمایندہ ہونے کا اعلان کیا تھا۔ اسکی تصدیق کی کیا حقیقت تھی؟ اور کہاں سے اس کو حاصل ہوئی؟ اس کا کچھ پتہ نہیں اور آیا حکومت اتھنز یا یونانی افواج نے اس کے دستخط کو تسلیم منظور بھی کیا ہوگا؟ یہ بھی مشتبہ تھا۔ ان کے علاوہ دوران کانفرنس میں چند سابق وزرائے یونان اس جرم میں کہ انھوں نے ایم وینزلاس اور دول کی جارحانہ کارروائی کی تعمیل کیوں کی سزایاب ہوئے یہ امر خود ایم وینزلاس اور برطانیہ جو اس کی ذمہ داری میں شریک تھا دونوں کے لیے نہایت پریشان کن تھا بالخصوص بلقان

بھی کچھ مطمئن نہ تھیں اور کبھی کبھی دبی زبان سے کچھ بول بھی پڑا کرتی تھیں۔ بلغاریہ، یونان یا اور کوئی ریاست بھی تھریس ترکی کو دیئے جانے پر خوش نہ تھی اگرچہ سب کی سب اپنے علاوہ کسی اور کو دیدیئے جانے پر ترکی کو دیا جانا مرجح سمجھتی تھیں[1]۔

روسیوں کے متعلق یہ خیال تھا کہ مسئلہ بنانے میں ان کی صرف آواز ہی آواز ہے حالانکہ ان کا مطالبہ ترکوں سے کہیں زیادہ تھا اور انھیں ہمیشہ شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا کہ وہ کانفرنس کو توڑنے آئے ہیں۔

خاص خاص بین الاقوامی مسائل زیر بحث یہ تھے، آبنایوں کی آزادی، غیر ملکی باشندوں اور ان کے ذاتی، مالی اور معاشرتی مفاد کی حفاظت اور قلیل التعداد آبادی کے حقوق اور جان کا تحفظ آزادی آبنائے کے متعلق زمانۂ امن میں کوئی بڑی دشواری نہ تھی جو ہمیشہ ایسے زمانہ میں اس کو حاصل رہا کرتی تھی البتہ بعض حصوں میں فوجیں نہ رکھنے اور دوسرے فروعی سوالات پر بحث تھی۔ لیکن ترک کم از کم اتنا تسلیم کرتے تھے کہ صلح کے زمانہ میں خواہ کچھ بھی شرائط ہوں لیکن جنگ چھڑتے ہی کوئی بھی حکومت ہوتی اگر اس سے ممکن ہوتا، آبنایوں کو فوراً بند کر دیتی جیسا کہ انگلستان نے جنگ عظیم کے زمانہ میں چینل کو بند کر دیا تھا۔ اس لحاظ سے قسطنطنیہ میں ہونے کی بنا پر ترکی بھی راستہ فوراً بند کر دینے کی مجاز تھی اور کانفرنس کا اس کے متعلق اسقدر شور و غل بالکل نمائشی تھا۔ غیر ملکی حقوق و مفاد پر جانبین سے سخت مباحثہ رہا اور اسی مسئلہ پر

[1] یہ بوشیدہ طور پر مشتہر کر دیا گیا ہے کہ ترکی نے اپنی عیسائی رعایا کو نہایت بیرحمانہ طریقہ پر ستایا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ترکی حکومت ایک حقیقی نمونہ نہ تھی لیکن بعض لحاظ سے دیگر مشرقی یورپی سلطنتوں سے کسی طرح بری بھی نہ تھی۔ یونانی جو ایشیائے کوچک میں ترکوں کے مظالم سے اپنی اور دوسروں کے تحفظ کا اسقدر ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، سمرنا میں صدیوں سے اسقدر خوشحال اور متمول ہیں بلکہ وہ اپنے کو یونان سے زیادہ بہتر حالت میں پاتے ہیں جہاں اچھی زندگی بسر کرنی دشوار ہے۔ اگر یہ سچ ہے کہ ترکوں نے ان پر مظالم کئے ہیں تو وہ خود بھی وہاں کیوں جمے رہے اور دوسرے یونانیوں کو کیوں بلاتے رہے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ اب جبکہ ترکی حکومت مٹ رہی ہے انہیں یہ محسوس ہو رہا ہے کہ ترکی خواہ کیسی ہی بری کیوں نہ رہی ہو، ان کے ہمسایہ عیسائی اور یہودیوں سے لاکھ درجہ اچھی تھی۔

بالآخر کانفرنس کا خاتمہ بھی ہوا۔ اس قسم کے کسی تحفظ سے شہنشاہیت محفوظ تھی تا اور اگر ترکی شہنشا
وانگریزی مصری شہنشاہیت کے معنی میں نہیں تسلیم کرلی جاتی تو دول یا ترکوں کے مطالبات
منظور کرلیتے یا جنگ ہوتی۔

قلیل التعداد آبادی کے مسئلہ تحفظ میں ممکن ہے مختلف حکومتوں کے مختلف سیاسی معاد شامل
ہوں لیکن یہ معاملہ ترکوں کے گزشتہ طریقہ حکومت کی بنا پر خاصۃً عام انسانیت سے تعلق رکھتا ہے
جہاں تک ایشیای کوچک میں یونانیوں اور آرمینیوں کا تعلق ہے، یہ مسئلہ قتل عام اور جلا وطنی نے
اس کو صاف کر دیا ہے لیکن ان کے یا قسطنطنیہ اور تھریس کے دیگر اقوام کے متعلق خواہ صفحہ
کاغذ پر کچھ بھی وعدے لے لیے جائیں کہ حقیقتاً یہ تمام تر ترکوں کی نیک نیتی پر مبنی ہے بد قسمتی سے ایسے
دوسرے معاہدوں کی بھی کم وبیش یہی حالت ہے جس کی صورت یہ ہے کہ کوئی اور حکومت جو مناسب
سمجھے بجز ان معاہدوں کی پابندی کرے۔

ہمیں بسمارک کا وہ قول یاد ہے۔ اور ۱۹۱۴ء کے ناگوار تجربوں کے بعد بھی جو حکومت اس
قسم کی قربانی اور مظالم کے لیے تیار ہے، بخوبی دوبارہ غور کرے۔

مجلس اقوام کے آیندہ کارروائیوں پر بہت کچھ امید و اعتماد کیا جا رہا ہے لیکن اس لیگ
نے ابھی بمشکل اتنا وزن اور اختیار اپنے میں پیدا کیا ہے جس سے یہ بھروسہ یا امید قائم کی جاسکے
کہ اس کی کارروائیاں اراکین مجلس یا دیگر دول پر کوئی اثر بھی ڈال سکیں گی۔

ان بین الاقوامی مسائل کے علاوہ دول عظمیٰ اور دول ادنیٰ کے بہت سے قومی سوالات
بھی پیدا ہو گئے تھے۔ ان میں سے ہر حکومت اپنے ذاتی معاد کے لیے کوشاں اور دوسروں کی
حمایت کی اس بنا پر متوقع تھی کہ بوقت ضرورت وہ اس کی مدد کرے گی۔

اس کی ایک بہتر مثال موصل کی تھی جس میں انگلستان کے سوا کسی دوسری طاقت کا کوئی
معاد براہِ راست نہ تھا لیکن تمام دول چاہتی تھیں کہ اس پر کوئی تفریق نہ ہو۔ تاکہ کانفرنس اور
خود ان کے معاد کا بے وقت خاتمہ نہ ہو جائے

لاسین کے مباحث میں دول عظمیٰ کے تمام نمایندے نہایت اعلیٰ جذبات سے کام لے رہے تھے۔ لیکن ان کی تہ میں اکثر مادیت کی بدنما صورت پنہاں ہوتی تھی۔ ترکوں جیسے سادہ دل اور کم تعلیم یافتہ لوگوں کے معاملہ میں نہایت اعلیٰ اخلاقی اور ذہنی افضلیت ظاہر کرکے پریشان کرنا بیکار رہتا۔

دول عظمیٰ کے نمایندگان کے لیے یہ ایک بہت بڑا نقصان تھا کہ وہ ان مقامات کے حالات و واقعات کی اصل حقیقت سے جن سے ان کو کام پڑا واقف نہ تھے۔ جہاں تک معلوم ہو سکا ہے اگر کوئی برطانوی نمایندہ جو ترکوں یونانیوں اور ریاستہائے بلقان کے متعلق حقیقتاً کچھ علم رکھتا رہا ہو۔ تو وہ ایک سر ایڈم بلاک کی ذات تھی اور اس نے خود میرے سامنے اسکا اعتراف کیا کہ موجودہ ترکوں کو آج کوئی نہیں سمجھ سکتا ہے۔ وہ سلطان عبدالحمید کے زمانہ کے بھولے بھالے ترک نہیں ہیں اور نہ انجمن اتحاد و ترقی کے خود غرض چالاک نوجوان ترک ہیں وہ عثمانی ترک بھی نہیں ہیں بلکہ ایک نئی نسل کے پرجوش قوم پرست ہیں جو یورپ کے اس خیال کی وجہ سے کہ ترکی بحیثیت طاقت نیست و نابود کر دیجائے سرکش رہتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ لارڈ کرزن کو مشرق اور مشرقی اقوام کے متعلق بہت کچھ تجربہ حاصل ہے۔ لیکن ان کا تجربہ ترکی سے بھی دور مشرقی لوگوں کے متعلق ہے۔ اور خود ان کی (لارڈ کرزن) قدامت پسندی جذبات وطبائع میں کسی تغیر و انقلاب کے تسلیم کرنے میں مانع ہے۔

مشرق قریب میں تغیر حالات سے دول کی عدم واقفیت ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ گذشتہ چند سالوں کے اندر غلطیوں پر غلطیاں سرزد ہوئیں اور اتنے مصائب وقوع میں آئے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ لارڈ کرزن کو مخلوطی حکومت (کولیشن گورنمنٹ) میں اسوقت وہی اعزاز حاصل تھا جو آج ہے لیکن یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ یکبارگی ایک نیا باب کھول دینگے۔ اور اپنے قدیم مقلدانہ رویہ کو بدل دینگے۔ درحقیقت یہ دیکھ کر شبہ ہوتا ہے کہ لارڈ کرزن جیسے عالی دماغ شخص مسٹر لائڈ جارج کی پالیسی کی اس طرح اندھی تقلید کرے غالباً ان کی صحت اچھی نہ تھی جس کی وجہ سے

وہ اس پالیسی کی مزاحمت کرنے کی بجائے اتباع کرتے رہے - پھر بھی ترکی، مصر، عراق اور فلسطین میں بالآخر ایک نیا باب کھولنا ہی پڑے گا۔

پیرس، کینز، اور جینوا میں مسٹر لائڈ جارج مشرقی سیاسیات کے بن دیکھے میدان میں قدم رکھتے ہوئے تمام مشوروں سے آنکھیں بند کر کے خوشی کے مارے اچھلتے پھرتے تھے اور ان کے دائیں بائیں وزیر خارجیہ تھے جو انھیں ان کی حرکتوں سے باز نہ رکھ سکتے تھے۔

لاسین میں لارڈ کرزن کا رویہ ترکوں کے ساتھ ایک ہیڈ ماسٹر کی طرح تھا اور بعض اوقات نیک دل اور طفلانہ - لیکن بہر صورت ایک مسلمہ لیڈر کا سا برتاؤ نہ رہا - ان کا گھر کو رخصت ہونا جبکہ چوبیس گھنٹہ کے قیام میں وہ دستخط شدہ صلحنامہ کو جیب میں رکھ کر لیجاتے، ایک نمایاں خصوصیت رکھتا ہے - موصل کے معاملہ میں انگلستان کی بھی کچھ پیش نہ گئی - اور چونکہ یہ مسئلہ ان کی زیر غور سمجھا جاتا ہے، لہذا فی الحال اس میں پڑنا مناسب نہیں - لیکن یہ صاف ظاہر ہے کہ ترکی کے کسی مطالبہ پر بحث تک کرنے سے بھی لارڈ کرزن کا انکار کر دینا حقیقت میں بالفاظ دیگر کہتا تھا کہ انگلستان بجائے اس کے کہ ایک انچ بھی پیچھے ہٹے جنگ پر آمادہ ہے - یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا کوئی برطانوی شہری موصل کے لیے جنگ کرنے پر تیار ہے تاکہ اس کو امیر حجاز سے لیکر جسے برطانیہ نے عراق پر لگا رکھا ہے، کسی بدوی سردار کے حوالہ کر دیا جائے - علاوہ اس کے مستند ذرائع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ فیصل ترکوں کا موصل پر قابض رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں بجائے اس کے کہ وہ خود اس معاملہ میں اپنے طاقتور ہمسایوں سے برسرپیکار رہیں - یہ دیکھ کر لارڈ کرزن اپنے حیثیت پر دوبارہ غور کر رہے ہیں اپنی نہیں بلکہ انگلستان کی حیثیت پر - وہ اس کی توقع نہ کر سکتے تھے کہ فرانس یا اٹلی موصل کے لیے ان کے ساتھ جنگ میں شریک ہوں گے۔

اسی لیے بجائے صاف انکار کرنے کے انھوں نے یہ مسئلہ مجلس اقوام کے حوالہ کیے جانے کی تجویز کی ہے - ترکوں نے جو لیگ کے ممبر نہیں ہیں اس فیصلہ پر اعتراض کیا۔

لارڈ کرزن کے اس تجویز کی غرض یہ بھی کہ انکار صاف کے جو نتائج ظہور پذیر ہوں، انکی

ذمہ داری ان کے بجائے لیگ کے شانوں پر آئے۔ یہ اگرچہ ایک اچھی سیاسی چال تھی لیکن برطانیہ عظمیٰ جیسی سلطنت کے شایان شان نہیں جبکہ اسکی غرض اس قدر صاف ظاہر ہو چکی تھی۔ اس چال سے تنی کامیابی تو ضرور ہوئی کہ تمام کارروائی ایک سال کے لیے رک گئی اور اس وقت تک امید ہے کہ یہ مسئلہ کی اہمیت بھی جاتی رہیگی۔

اس مضمون کے لکھنے کے وقت تک یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ آیا کانفرنس پھر دوبارہ ہوگی یا نہیں۔ اس لیے کانفرنس کی کامیابیوں اور ناکامیوں پر زیادہ گفتگو کرنی بے سود ہے۔

یہ ایک بڑی ناانصافی ہوگی اگر کانفرنس کے اس ناکامی کا کوئی ایک واحد سبب قرار دیا جائے، یا برطانیہ کے کارگزاریوں پر اس تنقید و تبصرہ کے بعد جو گزشتہ صفحات میں کیا گیا برطانوی نمایندگان کے تمام رویہ کو برا سمجھا جائے۔ لارڈ کرزن کو ایک مختلف العناصر جماعت کے رہنمائی کرنی پڑی اور ترکوں کے اکثر غیر معقول اور احمقانہ حرکتوں سے وہ غصہ و اشتعال کی انتہائی حد کو پہنچ جاتے تھے۔ کسی نہ کسی کو تو تمام رہبری اپنے ہاتھ میں لینی ضرور تھی اور لارڈ کرزن کی سرکردگی متفقہ طور پر منظور ہوئی اور بعد میں پسندیدگی اور تعریف کا بھی اظہار کیا گیا۔ کوئی دوسرا شخص اس کی بجائے اس سے بہتر کسی حالت میں نہیں ہوسکتا تھا اور اگر ان سے اتفاقیہ کچھ غلطیاں سرزد ہوئیں تو ہر تجربے شخص کی طرح، اس کا سبب یہ تھا کہ اسمیں اچھے اوصاف کے ساتھ کچھ کمزوریاں بھی تھیں۔

کوئی سمجھدار شخص جو کانفرنس کے انعقاد اور اس کے عارضی شکست کے اسباب کا متلاشی ہو، یہ سوال کیئے بغیر نہیں رہسکتا کہ "کیا ہماری خارجیہ پالیسی میں تبدیلی کی فوری ضرورت نہیں ہے؟" سب سے بڑے واقعات جن کی وجہ سے کانفرنس منعقد کی گئی دو تھے۔ (۱) یونانیوں کی شکست (۲) واقعہ چناق۔ اس موقع پر مخلوطی حکومت (کولیشن گورنمنٹ) نے ترکی سے جنگ کرنے پر آمادگی ظاہر کی بجائے اس کے درہ دانیال سے قدم اٹھالیتے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ پیش کی جاتی ہے کہ برطانوی پرسٹیج (رعب و وقار) اٹھ جاتا۔ مگر ہم نے دیکھا کہ فرانس اور اٹلی نے ایسا کرنے سے اپنا کوئی وقار نہیں کھویا اور اس کے بتانے کی کوئی ضرورت

نہیں کہ اُس وقت برطانوی پرسٹیج پر کیا اثر پڑتا جبکہ ترک ملک کا انتظار کیے بغیر فوراً قلعہ پر حملہ کرکے
انھیں برباد کر دیتے جیسا کہ اکثر فوجی ماہرین کے خیال کے بموجب اغلب تھا۔

رعب و وقار سے بھی زیادہ ضروری سوال یہ تھا کہ آیا اتنے سے کام کے لیے جنگ کرنا
مناسب بھی تھا؟ کیا ہم نے اس پر کبھی غور کیا ہے کہ اس جنگ میں جبکہ اتحادیوں میں سے کسی کی
ہمدردی بھی اس کے ساتھ نہ ہوتی اکیلے برطانیہ کی کیا حالت ہوتی؟۔ انگلستان کو ایشیائی
کوچک میں فوجی پیشقدمی کرنی ہوتی اور ممکن تھا کہ اُسے ترکی بالشویکی افواج کے تعاقب میں
سائبیریا کے دشوار گزار اور اجنبی ملک میں دوڑنا پڑتا۔ ساتھ ہی اس کو بحر روم کے سواحل
کی نگرانی بھی قسطنطنیہ سے لیکر افریقہ میں سلم تک کرنی پڑتی۔ اور عراق، ٹرانسجاردنیہ[۱]
فلسطین اور مصر کے حکمرانوں کی بھی حمایت یا مخالفت کرنی ہوتی۔ اس بے چینی اور خلفشار
کی وجہ سے یہ امید نہ تھی کہ بالشویکی اور ترکی پروپگنڈا کامیاب ہونے سے رہتا۔ انگلستان کی حالت
اس وقت جنگ عظیم کے زمانہ سے بھی زیادہ دشوار ہو جاتی۔ اور اس مہم میں جان و مال کی جو
عظیم الشان قربانی کرنی پڑتی اس کے خیال سے دل لرز جاتا ہے۔ آخر یہ سب کس لیے؟ صرف اس واسطے
کہ ایک غلطی کا اعتراف کرنا نہیں چاہتے تھے اور ایک ایسی مہلک پالیسی پر اڑے رہتے بجائے
اس کے کہ ترکی کے ساتھ ایک سمجھوتا کرلیں۔ موجودہ خارجیہ پالیسی کی ہر جنبش پر بالشویزم
اور اشتراکیت   کے خوفناک گھات میں لگے ہوئے ہیں جو انگلستان کو
دنیا میں اپنا سب سے بڑا جانی دشمن سمجھتے ہیں۔ کیا یہ کوئی اچھا کام ہوگا کہ ترکی کو روس اور
جرمنی کے آغوش میں ڈال دیں؟ ترکوں کو روس سے کوئی محبت نہیں بلکہ برعکس اسکے انہیں
ہر وقت خوف لگا رہتا ہے۔ لیکن ہم نے انھیں متعدد بار مجبور کیا کہ وہ سوویٹ سے امداد لیں
اور اتحاد قایم کریں۔ یہ کس کے لیے؟ یقیناً اپنے لیے نہیں۔ ترک اگر یونان یا بلغانی میں سے

---

[۱] یردن جسے انگریزی میں جارڈن کہتے ہیں، فلسطین میں ایک دریا ہے۔ اسکے مشرقی ساحل کا علاقہ ٹرانسجارڈنیہ کہلاتا ہے۔ (مترجم)

کچھ حصہ دبالینا چاہتے ہیں تو ان کو اس سے باز رکھنے میں انگلستان کا کیا مفاد شامل ہی جس سے وہ
مفت کی جنگ اپنے سر مول لے ؟ اس کی حمایت میں جو دلیل پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ تا وقتیکہ کمل
تحفظ نہ حاصل کر لیا جائے ممکن ہی کہ دول کو جلدی پھر دوبارہ بلقان جیسی تشنہ دگی کا مقابلہ کرنا
پڑے ۔ فرض کر لو (حالانکہ یہ بہت دشوار ہی) کہ اس قسم کے تحفظ سے آیندہ مشرقیہ قریبہ میں کوئی
جنگ نہ ہوگی پھر بھی ہمارے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہی کہ آیا یہ فرض خاص انگلستان ہی کا
ہی کہ وہ اس پر مصر رہے اور اس کے عوض ترکی تمام دنیا ی اسلام کو اپنا دشمن بنائے اور اپنے
کو ہندوستان، ایشیا اور شمالی افریقہ کے ممالک میں بالشویکی اور جرمن پروپگنڈا کے خطرہ میں
ڈالے اور قسطنطنیہ سے لیکر خلیج فارس اور خرطوم تک ایک طوفان عظیم میں مبتلا رہے ۔

یہ زمانہ عملی سیاسیات کا ہی اور اس عہد میں انگلستان اور فرانس جن کی زیر حکومت مسلمانوں کی
کثیر تعداد بستی ہی۔ اگر کوئی بات قابل عمل ہی تو وہ یہ کہ ایشیا اور افریقہ کے ساتھ باہمی دوستانہ
تعلقات کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی اس حکومت سے بھی صلح رکھیں جو ان کا مستقر خلافت ہی۔
اس سے فوراً ابادیوں کی آزادی بھی حاصل ہوجائے گی اور روس و جرمنی کی ان پیہم کوششوں
کو بھی شکست ہوگی جو وہ غیر متفق دول مغرب کے خلاف اپنے اور ترکی سے مرکب ایک جدید
رکاوٹ پیدا کرکے کرنا چاہتے ہیں ۔

اگر ہم چھوٹے چھوٹے اختلافات کو مٹا دیں اور فوائد و نقصانات اور قربانی و منافع کا نسبتہ
مقابلہ کرکے حالات آیندہ کا وسیع النظری کے ساتھ اندازہ کریں تو کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ
انگلستان کا فرانس اور ترکی سے متفق ہونا ممکن ہی ۔

ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہی کہ اپنی پالیسی کو نہایت دیانتدارانہ، پائدار اور درست
رکھیں۔ ہم اصول خود اختیاری کے اسقدر حامی بنتے ہیں لیکن فلسطین میں مسلمانوں اور عیسائیوں
کی کثیر تعداد آبادی پر یہودی حکومت قایم کرنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح عراق اور ٹرانس جارڈینیہ میں
ہم نے برائے نام چھوٹے چھوٹے بادشاہ منتخب کیے ہیں جن پر وہاں کے باشندے ترکوں کے قدیم

حکومت ہی کو ترجیح دیں گے یہی حال ارض پاک کا بھی ہے جہاں نئے آقا سے پرانے مالک ہی بہتر تھے۔ کوئی شخص یا کوئی قوم کسی ایسی غیر ملکی حکومت کو صبر و سکون سے نہیں برداشت کر سکتی جو انہیں ہر حیثیت سے بنظر حقارت دیکھتی ہو یہ برطانیہ عظمیٰ ہے"۔ جو حکومت کثیر التعداد قوم کی اسقدر حامی ہو نیکے باوجود اس گناہ کے سب سے بڑی مرتکب ہوئی ہے۔

ہم نے فرانسیسی ہمدردی کو بھی اپنے سے علحدہ کر دیا ہے اور علاقۂ رہر میں اس کی دشواریاں زیادہ ہماری وجہ سے پیدا ہو رہی ہیں۔ بجائے اس کے کہ اسکی اخلاقی حمایت و امداد کرتے جس کی اسے توقع تھی، ہم نے پند و نصائح کے سوا اور کچھ نہیں کیا۔ یہ سب جانتے ہیں کہ ۱۹۱۴ء میں اگر انگلستان نے پہلے ہی یہ اعلان کر دیا ہوتا کہ وہ فرانس کی طرف سے لڑے گا تو یہ جنگ کبھی نہ ہوتی اسی طریقے سے اسکا بھی قطعی یقین تھا کہ اگر ہم نے اصولاً ہر کے معاملہ میں فرانس کی حمایت کا اعلان کر دیا ہوتا تو جرمنوں کی طرف سے بہت کم مزاحمت ہوتی۔ مصر میں ہم امن و صلح قایم کرنے میں قطعاً ناکام رہے۔ فلسطین تقریباً بغاوت ہی کی حالت میں ہے، ۱۶ آق سے بھی بعد از خرابی بسیار واپسی پر غور کیا جا رہا ہے۔ ہماری خارجیہ پالیسی چار سال تک سخت ابتلا و آزمائش میں رہی اور پہلے سے کچھ زیادہ بہتر نہ رہی بلکہ تقریباً ناکام رہی۔

میں یہاں پر وہی ذکر کرتا ہوں جس کا مجھے علم ہے۔ گزشتہ صدی کے آخر میں جو جنگ ترکوں اور یونانیوں کے درمیان ہوئی تھی اس موقع پر بھی ہم نے قسطنطنیہ کے ساتھ تقریباً وہی غیر دوستانہ رویہ اختیار کیا جو آج ہمارا ہے۔

اپنے قدیم دوستانہ رویہ کے ترک کر دینے اور اسلام کو اپنا دشمن بنا دینے سے جو خطرہ ہمارے درپیش ہے، اس کا اظہار اس خط سے بخوبی ہوتا تھا جو "تماشائی" (اسپکٹیٹر) کے نام سے اسٹینڈرڈ میں شائع ہوا تھا۔ لارڈ سالسبری وزیر خارجیہ ایسے نہ تھے کہ تنبیہ پر دھیان نہ دیتے چنانچہ انھوں نے اڈیٹر کو یہ لکھا کہ اس خط سے انگلستان کی پالیسی آیندہ بدل جائیگی، یہ وہ الفاظ تھے جن کی فوراً تعمیل کی گئی اور سر پی کری کو فوراً واپس بلا لیا گیا اور بابعالی کے

۔تہ بتر سلوک ہونے لگا۔ کیا تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرانے گی؟ ہمارا حال یہ ہے کہ گڑگڑاتے
ہیں اور گھگھیانے سے پرہیز۔ کیا برطانوی سپاہی، جہاز راں، اور محصول دینے والے نہیں سمجھتے کہ
وہ کہاں لیجائے جا رہے ہیں؟ قبل اس کے کہ موقع ہاتھ سے نکل جائے بہتر ہے وہ خود اپنے
ں سے پوچھیں۔

سعید انصاری، متعلم جامعہ

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی ۔۔۔ یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا ۔۔۔ جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

(اقبال)

مصر میں تعلیم

(بسلسلہ اشاعت فروری)

اپنی نشأت جدیدہ میں حکومت اپنے مددگاروں، بہترین مشیروں اور امانت دار کام کرنے والوں سے خالی تھی۔ ساتھ ہی پیہم مخالف واقعات، متواتر شورشیں اور مسلسل لڑائیاں کرنا پڑیں ان وجوہ سے اسلوب تعلیم جس معیار پر ہونا چاہیے تھا۔ نہ ہو سکا۔ کیونکہ اس وقت صرف یہ مقصد پیش نظر تھا کہ جلد سے جلد وطن عزیز کے نونہال تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو جائیں اور حکومت اُن سے اپنے امور میں مدد لے سکے۔ اور بڑے بڑے علوم کی تکمیل کرانے والا کوئی نہ تھا۔ غیر وطنی و اجنبی لوگوں کی اگر خدمات حاصل کی جاتی تھیں تو وہ زیادہ مفید و کار آمد نہ ثابت ہوتے تھے۔ لہذا اُنھیں اہل وطن ہی میں سے جو جب مل جاتا تھا اُسے لینا پڑتا تھا۔ مگر جب حکومت مدد نے محسوس کیا کہ اُس کو ایسے اُستاد درکار ہیں جو ریاضیات، معقولات، اصول تربیت و ترتیب مدارس طریقۂ تعلیم و دقت معلمی میں کامل و ماہر ہوں تو اس نے طلبہ کی جماعت یورپ بھیجنے کا تہیہ کیا۔ اس وجہ سے کہ آج یورپ ہی اِن علوم کا مرکز بنا ہوا ہے اور تمام قدیم و نایاب علمی کتابیں اس کی مروجہ زبانوں میں منتقل ہو گئی ہیں۔ اس کے علاوہ خود مشاہیر یورپ کی تصانیف بھی ان میں شامل کر لی گئی ہیں۔ اس طرح تعلیم کو یورپ نے بالکل اپنے ہاتھوں میں محصور کر لیا ہے۔ غرض سب سے پہلی کیپ ماہ شعبان ۱۲۴۱ھ میں یورپ بھیجی گئی۔ اس نے آٹھ سال نو ماہ یورپ میں قیام کیا یہ طلبہ مختلف ممالک میں تقسیم اور ہر فن کے لیے چند مخصوص ہو گئے۔ گوہر مقصود حاصل کر کے وطن کے مایۂ ناز فرزندوں کی یہ جماعت جمادی الاول ۱۲۵۰ھ میں اپنے مقدس ملک میں واپس آ گئی۔ انھیں میں علامۂ فاضل مرحوم رفاعہ بک، مظہر پاشا، پاشا بھی تھے اس جماعت کی تعداد طلبہ (۱۳۷) تھی۔ ان میں مشائخ امرا، عام رعایا اور معززین کے بچے تھے، ترک، عرب، اور

بڑے دمی وارمنی بچے بھی تھے۔ جو ملازمین حکومت کی اولاد تھی ۱۲۵۳ھ میں جبر تیرہ (۱۳) طالب علم
یورپ گئے۔ ان میں سے بعض آٹھ سال کچھ گیارہ سال وہاں مقیم رہے۔ اس کے بعد ۱۲۶۲ھ ۵ ۔ ۶۰ ۔ د
۵۰ ۔ ۵۸ ۔ ۹ ۵ میں اور چند لایق طلبہ گئے جن کی تعداد (۷ ۳) نفر تھی۔ یہ سب (۱۷۰) طلبا یورپ سے
ان تحصیل ہو کر آئے۔ جن کی تعلیم پر محمد علی پاشا نے (۴ ۔ ۱۲۳۱) پونڈ مصری صرف کیے ان طلبہ نے
مختلف مدتوں تک یورپ میں قیام کیا۔ ان کی مدتِ قیام ہی کے لحاظ سے مصارف و وظائف
بھی مختلف ہوئے۔ چنانچہ پہلی کیپ میں ۵۱۰ پونڈ فی طالب علم صرف ہوا۔ اور حکومت کے خزانہ
سے ادا کیا گیا۔ دوسری کیپوں میں بھی مختلف تعداد تھی۔ اور وظائف و مصارف بھی مختلف ہوئے۔
مثلاً جو لوگ گیارہ سال یورپ رہے۔ اُن پر حکومت مصر نے (۹۷۹) پونڈ صرف کیے۔ محمد افندی
اسمعیل اکتیس ۳۱ سال یورپ میں رہے۔ اون کی تعلیم پر (۵۳۴۰) پونڈ صرف ہوا۔ حسن افندی بیانی
۱۵ سال رہے۔ اُنھوں نے ۲۱۰۷ پونڈ وظیفہ پایا۔ محمد افندی شباسی تیرہ سال رہے۔ ان کو ۲۳۲۱
پونڈ ملا۔ مصطفےٰ افندی سیکی نے ۱۹ سال قیام کیا۔ اُنھوں نے ۲۱۰۷ وظیفہ لیا۔ ابراہیم افندی بیرو
۱۲ سال رہے۔ ان کو ۹۴۹ پونڈ دیا گیا۔ محمد افندی علی البقلی اور حسین افندی رشیدی نے تیرہ سال
قیام کیا اُن میں سے ہر ایک کو ۱۳۶ پونڈ۔ غرض اس طرح سے مدت قیام یورپ کے اختلاف کے
لحاظ سے طلبہ پر مصارف بھی ہر ایک کے مختلف ہوئے۔ اور ۱۲۶۲ھ میں ایک خاص منتخب جماعت
یورپ کو بھیجے گئے۔ جن میں حسین بک اور عبد الحلیم پاشا، پاشائے مرحوم کے صاحبزادے قابل ذکر
ہیں یہ ستر طلبا تھے جن میں علامہ علی پاشا مبارک بھی ہیں جو مصر کے مشہور و نامور وزیر ہوئے۔
اور جن کا علم و فضل محتاج بیان نہیں اس جماعت کے سرگروہ ا   ن بک لیے۔ اس گروہ نے
پیرس کو اپنا تعلیمی مرکز بنایا۔ اور اسپر (۹۴۱۱۵) پونڈ مصری صرف ہوئے۔ پھر اور ملک کے
نوجوان بھیجے گئے جنکی تعداد (۲۹۰) ہوتی ہے۔ ان میں بڑے بڑے ترک و عرب سردار زادے
تھے۔ اور ان سب کی تعلیم پر کل (۲۷۳۳۶۰) پونڈ مصارف آئے۔ مرحوم عباس پاشا اُن کے
عہد حکومت میں ۴۸ طلبہ یورپ گئے۔ جن پر ۸۲۹۶۳ پونڈ صرف ہوئے پھر خدیو معظم اسمٰعیل پاشا

کے زمانہ میں ۱۵۵ طلبہ روانہ ہوئے جن پر ۱۳۷۸۶۶ مصری پونڈ خرچ ہوئے۔ مرحوم توفیق پاشا کے دور میں موجیل بک کی سرگردی میں ایک جماعت بھیجی گئی مگر افسوس یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس پر کیا صرف ہوا۔

تکمیل فوائد و اتمام مضمون کے خیال سے اس موقعہ پر مکاتب کی تاریخ افتتاح بھی لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱ مدرسۃ البیادہ (پیادہ فوج) ماہ ذوالحجہ سنہ ۱۲۴۰ھ میں بمقام قصر عینی۔ (مگر یہ مدرسہ پھر سنہ ۱۲۵۲ھ میں کسی خاص وجہ سے بند کر دیا گیا۔

۲ مدرسہ حربیہ بمقام قلعہ سنہ ۱۲۱۴ھ میں

۳ مدرسہ شوال سنہ ۱۲۴۴ھ میں

۴ مدرسہ الاجزائیہ (دوا سازی کا مدرسہ) بمقام قلعہ جمادی الثانیہ سنہ ۱۲۴۵ھ میں

۵ مدرسہ السواری (فوجی رسالہ کا مدرسہ) حافظ افندی اسمٰعیل کی نگرانی ماہ ذیقعد سنہ ۱۲۴۶ھ میں بمقام جیزہ۔

۶ مدرسۃ الطب بیطاری (وٹرینری، علاج مواشی) بمقام ا سنہ ۱۲۴۷ھ میں

۷ مدرسۃ التوبحہ (توپ خانۂ فوجی) بمقام بطرہ زیر نگرانی خورشید افندی سنہ ۱۲۴۷ھ میں جو سنہ ۱۲۵۶ھ میں موسیو بورڈکن نگرانی میں دیدیا گیا،

۸ مدرسۃ البحریہ (جہاز راں) ماہ ربیع الآخر سنہ ۱۲۴۷ھ

۹ مکتب پیادہ (پیادہ فوج) بمقام خانکہ۔ جمادی الاول سنہ ۱۲۴۸ھ میں

۱۰ مکتب شریف (ملک مصر کا حصہ زیریں) سنہ ۱۲۴۹ھ میں

۱۱ مکتب مہمات الحربیہ (سامان جنگ کا مدرسہ سنہ ۱۲۴۹ھ میں پھر یہ سنہ ۱۲۵۱ھ میں بند ہو گیا،

۱۲ مکتب پیادہ مقام ابی زعبل میں سنہ ۱۲۵۰ھ

۱۳ مکتب پیادہ بمقام دمیاط صفر سنہ ۱۲۵۰ھ میں

۱۴ - مدرسۂ فن تعمیر (انجینرنگ) بمقام بولانہ ۱۲۵۰ھ میں زیر نگرانی موسیو حالیکان (بلیکن)
یہ مدرسہ ماہ رجب ۱۲۵۰ھ میں امیریک کے سپرد کیا گیا پھر ۱۲۶۲ھ میں علامہ علی پاشا مبارک
کے حوالہ ہوا جبکہ وہ یورپ سے فارغ التحصیل ہو کر اپنے وطن واپس آئے ہیں۔
۱۵ - مدرسۂ تجہیزیہ (ہائی اسکول) یہ ماہ رجب ۱۲۵۲ھ میں مدرسۃ المبادہ سے الگ کیا گیا
پہلے دونوں ایک تھے۔
۱۶ - مدرسہ طب و دایہ گری (ماہ ذیقعد ۱۲۵۲ھ میں
۱۷ - مدرسہ الفی سیہ (حساب دفاتر) بمقام سیدہ زینب ماہ ذیقعد ۱۲۵۲ھ میں
۱۸ - مدرسۃ الالسن (زبانیں سکھانے کا) بمقام ازبکیہ۔ ماہ ربیع الاول ۱۲۵۴ھ میں
۱۹ - مدرسۂ علاج مویشی بمقام مصر ماہ ذیقعد ۱۲۵۲ھ میں
۲۰ - مدرسۃ العملیات (تشریح زخم وغیرہ) ماہ محرم ۱۲۵۵ھ میں
۲۱ - مدرسۃ المفروزۃ (فوجی دستہ کا) ذیقعد ۱۲۶۵ھ میں بمقام مصر
۲۲ - مدرسۂ " ماہ صفر ۱۲۶۷ھ " مقام اسکندریہ
۲۳ - مدرسۂ زراعت و محاسبۂ قبطیہ مقام عباسیہ ان دونوں کی تاریخ افتتاح افسوس کہ معلوم نہ ہو سکی

یہاں تک پہنچکر نگاہ بصیرت دغور ٹھہر جاتی ہے۔ اور ان مساعی جمیلہ کو حیرت انگیزی کے ساتھ دیکھتی ہے۔ اس دور میں جو معارف ضروریہ سے بالکل خالی اور حوادث وصعوبات میں گھرا ہوا تھا۔ روپیہ کی قلت اور کارآمد آدمیوں کے قحط میں مبتلا تھا، ایک مرد دانا سمجھ سکتا ہے کہ محمد علی پاشا کا یہ اہم ترین کارنامہ ایک عالی ہمت، دوراندیش نتیجہ شناس ہی کا کارنامہ ہو سکتا ہے۔ مرحوم ہی نے مصریوں کو تعلیم یافتہ و مہذب آدمی بنایا۔ اور کار و بار حکومت میں درک حاصل کرنیکے مواقع دیئے ایسی استعداد و قوت پیدا کی کہ اپنی قابلیت و حقوق دونوں کے لحاظ سے وہ اس قابل ہو سکے کہ حکومت کے انتظامی اور ذمہ دار عہدوں کو سنبھال لیا۔ اور غیر متمدن ملک میں جب تمدن و شائستگی کی بنیاد پڑتی ہے اور ملک جہالت و وحشت میں مبتلا ہوتا ہے اس وقت اس کو

سنبھال لینا آسان کام نہیں ہے۔ اور محمد علی پاشا ہی کا کام تھا اُن کی وفات کے بعد آن کے
فرزند رشید بطل نامور مرحوم ابراہیم پاشا کے ہاتھ میں حکومت مصر کی عناں آئی۔ اُن کا
عہد دولت اگر جلد ختم نہ ہو جاتا تو یقیناً اُن کے کمال علم دوستی و معارف پروری کی بدولت ملک
اُس دولتِ لازوال سے مالا مال ہو جاتا۔ لیکن افسوس تمناؤں اور آرزوؤں کے خلاف موت
نے بہت عجلت کی۔ مرحوم ابراہیم پاشا کے بعد اُن کے جانشین عباس پاشا الاول ۲۷
صفر سنہ ۱۲۶۴ھ کو سریرآرائے مصر ہوئے۔ آپ نے بعض مدارس میں کمی کی بعض میں اضافہ چنانچہ
آپ کے عہد میں مدارس کی تعداد اور اُن کے مصارف کا اندازہ حسب ذیل نقشے سے ہوگا یہ
سنہ ۱۲۶۵ھ کا ماہانہ نقشہ ہے۔

	ماہانہ	تعداد	معلم	ملازم
مدرسہ المبتدیات	۷۰۷۰	۲۰۹	. . .	.
مدرسہ طب و دایہ گری	۳۱۷۵۰	۴۵ ۴ جنین ۳ لڑکیاں تھیں	.	.
مدرسہ اسواری بمقام جیزہ	۲۵۰۲۳	۲۴۵	.	.
طلبہ پیرس روانہ کئے گئے	۲۳۱۳۵	۷۲	.	.
مدرسہ توبجیہ بمقام طبرہ	۱۳۰۹۷۵	۸۸۶	.	.
مدرسہ اللسن و محاسبہ	۴۷۵۴۹	۳۲۰	.	.
مدرسہ فن تعمیر (انجینیرنگ)	۲۵۷۱۳	۱۳۲	.	.
مدرسہ المفرودہ فوجی دستوں کا	۱۹۸۵۹	۱۶۹۶		
ملازمین و مشاہرات	۱۴۹۴۹۷	۳۲۲	.	.
میزان مصارف	۴۳۰۱۹۳	۳۳۰۸		.

یہ تعداد پاشائے موصوف کے آغاز دورِ حکومت کی ہے۔ مدارس کی تعداد میں مزید اضافہ ہوا اور طلبہ کی تعداد میں بھی پھر دو شوال ۱۲۶۴ھ کو مرحوم عباس پاشا اول کے بعد مرحوم سعید پاشا والی مصر ہوئے۔ انہوں نے سررشتہ تعلیم کی جانب مطلق توجہ نہ کی اور طلبہ کا یورپ بھیجا جانا بھی بند کر دیا۔ تمام مدارس بند کر دیئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ حالانکہ خود سعید پاشا نے علوم و معارف کی آغوش میں پرورش پائی تھی۔ اُس فضا میں ہوئے پہلے تھے اور بجائے خود ذوق آشنائے علوم تھے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ تعلیم یافتہ گروہ کی کثرت سے ان کو کوئی خطرہ تھا کیونکہ وہ خود نہایت بہادر و جری تھے۔ اور سب سے پہلے فرمانروا ہیں جنھوں نے حریت شخصی کی طرح ڈالی لیکن تعلیم عام کی بجائے فوجی تعلیمات کی طرف زیادہ صرف ہمت فرمایا اور بعید التفات سے کام لیا خود بنفس نفیس اس کی سرپرستی کی۔ اور قوانین یورپ کو پیش نظر رکھ کر بہت سے طریقوں کا اضافہ فرمایا۔ اس سے فوجی صیغہ حسن انتظام کی حیثیت سے بہت ترقی کر گیا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو سلطان عبدالمجید کی جانب سے خطرہ تھا۔ لہذا صیغہ فوج، آلات و اسلحہ جنگ کی بہم رسانی و تیاری پر زیادہ توجہ مبذول رکھی جس قدر شغف و انہماک فوجی صیغہ سے تھا۔ اسی قدر اگر سررشتہ تعلیم کی جانب ہوجاتا تو ایک متنفس کو بھی وہ جاہل نہ رہنے دے۔ تاہم انکے عہد میں کسی مقرب خاص کی تحریک و سفارش پر مدرسہ طب دوبارہ قائم کیا گیا۔ اور علامہ رفاعہ بک کی سوڈان سے واپسی پر قلعہ میں اُن کے لیے ایک مدرسہ کھول دیا۔ جس میں ۵۶ طلبہ داخل ہوئے۔ جس کا ماہانہ صرف ۲۳۸ پونڈ ۳ قرش تھا۔ مگر کوئی خاص مقصد پیش نظر نہ تھا۔ مدرسہ رفاعہ بک میں فوجی تعلیم کے لیے بھی چند معلمین رکھے گئے۔ باقی مدارس کے مکانات کارخانوں وغیرہ کے کام میں لائے گئے اور تمام آلات و سامان تعلیم فروخت کر دیے گئے۔ مصر میں اس حد پر پہنچ کر تعلیم رکی ہوئی تھی کہ حضرت خدیو اسمٰعیل پاشا کا دور مبارک آیا وہ ۲۷ رجب ۱۲۷۹ھ میں والی مصر ہوئے۔ انہوں نے تمام مدارس اور تعلیمات کے شعبے کھول دیئے۔ اور ایک خاص محکمہ اس کا الگ جاری کیا۔ اپنی پوری توجہ تعلیمات پر صرف فرمائی۔ بہت سے طلبہ کو

یورپ بھیجنے پر تیار کیا۔ فوجی تعلیم کا شعبہ ملکی (سول) تعلیم سے جدا کر دیا۔ اور اس کے تمام شعبوں کا ایک خاص جدید محکمہ سے الحاق فرمایا۔ پھر مکاتب اہلیہ (پبلک اسکولز) کی طرف توجہ فرمائی۔ تمام ملک کے مدارس و مکاتب کے لیے ایک قانون بنایا۔ شہروں اور گاؤں میں تعلیم کی نشر و اشاعت کے لیے پوری کوشش سے کام لیا۔ اور تعلیم کی تین قسمیں قرار دیں۔

۱۔ اول ابتدائی تعلیم۔ شہروں اور دیہات کے مدارس میں، جو صرف معمولی نوشت و خواند اور حفظ قرآن شریف، علم توحید کا ایک رسالہ اور حساب کے چاروں ابتدائی قواعد تک محدود تھی۔

۲۔ قسم دوم مدارس عامہ، مرکزی شہروں میں، ان طلبہ کو نحو عربی، حساب، ہندسہ، جغرافیہ تاریخ اور کچھ علم الطبیعات، پڑھائے جاتے تھے۔ مثلاً حوادث فضائیہ اور کچھ فوائد کیمیاویہ، نباتات، اور زمین کی درستی و اصلاح سے متعلق۔ تاکہ طلبہ میں، مدارس عالیہ میں داخل ہونے کی استعداد پیدا ہو جائے۔

۳۔ قسم سوم۔ مدارس امیریہ تھے۔ ان میں اُن تمام علوم اولیہ کی تعلیم دیجاتی تھی جس سے طلبہ میں مدارس خصوصیہ میں داخلہ کی صلاحیت پیدا ہو جاتی تھی۔ اور ان مدارس خصوصیہ کے مصارف خود بارگاہ خدیویہ سے ہوئے تھے۔ اب رہے ابتدائی اور تجہیزی (پرائمری اور ہائی) مدارس ان کا تمام بار مصارف حکومت کے ذمہ اور اس فیس کی آمدنی پر تھا جو طلبہ کے متولیوں سے وصول ہوتی تھیں۔ اس کی مقدار بیس سے سو قرش تک اُن کی حیثیت و مقدرت کے لحاظ سے ہوا کرتی تھی۔ اور دوسری مکاتب پر اقطاع جفلک کی آمدنی صرف کی جاتی تھی۔ یہ ملک مصر کا وہ نشیبی حصہ تھا جسے خدیو معظم نے مکاتب اہلیہ کو عطا فرمایا تھا۔ اور اُن اوقاف خیریہ کی آمدنی، جو دیوان اوقاف سے متعلق تھے۔ یا بعض اہالی ملک کے نگرانی میں تھے۔ اس کے علاوہ تلامذہ کے ماں باپ سے کچھ رقم فیس وصول ہوتی رہتی تھی جسکی مقدار پانچ (۵) قرش سے پندرہ قرش تک تھی۔ اور ان کی حیثیت کے لحاظ سے لی جاتی تھی۔ یتیم بچے بھی بلا استثنا حکومت کے ہر ایک مدرسہ اور مکتب میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ آلات و سامانِ تعلیم عام طور پر یتیم طالب علم کو مدرسے سے مفت دیئے جاتے تھے۔ اس طریقے سے تعلیم تمام شہروں اور گاؤں میں عام ہو گئی۔ مدارس و مکاتب بھی اس تعلیم سے ہزاروں کی تعداد میں

بنا ملک نے فائدہ حاصل کیا۔ خدیو معظم اسمٰعیل پاشا کو اس تعمیم معارف پر آمادہ کرنے کا سہرا علامہ جلیل، وزیر جلیل علی پاشا مبارک کے سر ہے جو ابو المعارف کہے جا سکتے ہیں۔ وہی مدارس کی ترتیب نظام میں لانے اور صحیح اصول پر فن تعلیم کو وضع کرنے والے ہیں اس سے قبل محض قیاس پر تعلیمی اصول بنے تھے۔ یہ نیک دل علم پرور وزیر جس روز وزیر ہوئے واپسی تک اُن کا ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جو ترقی تعلیم کے مسئلے سے خالی گزرا ہو۔ اور انھوں نے بہت سے مدارس و مکاتب بلا اجازت حکومت ہی کھول دیے تھے۔ پھر جب موقع مل جاتا تھا منظوری لیکر مستقل کر دیتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ علی مبارک پاشا کی مساعی جمیلہ اور ان کی شاندار تعلیمی کارناموں کو گننے کے لیے ایک مستقل تصنیف درکار ہے۔

نحوی صدیقی

قتل جہاں کے واسطے تازہ پھر اک بہانہ کر

ازافاضات مولانا شاد عظیم آبادی

چشم سیہ میں سرمہ دے زلفِ رسا میں شانہ کر — قتل جہاں کے واسطے تازہ پھر اک بہانہ کر

نالہ ہوا ہے منفعل شہرتِ عام سے عبث — کس نے کہا کہ یوں بلند شورشِ عاشقانہ کر

اہل ہوس بھی ہو گئے آکے حریفِ میکشاں — پیر مغاں الٹ دے خُم، بند شرابخانہ کر

جس پہ ہو آپ محو تو نقش وہ کھینچ ہر طرف — ہاتھ میں کلکِ فکر لے، گھر کو نگارخانہ کر

تشنگی زباں عبث، دل میں بھرے ہیں خار و خس — چھوڑ ابھی برونِ در، فکرِ درونِ خانہ کر

باغ جہاں ہے پُر خطر، بلبلِ زار سے کہو — شاخ بلند و استوار دیکھ کے آشیانہ کر

دیکھ کلام شاد کا، شعر کا ماحصل سمجھ — جاگ کے کر شبیں بسر، فکر کو عارفانہ کر

مسئلۂ اشتراکیت

تنقیدی نقطۂ نظر سے

اشتراکیت کی تحریک موجودہ سوسائٹی کے نظام سرمایہ داری کے خلاف دراصل صدائے احتجاج کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس تحریک کی بنیاد ہی انفرادیت کے خلاف ہے جیسا کہ اس کے لغوی معنی سے عیاں ہے۔ اس کا تمامتر مقصد سرمایہ اور محنت (جو پیدائش دولت کے دو اہم اجزاء لاینفک ہیں) کی باہمی کشاکش کو رفع کرنا اور ان کے باہمی تعلقات کو (جن کا اثر صرف انھیں تک محدود نہیں رہتا بلکہ بحیثیت مجموعی سوسائٹی پر پڑتا ہے) خوشگوار بنانا ہے۔ اس تحریک کے حامیوں کے نزدیک پیدائش اور تقسیم دولت کا ایسا انتظام ہونا چاہیے کہ سوسائٹی کے سب ممبر اس کے ذریعہ سے بہرہ اندوز ہوسکیں۔ اس تحریک کا یورپ کی سرزمین میں اُس وقت آغاز ہوا جب وہاں کی فضا ہر قسم کی برائیوں اور آلودگیوں سے مکدر ہورہی تھی چنانچہ اشتراکئین نے اقتصادی ناانصافیوں کے ہی خلاف اپنی آوازیں نہیں بلند کی بلکہ اخلاقی وسیاسی اصلاح کے بھی وہی لوگ علمبردار ہوئے۔

علم طبعیات کے اس کلیہ میں مطلقاً شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ عمل وردِ عمل میں ایک خاص مناسبت ہوتی ہے جس طرح ساری دنیا میں کلیۂ عمل پیرا نظر آئے گا اسی طرح انسان کی تمدنی وعمرانی حیثیت میں بھی اس کی کارفرمائی سے انکار نہیں۔ انقلاب فرانس دراصل تمام یورپ کا انقلاب تھا لیکن فرانس کی سرزمین اپنی خصوصیتوں کے لحاظ سے اس کے لیے نہایت موزوں ثابت ہوئی یہاں مطلق العنان بادشاہ صرف ملکی وقومی معاملات تک اپنی دخل اندازی کو محدود نہیں کرتے تھے بلکہ خانگی معاملات تک میں شاہی قوانین اپنی تمام دہشت وجبروت کے ساتھ عمل پیرا نظر آتے تھے اسی کا نتیجہ تھا کہ انقلاب کے بعد جب جمہوریا سوسائٹی کا "درمیانی طبقہ" برسر اقتدار ہوا تو ان قوانین کو سب سے پیشتر مٹایا گیا جو شخصی آزادی میں حارج یا مانع تھے۔ درمیانی طبقہ سے وہ لوگ مراد ہیں جو اکثر اپنے کاروبار میں مصروف تھے رؤسا اور نوابوں کے زمانہ میں ان پر طرح

طبقے کے قبود عائد تھے انقلاب نے گویا ان نوابوں کے طریق حکومت کو ہمیشہ کے لیے دنیا سے معدوم کر دیا۔ اس کی جانشینی موجودہ آزاد خیال، حریت پسند طبقہ نے نہایت بے باکانہ طریقہ سے اپنے سر لی طبقے کے خیالات آزادی نہ صرف میدان سیاست تک پہنچ گئے بلکہ مذہب بھی انکی دستبرد سے نہ بچ سکا۔ چنانچہ انھیں لوگوں نے رومن کیتھلک کے رسوم و توہمات کے خلاف سخت جہاد شروع کیا غرضکہ جب تقریباً تمام یورپ نے لبرل طبقہ کی سرکردگی قبول کر لی تو زیادہ سے زیادہ مفاد کے حصول میں موانع باقی نہ رہے۔ نظام سوسائٹی کے ذمہ دار یہی تھے۔ کسی مطلق العنان کی دراز دستیوں کا خوف باقی نہ رہا کیونکہ اب تو دستوریت کی ابتدا ہو چکی تھی، مذہب کے احکام کی ان مادیت پرستوں کے دماغوں میں کچھ وقعت باقی نہ رہی چنانچہ اس زمانہ میں جتنے بڑے بڑے فلسفی اور علم اقتصادیات کے ماہرین پیدا ہوئے وہ بھی ماحول کے واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ہر طرف لیسز فیئر (یعنی ہر قسم کی اقتصادی آزادی) کے نظریہ کا غلغلہ بلند تھا۔ گورنمنٹ تو اپنی تھی ہی شخصی آزادی کا بڑی طرح استعمال کیا گیا۔ بادی النظر میں یہ آزادی جمہوریت کا سنگ بنیاد معلوم ہوتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یورپ کی موجودہ سقیم حالت اسی اصول کی عدم توجہی کی رہین منت ہے۔

جب یہ "طبقہ درمیانی" اپنے تفویض کردہ فرائض سے متجاوز ہونے لگا تو فطرت کے قانون نے اپنی دائمی سنجیدگی اور استغنا کے ساتھ اسکو بھی سزا دینی چاہی چنانچہ تحریک اشتراکیت کے معرض وجود میں آنے کی علت العلل یہی ہے۔ جیسا ہر تحریک کا خاصہ ہے اس میں بھی پہلے ارباب تخیل پیدا ہوئے جن پر مذہبی و اخلاقی رنگ غالب تھا اس کے بعد وہ جماعت آئی جو فلسفہ اور مادیت میں ڈوبی ہوئی تھی ان لوگوں نے ہیئت اجتماعیہ کو بھی علم الحیات پر خیال کیا کہ جس طرح جسم انسانی مختلف مدارج ارتقا طے کرتا ہے بعینہٖ ہیئت اجتماعیہ ان قوانین سے اثر پذیر ہوتی ہے۔ انھوں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ جس طرح موجودہ سوسائٹی کے "طبقہ وسطیٰ" نے طبقہ اعلیٰ" پر غلبہ حاصل کیا ہے اسی طرح "طبقہ ادنیٰ" مستقبل قریب میں تمام دنیا میں برسر اقتدار ہو جائیگا۔ یہ جماعت بھی اپنے

حدود میں حد سے متجاوز ہو گئی۔ ہم اپنے مضمون میں بھی بتلانا چاہتے ہیں کہ اکثر اشتراکئین بھی درمیانی راستہ کی طرف مائل نظر آتے ہیں جو یقیناً اسلام کا مسلک ہے۔ چونکہ اس تحریک کو یورپ کی متحدہ طاقتوں سے مقابلہ کرنا پڑا اس لیے ان اصولوں کو بھی جو فی نفسہ اچھے اور پسندیدہ ہیں نہایت بُری شکل میں پیش کیا گیا ہے۔

سب سے پہلا الزام اشتراکیت کے خلاف یہ ہے کہ "ملکیت ذاتی" کے حقوق یہ نظام تسلیم نہیں کرتا۔ یہ خیال غلط فہمی یا (تجاہل عارفانہ) پر مبنی ہے۔ اشتراکئین کا تو یہ دعویٰ ہے کہ موجودہ نظام سوسائٹی میں "ملکیت ذاتی" تو خال خال ہی نظر آتی ہے۔ اس زمانہ میں محنت اور اس کے ثمرہ میں کوئی مناسبت ہی نہیں۔ جو لوگ زیادہ محنت کرتے ہیں وہی محروم محض ہیں۔ اگر دنیا کے کسی ملک کے اعداد و شمار کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت اچھی طرح ظاہر ہو جائے کہ دنیا میں زیادہ تعداد انھیں فاقہ مستوں کی ہے جو "ملکیت ذاتی" سے بالکل عاری ہیں۔ نہ دنیا کے ممالک میں سے کہیں کے مزدوروں کا منتہائے نظر "ملکیت ذاتی" ہوتا ہے۔ مزدوری سے صرف پیٹ بھرنا مقصد ہوتا ہے اور جو بچ رہا تو وہ اس منحوس ساعت کے لیے پس انداز کر لیا جاتا ہے جب بیماری یا بیکاری سے دوچار ہونا پڑے۔ اس پس انداز سے سطح زندگی کو بلند کرنا یا مزید آسائش بہم پہنچانا مقصود نہیں ہوتا۔ ملکیت ذاتی سے ایک خاص جماعت بہرہ اندوز ہوتی ہے اور سوسائٹی کے عامۃ الناس کو اس سے زیادہ فائدہ نہیں حاصل ہوتا۔ اب وہ زمانہ بھی نہیں جب ایک معمولی مزدور بھی یہ امید کر سکتا کہ ایک روز وہ بڑا سرمایہ دار ہو جائیگا۔ اب تو زمانہ کا رجحان یہ ہے کہ ایک سرمایہ دار کے لیے تو اپنی مرفہ الحالی میں اضافہ کرنے کا موقع حاصل ہے لیکن وہ شخص جسکی حالت خراب ہے اس خستگی و خواری کو دور کرنے کے لیے مواقع موجودہ طریق تمدن نہیں بہم پہنچا سکتا۔ نظام اشتراکی ملکیت ذاتی کے اصول کے خلاف ہے بلکہ موجودہ طریق تمدن کے خلاف ہے جس کی بدولت عوام غربت و افلاس میں مبتلا رہتے ہیں۔ چنانچہ انھیں اسباب کی بنا پر اشتراکئین نے "مساوات مواقع" کا اصول قایم کیا ہے۔ ایک بچہ جو معمولی گھرانے میں پیدا ہوتا ہے اعلیٰ تعلیم اور عمدہ ترتیب

حاصل کر لیتا ہے اور اس کے غریب پڑوسی کا فرزند باوجود زیادہ ذکی اور ذہین ہونے کے ان مواقع سے محروم رہتا ہے یقیناً یہ بالکل درست ہے کہ خود کائنات فطرت میں کسی چیز کو مساوات حاصل نہیں۔ انگریزی کی ایک مثل ہے کہ "فطرت اعادہ کو ناپسند کرتی ہے"۔ دو درخت جنکو نشو ونما کے تقریباً مساوی مواقع حاصل ہو جاتے ہیں جب بھی بالکل ایک سے نہیں ہوتے۔ ممکن ہے کہ جب ایک درخت میں کونپل نکلنا شروع ہوئی ہو تو اس نے مشرقی ہوا کے جھونکے کا اتنا اثر قبول کیا ہو کہ اس کی تمام آیندہ شاخوں کے نکلنے کا رجحان مغرب کی طرف ہو گیا کیا یہ فطرت کی عدم مساوات نہیں؟ خیر۔ ہم اس مافوق الطبعی بحث کو چھوڑتے ہیں۔ سوسائٹی میں مساوات مواقع سے مشابہت کلی مراد نہیں بلکہ ملک کی ذمہ دار جماعت یعنی گورنمنٹ کی طرف سے اس کا اہتمام ہونا چاہیے کہ دہقان کے فرزند کو بھی ایسے حالات بہم پہنچیں کہ وہ بھی اپنے ہر قسم کے پوشیدہ جوہر دکھلا سکے کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ دہقان زادہ جو اپنی تمام عمر ہل بیل کے اہتمام میں گذار دیتا ہے اور جس کی سیاست کا دائرہ اپنے گھر کی چار دیواری یا اپنے گاؤں تک محدود رہتا ہے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع اس کو بہم پہنچ جانے پر نیوٹن یا بوعلی سینا کی طرح سائنس کے کلیات ونظریات قائم کرتا؟

چنانچہ تفریق مراتب تو بیشک معدوم نہیں ہو سکتی اور نہ اشتراکیین یہ چاہتے ہیں۔ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ حکومت بحیثیت نمایندہ عوام ہونے کے اس کی ذمہ دار ہے کہ ہر متنفس کو اعلیٰ سے اعلیٰ قابلیت حاصل کرنیکا پورا پورا موقعہ دیا جائے۔

یہ کہنا کہ جب اشتراکیین ملکیت ذاتی کو یکقلم مٹا دینگے تو تجارت اور عام صنعت وحرفت کا بازار بالکل سرد پڑ جائیگا حقیقت سے اسی قدر دور ہے جیسا کہ پہلا خیال۔ اس قسم کی افواہ کی ترویج صرف مخالفین اپنے پروپگنڈے کی غرض سے کرتے ہیں۔ ایچ۔ جی۔ ویلس صاحب مشہور مورخ انگلستان جو ۱۹۲۰ء میں روس صرف اس لیے تشریف لے گئے تھے کہ وہاں کی سیاسی ومعاشی حالت کا مطالعہ کریں اپنی کتاب میں اس مکالمہ کو لکھتے ہیں جو ان کے اور لینین صدر

جمہوریہ اشتراکی کے درمیان اسی اثنا میں ہوا تھا۔ ویلس صاحب لکھتے ہیں کہ میرا خیال تھا کہ میں لینن میں وہ باتیں پاؤنگا جو کٹر قسم کے مارکس کے متبع میں ہونی چاہئیں۔ لیکن ملاقات کے بعد میرا یہ خیال محض غلط ثابت ہوا۔ ایک امریکن سفیر بھی میرے ساتھ ملاقات کے لیے گیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ لینن سے کچھ خاص باتیں کرنا چاہتا ہے چنانچہ وہ وہاں سے میری واپسی کا منتظر تھا لیکن اثنائے گفتگو میں لینن نے امریکن کی طرف دیکھ کر مجھکو مخاطب کیا کہ ہم امریکہ سے خفیہ تجارتی معاہدہ کر رہے ہیں اور ہم لوگ اہل امریکہ کو سائبیریا میں ۵ سال کے لئے ٹھیکہ دینے کو تیار ہیں تاکہ یہ لوگ وہاں کاشت عمیق کریں اور ساتھ ہی کارخانے قائم کریں۔ اس معاہدہ میں ہم یہ شرط بھی رکھیں گے کہ امریکہ برطانیہ عظمیٰ اور جاپان کی غاصبانہ پالیسی کی مدافعت میں ہماری ممد و معاون ہو۔ یہ روس کی جمہوریت اشتراکی کے صدر کے الفاظ ہیں ان سے ان تمام بیانات کی یکسر تردید ہو جاتی ہے جو اشتراکئین کے خلاف پیش کیے جاتے ہیں کہ اشتراکی ترقی کے معنی یہ ہیں کہ تجارتی و صنعتی ترقی بالکل مسدود ہو جائے۔

سرمایہ داری اشتراکئین کے نزدیک

اشتراکئین کا موجودہ نظام تمدن پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ انسانی توہین جیسی اس زمانہ میں ہوئی ہے ویسی کبھی نہیں ہوئی۔ سرمایہ داروں کے نزدیک "محنت" بھی تجارتی بیع و شری کی حقیقت رکھتی ہے۔ ان کے نزدیک وہ بھی دیگر اشیاء بازاری کی طرح بے روح بیکار وہ چیز ہے۔ ایام سابقہ کی رسم بردہ فروشی کے ذکر سے یورپ کے تہذیب و تمدن پر رعشہ طاری ہو جاتا ہے لیکن فی الواقع آجکل کی نام نہاد آزادی سے اس زمانہ کی غلامی بہتر تھی۔ اس زمانہ میں "محنت" (یعنی پیدائش دولت کا ایک اہم عنصر) ایک غیر جاندار چیز سے تعبیر کی جاتی ہے۔ ایک سرمایہ اصل دار اپنی مشین کی مرمت کرانا اور اپنی آمدنی سے مطالبات فرسودگی کو علیحدہ کرنا ضروری خیال کرتا ہے لیکن اس کو اس بدنصیب انسان کے پس ماندگان کا مطلقاً خیال نہیں ہوتا جو اس کے کارخانے میں کسی مشین کے غیر معمولی صدمہ سے جانبر نہ ہو سکا۔ اگرچہ آجکل

تعلیم اشتراکیت کی نشر و اشاعت کی وجہ سے یورپ کے تمام ممالک کے مزدوروں میں اپنے
حقوق کا احساس پیدا ہو گیا ہے اور ہر جگہ ارباب انعال نے اس قسم کے قوانین پاس کرائے ہیں
جن کی وجہ سے بہ نسبت پیشتر کے اب مزدوروں کو رعایت حاصل ہو گئی ہے لیکن یہ ہرگز نہیں کہا
جا سکتا کہ اب مزدوروں کی حالت میں کوئی خرابی باقی نہیں رہی یا یہ کہ وہ اب بالکل مرفہ الحال
ہیں۔ زندگی کا بیمہ یا فیکٹری ایکٹ کے ذریعہ سے یقیناً اب بہ نسبت پیشتر کے مزدوروں نے اصلاحات
کرالی ہیں جنکی وجہ سے سرمایہ داروں اور مزدوروں کے حقوق کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔

تجارت اور جنگ

جنگ کوئی نئی چیز نہیں کہ اسی زمانہ کے لیے مختص ہو۔ لڑائیاں
ایام سابقہ میں بھی ہوا کرتی تھیں لیکن آج کل کی لڑائیوں کی بنیاد
سرمایہ داری ہے۔ موجودہ تہذیب تجارتی تہذیب ہے۔ اس تہذیب و تمدن کی کہانی کے فوراً بعد
موجودہ زمانہ کی مہیب اور عافیت سوز جنگوں کی داستان سرائی بھی ناگزیر ہے اس وقت تک
یہ کہانی ہمہ وجوہ مکمل نہیں ہوتی جبتک یہ خونیں منظر بھی نظروں کے سامنے سے نہ گزر جائے۔
اس زمانہ میں متمدن ممالک کے نزدیک یہ دو اہم سیاسی مسائل درپیش ہیں کہ کس طرح اپنے ملکی
مصنوعات کے لیے بازار حاصل کیے جائیں اور جس قدر منافع حاصل ہوں ان کو کس جگہ سرمایہ
کی شکل میں لگایا جائے ؟ یہ دونوں مسئلے بالکل لازم و ملزوم ہیں پہلے سیاسی چالوں سے ملکی
مصنوعات کے لیے بازار حاصل کیے جاتے ہیں اور اس کلیہ کا ثبوت بھی دیدیا جاتا ہے کہ کس طرح
سیاسی غلامی اور اقتصادی غلامی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

چونکہ یہ معاشی قانون ہے کہ کسی ملک میں سرمایہ کی زیادتی کیوجہ سے قیمت اشیا بڑھ
جاتی ہے اس لیے وہ منافع جو غیر ممالک کے بازاروں حاصل کیا جاتا ہے اپنے ملک کے کسی کاروبار
میں نہیں لگایا جاتا بلکہ ان غیر متمدن ممالک میں لگایا جاتا ہے جہاں بمقابلہ اپنے ملک کے سرمایہ کی
کمی ہے۔ اور شرح سود زیادہ حاصل کیا جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی وہاں اپنا سیاسی اقتدار قایم کرنیکی
کوشش کی جاتی ہے۔ ان غیر متمدن ممالک میں احتیاطاً اپنے سرمایہ کی حفاظت کی خاطر فوجیں

اور بحری قوت ہر وقت تیار رکھنی پڑتی ہے۔ اس قسم کے واقعات کی مثال مصر اور مراکش کی گذشتہ تاریخ سے خوب واضح ہو جاتی ہے اور انگریزوں اور فرانسیسیوں کے ان دونوں اسلامی ممالک پر قبضہ و تسلط کی تاریخ سے یہ تمام اصول "سرمایہ داری" بخوبی روشن ہو جاتے ہیں۔

پریس ان تمام حرکات کو مستحسن بنانے کے لیے انکو عوام کے سامنے اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ وہ فوراً مسحور ہو جائیں۔ کبھی ان کے جذبات سے اپیل کی جاتی ہے، کبھی مادر وطن کی آہ وزاری ان کے گوش گذار کیجاتی ہے۔ اور ہر طرح سے کوشش کی جاتی ہے کہ اپنی شخصی اغراض کو ملکی و قومی مفاد کی مدافعت کا جامہ پہنایا جائے اگر ترکوں کے خلاف انگلستان جنگ کرنے کا ارادہ کریگا تو یقین جانیے اقتصادی یا سیاسی مفاد پریس کے ذریعہ سے عوام کے سامنے نہیں پیش کیا جائے گا کیونکہ ایسا کرنے سے تو خود اپنی قلعی کھلتی ہے یعنی اگر تھریس کے علاقہ میں ریل کی انگریزی کمپنی قایم کرنے کا ذکر کیا جائے تو ظاہر ہے کہ انگلستان کے مزدوروں کے لیے کوئی خاص اور قابل ذکر فائدہ نہیں۔ اس قسم کا بہت کم ذکر کیا جائیگا۔ ہاں سب سے زیادہ زور اس مسئلہ پر دیا جائیگا کہ گیلی پولی میں انگریز "شہیدوں" کی قبروں کی محافظت انگریز قوم کا مذہبی اور اخلاقی فرض ہے چنانچہ انہیں "شہیدوں" کے نام سے عوام کے جذبات کو ابھارا جائیگا اور ان کو برسر پیکار ہونے کی ترغیب دیجائیگی۔ پروپگنڈا انیسویں صدی عیسوی کی ایجاد ہے۔ اور اس کے ذریعہ سے بھی طریق "سرمایہ داری" نے بہت ترقی کی ہے۔ علامہ اقبال نے مزدوروں کی حالت کا اپنی نظم خضر راہ میں یوں نقشہ کھینچا ہے ؎

مکر کی چالوں سے بازی لیگیا سرمایہ دار انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

بیکاری آج کل "مسئلہ بیکاری" بھی اپنی اہمیت کے لحاظ سے کچھ کم قابل ذکر نہیں۔ اور موجودہ تہذیب و تمدن کی اس سے بڑھکر اور کوئی خرابی قیاس میں نہیں آتی کہ ایک شخص جو ایمانداری کے ساتھ اپنی اور اپنے خاندان کی پرورش کرنا چاہتا ہے لیکن صرف اقتصادی مجبوریوں کی وجہ سے جن پر اس غریب کو کوئی اختیار نہیں وہ اپنے خاندان کو ذلت و خواری کی زندگی

ہیں بچا سکتا۔ مسئلہ بیکاری کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ جب موجودہ "سرمایہ داری" کا دور شروع ہوا اور بڑے بڑے کارخانے قائم ہوئے تو وہ کاشتکار لوگ جو گاؤں میں زمینداروں کے ظلم سے تنگ آ گئے تھے شہروں کی طرف بھاگ چلے۔ پہلے پہل تو ان سب کی کھپت ہو گئی لیکن جب بخار و برق کی ایجاد ہوئی مزدوروں کی ضرورت کم ہو گئی۔ اب ایک بڑی سے بڑی مشین کے لیے بھی ایک شخص نگرانی کے لیے کافی تھا جو صرف اس کی کارروائی کو سمجھ گیا ہو۔ اس طرح مزدوروں کی بڑی جماعت جو برسر کار تھی معطل بیکار ہو گئی۔ اسی زمانہ میں یورپین اقوام کو جو امریکہ، ایشیا اور افریقہ میں تفوق حاصل ہوا تو ملکی مصنوعات کے لیے بازار بھی سیاسی اثر کی وجہ سے بہم پہنچ گئے۔ باوجود آپس کے تجارتی مقابلہ کے کارخانوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی اور ملکی مصنوعات نے اسقدر ترقی کی کہ توازن رسد و طلب قائم نہ رہ سکا۔ اس کا قدرتاً نتیجہ یہ ہوا کہ کساد بازاری کے وقت اکثر کارخانوں کو بند کرنا پڑا۔ ایک تو نئی نئی مشینوں کے استعمال سے "محنت کی" کم ضرورت باقی رہی تھی اس قسم کے تجارتی حالات نے بیکار مزدوروں کی تعداد میں بہت اضافہ کر دیا۔ اب تو آہستہ آہستہ یہ نوبت پہنچ گئی ہے کہ ایک برسر کار مزدور کو اپنی بیکاری کے روز کا ویسا ہی یقین ہوتا ہے جس طرح دن کے بعد رات کا۔ اس کو مرگِ ناگہانی کی طرح اس منحوس ساعت کا انتظار کرنا پڑتا ہے جبکہ وہ محنت و مزدوری سے اپنے خاندان کی پرورش کرنا چاہے گا لیکن اسکو اپنی محنت کی قیمت گرانے کے بعد بھی مزدوری نہیں ملے گی۔

اس قسم کے مناظر یورپ کے تمام صنعتی شہروں کے قرب و جوار میں ایک انسان سال کے بارہوں مہینہ دیکھ سکتا ہے۔ بقول ایک انگریز مصنف کے کہ دنیا کے سب سے مالدار شہر کے گرد و نواح میں ہمیشہ مزدوروں کی ایسی فوج نظر آئے گی جنکی سردی کے موسم میں پوشاک ہی ناکافی نہ ہو گی بلکہ اگر آپ ان کے گھر میں جا کر ایک نمک کی ڈلی بھی تلاش کرنا چاہیں گے تو بمشکل دستیاب ہو گی۔ یہ ہیں موجودہ تمدن کی برکات جس کے مناقب کی مدح سرائی سے ابتک ہماری زبانیں نہیں تھکیں۔ یہ اس جگہ کی حالت ہے جہاں جمہوریت اور دستوریت کے غلغلے نہایت بلند آہنگی کے ساتھ بلند کیے جاتے ہیں۔ اقبال نے مزدوروں کو مخاطب ہو کر دوسری جگہ

بھی خوب کہا ہے ؎ دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب۔ تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
ہم نے اشتراکئین کے خلاف موجودہ سرمایہ داروں کے الزامات اور موجودہ تمدن کے خلاف
اشتراکیت کے اعتراضات پر کافی بحث کر لی۔ ہم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ دونوں فریق اپنے دعووں
میں کس قدر حد سے متجاوز ہیں۔

صحیح راستہ ان دونوں کے بین بین ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ موجودہ تمدن میں خرابیاں
ہیں لیکن ان کو درست کرنے کا طریقہ بھی ابتک غلط استعمال کیا گیا ہے۔

اشتراکیت اور اسلام

ہمارے نزدیک اگر موجودہ کشمکش کو دور کرنے کا کوئی واحد ذریعہ ہے تو وہ تمام عالم کا اصول اسلام کی طرف رجوع کرنا ہے۔ دنیا کے
کسی مذہب نے معاملات زندگی اور معاشرت کے ایسے اصول نہیں مرتب کیے جن پر بجا طور پر
مسلمانوں کو ناز و فخر ہے۔ اسلام نے نہ صرف مسیح کی طرح اخلاقی تعلیم پر اکتفا کی بلکہ مدنی زندگی کے
وہ تمام اصول بھی وضع کیے جن پر اگر آج عمل ہونے لگے۔ تو ہمارا عقیدہ ہے کہ یورپ کی موجودہ کشمکش
مطلقاً باقی نہ رہے اسلام نے اپنے پیرووں کے لیے روحانی مساوات کے دوش بدوش مادی
مساوات پر بھی زور دیا یعنی ہر مسلمان پر زکوٰۃ اسی طرح فرض کی گئی جس طرح اور احکام کی ادائگی۔

زکوٰۃ

زکوٰۃ دراصل ایک مقررہ ٹیکس ہے جو راس المال پر لیا جاتا ہے۔ عموماً اس مال کا
چالیسواں حصہ زکوٰۃ دیجاتی ہے جو تمام مصارف نکالنے کے بعد بچتا ہے۔ جیسا کہ اوپر
ہم کہہ چکے ہیں۔ عام مرفع الحالی کا اندازہ صرف تناسب آمدنی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ آمدنی متناسب
کرنے کی کیا دنیا کے کسی مدبر نے اس سے بہتر ترکیب بتلائی ہے؟ یقیناً اس کا جواب نفی میں ہے
اگر دنیا تمدنی تاریخ کا عہد زرین دیکھنا چاہتی ہے تو اسلام کی تاریخ کے علاوہ کوئی تاریخ اپنے آپ کو
پیش کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ تناسب آمدنی کی مثال کیا اس واقعہ سے بہتر کہیں دنیا میں
مل سکتی ہے جب لوگ اس کے متلاشی رہتے تھے کہ کوئی صدقہ قبول کرنے والا ملے۔
آج تک جو بڑے بڑے معاشئین پیدا ہوئے تقریباً سب انفرادیت کے علمبردار تھے۔ چنانچہ

انھوں نے "اصل" پر معمولی سا ٹیکس لگانے کی بھی سخت مخالفت کی۔ ان سب نے سب سے بڑی یہ وجہ بیان کی کہ اصل پر اگر ٹیکس لگایا جائیگا تو وہ "اصل" بازار سے فرار ہو جائیگا بعضوں نے لفظ Shy استعمال کیا ہے یعنی "اصل" شرمیلا ہو جائیگا اور تجارت وصنعت کے میدان میں نہ آئے گا۔ اور اس طرح عام قومی تجارت کو صدمہ پہنچیگا۔ ہم دریافت کرتے ہیں کہ کیا مسلمانوں نے باوجود اس اصل پر ٹیکس قائم ہو جانے کے تجارت وصنعت میں ترقی نہیں کی تھی۔ کیا اس زمانے میں عربوں اور مصریوں کی تجارت تمام دنیا میں پھیلی ہوئی نہ تھی؟

جیسا کہ ہم ابھی کہہ چکے ہیں دنیا اپنے تلخ تجربوں کے بعد پھر میانہ روی یعنی (مسلک اسلام) کی طرف رجوع کر رہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ واقعات کی منطق کے سامنے کسی فلسفی کی منطق نہیں چلتی گذشتہ سال سوئٹزر لینڈ کی پارلیمنٹ میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ "اصل" پر بھی ٹیکس لگانا چاہیے۔ چنانچہ ممبران اشتراکی نے تقریباً اکثریت اپنے ہم نوا بنالی لیکن چونکہ معاملہ نہایت اہم تھا عوام سے استصواب رائے کیا گیا (جیسا کہ وہاں کا ملکی دستور ہے) اسی زمانہ میں سوئٹزر لینڈ کے سکہ کی قیمت تمام بڑے بڑے بازاروں میں گر گئی۔ یورپ کے تمام ممالک کے اور خصوصاً انگلستان کے سرمایہ داروں نے جنکا "اصل" سوئٹزر لینڈ میں لگا ہوا تھا اپنی اپنی گورنمنٹوں سے خفیہ طور پر سوئٹزر لینڈ کا معاملہ خاطر خواہ طے کرانے کی درخواستیں کیں۔ اسوقت تمام یورپ میں سراسیمگی اور بدحواسی کا عالم تھا کیونکہ اس معاملہ کے بعد سب ممالک سوئٹزر لینڈ کی ضرور پیروی کرتے۔

خود انگلستان کے اراکین حزب العمال نے یہ تجویز منظور کی کہ "اصل" پر بھی ٹیکس لگنا چاہیے چنانچہ ان لوگوں نے اس "اصل" پر جو ایام جنگ میں سامان حرب وغیرہ تیار کرنے میں حاصل کیا گیا ہے ایک خاص ٹیکس "لگانے میں کچھ کامیابی حاصل کر لی۔ کیونکہ ایام جنگ میں جو آمدنی حاصل کی گئی۔ اس کی ملکیت کی تمام قوم حقدار ہے اور خاص شخص یا کمپنی کو اپنی ملکیت کہنا بے انصافی ہوگی۔ اس لیے ایک [illegible] ماورائے آمدنی کے ٹیکس کے جو اس اصل سے حاصل کی گئی ہو مقرر کیا گیا۔ غرضکہ ہر طرف سچائی کی طرف اقدام ہو رہا ہے اور یہ امید کرنا بیجا نہ ہوگا کہ تمام اقوام عالم

اصول اسلام کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جاوینگے۔

حرمت ربا جس طرح مسئلہ زکوٰۃ کی اہمیت کو عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہی اس سے زیادہ حرمت ربوٰے کے متعلق تعلیم یافتہ لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں بعضوں نے تو یہ فیصلہ ہی کر دیا ہے کہ مسلمانوں کے ادبار و افلاس کے اسباب میں سے ایک حرمت ربا اور زکوٰۃ دینا بھی ہی۔ کیونکہ دولت و سرمایہ کے بڑھانے کا اتنا موقع نہیں دیا جاتا ہی جتنا اس میں سے سالا نکل جاتا ہی۔ حرمت ربوٰے کے ذریعہ اسلام نے صرف دائن و مدیون یعنی سوسائٹی کے دو ممبروں کے ناگوار تعلقات قایم کرنے کا موقعہ ہی نہیں دیا بلکہ ہمیشہ کے لیے سرمایہ داروں کی غاصبانہ چیرہ دستیوں کو مٹا دیا۔ موجودہ نظام تمدن جو تمامتر خود غرضی پر مبنی ہے درست کرنے کے لیے اسلام نے اپنے احکام کے ذریعہ صحیح راستہ بتلا دیا۔ یہ اعتراض کیا جا سکتا ہی کہ خود غرضی تو فطرتہً جذبات انسانی کی محرک ہی اور جس طرح کہ فلسفی مِل نے کہا ہی۔ کہ اگر کوئی شخص اپنی پندار میں نہایت نیک کام کرتا ہی وہ بھی دراصل خود غرضی پر مبنی ہوتا ہی۔" اگر کوئی شخص کسی پر رحم کرتا ہی تو اس میں بھی خود غرضی کا شائبہ ضرور ہے کیونکہ کسی دوسرے کو مصیبت میں دیکھ کر انسان خود دل گرفتہ اور آزردہ خاطر ہوتا ہی اس لیے وہ اُس پر رحم کرتا ہی۔ یعنی جذبات عالیہ بھی تمامتر خود غرضی پر مبنی ہیں۔ لیکن ہم کو اس فلسفیانہ بحث سے سروکار نہیں۔ ہر معقول انسان کے نزدیک (یقیناً فلسفی بھی جن میں داخل ہی) خود غرضانہ حرکات اسی حد تک جائز ہیں جب تک کہ اس شخص کی خود غرضی سے اجتماعی مفاد کو نقصان کا اندیشہ نہو۔

غرضکہ اگر اقوام یورپ اپنی موجودہ معاشی پیچیدگیوں کو رفع کرنا چاہتی ہیں تو اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار ان کے پاس نہیں کہ وہ بھی اسلامی اصول پر عمل پیرا ہوں۔ چنانچہ ان اصول پر ایک حد تک جمہوریہ روس میں حکومت کی طرف سے عمل ہو رہا ہی لیکن یہ لوگ کبھی کبھی حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ مثلاً قانون میراث کو اُنھوں نے یکسر اڑا دیا ہے تاہم امید ہی کہ عنقریب جب مدنی زندگی اور ہیئت اجتماعیہ کے معاملات زندگی کا ان لوگوں کو تجربہ ہو گا تو آہستہ آہستہ درمیانی راستہ پر آجائینگے۔

یوسف حسین خاں

شذرات

عالم اسلامی کا موجودہ اضطراب حیات ملی کی کشمکش تمام دنیا کے مسلمانوں کی توجہ کی محتاج ہی اسی لیے دور و نزدیک متعدد تحریکیں جداگانہ ناموں اور مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتیں۔ جنگ بلقان و جنگ یورپ کے بعد ترکی، عرب، و ترکستان و دیگر اقطاع عالم کے مسلمانوں نے اس قدر ضرور محسوس کر لیا کہ ملت اسلامی کی بقا جمعیت و شیرازہ بندی سے ہی ممکن ہی اور ایسے وقت میں جبکہ تمام عالم اپنی ہوسناکیوں اور حرص و آز کا آماجگاہ اسلامی ممالک کو بنائے ہوئے ہی اس مسئلہ کی اہمیت اور فوری ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہی۔ لیکن گزشتہ عالمگیر جنگ کے انتشار و اضطرار میں کسی عملی کام کی گنجائش درکنار اس طرف پوری توجہ کا بھی موقع نہ تھا لیکن اب وہ وقت گزر چکا ہی اور ہر ملک اپنی استطاعت اور ہر فرد اپنی بصیرت کے موافق اس مقصد عظیم کی طرف متوجہ ہو گیا ہی۔

اسی سلسلہ میں مولانا ابو الکلام آزاد کی نگرانی میں "الجامعہ" کا اجرا ایک مبارک فال ہی اور مسلمانان ہند کی سیاسی اہمیت کا لحاظ کرتے ہوئے "الجامعہ" کو آج سے پہلے جاری ہو جانا چاہیے تھا مولانا نے اس رسالہ کو عربی زبان میں شائع کیا ہی جو بلاشبہ تمام ممالک اسلامی کی زبان ہی اور چونکہ ایک حصہ زبان فارسی کا بھی رکھا گیا ہی اس لیے تمام اسلامی ممالک میں اس رسالہ کا پڑھا اور سمجھا جانا یقینی ہی۔

"الجامعہ" کے مقاصد میں مندرجۂ ذیل امور کا بھی ذکر کیا گیا ہی:۔

(۱) تمام ممالک اسلامیہ و شرقیہ اور بالخصوص ہندوستان و ممالک اسلام و عرب میں باہمی تعلقات پیدا کرنا اور ایک دوسرے ملک کے واقعات و حالات پر روشنی ڈالنا۔

(۲) اس وقت کہ تمام دنیا انقلابات و تغیرات کی آماجگاہ بنی ہوئی ہی اور ہر ملک میں جدید اصلاحات و گزشتہ نقائص کے دور کرنے کی فکر کیجا رہی ہی اس امر کی کوشش کرنا کہ ان

تمام مساعی کو باہم گرایک رشتہ میں منسلک کر دیا جائے اور اس میں یکجہتی پیدا کی جائے۔

گزشتہ عالمگیر جنگ اپنے عظیم الشان نتائج ہلاکت وتباہی کے اعتبار سے آپ اپنی نظیر ہے کتنی ہی سلطنتیں صفحۂ ہستی سے محو ہو گئیں، تاجدار بے خانماں، ممالک معدوم اور اقوام وملل حرف باطل کی طرح مٹ گئے۔ اتلاف جان ونقصان مال کا اندازہ لگانا تو غالباً آج بھی ناممکن ہے لیکن سب سے بڑھ کر جو انقلاب ہوا ہے وہ خیالات وروایات کی تبدیلی ہے جس نے آج ملکوں کے نام، قوموں کی حیثیت، سلطنتوں کے نظام، اور دنیا کی اکثر مسلمہ اصولوں کو اس طرح بدل دیا گویا اُن کا وجود ہی نہ تھا اور اگر تھا بھی تو مٹ جانے ہی کے لیے!

ان حالات کا لازمی نتیجہ تھا کہ بعض طاقتور سلطنتیں اور سرمایہ دار قومیں آج بالکل مفلوک الحال ہیں اور عام فلاکت ونکبت تو تقریباً یورپ کے ہر ملک پر چھائی ہوئی ہے لیکن قوموں کی تاریخ میں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ اس عام بربادی ومالی مشکلات کا اگر سب سے کم کسی سلطنت پر اثر پڑا ہے تو وہ سلطنت ترکی ہے!

اگرچہ سلطنت ترکی کے پاس مال ومتاع نہ تھا اُس کے ذخائر وسائل دولت زمین میں دفن تھے اُس کے یہاں مالیات کے نبض شناس اور صنعت وحرفت کے ماہر نہ تھے لیکن آج اُس کا سکہ دنیا کے بازار میں تقریباً وہی قیمت رکھتا ہے جو جنگ سے قبل تھی اور زمانہ جنگ کے طویل اندوہناک عرصہ میں اس نے صرف ۱۶ کرور پونڈ کا کاغذی سکہ اپنی سلطنت میں جاری کیا تھا، جو ایسے ملک کے لیے جس کے خزائن دولت بیشمار ہوں اور خام پیداوار کی فراوانی ضرب المثل ہو کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتی

اگرچہ دنیا عرصہ سے امن وامان کی محتاج ہے لیکن گزشتہ چند سال کی خونریزی نے عام اضطراب وبےچینی پیدا کر دی ہے جس کا لازمی نتیجہ امن وعافیت کی طلب، اور سکون وراحت کی تلاش ہے۔ لیکن عرصہ تک زمانہ کی رفتار اس قسم کی ہر کوشش کو مظلوم کی آواز کی طرح باقی

رہی اور اپنی ہولناک سفاکیوں کے لیے نت نئے طرز ستم ایجاد کرتی رہی۔ مگر ایسا وقت بھی آتا ہے جب "ورنہ ستانی بہ ستم می رسد" کا دست غضب اُن ظالمانہ کوششوں کا انسداد کرنے کے لیے بڑھتا ہے اور دنیا محو حیرت رہ جاتی ہے کہ جرمنی و آسٹریا جو جنگ جدال، قتل و غارت، اور ہلاکت و بربادی کے مرادف سمجھے جاتے تھے آج جنگ کے خیال سے بھی سعد دور ہیں کہ جرمنی میں باوجود ہزارہا اختلافات باہمی و مناقشات اندرونی کے اس ایک امر میں سب متفق ہیں کہ آیندہ خواہ کچھ ہی ہو لیکن جنگ نہ ہو! چنانچہ فرانس کے خلاف ملک ستیاگرہ اس کی روشن مثال ہے۔ آسٹریا اپنے حلیفوں سے ایک منزل اور آگے ہے اور اگر تازہ اطلاعات صحیح ہیں تو اس نے اپنے ملک سے فوجی قوت کو بالکل ختم کر کے ایک ایسی مثال قائم کی ہے جس کی نظیر آج تمام عالم میں کہیں نہیں مل سکتی۔ سال رواں کے بجٹ میں جس قدر رقم فوجی اخراجات کے لیے رکھی گئی تھی وہ سب نامنظور کر دی گئی اور اُس کی بجائے کسی قدر پولیس میں اضافہ کر دیا گیا ہے اور یہ کوشش ہے کہ اندرونی انتظامات بالکل پولیس ہی کے ہاتھ میں ہوں اور چونکہ اس وقت جنگ کا تصور بھی نہیں لہذا فوج کی مطلق ضرورت نہیں۔

مختلف حصص ملک میں بعض اندوہگیں واقعات اور بالخصوص صوبہ پنجاب کے تازہ فسادات قومی تحریک اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے موت کا حکم رکھتے ہیں۔ موجودہ حالات میں ہر شخص یہ سوال کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا واقعی وہ ہندو مسلم اتحاد ایک فرضی و مصنوعی چیز تھی جو محض سیاسی مصلحتوں اور ملکی ضروریات کے لیے ایک وقت خاص کے لیے وضع کی گئی تھی یا درحقیقت وہ ایک ایسی ضرورت ہے جس کا وجود ہمیشہ اور ہر حال میں ضروری ہے؟ اس بحث کے مختلف پہلوؤں اور اُن کی تشریح و توضیح اور رد و قدح کے لیے اخبارات کے صفحات ہی زیادہ موزوں ہیں لیکن ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہ ہندوستان کی مختلف قوموں میں اتحاد باہمی اور مقاصد سیاسی میں یکجہتی ملک کی فلاح کے لیے لازمی اور

ضروری ہے صرف اس قدر عرض کریں گے کہ اگر اکابرین قوم اختلافات باہمی پر پردہ ڈالنے کے بجائے اُن کو وضاحت سے بیان کرکے جرأت ودلیری کے ساتھ اتحادِ عمل کے صحیح معنے سمجھانے کی کوشش کرتے اور لفظ "اتحاد" کو الف لیلہ کا "سیسم" یا اسم اعظم ہوجانے سے بچاتے تو غالباً یہ صورت نہ پیدا ہوتی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ غفلت اخبارات کی طرف سے کی گئی جن کی نامناسب وقابل اعتراض تحریروں نے باہمی منافرت وجماعتی اختلافات ومذہبی جذبات کو اس طرح برانگیختہ کردیا کہ اب صورت اصلاح نظر نہیں آتی۔

عرصہ سے ملک میں بااثر وقابل وقعت اخبارات کی کمی ہے اور گزشتہ دو سال کے انقلاب انگیز زمانہ میں اگر "ینگ انڈیا" کی رہنمائی معاون نہ ہوتی تو غالباً یہ یا اسی قسم کا کوئی دوسرا فتنہ اُٹھ کھڑا ہوتا۔ آج جبکہ مصیبت کا وقت نظر آرہا ہے ایک باوقعت وبااثر اخبار کی ضرورت اور زیادہ محسوس ہوتی ہے اور غالباً محض انگریزی اخبارات کو موجودہ ضروریات کے لیے کافی خیال کرلینا صحیح نہیں ہے۔

جناب شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ کو حضرت عبدالعزیز چاوش کا ایک مکتوب بزبان عربی موصول ہوا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت ملیہ انگورہ نے ایک محکمہ بنام "امور شرعیہ واوقاف وکالتی تدقیقات وتالیفات اسلامیہ ہئیت علمیہ سی" قائم کیا ہے جس کے روح رواں علامہ موصوف ہیں۔ اور ان کی خواہش ہے کہ یہ ادارہ دنیائے اسلام کے علوم وفنون ومساعی علمیہ وادبیہ کا مرکز قرار پائے۔ چنانچہ اکثر اسلامی مدارس کو انھوں نے اتحاد عمل کی دعوت دی ہے۔ امید ہے کہ اشاعت آیندہ میں ہم اصل تحریر مع ترجمہ شائع کرسکیں گے۔

جامعۂ ملیۂ اسلامیہ علیگڈھ
کے
شعبہ تصنیف وتالیف کی شایع کردہ کتابیں

(۱) ازہار العرب - مؤلفہ مولانا اسلم رقی	قیمت غیر مجلد ۸ر
(۲) تاریخ الامت - مصنفہ مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری	قیمت ۱ ۸ر
(۳) ایضاً (حصہ دوم) ۶ ر (حصہ سوم)	" ۱ ۸ر
(۴) مبادی معاشیات - از پروفیسر ذاکر حسین خاں صاحب	" ۱ ۵
(۵) اخبار الدولتین - از مولانا نیاز فتحپوری	(زیر طبع)
(۶) انتخاب کلام میر - مرتبہ مولوی نور الرحمن بی اے	(")
(۷) خطبۂ شیخ الہند - (بہ تقریب افتتاح جامعہ)	قیمت ۲ر
(۸) خطبۂ مسیح الملک - حکیم اجمل خاں صاحب	" ۲ر
(۹) انتخاب مضامین جوہر - معہ تصویر	" ۶ر
(۱۰) ترکوں کی کہانیاں	" ۱۲ر

المشتہر

مہتمم مکتبۂ جامعۂ ملیۂ اسلامیہ علیگڑھ

دیوان غالب ۔ مطبع کاویانی برلن جو علوم فارسی جدیدہ و علوم شرقی کی خدمت سے بیحد مشہور ہو چکا ہے دیوان غالب (پاکٹ ایڈیشن) بکمال صحت و عمدگی کے ساتھ طبع کر رہا ہے جو اس ماہ کے آخر تک وصول ہو جائے گا اور سوائے مکتبہ جامعہ ملیہ کے کسی دوسری جگہ نہیں مل سکے گا نہایت خوشنما جلد اور نفیس کاغذ و طباعت

مطبع شرکت کاویانی برلن

کے سول ایجنٹ ہونے کی حیثیت سے مندرجہ ذیل کتابیں مکتبہ ہذا میں موجود رہتی ہیں۔

۱۔ سفرنامہ ناصر خسرو مع سعادت نامہ و روشنائی نامہ	۶ روپیہ ۸ آنہ
۲۔ تاریخ سنی ملوک الارض مصنفہ حمزہ اصفہانی	۲ روپیہ ۸ آنہ
۳۔ تیاتر (ڈراما) مصنفہ نظام الدولہ مرزا ملکم خان	۲ روپیہ ۸ آنہ
۴۔ موش وگربہ (نظم) مصنفہ عبید زاکانی	۵ آنہ ۶ پائی

علاوہ ان کتابوں کے اردو زبان کی تمام مستند و مقبول تصانیف اور جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کے نصاب کی درسی کتابیں مکتبہ ہذا میں مل سکتی ہیں۔

المشتہر

مہتمم مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

الله اکبر

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

کا

ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ نور الرحمٰن

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

قیمت سالانہ للعہ ر

فہرست مضامین

جامعہ

جلد — شوال المعظم ۱۳۴۱ھ مطابق مئی ۱۹۲۳ء — نمبر ۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

جلد ۱ شوال المعظم ۱۳۴۱ھ مطابق مئی ۱۹۲۳ء نمبر ۵

ایسٹر کا خواب

(مسٹر ولیم شوانز نے خاص "جامعہ" کے لیے مرحمت فرمایا)

یا ایہا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ وجعلناکم شعوباً و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (قرآن)

بہار کی پیاری جانفزا نظر نے ندیوں اور چشموں کو، جنھیں برف نے جکڑ رکھا تھا، رہا کر دیا ہی؛

وادیوں میں امید کی مسرت سرسبز ہو رہی ہی؛

مٹن جاڑے نے ضعف کے سبب پسپا ہو کر ناہموار پہاڑیوں میں پناہ لی ہی؛

اور بھاگتے بھاگتے وہاں سے بھی میدانوں کے سبزپوش سطح پر برف کے چھوٹے چھوٹے

دانوں کی بوچھار کر رہا ہی؛

میں گاؤں کی چہل پہل کی آواز سن رہا ہوں

یہی ہے غریبوں کا سچا آسمان
ہر چھوٹا بڑا خوشی کے نعرے بلند کر رہا ہے
یہاں میں انسان ہوں
اور یہیں میں انسان ہو سکتا ہوں

(گوئٹے : فاؤسٹ)

بدنفس، بدخصال انسان مردود اور ہلاک ہوگا۔
بھیڑیے اور بھیڑیں ساتھ ساتھ رہینگی۔

(انجیل مقدس)

صفحۂ عالم پر وہ تنہا قوم جس کا تعلق اُس جنگ سے نہیں تھا جو مغرب، مشرق، اور جنوب کے ملکوں نے حد سے زیادہ ذہنی اور اقتصادی ترقی کرنے والے جرمنی سے چھیڑی تھی؛ وہ تنہا قوم جس کے دامن پر اس محاربۂ باطل کی خونریزی، طمع اور نفرت کا دھبہ نہیں ہے وہ قطب شمالی کے ایسکیمو Eskimos ہیں۔ اسی لیے میرے خواب کے دیوتا نے پانچوں براعظم کے ممالک کے قائدین کو گاڈھاب میں، جو جنوبی گرین لینڈ کے مغربی ساحل پر ایک پُرامن بستی ہے Good Friday منانے کے لیے ایک مجلس میں مدعو کیا۔ دراصل پہلے شمالی گرین لینڈ میں مقام کرسٹن ھاب Christenhaab دائمی امن کے مسکن کی حیثیت سے منتخب کیا گیا تھا لیکن یہودی اور مسلمان نام پر معترض ہوئے وہ چاہتے تھے کہ سب لوگ محبت، عقیدت، اور امید کے مساوی حقوق کے ساتھ آئیں اور یہ صرف گاڈھاب، "خدا کے بندرگاہ" میں ممکن تھا۔

صرف خواب میں، جو زمان و مکاں کے ماورا اپنی اُڑان اُڑتا ہے، بھیڑیے اور بھیڑیں شیر اور ہرن، عقاب اور کبوتر، امن و امان کے ساتھ پہلو بہ پہلو بیٹھ سکتے ہیں۔ اس لیے

یہ قابل یقین ہو کہ میرے گرین لینڈ والے مستقبل کے معبد میں ولیم ثانی اور ووڈرو ولسن
کونو اور پوان کارے، لینن اور لائڈ جارج، مسولینی اور نر ائیل، ہنیٹش اور
کمال پاشا، سنیاٹسین اور یاما گاتا، ھیوزا اور ڈیاز، بوتھا اور گاندھی سب جمع
تھے۔ اسی لیے یہ بھی باور کیا جا سکتا ہو کہ یہ لوگ پیرس اور سیلز، کینس اور لوزان کی طرح
حریفانہ پڑاؤ میں منافق دلوں اور زبانوں کے ساتھ ایک دوسرے کو حملہ، درندہ پن اور فریب
کے انداز سے نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ ان پشیمان لوگوں کی طرح جنھوں نے گمراہی اور شامت
سے ایک دوسرے کو دکھ دیا ہو اور اس لیے اب اسی قدر گرمجوشی کے مصافحے بخاموشی یہ
ثابت کرتے ہیں کہ جو کچھ گزر چکا ہو وہ اب حقیقت میں فراموش کر دیا جائے گا اور ہمیشہ
کے لیے امن الٰہی کا دور دورہ رہے گا، دلوں کے آسمان پر اور ذہن کی دنیا میں۔

تھمسٹاکلیس پوان کارے اپنے سیدھے ہاتھ سے دل تھامے اور سفید بالوں والا
سر سینہ پر جھکائے اٹھتا ہو اور سلسلہ کلام یوں شروع کرتا ہو:۔

”بھائیو! جب میں نے اپنے پیارے وطن کی عظمت اور اقتدار کی خاطر انگلستان کے
ایڈورڈ اور روس کے نکولا کے ساتھ مل کر مجبور اور اسلحہ کے بوجھ میں دبے ہوئے جرمنی
کے خلاف ذلت اور بربادی کی جنگ چھیڑی، اُس وقت میں گمراہی میں مبتلا تھا۔ اے ہوہن زولر
اے ہابسبرگ والو، اے ھیسن والو، اے کوبرگ والو! میری خطا معاف کرو اور پیارے
خدا کے سامنے میری سفارش کرکے میری مدد کرو تاکہ لاکھوں بیگناہ مقتولوں کا خون تابہ
میری آنکھوں سے نہ ٹپکے!“

شکستہ حال ولیم جو اپنے گناہوں کے کفارہ میں جرمنی راہبوں کے کپڑے پہنے
اور ڈاڑھی بڑھائے تھا، رقت آمیز لہجہ میں جواب دینے کھڑا ہوا:۔

”پیارے ہمسایہ اور دوست! یہی التجا میں تجھ سے اور سب خدا کے بندوں سے کرتا ہوں
ہم سب کے سب گمراہ تھے۔ ہم سب اندھے ہو گئے تھے۔ میں نے بھی بارہا تلوار اٹھائی ہو لیکن

یقین جانو میں نے جو کچھ بھی کیا خوف سے کیا۔ مجھے ڈر تھا۔ اپنے تاج کے لیے۔ لیکن میرے ضمیر پر اس سے بھی بدتر گناہ کا بوجھ ہی۔ میں نے اپنے جرمن بھائی کو جو مزدور کے لباس میں تھا "بیوقوف" اور "کمبخت"، کہا۔ تم جانتے ہو کہ ناصرہ کے خدا آسا باشندے نے ایسے روحانی قتل کے لیے کیسی خوفناک سزا مقرر کی ہی؟"

اس کے بعد لائڈ جارج جس نے ایک زمانہ میں زرعی زمین کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا اٹھا۔ "عیسائی بھائیو! تم دونوں سچ کہتے ہو۔ زمین پر صرف اسی وقت سچا امن ہو سکتا ہی جبکہ ہم سب بلا کچھ چھپائے ہوئے پشیمانی کے انداز میں اپنے سب گناہوں کا اعتراف کریں۔ لیکن پیارے جیمس اور غریب ولیم! تمھارے گناہوں کی کیا حقیقت ہی میری ذلیل حرکات اور ریاکاری کے سامنے۔ جب میں جرمنی پر سارقانہ فتح پانے کے بعد انگریز قوم کے گرجا میں جاکر نماز شکر ادا کرنے کی تلقین کرتا تھا۔ اس وقت میرا دل اپنے دریائے اسپرے Spree کے کنارے رہنے والے عزیزوں کے خلاف نفرت سے لبریز تھا۔ خدا میرے اس انگریزی جھوٹ کو معاف کرے!"

ووڈرو ولسن اس انداز سے آگے بڑھا کہ اس کے لباس سے استری کی صاف ستھری شکنیں مل دل کر مٹ گئی تھیں اور کلاہ میرزائی کی جگہ ایک کانٹوں کا تاج اس کے ہاتھ میں تھا۔ "جرمنو- رومانو- سلافو- منگولو- افانو- بھائیو! کیا میں تم سب میں ذلیل ترین فرد نہ تھا جبکہ میں نے تقدس مآب معصوم شکل بنائے ہوئے مسافر جہازوں پر آلات قتل بار کرا کے اپنے ان دینی بھائیوں کے خلاف استعمال ہونے کے لیے بھیجے جنھیں لوگوں نے مجھ سے جدا کر دیا تھا۔ جبکہ میں نے صلح کے وقت اس المناک ڈراما کو ایک شیطانی کامیڈی بنا دیا۔ کیا تم اندازہ کر سکتے ہو کہ اس دن سے آجتک کیوں جنون میرا پیچھا کر رہا ہی اور کیوں میرا جسم زار و نزار ہو گیا ہی؟"

لینن روسی چغہ پہنے اور کمر رسی سے باندھے، پیر میں کھڑاؤں ننگے سر اٹھا۔

"اے خدا کے غریب بے مایہ لوگو (Proleteriat) اپنی مقدس ملاک کی جو نعمتیں اب خدا خدا کر کے ملی ہیں حفاظت کرو اور ہم لوگوں سے جو صدیوں سے پسے اور روندے جا رہے ہیں مل کر سب سے خوفناک دشمن کا مقابلہ کرو، جو خود ہمارے سینے کے اندر ہی اور پسندیدہ اور نیک جذبہ کو دبانا چاہتا ہے۔ آؤ ہم سب رشک، حسد، نفرت اور بدباطنی، تمام جبنی اور شیطانی قوتوں کے خلاف آخری لڑائی، آخری جہاد کا اعلان کریں۔ میرے ضمیر پر بھی اتنا بوجھ ہے جو ایک معمولی آدمی سے کے اٹھائے نہیں اٹھ سکتا۔ مجھے یہ بوجھ سر سے اتارنا اور خطاؤں کی تلافی کرنا ہے۔ ہم جہنم پر ضرور فتح پائیں گے اگر محبت ہمارا قول اور محبت ہی ہمارا فعل ہے!"

ان الفاظ کو سنکر مشرق بعید کے ایشیائی اُس چھوٹے سے مجمع بڑے کے وسط میں آ کھڑے ہوئے اور ان کے ہندی رہنما گاندھی نے جن کے متین چہرے پر ابتک قید زنگ کا رنگ جھلک رہا تھا دعا کے انداز میں کہنا شروع کیا:۔

"اے پرماتما! ہم سب کو بخش دے کہ ہم جو کچھ کرتے تھے اسے سمجھتے نہ تھے۔ لیکن آج سے اے خالق برتر پرستش ہو تیرے نام کی۔ چین سے لے روئے والی زمین کو اور مست نصیب ہو مصیبت زدہ انسانوں کو۔ آمین!"

سب نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر ایک حلقہ بنا لیا اور مشترکہ انسانی معبد کے اس پرانے گیت کو گانا شروع کیا:۔

بھائیو۔ اس حلقہ میں شامل ہونے کے لیے اپنے اپنے ہاتھ بڑھاؤ۔ اس پیاری مقدس ساعت نے ہمیں عالم قدوس کے انوار سے روشناس کر دیا ہے اپنی ارضی آلودگیوں کو پھینک دو۔ ہماری دوستی کی ہم آہنگیاں ہمیشہ حسن و خوبی سے باقی رہیں۔ آمین۔ آمین۔ آمین

آخری آمین، کے ساتھ ایک نگاہ کو خیرہ کر دینے والی بجلی چمکی، جاڑے کے نیلے آسمان سے جس کے در چوپٹ کھل گئے تھے۔ اب موسم بہار کے گیت اُس شمالی آزادی یافتہ زمین پر گائے جا رہے تھے جو ابھی چند منٹ پہلے برف سے جکڑی ہوئی تھی .... آسمان سے ایک ندا آئی:۔

۶

"آج سے میری زمین انسانوں کے ہاتھوں خراب نہ ہوگی۔ یہ ویسی ہی مکمل ہوگی جیسی میری آسمانی سلطنت ہے۔ کیونکہ جیسے تیسے آج تم سب نے محبت کا اقرار کر لیا ہے۔ امن و چین تمھیں نصیب ہو اور ہمیشہ قائم رہے۔ تمھیں اپنے خالق کا "ایسٹر" مبارک"

تاریخ اور اُس کا موضوع

ہر علم و فن کا ایک مخصوص موضوعِ سخن ہوتا ہے اور بحث کے لیے متعین حدود ہوتے ہیں جن سے آگے بڑھنا گویا دوسرے کی مملکت میں مداخلت بیجا کرنی ہے۔ مثلاً ریاضی صرف اعداد سے بحث کرتی ہے۔ نفسیات کا روئے سخن انسان کی دماغی و جذبی کیفیت سے ہوتا ہے۔ ریاضی کو نہ کیفیات قلبی و حسیات دماغی سے غرض ہے اور نہ نفسیات کو اعداد و شمار سے مطلب۔ لیکن ہمارے مورخین کے نزدیک تاریخ کے لیے کوئی متعین حدود نہیں۔ فلسفہ کے لفظ کی طرح تاریخ کا استعمال بھی ہر موقع و محل کے لیے ہونے لگا ہے اور چند قصے، افسانے اور واقعات گزشتہ کا جاننے والا بآسانی مورخ کا لقب پا سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ان چند علوم میں سے ہے جسے انسان نے اپنے ساتھ لیکر دائرۂ تہذیب میں قدم رکھا اور آج بھی دیگر علوم کی طرح اس کا درجہ کسی سے کم نہیں۔ سطور ذیل میں ہم اس پر بحث کریں گے کہ تاریخ کا مفہوم مختلف زمانوں اور مختلف اشخاص کے نزدیک اب تک کیا رہا ہے؟ اور درحقیقت اس کا صحیح موضوع کیا ہونا چاہیے؟

تاریخ اب تک کیا تھی؟

یوں تو انسان نے جب سے اپنی تمدنی زندگی شروع کی، تاریخ کا آغاز اسی کے ساتھ ساتھ ہوا لیکن علمی حیثیت سے اس کا پتہ سب سے پہلے چھٹی صدی قبل مسیح میں یونانیوں کے ہاں ملتا ہے جو اس لفظ کو عام معنی میں علم کی تلاش و تفحص کے لیے بولتے تھے۔ اس سے ان کا مطلب واقعات گزشتہ یا کارنامہائے دیرینہ کا بیان کرنا نہ تھا بلکہ علمی تفتیش و تحقیق مقصود تھی۔ لیکن[۵] وہی صدی بعد جب یونان کا آفتاب علم اپنے نصف النہار پر پہونچا، یہ مفہوم

[۵] انسیکلوپیڈیا بریٹانکا

اُلٹ گیا۔

"ارسطو کے بعد ہمارے ہاں (یونانیوں) اس لفظ کا استعمال متعین طور پر ادبی معلومات کے لیے ہونے لگا بجائے اس کے کہ تفتیش و تحقیق کے لیے ہو جو اس سے پیشتر تھا۔ ارسطو سے لیکر اب تک تاریخ ایک طرح کا لٹریچر یا ادب ہی ہے۔"

یونانیوں کے بعد جب یہ علم مسلمانوں کے ہاتھ میں آیا تو انھوں نے اس میں معتدبہ اضافہ کیا اور بہت سی خصوصیات پیدا کیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ وہ تمام واقعات کو حدیث کی طرح بہ اسناد متصل لکھتے تھے جن سے واقعات کے صحیح ہونے اور غلو سے پاک ہونے میں بمشکل شبہ ہو سکتا ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ علامہ ابن خلدون نے فلسفۂ تاریخ کی بنیاد ڈالی۔ مسلمانوں کے ہاں چونکہ حدیث اور سیرت کا فن مذہب سے متعلق ہونے کی وجہ سے شروع ہی تھا، اس کے اثر سے تاریخ نے بھی ذکر واقعات و سوانح کا رنگ پکڑا۔ علاوہ اس کے عربوں میں انساب کا چرچا قبل اسلام سے اس قدر موجود تھا کہ انسان تو انسان اونٹ گھوڑوں تک کے نسب نامے یاد رکھنا انتہائی کمال سمجھا جاتا تھا۔ اس نے بھی مسلمانوں کے مروجہ تاریخی مفہوم پر بہت بڑا اثر ڈالا۔

ہندوستان کو فلسفہ و الہیات سے بھلا اس قدر فرصت کہاں کہ تاریخ کی طرف کوئی خاص اعتنا کیا جاتا۔ آج جو قدیم تاریخی سرمایہ ملتا ہے وہ زیادہ تر راجاؤں مہاراجاؤں کے قصے کہانیاں ہیں، یا بعض سورماؤں کے کارنامے جن میں بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اکثر مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ ہندوستان کی قدیم مستند تاریخوں میں کوٹلیہ کی تصنیف بہت مشہور ہے اس میں اس عہد کے نظام حکومت اور خود راجہ کے حالات سے بحث کی گئی ہے۔ قدیم تاریخ کا زیادہ تر سرمایہ ابھی تک غیر مرتب اور اکتشاف کا محتاج ہے لیکن جو کچھ بھی موجود ہے اس میں فسانہ کا رنگ غالب ہے اس لیے کہ مسلمانوں کی طرح یہاں روایات کے محفوظ

سلہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد صفحہ

رکھنے یا ان کے صحیح و غلط میں تمیز کرنے کا کوئی طریقہ موجود نہ تھا۔

آج اس دَور حاضر میں یورپ جو تمام دنیا کا علمی حیثیت سے علمبردار بنا ہے اس کے ہاں تاریخ نہ تو روایات اور ذکر واقعات کا نام رہی اور نہ قصہ و افسانہ کہلائی، اس نے ایک نئی صورت اختیار کرلی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ واقعات و حالات کو مبالغہ سے پاک کرکے ان کی اصلی صورت پیش کردیا جائے بلکہ جو مورخ جس عہد یا قوم کی تاریخ لکھنے بیٹھتا ہے وہ ان واقعات کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والا اپنی رائے کی بجائے خود مصنف کے خیالات و عقائد کا پابند ہوجاتا ہے۔ تاریخ نے یہاں آکر ایک اور صورت بھی اختیار کرلی ہے۔ کسی عہد یا ملک کی عام تاریخ لکھنے کے علاوہ ان کا خصوصی طور پر مطالعہ کرنا ہوتا ہے اور واقعات کی تفتیش و تحقیق، تاریخوں کی تعین و تخصیص، حالات کی تہذیب و ترتیب اس عہد کے اصلی ذرائع معلومات سے کی جاتی ہے۔ وہ ذرائع خواہ تحریر کی صورت میں ہوں یا چٹانوں، استونوں اور سکوں کی تحریریں ہوں یا اور بھی کوئی قدیم آثار ہوں۔

جس طرح تاریخ کا مفہوم مختلف قوموں اور ملکوں میں مختلف رہا ہے، اسی طرح مختلف حکما اور اہل علم نے اس کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ دو ہزار برس قبل پالیبیس[۵] کا تاریخ کے متعلق یہ خیال تھا وہ کہتا ہے کہ

"ترقی کے صرف دو راستے ہیں، ایک اپنا ذاتی تجربہ۔ دوسرا طریقہ اوروں کے تجربہ کے ذریعہ سے۔ ان میں اول الذکر میں بہت سے مصائب خطرات کا سامنا کرنا ہوتا ہے اور دوسرے میں، حالانکہ فوائد وہی حاصل ہوتے ہیں لیکن کوئی خطرہ درپیش نہیں۔ ہر شخص کو ماننا چاہیے کہ تاریخ کا مطالعہ بہترین ذریعہ ہے زندگی کے تمام مراحل طے کرنے کا۔"

اس خیال کے بموجب تاریخ بڑے بڑے اشخاص کے سوانح زندگی کا نام ہے جو انسان کے سامنے درس عبرت پیش کرتے ہیں۔

[۵] دوسری صدی قبل مسیح میں (۲۱۰ ق۔م سے ۱۲۰ ق۔م) یونان کا ایک بہت مشہور مورخ گزرا ہے۔ اس نے روما کی تاریخ ۴۰ جلدوں میں لکھی ہیں جن میں سے اب ابتدائی ۵ جلدیں ملتی ہیں۔

کارلایل نے تاریخ کا مفہوم یہ لیا ہے کہ
"ماضی[51] کی خوب چھان بین کرو۔ یہ علم کا سرچشمہ ہے جس کے ذریعہ سے 'حال' اور 'استقبال' کا پتہ لگ سکتا ہے۔"

میکالے کے نزدیک اس کا جو مفہوم ہے، اسے خود اسی کے الفاظ میں سنیئے۔ وہ کہتا ہے کہ
"تاریخ[52] اپنے منتہائے کمال پر شعر و فلسفہ کا ایک مجموعہ ہے۔"

میکالے چونکہ خود بھی بہت بڑا انشا پرداز تھا، اس نے اسی نقطۂ نظر سے تاریخ کو دیکھا اور شعر سے تعبیر کیا اور فلسفہ اس لیے کہا کہ تاریخ قوموں کے عروج و زوال کی صحیح تصویر پیش کرتی ہے۔

غرض ان تمام مفہومات و معانی کے لحاظ سے جو مختلف قوموں اور زمانوں میں مروج تھے اور ان تمام تاویلات سے جو حکما اور مورخین نے کی ہیں، تاریخ شعر و فلسفہ، قصہ و افسانہ، اخلاق و نصائح، پند و موعظت، حکمت و سیاست اور تمام دیگر علوم و فنون کا دفتر بے پایاں بنجاتی ہے اور مورخ کی حیثیت کبھی ادیب و شاعر کی اور کبھی حکیم و فلسفی کی ہے تو کبھی اتالیق اور معلم اخلاق کی۔ اور اس سے یہ بھی بخوبی ظاہر ہوگیا ہوگا کہ تاریخ کا مفہوم اب تک ہر زمانہ اور ہر قوم میں کیا رہا ہے؟ اور ہر شخص نے اس کی کیا تاویل کی ہے!

تاریخ کسی ایک مضمون کا نام نہیں

حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی قوم شاہراہِ تمدن پر قدم رکھتی ہے تو اس کی معاشرت میں وہ ترقی تنوع نہیں ہوتا جو دنیا کی تہذیب یافتہ قوموں میں ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اس کی طرز بود و باش کو لو۔ ایک ہی کمرہ دن میں اگر نشستگاہ کا کام دیتا ہے تو شب میں خوابگاہ کا۔ کھانے کے وقت وہی دارالطعام ہوجاتا ہے تو دوسرے اوقات میں نوشت و خواند کا کام بھی

[51] کارلایل کا مضمون "On History" نوشتہ ۱۸۳۰ء

[52] میکالے کا مضمون Hallam's Constitutional History of England. نوشتہ ۱۸۲۸ء

سی میں ہوتا ہے۔ برعکس اس کے وہی قوم جب تہذیب تمدن سے آراستہ ہو جاتی ہے تو پھر
اس کے کسی فرد کی جائے قیام کو دیکھو۔ جو نشستگاہ ہے وہ دارالطعام کا کام نہیں دیتا۔ خوابگاہ
اور مطالعہ کا کمرہ دونوں علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ ملاقات اور آرام کے جداگانہ حصے مخصوص ہیں
یہی فرق ان کے کھانے میں بھی نمایاں ہوتا ہے۔ انواع و اقسام اور رنگ برنگ کے کھانے
جو شباب تمدن میں نظر آتے ہیں، وہ اوائل تہذیب میں ان کے ایک نان و نمک کے اندر
پنہاں ہوتے ہیں۔

بعینہ یہی علوم و فنون کا بھی حال ہے۔ جب قومیں میدان تہذیب میں قدم رکھتی ہیں اس وقت
تمام علمی مشاغل کسی ایک دو مضامین میں محدود رہتے ہیں لیکن یہی نیم متمدن جماعت جب تہذیب
کے اوج شباب پر پہنچتی ہے تو ہر طرف علوم و فنون کی شاخیں وقت اور ضرورت کے تقاضے
سے اس طرح پھوٹ نکلتی ہیں جیسے ایک غنچہ کی پنکھڑیاں۔ یہ عرب کے بادیہ نشین قبائل ظہور اسلام
سے قبل شاعری اور انساب کے سوا اور کیا جانتے تھے؟ لیکن چند صدیاں بھی نہ گزرنے
پائی تھیں کہ فلسفہ، ہیئت، منطق، کیمیا، ریاضی، طب، تاریخ، مذہب اور ان میں سے ہر ایک
کی متعدد شاخوں کا مطالعہ ہر خاص و عام کرنے لگا۔

اب سے پیشتر تاریخ ایک بہت ہی وسیع مضمون سمجھا جاتا تھا اور انسان سے متعلق ہر قسم کا
علم و فن اس میں شامل تھا۔ لیکن انسان کوئی بے حس، غیر متحرک شے کا نام نہیں یا مشین کا کوئی
ایک پرزہ نہیں جو صرف ایک ہی کام کرے بلکہ انسان کھاتا پیتا ہے، ہاتھ پاؤں کی جنبش سے
دولت پیدا کرتا ہے، تنہا نہیں بلکہ جماعت میں رہنے سہنے کا عادی ہے، صرف جسمانی نہیں بلکہ ذہنی
و دماغی قوا کو بھی کام میں لاتا ہے، ماسوا ان کے اس کا بحیثیت روحانی کسی اور ذات سے
بھی تعلق ہے، غرض انسان کی ان مختلف حیثیتوں نے اس کے لیے مختلف شاہراہ عمل تیار کر دیا
ہے اور یہی حیثیتیں تہذیب تمدن کے آنے پر چمک اٹھتی ہیں اور متعدد و مختلف علوم کی شکلوں میں
نمودار ہو جاتی ہیں۔ سترہویں صدی سے پیشتر علم المعیشت یا معاشیات کوئی علم نہ تھا

لیکن جب یورپ میں صنعتی انقلاب نے پیدائش دولت کی نئی نئی صورتیں پیدا کردیں تو انسان کے اس شعبۂ زندگی نے ایک مخصوص نام اختیار کرلیا جو اکنامکس، پولیٹیکل اکانمی اور معاشیات کے نام سے وقتاً فوقتاً موسوم ہوتا رہا ہے۔

اسی طرح جب ایک بنی آدم کے لسانی اختلاف کی طرف توجہ ہوئی تو ایک ہی قوم کے مختلف زبانوں کی بولیوں میں فرق و تشابہ اور اسی طرح مختلف قوموں کی زبانوں میں اشتباہ و اختلاف سے علم اللسان کی بنیاد پڑی۔ پھر اسی انسان پر جب بہ اعتبار نسل و خون غور و فکر کیا جانے لگا اور مختلف ممالک کے باشندوں میں کچھ مشابہت و کچھ مخالفت بہ لحاظ رنگ روپ نظر آئی تو اس سے علم الانسان Ethnology پیدا ہوا، وقس علیٰ ھذا

اسی طرح پہلے نہ صرف انسان سے متعلق تمام علوم و فنون تاریخ میں شامل سمجھے جاتے تھے بلکہ دنیا کی ہر شے کے متعلق چھوٹے بڑے تمام واقعات داخل تھے۔ "فلسفۂ تغیر" نے آج یہ ثابت کردیا ہے کہ دنیا کا ذرہ ذرہ اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ کوئی شے ایک حالت پر قائم نہیں۔ آج جس جگہ ایک وسیع دریا موجیں مار رہا ہے، عناصر کی باہم کشمکش سے کیا عجب کہ کل وہی خطہ ایک یکسان بے آباں بن جائے۔ انسانی مصنوعات میں بھی، رع۔ ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت، کی بناٴ پر ہر چیز میں روزانہ تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر تدریجی تغیرات کے بیان کا نام تاریخ ہے، تو ہر چیز اپنی تاریخ رکھتی ہے یہاں تک کہ خود تاریخ کی بھی تاریخ ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا کہ تمدن کے ساتھ ساتھ علوم و فنون میں تنوع و تعدد ہوتا ہے، آج ہر علم و فن انسان کے ہر شعبۂ زندگی اور ہر شے کی مکمل و مرتب تاریخ جدا جدا موجود ہے۔ معاشیات کی تاریخ عالم معاشیات سے پوچھو، ادب شاعری کی تاریخ صرف اس زبان کا ادیب شاعر ہی بہتر بتا سکتا ہے۔ زمین کے تدریجی تغیرات کا حال ماہر علم الارض (جیالوجی) کے ہاں ملے گا۔

غرض اس ترقی و تعدد کی بنا پر یہ قیاس کرنا بالکل بجا ہے کہ اس انبارِ علم و فن سے جس کا نام اب تک تاریخ چلا آتا ہے، اسی طرح تمام علوم و فنون ایک ایک کرکے علیحدہ ہوجائیں گے اور مخصوص

۱؎ پالو نیر کے ایچ کی دو اشاعتوں میں رومال و بوسہ تک کی تاریخ شائع ہوئی!

صورتیں اختیار کرلیں گے جن کے اپنے اپنے خاص نام اور پھر تاریخ کے نام سے کوئی علم باقی نہ رہیگا

تاریخ کا موضوع ریاست و حکومت ہی

لیکن باوجود اس کے کہ تاریخ علوم و فنون کا ایک معجون مرکب ہی ہے، پھر بھی اُسے ایک نہ ایک شاخ علم سے نسبتاً زیادہ تعلق رہا ہے۔ اور اس کے ان تمام مفہوم و معانی میں ایک شے قدر مشترک بھی اور وہ سیاست ہی۔ پرانے قصے کہانیوں کو لو (جو تاریخ ہی کی ایک صورت ہے) اس کی ابتدا، ایک بڑے راجہ کے فقرہ سے ہوگی۔ ہندوستان کی قدیم کتابوں مثلاً رامائن اور مہابھارت کو دیکھو، اول الذکر میں راجہ دسرتھ کے دربار کا حال اور ولیعہد تخت رام چندر جی کا المناک قصہ جلا وطنی مذکور ہے۔ موخر الذکر کوروؤں اور پانڈوں میں ایک عظیم جنگ کی داستان خونیں پیش کرتی ہے۔ قدیم تاریخ کے لیے کوٹلیہ کی تصنیف سب سے مستند سمجھی جاتی ہے لیکن اس میں بھی خود راجہ کے نظام اوقات، دارالسلطنت پاٹلی پتر (موجودہ پٹنہ) کے تفصیلی حالات، افواج کی اقسام و تعداد اور حکومت کے دوسرے شعبوں کا بیان غالب نظر آرہا ہے۔ بعد کی تصانیف میں ساتویں صدی عیسوی کی ہرش چرت بہت مشہور ہے۔ اس میں جیسا کہ خود نام سے ظاہر ہے ہرش راجہ کے حالات سے زیادہ بحث کی گئی ہے۔

تاریخ اسلام کو لو۔ اس کی ابتدائی تصانیف میں کتاب الفتوح الکبیر، کتاب المغازی، کتاب امراء البصرہ کافی شہرت رکھتی ہیں۔ ان کا باطن ان کے ظاہر سے دیکھو کہ فتح و نصرت، جنگ و جدل کے واقعات اور ارکان و اعیانِ سلطنت کے حالات درج ہیں۔ بیہقی و طبری کی مجلدات بھی خلافت و حکومت، افواج کی نقل و حرکت توسیع مملکت کے حالات سے پُر ہیں۔ یہاں آکر سلاطین ہند کے عہد حکومت میں جو تاریخی کتابیں تصنیف ہوئیں ان میں سے کچھ تو خود ان سلاطین کے خود نوشتہ تزک و تذکرے تھے مثلاً تزک بابر، تزک جہانگیر اور کچھ درباری مورخین و مصنفین کے قلم سے تھیں جو عموماً سلاطین کے نام سے موسوم ہوتی تھیں مثلاً تاریخ فیروز شاہی

طبقات ناصری اکبر نامہ وغیرہ۔

پانچویں صدی قبل مسیح میں جبکہ یونان کے علم وتہذیب کا عالم شباب تھا اُس وقت بھی یہی چیزیں تاریخ کا سرمایہ تھیں تھوسیڈائڈس[۱] نے جس عہد کے حالات لکھے ہیں اس میں سب سے زیادہ مشہور و معروف واقعات کچھ ہو سکتے ہیں تو وہ سقراط (پیدائش ۴۷۰ق م) کا حکمت و فلسفہ یا فیڈیاس[۲] کی سنگتراشی لیکن مصنف مذکور نے ان میں سے کسی ایک کا ذکر نہیں کیا، بلکہ وہ جنگ و جدل کی داستانیں اور دوسرے سیاسی واقعات نہایت زور و شور سے بیان کرتا ہے۔

یہ امر کہ تاریخ کا موضوع بحث ریاست و حکومت ہے اور وہ صرف سیاسیات سے بحث کرتی ہے خود تاریخی واقعات سے روشن ہے۔ دنیا میں کتنی ہی تحریکیں پیدا ہوتی ہیں جو آگے چلکر تاریخ کا سرمایہ بنتی ہیں، لیکن اُس وقت تک وہ کسی شمار میں نہیں ہوتیں جب تک ان کا اثر وہاں کی سیاسیات پر نہ ہو یا بہ الفاظ دیگر وہ خود اس عہد کی سیاسیات نہ بنجائیں۔ پندرہویں صدی کے آخر میں گرو نانک جی پیدا ہوتے ہیں اور تھوڑے ہی عرصہ میں ان کے چیلوں کی معقول تعداد سکھوں کے نام سے موسوم ہوتی ہے لیکن اس طرف کوئی توجہ بھی نہیں کرتا یہاں تک کہ ۱۶۰۶ء میں جب ان کا روحانی پیشوا قتل کیا جاتا ہے اور وہ سلطنت مغلیہ سے ٹکراتے ہیں تو اس کے بعد سے ہر شخص چونک پڑتا ہے۔ رفتہ رفتہ جب ان کی جماعت مذہبی حیثیت سے منظم فوجی صورت اختیار کر لیتی ہے اور گزشتہ صدی کے وسط میں جب برٹش گورنمنٹ سے تصادم ہوتا ہے اس وقت انگریز مورخین بھی ان کے آغاز وجود اور حالات سے، گو مختصراً ہی

[۱] پانچویں صدی قبل مسیح میں یونان کا بہت مشہور مورخ گزرا ہے۔ سپاں کی وفات کے بعد وہ امرائی سلطنت کی جماعت کا لیڈر ہوا۔ ۴۲۴ق م۔ میں وہ جلاوطن کر دیا گیا۔

[۲] پانچویں صدی قبل مسیح میں ایک بہت بڑا سنگ تراش اور نقاش ہوا ہے۔ حکومت کی طرف سے وہ اس فن کا سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوا تھا۔

سی بحث کرتے ہیں۔ اب بھی جس قدر سکھ یہاں کی سیاسیات پر اپنا اثر ڈالیں گے اسی قدر روز بروز نمایاں ہوتے جائیں گے ۔

اسی طرح یورپ میں کارل مارکس انیسویں صدی میں اپنے معاشی نظریہ اور نظام اشتراکی کی تبلیغ شروع کرتا ہے اور ایک عرصہ تک اس کی تمام تر تعلیم و تبلیغ غریب مزدوروں تک محدود رہتی ہے لیکن ۱۸۴۸ء میں فرانس کے تغیرات سیاسی سے متاثر ہو کر جرمنی بھی علم بغاوت بلند کرتا ہے اس وقت اس کی تعلیمات و خیالات کا حکومت سے تصادم ہوتا ہے اور اس کی تحریک خطرناک خیال کی جاتی ہے۔ چنانچہ اسی جرم میں وہ گرفتار بھی کر لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد جب وہ فرانس میں آتا ہے تو یہاں بھی اس کی تحریک سرمایہ دار حکومت کے خلاف آن پڑتی ہے اور وہ جلاوطن کیا جاتا ہے۔ یہی تحریک آئندہ چل کر اپنے عہد کے سیاسیات کی مرادف بنجاتی ہے اور ایک کثیر تاریخی مواد فراہم کرتی ہے۔ اسی کے بالمقابل ان تحریکوں کو بھی دیکھو جو حکومت و سیاست سے بے تعلق رہیں اور انجام کار ان کا نام و نشان بھی مٹ گیا ہندوستان میں برہمو سماج تحریک کو چند افراد کے سوا کون جانتا ہے ؟ ۔

یہی حال بعینہ اشخاص کا بھی ہے۔ دو آدمی ایک ہی وقت میں ایک دوسرے سے کم اہمیت نہیں رکھتے لیکن تاریخ کے نزدیک جو حیثیت ایک سیاسی شخص کی ہوتی ہے وہ غیر سیاسی کی نہیں غیاث الدین تغلق (۱۳۲۰ء سے ۱۳۲۶ء) اور محمد تغلق (۱۳۲۶ء سے ۱۳۵۱ء) کے ناموں سے آج بچہ بچہ واقف ہے اور ہندوستان کی کوئی تاریخ ان کے ذکر کو چھوڑ کر مکمل نہیں ہو سکتی لیکن اسی تغلق آباد (دہلی) میں ایک ذات سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا کی بھی گزری ہے جن کی حکومت جسمانی نہیں بلکہ لاکھوں کروروں انسانوں کے قلوب پر تھی لیکن تاریخ میں آپ کا ذکر تک نہیں آتا اور کتنے ہیں جو آپ کے نام کے علاوہ حالات و واقعات سے بھی واقف ہیں ۔

انگلستان کی تاریخ اٹھا کر دیکھو ایک مورخ جب سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی

کے حالات لکھیگا تو کیا تم سمجھتے ہو کہ جو وقعت وہ سر رابرٹ والپول[51] کو دے گا، وہی سر آئزک نیوٹن کو بھی دے گی؟ جس شرح و بسط کے ساتھ وہ اول الذکر کے حالات، اس کے اقتدار واثر کے اسباب، قانون مسکرات، اور اس کی صلح پسند پالیسی سے بحث کرے گا، کیا اسی تفصیل سے نیوٹن کے سوانح زندگی، اس کے کارنامے، اس کے قانون کشش اجسام، اس کی لاطینی تصنیف پرنسی پیا پر بھی روشنی ڈالے گا؟ آخر اس کا کیا سبب ہے؟ صرف یہی کہ شاہان تغلق اور والپول ریاست و حکومت سے تعلق رکھتے تھے اور حضرت سلطان المشائخ اور نیوٹن کو ان سے کوئی تعلق نہ تھا، اس لیے وہ تاریخ میں ان سیاسی اشخاص کے برابر جگہ نہ پا سکے۔ آئندہ جبکہ تاریخ کا موضوع اور متعین مصارف ہو جائے گا تو غیر سیاسی حالات و اشخاص اس دائرہ سے بالکل خارج ہو جائیں گے۔

کیمبرج یونیورسٹی میں سیاسیات پر لکچر دیتے ہوئے جب سیلے نے اپنا یہ خیال پیش کیا کہ "سیاسیات پر لکچر دینا تاریخ پر لکچر دینا ہے" تو اس کے سب سے بڑے مخالف مسٹر بیرل تھے وہ کہتے ہیں کہ:-

"طبائع انسانی دنیا کے بڑے بڑے واقعات کے پڑھنے میں قدرتاً دلچسپی رکھتے ہیں اور ہمیشہ رکھیں گے۔ اس لیے تاریخ کا فن کبھی مردہ نہیں ہو سکتا"

آج بھی کم و بیش شاید ہی اعتراض پیش کیا جائے کہ تاریخ صرف بڑے بڑے واقعات اور اہم حوادث کا نام ہے، خواہ جو ابر دریا سے تعلق رکھتے ہوں یا کوہ و دریا سے۔ اور ان واقعات و حوادث کے اسباب و نتائج سے کوئی بحث نہ ہو، یا اس اصول سے جس کی بنا پر

[51] بہت بڑا ماہر بالیاقت تھا۔ جارج اول (۱۷۱۴ء سے ۱۷۲۷ء) کے عہد حکومت میں وہ وزیر اعظم رہا اور اکیس برس تک انگلستان کی عنان حکومت عملاً اسی کے ہاتھ میں تھی۔

[52] کیمبرج میں پروفیسر تھا، ۲۴ برس تک رایل سوسائٹی کا صدر رہا۔ "قانون کشش اجسام" کی ایجاد کا سہرا اسی کے سر ہے۔ اس کی مشہور تصنیف پرنسی پیا لاطینی زبان میں ہے۔

[53] و [54]

وہ ظہور پذیر ہوئے کوئی غرض نہ ہو تو اس صورت میں تاریخ کی حیثیت گورنمنٹ گزٹ سے کچھ زیادہ ممتاز نہیں رہتی جو خشک واقعات کا ایک مجموعہ ہوتا ہے۔ نیز ان واقعات کی فراہمی و نگہداشت میں حکومت جو کوشش کرتی ہے، وہ مورخین کی ذمہ داری کو ہلکا کرنے کے لیے کافی ہے۔

ایک دوسرا شائبہ اس خیال میں اور یہ پایا جاتا ہے کہ طبایع انسانی کی دلچسپی، تاریخ میں اگر یہ غرض ملحوظ ہے تو فسانہ و قصص کا مطالعہ دلچسپی کے لیے کافی ہے اور اگر اس پر بھی واقعات کی عظمت و شوکت منظور ہے تو ہمارے نزدیک طلسم ہوش ربا اور داستان امیر حمزہ کا نام لینا نامناسب نہ ہوگا۔ غرض اس تاریخ کے لیے یہی دو چیزیں ضروری تھیں، تو موجودہ مفہوم کے لحاظ سے یہ فن کبھی کا مردہ ہو چکا ہوتا۔

ابتدائے مضمون میں ہم نے تاریخ کے مختلف معانی و مفہوم سے بحث کی پھر اس کے بعد اس علم کی تدریجی ترقی دکھائی کہ آیندہ کس طرح سے تمام علوم اس انبار علم سے ایک ایک کرکے نکل جائیں گے اور ہر ایک اپنی اپنی مناسبت سے مخصوص اور مناسب نام اختیار کرے گا، لازمی طور پر سرے سے اجاڑے گا لیکن بعض تاریخی ذخیروں سے ہم نے یہ بھی بتایا کہ پہلے بھی کسی نہ کسی قدر اس کا تعلق ایک شعبہ زندگی یعنی 'ریاست و حکومت' سے رہا ہے اور پھر متعدد تاریخی مثالوں سے یہ ثابت کیا کہ آیندہ بھی اس کا موضوع یہی 'ریاست و حکومت' ہوگا اور تاریخ سیاسیات سے بحث کرے گی۔ تاریخ کا یہ موضوع قرار دینے میں ایک سب سے بڑا الزام جو عاید ہوتا ہے وہ یہ کہ اس کا دائرہ بہت تنگ کر دیا گیا ہے۔ بے شک یہ صحیح ہے کہ اس صورت میں تاریخ ایک دریائے بے پایاں یا 'انبار علوم' نہیں رہی، راقم کے نزدیک علم صرف دماغی تعیش کے لیے نہیں ہے بلکہ اس سے عملی زندگی میں کچھ نہ کچھ کام لینا ہے اس بنا پر تاریخ سے بھی انسان کی عملی زندگی میں کام لیا جا سکتا ہے لیکن یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک اس کے متعین حدود نہ قائم کیے جائیں اور اس کا ایک مخصوص موضوع بحث نہ قرار دیا جائے۔

سعید انصاری متعلم جامعہ

ہندوستان عربوں کی نظر میں

(خاص جامعہ کے لیے)

ہم جناب محمد حبیب صاحب بی۔ اے (آکسن) پروفیسر مدرسۃ العلوم کی عنایت سے مندرجہ ذیل مضمون نذر ناظرین کرتے ہیں جو موصوف نے ہماری انجمن تاریخ کے ایک خاص جلسہ کے لیے ڈاکٹر ٹرٹن نے تیار کیا۔ مضمون ہذا ہندوستانیوں کے لیے صرف اس وجہ سے دلچسپ ہے کہ اس میں قدیم زمانہ میں عربوں کا جو تعلق ہندوستان سے تھا اُس کا وہ پہلو پیش کیا گیا ہے جس سے ہم لوگ بہت کم آشنا ہیں۔ مدیر

اس وقت جبکہ علوم عربیہ کے بہار کا زمانہ تھا، ہندوستان عربوں کے نزدیک ایک نامعلوم ملک تھا، اسی لیے بڑے بڑے اشخاص کے نام اس مضمون میں بمشکل نظر آئیں گے ہندوستان عربوں کے دنیائے علم کا کوئی جزو نہ تھا۔ تجار بندرگاہوں تک آتے جاتے تھے لیکن اندرونی حصہ ان کے لیے ایک خیالی دنیا تھی۔ مثال کے طور پر لیجیے ابو الفدا، (المتوفی ۱۳۳۱ء بمقام شام) تاریخ مصر کے ابتدائی حالات نہایت تفصیل سے بیان کرتا ہے لیکن اس میں ہندوستان کا ذکر بہت ہی شاذ آتا ہے۔ البیرونی کی تصنیف مقبول نہ ہوئی اور کسی اور مصنف نے اس موضوع پر توجہ نہیں کی۔

عام طور پر ہندوستان عقل و دانش کا مرکز سمجھا جاتا تھا اور اس کا کچھ حصہ عربوں تک بھی پہونچا۔ بیدپائے کا قصہ جو کلیلہ دمنہ کے نام سے مشہور ہے اور الف لیلہ کے بعض حصے اس کی کافی دلیل ہیں لیکن خیالات بہت مبہم ہوا کرتے تھے۔ ایک مسلمان عالم (المتوفی سنہ ۱۱۴۱ء) نے یہ بتایا کہ برہمن کا لفظ ابراہیم سے مشتق ہے ان کا قول ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی ایک کتاب جو پانچ جلدوں میں تھی، برہمنوں کے ہاتھ لگ گئی۔ پانچواں حصہ بہت ہی مقدس سمجھا جاتا تھا اور کسی کو اس کے پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔" ان میں یہ مشہور تھا کہ جو کوئی اس حصہ

کو پڑھے گا فوراً مسلمان ہو جائے گا"۔ ابن خلدون نے (۱۴۰۶ء) خاص طور سے ہندوستان کے جوگیوں کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ لوگ اپنے جسم کو طرح طرح سے اذیتیں دے کر علم اور قوت حاصل کرتے ہیں۔

مشرقی سیاحوں کے عجیب و غریب قصے کتاب غرائب لندن میں جمع کیے گئے ہیں۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا یہ کتاب حقیقتاً پرانی ہے؟ اس میں بہت سے خودکشی کے متعلق بھی قصے درج ہیں۔ دو آدمیوں نے ایک گڑھا کھدوایا اور اسے آگ سے بھر دیا، اس کے بعد اس میں کھڑے ہو گئے اور چپسی کھیلنے لگے یہاں تک کہ آگ نے ان کے اعضائے رئیسہ تک پہنچکر ان کا خاتمہ کر دیا۔ بعض لوگ جو غرق آب ہونا چاہتے تھے وہ لوگوں کو روپئے دیتے تھے تاکہ وہ ان کے سر کو پانی کے اندر دبائے رکھیں۔ نمونہ کے طور پر ایک عجیب قصہ کا ذکر کر دینا یہاں کافی ہو گا۔ ایک دریا میں بہت سے مگر رہا کرتے تھے، ایک ہندوستانی جادوگر نے پانی پر جادو کر دیا اور کچھ دور تک مگر کسی کو کوئی اذیت نہ پہنچاتے تھے۔ وہاں کے راجہ نے یہ سنا اور حکم دیا کہ اچھا پھر جادو کرے۔ دو مجرم پانی کے اندر بھیجے گئے اور ان کو کوئی اذیت نہ پہونچی۔ جب راجہ کو یہ معلوم ہو گیا کہ مگر کچھ بھی تکلیف نہیں پہونچاتے تو اس نے اشارہ کیا، ایک نوکر اٹھا اور جادوگر کا سر تن سے جدا ہو گیا۔ مصنف نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ مشہور اشخاص کے بت رکھے جانیکا بھی دستور تھا۔

ابن الاثیر نے اپنی تاریخ عالم میں چند واقعات دیے ہیں لیکن ان کی تفصیلات کوئی قابل اعتبار نہیں۔ اس نے لکھا ہے کہ محمد غوری نے لاہور پر ۱۱۸۳ء میں قبضہ کیا۔ اس نے اجرا (اُچھ) فتح کیا اور اس کی ایک فوج کے ہاتھ شکست کھائی جس کی کمان ایک عورت کرتی تھی (۱۱۵۳ء)۔ محمد غوری اس جنگ میں زخمی ہو گیا تھا اور جب اچھا ہو گیا تو اس نے امراء کو جو میدان جنگ سے بھاگ آئے تھے، گھوڑوں کے توبڑوں میں جو کھانے کو دئے۔ یہ تمام قصہ ۱۱۸۶ء کا بیان کیا گیا ہے۔ صحیح تاریخ ۱۱۷۵ء ہے۔ اُچھ کی فتح ایک رانی کی مکاری سے

ہوئی لیکن اس کے متعلق کچھ گڑبڑی ہے۔ تھانیسر کی پہلی لڑائی کی تاریخ غلط دی ہوئی ہے لیکن دوسری کی صحیح ہے یعنی ۱۱۹۲ء۔ اس سے حالات معلوم ہوتے ہیں یعنی یہ کہ ہندوستانی طلوع آفتاب سے قبل اُٹھنے کے عادی نہ تھے۔ ۱۱۹۴ء میں راجہ بنارس نے شکست کھائی اور قتل ہوا اس کی نعش اس کے دانتوں سے شناخت کی گئی۔ جڑ چونکہ کمزور تھی اس لیے اس کے دانت سونے کے تار سے جڑے ہوئے تھے۔

خوشاپور کے قریب ایک قوم رہتی ہے اس کے بارہ میں یہ لکھا ہے کہ انہیں بہ یک وقت متعدد شوہر رکھنے کی رسم جاری تھی اگر ان میں سے کسی کے لڑکی ہوتی تھی تو وہ اپنے دروازہ پر کھڑے ہو کر آواز دیتا کہ اس لڑکی سے کون شادی کرے گا؟ اسے کوئی لے گا؟ اگر کوئی جواب دیتا تو وہ اسے چھوڑ دیتا ورنہ وہیں اسے ختم کر دیتا تھا۔ جب ایک شوہر بیوی کے پاس ہوتا تھا تو وہ اپنے جوتے دروازہ پر چھوڑ جاتا اور جب تک وہ پڑے رہتے کوئی دوسرا شوہر نہیں آسکتا تھا۔ اسے دیکھکر جنوبی عرب کے لوگوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جن کا بیان اسٹربونے کیا ہے۔

ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ اس کے معلومات زیادہ تر سیاحین اور تجار سے مشتق ہیں اس لحاظ سے اس کی غلطیاں کچھ زیادہ تعجب خیز نہیں ہیں۔

یاقوت نے (۱۲۲۹ء) جو ایک عالم جغرافیہ تھا، اپنے روزنامچہ میں بہت کم ذکر کیا ہے مثلاً دہلی اور بنارس کا کہیں تذکرہ نہیں۔

بین الاقوامی تعلقات کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں۔ ابو الفداء نے لکھا ہے کہ ہندوستان کے بادشاہ نے (غالباً محمد تغلق) سلطان مصر کے پاس ۱۳۳۰ء میں تحایف بھیجے لیکن سلطان یمن نے انھیں راستہ میں چھین لیا اور سفراء میں سے بعض کو مار ڈالا۔ اس کے عوض سلطان مصر نے یمن کے قاصد کو قید کر لیا۔

اس امر کو ظاہر کرنے کے لیے کہ عربوں کی خالص زندگی ہندوستانی اثر سے پاک تھی،

بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ خاص خاص کتابیں اس کے لیے دیکھنی چاہئیں۔ سب سے پہلے ابن بطوطہ کا سفرنامہ ہے جو ۱۳۳۳ء سے ۱۳۴۶ء تک ہندوستان میں تھا۔ اس مضمون میں تاریخی حیثیت سے واقعات کا ذکر ہوگا۔

یہاں کی حکومت تلاش و نگرانی کی بہت عادی تھی۔ جب ابن بطوطہ سندھ میں پہنچا حکومت کے محرروں نے حاکم ملتان کے ہاں اطلاع دی اور اس کے بعد دہلی خبر بھیجدی۔ ایسے ہی اور بھی واقعات ہیں اس کی ایک بیوی کو ملکہ سے ملاقات کرانے کے لیے لے گئے اور جب وہ واپس ہوئی تو بیش بہا تحائف ساتھ لائی۔ ابن بطوطہ نے اپنا ذخیرہ قائم کرنے کے لیے انھیں اپنے احباب میں تقسیم کر دیا اس لیے اس کی زندگی کے تفصیلی حالات سلطان کے پاس بھیجے جاتے تھے۔ صرف نو وارد اشخاص ہی کی نگرانی نہیں ہوا کرتی تھی بلکہ ہر حاکم کے پیچھے خواہ بڑا ہو یا چھوٹا سلطان کا ایک غلام بطور خفیہ کے نگار رہتا تھا۔ غلام لڑکیاں ان کے گھروں میں خفیہ کا کام کرتی تھیں اور ان کی اطلاعات بھنگنوں کے ذریعے سے پہنچتی رہتی تھیں۔ اسی تفتیش کی ابن بطوطہ ایک مثال بیان کرتا ہے۔ کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کرنا چاہتا تھا۔ اس عورت نے سلطان کے سر کی قسم دیکر بہت منت سماجت کی کہ اس ارادہ سے باز آئے دوسرے دن صبح کو وہ دربار میں بلایا گیا اور سلطان نے اسے اس واقعہ کی یاد دہانی کی۔ مصنف سنجیدگی کے ساتھ یہ لکھتا ہے کہ اس شخص کے خاتمہ کا باعث یہی واقعہ ہوا۔

ہر نو وارد شخص (بشرطیکہ وہ بڑا آدمی ہو) جو ملک میں قدم رکھتا ہے اپنے ساتھ سلطان کے لیے ایک تحفہ لاتا ہے۔ ہمارے سیاح (ابن بطوطہ) نے اس رسم کی تعمیل اس طرح سے کی کہ منجملہ دوسری چیزوں کے وہ اپنے ساتھ تیروں سے لدا ہوا ایک اونٹ لایا تھا۔ بعض رسومات دربار کا بھی کچھ پتہ چلتا ہے۔ سلطان کی بلا اجازت کوئی شخص دربار عام میں نہیں داخل ہو سکتا تھا۔ امرا و حکام کو ملازمین کی متعین تعداد ساتھ لیجانے کی اجازت تھی لیکن داخلہ سے قبل سب کے نام درج کرلئے جاتے تھے۔ دربار عام کے آداب میں کچھ آزادی رہی ہوگی۔ کیونکہ

ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ میں امراء کے زمرہ میں بادشاہ کو تمیز نہ کرسکا۔ سلطان غیر ملکی اشخاص سے ملنے کا بڑا شائق تھا جنھیں وہ ہندوستان کے لوگوں پر ترجیح دیتا۔ وہ ان کے ساتھ نہایت فیاضانہ سلوک کرتا اور حکومت میں ان کو خاص حصہ دیتا تھا، خود ابن بطوطہ نے قاضی کی خدمت انجام دی وہ چاہتا تھا کہ یہ لوگ "عزیز" کہے جائیں اور لوگ انہیں "غریب" (مسافر) کے نام سے نہ پکاریں۔ اردو کے عرف عام میں اس لفظ کا جو مفہوم ہے اس سے اس کا کچھ تعلق معلوم ہوتا ہے۔

اس عہد میں اکثر شاہانہ فیاضیوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یہ عام دستور تھا کہ تحفے کسی نام سے منسوب کرکے دیے جاتے تھے مثلاً فلاں تحفہ "سر کی دھلائی" کے لیے، جب کبھی کوئی تحفہ پیش کیا جاتا تھا تو طریقہ عمل بہت پیچیدہ ہوتا تھا۔ تحفہ پانے والے کو پہلے ایک سرٹیفکٹ دیا جاتا تھا (ابن بطوطہ کو اس کے لیے دو یا تین دینار دینے پڑے) جس پر وہ اپنے دستخط کرتا تھا پھر تین امراء اس پر اپنے اپنے دستخط ثبت کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ وزیر کے دفتر میں بھیج دیا جاتا جہاں اس کی نقل لی جاتی، پھر وہ کاغذ رجسٹری و معائنہ کے دفتر میں جاتا۔ اس کے بعد وزیر خزانچی کو ادائیگی کا حکم لکھتا جسے وہ ضابطہ تحریر میں لاتا۔ اور پھر زر عطیہ ادا کردیا جاتا تھا۔ یہ سنکر تعجب نہ ہونا چاہیئے کہ ابن بطوطہ کو بارہ ہزار دینار کے لیے چھ ماہ تک انتظار کرنا پڑا تھا اس پر بھی ۱۰ فیصدی حسب دستور کاٹ لیا جاتا تھا۔

برعکس اس کے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اکثر درباریوں کو روپیوں کی سخت ضرورت ہوتی تھی کئی ایسے مدیون تھے جو سلطان کی زیر حفاظت ہوتے، ادائیگی قرض کا طریقہ باقاعدہ طور پر عمل میں آتا تھا۔ جونہی مدیون محل میں داخل ہونے لگتا، داین اس پر دست درازی کرتا۔ اتنے وہ چلا اٹھتا کہ "بادشاہ کا دشمن!" "سلطان کے سر کی قسم، تم داخل نہیں ہو سکتے۔ جب تک پورا قرضہ چکا نہ دو۔ مدیون بھی تاوقتیکہ بقایا صاف نہ کرلیتا یا ملتوی نہ کرلیتا، اپنی جگہ سے ٹل نہیں سکتا تھا۔

سلطان کے خود مختارانہ رویہ کی عجیب اور دلچسپ مثالیں بھی ملتی ہیں۔ ایک بار وزیر کہیں باہر گیا ہوا تھا، چنانچہ اس کے ہاں ایک دن شب میں گیا اور اس کی دو لڑکیوں کی شادی خداوند زادہ قوام الدین کے لڑکوں سے کر دی گویا وہ خود وزیر کا حقیقی قائمقام تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے روپیوں کی تھیلیاں اور کپڑے قاضی اور نوشے کو عطا کیں۔

ایک دوسری شادی میں دولہا اور دولہن کے ساتھیوں میں نقلی جنگ ہوئی۔ اس کے شرکار تمامتر حکام تھے جنھیں سلطان نے نامزد کیا تھا۔ جنازے کا لمبا نام قدرتی ہے۔ ایک بار ہمارے مصنف (ابن بطوطہ) کی ایک بچی کا انتقال ہو گیا چنانچہ وہ تمام رسوم بیان کرتا ہے جو اس کے مرنے پر عمل میں آئیں۔ وہ کہتا ہے کہ تین دن کے بعد قبر کے پاس ایک خیمہ نصب کیا گیا، قبر پر پھول ڈال دیئے گئے اور نارنگی اور لیمو کی ٹہنیاں لگائی گئیں۔ اگر ان میں پھل نہ ہوتے تھے تو دھاگے سے باندھ دیئے جاتے۔ خشک پھل اور ناریل بھی قبر پر رکھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد مختلف رؤسا وہاں پہنچے، تلاوت کلام مجید ہوئی، قاضی نے نوحہ پڑھا اور اس کے بعد سلطان کی مدح کی (اس وقت تمام لوگ کھڑے ہو گئے تھے) اور پھر نماز پڑھی گئی۔ یہ ختم ہو جانے کے بعد لوگوں پر گلاب چھڑکا گیا، شربت اور پان تقسیم کیے گئے اور مجمع رخصت ہوا۔

سلطان کی قبر کے بغل میں اس کے جوتے ایک تپائی پر رکھ دیئے جاتے تھے اور لوگ ان کا اسی طرح اعزاز و اکرام بجالاتے جیسا خود سلطان کا اس کی حیات میں کرتے تھے۔ جب محمد تغلق، قطب الدین کے مقبرہ پر گیا تو اس نے ان کے جوتوں کو سر پر اٹھا کر رکھ لیا۔

جب سلطان عین الملک باغی سے لڑنے کو نکلا تو فوج کے ہمراہ ابن بطوطہ بھی تھا۔ جس وقت وہ خیمہ میں اپنی بیویوں کے پاس بیٹھے تھے، ایک نوکر نے آکر کہا کہ "جلدی باہر آیئے سلطان نے ابھی یہ حکم صادر کیا ہے کہ جو شخص کسی عورت کے ساتھ پایا جائے اسے فوراً قتل

کر دیا جائے" ابن بطوطہ یہ سُنکر بہت خوفزدہ ہوا لیکن امرا میں سے ایک نے بادشاہ کو سمجھایا کہ اس حکم کو منسوخ کردے۔ اگر کہیں اس حکم کے تعمیل کی نوبت آتی افوج کا بیشتر حصہ قتل ہو چکا تھا۔ اس کے بجائے تمام عورتیں پاس کے ایک قصبہ میں بھیجدی گئیں۔

ایک دفعہ ابن بطوطہ کو دس ہندو لڑکیاں جو جنگ میں گرفتار ہوئی تھیں، ہاتھ آئیں۔ ان میں سے ایک لڑکی اس نے اس لوکر کو دی جو انہیں لایا تھا لیکن وہ اس عطیے سے مطمئن نہ ہوا۔ ان میں تین لڑکیاں خود اس کا ایک دوست لے گیا، باقی کا حال اسے خود نہیں معلوم۔ لڑکیاں بہت گندہ اور غیر شایستہ تھیں۔ تربیت یافتہ غلام بھی ارزاں قیمت پر ملتے تھے لیکن کسی کو ان کے خریدنے کا خیال بھی نہیں ہوتا تھا البتہ بطور تحفے کے عموماً پیش کیے جاتے تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ لوگ زیادہ تر ہندو ہوتے تھے جو یا تو بہ حیثیت ذمّی گاؤں میں بستے یا پہاڑوں میں باغی ہو کر رہتے تھے۔ جبکہ وہ سلطان کی سفارت کے ساتھ ایک خاص مقصد کے لیے چین جا رہا تھا، اس اثنا میں کوئل سے چند میل کے فاصلہ پر لڑائی کا حال سننے میں آتا ہے اس واقعہ سے اس عہد کے حالات کا صاف پتہ چلتا ہے۔ اس لڑائی میں وہ خود بھی گرفتار ہوا اور بمشکل جان بچا سکا جس پر وہ خود اظہار تعجب کرتا ہے۔

جب مسافر ملتان میں پہونچتے تھے تو وہاں دستور کے مطابق ان کی سخت جانچ ہوتی تھی۔ مال تجارت کا ایک چوتھائی بطور محصول کے لے لیا جاتا تھا اور فی گھوڑا ۷ دینار دینے پڑتے تھے۔ غنیمت ہے کہ ایک نامی امیر کی مداخلت کی وجہ سے ابن بطوطہ اس قسم کی جانچ سے بچ رہا۔ دو سال بعد محمد شاہ نے خلیفہ عباسی کو تسلیم کیا اور حکم دیا کہ وہ یکی اور زکات صرف دو ہی محصول باقی رہیں اور دیگر محصولات اس نے اٹھا دیے۔

اس نے علاء الدین خلجی کا بھی ذکر کیا ہے کہ اس نے تمام اشیاء کی قیمتیں مقرر کر دی تھیں۔ اس نے بازار کے افسر سے پوچھا کہ گوشت اس قدر گراں کیوں ہے؟ معلوم ہوا کہ بھیڑ اور جانوروں پر سخت محصول لگا دیے گئے ہیں۔ اس نے یہ محصول اٹھا دیے اور گوشت

فروشوں کو روپئے دیئے اور کہا کہ مال بیچکر روپئے خزانے میں جمع کر دیا اور خود انہیں کمیشن ملتا تھا
اس نے ایسا ہی کپڑے کے معاملہ میں بھی کیا جو دولت آباد سے آتا تھا۔

اس کے بعد جب غلہ کی قیمت بڑھی اس نے سلطنت کی طرف سے گھٹے کھولے اور لوگوں
کے ہاتھ غلہ فروخت کرتا۔ جب غلہ فروشوں نے مقررہ قیمت پر بیچنے سے انکار کیا تو اس نے
انہیں بیچنے ہی سے روک دیا اور چھ مہینے تک برابر وہ لوگوں کو غلہ مہیا کرتا رہا۔ جن جن کے
پاس بڑے بڑے ذخیرے تھے، وہ ڈرنے لگے کہ کہیں تمام غلہ سڑ نہ جائے اس لیے اس سے
پھر اجازت لی لیکن اب انہیں مقررہ قیمت سے بھی کم پر بیچنے کا حکم ملا۔

کچھ نظام حکومت کا بھی حال معلوم ہوتا ہے۔ ایک صوبہ کی جس میں پندرہ سو گاؤں تھے
مالگزاری ساٹھ لاکھ تھی۔ لیکن سکہ کا ذکر نہیں۔ ایک حاکم صوبہ مالگزاری کا بیسواں حصہ
اپنی تنخواہ کے لیے رکھ لیتا تھا۔ حکام کی دیانتداری اور ادائگی فرض کی تحقیق کے لیے
ایک مخصوص محکمہ تھا جو انہیں رعایا سے انصاف و مہربانی کے ساتھ روپیہ وصول کرنے
پر مجبور کرتا تھا۔ ہندو قصبات پر مسلمان حاکم مقرر کرنا گورنروں کا دستور سا ہو گیا تھا۔ یہ
صاف طور پر مذکور ہے کہ فوجوں میں مسلمان اور ہندو دونوں شامل ہوتے تھے۔

کچھ روشنی دونوں مذاہب کے تعلقات پر بھی پڑتی ہے۔ جب کوئی نامور ہندو اسلام
قبول کرتا تو وہ سلطان کے پاس بھیجدیا جاتا تھا جو اس کے حسب رتبہ طلائی کنگن یا ہار اور
خلعت عطا کرتا۔ یہ عموماً شب میں ہوتا تھا تاکہ دن میں اس کے دوستوں یا ہم مذاہب
میں سے کوئی محل میں آنہ جائے۔

اسلام اگرچہ فاتح قوم کا مذہب تھا لیکن ہندو مذہب کا اثر پڑے بغیر نہ رہا۔ قصبہ
جنجی واقع دریائے سندھ میں عربوں کا ایک خاندان رہتا تھا جو حجاج کی فرستادہ فوج
کے ساتھ یہاں آگئے تھے وہ کھانا تنہا بیٹھکر کھاتے تھے اور کسی کو کھاتے ہوئے دیکھنے
نہیں دیتے تھے۔ اپنے خاندان سے باہر شادیاں بھی نہیں کرتے تھے۔ ایک شیخ تھے جو

اپنا کھانا ہمیشہ اپنے ہاتھ سے پکاتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ غلام یا کنیز کے چھونے سے کھانا ناپاک ہو جائے گا۔

جادو یا سحر پر عموماً اعتقاد کیا جاتا تھا۔ اور جنوبی ہند میں مسلمان ہندوستانی تعزیوں کو اس میں اپنا استاد مانتے تھے۔ یہ اعتقاد تھا کہ ساحر بے آب و دانہ مہینوں تک رہ سکتے ہیں۔ منگلور میں ایک مسلمان نے جو انہیں جوگیوں کا چیلہ تھا، ایک اونچا چبوترہ بنوایا۔ اور اس پر ۲۵ دن تک بے آب و دانہ کھڑا رہا۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے پاس گولیاں ہوتی ہیں جن میں سے وہ ایک ہر روز کھا لیا کرتے ہیں، اس کے علاوہ انہیں اور کھانے پینے کی کچھ ضرورت نہیں ہوتی۔ بہت سے سبزی کھانے کے عادی ہوتے تھے اور اکثر گوشت نہیں کھاتے تھے بعضوں کی نظر میں یہ اثر تھا کہ جس شخص کی طرف دیکھتے وہ مر جاتا۔ اُس کا دل جسم کے اندر سے غائب ہو جاتا تھا۔

بہت سی عورتوں میں یہ قوت تھی اور اس لیے وہ بہت مشہور تھیں۔ اگر کوئی عورت ساحر سمجھی جاتی تو چار مٹکے پانی سے بھرے ہوئے اس کے ہاتھ پاؤں میں باندھ دیئے جاتے اور وہ دریائے جمنا میں ڈال دی جاتی۔ اگر وہ نہ ڈوبتی تو یہ ثابت ہوتا کہ وہ ساحرہ ہے اور پھر وہ جلا دی جاتی۔ اس کی راکھ جمع کر لی جاتی اور جو شخص اسے اپنے جسم پر مل لیتا تو ایک سال تک اس پر کسی کا جادو نہ چل سکتا۔ بعض مقامات پر لوگ ایسے جانور کا عقیدہ رکھتے تھے جو دن میں انسان کی شکل اور رات میں بھیڑیا ہو جاتا تھا۔

امیر عین الملک نے ایک بار بغاوت کی اور گرفتار ہوا۔ اس کی بیوی کے اعزہ نے اس سے اصرار کیا کہ تو بھاگ جا لیکن اس عورت نے جواب دیا "کیا میں کافروں کی بیوی کی طرح نہ ہوؤں لیکن اپنے شوہروں کے ساتھ جلا دیتی ہیں؟ میں بھی اپنے خاوند کے ساتھ جان دیدوں گی اور حیات ابدی پاؤں گی"، سلطان نے یہ سنکر اس کی بڑی عزت کی۔ ہمارے سیاح نے ستی کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ یہ رسم بہت ہی معزز سمجھی جاتی تھی

درگو اس کے لیے کوئی جبر نہ تھا پھر جو عورت اس سے انکار کر دیتی اس کا حشر ایسا برا ہوتا کہ اس رسم کا اختیاری سمجھا جانا تقریباً غلط تھا۔ سلطان کے دائرۂ حکومت میں اس کے لیے اجازت لینی پڑتی تھی اگرچہ یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ کبھی اجازت سے انکار کر دیا گیا ہو۔ ایک جلوس میں مسلمان عورتوں کے ساتھ ساتھ مرگھٹ تک گئے۔ جب عورت شعلوں میں کود پڑی تو ہر قسم کے باجے وغیرہ بجنے شروع ہو گئے تاکہ عورت کی آواز دب جائے اور مرد بڑے بڑے لٹھوں سے اس کو دبائے ہوئے تھے تاکہ وہ حرکت نہ کر سکے۔ یہ سنکر حیرت ہوگی کہ اس نے یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ فارسی بولتی ہے شاید اس سے اس کو اپنے عرب ناظرین پر یہ ظاہر کرنا مقصود ہو کہ عورت غیر قوم کی تھی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مسلمان مجنون فقیر کے بھیس میں رہا کرتے تھے، سر کے بال شانوں پر لٹکتے رہتے تھے۔ اس کے برعکس بنگال کے قریب کہیں ایک شیخ تھے جن کی زیارت کے لیے ہندو ان کی خدمت میں آتے اور تحفے پیش کرتے تھے۔

خسرو خاں نے خود مختار ہونے کے بعد ہندوؤں کو دوست بنانے کے لیے جانوروں کا ذبیحہ ممنوع قرار دیدیا تھا۔

ایک شیخ علی الحیدری کھمبات میں (کاٹھیاوار کے قریب) رہتے تھے وہاں کے ملاح انھیں اپنا مرشد مانتے تھے۔ اگر کوئی ان میں منت مانتا اور پوری نہ کرتا تو شیخ اسکی یاد دہانی کر دیا کرتے تھے۔ جلال افغانی کی بغاوت میں شرکت کرنے سے ان کی سزا ہوگئی پہلے جلاد نے تلوار چلائی لیکن ان پر کچھ ضرب نہ آئی، دوسرا کچھ کامیاب ہوا۔ ابن بطوطہ نے حیدریہ فرقہ کے بعض درویشوں سے امروہہ میں ملاقات کی۔ وہ ناچتے تھے اور آگ میں سے گزر جاتے تھے۔ ہلی کے پاس ایک مسجد تھی جس پر ملاح منتیں چڑھاتے تھے۔ یہ صحیح نہیں کہ رسم ہندوؤں کے اثر سے ہی آئی ہو۔

مختلف چیزوں کے متعلق اگر متفرق معلومات جمع کیے جائیں، تو بہت سے حالات پر

روشنی پڑتی ہے۔ ہینتور میں ۲۲ مدرسے لڑکوں کے لیے اور ۱۳ لڑکیوں کے لیے تھے۔ اس قصبہ کی تمام عورتیں قرآن جانتی تھیں۔ خود ابن بطوطہ کی ایک بیوی نہایت عبادت گزار تھی اور قرآن پڑھ سکتی تھی لیکن لکھنا نہیں جانتی تھی۔

اگر جنگ میں فتح کی کوئی امید باقی نہ رہتی تو سپاہی اپنی پگڑیاں اُتار کر گھوڑوں کی گردنوں پر ڈال دیتے تھے تاکہ اس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ اس پر تل گئے ہیں کہ یا 'تخت یا تختہ' اس وقت گھوڑوں کی چار نسلیں ہوا کرتی تھیں۔ گھوڑوں کو دس روز تین رطل یومیہ گھی پلایا جاتا تھا، اس عرصہ میں ان سے سواری کا کام نہیں لیا جاتا تھا۔ اس کے بعد ایک ماہ تک انہیں ماش کی پتی کھلائی جاتی تھی۔

محل یا مکانات کے باہر کرایہ کے لیے پالکیاں طیار رہا کرتی تھیں۔

ابن بطوطہ نے دسترخوان کے لذائذ سے بھی بے توجہی نہیں کی۔ وہ کہتا ہے کہ آندھی کے گرے ہوئے آموں کے اچار بنتے تھے جو کھانوں میں استعمال کیے جاتے تھے۔ وہ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ مالوہ اور دہلی کے درمیان جو سڑک جاتی ہے اس پر میلوں کے نشانات بنے ہوئے ہیں۔

بہت سی باتوں میں ہندوستان اس وقت سے کچھ زیادہ نہیں بدلا ہے۔ شمالی حصہ میں لوگ اکثر سفید کپڑے پہنتے تھے، اس وقت بھی خچر کی سواری ذلت سمجھی جاتی تھی۔ ہرکارہ ایک لاٹھی لیے ہوتا تھا جس میں گھنٹیاں بندھی ہوتی تھیں۔ یہ سُنکر حیرت ہوتی ہے کہ پیدل ہرکارہ سوار سے کہیں تیز چلتا تھا۔ دس دن کا آمد و رفت کا سفر ہرکارہ ۳۶ گھنٹہ سے کم میں طے کرتا تھا یعنی جواب اگلے دن کی شام تک آ جاتا تھا۔ (روانگی کا وقت نہیں دیا ہے)

جنوبی ہند میں ہمارے سیاح (ابن بطوطہ) نے دیکھا کہ عورتیں کمر سے اوپر اپنے جسم کو نہیں ڈھکتی تھیں ایک شریف مسلمان کی حیثیت سے وہ اس سے بہت متاثر ہوا

اور قاضی سے شکایت کی۔ اس نے ان کے لباس کی اصلاح کرنی چاہی لیکن ناکام رہا۔
اس نے اپنی ایک کنیز کو دہلی کا لباس پہنایا لیکن نتیجہ اس سے بھی بُرا نکلا کنیز اس نئے
لباس کو سنبھال نہ سکتی تھی۔

اس نے سلطان رضیۃ الدین کے موت کا عجیب قصہ لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک جنگ
میں شکست کھا کر وہ تنہا گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگ نکلی۔ تکان سے چور چور ہو گئی تھی
اس نے ایک جگہ ایک کسان سے کچھ کھانے کو مانگا۔ اس کے بعد وہ سو گئی۔ کسان نے
اس کے سُنہرے کپڑوں سے پہچان لیا کہ وہ عورت ہے اور اسے جان سے مار ڈالا۔

سعید انصاری متعلم جامعہ

نظام اشتراکی

اس عہد کی جدید تحریک اشتراکیت، جس کا مقصد مزدور پیشہ جماعت اور مفلوک الحال عوام کی بہبودی ہے۔ دنیا میں اُسی وقت سے موجود ہے جب سے تفریق مراتب کی ترویج ہوئی۔ مسٹر میکڈانلڈ ممبر انڈیپنڈنٹ لیبر پارٹی اپنی کتاب "تحریک اشتراک" میں فرماتے ہیں:-

"اشتراکیت اُن لوگوں کا مذہب ہے جو اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ جماعت انفرادی بقا و خوشحالی کے لیے ہوتی ہے۔ زندگی کے معاشی اسباب کا انتظام مثلاً زمین اور اصل کو صنعت و تجارت کے لیے چند افراد کے ناجائز قبضہ میں نہ چھوڑا جائے۔ بلکہ کم و بیش ہر شخص قدرت کے ان وسیع خزانوں سے یکساں مستفیض ہو۔ یہی اشتراکیت ہے۔ اس کا مقصد آزادی ہے۔ وہ آزادی جس کا کانٹ (Kant) نے اُس وقت تصور کیا تھا جبکہ اُس نے یہ دعویٰ کیا کہ انسان بذات خود ایک مدعا ہے نہ کہ اپنے ایک ہم جنس کے مدعا حاصل کرنے کا آلۂ کار۔ گو اشتراکیت موجودہ سوسائٹی کو بدلنا چاہتی ہے لیکن کسی طرح اُس کے لیے مضرت رساں نہیں۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جو انفرادی آزادی کے لیے مانع نہیں۔ حکومت و رعایا کے تعلقات، باہمی امداد، تدریجی اجتماعی ترقی اس نظام کے ماتحت اچھی طرح کامیاب ہو سکتی ہیں۔ یہ ایک شہر ہے جہاں ہر سمت سے آکر بہت سے راستے ملتے ہیں ایک راستے سے مذہبی لوگ، دوسرے سے تجارت پیشہ اور تیسرے سے فلسفی اس میں آکر داخل ہوتے ہیں اور بے شمار طریقہ اور راستے ہیں مثال کے طور پر انگلستان میں انڈیپنڈنٹ لیبر پارٹی۔ چرچ سوشلسٹ لیگ، سائنٹفک سوشلسٹ سیکشن اپنے اپنے اصولوں کے موافق اس کو کامیاب بنانے کے لیے نشر و اشاعت میں نہایت انہماک کے ساتھ مصروف ہیں۔"

ہنگامۂ فرانس ۱۸۴۸ء کے بعد جبکہ فضائے یورپ میں امن و سکون پیدا ہوا تو جرمن بمقابلہ دیگر ممالک کے صنعت و حرفت میں زیادہ گامزن نظر آیا۔ اسی زمانہ میں کارل مارکس نے ایک غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ اسٹیٹ سوشلزم کا حامی تھا۔ یعنی حکومت پیدائش و تقسیم دولت کا خود انتظام کرے۔

موجودہ حکومت سے وہ بہت بیزار تھا۔ اس کی جگہ جمہوری نظام حکومت قائم کرنا چاہتا تھا علاوہ انقلاب پسند ہونے کے ایک بہترین مصلح بھی تھا۔ تخریب کے ساتھ وہ تعمیر کو بھی ضروری سمجھتا تھا۔ انقلاب کو ارتقار کا ایک مظہر اور قانون فطرت کے تابع سمجھتا تھا۔ اب اشتراکیت کوئی خیالی تحریک تھی۔ ارباب تخیل ( ) کا اثر ختم ہوچکا تھا۔ اب اصلی کام کرنا شروع ہوگیا تھا۔ اس نے سوسائٹی کی خرابیوں اور نقائص دور کرنے کے دو اصول قرار دیئے اور ان کے حاصل کرنے کے لیے دو طریقہ۔

(۱) موجودہ نظام اجتماعی کو برباد کر کے تقسیم دولت میں مساوات پیدا کرنا

(۲) پرائیویٹ ملکیت کو بالکل نیست و نابود کردیا جائے۔ ان مقاصد کے حاصل کرنے کے لیے "انجمن بین الاقوامی" برائے اتحاد مزدوران اور فرقہ بندی ( ) یہ دو ذرایع عمل میں لائے جائیں۔ پرائیویٹ ملکیت کو فنا کرنے سے یہ مقصد ہے کہ گورنمنٹ بذات خود دولت کی پیدائش و تقسیم کی ذمہ داری اپنے اوپر لے اور غیر مکتسب ذرائع کو تباہ کردیا جائے۔ ہر شخص کام کے لیے مجبور کیا جائے اور تحارف و تقابل کا خاتمہ ہوجائے۔[۵۱]

ہنگامۂ فرانس کے بعد جبکہ نیابتی حکومتیں نئی نئی قائم ہوتی تھیں جرمنی میں مشہور سیاست داں پرنس بسمارک نے جب پارلیمنٹری گورنمنٹ مرتب کی تو اس کو دو جماعتوں میں تقسیم کیا۔ بنڈیسرتھ ( ) اور ریشتاغ۔ (جس طرح کہ انگلستان میں دارالخواص اور دارالعوام ہیں) انتخاب کے ایسے اصول بنائے کہ بنڈیسرتھ میں عمائدین و روسار ملک اور ریشتاغ میں عوام شامل ہوئے۔ اصلی طاقت اول الذکر کے ہاتھ میں رہی۔ اور دوسری محض بحث و مباحثہ کی جولانگاہ بن گئی۔ اشتراکین نے جب یہ حالت دیکھی تو اس نظام کی تباہ کرنے کی کوشش کی۔ کرل مارکس کے اصولوں پر عملدرآمد کیا گیا۔ گو حکومت کو تو

---

[۵۱] انتخاب مضامین جوہر۔ "کرل مارکس اور نظام اشتراکی" از یوسف حسین خانصاحب متعلم بی۔ اے جامعہ ملیہ

نپٹ سکے لیکن رفتہ رفتہ میں عوام کی نیابت کا ایک حد تک کمزور بن گیا۔ جوں جوں وقت آتا گیا تمام یورپ امریکہ میں سوائے روس کے صحیح نیابت کا طریقہ ترقی پذیر ہوتا رہا۔ خاصکر موجودہ زمانہ میں انگلستان سب سے زیادہ عوام کی نیابت کا مرکز بن گیا ہے۔ کارل مارکس کے عہد میں جرمن میں انجیلز اور لیسلی۔ فرانس میں پراوڈھن۔ اٹلی میں میزنی۔ انگلستان میں آدن اور رسکن روس میں بیکانن وغیرہ تھے۔

روس میں شہنشاہیت کا دور دورہ تھا۔ اس کے مٹانے کے لیے یہاں بھی یہ تحریک عدمیت (نہلزم) کے نام سے مشہور تھی[۵] فرقہ جنگی پر گلدر آمد کیا گیا۔ ملک میں عام بیداری پیدا ہوگئی۔ کامیابی خوب اچھی طرح ہوئی۔ طلبا نے اس میں بہت کافی حصہ لیا تھا۔ گرفتاریاں برابر جاری رہیں۔ حکومت نے عاجز ہوکر مارشل لا کا نفاذ کردیا۔ تحریک گرچہ ایک قلیل مدت کے لیے بند ہوگئی لیکن پھر اپنی اصلی حالت پر بلکہ پہلے سے دوگنی طاقت کے ساتھ شروع کی گئی۔ گزشتہ جنگ عظیم نے بہت اچھا موقع دیا۔ مسٹر لینن کی رہنمائی میں کام شروع کیا گیا۔ بالآخر انقلاب ظہور میں آیا۔ اس سے قبل ایک لاکھ اسّی ہزار آدمی جیلخانوں میں مقید تھے۔ اب شہنشاہیت کا دور ختم ہوگیا۔ اور اس کی جگہ نظام اشتراکی (بالشویکی حکومت) قائم ہوئی۔ یورپ کے دیگر ممالک سے روس اپنی طبعی و اقتصادی حیثیت سے بالکل مختلف ہے۔ حکومت پیدائش و تقسیم کا انتظام بذات خود کرتی ہے۔ لیکن چونکہ اس تحریک کی کامیابی کا دارومدار اور قیام "بین الاقوامی" اصول پر مبنی ہے لہذا دیگر ممالک کو بھی بالشویکی اسی نظام کے تحت میں لانا چاہتے ہیں۔ لیکن واقعات بتلاتے ہیں کہ دنیا اس کے بہت خلاف ہے۔ اُن کی طبعی و اقتصادی حالت بالکل جدا ہے پس بیرونی معاشی دباؤ سے یہ نظام بدل جائے گا۔

روس میں بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ وہ اپنے سرمایہ کو دوسرے ملکوں میں لے جاکر تجارت میں لگاتے ہیں۔ روس میں سرمایہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

---

[۵] تاریخ اشتراکیت کرکپ

اشتراکیت ایک مقصد ہے نہ کہ الہامی قانون اس لیے ہر زمانے کے موافق مختلف صورتوں میں اس کو
معلوم سمجھا گیا۔ منزل مقصود تو وہی ہے مگر طریقۂ کار بدلتا رہا۔ مسٹر میکڈانلڈ فرماتے ہیں۔
"جوں جوں وقت آتا جاتا ہے اور ہمارے صنعتی و حرفتی تجربے مکمل ہوتے جاتے ہیں اسی طرح سابق اشتراکیین
کے اصول اور طریقۂ کار میں تغیر و تبدل بھی ہوتا رہتا ہے۔ نیز ایک جانب قدم بڑھانے سے دوسرے
مخفی راستے نکل آتے ہیں اور طریقۂ کار بھی بدل جاتا ہے۔ گزشتہ اشتراکیین کو دیکھو جب فضا
صدائے انقلاب سے گونج رہی تھی ان کے اصولوں پر ایک نیا رنگ چڑھ گیا تھا مگر اب وہ فضا بدل
گئی اور یہ رنگ بھی اُڑ گیا (ارتقار کا اقتضا ہی تھا) لیکن اشتراکیت کا مقصد وہی ہے یعنی عوام الناس
کی بہبودی"۔ اور آگے چل کر فرماتے ہیں:۔
"اس سے کچھ غلط فہمی رفع ہو جائیگی اگر پہلے ہی سے میں یہ ظاہر کر دوں کہ یہ تحریک انفرادی مفاد
کے لیے مضرت رساں نہیں ہے۔ جب اشتراکیین سرمایہ داری (Capitalism) اور
شخصی ملکیت ______ پر اعتراض کرتے ہیں تو سرمایہ داروں اور تاجروں کو الزام نہیں
دیتے بلکہ برخلاف اس کے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ سرمایہ دار اس طریقۂ کار . . . . .
. . . . کا اتنا ہی شکار ہوا ہے جتنا کہ ایک مزدور۔ اور
اس کی خرابیوں سے اتنا ہی متاثر ہوا ہے جس قدر کہ ایک فلاکت زدہ شخص۔ گو ان دونوں کی حالت
سے نتائج تو یکساں مرتب نہیں ہوتے لیکن نقصان کی حیثیت سے دونوں برابر ہیں۔ اشتراکیت
اصولاً معاشی اسباب کے ارتقار سے بحث کرتی ہے نہ کہ اخلاقی تاریخی سے ہم کسی صورت سے
اجتماعی مسائل انفرادی مسائل سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ ان دونوں سے بہت سے فوائد مرتب ہوتے
ہیں۔ اشتراکیت ترقی اجتماعی کا دوسرا نام ہے جس میں ہر فرد اپنا وجود رکھتا ہو۔"
موجودہ حالات و واقعات کو دیکھتے ہوئے ایک ماہر نفسیات یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ عام طبائع انسانی
ایسی ہیں کہ اشتراکیت یک لخت قابل عمل نہیں بنائی جا سکتی بلکہ ارتقائی انقلاب (Evo-
lutionary Revol.) زیادہ کارگر ہوگا کہ جارحانہ انقلاب Aggressive

Revolution ، وہ ذرا ذرا سی بات کو اندیشۂ خطرہ سے تعبیر کرتی ہیں۔
انگلستان کے موجودہ نظام حکومت میں نیابت کا کافی حق دیا گیا۔ انڈیپنڈنٹ لیبر پارٹی کے اراکین اور دیگر جماعت کے ممبران جن کے مقاصد میں عوام کی بہبودی مد نظر ہے دار العوام میں حال کے انتخاب کے بعد کافی تعداد میں موجود ہیں۔ مسٹر میکڈانلڈ حصول اشتراکیت کے لیے حسب ذیل طریقہ بتلاتے ہیں۔ جنوری ۱۹۲۳ء میں ایک جلسہ کی صدارت فرماتے ہوئے کہا کہ سرمایہ داروں کے خلاف کوئی سازش نہیں کی جارہی ہے بلکہ عوام کے لیئے اقتصادی و اخلاقی آزادی حاصل کرنا مقصود ہے۔ ڈماکریسی۔ تعمیری قوانین۔ حق گزاری۔ پرائیویٹ ملکیت۔ بہترین ذریعہ کار برآری ثابت ہوں گے۔

(۱) جمہوریت

پارلیمنٹری گورنمنٹ جس میں عوام کو نیابت کا کافی حق حاصل ہو۔ ملکیت کو حق رائے دہندگی کا معیار قرار نہ دیا جائے۔ انگلستان جہاں نیابت کا طریقہ ایک حد تک اصلی معنوں میں حاصل ہے وہاں حکومت کو تباہ و برباد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ گزشتہ صدی عیسوی میں عوام کو یہ حق حاصل نہ تھا۔ طاقت اُن کے ہاتھ میں نہ تھی۔ اسی وجہ سے اشتراکیین نے فرقہ جنگی و دیگر طریقے ایجاد کیے

(۲) تعمیری قوانین

جب عوام کو حق نیابت حاصل ہے تو قانون کے ذریعہ مختلف فرقوں کی جائز شکایت دور کرنے کے لیے مناسب سہولتیں بہم پہونچائی جائینگی۔ وہ تمام اقتصادی رکاوٹیں جو نقصان دہ ہیں دور کردی جائیں گی۔ کارخانوں کی از سر نو تنظیم کی جائیگی۔ خاص خاص قسم کی فیکٹریاں قائم رہیں گی یعنی صنعت و حرفت کو زیادہ رواج دیا جائے گا۔ اصل پر ٹیکس لگادیا جائیگا تاکہ مفاد عامہ پر صرف کیا جائے۔ تعلیم عام اور سستی کردی جائیگی تاکہ ایک معمولی سے معمولی مزدور بھی اپنے

بچوں کو تعلیم دلا سکے۔ کام کے لحاظ سے فرق تو ضرور ہوگا مگر ہر شخص اپنی ضروریات آسانی سے
دور کر سکے گا۔

(۳) حق کارگزاری قانون کے ذریعہ کارخانوں اور
دیگر ملکیات میں کام کے گھنٹے کم کر دیئے جائیں گے۔ اگر انجن میں کوئلہ جلانے والے صرف ۲ آدمی ہیں
جیسا کہ عام دستور ہے (یعنی دن میں ۱۲ گھنٹے ایک آدمی کام کرتا ہے اور رات میں ۱۲ گھنٹے دوسرا)
تو بجائے دو آدمیوں کے چار رکھے جائیں گے۔ اس سے ایک تو بیکاری کا انسداد ہو جائے گا۔
دوسرے قوائے انسانی زیادہ مضمحل نہ ہوں گے۔ عام تندرستی بڑھ جائیگی۔ آرام کا کافی وقت
ملے گا۔ پیداوار بھی زیادہ ہوگی۔ مشین کے ذریعہ پیداوار اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ملک کا ہر فرد
اپنی ضروریات اچھی طرح پوری کر سکتا ہے۔ اور پھر بھی ایک کثیر ذخیرہ بچ رہتا ہے۔ آجکل لنکا شائر
میں ۲۰ آدمی اتنا کپڑا تیار کرتے ہیں جتنا کہ پہلے زمانہ میں تمام جولاہے بناتے تھے لیسٹر کے
ایک ہزار چمار ایک چوتھائی ملین افراد کے لیے اتنے جوتے بنا سکتے ہیں کہ ایک سال میں ہر شخص
چار جوتے پہن سکتا ہے۔ ۱۲۰ آدمی اتنا آٹا پیس سکتے ہیں کہ ۲۰۰۰۰۰ افراد کھا سکتے ہیں۔

گورنمنٹ ہر فن کو قائم رکھنے کے لیے اعلیٰ قانون بنائیگی۔ حتیٰ کہ حضرت شاعر (غالباً جو
زیادہ تر قوم کے جذبات کے ترجمان ہوں) بھی ایک کارگزار فرد شمار کیے جائیں گے۔ ایسا
ماحول پیدا ہو جائیگا کہ ہر شخص اپنی قابلیت کے موافق اپنی خدمات شوق کے ساتھ انجام دیگا۔
جو لوگ کام کرنے کے قابل نہ ہوں گے اُن کو وظیفہ وغیرہ سے امداد دی جائیگی۔

ذاتی ملکیت اشتراکیت کا عام مفہوم یہ سمجھا گیا
ہے کہ اس قسم کی حکومت مثل ایک خاندان کے ہے جس کا ایک فرد پیدائش و تقسیم کا انتظام کرتا ہے۔
ایسی حکومت میں ذاتی ملکیت کوئی مفہوم نہیں رکھتی۔ یہ ایک مغالطہ ہے۔ روس میں بھی
ہر شخص اپنے ایک مکان مستقل طریقے سے رکھتا ہے۔ گو یہ نظام حکومت آخری درجہ کا ہے لیکن
پائدار نہیں۔

امریکہ جو دنیا کا سب سے متمول ملک ہے وہاں مالدار اور غریب کا تناسب ایک اور دس کا ہے۔ انگلستان۔ فرانس۔ جرمنی وغیرہ میں تو اس سے زیادہ ہے مگر قسمت ہندوستان میں ایک اور چھ سو کا تناسب ہے ہر شخص کو اپنی حیثیت۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مستحکم و مضبوط رکھنے کے لیے ذاتی ملکیت جس پر اس کی زندگی کا دارومدار ہے رکھنا ضروری ہے ذاتی ملکیت جو موجودہ نظام کے ماتحت ایک خطرہ بن گئی ہے یقینی تباہ کر دینا چاہیئے وہ صرف قانوناً اس حد تک ہوگی کہ مفاد عامہ اور حکومت خطرہ میں نہ پڑ جائے۔

یہ ہے وہ اشتراکیت جس کے لیے دنیا میں ہر شخص باوجود اختلاف مذہب و عقائد کوشاں ہے۔ دراصل اشتراکیت کا اتنا ہی مقصد بھی ہے کہ اس نظام کے ماتحت عوام کافی اطمینان و سکون کی زندگی بسر کر سکیں۔

عبدالحمید خاں متعلم جامعہ

دول یورپ اور ترکی

وہ ممالک جو ترکوں کی اکثریت آبادی کے باوجود ان سے التوائے جنگ کے بعد علیحدہ کر دیئے گئے تھے دوبارہ اناطولیہ کے ترکان احرار کے قبضہ میں آ گئے ہیں۔ یونانیوں پر ان کی مہم باشان کامیابی کو جو سے پیشتر لوگوں کو دیکھنا نصیب ہوا۔ ڈھائی سو سال میں پہلا موقعہ ہے کہ ترکوں نے اپنی کسی متاع گم شدہ کو حاصل کر لیا ہو۔ ۱۶۹۵ء کے محاصرہ وائنا کے بعد سے ترکوں کے حدود سلطنت میں برابر تخفیف ہوتی جاتی ہے اور وہ صوبے جو اغیار کے زیر تصرف ہو جاتے ہیں مسلمانوں کی آبادی وہاں سے بالکل غائب ہو جاتی ہے حالانکہ چند سال پیشتر وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہی کیوں نہ ہو۔ اس قسم کے واقعات پر تاریخ شاہد ہے۔ دول یورپ نے سمرنا، مقدونیہ اور بلغاریہ ہی تک اپنی قناعت ظاہر نہ کی بلکہ ترکوں کو اناطولیہ کے علاقہ سے جو ان کا قدیم وطن ہے محروم کرنے کی ٹھان لی تاکہ زمین کی تمام وسعتوں میں اس قوم کے پاس کوئی مامن و ملجا باقی نہ بچے۔ دول یورپ کے اس غاصبانہ طرز عمل نے ترکوں کی حیات کے حق میں مسیحائی کی اور ان میں جذبہ قومی پیدا کر دیا جو عرصے سے ان میں مفقود تھا۔

ترک جنگ بلقان کے بعد سے ایسے درماندہ ہو بیٹھے تھے کہ اس جنگ عظیم کی تاب لانے کے بالکل ناقابل تھے۔ اس وقت ترکی کے بعض ارباب حل و عقد نے جرمنی کے ساتھ دوستی کا اظہار کیا اور انہیں پر ترکوں کی آیندہ مشکلات کی ذمہ داری ہے۔ ترکی قوم "اعلان جہاد" کے مفہوم سے خوب واقف تھی اور ان کے نزدیک انگریزوں فرانسیسیوں اور جرمنوں میں کوئی فرق نہ تھا بلکہ وہ ان سب کو ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے خیال کرتے تھے۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو جب ترکی محاذ پر دول متحدہ کی طرف سے التوائے جنگ کا اعلان ہوا تو ترکوں کو یک گونہ اطمینان نصیب ہوا اور وہ تقریباً سب شرائط کو تسلیم کرنے کے لیے طیار تھے جو اتحادیوں کی طرف سے پیش کی جائیں۔ ان کو اس کا مطلقاً علم نہ تھا کہ شرائط صلح کیا ہونگی لیکن اس کا ضرور یقین تھا کہ اتحادی ان مواعید و مواثیق کے خلاف ورزی نہ کریں گے جو انھوں نے التوائے جنگ کے وقت

نہایت بلند آہنگی سے کیے تھے۔ رؤف بے نے جو شرائط التوائے جنگ پر دستخط ثبت کرنے والوں میں سے
تھے اور جو آجکل انگورہ گورنمنٹ کے وزیر اعظم ہیں مجھ سے (راقم مضمون) بذات خود ایک مرتبہ تذکرۃً کہا
کہ "مودروس کی گفت و شنید کے موقعہ پر اتحادی اپنی شرائط سے زیادہ اپنے وعدوں پر زور دیتے تھے"۔
التوائے جنگ کے اصولی شرائط یہ تھیں کہ آبنائے کلیۃً آزاد رہیں گی اور اصول قومیت و خود اختیاری کا
ہر طرح لحاظ رکھا جائیگا۔ پہلی شرائط دفعہ نمبر (۱) اور دوسری شرائط دفعہ نمبر (۷) کے ماتحت ہے۔ دفعہ ۷ کی
رو سے دول یورپ کے حدود بھی مقرر کر دیے گئے ہیں تاکہ وہ غیر ترکی صوبجات کے علاوہ اپنا اثر نہ قائم کر سکیں۔
دفعہ (۲۴) کی رو سے اتحادی ترکی صوبوں پر اس وقت تک پیشقدمی نہیں کر سکتے جب تک کہ ترکوں کی طرف سے
اتحادیوں کے حقوق پر ناجائز حملہ نہ کیا جائے یا جب تک آرمینیہ کے علاقہ میں فتنہ و فساد دفع کرنے کی
ضرورت نہ محسوس کی جائے۔ لیکن بغیر کسی خاص وجہ کے دول متحدہ نے قسطنطنیہ تھریس اور اناطولیہ کے
بڑے رقبہ پر اپنا تسلط جما لیا۔ بیکس ترکوں میں اس وقت صدائے احتجاج تک بلند کرنے کی طاقت نہ تھی۔
التوائے جنگ کی ان اصولی شرائط کے خلاف ورزی کی گئی اور دوسرے شرائط مثلاً تخفیف فوج۔
سامان حرب کا حوالہ کرنا وغیرہ وغیرہ پر نہایت شد و مد کے ساتھ عملدرآمد شروع کر دیا گیا۔ انہیں ایام
میں یہ افواہیں بھی گرم ہونی شروع ہوگئیں کہ باقی ماندہ ترکی صوبے بھی اتحادیوں نے آپس میں تقسیم کر لیے
ہیں اور ترکی صوبوں کا بڑا حصہ یونان کے حصہ میں آیا ہے۔ حقیقتاً یہ افواہیں درست نہیں۔ دوران جنگ
میں اتحادیوں نے ایک خفیہ معاہدہ آپس میں کیا تھا کہ مشرقی اناطولیہ اور قسطنطنیہ کا علاقہ روس کو دیا جائے
اور سینٹ جین ماریں کے معاہدہ کی رو سے سمرنا اور عدلیہ پر اٹلی کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا۔ روس اسی زمانہ
میں انقلاب کی ابتلائے عظیم میں مبتلا تھا۔ اس کی حالت حد درجہ زبون تھی۔ چنانچہ قسطنطنیہ اور آبنائے
کے علاقہ کے متعلق اتحادیوں میں اختلاف شروع ہوا۔ دول متحدہ کا خیال ہوا کہ اگر ان علاقوں کو
ٹرکی کے نام نہاد تصرف میں رکھا جائے تو آپس کی نااتفاقی کا خدشہ مٹ جائے گا۔ حقیقتاً اسی آپس کی
نااتفاقی کی وجہ سے مسٹر لائڈ جارج نے اپنی تقریر میں با دل ناخواستہ اظہار فرمایا "کہ ہمارا مقصد ایشیائے کوچک
اور قسطنطنیہ کے مشہور و معروف خطوں اور زرخیز زمینوں پر قبضہ کرنا ہرگز نہیں"۔ اس اعلان سے اور بہت سے

فوائد بھی مطلوب تھے جن کے ذکر کا یہاں موقع نہیں۔

ممالک متحدہ امریکہ نے جنگ میں اس شرط پر شرکت کی تھی کہ دوران جنگ کے تمام خفیہ معاہدات یکقلم منسوخ کر دیئے جائیں۔ چونکہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کو اس وقت امریکہ کی مدد کی سخت ضرورت تھی اس لیے اس شرط کو فوراً منظور کر لیا گیا۔ چنانچہ دونوں حکومتوں نے اعلان کر دیا کہ سنہ ۱۹۱۶ء اور سنہ ۱۵ء کے تمام معاہدے جو روس کی شرکت کے ساتھ کیے گئے تھے منسوخ کر دیئے گئے کیونکہ حکومت روس اب ہماری شریک کار نہیں رہی۔ اب یونان اپنی تمام دیرینہ امنگوں کے ساتھ میدان میں آتا ہے!

اگر روس نے اتحادیوں سے دست کشی اختیار کی تو ان کو اس کی بجائے ایک دوسرا تازہ دم رفیق مل گیا جو ابتک کسی سے برسرپیکار نہ تھا یعنی یونان۔ اگرچہ مقدونیہ کے علاقہ میں یونانی افواج سے کافی مدد ملی تھی لیکن یونان کی طرف سے جو اس خدمت کے انعام کا مطالبہ کیا گیا وہ حد سے متجاوز تھا۔ صلح کانفرنس میں مسٹر وینزیلوس (وزیر اعظم یونان) نے جو رپورٹ پیش کی اس میں نہایت منطقی طریقہ سے تھریس۔ قسطنطنیہ جنوبی البانیہ اور مغربی اناطولیہ معہ بندرگاہ سمرنا پر اپنا استحقاق ظاہر کیا۔ ساتھ ہی تمام ممالک یورپ میں پروپگنڈے کے ذریعہ اپنے آپ کو برسرحق ہونے نیز ان تمام علاقوں میں یونانی نسل کے لوگوں کی اکثریت (چاہے وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہوں لیکن یونانی نسل میں داخل ہو سکتے ہیں) ظاہر کرنے کی بڑی شد ومد سے کوشش کی گئی۔ بعض مقامات میں جب علم اعداد وشمار کے بیجا استعمال سے بھی کوئی فائدہ متصور نہ ہوا تو یہ امر ثابت کیا گیا کہ ان لوگوں کی کہانیاں اور دیرینہ رسوم یونانیوں سے ملتی جلتی ہیں غرضکہ مقصد براری کی تدابیر اختیار کرنے میں کوئی کوتاہی اپنی دانست میں نہ باقی رہنے دی۔ واقعتاً مسٹر وینزیلوس اپنے غیر ذمہ دارانہ افعال سے مستقبل کے خطرہ کو دل ہی دل میں محسوس کرتے تھے لیکن مسٹر لائڈ جارج مسٹر ولسن اور مسٹر کلیمنشو کی ہمت افزائی نے جو ناقابل عمل عزائم اور ولولے ان کے دل میں پیدا کر دئیے وہ ان کی عقل سلیم اور سنجیدہ فطرت کی راہبری پر غالب

تھے گئے۔ اُدھر انگلستان اور فرانس کی طرف سے اس لئے اور بھی خاطر مدارات ہو رہی تھی کہ ان کو مشرق قریب میں اپنا تسلط قائم رکھنے کے لیے فوجوں کی ضرورت تھی اور دونوں ملکوں کی مالی حالت جواب دے چکی تھی۔ بس پھر یونانی فوجوں سے زیادہ موزوں کون ہو سکتا تھا؟ مسٹر وینزیلوس نے کانفرنس میں اپنا اثر اور بھی زیادہ یہ کہکر پیدا کر لیا کہ "عنقریب دنیا دیکھ لے گی کہ ترک ان تمام علاقوں میں ایک عیسائی بھی زندہ نہ چھوڑیں گے"۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اپنے ان اعلیٰ حکام کے مشوروں کی بھی مطلقاً پروا نہ کی جو ترکوں کے ساتھ رہ چکے تھے اور ان کی فطرت اور قومی عصبیت سے بخوبی واقف تھے۔ بہر حال باوجود اٹلی کی سخت مخالفت کے یونانی افواج کو سمرنا میں داخلہ کی اجازت مل گئی۔ ۱۵ مئی کو یونانی فوج اتحادی جنگی جہازوں کی سرکردگی میں سمرنا کے ساحل پر اتری۔ متصل علاقوں میں لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا۔ ممکن تھا ترک لوگ کسی متمدن اور شائستہ قوم کے داخلہ پر اتنے برافروختہ نہ ہوتے لیکن یونانیوں کی اس دست درازی کو جو مدت تک ان کے محکوم رہ چکے تھے اور جو نظام تمدن کے مبادی اصول سے بالکل نابلد تھے کیونکر برداشت کر سکتے تھے۔ ہر وہ متنفس جو قوم ترک کی نفسیات سے کچھ بھی درک رکھتا ہو اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ لیکن دول متحدہ کے مدبرین پر تو ایک یونانی سحر طراز (مسٹر وینزیلوس) کے جادو نے اپنا کافی اثر قائم کر دیا تھا۔ باوجود اتحادی کمیشن کے تحقیقاتی رپورٹ شائع ہونے کی اجازت نہ دینے کے تمام دنیا پر یونانیوں کی ہولناک ستم آرائیاں ظاہر ہو گئی ہیں۔

ترکوں کا شیرازۂ نظام اس وقت بالکل منتشر تھا لیکن لوگوں کی خودداری اور عصبیت فنا نہوئی تھی۔ یونانیوں کے مقابلہ کے لیے اُنھوں نے خود گروہ بندی شروع کر دی۔ یونانیوں کی فوج اس وقت اسّی ہزار سے زائد پہونچ گئی تھی۔ یہ فوج اب اسی علاقہ تک محدود نہ رہی جہاں تک کہ کانفرنس نے اجازت دی تھی بلکہ اور پیشقدمی شروع کر دی۔ باقاعدہ سمرنا یونانی حکومت کا مرکز قرار دیا گیا اور مسٹر اسٹرگیڈس کو اس علاقہ کا ہائی کمشنر مقرر کیا۔ یونانی تسلط کی خبر

تمام ترکی علاقہ میں نہایت سرعت کے ساتھ پھیل گئی۔ لہٰذا چونکہ التوائے جنگ کے بعد صلحنامہ پیش کیے جانے تک اس قدر تعویق برتی گئی تھی کہ ان ایام میں ترکوں کو اپنی بے بسی کا اچھی طرح احساس ہو گیا تھا اور وہ احیائے قومی کی تحریک جو چند ذہنوں تک محدود تھی اب ایک عظیم الشان کام انجام دینے کی کفیل ٹھہرائی گئی۔ یہ تحریک عام طور پر مصطفےٰ کمال پاشا کے اسم گرامی کے ساتھ منسوب کی جاتی ہے۔ لیکن دنیا کی یہ مہتم بالشان ہستی خود اس تحریک کی بانی نہیں ہے۔ اس کے اصلی بانی تو وہ یونانی مدبر ہیں جنھوں نے ساحل سمرنا کی طرف اپنی افواج روانہ کی تھیں۔ التوائے جنگ تک مصطفےٰ کمال سیاسیات میں کم دلچسپی لیا کرتے تھے۔ اب تک ان کی زندگی ایک فوجی زندگی تھی (۱۹۰۸ء کے انقلاب میں یہ مقدونیہ میں تھے اگرچہ دوسرے فوجی افسروں کی طرح یہ بھی شریک کار رہے لیکن نمایاں حیثیت سے نہیں) دوران جنگ میں اُنھوں نے دردانیال اور فلسطین کی لڑائیوں میں اپنی قابلیت کے خوب اچھی طرح جوہر دکھلائے تھے۔ مقابلۃً ان کا رجحان اتحادیوں کی طرف زیادہ تھا۔ ۱۹۱۶ء ہی میں ان کو اتحادیوں کی کامیابی کا پورا یقین ہو گیا تھا چنانچہ اُنھوں نے جلد از جلد صلح کرنے کی تجویز بھی پیش کی تھی۔

جب سمرنا پر یونانیوں کا قبضہ ہو گیا تو اُنھوں نے ترک قوم کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو اناطولیہ میں ایک نظام کے ماتحت لانے کی کوشش کی ارض روم اور سیواس کی کانگریسوں میں انھیں کو صدر منتخب کیا گیا۔ سیواس کی کانگریس کے بعد اُنھوں نے مدافعت کے لیے فوجی نظام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ آہستہ آہستہ ترکی قسمت کا فیصلہ مصطفےٰ کمال اور ان کے ساتھیوں پر منحصر ہو گیا اور قسطنطنیہ کی دخل اندازی محض برائے نام رہ گئی۔ غالباً اس وقت سوائے داماد فرید پادشاہ کے اور کوئی متنفس نہ تھا جو غازی موصوف کی ان حرکات کو از راہ پسندیدگی نہ دیکھتا ہو۔ داماد فرید نے ان پر بغاوت کا الزام لگایا کہ وہ سلطان المعظم کے اختیارات میں مداخلت کرتے ہیں۔ مصطفےٰ کمال نے نہایت بلند آہنگی کے ساتھ انگریزوں اور فرانسیسیوں کے خلاف اعلان کر دیا۔ اور یہ دعویٰ پیش کیا کہ دول متحدہ کی تمام حرکات التوائے جنگ کی شرائط کے صریحاً خلاف ہیں

جن میں ہر حکومت کو (اور ہم کو خاصکر) حکومت خود اختیاری کا مجاز ٹھہرایا گیا ہے۔

۱۹۱۹ء میں داماد فرید وزارت سے برطرف کر دیے گئے اور ان کی بجائے علی رضا پاشا منتخب ہوئے جو ترکان احرار کے طرفدار تھے اور ان کی تمام حرکات کو حق بجانب خیال کرتے تھے۔ اس انتخاب عام میں حریت پسندوں نے پارلیمنٹ میں اپنی اکثریت حاصل کر لی۔

۲۸ جنوری ۱۹۲۰ء کو ممبران پارلیمنٹ نے کثرت آرا سے یہ قرارداد منظور کی کہ "ترکی کو حریت کامل سے کم پر قناعت نہ کرنی چاہیے۔ نیز کارس، اردھان اور باطوم کے علاقوں کو اپنی گورنمنٹ کے متعلق حق فیصلہ ان کے انتخاب عام پر منحصر قرار دیا جائے۔"

انگریز خاص طور پر قسطنطنیہ میں اس قسم کی جماعت کی موجودگی کو بہ نظر استحسان نہیں دیکھتے تھے۔ چنانچہ مارچ ۱۹۲۰ء میں مجلس کابینہ کے اکثر ممبروں کو جن میں رؤف بے (موجودہ وزیر اعظم انگورہ گورنمنٹ) بھی شامل تھے گرفتار کر لیا گیا اور بعض کو مالٹا جلاوطن کر دیا گیا۔ ۱۶ مارچ ۱۹۲۰ء کو تمام سرکاری اور امور عامہ کی عمارات پر انگریزی سپاہ کا قبضہ ہو گیا۔ مجلس نے اس کے خلاف سخت صدائے احتجاج بلند کی اور علی رضا مستعفی ہو گئے۔ اور ان کی بجائے داماد فرید ۱۶ اپریل ۱۹۲۰ء کو دوبارہ برسر اقتدار ہو گئے۔

شیخ الاسلام کے ذریعہ ایک فتویٰ شائع کیا گیا جس کی رو سے مصطفیٰ کمال اور ان کے تمام ہم مشربوں پر بغاوت کا الزام لگایا گیا اور جلاوطنی کا حکم بھی دیدیا گیا۔ مصطفیٰ کمال نے انگورہ میں نئی پارلیمنٹ منعقد کی اور چونکہ برٹش گورنمنٹ نے اکثر ممبروں کو گرفتار کر لیا تھا اور ان کو انگورہ جانے کی اجازت نہیں دی تھی اس لیے جدید انتخاب کا اعلان کر دیا گیا اور انتخاب کے بعد ۲۹ اپریل ۱۹۲۰ء کو پارلیمنٹ کا اجلاس منعقد کیا گیا۔ مصطفیٰ کمال صدر جمہوریت قرار پائے اور باقر سمیع بے وزیر خارجہ۔ نئی گورنمنٹ نے تمام سرکاری ملکیت پر اپنا قبضہ کیا اور انگورہ میں قسطنطنیہ بنک کی شاخوں کو بھی اپنے زیر اہتمام لے لیا۔

اپریل ۱۹۲۰ء مقام سین ریمو۔ میں "کونسل اعلیٰ" نے اتحادیوں کے نمایندہ جماعت ہونیکی

حیثیت سے شرائط صلح کی ترتیب دی۔ اور باوجود اتحادی افسروں کی سخت تاکید کے الوالی اور سنجک کا علاقہ یونان کے حوالہ کیا اور سلطان کے تسلط کو برائے نام تسلیم کیا۔ قسطنطنیہ کو دمختلفہ ہونے کی وجہ سے اتراکوں کے لیے چھوڑ دیا گیا اور آبنائے پر بین الاقوامی کمیشن منعقد کیے جانے کا فیصلہ کیا۔ عرب صوبے ترکوں کے اثر سے بالکل علیحدہ کر دیئے گئے چونکہ ترکان احرار نے ان شرائط کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا یونان کو اس امر کا اختیار دیا گیا کہ وہ ان شرائط کو بہ جبر منوائے۔

جون کے آخری دنوں میں یونان نے اپنا حملہ شروع کر دیا اور یونانی افواج بالیکستر سے شمالی جانب روانہ ہو کر بحر مارمورہ تک پہونچ گئیں۔ تھریس میں جعفر طیار کے ماتحت جو سپاہ تھی اس سے مقابلہ ہوا اور جعفر طیار کو مجبوراً پیچھے ہٹنا پڑا اور ۲۵ جولائی کو ایڈریانوپل پر یونانی قبضہ ہو گیا۔ یونانیوں کو مغالطہ ہوا کہ اب ترکوں کی رہی سہی طاقت کا بھی بالکل خاتمہ ہو گیا۔ ان فتوحات کی اصل وجوہ یہ تھیں کہ اول تو ترکوں کی تمامتر توجہ باقاعدہ افواج کی ترتیب میں لگی ہوئی تھی اور دوسرے انہیں ایام میں مقام بروسا پر ترکان احرار کے خلاف اور اتحادیوں کے ایما سے احمد انزلور کی سرکردگی میں علم بغاوت بلند کر دیا گیا جس کو فرو کرنے کے لیے بہت قوت صرف کرنا پڑی۔ یونانی مادی حیثیت سے بہ مقابلہ ترکوں کے اچھی طرح مسلح تھے اور التوائے جنگ کے بعد سے اتحادیوں نے ہر ممکن طریقے سے مدد و اعانت کی۔

اس زمانہ میں دو ایسے اہم واقعات پیش آئے جنھوں نے جانبین کی سیاسی حالت میں ایک نمایاں تغیر پیدا کر دیا۔ ایک تو ترکان احرار اور بالشویک روس کے مابین اتحاد اور دوسرے مسٹر وِنزیلوس کا وزارت یونان سے برطرف کیا جانا۔ چونکہ روس کے تعلقات دول عظمیٰ سے کشیدہ تھے اس لیے ترکوں سے ان کے دوستانہ تعلقات پیدا ہونا بالکل طبعی امر تھا۔ ترکی کے ذی فہم مدبرین روس کے ساتھ اتحاد کے لیے دل سے متمنی نہ تھے لیکن سیاسی حالات کو دیکھتے ہوئے مصطفیٰ کمال روس سے عہدنامہ کرنے کے لیے طیار ہو گئے۔ ۱۶ مارچ ۱۹۲۱ء کو دونوں ممالک کے نمایندوں نے اس عہدنامہ پر دستخط ثبت کیے۔ بایں ہمہ ترکوں نے اپنے تعلقات قائم

کرنے میں نہایت حزم و احتیاط برتا۔ اس عہد نامہ کی رو سے صرف دونوں ملکوں کی حدود کا تصفیہ کر دیا گیا۔ مراعات یکقلم محو کر دیئے گئے اور آبناؤں کی آزادی کو تسلیم کر لیا گیا۔ اخلاقی امداد جو بالشویکوں کی طرف سے بعد شکر قبول کی گئی لیکن فوجی کمک یا حدود ترکی میں اشتراکیت کی تبلیغ کو مطلقاً منع کر دیا گیا۔

اسی عرصہ میں شام۔ ہندوستان۔ اور عراق میں جو تحریکات دول عظمیٰ کے برخلاف رونما ہوئیں ان کی دراصل تمامتر ذمہ داری دول عظمیٰ ہی پر عائد ہوتی ہے کہ انہوں نے مشرق قریب میں ایسا برا سلوک کیوں روا رکھا۔ ترک بہت مدت سے ترکی قوم کے آپس میں اتحاد کی کوشش کر رہے تھے لیکن اتحادیوں کے اس سلوک نے ان کو تحریک "اتحاد اسلام" کی طرف متوجہ کر دیا۔ ایک قوم پرست ترک نے مجھکو (راقم مضمون کو) یقین دلایا کہ اگر اتحادی اور خصوصاً انگریز ترکوں سے حقیقی معنی میں مصالحت کر لیں تو ترکوں کو ہندوستان یا مصر کے معاملات میں مطلقاً دلچسپی نہ رہیگی۔

مسٹر وِنزیلوس وزیر اعظم یونان کی علحدگی کے بعد ہی فرانس کی خارجی پالیسی میں ایک اہم تغیر واقع ہوا۔ فرانس نے واقعات کے رجحان سے بہت جلد معلوم کر لیا کہ ترکوں کے ساتھ مفاہمت کرنے میں اس کے ملک کا مفاد مضمر ہے۔ اگرچہ برطانیہ قسطنطنیہ کو برسر اقتدار ہونا پسند نہیں کرتی تھی لیکن عہدنامہ سیورے کے خلاف کرنے میں برطانوی مدبرین مذبذب تھے اٹلی تو پیشتر ہی سے یونان سے خار کھائے بیٹھا تھا اور شروع ہی سے اس کی ہمدردی ترکوں کے ساتھ تھی۔ یونان کی سیاسی تبدیلی کے ساتھ ترکی محاذ پر جو یونانی افسر تھے ان میں سے اکثر کی بجائے دوسرے شہنشاہیت پسند افسر مقرر کیے گئے۔ چنانچہ ان چند در چند وجوہ سے جو آیندہ اثر پڑا وہ میں ابھی بتلاتا ہوں۔

یہ ظاہر تھا کہ موجودہ صورت حال عرصہ تک قائم نہ رہ سکے گی۔ چنانچہ اتحادیوں نے لندن میں فروری ۱۹۲۱ء میں ایک کانفرنس کے انعقاد کی تجویز کی۔ دول مغربی جاپان اور یونان سب کے

علاوہ ٹرکی کی دونوں گورنمنٹوں کو بھی دعوت دی (قسطنطنیہ کی گورنمنٹ اس وقت تک قائم تھی)۔ کثرت آرا سے یہ تجویز منظور کی گئی کہ ایک اتحادی کمیشن بیٹھے جو مختلف فیہ علاقوں کے متعلق ایک رپورٹ پیش کرے۔ دونوں حکومتوں کو اس کے فیصلہ پر سر تسلیم خم کرنا پڑیگا۔ ترکی نمایندے تیار تھے لیکن یونانیوں نے اس کو قبول سے انکار کر دیا۔ ۱۲۔ مارچ کو ایک یہ اسکیم پیش کی گئی کہ صلحنامہ سیورے پر کچھ ترمیمات منظور کر لی جائیں یعنی یونان اناطولیہ کے تمام مغربی علاقہ کا تخلیہ کر دے اور سمرنا پر لیگ آف نیشنز کے زیر اثر ایک عیسائی گورنر مقرر کیا جائے۔

دونوں حکومتوں کے نمایندوں نے اس تجویز کے متعلق اپنی اپنی گورنمنٹوں سے مشورہ کی مہلت طلب کی۔ بس اس کے بعد کانفرنس ختم ہو گئی اور کوئی بھی کسی خاص فیصلہ تک نہ پہونچ سکا۔ باقر سمیع بے (وزیر خارجیہ جو اس وقت ٹرکی کی نمایندگی کر رہے تھے) نے فرانس اور اٹلی سے اسی عرصہ میں متعدد تجارتی عہدنامے کر لیے لیکن چونکہ مجلس عالیہ انگورہ نے ان کو منظور کرنے سے انکار کر دیا اس لیے باقر سمیع بے کو مستعفی ہونا پڑا۔ اس استعفے کی اصلی وجہ دوسری تھی۔ باقر سمیع بے نے مسٹر لائڈ جارج کے ساتھ ایک دفعہ دوران گفتگو میں کہا تھا کہ ترکوں کو بالشویکوں سے کوئی محبت نہیں اور اگر اتحادیوں کی طرف سے عمدہ سلوک کی اُمید ہو سکے تو ترک روس کی دوستی کو بالائے طاق رکھنے کو طیار ہیں۔ چند روز بعد ہی یہ پوری گفتگو روس کے سرکاری اخبار نے نقل کی۔ ساتھ ہی گورنمنٹ روس نے مصطفےٰ کمال سے سخت شکایت کی۔ چنانچہ اسی بنا پر باقر سمیع بے کو اپنی گفتگو کے غیر ذمہ دارانہ الفاظ کی وجہ سے استعفیٰ دینا پڑا۔

یونانیوں نے اپنا دوسرا حملہ اس وقت تک شروع کر دیا تھا۔ پہلے پہل کچھ فتوحات حاصل ہوئیں۔ لیکن تھوڑے دن کے بعد وہ اپنے پرانے محاذ جنگی پر واپس آ گئے۔ ۱۰۔ مئی ۱۹۲۱ء کو دول متحدہ نے اپنی غیر جانبداری کا اعلان کیا۔ اپنی قوت پر بھروسہ کرتے ہوئے یونان نے اپنا تیسرا حملہ شروع کر دیا اور اس مرتبہ عزم بالجزم کر لیا کہ ترکوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیں گے۔ بعض مقامات پر انہوں نے فتح حاصل کی لیکن ترکوں کی فوج کا زیادہ تر حصہ صحیح سلامت واپس چلا گیا۔ اس کے بعد تقریباً

ایکسال تک طرفین کی کوئی قابل ذکر فوجی کاروائی نہیں کی گئی۔

اس عرصہ میں سیاسی شاطرانہ چالیں دونوں طرف جاری رہیں۔ فرانس نے دوبارہ مسٹر فرنکلن کو انگورہ روانہ کیا تاکہ انگورہ گورنمنٹ سے گفت وشنید کریں۔ چنانچہ ایک معاہدہ پر طرفین کی طرف سے ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو دستخط ثبت کیے گئے۔ اور دوسرے روز مجلس ملیہ انگورہ نے اس کی منظوری دیدی۔ اس معاہدہ کی رو سے فرانس کو شام اور سلیشیا کے اضلاع خالی کرنے پڑے۔ اب گویا اتحادیوں میں سے ایک بڑی قوت نے انگورہ گورنمنٹ کو باضابطہ تسلیم کرلیا۔ اب ترکان احرار کو اپنی تمامتر توجہ یونان کی طرف منعطف کرنے کا موقعہ مل گیا۔ اس عہدنامہ کی وجہ سے فرانس اور برطانیہ میں بھی کچھ کشیدگی کے آثار پیدا ہوگئے۔ اب یونان کی ہمت افزائی کے لیے صرف برطانیہ باقی رہ گئی تھی۔

۴ر فروری ۱۹۲۲ء کو لارڈ کرزن نے ایک نہایت اہم تقریر کی جس میں انگلستان کو غیرجانبدار ہونے پر بہت زور دیا اور ساتھ ہی یونان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے انعام کا ذکر جو عنقریب حاصل ہوجائیگا، نہایت شاندار الفاظ میں ذکر کیا۔ ۱۵۔ فروری ۱۹۲۲ء کو مسٹر گونیریز نے لارڈ کرزن کی توجہ اپنے ملک کی ناگفتہ بہ حالت اور فوجوں کی بے سروسامانی کی طرف مبذول کرائی۔ اور یہ بھی ظاہر کردیا کہ اس حالت میں ترکوں کے خلاف عرصہ تک مقابلہ کی تاب لانا بالکل محال ہے۔ لارڈ موصوف نے لندن میں بیٹھے بیٹھے صبرواستقلال کی تلقین کی اور اطمینان دلایا کہ سلسلہ جنبانی جاری رکھو۔ لارڈ کرزن نے اس خط کی نقل تمام وزارت برطانیہ کے ممبروں کے پاس بھیجدی تھی لیکن ایسے اہم معاملہ پر بغیر غور وفکر کا موقعہ دیئے ہوئے اپنی ذمہ داری پر جواب دیدیا۔ ۲۲ مارچ ۱۹۲۲ء کو پیرس میں پھر اتحادیوں کی طرف سے متحاربین کو شرائط صلح پیش کی گئیں ان شرائط کی رو سے قسطنطنیہ پر ترکوں کا قبضہ تسلیم کیا گیا اور تھریس کے حدود دشتلجی سے بحر مارمورہ تک متعین کیے گئے نیز ترکوں کو اپنی فوجی تعداد بڑھانے کی اجازت دیدی گئی۔ ٹرکی ان شرائط پر صلح کے لیے طیار تھا، بشرطیکہ اناطولیہ کا علاقہ یونانی فوراً خالی کردیں۔

غرضکہ حسب سابق اس مرتبہ بھی اس کانفرنس سے کوئی خاص مقصد حاصل نہ ہو سکا۔
اس کے بعد یونانیوں نے پھر ارادہ کیا کہ آخری جنگ کریں اور اس مرتبہ قسطنطنیہ پر قبضہ کرکے شرائط بجبر منوائیں۔ مسٹر لائڈ جارج نے ۴ اگست کو دارالعوام میں تقریر کی اس میں یونان کی سخت طرفداری کا اظہار کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصطفےٰ کمال کو پورا یقین ہو گیا کہ برطانیہ سنجیدگی کے ساتھ اناطولیہ کو خالی نہ کرائیگا اور اعلان کر دیا کہ اب ترک بغیر کسی کی مدد کے اپنی قوت بازو سے اپنے جائز حقوق کو حاصل کرینگے۔ ترکان احرار کا حملہ عصمت پاشا کی زیر سرکردگی یونانی لشکروں پر شروع ہو گیا۔ یونانی سپاہ پیشتر ہی سے بددل ہو رہی تھی ایسے بے تحاشا بھاگنا شروع کیا کہ شاید اس کی نظیر تاریخ میں ملے۔ راستہ میں جتنے شہر اور گاؤں پڑے سب کو یہ لوگ خاک سیاہ کرتے گئے۔ قصہ مختصر یہ کہ ۹ تاریخ کو ترکی سپاہ بغیر کسی مزاحمت کے سمرنا میں داخل ہوئی۔ پچاس ہزار یونانی قیدی گرفتار کیے گئے اور بہت سا سامان حرب بھی ان کے ہاتھ لگا۔
جب یونانی سپاہ اپنے ملک واپس پہونچی تو اس نے اپنی گورنمنٹ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور قسطنطین کو تخت سے برطرف کرکے اس کے بیٹے کو بادشاہ بنایا اور دوسرے وزرا منتخب کیے۔ پانچ سابق وزیروں پر مقدمہ چلایا گیا اور آخر میں ان پانچوں کے گولی مار دی گئی۔
۳ ستمبر ۱۹۲۲ء کو یونان نے اتحادیوں سے درخواست کی کہ وہ ان کے معاملہ میں مداخلت کریں چنانچہ لتولے جنگ کی گفت و شنید ختم ہونے کے بعد خود دول متحدہ نے اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ صلحنامہ سیورے میں ترمیم کی جائے۔ انگورہ گورنمنٹ نے اپنی انھیں پرانی شرائط کا اس مرتبہ بھی اعادہ کیا جو اس نے تین سال قبل اپنے میثاق ملی میں طے کی تھیں یعنی تمام ترکی صوبوں کو غیر ترکی اثر سے بالکل پاک کر دیا جائے۔ اس میثاق ملی کے ماتحت اناطولیہ تھریس اور قسطنطنیہ کا پورا علاقہ دول عظمیٰ کو خالی کرنا پڑتا تھا۔ فرانس اور اٹلی تو نیم راضی تھے لیکن صلح کی راہ میں کوئی رکاوٹ تھی تو وہ برٹش گورنمنٹ تھی۔
جب ترکان احرار کا لشکر مظفر سمرنا کی فتح سے فارغ ہو کر آبناؤں کی طرف متوجہ ہوا تو

برٹش گورنمنٹ نے فوراً اعلان کر دیا کہ وہ ترکوں کے خلاف دفاعی جنگ کریگی چنانچہ وزیر اعظم برطانیہ (مسٹر لائڈ جارج) نے نو آبادیات کو اپنی مدد کے لیے آمادہ کر لیا۔ بہت دنوں تک یہ خدشہ رہا کہ نہ معلوم کس چھوٹی سی بات پر آتش جنگ مشتعل ہو جائے۔

جب جنگ کا احتمال اس قدر بڑھ گیا تو فرانس اور اٹلی نے فوراً اپنے فوجی دستوں کو واپس آنے کی ہدایات روانہ کر دیں۔ اس وقت اتحادیوں کا نام نہاد اتفاق اپنی اصلی شکل میں دنیا کے روبرو ظاہر ہو گیا۔

دول متحدہ کے نمایندوں نے آپس کی گفت و شنید کے بعد ترکوں کو پیرس میں صلح کی گفتگو کے لیے دعوت دی۔ اناطولیہ اور تھریس (دریاے مرتضیٰ تک) کو ترکی کے زیر تصرف رکھے جانے اور تخلیہ قسطنطنیہ کے متعلق ترکوں کو پیشتر ہی سے مطلع کر دیا۔ آبناؤں کے متعلق جو اس کانفرنس میں فیصلہ کیا جاے اس کو عملی صورت میں لانا لیگ اقوام کے ذمہ کیا گیا۔

مدنیہ کانفرنس منعقد ہوئی اور ۱۹ اکتوبر کو بہت کوشش و کاوش کے بعد اس کی کارروائی ختم کی گئی۔ اور صلح کانفرنس کی تاریخ ۱۳ نومبر (بعد میں تاریخ ۲۰ نومبر کر دی گئی) مقام لوزان میں مقرر کی گئی۔ مدنیہ کانفرنس کی شرائط کی رو سے اتحادیوں نے تھریس کے علاقہ کو اپنے انتظام میں غیر ترکی عنصر سے خالی کرانا شروع کر دیا۔ اب ترکوں نے اس کے بعد برطانیہ کو قسطنطنیہ خالی کرنے پر مجبور کرنا شروع کیا آہستہ آہستہ جیسا سب لوگ جانتے ہیں ترکوں نے تمام انتظام اپنے قبضہ میں کر لیا۔ جب قسطنطنیہ پر اچھی طرح اپنا قبضہ ہو گیا تو اس کے بعد سلطان کو معزول کر دیا اور وہ مالٹا فرار ہو گئے۔ اس کے بعد ترکوں نے مراعات سے (جو غیر ترکی اقوام کو حاصل ہیں) نجات حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ آجکل دوسرا اہم مسئلہ عدالتوں کا ہے۔ اتحادی اپنی عدالتیں علحدہ ہی جاری رکھنا چاہتے ہیں۔

میرے نزدیک اس کا تصفیہ اس صورت سے ہو سکتا ہے کہ اتنے عرصہ تک کے لیے جب تک ترکی عدالتی نظام باقاعدہ نہ ہو جائے لیگ اقوام کے ماتحت ایک عدالت مقرر کر دی جائے

جو اس وقت تک کام انجام دے سکے۔

مجھکو (راقم مضمون کو) پورا یقین ہے کہ اقتصادی ضروریات کی وجہ سے ترکوں کو اس میں نفع رہیگا کہ وہ ہمارے ساتھ صلح کرلیں کیونکہ ان کو اپنے مددگار بالشویک روس سے کسی قسم کی امید نہ رکھنی چاہیئے کیونکہ وہ تو خود دیوالیہ ہو رہا ہے۔

میرے خیال میں ترکوں کے ساتھ جب کسی قسم کا معاملہ کیا جائے تو تین باتوں کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہیے۔ اتحادی خود موجودہ حالت کے ذمہ دار ہیں کیونکہ انھوں نے ترکوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے اور یونانیوں سے حکمرانی کرانے کی کوشش کی تھی۔ دوسرے یہ کہ ترکوں میں اب ارتقائے قومیت پایۂ تکمیل کو پہونچ چکا ہے۔ تیسرے یہ کہ ترکوں کو اب "پرانے ترک" یا "نوجوان ترک" نہ خیال کرنا چاہیئے بلکہ اب وہ "جدید ترک" ہیں۔

اگر ہمارے مدبرین ان باتوں کو خیال میں رکھیں تو مصالحت کی صورت نکل سکتی ہے۔ ہم کو یہ بھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ ترکوں کا بمقابلہ مغربی دول کے روس سے تصادم کا بہت زیادہ گمان ہے کیونکہ قسطنطنیہ اور تھریس پر ہمیشہ روس کا دانت رہیگا۔ آبناؤں کے متعلق بھی لوزان کانفرنس میں عصمت پاشا کا رویہ نہایت صلح پسندانہ رہا ہے اور امید ہے کہ اگر اتحادیوں کی طرف سے بھی کوشش کی گئی تو مفاہمت کی کوئی شکل ضرور نکل آئیگی۔ ترک اپنے اس رعب و دبدبہ کو قائم رکھنا چاہتے ہیں جو انھوں نے حال ہی میں حاصل کرلیا ہے اگر دول مغربی ان تمام امور پر لحاظ رکھینگی تو مجھکو امید ہے کہ "جدید ترکوں" سے مصالحت ہو جائیگی۔

(ماخوذ)

یوسف حسین خاں
متعلم جامعہ ملیہ اسلامیہ

مطبوعاتِ جدیدہ

ہیئت جدید

پروفیسر منہاج الدین بی اے، ایم ایس سی اور پروفیسر برکت علی ایم اے، بی ایس سی اساتذہ طبعیات و ریاضیات پشاور کالج کی یہ تازہ تالیف جس کا پہلا حصہ مبادی ہیئت، تجاذب مادی، ہیئت عملی، مناظر ہیئت، کل چار مقالوں سے بحث کرتا ہے، موضوع سے اپنی ناآشنائی کے باوجود میں نے دلچسپی سے پڑھی اور یہی اس کتاب کا سب سے زیادہ قابل ستایش پہلو ہے۔ نصاب تعلیم کی حیثیت سے اس کے فائدہ مند ہونے میں تو کوئی کلام ہی نہیں۔ مگر پیمایش وقت کے مختلف ذرائع اور گھڑیوں کی تشریح مختلف سنین و تواریخ کے حالات ایک سے دوسرے کا استخراج، مد و جزر، موسم کی تبدیلیاں، دوربین، اختلاف مناظر، مناظر فضائی، کسوف و خسوف ایسے مباحث ہیں اور اس عجیب طریقہ سے بیان کیے گئے ہیں کہ ہر پڑھا لکھا آدمی خواہ ہیئت سے قطعاً نابلد کیوں نہ ہو مستفید اور محظوظ ہو سکتا ہے قوم کی عام معلومات علمیہ کی سطح کی بلندی کے لیے ایسی کتابوں کی شدید ضرورت ہے۔ اگرچہ دنیاے اردو بدمذاقی کا لحاظ کرکے اس قسم کی تالیفات مؤلف کے لیے سخت ایثار کی محتاج ہیں۔

وضع اصطلاحات کا اشکال جو دوسری مالدار زبانوں کے مصنفین کے مقابلے میں اردو کے اہل قلم کے لیے ایک حوصلہ شکن گھاٹی ہے، جابجا سلاست بیان میں حارج ہو جاتا ہے۔ بعض مقامات پر عربی کی اصطلاحات موضوعہ بھی اسی طرح تشریح و توضیح کی محتاج نظر آتی ہیں جس طرح اصل یونانی، لاطینی یا انگریزی مصطلحات۔ مگر جب تک ایک ہی موضوع پر متعدد کتابیں نہ لکھی جائیں اور اصطلاحات علمیہ کثرت استعمال سے حلقۂ تعلیم میں دائر و سائر نہ ہو جائیں یہ دقتیں ناگزیر ہیں۔ بایں ہمہ موانع بیان واضح اور سلیس، نقوش بہت صاف اور صحیح ہیں اور ہم مؤلفین کو ان کی اس کامیاب علمی خدمت پر داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ فرہنگ مصطلحات انگریزی و اردو آخر میں ضم ہے۔ کاغذ عمدہ تقطیع ۲۲×۲۹ چھپائی صاف حجم ۲۴۰ صفحے قیمت قسم اول سے ر قسم دوم عا۔ مولفین ممدوحین سے مل سکتی ہے۔

بصائر

خواجہ محمد عبدالحی صاحب فاروقی اُستاد تفسیر جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڈھ نے جن کی تفسیر القرآن فی معارف القرآن سورہ بقرہ ملک میں مقبول ہو چکی ہے۔ یہ رسالہ بھی تالیف کیا ہے۔ فرعون کے قصّہ کو قرآن مجید کی متفرق آیات سے جمع کرکے اس پر اپنے مخصوص سیاسی طرز میں تبصرہ کیا ہے۔ کتاب نہایت سبق آموز اور دنیا کی موجودہ حالت سے مشابہت و موازنہ کے باعث نہایت بصیرت بخش اور دلچسپ ہے۔ تورات اور قرآن کے بیان قصص کا فرق لطیف، قرآن کے انتخاب و ایجاز کا راز، متحدہ قومیت جس کے توڑنے کی فرعون نے کوشش کی، فرعون کا اصل خوف کیا تھا، نتائج جبر و استبداد وغیرہ نہایت حکیمانہ مباحث ہیں۔ اور بیان واضح و دلنشیں کتابت و طباعت پاکیزہ تقطیع ۲۰×۳۰/۸ موزوں حجم ۱۴۴ صفحے قیمت ۶/ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڈھ

رشحاتِ اوج

حافظ محمد یعقوب صاحب اَوج گیاوی اپنے کلام کے ذریعے سے جو اکثر اُردو رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے ملک میں کافی طور پر روشناس ہو چکے ہیں۔ ان کی بائیس نیچرل، اخلاقی، اور مذہبی نظموں کا یہ مختصر مجموعہ جو چھوٹی تقطیع کے ۸۰ صفحوں پر چھاپا گیا ہے بغرض تنقید وصول ہوا ہے۔ یہ نظمیں زیادہ تر قطعات شبلی، کلام حالی، نعت امیر مینائی اور مولوی ظفر علی خاں کی نظم طغیانیٔ نوح و موسیٰ کے تتبع میں لکھی گئی ہیں اور اس کوشش میں حضرت اَوج بہت کچھ کامیاب کہے جا سکتے ہیں یہ مجموعہ نوجوانانِ ملک کے لیے سبق آموز اور مفید ہے اور عام دنیاے تغزل کے مقابلہ میں قابل قدر

مگر ان نظموں سے زیادہ دلچسپی تو مجھے خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی "پیر و میر" کی تقریظ سے ہوئی جس کا آغاز یوں ہوتا ہے "غایت شاعری یہ ہے کہ محاورات و اصطلاحات زبان کی حفاظت کی جائے" اور آخری فقرے یہ ہیں "نظم میں محض اعلیٰ خیالات سے کام نہیں لیا ہے بلکہ

شاعری بھی کی گئی ہے.......... جناب آوج میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ ضبطِ محاورات میں خاص احتیاط سے کام لیتے ہیں اور دائرۂ تقلید زبان سے باہر قدم نہیں رکھتے ہیں جیسا کہ عموماً آجل کے شعرا کے یہاں دیکھنے میں آتا ہے۔ اس لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کی زبان اپنے اصلی مرکز (لکھنؤ) کے تحت میں ترقی کر رہی ہے" (؟!)

بنگلور کی طباعت کے لحاظ سے رسالہ غنیمت چھاپا گیا ہے قیمت فی جلد ۵ر

ملنے کا پتہ:۔ کے حاجی محمد محی الدین تاجر کتب نمبر ۳۹۹ موچی بازار معسکر بنگلور

"ناقد"

رفتارِ تعلیم

"ہندوستانی فن لطیف کی خصوصیات" پر ڈاکٹر مس اسٹیلا کرامرش (مقیم حال شانتی نکیتن) نے میسور یونیورسٹی میں دو لکچر دیے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف نے اپنے پہلے لکچر میں یہ بتایا کہ ہندوستانی فن لطیف آج ہمارے سامنے کس حالت میں ہے؟ ان کے خیال کے بموجب یہ محض خیالات کی تصویر ہے، بجائے اس کے کہ نفسِ حقیقت کا مرقع ہو۔ دوسرے لکچر میں اُنھوں نے جاوا۔ سیام۔ چین۔ جاپان اور وسط ایشیا کے فن لطیف پر بحث کی۔ اُنھوں نے بیان کیا کہ کس طرح سے ان ممالک میں اس فن نے جدید شکل اختیار کرلی ہے تاہم ہندوستانی خصوصیات اُن میں بہت کچھ پائی جاتی ہیں۔

یاد ہوگا کہ گزشتہ ماہ اکتوبر میں موصوف نے ہمارے جامعہ ملیہ میں بھی "اسلامی فن لطیف" پر ایک مبسوط اور دلچسپ لکچر دیا تھا۔

یہ دیکھکر کہ آسٹریا کی باشندہ اور وی اِنا یونیورسٹی کی تعلیمیافتہ لیڈی ہندوستانی اور اسلامی فنون لطیفہ کے مطالعہ اور ترویج میں اس قدر سرگرم ہے، یہ سوال اُٹھتا ہے کہ ہمارے علوم و فنون اغیار کے رہین منت کب تک رہیں گے؟ لیکن کم و بیش جو دلچسپی فنون لطیفہ سے اب پیدا ہو رہی ہے اس سے یہ امید ہوتی ہے کہ شاید عہد جہانگیری و اکبری پھر لوٹ آئے۔ لیکن اور قوموں کی بہ نسبت ہندوستانیوں کی رفتار ابھی سست ہے۔

سویٹ گورنمنٹ کی طرف سے طفلس میں ایک یونیورسٹی کھلی ہے تاکہ ترکی، ایران، خیوا، بخارا، افغانستان، ہندوستان اور دوسرے مشرقی ممالک کے طلبا وہاں جاکر تعلیم حاصل کریں۔ تقریباً ایک سو طلبا جو بالخصوص ترکی اور ایران کے ہیں، اس تعلیمگاہ میں داخل ہوچکے ہیں۔

اکسفرڈ، کیمبرج اور دیگر مغربی یونیورسٹیوں کے تعلیمی نتائج تو دیکھ لیے، اب ذرا دیکھیں کہ

انقلاب جدید کی یہ درسگاہیں کیا اثر رکھتی ہیں؟

ایک طرف ہماری قدامت پرستی کا یہ عالم ہے کہ جس پاٹھ شالے یا مکتب میں جائیے' آج سے دو ہزار اور پانسو برس پیچھے کا سماں نظر آتا ہے' دوسری جانب مغرب کی جدت پسندی کا یہ نتیجہ ہے کہ نت نئے تعلیمی تجربے عمل میں لائے جا رہے ہیں۔ استادوں کے ذریعہ حصولِ علم تو سُنا ہوگا لیکن بن اُستاد کی تعلیم بھی دیکھی ہے؟

انگلستان میں ایک مدرسہ مالبروڈیمانسٹریشن اسکول کے نام سے قائم ہے۔ اس کے شیرخوار بچوں کے شعبہ میں کوئی ۴½ برس سے ایک بہت ہی اہم علمی تجربہ عمل میں لایا جا رہا ہے۔ اس میں کوئی چار سو غریب بچے دس جماعتوں میں منقسم ہیں۔ عمارت کی کل زیب آرائش ایک میز جس پر ایک پیانو رکھا ہوتا ہے اور ایک کرسی ہے۔ بچوں کو کوئی اُستاد باقاعدہ پڑھانے نہیں آتا بلکہ وہ اپنی تربیت آپ اپنے سے حاصل کرتے ہیں۔ البتہ ہر جماعت میں ایک نگراں ہوتا ہے' سامان تعلیم میں چند سادہ آلات رکھے ہوتے ہیں جنھیں بچے خود بخود استعمال کرتے ہیں' ان کی تندہی اور توجہ گزاری کا اندازہ چھوٹی ہی جماعتوں سے ہونا شروع ہو جاتا ہے' یہاں تک کہ بڑی جماعتوں میں آکر ۷-۸ برس کے بچے اس نظم و تربیت اور سکون و توجہ کے ساتھ اپنے اپنے کاموں میں لگے رہتے ہیں گویا معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کی نمائش کی گئی ہے۔ اور اونچی جماعتوں میں آپ ان سے باتیں کیے جائیے لیکن ان کے کام میں کسی طرح کا فرق نہیں آتا۔ اور ایک نمونہ ملاحظہ کیجئے۔

ایک بچہ ۴ سال کی عمر میں داخل ہوا' کوئی دو ہفتہ تک وہ اِدھر اُدھر پھر کر اپنے ساتھیوں کی تمام حرکات کو بغور دیکھتا رہا۔ پھر رفتہ رفتہ ان تصاویر اور آلات سے جو دیواروں پر لگے ہوئے تھے' کام لینے لگا۔ کوئی پوچھ گچھ کرنے والا نہ تھا اور تین ہفتہ تک اس نے یونہی اپنا وقت گنوایا لیکن حقیقت میں کیا یہ وقت کا گنوانا تھا؟ اب یہی بچہ ایک دوسرے اسکول میں داخل ہوتا ہے اور نہایت ہوشیاری

"دستعد بچے اپنے لکھنے پڑھنے کا کام کرتا ہے۔

اسی طرح ایک دوسرا بچہ اور داخل ہوتا ہے جو ابتدا میں نہایت شریر اور گستاخ تھا۔ کوئی کام ٹھیک نہ کرتا۔ اس کی اصلاح اس طرح پر ہوئی کہ جب کبھی وہ کوئی شرارت کرتا تو معلمہ جس کا کام پڑھانا نہیں بلکہ نگرانی ہوتا ہے، اس کو چھوٹی جماعتوں کے سامنے بیجا کر اس سے مخاطب ہوکر یہ کہتی کہ "اگر ان بچوں کو کوئی عذر نہ ہو تو تم ان کے ساتھ رہ سکتے ہو"۔ اس پر وہ بچے اظہار افسوس کرتے اور صرف یہ کہتے کہ "ہمیں ایسے لڑکے کی ضرورت نہیں"۔ یہی حال ہر جماعت میں ہوتا۔ اب وہ غریب بچہ خود اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھتا اور سوچتا کہ اتنے لڑکوں کی ناخوشی وہ کب تک گوارا کر سکتا ہے؟ نتیجہ یہ ہوا کہ وہی شریر بچہ تھوڑے دنوں میں سیدھا سادہ نیکبخت بن گیا۔

شانتی نکیتن میں ہندوستانی علوم قدیمہ کی تعلیم و اشاعت کے لیے جو کوشش کی جارہی ہے علمی طبقہ میں اس سلسلہ میں یہ خبر بھی دلچسپی سے سُنی جائیگی کہ ڈاکٹر ٹیگور نے سنسکرت کے قلمی نسخوں کے لیے ایک اپیل شائع کیا ہے۔ ان علوم کے قلمی نسخے جو سنسکرت اور ہندوستان کی دوسری قدیم زبانوں میں ہیں، بے اعتنائی کی وجہ سے ضائع ہو رہے ہیں یہ دیکھکر وشوا بھارتی (شانتی نکیتن کالج) نے انکی تہذیب ترتیب اور طباعت و اشاعت اپنے ذمہ لی ہے مسٹر آر۔ ایس شاستری نے جو بڑودہ لائبریری میں رہ چکے ہیں، اس کی فراہمی کے لیے اپنی خدمات پیش کی ہیں۔

جرمنی میں موجودہ سیاسی اور معاشی مشکلات کی وجہ سے وہاں کی تعلیمی فضا جس حد تک غیر متاثر رہی، وہ اور ممالک کے حالات دیکھتے ہوئے جرمنی کے ذوق علم و فن پر دال ہے۔ ابھی حال میں یہ معلوم ہوا ہے کہ وہاں کی معاشی حالت خراب ہو جانے کی وجہ سے بارہ ہزار طلبا میں سے آٹھ ہزار طلبہ خارجی اوقات میں کام کرکے اپنی تعلیم کے مصارف ادا کرتے ہیں۔ ان میں سے ۴ ہزار کی تعداد ایسے طلبہ کی ہے جو روزانہ ۸ گھنٹہ کام کرتی ہے اور اس سے جو وقت بچتا ہے وہ

مطالعہ کتب میں گزرتا ہی یہ طریقہ نہ صرف مجبوراً اختیار کیا گیا ہی بلکہ علمی حلقوں میں پسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا ہی۔ خیال ہی کہ اس طریقہ سے طلبا اپنے حاصل شدہ علم کا صحیح استعمال بھی جان لیں گے اور آپ اپنے کفیل بھی ہوں گے۔

مسٹر ایس۔ اے پانڈے نے "تعلیم اور اس کے اغراض و مقاصد" پر مسلسل کئی مضامین لکھے ہیں۔ ایک نمبر میں موصوف نے تعلیم کی غرض بتائی ہی کہ "زندگی کو خوشگوار بنانا خواہ وہ انفرادی ہو یا قومی"۔ پھر اسی اصول کی تشریح موصوف نے اس طرح پر کی ہی "کوئی شخص روزی کمانے کے لیے کوئی پیشہ اختیار کرنا چاہتا ہی تو اُس کو چاہیے کہ وہ کسی صنعتی اسکول میں جائے لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری جو امر ہی وہ یہ کہ اس کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اپنی زندگی خوشگوار اور مفید طریقہ پر کیونکر بسر کر سکتا ہی۔ ہم صدہا نوجوانوں کو دیکھتے ہیں جو اپنی زندگی میں بے انتہا بے اصول اور بے کار نظر آتے ہیں۔ دیکھا ہوگا کہ کیسی جلدی وہ مغربی فیشن اور تقلید کے عادی بن جاتے ہیں اور اپنے ماضی کو کس طرح بھلا دیتے ہیں۔ ان سے اُتر کر عوام کو دیکھو جو سوسائٹی کے سنگ بنیاد ہیں۔ کس طرح سے وہ بدکاری، شراب نوشی اور دیگر مسکرات کے خوگر ہو جاتے ہیں۔ اکثر ان میں سے پیشہ کی تعلیم پائے ہوئے ہوتے ہیں لیکن زندگی ان کے لیئے دوبھر ہو جاتی ہی۔ یہ کیوں؟ صرف اس لیے کہ تعلیم نہیں ہوتی۔

"آج کل علمی تعلیم پر صنعتی تعلیم کو ترجیح دی جاتی ہی تاکہ تعلیم یافتہ اپنی روزی پیدا کر سکیں لیکن یہ دونوں چیزیں جدا جدا ہیں۔ موخر الذکر سے تعلیم کا مقصد یعنی "زندگی کو خوشگوار بنانا" کبھی نہیں حاصل ہو سکتا۔ علمی تعلیم کے بدلے صنعتی تعلیم پر زور دینا میرے خیال میں ایک قدم پیچھے ہٹنا ہے۔

۱۱۔ مارچ کو سر آشوتوش چودھری نے قومی مجلس تعلیم بنگال کے ایک کالج کا سنگ بنیاد

سکتے ہوئے بیان کیا کہ مجلس مذکور بسلسلہ تقسیم بنگال ۱۹۰۶ء میں قائم ہوئی ۔ پھر آپ نے عطیات
کی تفصیل اور مجلس کی تدریجی ترقی بیان کی اور اُمید ظاہر کی کہ آئندہ سال سے [illegible]
ضروری سامان فراہم ہو جائیں گے ۔ آپ نے یہ بھی بتایا کہ ۱۹۲۱ء میں ہزار طلبہ ، ۱۹۲۲ء میں
دو ہزار طلبہ نے داخلہ کی درخواست دی لیکن اس مرتبہ ۶۵۰ سے زیادہ طلبہ نہیں لیے جا سکتے ۔
مجلس نے کچھ اساتذہ اور طلبہ کو بغرض تعلیم باہر بھیجے جانے کا بھی فیصلہ کیا ہے ۔

'' معلم ''

مخمس بر غزل غالب

گھٹتا ہی نفس ضعف سے ور ہونے تک — دب کے رہ جاتا ہی سرگرم سفر ہونے تک
اور جو یہ آگ بھڑکتی بھی شرر ہونے تک — آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہی تری زلف کے سر ہونے تک

گلشن عشق میں سیکھو رہ و رسم تسلیم — گنج امید کی زینت ہے یہاں سایۂ بیم
ہے پریشانی نکہت اثر لطف شمیم — پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

دل مضطر نہ ٹھہرنے میں ہے رشک سیماب — اُن کا انداز تغافل ہی قیامت کا جواب
جی میں ہے حضرت ناصح سے یہ پوچھوں کہ جناب — عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک

دل تڑپتا ہے کہ سرگرم فغاں ہو تم بن — غیرت عشق یہ کہتی ہے۔ یہ ہے ناممکن!
اس کشاکش میں یہ بیمار جیئے گا کے دن — ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

جس کو سمجھا تھا جہاں چشمۂ حیواں وہی دل — شوق کے بل پہ ہے اُس برق فنا کا حامل
جس کی اک لہر میں ہو زیست کا دعویٰ باطل — یک نفس بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمی بزم ہی اک رقص شرر ہونے تک

دل کو ہے تربیت جوہر باطن کی اُمنگ — سر میں ہی ساغر مستانہ عشرت کی ترنگ
روز رہتی ہی فسوں سازیٔ اوقات سے جنگ — دام ہر موج میں ہی حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہی قطرے پہ گہر ہونے تک

آپ کیا پوچھتے ہیں اپنے مریضوں کا مزاج — اُن کو رکھنا ہی سیہ نامۂ تقدیر کی لاج

دردمند تپ الفت کو شفا کل ہو نہ آج　　غم ہستی کا اثر کس سے ہو جز مرگ علاج

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

عابد - برلن مارچ ۲۳ء

کلام شاد عظیم آبادی

نشاں کا ذکر تو کیا ہے زمیں کے بھی نہ رہے　　ہم اپنی چال سے آخر کہیں کے بھی نہ رہے

شکایتیں تری آئیں زباں پر آخر کار　　گئی جو ہاتھ سے دنیا تو دیں کے بھی نہ رہے

سنا ہے بعد فنا کے ہے زندگانی پھر　　اگر یہی ہے تو پھر ہم کہیں کے بھی نہ رہے

[illegible]صل کیا اور ہوئے عدم کو رواں　　ہم انتظار میں تیری نہیں کے بھی نہ رہے

بتاؤ کون سنبھالے گا شاد ہستی میں

اگر حواس بجا ہمنشیں کے بھی نہ رہے

وہ سبق سیکھ کہ دل جس پہ نظر دوختہ ہے　　گل و بلبل کی کہانی تو اب آموختہ ہے

اس پہ بھی تیر اثر پا نہیں جاتا اے صید　　ٹانکے پلکوں میں ہیں پا بستہ و پر دوختہ ہے

شاد عظیم آبادی

شذرات

ہر ولہلم شوانر جن کی تصویر آج شائع کی جاتی ہے ایک شصت سالہ بزرگ ہیں جو ایک بہت بڑی تعلیمی اور معاشرتی تحریک کے رہنما اور ایک ہر دلعزیز رسالہ کے مدیر ہیں۔ "معلم ملت" نام ہے اُس جماعت کا جس کے ممدوح صدر ہیں اور اُس رسالہ کا بھی جو اُس جماعت کا آرگن ہے۔ اس جماعت کا مقصد یہ ہے کہ عوام الناس خصوصاً کاشتکاروں کے لیے عام تعلیم اور اخلاقی تربیت کا سامان مہیا کرے اور انھیں سلطنت کے زیر اہتمام تعلیم سے جو اکثر سیاسی مصالح پر مبنی ہوتی ہے بے نیاز کردے۔ اس جماعت کے ارکین کی تعداد پانچ ہزار ہے جو جرمنی کے ہر حصے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ زیادہ تر ان میں مدرسین ہیں لیکن تجار، صناع، اہل قلم اور سیاست داں طبقہ کے لوگ بھی اس میں شامل ہیں۔

یہ بزرگ نہایت باخلاص، بے بناوٹ سادہ مزاج اور صوفی منش ہیں۔ تصوف کے سلسلہ میں انھیں ہندوستان سے دلچسپی ہوئی اور ہندو اور مسلمان صوفیوں کے حالات اور خیالات کا تجسس کرنے لگے۔ بھگوت گیتا اور کیمیائے سعادت موصوف کی مرغوب کتابوں میں سے ہیں اور امام غزالی کو یہ مغرب کے بڑے سے بڑے صوفیوں سے بہتر سمجھتے ہیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ممدوح کو بیحد ہمدردی ہے اور ہمارے رسالہ کے لیے اکثر مضامین عنایت فرمانے کا وعدہ کرتے ہیں۔

ذیل میں ممدوح کے مختصر حالات زندگی خود اُن کے قلم کے لکھے ہوئے نقل کیے جاتے ہیں۔

ولہلم شوانر ۱۰ نومبر ۱۸۶۳ء کو پیدا ہوا جو مشہور مجدد عیسویت مارٹن لوتھر اور روائنا کے باکمال شاعر فریڈرش شلر کا یوم ولادت ہے۔ اس نے اپنے وطن کورباخ میں تعلیم پائی اور ۱۸۸۲ء سے ۱۸۸۵ء تک ریاست ہیس کے مقام ہومبرگ میں ایک سیمنار میں رہبانیت کی زندگی بسر کرتا رہا۔ ۱۸۸۵ء سے ۱۸۹۲ء تک والڈک میں مدرس کے خدمات انجام دیتا رہا۔ اس عرصہ میں اپنی

آزاد خیالی کے سبب اُس سے اور متعصب مذہبی لوگوں سے جو کلیسائی عیسویت کی اندھی تقلید
کرتے تھے بگاڑ ہوگیا۔ اُس نے ملازمت سے استعفا دیدیا اور کچھ دن کیل میں اور بعد ازاں برلن
میں یک وزانہ اخبار کا مدیر رہا ۱۸۹۶ء میں مدرسوں کی آزادی کے لیئے احتجاج کرنے کے سلسلے
میں اُسے مہینوں قید کی مصیبت جھیلنا پڑی۔ اس سے پہلے وہ ایک سال تک ایک مذہبی رسالہ
کی ادارت کرچکا تھا اور قید سے رہائی پانے کے بعد اُس نے ایک معاشرتی تعلیمی اور مذہبی اخبار
"ہم ملت" کے نام سے نکالا۔ اس اخبار کی اشاعت کو اب ستائیسواں سال ہے اور جرمن قوم
کے ہر طبقہ میں اس کے ہمدرد، بہی خواہ اور رفیق موجود ہیں۔ ولہیلم شوارز نے جرمن نسل کے بہترین
شعرا۔ فلسفیوں۔ صوفیوں اور ہر قسم کے مصنفین کی مقدس تصنیفات کا انتخاب
"جرمن انجیل" کے نام سے تالیف کرکے تین جلدوں میں شائع کیا۔ علاوہ اس کے
اُس کی تصنیفات میں "خدا کی جستجو مختلف قوموں میں"، "روشنی کی تلاش"، "زندگی کی جہاں گردی"
وغیرہ وغیرہ اور دو چھوٹے رسالے جس میں سوتے جاگتے کے خواب بیان کیئے گئے ہیں۔ اور
"نورانی راتیں" اور "نورانی دن" ہیں۔

جرمنی کے مدرسین کا بہت بڑا حصہ اُس کے گرد جمع رہتا ہے اور اُس کے کام میں اُس کا
دست و بازو ہے۔

اُس کی زندگی اور اُس کی زندگی کی کارگزاری خالص مذہب کے لیئے وقف ہے اور
ہندوستان کے مصلح مہاتما گاندھی کے طرز عمل سے مشابہ ہے۔

ڈاکٹر اقبال کو آج تک صرف ایک شاعر ہی نہیں بلکہ حیات ملی کے نازک پر خطر دور کا نبض شناس
اور آنیوالے حوادث و آلام سے متنبہ کرنے والا پیغامبر سمجھا گیا ہے۔ خیالات کی بلندی نے جذبات
کی پاکیزگی کو اعجاز بنا کر پیش کیا اور دل کی درد و تڑپ نے دنیا کو وہ چیز بخشی جو بالآخر کلام اقبال
کے نام سے مشہور ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کی تازہ ترین تصنیف "پیغام مشرق" اگر پیغامی حیثیت میں

ہیں تو اپنے شاعرانہ انداز میں اُن کی دوسری فارسی تصنیفات سے زیادہ بلند اور زیادہ وسیع ہے۔ اُنھوں نے اس مجموعہ میں ملت اسلامی کے کسی ایک پہلو سے بحث نہیں کی ہے بلکہ مختلف متفرق اشعار، قطعات، رباعیات، نظموں اور غزلوں میں مشرق کی روح کو مغربی دماغ کے لیے پیش کیا ہے تاکہ مغرب کے بعض افراد جو اپنی بلند پروازی اور وسعت خیال کے لیے دنیائے مغرب کو تنگ پاکر فضائے مشرق کی طرف رخ کرتے ہیں اس مجموعہ میں اس کی ہمہ گیر و عدیم النظیر وسعت کا کچھ اندازہ کرسکیں اور اپنی استعداد کے مطابق اُس سے بہرہ اندوز ہوسکیں۔

پیام مشرق درحقیقت المانوی شاعر گوئٹے کے مغربی دیوان کا جواب ہے جو آج سے قبل اقلیم سخن کے اس تاجدار نے اپنی زبان (جرمن) میں شائع کیا تھا۔ گوئٹے مشرقیت کا دلدادہ تھا، خواجہ حافظ کے علاوہ سعدی و فردوسی سے بھی اُس نے خوشہ چینی کی تھی اور فارسی شاعری سے اُس کی شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ اپنے مجموعہ کلام کو "مغربی دیوان" کے نام سے موسوم کیا اور بعض غزلیں بھی اپنی زبان میں تصنیف کیں۔

اقبال نے اپنی جدید تصنیف کے متعلق خود ان الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے۔

"پیام مشرق کے متعلق جو 'مغربی دیوان' کے سو سال بعد لکھا گیا ہے مجھے کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ ناظرین خود اندازہ کرلیں گے کہ اس کا مدعا زیادہ تر ان اخلاقی، مذہبی، اور ملی حقائق کو پیش نظر لانا ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔"

جامعہ ملیہ کے کتب خانہ کے متعلق ایک مضمون ماہ فروری کی اشاعت میں نکلا ہے جس سے اس کتب خانہ کی موجودہ حالت و علم دوست و ہمدرد اصحاب کی گرانقدر اعانت کا کسی قدر اندازہ ہوجاتا ہے۔ مقام مسرت ہے کہ اس ماہ میں ہمارے کتب خانہ کو تقریباً پانسو جلدیں اور وصول ہوئی ہیں جس کو ایک بزرگ کی ذاتی لائبریری کہنا چاہیئے۔

مولوی محمد عسکری صاحب مرحوم جن کا حال میں انتقال ہوا ہے۔ ہاپڑ ضلع میرٹھ کے رہنے والے ایک عرصہ سے فیض آباد اور دوسرے مقامات میں بہ سلسلۂ ملازمت مقیم تھے۔ مرحوم جدید یونیورسٹیوں کے ڈگری یافتہ نہ تھے شاید اسی لیے علمی ذوق سے بہرہ وافر رکھتے تھے اور کتب بینی کے عاشق تھے۔ دفتر کی ملازمت میں ان کاموں کے لیے وقت نکالنا اور اپنی محدود آمدنی سے ایک مختصر و مفید کتب خانہ قائم کر لینا ان بزرگوں کی بلند ہمتی و خوش قسمتی نہیں تو اور کیا ہے؟ چنانچہ مولوی محمد عسکری صاحب نے بھی اُردو کے تقریباً تمام بلند پایہ مصنفین کی کتابوں اور بہترین ادبی رسالوں کا (جیسے مخزن، اسوہ حسنہ وغیرہ قابل ذکر ہیں) ایک مختصر کتب خانہ فراہم کر لیا تھا، جو ان کی وفات حسرت آیات کے بعد ان کی اہلیہ صاحبہ کی عنایت سے جامعہ ملیہ کو حاصل ہو گیا۔

کتنے ہی نادر و قابل قدر ذاتی کتب خانے آج اپنے مالکوں کی ناقدردانی و غفلت کی بدولت فنا ہو رہے ہیں اور یہ حالت اس قدر عام ہے کہ اُس کو دیکھتے ہوئے اس نیکدل خاتون کی یہ فیاضی و اولوالعزمی باعث صد تحسین و آفریں ہے۔

مسٹر داؤد داپسن دنیائے صحافت میں جو قابل رشک شہرت رکھتے ہیں۔ وہ محتاج بیان نہیں۔ ملگرآن، کرانیکل، انڈپنڈنٹ، اور نیشن کے صفحات اُن کی بلند پایہ نطیف و ظریف تحریروں سے پڑ ہیں۔ علاوہ اخباری و سیاسی قابلیت کے وہ علمی و ادبی حلقوں میں بھی کافی معروف ہیں اور اپنی طرز کے نہایت پرلطف شاعر ہیں ان خصوصیات کے علاوہ اُن کے جذبات اسلامی و ہمدردی ملکی بجائے خود اک دلکشی رکھتے ہیں نہایت مسرت ہے کہ فی الحال اُنھوں نے جامعہ ملیہ کی خدمت کو قبول فرما لیا ہے۔ اساتذہ جامعہ میں ان کا اضافہ بلاشبہ قابل قدر ہے جہاں وہ علاوہ دیگر فرائض کے نصاب تعلیم کی طیاری میں بھی امداد کر رہے ہیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڈھ

کے

شعبہ تصنیف و تالیف کی شایع کردہ کتابیں

(۱) ازہار العرب۔ مؤلفہ مولانا سورتی — قیمت غیر مجلد ۸ر

(۲) تاریخ الامت۔ مصنفہ مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری — قیمت ۶ عہ ۸ر

(۳) ایضاً (حصہ دوم) ۶ " (حصہ سوم) — " ۶ عہ ۸ر

(۴) مبادی معاشیات۔ از پروفیسر ذاکر حسین خاں صاحب — " ۶ عمہ

(۵) اخبار الدولتین۔ از مولانا نیاز فتحپوری — (زیر طبع)

(۶) انتخاب کلام میر۔ مرتبہ مولوی نور الرحمن بی اے — (")

(۷) خطبہ شیخ الہند۔ (بہ تقریب افتتاح جامعہ) — قیمت ۲ر

(۸) خطبہ مسیح الملک۔ حکیم اجمل خاں صاحب — " ۲ر

(۹) انتخاب مضامین جوہر۔ معہ تصویر — " عمہ

(۱۰) ترکوں کی کہانیاں — " ۴ر

المشتہر

مہتمم مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

دیوان غالب ۔ مطبع کاویانی برلن جو علوم فارسی جدیدہ و علوم شرقی کی خدمت کے لیے مشہور ہو چکا ہے ہمارے لیے دیوان غالب (ایڈیشن بلا ترمیم) بکمال صحت و خوبی کے ساتھ طبع کر رہا ہے جو اس ماہ کے آخر تک وصول ہو جائے گا اور سوائے مکتبہ جامعہ ملیہ کے کسی دوسری جگہ نہیں مل سکے گا نہایت خوشنما جلد اور نفیس کاغذ و طباعت

مطبع شرکت کاویانی برلن

کے سول ایجنٹ ہونے کی حیثیت سے مندرجہ ذیل کتابیں مکتبہ ہذا میں موجود رہتی ہیں۔

۱۔ سفر نامہ ناصر خسرو مع سعادت نامہ و روشنائی نامہ	۶ روپیہ ۸ آنہ
۲۔ تاریخ سنی ملوک الارض مصنفہ حمزہ اصفہانی	۲ روپیہ ۸ آنہ
۳۔ تیاتر (ڈراما) مصنفہ نظام الدولہ مرزا ملکم خاں	۲ روپیہ ۸ آنہ
۴۔ موش و گربہ (نظم) مصنفہ عبید زاکانی	۵ آنہ ۶ پائی

علاوہ ان کتابوں کے اردو زبان کی تمام مستند و مقبول تصانیف اور جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کے نصاب کی درسی کتابیں مکتبہ ہذا میں مل سکتی ہیں۔

المشتھر

مہتمم مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

اللہ اکبر

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

کا

ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ نور الرحمن

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

قیمت سالانہ للعہ

فہرست مضامین

جامعہ

جلد ۱ | ذیقعدہ ۱۳۴۱ھ مطابق جون ۱۹۲۳ء | نمبر ۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

جلد ۱ ماہ ذیقعدہ المعظم ۱۳۴۱ھ مطابق جون سنہ ۱۹۲۳ء نمبر ۵

جوہر

اور انکی شاعری

کارساز عالم کی کارسازیوں میں شاید سب سے عجیب حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی اہم ترین حوادث ونتائج کے وجود کا ذمہ دار ایسے ذرائع واسباب کو بنایا جاتا ہے جو بظاہر ان کے قطعی منافی اور عقل بشری کے اعتبار سے بالکل بعید از قیاس ہوتے ہیں۔

بجلی کا خزانہ پانی کے دھارے میں مخفی نکلتا ہے۔ آتش سوزاں کے شرارے ہری ہری شاخوں کی رگڑ سے پیدا ہوتے ہیں۔ خلیلؑ بت شکن کی صدائے توحید بت پرستی کے مرکز سے بلند ہوتی ہے۔ فرعون کی خدائی کا تختہ اُلٹنے والا مفتوح و بے بس رعایا کا ایک حقیر فرد ثابت ہوتا ہے۔ آزادی کی شعاعیں استبداد کی گہری تاریکیوں سے پھوٹ کر نکلتی ہیں۔ عقل دنگ ہے جو تمدن جدید کا صنم اعظم کے بتکدہ مسمار کرنے کے لیے وہ جوان ہمت (گاندھی) تیشہ جہاد ہاتھ میں لیکر اٹھتا ہے جس نے انگریزیت کی فضا میں آنکھیں کھولیں اور مغربیت کی آغوش میں تربیت پائی۔

مادیات، روحانیات، جسمانیات، اخلاقیات، حیوانیات، بشریات، کائنات کے ہر ہر شعبہ میں قانون کی یہ کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ہمیں اس قائل کے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے کہ "ہماری گمان [illegible] ان کیلئے ہی متین، زبردست اور بہاری ترکیبیں استادانہ ہوتی ہیں" اور ہمیں یہ درس حقیقت ملتا ہے کہ ہمارے تعقل سے ماوراء اور ہمارے ادراک سے مافوق کوئی ایسی ہستی ہے جس کی چالیں بڑی ہی شاندار

ہیں، جسکی اُستادی و خوش تدبیری کے سامنے ہمارے بڑے سے بڑے عقلا دنگ، بڑے سے بڑے مدبرین حیران، اور بڑے سے بڑے استادان کار کو قدم قدم پر اپنی شکست کا اعتراف، اور اپنی ومکروا ومکر اللہ واللہ خیر الماکرین۔ درماندگی اور بےبسی کا اقبال کرتے ہی بنتا ہے۔

یہ اسی لطیف "خبیر" صانع کی صنعت گری تھی جس نے بیسویں صدی عیسوی کی روشن خیال، علم پرور، وشائستگی نواز دنیا کو ایک بار پھر صحابہ کرامؓ کے صدق عمل، خلوص قلب، و پختگی ایمان کا زندہ نمونہ دکھا دیا۔ اور اس غرض کے لیے انتخاب ایسے شخص کا کیا جس کی ولادت انگریزیت کی زمین پر ہوئی، جسکی رضاعت دایہ عقلیت نے کی، اور جسکی ایک عمر اس طرح گزری، کہ ہر ہر سانس فرنگیت کی فضا میں لیتا تھا۔ ورنہ چند سال پیشتر کس انسانی دماغ کو یہ اندازہ ہو سکتا تھا، کون سی عقل بشری یہ پیش بینی کر سکتی تھی کہ علیگڑھ کالج کی روشن خیالی فرنگی محل کی مولویت کے ہاتھ پر بالآخر بیعت کرے گی۔ انگریزی زبان کا سحر نگار انشا پرداز اپنے بہترین اوقات کو حفظ قرآن کے لیے وقف کر دیگا۔ مارگولیس کا شاگرد شہنشاہ کونینؐ کے عشق میں بلالؓ و اُویسؓ کی یاد تازہ کرا دیگا، مل و مارلی، گلیڈسٹن و بریڈلا کے مدرسہ تحقیق کے فاضل کو قصباتی قوالوں کی "غیر مہذب" صدائیں رقص و وجد میں لائینگی۔ اکسفرڈ کا آنرز میں گریجویٹ سلسلۂ عالیہ قادریہ کی غلامی پر فخر کرے گا نفیس اور بیش بہا سوٹ پہننے والا جیلی نہ کی اپنی پرانی میلی کچیلی گلی شوق سے اوڑھیگا۔ مخمل کے کوچ اور پر تکلف مسہری پر بیٹھنے والا کھدری زمین کے مرطوب فرش پر جلنے کے جاڑے ہنسی خوشی کاٹ دیگا۔ اور صوبہ کے گورنروں پارلیمنٹ کے ممبروں، اور امرا ہند و انگلستان کا وہ عزیز دوست، جسکا ایک دن بھی بغیر سرکاری ضیافتوں اور پارٹیوں کے بمشکل گزرتا تھا وہ ایک دو وقت نہیں، مدتوں وہ غذا کھائیگا اور کھا کر رزاق مطلق کا شکر ادا کریگا، جس کی جانب انسان تو الگ رہے، ان حکام ذوالاحترام و "امرا نامدار" کے کتے بھی شاید رخ نہ کرتے!

انسانی عقل و فہم کو یہ قلب ماہیت، یہ تغیر حال، بیشک عجیب معلوم ہوتا ہے، لیکن کیا اُس ذات کے لیے یہ کچھ بھی عجیب ہے، جو ہر لحظہ و ہر ساعت، موت کو زندگی، پستی کو بلندی، جمود کو حرکت

ضعف کو قوت، مرض کو صحت، ضلالت کو ہدایت، تشنگی کو آسودگی، خندۂ غفلت کو گریۂ عبرت، آہ کو واہ، ساز کو سوز، اضطراب کو تسکین، میں تبدیل کرتی رہتی ہے؟

جوہر کی شاعری اُن کے قلب کی زبان، اُن کے جذبات کی ترجمان، ان کے واردات کا بیان ہے۔ آورد، تصنع، و تکلف کا ان کے ہاں گزر نہیں۔ ان کے قلب پر جو کچھ گزرتی رہتی ہے، وہ بلا تکلف زبان قلم پر آجاتی ہے۔ اپنی سیر باطنی میں وہ جن جن مقامات و منازل سے گزرتے رہتے ہیں۔ الفاظ موزوں میں انھیں کا عکس ان کی زبان کھینچ دیتی ہے۔ تاثیر اس طرزِ سخن کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور یہ وصف انکے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اہل ذوق کو انکا ایک ایک شعر تاثیر میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ حکیم شیراز نے صدیوں پیشتر کہا تھا کہ "آنچہ از دل خیزد بر دل ریزد" یہ قول جوہر کے کلام پر حرف بحرف صادق آتا ہے ان کی ہر آواز دل سے اُٹھتی ہے، اور اسی لیے دل ہی پر جا کر بیٹھتی ہے۔

انکی شاعری گل و بلبل، زلف و کاکل، خط و عارض سے یکسر تہی مایہ ہے۔ ان کا کلام ایک حقیقی مسلم کا کلام ہے۔ ان کے جذبات تمامتر وہ ہیں جو ایک مومن صادق کے ہونا چاہیے۔ بے شبہ انکی شاعری بھی چاشنیٔ عشق سے بیگانہ نہیں، بلکہ سچ یہ ہے، کہ عشق کی ٹیک اُنکے ایک ایک مصرعہ میں موجود ہے۔ البتہ انکا معشوق نہ ایران کا "سبز خط" ہے، نہ ہندوستان کا "بت سیمیں بدن"۔ نہ اُس کی کمر معدوم ہے نہ اس کا دہن غائب۔ نہ اس کے ہاتھ میں خنجر رہتا ہے، اور نہ وہ برلی کے سرمہ مستی کا قدردان ہے۔ اُن کا معشوق ان تمام مزخرفات سے ارفع و منزہ ہے۔ انکا معشوق مُردہ نہیں، زندہ ہے۔ فانی نہیں باقی ہے۔ سفاک، ستمگر نہیں، رحمٰن و رحیم۔ انکا محبوب وہ ہے جو ہر مسلم، بلکہ ہر سلیم الفطرت انسان کا ہوتا ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ (بقرہ - ع ۲۰)

(اہل ایمان تو معشوق حقیقی پر دل و جان سے فریفتہ رہتے ہیں)

ان عاشقوں کا ایک پیشوا سات سو سال اُدھر یہ تعلیم دے گیا ہے۔ ؎

جملہ معشوق است و عاشق پردۂ — زندہ معشوق است و عاشق مردۂ
عشقہائے کز پے رنگے بود — عشق نبود عاقبت ننگے بود
زانکہ عشق مردگان پایندہ نیست — چونکہ مردہ سوئے ما آیندہ نیست
عشق زندہ در روان و در بصر — ہر دمے باشد ز غنچہ تازہ تر
عشق آں زندہ گزیں کو باقی است — کز شراب جانفزایت ساقی است
عشق آں بگزیں کہ جملہ انبیا — یافتند از عشق او کار و کیا
عشق بر مردہ نباشد پایدار — عشق را بر حی و بر قیوم دار

اس عشق کا دوسرا نام ایمان کامل ہے، اور جوہر کا کلام انہیں جذبات ایمانی کا مرقع ہے۔ کہیں وہ اپنے محبوب کے حسن و جمال کا بیان کرتے ہیں، لیکن لذت عشق کی کیفیت کو الفاظ سے ادا کرنا چاہتے ہیں، اور کہیں راہ عشق کی دشواریوں اور سختیوں کا تذکرہ مزے لے لیکر کرنے لگتے ہیں۔

آخر یہی نظربندی (۱۹۱۵ء تا ۱۹۱۹ء) انکے حق میں اکسیر ثابت ہوئی۔ اوہام کا زنگ دور ہو گیا، حجابات اٹھنے لگے، اور نظارۂ جمال کسی قدر ہونے لگا۔ ذیل کے صاف و سادہ اشعار میں ذرا دیکھنا کس مزے سے اپنی آپ بیتی سناتے ہیں ؎

تشنہ لب ہوں مدتوں سے دیکھیے — کب در میخانۂ کوثر کھلے
رات تہمت تک تو چھوڑی تب کہیں — راز ہائے بادہ و ساغر کھلے
رونمائی کے لیے لایا ہوں جاں — اب تو شاید چہرۂ انور کھلے
یہ نظربندی تو نکلی رد سحر — دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے
اب کہیں ٹوٹا ہے باطل کا طلسم — حق کے عقدے اب کہیں بہتر کھلے
اب ہوا ہے ماسوا کا پردہ فاش — معرفت کے اب کہیں دفتر کھلے
فیض سے تیرے ہی اے قید فرنگ — بال و پر نکلے قفس کے در کھلے
جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر — مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

(آخری شعر میں زندگی مزا و غفلت کی زندگی ہے۔ یعنی جب جوہر کی یہ غفلت و مادیت کی زندگی ختم ہوچکی یہ سقف جا کر جوہر اصلی کھلنا شروع ہوئے)

عشق کا کمال یہ ہے کہ اپنی شخصیت کو معشوق کی شخصیت میں بالکل فنا کر دیا جائے طالب اپنی ذاتی خواہش و ارادہ کو مٹا کر اپنے تئیں بالکل مطلوب کے ہاتھ میں دے دے۔ جو کچھ دیکھے اس کی آنکھوں سے دیکھے۔ جو کچھ سنے اس کے کانوں سے سنے۔ جو کچھ کہے اس کی زبان سے کہے۔ اس کی راہ کی مصیبت کو عین راحت سمجھے یعنی آسائش، عزت، ناموس، بلکہ زندگی تک کو اس کی خوشی پر قربان کر دے ہمت، استقامت کا سررشتہ ہاتھ سے نہ دے۔ اس کی توفیق اور [illegible] خصوصیت پیدا [illegible]

شعر ان تمام مراتب کی تشریح کرتے ہیں۔

تسلیم و رضا کا شیوہ ایسا ہے، جو ہر تلخ کو شیریں، ہر مصیبت کو راحت، ہر آگ کو پانی بنا دیتا ہے ۵

ہر رنگ میں راضی برضا ہو تو مزا دیکھ ، دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ

تمام گذشتہ عاشقوں کی سرگزشت اسی تجربہ کی تائید میں ہے۔ ان کی شان سے تو گرفتار کو ہمت کا سبق لینا چاہیئے ۵

ہے سنت ارباب وفا صبر و توکل ، پاؤں چھوٹ نہ کہیں ہاتھ سے دامان رضا دیکھ

۵ سب سے بڑے عاشق کی مثال [illegible] عالم اسلام کی نظیر سب سے زیادہ سبق آموز و ہمت افزا ہے

دشت رہ غربت میں اکیلا تو نہیں تو ، بطحا کے مہاجر کا تو نقش کف پا دیکھ

اگر ادھر سے توفیق شامل حال ہو جائے، تو ایک مشت پر میں خدائی کی قوت پیدا ہو سکتی ہے۔

انسان کا اپنی کمزوری کا عذر پیش کرنا ضعف ایمان، خامی عشق کی دلیل ہے۔ ۵

تو طیر ابابیل سے ہرگز نہیں کمزور ، بیچارگی پر اپنی نہ جا شان خدا دیکھ

اس طرز زندگی میں جو لطف ہے، اسے کچھ وہی خوب جانتے ہیں جن پر گزر رہی ہے ۵

اس طرح کے جینے میں ہی مرنے کا مزا دیکھ ، قسمت میں یہی ہے کہ ابھی راہ قضا دیکھ

مظلوم و باوفا حسین ابن علیؑ کے رنگ مقبولیت کو دیکھنا، اور پھر ذرا اس کا مقابلہ ظالم و خود پرست

یزید کی ملعونیت سے بھی کرنا! خلیل بت شکن و اسمٰعیل ذبیح سے لیکر منصور و سرمد تک ہزار ہا عشاق سر بکف نظر آ رہے ہیں، اور عشق کی دلکشی ہے، کہ روز بروز بڑھتی جاتی ہے ؎

اللہ کے باغوں کا بھی ہے رنگ نرالا ٭ اس سادگی پہ شوخی خون شہدا دیکھ

اس دربار میں نذر مقبول صرف خلوص نیت و صدق عمل کی ہوتی ہے۔ ملمع کے سکوں کا اس دیار میں چلن نہیں ؎

جو حسن طلب لاکھ، مگر کچھ نہیں ملتا ٭ ہو صدق طلب پھر اثر آہ رسا دیکھ

دشمنان ایمان و منکرین عشق کو کیا خبر، کہ نظر بندی نے کس طرح فاسق کو عارف، کور کو بینا۔ اور کثیف کو لطیف بنا دیا ہے۔ بت کے بندہ کو اب اپنے اللہ کے بندہ ہونے کا احساس ہو گیا ہے۔ اور اس احساس عبدیت نے اس کی جنبش لب اور عرش اعظم کے درمیان وہ سلسلۂ ربط قایم کر دیا ہے، جس کی دید سے عقلیت کی آنکھیں محروم ہیں ؎

ہوں لاکھ نظر بند دعا بند نہیں ہے ٭ اللہ کے بندوں کو نہ اس طرح ستا دیکھ

تعزیرات حکومت و ضوابط استبداد کی عمر کتنی؟ "برگردن او بماند و بر ما بگذشت"۔ البتہ عاشق کی زندگی دامانِ ابد سے بندھی ہوئی ہے۔ ؎

جو تیری دو روزہ مرا بیاں ہے ازل کا ٭ پابند جفا تو ہے تو میری بھی وفا دیکھ

جادۂ عشق کو چھوڑ کر راہ ہوس پرستی پر چلنے والوں کا تجربہ یہ ہے، کہ اس "سیر باغ" پر بہار کا سایہ ہی نہیں پڑنے پاتا، اور یاس و حرماں کے سموم آتشین کی لپٹیں دائمی طور پر اس کے نصیب میں رہتی ہیں ؎

عقبیٰ تو کہاں، واں نہیں دنیا کا بھی کچھ ٹھیک ٭ اس کا ذرے نیض سے دل تو بھی لگا دیکھ

لھم فی الدنیا خزی و لھم فی الاٰخرۃ عذاب عظیم۔ (بقر۔ ع ۱۴)

یہ ایک غزل کے چند اشعار تھے۔ اب ایک اور غزل پر نظر ہو۔

بے بصروں کے لیے موت سے بڑھکر کوئی درد انگیز و اندوہ ناک واقعہ تصور میں بھی نہیں

نہ سکتا۔ اس سے بچنے کے لیے ہر ممکن تدبیر، ہر امکانی احتیاط عمل میں لائی جاتی ہے۔ لیکن لذت آشنایانِ عشق جانتے ہیں کہ راہِ حق میں شہادت، حیاتِ جاودانی کے مرادف ہے۔ اور اگر شوقِ بقا ہے، تو پہلے اپنے تئیں اس راہ میں فنا کر کے دیکھنا پڑے گا۔ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ (آل عمران ع ۱۷)، جو ہر کو اس وعدۂ الٰہی پر اعتماد کامل ہے۔ اور وہ اس استحکام کے ساتھ جو ایمان کامل ہی سے پیدا ہو سکتا ہے، فرماتے ہیں۔

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے
بر غیب سے سامان بقا میرے لیے ہے
سبز رو و سرخ پوش شہیدِ دشتِ کربلا کا خونچکاں کفن ان کے دامنِ دل کو کھینچ رہا ہے
پیغام ملا تھا جو حسینؑ ابنِ علی کو
خوش ہوں وہی پیغامِ قضا میرے لیے ہے

شہداء راہِ حق کے رتبہ کا کیا پوچھنا منطق بشری بیان سے عاجز ہے۔ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ أَعْظَمُ دَرَجَةً عِندَ اللَّهِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُم بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَنَّاتٍ لَّهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ (توبہ۔ ۳) رضائے الٰہی کا درجہ تو الگ رہا ادنیٰ رتبہ یہ سمجھنا چاہیے کہ میدانِ جنگ میں قدم رکھتے ہی حورانِ جنت کا پیامِ آرزو پہنچنے لگتا ہے۔

یہ حورِ بہشتی کی طرف سے ہے بُلاوا
لبیک کہ مقتل کا صلا میرے لیے ہے

کامریڈ کے ایڈیٹر کے لیے دنیوی ترقی کے بہتر سے بہتر مواقع موجود تھے۔ ہندوستان کا ذکر نہیں، انگلستانی صحافت میں بلند سے بلند کرسیِ ادارت اسکے لیے خالی تھی، مناسب سرکاری میں بڑی سے بڑی رفعت اس کے لیے چشم براہ تھی۔ عزت، ثروت، اقتدار، وجاہت، کے اصنامِ کبیرہ نے قدم قدم پر اسے لبھایا، لیکن اس گشتۂ عشقِ حق نے ماسوا کی جانب نظر اٹھانا ہی گناہ سمجھا، اور سارے رشتے توڑ صرف ایک کا ہو رہا۔

آنکس کہ ترا شناخت جاں را چہ کند
فرزند و عیال و خان و ماں را چہ کند

دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی ؛ دیوانۂ تو ہر دو جہاں را چہ کند

جوہر کی شخصی زندگی سے واقفیت رکھنے والے خدائے حاضر و ناظر کو درمیان ڈال کر اس امر کی شہادت دے سکتے ہیں کہ ذیل کے اشعار سخن گوئی، لفظ تراشی، دقانیہ پیمائی کے نتائج نہیں بلکہ "آپ بیتی" کے چند ابواب ہیں اس زندگی کے جواب حسبنا اللہ ونعم الوکیل کے ماتحت بسر ہوئی ہے۔

میں کھو کے تری راہ میں سب دولت دنیا ؛ سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لیے ہے

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے ؛ یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف ؛ کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

حق گوئی و حق پرستی کا صلہ یوم آخرت کے لیے مخصوص نہیں، بلکہ اس دنیا کے ساتھ کچھ قیمت نقد بھی وصول ہو جاتی ہے۔ صدق مطلق کا وعدہ ہے:- لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَ لَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ (نحل-۳۰) البتہ یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھی یہ انعام و امتیاز دار و رسن و سلاسل زنداں کی شکل میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ بہر صورت جوہر کا ذاتی تجربہ تو یہ ہے ؎

انعام کا عقبیٰ کے تو کیا پوچھنا لیکن ؛ دنیا میں اس ایمان کا صلہ میرے لیے ہے

حسن مطلق نے جب مرتبۂ اطلاق سے قید و تعین میں آنا چاہا تو اپنا مظہر اتم اس ہستی بشری کو بنایا، جسے ہم خاتم رسالت صلعم و سرور کونین کے القاب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ ذات اقدس، ذات باری ہی کی طرح، اپنی فیض رسانی و منبع خلایق ہونے میں ہمہ گیری و جامعیت

---

[1] اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ (حم سجدہ-۴)

[2] الذین یبلغون رسلت اللہ ویخشونہ ولا یخشون احدا الا اللہ وکفی باللہ حسیبا (احزاب-۵)

[3] فمن یومن بربہ فلا یخاف بخسا ولا رھقا (جن-۱۴)، وینجی اللہ الذین اتقوا بمفازتہم لا یمسہم السوء ولا ھم یحزنون (زمر-ع ۶)

کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور کائنات کا ذرہ ذرہ اسی آفتاب سے اخذ نور کرنے پر مجبور ہے۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ (آل عمران - ۹)

خواجہ کونین و سلطان ہمہ — آفتاب جان و ایمان ہمہ

خواجگی ہر دو عالم تا ابد — کرد وقف احمد مرسل احد

اس کی اطاعت عین اطاعت خدا، اس کی محبت عین محبت حق، اس کا عشق عین عشق الٰہی ہے، بلکہ سچ یہ ہے، کہ عشق الٰہی کی دستاویز مستند ہی نہیں قرار پا سکتی، جبتک اس پر عشق رسول کی مہر ثبت نہو۔

درمقامِ لِیْ مَعَ اللّٰہ از کمالِ اتصال

از خدا نبود جدا ہچوں شعاع از آفتاب

جوہر کا دماغی نشو و نما اس فضا میں ہوا جہاں اس سردار دو عالم صلعم کی حیثیت زیادہ سے زیادہ ایک نیک نیت مصلح قوم کی تھی، جس طرز کے مصلح ہر ملک اور ہر قوم میں پیدا ہوتے رہتے ہیں بلکہ اکثر "روشن خیال" محققین کے نزدیک تو (نعوذ باللہ) اس سے بھی پست تر۔ جوہر کی فطرت سلیم و ذوق ایمانی کا کمال یہ ہے، کہ اس فضا میں سالہا سال تک سانس لیتے رہنے کے باوجود اس زہر کے اثر سے بالکل محفوظ رہے اور طوفان "عقلیت" کے شدید جھونکوں کے درمیان بھی انکے گوشۂ قلب میں محبت رسول کا نور اپنی نورانیت و ضو میں برابر ترقی کرتا رہا، تاآنکہ ایک عالم اسکی ضیا گستری سے منور ہو کر رہا۔

سنہ ۱۹۱۶ء میں راقم سطور کا انگریزی رسالہ سائی کولوجی آف لیڈر شپ" شائع ہوا۔ چھندواڑہ کے اسیر فرنگ نے اس پر اپنے عنایت ناموں میں نہایت تفصیلی تبصرہ کیا۔ راقم پر اس وقت تک "عقلیت" کی لعنت پوری طرح مسلط تھی۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت پر حیرت ہوتی تھی، کہ کامریڈ کے اڈیٹر کی ایک ایک سطر عشق رسول کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے، اسیری اور آزادی، گویائی و خاموشی، زمزمہ سنجی و زبان بندی کے انقلابات اس جوہر کی تربیت کرتے رہے۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں اس کی آب و تاب اس درجہ کو پہنچی

کہ بعض وہ قلوب بھی جو الحاد و عقلیت کے مرکز ظلمات تھے، پرتوِ نور سے جگمگا اُٹھے۔

نعت گو شعراء اُردو میں بھی کثرت سے ہو چکے ہیں اور بعض کو شہرت عام سند امتیاز بھی مل چکی ہے، مثلاً محسن کاکوروی، آسی غازی پوری لیکن ان حضرات نے عموماً مناقب کے صرف خارجی پہلوؤں پر توجہ کی ہے، اور ان کو بھی کثرت تکرار نے بڑی حد تک بے لطف بنا دیا ہے۔ رُخ انور کی تابانی، گیسوئے اقدس کی سیاہی، ابروئے مبارک کی کجی، وغیرہ گنتی کے چند بندھے ہوئے مضامین ہیں کہ انہیں کو اُلٹ پھیر کر یہ حضرات ہمیشہ باندھتے رہتے ہیں۔ جوہر کی شاعری چونکہ رسمی و تقلیدی نہیں، اس لیے اس نے اس باب میں بھی اپنے لیے ایک نئی راہ کا انتخاب کیا، یعنی بجائے خارجیت کے داخلیت کو اپنا موضوع بنایا اور بجائے آثار و شمایل کی نقاشی کے جذبات و واردات کی ترجمانی کی۔

یوسفؑ کا حسن، لیلیٰ کی محبوبی مسلم پھر بھی انکے قصائد مدح میں قلب انسانی کو وہ لذت کیونکر حاصل ہوسکتی ہے، جو زلیخا کی بیقراری اور مجنوں کی آہ وزاری کی داستان میں ہے۔ محمد علی کا اعلیٰ موضوع حسن کی رعنائی، جمال کی زیبائی نہیں، بلکہ وہ دل کی چوٹ، عشق کی تڑپ، جذبات کے سوز کو سامنے لاکر رکھ دیتا ہے۔ اور یہی اسکے کلام کی تاثیر کا راز ہے۔ آقا لاکھ کریم و فیاض ہو، اس کے بیان میں وہ درد و اثر کیسے پیدا ہوسکتا ہے، جو غلام کی جانب سے محتاجی و درماندگی کے عرض حال میں ہوگا۔

اس مجموعہ میں خالص نعتیہ اشعار تعداد میں چند ہی نظر آئینگے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر ہر بجائے خود ایک دفتر ہے۔ دفتر علم بے معنیٰ نہیں، دفتر عشق با معنیٰ۔

" وفا میرے لیے ہے" "قضا میرے لیے ہے" کی زمین میں مضامین توحید سے لبریز غزل میں کہتے ہیں کہ یاد آتا ہے، کہ کعبۂ خلیل کا طواف، بغیر آقائے مدینہ صلعم کی آستاں بوسی کے، مذہب عشق میں معتبر نہیں فوراً قلم کی زبان درود خوانی میں مشغول ہو جاتی ہے؂

اے شافع محشر جو کرے تو نہ شفاعت	پھر کون وہاں تیرے سوا میرے لیے ہے
کیوں ڈھیلے تیری پر نہ فدا ہوں کہ جو فرمائے	اچھے تو سبھی کے ہیں بُرا میرے لیے ہے

؂ حدیث میں مروی ہے .... حشر میں نیکو کاروں کا ساتھ خدا دیگا، بدکاروں کا ساتھ میں دونگا۔

حضرت آسی غازی پوریؒ کا ایک پُر کیف مطلع ہے ؎

صبا تو جا کے یہ کہیو مرے سلام کے بعد
تمہارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

جو ہر بھی اس سفینے میں کچھ الا پتے ہیں ؎

تمہارے فضل کے بھروسے یقین رکھتے ہیں
کہ عید آئے گی بیشک مہ صیام کے بعد

زمیں سے چھوٹ گئے جبریل بھی قیامت تک
کہ وحی بند ہوئی سید الانام کے بعد

"کلام جدید" میں اشعار ذیل عاشق رسولؐ ہی کی زبان سے نکل سکتے ہیں ؎

الٰہی شکر ترا پھر مہ صیام آیا
مہ صیام نہیں عید کا پیام آیا

گھڑی وہ کیسی مبارک تھی کن جانئے نبیؐ
حرا میں عرش سے اقرأ کا جب پیام آیا

جب اپنی پوری جوانی پہ آگئی دنیا
تو زندگی کے لیے آخری نظام آیا

میں اس پہ بھیجوں درود و سلام کس منہ سے
کہ جس کے نام خود اللہ کا سلام آیا

نبیؐ سے ملتے ہی اسلام کی سپر تھا وہی
جو ان کے کفر کی شمشیر بے نیام آیا

سارے مجموعہ کی جان وہ غزل ہے، جو پیچاپور جیل میں اسی سال موزوں ہوئی ہے۔ ان اشعار کو پڑھنا اور ذرا فیصلہ کرنا، کہ شاعر الفاظ کو مرتب کر رہا ہے، یا عاشق پارہ ہائے جگر کو خون عشق میں نگار رہا ہے؟ یہ جذبات بیسویں صدی عیسوی کے ایک "نیچری" کے ہوسکتے ہیں یا خیر القرون کے بزرگ اخیار کے؟ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء ؎

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں

ہر آن تسلی ہے ہر لحظہ تشفی ہے
ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہیں مداراتیں

کوثر کے تقاضے ہیں تسنیم کے ہیں وعدے
ہر روز یہی چرچے ہر رات یہی باتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں
بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

قابل رشک ہے وہ صفائے قلب جس پر ان تجلیات کا ظہور ہو، مستحق تبریک ہے وہ سینہ

اس بار امانت کا متحمل ہو، اور لائق صد تکریم و احترام ہی، وہ پختگی ایمان، وہ عشق خدا اور وہ عشق رسول، جو خاک کے پاک ذرہ کو آفتاب، اور فاسق کو ولی بنا دے۔

جوہر کے جوہر مندی پر ایک سرسری نظر ہو چکی، لیکن شاعری کا محض قلب ہی سی تعلق نہیں بات سے بھی ہی۔ اور محمد علی تو یقیناً صاحب دل ہونے کے ساتھ صاحب زبان بھی ہیں۔ انکا مخصوص پیام دعوت ایمان ہے۔ لیکن اس پیام کو جس شیرینی و شستگی کے ساتھ وہ ادا کرتے ہیں، وہ بجائے خود ایک چیز ہے۔ "عام عاشقانہ مضامین کو جس قدرت فن کے ساتھ وہ ادا کر جاتے ہیں، اس پر ادبیت ناز کرتی ہی، اور خوش بیانی اس سے مزہ لیتی ہی۔

شوخی بیان، لطف زبان، حسن ادا، رنگین خیالی، اور عاشقانہ مضمون آفرینی کا اگر نمونہ دیکھنا ہے، تو اشعار ذیل پر ایک نظر کرتے چلیں ؎

خوگر جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی	اسقدر ظلم پہ موقوف ہے کیا، اور سہی
کشور کفر میں کعبہ کو بھی شامل کرلو	سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی
ہم وفا کیشوں کا ایمان ہی پروانہ صفت	شمع محفل جو وہ کافر نہ رہا اور سہی

جینا وہ کیا کہ دل میں نہ ہو تیری آرزو	باقی ہی موت ہی دل بے مدعا کے بعد
تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے	میرا لہو بھی خوب ہی تیری حنا کے بعد
اک شہر آرزو پہ بھی ہونا پڑا خجل	ھل من مزید کہتی ہی رحمت دعا کے بعد
لذت ہنوز، مائدۂ عشق میں نہیں	آتا ہے لطف جرم تمنا سزا کے بعد۔

ہے رشک کیوں یہ ہمکو سزاوار دیکھ کر	دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر"
اس شان امتیاز کو دیکھو کہ اہل کفر	مومن سمجھ رہے ہیں ہمیں خوار دیکھ کر

تیرِ نگہ نے کر دیا دونوں کا فیصلہ — باہم دل و جگر کی یہ تکرار دیکھ کر
ہر سینہ آرہی تھے پیکاں کا منتظر — ہوا انتخاب سے نگہ یار دیکھ کر

یادِ وطن نہ آئے ہمیں کیوں وطن سے دور — جاتی نہیں ہے بوئے چمن کیا چمن سے دور
آساں نہ تھا تقربِ شیریں تو کیا ہوا — تیشہ کو کوئی رکھ نہ سکا کوہکن سے دور
ہے بعد کربلا سے بھی قربِ یزید بھی — اور چاہتے یہ ہیں کہ ہوں پنجتن سے دور
ہیں اتنے لافِ شوق پہ مرعوبِ حسن بھی — یہ طائفہ عجیب ہے اک مرد و زن سے دور

مولانا محمد علی کی شاعری کی ابتدا کیونکر ہوئی؟ کس سے تلمذ ہے؟ درمیانی مدارجِ ارتقا کیا کیا طے ہوتے رہے؟ وہ خود اپنی شاعری کی بابت کیا رائے رکھتے ہیں؟ خوش قسمتی سے ان تمام سوالات کا جواب خود موصوف کے قلم سے اُن کے اُس عنایت نامہ میں موجود ہے، جو ۱۶ راگست ۱۹۱۶ء کو چھندواڑہ سے راقم سطور کے نام لکھا تھا، اور جس کے ساتھ اپنی متعدد غزلیں بھی عنایت کی تھیں۔ ذیل میں ان کے مکتوبِ گرامی کے اس جزو کو تمام و کمال نقل کیا جاتا ہے جو ناظرین کے لیے یقیناً خاص دلچسپی کا باعث ہوگا۔

"آپ میری شاعری کا کیا پوچھتے ہیں۔ بچپن میں تو بہت سے سامان ایسے بہم ہو گئے تھے کہ میں آج زلف وابرو کی تعریف میں خاصے شعر نکال لیا کرتا۔ رامپور میں اُس زمانہ میں پیدا ہوا تھا جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا، داغ، امیر، تسلیم، جلال، عروج دہلی اور لکھنؤ کے آسمانوں کے ٹوٹے ہوئے تارے سب رامپور کے آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے، خود میرے خاندان میں بھی شعرگوئی کا ذوق ہوا۔ تین چار عزیز اُستاد داغ کے شاگرد ہوئے، جنہیں ایک میرے حقیقی بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر اور میرے چچازاد بھائی اور خسر عظمت اور اُن کے بھائی حافظ احمد علی صاحب شوق شامل تھے گھر پر بارہا مشاعرہ ہوا، پھر داغ کو نواب کلب علیخاں صاحب مرحوم نے جن کی نظر ہمیشہ کفایت شعاری

پڑھتی تھی، از راہ پرورش سرکاری اصطبل کا داروغہ بھی کر دیا تھا، تاکہ وظیفہ محض کا ربیکار ان کی نذر نہ ہو، یہ میرے مکان کے عقب میں تھا، اس لیے روزانہ ان کی زیارت یوں ہی ہو جاتی تھی، اور اب اوس بذلہ سنج کے شعر کا لطف اُٹھاتا ہوں۔ جس نے داغ کے اس تقرر پر کہا تھا (ممکن ہے کہ تاریخ بھی نکلتی ہو) کہ

آیا دہلی سے ایک مُشکی خر + آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا (داغ کی غزل یاد کیجیے) ؎

آج رخصت جہان سے داغ ہوا - خانۂ عشق بے چراغ ہوا

اس پر مستزاد یہ کہ ذوالفقار روزانہ داغ کے گھر جاتے تھے جو ہمارے مکان سے دور نہ تھا اور مجھے بھی لیجاتے تھے۔

داغ نے پہلے دن پوچھا کہ کچھ شعر بھی یاد ہیں، میری عمر بہت ہی کم تھی، مگر بھائی نے کچھ شعر یاد کرائے تھے، جنھیں میں نہایت زور دار شان سے کڑک کڑک کر پڑھا کرتا تھا، میں نے داغ ہی کے چند شعر انھیں سُنا دیے سُنکر پھڑک گئے۔ اور اُس کے بعد ہمیشہ اصرار رہا کہ اس بچّہ کو ضرور لایا کرو جناب والا اس کے بعد اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں تو بیجا ہوگا مگر میرا دعوے تو اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے، سنیئے، میں نہ صرف شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں بلکہ اوس کی توند پر کودا ہوں۔ اُسے ہاتھی بنا کر پیٹھ پر سوار ہوا ہوں۔ غرض کوئی بے ادبی یا گستاخی باقی نہیں رہی۔ جو میں نے شعر و سخن کی شان میں نہ کی ہو۔

میری پیدائش ۱۸۸۳ء کے اواخر کی ہے۔ میں نے دس برس ہی کی عمر میں بہت سے لغو و فضول شعر مگر بامعنی اور موزوں کہے تھے، اور اچھا ہوا کہ اب کسی کو یاد نہیں ورنہ جب میری آفیشیل بیوگرافی (یعنی گورنمنٹ کی طرف سے نہیں بلکہ بقول آپ کے میری اُمت کی طرف سے) لکھنے کا وقت آتا۔ تو میرے سیرۃ نگار کو سخت مشکل کا سامنا ہوتا۔ کہ اس بکواس کو ردی دان بلکہ آتشدان کی نذر کیا جائے۔ یا سیرۃ پیشوائے قوم و ملک میں جگہ دیجائے، ہمدرد کے سنسر نے (جن کا چند ماہ کے بعد ہی انتقال یکایک ہو گیا) ہمدرد میں سے ایک بار چڑیا چڑے کی کہانی کو بھی

ر جو محض امتحاناً درج کی گئی تھی، خارج کر دیا تھا اور اعتراض کیا گیا تو کہا کہ "جالی ہے تو جڑ یا جہ ونٹی ہی کہ کہنی اور مطلب بھی صاف معلوم ہوتا ہے، مگر ہمدردوں والوں سے ڈر ہی لگتا ہے۔ اور دونی کا معاملہ ہے، معلوم اس میں بھی کچھ زہر بھر دیا ہو، اور جواب ہی ہمارے سر آپڑے۔ آپ نفسیات کے ماہر ہیں کیا ممکن نہیں کہ میری لے جنے والا سیرۃ نگار باوجود نقادِ سخن ہونے کے محض بطل پرستی کے باعث یہ خیال کرنے لگتا۔ کہ نہ معلوم کیا کیا اسرار اس بظاہر لچر پوچ میں پوشیدہ ہیں۔ اور آنے والی نسلیں ممکن ہے۔ کہ اس سے بھی زیادہ روشن ضمیر ہوں اور ان سرار سے واقف ہو کر دنیا کو نئے نئے معلوما اور عجیب عجیب انکشافات سے مالا مال کر دیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ انہیں داخل ہی کر دو۔ اور اسی طرح ہمیشہ کے لیے میری پوچ گوئی باقی رہتی اور قیامت کے دن استاد داغ میرا دامن پکڑ کر خود بھی بدنام ہوئے اور ہمیں بھی بدنام کیا۔ خیر اب سنئے کہ گیارہ برس کی عمر میں میں علیگڑھ گیا ایک بڑے بھائی نے میری موزوں گوئی کا ذکر مولانا شبلی مرحوم سے کیا۔ دوسرے نے میرے حافظہ کی تعریف کی کہ "المامون میز پر رکھا تھا۔ اٹھا کر پڑھنے لگا۔ اور ایک دن میں نے امین کے قتل پر جو مرثیہ ہے۔ اس کا ایک شعر عربی کا پڑھا۔ تو اس کا مجھے ترجمہ سنا دیا۔ حالانکہ عربی سے بالکل ناواقف ہے۔ مولانا کو یقین نہ آیا۔ اور امتحان کی غرض سے ہم بلائے گئے پہلے مامون کی اولاد کی فہرست مانگی۔ پھر اس کا حلیہ پوچھا۔ جب اس میں پاس ہوگئے تو ایک مصرعہ طرح اسی وقت دیا اور کہا کہ شعر لکھو۔ چیزے از قسم لچر پوچ اسی وقت تیار ہو گئی میرا خیال ہے کہ مولانا مرحوم پر تو جو سکہ بیٹھ گیا تھا وہ اسی لچر پوچ کا تھا۔ میں اسکول ہی میں تھا۔ کہ ایک نظم انعامی میں نے بھی لکھی۔ اور مولانا حکم ٹھہرے۔ انعام تو ایک کہنہ مشق بزرگ کو ملا۔ مگر ہماری نیچر گوئی کا بھی خاصہ شہرہ ہوا۔ اکثر ایسا ہوا کہ ذوالفقار بھائی نے کوئی نظم لکھ دی۔ اور ہم نے اپنی طرف سے پڑھ دی۔ مگر جب عمر ذرا زیادہ ہوئی تو امتحانوں نے فرصت نہ دی۔ کالج میں البتہ آخری سال سجاد حیدر کی صحبت میں شعر و سخن کا چرچا رہا۔ پہلے بھی جب ہم لوگ انٹرنس میں تھے۔ تو ایک نظم تین شعراء باکمال نے حاجی اسمٰعیل خاں صاحب (ترجمۃ الدجاج دیوثین جیک والے) کی دعوت کے شکریہ میں تیار کی تھی، اُن میں سے

ایک یہ خاکسار تھا۔ ایک سجاد حیدر صاحب اور ایک سید وزیر حسن صاحب آنریبل و آزمودہ کار سکریٹری مسلم لیگ کے برادر اصغر غرض ایک سال آخری کالج میں خوب گذر گیا۔ اور وہ مشاعرہ جسے بعدہ حسرت نے رونق بخشی ہم لوگوں ہی کا ایجاد کردہ تھا۔ چودھویں کو ہوا کرتا تھا۔ اور شمع پیش نہ کی جاتی تھی، کرکٹ کالان میدان ہی جائے مشاعرہ تھا۔ ایک بار چودھویں کو بارش ہو گئی۔ تو تین چار دن مطلع صاف ہونیکی راہ دیکھ کر ڈائننگ ہال میں کیا گیا۔ اسوقت میں نے اپنی ایک غیر طرح میں اس شعر کا بھی اضافہ کر دیا ؎

لطف مشاعرہ تو گیا چودھویں کے ساتھ ۔۔۔ ذرشسِ نو فردیں نہیں وہ چاندنی نہیں

علیگڈھ کالج میں شاعری تو کچھ کی مگر دہی فرضی معشوق۔ اگر کچھ اصلیت تھی بھی تو اتنی ہی جتنی ایران کی شاعری کو اور سبزہ خط وغیرہ کو ایک حد تک بامعنی کر دیتی ہے۔ کالج چھوڑا تو ولایت جانا ہوا۔ یہاں البتہ شاہدان اصلی کی کمی نہ تھی۔ مگر ذوق نظارۂ جمال لاکھ سہی اور گرہ میں مال بھی سہی تاہم طبیعت کا میلان خلاف دستور عام بدتورع کی طرف تھا۔ دو برس کے قریب تو ہندوستان کے کچے دھاگے نے باندھے رکھا۔ دو برس کسی اور کے خیال نے مگر یہ آخری خیال بھی باعصمت تھا اور محض حالات گردوپیش کا تقاضا اس کا محرک تھا۔ جب ان سب تجربوں کے بعد کپڑے پھاڑتے گھر کو آئے۔ تو تاہل کی زندگی بال بچوں کے خیال نے شاعری سے مستغنی نہیں تو غافل ضرور کر دیا گذشتہ چند سالوں میں اگر کچھ ترشح شاعری کا ہوا۔ تو وہی قومی مرثیہ مگر زیادہ تر وہی۔ البتہ پچھلے دو تین برس میں عشق حقیقی رنگ لایا ہے۔ اور تغزل کا زور ہے۔ یہ اپنی تنک آبی ہے کہ سوائے چار پانچ غزلوں کے اس فرصت کے زمانہ میں بھی کچھ نہ لکھ سکا۔ لکھنے کے لیے نہ بیٹھتا ہوں۔ نہ کوشش کرتا ہوں۔ مگر جب طبیعت پر خود ہی کسی بیرونی تحریک کا غلبہ ہوتا ہے۔ تو بغایت مجبوری کہہ لیتا ہوں۔ اور یہی ایک ذریعہ (علاوہ تلاوت قرآن پاک کے) تسکین قلب کا رہ گیا ہے۔ چونکہ آپ کا اصرار ہے۔ کہ پوری غزلیں لکھ بھیجوں۔ اس لیے یہ لکھے بھیجتا ہوں Touchston کی معشوقہ سے زیادہ قابل قدر نہیں۔ "A poor thing but mine own"

ب رخصت ہوتا ہوں اور تضیع اوقات کی معافی کا خواستگار ہوں۔ ....

(غزلین و رباعیات میں) یہ چند اشعار ہیں۔ ممکن ہے کہ بقول آپکے میری "امت" ان سے کچھ تسکین پائے
بہ حال خود مجھے ضرور کچھ نہ کچھ تسکین ہو جاتی ہے۔ مگر ان کو لٹریچر سے کیا تعلق۔ یہ صرف اپنی دست
شانی اور یادگاری کے لیے ہیں"۔

عبدالماجد (بی اے)

مجوس اور اسلام

مضمون ذیل دراصل پارسی علوم اور اسلام کا تتمہ ہے۔ گذشتہ نمبروں میں زبان پہلوی کی نادرؔی
دنقائص، قدیم علوم پارسی کی کیفیت وکمیت ان پر عرب کی لسانی وادبی تاثیرات واحسانات
سے بحث کی گئی تھی۔ بمضمون ہذا میں عہد اسلام میں (ساتویں صدی ہجری تک) پہلوی ادبیات
کی موجودگی اور مسلمانوں کے ہاتھ سے ان کی خدمت وحفاظت بذریعہ تراجم واقتباس ثابت
کی گئی ہے، اور مجوسیوں پر اسلام کے دردانگیز مظالم کی حقیقت کے انکشاف پر خاتمہ کیا گیا ہے۔

پارسی علوم ساتویں صدی ہجری تک

قدیم پارسی لٹریچر جو کچھ بھی تھا اور جیسا کچھ بھی تھا ساتویں صدی ہجری تک ایران میں موجود تھا، جس کا ثبوت ہمیں عربی تاریخوں سے ملتا ہے۔ ان مصنفین اسلام نے ان سے پورا پورا استفادہ کیا ہے۔ ساتویں صدی کے تاتاری فتنوں میں جہاں سینکڑوں جلیل القدر فضلا اور ان کی بے بہا تصانیف تلف ہو گئیں اگر ان کے ساتھ پارسی کی گنتی کی دس بیس کتابیں بھی ناپید ہو گئیں تو ان کا کیا شمار۔ مگر یہ کہنا بالکل مبالغہ نہ ہوگا کہ پارسی میں جو کچھ مواد قابل اعتنا تھے عربی میں منتقل ہو گئے فتح ایران سے ایک صدی کے اندر اندر فارسی کی اکثر کتابیں عربی میں ترجمہ ہو چکی تھیں۔

تراجم

ہشام بن عبدالملک اموی نے جو ۱۰۵ھ میں تخت نشین ہوا اپنے میر منشی جبلہ بن سالم سے جنگ رستم واسفندیار، داستان بہرام چوبین اور فارسی کی بہت سی کتابیں ترجمہ کرائیں۔ اس نے ۱۱۳ھ میں ایک تاریخ عجم کا ترجمہ بھی کرایا جو ایران کی مفصل ومبسوط مصور تاریخ تھی اور مسعودی نے اسے ۳۰۳ھ میں شہر اصطخر میں دیکھا تھا[1]۔

خلافت عباسیہ کے مترجم بہرام بن مردان شاہ نے خدائے نامہ جو شاہنامہ کا ایک اہم ماخذ ہے حاصل کرنا چاہا تو اسے اس کتاب کے بیس نسخے مل گئے۔ عربی میں اس کتاب کے آٹھ مختلف

---

[1] کتاب الاشراف مسعودی مطبوعہ یورپ صفحہ ۱۰۶

ترجمے حمزہ اصفہانی کی نظر سے گذرے ہیں[۱]۔ عبداللہ بن المقفع مشہور فاضل و مترجم کتب پہلوی نے بھی اس کتاب کا اور آئین نامہ، سکیران، اور بہت سی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔ خدائے نامہ کے پانچ ترجمے پانچ شخصوں نے کیے[۲]۔ تاریخ دولت ساسانی کا ترجمہ ہشام بن قاسم اصفہانی نے کیا اور نیشاپور کے مشہور موبد بہرام بن مردان شاہ سے اس کی اصلاح و تصحیح کرائی۔

دیگر کتب پارسی

ان عربی ترجموں کے علاوہ ہمیں عرب مصنفین کی کتابوں سے بہتیری قدیم پارسی کتابوں کا پتہ ملتا ہے۔ اشکانی دور (سنہ قبل مسیح لغایۃ سنہ ۲۲۶ء) تک کا سرمایۂ علم حمزہ اصفہانی کے زمانہ تک یعنی ۳۵۰ھ تک ایران میں موجود تھا۔ وہ کہتا ہے کہ عہد ملوک الطوائف (اشکانیاں) میں کتاب مزدک، کتاب سندباد، کتاب برسناس، کتاب شیماس وغیرہ لکھی گئیں جو آج لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں اور ان کا شمار ستر کے قریب پہنچتا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں فقی ایامھم وضعت الکتب التی ھی فی ایدی الناس مثل کتاب مزدک و کتاب سندباد و کتاب برساس و کتاب شیماس و ما شبھھا من الکتب التی تبلغ عددھا قریبا من سبعین کتابا[۳]۔ جب اشکانیوں کے عہد قحط الرجال و طوائف الملوکی کی ستر کتابیں چوتھی صدی ہجری میں موجود تھیں تو اس سے قریب تر عہد ساسانی کے علوم کیوں غارت ہونے لگے تھے۔

دوسرے پارسی اجزا و رسائل جو عہد اسلام میں موجود تھے اور اسلامی کتابوں میں مذکور ہیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

شہرزاد و پرویز (اردشیر کے خود نوشت وقائع)، کارنامۂ نوشیرواں، مزدک نامہ، بہرام و نرسی نامہ، کتاب التاج، کارنامۂ اردشیر بابکان (شاہنامہ کا دوسرا اہم تر ماخذ)، جاماسپ نامہ

---

[۱] سنی ملوک الارض حمزہ اصفہانی صفحہ ۹ و ۱۹

[۲] ایضاً صفحات ۹ - ۱۵ - آثار الباقیہ مطبوعہ لیپزک صفحہ ۹۹

[۳] سنی ملوک الارض صفحہ ۴۰ - اس دعوے کا ذمہ دار حمزہ اصفہانی ہے۔ تمام مورخین متفق ہیں کہ اس تاریک عہد میں کوئی علمی حرکت ظاہر نہیں ہوئی۔

آئین بہمن، داراب نامہ، دانش افزائے نوشیروانی مولفہ بزرگ مہر (بزرجمہر) باستان نامہ، دانشور نامہ، خرد نامہ۔ بقول صاحب مجمع الفصحاء، " فردوسی آثار و افعال ملوک عجم را ازاں نامہا بدست آوردہ"

پارسی ادبیات کی اس لمبی فہرست سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ سب عہدِ ساسانی کا سرمایہ تھیں۔ معدودے چند کے سوانح کی تصریح پچھلے اوراق میں کی جا چکی ہے اکثر کتابیں عہد اسلام کی تالیفات ہیں۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اسلام کی عالم افروز روشنی سے مجوس بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ ایک طرف نومسلم ایرانی عربی تصنیفات میں معروف ہوئے تو دوسری طرف غیر مسلم ایرانی پہلوی جدید میں تالیفات کی طرف متوجہ ہوئے جن پر اسلام کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔ ان پارسی تصنیفات کا سلسلہ آٹھویں صدی ہجری تک جاری رہا۔

تاریخ ایران کا یہ ذخیرہ عہد غزنوی تک ایران میں عام تھا۔ مورخین اسلام طبری، مسعودی، دینوری، یعقوبی، حمزہ اصفہانی، ابو معشر، موسیٰ ابن عیسیٰ الکسروی اور ابن حوقل نے ان سے استفادہ کرکے ایران کی تاریخیں مرتب کیں۔ ان میں سے اکثر فردوسی کے وقت تک تصنیف ہو چکی تھیں۔ اور اس نے ان سے پورا پورا استفادہ کیا ہے اگرچہ اقرار نہیں کرتا۔ خود سرجان ملکم جو فاتحین عرب پر ادبیات عجم کی وحشیانہ تباہی کا الزام عائد کرتے ہیں، شاید بھولے سے ایک جگہ فرماتے ہیں :۔

" اجزائیکہ مضامین شاہنامہ ازاں گرفتہ شدہ است در زبان پہلوی بود ....

بعد از تالیف و ترتیب شاہنامہ نسخہائے قدیم بہ بے اعتنائی از میان رفتہ است واگر ہم احیاناً حفظ شدہ باشد محتمل است کہ در خزانۂ سلاطین غزنوی بودہ است، دراں صورت باید در فتنہ غوریاں کہ غزنین بباد نہب و تاراج رفت ایں اجزا نیز از دست رفتہ و ضائع شدہ باشد[۲]"

آپ نے دیکھ لیا کہ مسلمانوں نے پارسی ادبیات کی کیسی خدمت کی، کس طرح تراجم و انتقاط

---

[۱] جزو سوم مضمون ہذا مطبوعہ جامعہ بابت اپریل میں تفصیل گذر چکی اس مسئلہ پر شعر العجم حصہ اول اور زیادہ تر تاریخ علوم ایران پروفیسر براؤن جلد اول میں محققانہ بحث کی گئی ہے۔
[۲] تاریخ ایران جلد اول صفحہ ۶۵

دستفا وسے ان کو محفوظ کیا جس کے بغیر شاید آج پارسی کی کتابوں کے نام سے بھی دنیا آشنا نہ ہوتی۔ اس حقیقت پر نظر کیجیے، خود معترض کے فقرۂ بالا کو پڑھیے، پھر فاتحین اسلام کے خلاف ان کی وہ ہنگامہ آرائی ملاحظہ فرمایئے جو تمہید میں مذکور ہوئی، اور فیصلہ کیجیے کہ سر جان ملکم کا یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے کہ جاہل فاتحین اسلام نے پارسیوں کے تمام علوم ملیامیٹ کر دیئے۔

پارسی فاضل کی شہادت

رہا یہ اعتراض کہ فاتحین عرب نے ایرانیوں کی بامردانہ مدافعت سے طیش میں آکر ایران کے شہروں کو مسمار کر دیا، آتشکدوں کو آگ لگا دی، پجاریوں اور موبدوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا اور پارسی ادبیات کے ساتھ ان قابضوں کو بھی مٹا دیا۔ کیا خوب ہو کہ اس سنگین الزام کا جواب خود پارسی فاضل کی زبان قلم سے ادا ہو۔ کیونکہ۔

الفضل ما شهدت به الاعداء

مسٹر تریمان

مسٹر تریمان موصوف الصدر نے ایک روسی مستشرق M. Inostranzev کی محققانہ روسی تصنیف سے انگریزی میں ایک ترجمہ شائع کیا ہے اور آخر میں اصل ماخذوں کا ترجمہ بھی ضم کر دیا ہے۔ اس کا نام ہے ادبیات اسلام پر ایرانی اثرات۔
Iranian Influence on Muslim Literature

ایک طرف سر جان ملکم اور پروفیسر آزاد اپنے "پارسی بھائیوں" کے علوم و فنون اور تہذیب و تمدن ہی نہیں بلکہ ان کا ایمان اور مذہب عربوں کے ہاتھوں غارت ہونے پر رقت انگیز نوحہ خوانی میں مصروف نظر آتے ہیں، دوسری طرف انکے "پارسی بھائی" فرماتے ہیں :۔

"غیر محققانہ طلاقت لسانی اور دل خوشکن مقرری کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ عربوں نے تہذیب ایران کے دماغی اور جسمانی تمام شعبوں پر ایسی جھاڑو پھیری ہے کہ مجوسیوں کے متعلق کوئی معتبر ذریعہ معلومات باقی نہیں رہا۔ . . . . خود عربی ادبیات عربوں کے ہاتھوں ایرانی تہذیب و تمدن کے مٹائے جانے کی بے بنیاد کہانی کی نفی کر رہی ہیں۔ تاریخ کے متفرق شعبوں جغرافیہ اور سائنس و فلسفہ پر

عربی تصانیف ایرانی تہذیب و تمدن کی تاریخ کے لیے وسیع مواد بہم پہنچاتی ہیں۔"
یہ خود مسٹر زیان کے مقدمہ یا دیباچہ کے الفاظ ہیں۔ کتاب کے حصۂ ترجمہ میں ہم اسی مصنف سے
نقل کرتے ہیں۔

"ایرانیوں کی فاتحانہ حیثیت مفقود ہونیکے بعد بھی اُنکے پیشوایانِ مذہب کی وقعت و حرمت ایرانیوں
اور عربوں کی نظر میں یکساں قائم رہی۔ اسی طرح دہقانوں کی جماعت کا رتبہ بھی علی حالہ برقرار رہا ——
زرپی دہقان ایرانی روایتوں کے حامل تھے۔ فتح ایران کے بعد سالہا سال تک عرب آثارِ صنادیدِ
عجم کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے رہے اور اپنی تصانیف میں وضاحت کے ساتھ اُن کے بیانات
چھوڑ گئے۔ چنانچہ اصطخری و ابن حوقل[1] جو پانچویں صدی ہجری کے آغاز کے مصنف ہیں، بتاتے ہیں
کہ تمام مدتِ عہدِ اموی میں کرمان کے اکثر مقامات کے باشندے کھلم کھلا اپنے دین (آتش پرستی)
پر قائم تھے۔ باشندگان فارس کا حصۂ غالب آتش پرست تھا اس صوبہ کا کوئی قریہ اور گاؤں تک
آتشکدہ سے خالی نہ تھا۔ قدیم محلات، قلعے، آتشکدے تمام فارس میں پھیلے ہوئے تھے۔
مقدسی کا بیان ہے کہ شیراز کے آتش پرستوں کے لباس کے لیے کوئی امتیازی علامت نہ تھی
اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں ان میں اور مسلمان رعایا میں کوئی فرق نہ تھا۔ بے شبہ فتح اسلام
کے بعد پارسیوں کی حالت نسبتہً اچھی تھی۔ کبھی کبھی کوئی چیز انہیں صدمہ پہنچاتی تھی تو وہ اور اور
ادیان و مذاہب کا جوشِ تعصب اور سازشیں ہوتی تھیں۔ اگرچہ وقتاً فوقتاً امرائے دولت کے
مدارج تک پہنچکر بڑے بڑے کارنامے انجام دے لیتے تھے مگر بالعموم یہ جماعت الگ تھلگ اور
سیدھی سادی زندگی بسر کرنے کی عادی تھی۔ اسی سبب سے یہ اپنے خصائصِ قومی اور شعائر
قدیمی پر قائم رہ سکی۔ امتدادِ زمانہ کے بعد ان کی زندگی خراب سے خراب تر ہوتی گئی۔ ان میں
سے ایک ٹولی بتدریج مغربی ہند میں جا رہی۔ تمام پارسی ادبیات میں صرف ایک مقام پر

---

[1] اصل تصنیف یعنی متن کمیاب ہے۔ فرانسیسی اور پھر انگریزی میں ترجمے ہوئے ہیں۔ انگریزی ترجمہ اب سے ایک
صدی پیشتر سر ولیم اوسلی نے کیا۔ مسلم

ہم ترک وطن کا ذکر پاتے ہیں مگر وہاں بھی بیان اس قدر مبہم ہے کہ اصل واقعہ کا صرف دھندلا
نقشہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کتاب کا نام قصۂ سنجان ہے اور سولھویں صدی عیسوی کے آخر
کی تصنیف ہے۔ لہٰذا اسے قدیم گبروں کی ایک بقیہ کو نج سمجھنا چاہیے۔ بہرحال اس کتاب کے بیان
سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے تسلط کے بعد پارسی ایک سو سال تک پہاڑی علاقوں میں
بسر کرتے رہے۔ پھر ہرمز کو منتقل ہوگئے۔ وہاں سے گجرات میں جا بسے۔ پھر اور تارکان وطن
بھی خراسان سے آملے۔ اس سے بھی اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ پارسیوں کا ترک وطن تدریجی تھا۔
ورنہ یکبارگی اجتماعی ترک وطن کی صورت میں عربی تصانیف سے کوئی سراغ ملنا چاہیے تھا۔
اس کے علاوہ یہ بھی مسلّم ہے کہ ان کی معتدبہ تعداد اپنے وطن ہی میں رہی جن کی اولاد ایران
کے موجودہ گبر ہیں۔

طبرستان کے اسپہباد جو خاندان ساسانی کے فوجی گورنر تھے فتح ایران کے بعد پوری ایک
صدی سنہ ۔۔۔ء تک آزادانہ اپنے ملک میں خود مختار حکمرانوں کی حیثیت سے حکومت کرتے رہے۔ ان کے
سکے آج تک موجود ہیں۔ پھر اس زمانہ میں پارسیوں کا ایک محفوظ پارسی حکومت کو چھوڑ کر ہندوستان
میں یکبارگی و مضطربانہ ہجرت کرنا قرین قیاس نہیں۔ مصنف موصوف اسی سلسلہ میں رقم طراز ہے :-

"مندرجہ بالا بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عربوں کی فتح ایران کے بعد کئی صدیوں تک
پارسی روایات ادبیہ اپنی قومی شکل میں موجود تھیں۔

عرب مصنفین قدیم فارسی کتابوں کی تلاش میں پارسی موبدوں تک پہنچا کرتے اور کامیاب
ہوتے تھے .... محض انہی عرب مصنفین کی بدولت آج علمی مواد دنیا پر باقی رہ گئے
ہیں جن میں سے بعض ساسانی عہد کی کتابوں کے (عربی) ترجمہ ہیں ....

"ابن حوقل گیارھویں صدی کے وسط میں گذرا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ آج فارس میں کوئی ضلع
یا شہر بلکہ گاؤں نہیں جہاں آتشکدے نہوں .... یہ بڑے خوشحال، تجارت
پیشہ، اور جہاز راں ہیں .... بہ آفرید کے نام سے عہد اسلام میں زرتشتی مذہب

سے ایک فرقہ قائم ہو گیا تھا۔ اس کے واقعات سے بین بات کی نہایت زبردست
دلیل ہاتھ آتی ہے کہ اس زمانہ میں زرتشتیوں کو صرف اپنے مذہب پر قائم رہنے ہی کا فیصلہ
نہ دیا گیا تھا بلکہ البیرونی کے بیان کے مطابق قدیم زرتشتی اور یہ جدید فرقہ دونوں خلفاء کے
زیر سایہ دوش بدوش شاد و مطمئن زندگی بسر کرتے تھے۔

حمداللہ مستوفی نزہۃ القلوب میں چودھویں صدی عیسوی کا مشاہدہ بیان کرتا ہے کہ
"اشتر Alishtar میں ایک قدیم آتشکدہ ہے جس کا نام اردوخش ہے......
......تشیز کے قریب پرانے قلعے ہیں جن میں سے ایک کا نام آتش گاہ (آتشکدہ) ہے
...... مقدسی کا بیان ہے کہ آتش پرست یہود و نصاریٰ کی طرح اہل کتاب کے
حقوق رکھتے ہیں۔"

پروفیسر براون اب ذرا ایران کی قوم اور علوم کے مسلّم الثبوت شیدائی پروفیسر براون
صاحب کی زبان سے بھی پارسیوں کے ساتھ عربوں کے برتاؤ کا حال
سُن لیجیے۔ وہ اپنی مشہور تصنیف تاریخ علوم ایران میں فرماتے ہیں :۔
"اکثر کہا جاتا ہے کہ غازیان اسلام دو چیزیں پیش کیا کرتے تھے کہ ان میں سے کوئی ایک
اختیار کر لو۔ قرآن یا تلوار۔ مگر حقیقت یہ نہ تھی۔ مجوسیوں، عیسائیوں اور یہودیوں سب کو اپنے
اپنے دین پر قائم رہنے کی اجازت تھی۔ صرف جزیہ ادا کرنا پڑتا تھا جو بالکل منصفانہ انتظام تھا،
کیونکہ خلفا کی غیر مسلم رعایا قانوناً فوجی خدمت اور ادائے صدقات سے بری تھی، مگر مسلمانوں
پر دونوں چیزیں مذہباً فرض تھیں ...... بحرین میں پارسی مرزبان اور اس کے کچھ ہم وطن
مسلمان ہو گئے اور باقی فی مرد بالغ ایک دینار جزیہ قبول کرکے اپنے دین زرتشتی پر قائم رہے۔
مجوسی اور یہودی اسلام کے سخت دشمن تھے اور جزیہ دینے کو ترجیح دیتے تھے.......
"جو شہر مسلمانوں کی مدافعت میں زیادہ مزاحم ہوتے تھے خصوصاً وہ شہر جو ایک دفعہ
ہتھیار ڈال دینے کے بعد دوبارہ بغاوت کر بیٹھتے تھے ان کا بچنا آسان نہ تھا۔ بالخصوص،

... الغرض صورت میں قابلِ جنگ مرد یا کم از کم جو مسلح پائے جاتے تھے تہ تیغ کر دیئے جاتے اور ان کی عورتیں اور بچے اسیر کر لیے جاتے تھے۔ تاہم یہ نہیں معلوم ہوتا کہ مجوسیوں پر مجوسی ہونے کی بنا پر کوئی ظلم کیا گیا ہو یا ایران کو بزور مسلمان بنایا گیا ہو . . . . اس میں شک نہیں کہ عرب میں نومسلم اور اسیر جنگ ایرانیوں کے غیر محدود ہجوم نے حضرت عمرؓ کو بہت متفکر کر دیا تھا۔ چنانچہ آپ نے فرمایا تھا کہ "الٰہی ان اسیران جلولہ کی اولاد سے تیری پناہ!" اور در حقیقت واقعات نے آپ کے تردد کو بجا ثابت کر دیا۔ آپ انہیں ایرانی اسیروں میں سے ایک کے خنجر سے شہید ہوئے جسے عرب ابو لولو کہتے تھے۔ ایران کے زیادہ متعصب شیعے آج تک اسی حادثہ کو مسرت کے ساتھ یاد کیا کرتے ہیں اور کچھ ہی عرصہ ہوا کہ عمر کشان کے نام سے آپ کی برسی منایا کرتے تھے . . . .

آب دین زرتشتی اگرچہ دین سلطانی کے رتبہ سے تو گر گیا تاہم ایران سے بالکل نہ مٹا۔ جن لوگوں نے دین اسلام قبول نہ کیا اور اپنے آبائی مذہب مجوسی پر قائم رہے ان کی تعداد صرف ان تارکانِ وطن ہی تک محدود نہ تھی جو عرب حملوں سے پہلے جزائر خلیج فارس کو اور وہاں سے ہندوستان بھاگ آئے جہاں انھوں نے پارسی نوآبادیاں قائم کر لیں جو اب تک بمبئی اور سورت میں اور ان کے آس پاس موجود ہیں۔ بلکہ یہ جماعت تو مجموعی پارسی آبادی کا ایک جزو قلیل تھی . . . . موبدوں کا اثر اور احترام اب تک قائم تھا۔ عمائدین خلافت سے ان کے تعلقات اچھے تھے پارسیوں کو ایک حد تک حکومت خود اختیاری حاصل تھی۔ آتشکدوں کو ایسی حالت میں بھی جب ان کے انہدام کا قانوناً اعلان کر دیا جاتا تھا[۱]۔ علاً شاذ و نادر ہی صدمہ پہنچایا جاتا تھا۔ بلکہ بعض اوقات مسلمان حکام ایسے لوگوں کو سخت سزائیں دیتے تھے جو نامعقول جوشِ دینی میں آتشکدوں کو کوئی نقصان پہنچا دیتے یا برباد کر دیتے تھے۔ فتح ایران کے بعد تین صدیوں

---

[۱] اس کی ضرورت صرف ایسی حالتوں میں پڑتی تھی کہ معابد کو حکومت نے جو حرمت و آزادی بخشی تھی اس سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مجوس ان کو سیاسی سازشوں کا مرکز بنا لیتے تھے۔

تک قریب قریب ہر صوبۂ ایران میں آتشکدے موجود تھے۔ حالانکہ آجکل ہو تم شینڈلر کے باوجود احتیاط شمار کے موافق ایران کے تمام آتش پرستوں کی مجموعی آبادی صرف ساڑھے آٹھ ہزار کے قریب پہنچتی ہے[1]۔"

(تمام شد)

محمد مسلم۔ ایم اے

---

[1] جلد اول۔ مقالہ دوم کے آخری صفحات۔

جمہوریہ روس میں تعلیم

روس بالعموم زرعی ملک ہے جس میں اب سے پچاس سال قبل تک زیادہ تر کسان کاشتکاری کرتے تھے۔ اُس وقت کی حکومت نے ان سیدھے سادے کسانوں کو تعلیم دینا خلاف مصلحت سمجھا یہاں تک کہ اگر کسی نے انکو تعلیم دینے کا ارادہ بھی کیا تو وہ اُس کی مزاحم ہوئی۔ فوج میں کوئی باقاعدہ تعلیم کا انتظام نہ تھا اور صرف ۸ فیصدی سپاہی کچھ لکھ پڑھ سکتے تھے۔ روس کا جنوبی مشرقی حصہ ملک عموماً مسلمانوں سے آباد ہے جن میں سے بہت سے قیم خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ لوگ تھوڑی بہت روسی زبان بول سکتے تھے مگر اکثر لوگوں نے اپنی ہی زبان اختیار کی۔ یورپ کی تہذیب نے اپنی ترقی کی حالت میں روس کے بہت بڑے حصہ کی طرف جس میں یہ لوگ اور تقریباً تمام کسان بھی شامل ہیں بالکل رُخ نہیں کیا۔

روس میں جب انقلاب رونما ہوا تو وہاں کی یہ کیفیت تھی۔ لیکن انقلاب کے بعد فوراً جس کام کی طرف فوری توجہ کی گئی وہ سابق نظام تعلیم کی اصلاح تھی۔ انقلاب سے قبل تعلیم کا انتظام جیسا کچھ بھی تھا۔ حکومت۔ چرچ اور میونسپلٹی کے ہاتھوں میں تھا۔ زار اور اُس کی حکومت کے مصلح قوم کو تاریکی میں رکھتے تھے تاکہ اس کی ذاتی اغراض و مقاصد میں کوئی چیز سد راہ نہو جس طرح اس حکمت عملی کو تمام شہنشاہیت پرست ممالک اپنی نوآبادیوں کے معاملات میں برتتے ہیں۔

زار کے عہد حکومت میں روس کے تمام اسکول اور کالج غربا کے لیے نہ تھے بلکہ محض امرا کے لیے تھے۔ اصولاً ہر ایک آدمی سوائے یہودیوں کے اپنی اولاد کو تعلیم دے سکتا تھا مگر اخراجات ناقابل برداشت ہونے کی وجہ سے بیچارے معمولی آدمی اپنے بچوں کو بالکل نہیں پڑھا سکتے تھے انقلاب روس نے ان تمام دقتوں کو دور کر کے تعلیم کو مفت اور لازمی کر دیا۔ اس کا ایک محکمہ جدا قائم ہوا ہے جس کا تمام کاروبار حکومت کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ کام تین شعبوں میں منقسم ہے۔

۱۔ شعبہ عملی معہ صیغہ جات عام تعلیم ابتدائی و ثانوی جس میں "مترتب مدارس ریاضت"

"مدارس اصطلاحات" "مدارس صنعت و حرفت" مدارس ابتدائی اور مدارس تعلیم و تربیت برائے اساتذہ
بھی شامل ہیں۔
۲. شعبۂ علمیہ جس میں انجمنہائے علمیہ۔ مجالس تعلیم اعلیٰ اور کتبخانے شامل ہیں۔
۳۔ شعبۂ فن جس میں مختلف فنوں کی شاخیں شامل ہیں مثلاً موسیقی ادب۔ تھیٹر۔ سینما حفاظت
آثار قدیمہ وغیرہ وغیرہ۔
علاوہ اُن کے ایک اور شعبہ خاص مجلسِ تعلیم سیاسیات کے زیر عنوان قائم کیا گیا ہی۔ اس مجلس
کا مقصد عوام میں اشتراکیت کی روح پھونکنا اور اشتراکی خیالات پھیلانا ہے اگر ان مشکلات دشواریوں
اور خامیوں پر نظر رکھی جائے جن کا باعث یہ طویل جنگ ہے جس میں سامان صنعت و حرفت
اور معلمین وغیرہ بھی کام آئے اور جس نے ذرائع ہمرسانی سامان بھی مسدود کر دیئے، تو جمہوریۂ روس
میں تعلیم کا کام قابل قدر قرار پائے گا۔ مندرجہ ذیل نقشہ سے واضح ہو جائیگا کہ جمہوریۂ کے مدارس
اور طلبا میں کتنا اضافہ ہوا ہی۔

سال	مدارس ابتدائی و ثانوی	شمار طلبار
۱۹۱۱	۴۷۸۵۵	۳۰۶۰۴۰۰
۱۹۱۹	۶۳۳۱۷	۴۷۹۶۲۸۴
۱۹۲۱ (یکم جون)	۹۱۵۰۰	۷۲۰۰۰۰۰

یہ آسانی سے معلوم ہو سکتا ہی کہ ابتدائے انقلاب سے مدارس اور طلبار میں دوگنے سے
بھی زائد اضافہ ہو گیا جو ہمت و ارادہ کی نمایان کامیابی ہی۔ روس کی موجودہ حالت ایسی ہی کہ
نہ وہاں نئی کتابیں چھاپنے کے لیے کافی سامان ہی اور نہ لکھنے کے لیے۔ علاوہ اس کے ہر مدرسے
میں طلبار کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لیے اساتذہ کی تعداد بھی ناکافی ہی۔
لیکن ان تمام دشواریوں کے باوجود محکمہ تعلیم حتی الامکان کوشش کر رہا ہی اور ایک نئے
طرز تعلیم کی مستقل بنیاد ڈالنے کی فکر میں ہی۔ اسکی ایک خاص ایجاد "مترتب مدرسہ ریاضت" ہی

اس مدرسہ کا مقصد مختلف جماعتوں اور طبقوں کے بچوں کی تعلیم کا ایک ہی لائحہ عمل قائم کرکے تمام دیگر ابتدائی اور ثانوی تعلیمی نظاموں کو توڑ دینا ہے۔ اس کے صرف دو درجے ہیں۔ درجۂ اول و درجۂ دوم درجہ اول میں ۸ سال سے ۱۲ سال تک کی عمر کے بچے تعلیم پاتے ہیں اور درجۂ دوم میں ۱۲ سال سے ۱۸ سال تک کی عمر کے بچے۔ جمہوری روس کا ایک بہت ہی اہم مقصد یہ ہے کہ اُس کے تمام شہری شند پیدائش اشیا میں عملی حصہ لیں۔ اسی وجہ سے ان مدرسوں میں جو چیزیں کہ بچے استعمال کرتے ہیں اُن کو جہاں تک ممکن ہے خود بھی طیار کرتے ہیں۔ نجاری۔ کپڑے بننا۔ سینا۔ باغبانی اور دیگر دستی کام جدید اصول کے مطابق بچوں کو سکھائے جاتے ہیں جو کہ اس کے باقاعدہ نصاب تعلیم کے پورا کرنے میں ذریعۂ تعلیم کا کام دیتے ہیں۔ مدارس میں بچوں کے تمام اخراجات خوراک اور لباس حکومت برداشت کرتی ہے اور بعض تعلیم گاہوں میں بستر بھی مہیا کیے جاتے ہیں۔ طلبا مدارس ہی میں رہتے ہیں اور اپنی فلاح و بہبود کے لیے اپنے اساتذہ کی مدد سے مختلف کام کرتے رہتے ہیں۔ درجۂ دوم کے مدارس میں طلبا بڑے پیمانہ پر پڑھتے اور کام کرتے ہیں اور جس پیشہ کو وہ تعلیم سے فارغ ہونیکے بعد اختیار کرنا چاہتے ہیں اُس کو یہاں پر عملی طریقے سے حاصل کرتے ہیں۔ تعلیم کا کام اسکولوں کے علاوہ مزدوری کے کاروبار میں بھی پھیلایا جارہا ہے۔ اگرچہ جمہوری حکومت نے ایک فرمان جاری کردیا ہے کہ ۱۴ سال سے کم عمر کے بچے مزدوری کے کاموں میں نہ لگائے جائیں۔ لیکن معاشی نازک حالت اور قحط وغیرہ سے حکومت مجبور ہوگئی کہ ایک عارضی زمانہ کے لیے میعاد عمر ۱۴ سال سے گھٹا کر ۱۲ سال کردیئے۔ مگر یہ نظرانداز نہ کردینا چاہیے کہ ان چھوٹے بچوں کو جو کارخانوں میں کام کرتے ہیں صرف کام کرنے کی ہی اجازت نہیں ہے بلکہ تعلیم حاصل کرنے کے بھی مواقع دیئے جاتے ہیں۔ تعلیم لازمی ہونیکی وجہ سے کارخانہ میں کام کرنے والے ہر بچہ کو روزانہ ۴ گھنٹہ اسکول میں حاضر ہونا ضروری ہے اور اس مقصد کے لیے خاص شام کے اسکول یا نصف وقت کے اسکول قائم ہیں۔ صرف پیٹروگراڈ میں تقریباً ۶۴ مدرسے ہیں جن میں تقریباً .... طلبا ہیں۔ پیٹروگراڈ میں ایک اور مدرسہ ہے جو اب نمونہ بنگیا ہے۔

جو طلباء اس مدرسے میں تعلیم پاتے ہیں اُنھوں نے ہی مدرسہ کی عمارت کی مرمت کی باورچی خانہ بنایا۔ پانی کے نلوں کو درست کیا۔ ایک پُرانے جھونپڑے کو مرمت کر کے دارالطعام بنایا اور اپنے لیے ایک تفریح گاہ .... تعمیر کی۔ وہ ایک ایسی جماعت کی طرح رہتے ہیں جو تمام امور متعلقہ کو خود ہی سرانجام دیتی ہو۔ آپس میں ہی طلباء کی ایک مجلس منتخب کر لیتے ہیں جو نظام مدرسہ اور نصاب تعلیم تجویز کرتی اور آپس کے جھگڑوں کا فیصلہ کرتی ہو۔ یہ سب آپس میں نہایت اچھے دوستوں کی طرح رہتے ہیں۔ طلباء ہی خود اپنے چال چلن کے ذمہ دار ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کے اخلاق نہایت اعلیٰ ہیں۔

مدراس کے علاوہ اور بھی انجمنیں ہیں جو عملی کارگذاری میں مصروف ہیں مثلاً "بچوں کا گاؤں" جو پیٹروگریڈ کے قریب ہے اور جس کی مثال کسی دوسرے ملک میں نہیں مل سکتی۔ "بچوں کا گاؤں" .... زار کے موسم گرما کے محل Czarskoe Selo میں آباد ہے اور روس کے تمام حصۂ ملک کے بچوں اور طالب علموں کے لیے تعطیلیں گذارنے کا مقام اور مرکز ہے، وہ گروہ در گروہ آتے ہیں اور ہفتوں قیام کرتے ہیں بعض اوقات تین تین مہینے تک وہیں رہتے ہیں گرمیوں کے موسم میں عموماً سیر و تفریح کے لیے سفر کی تیاریاں ہوتی ہیں اور آس پاس کے مختلف اضلاع میں سے بچوں کے گروہ کئی کئی روز کے لیے اس مقام پر لیکچر سننے، نغمہ و موسیقی سے دل بہلاتے، بچوں کے تھیٹر اور مختلف کھیلوں سے لطف اُٹھانے کے لیے آتے ہیں۔ خاص لیکچر روس کی تاریخ پر دیے جاتے ہیں اور بچوں کو زار کا مشہور محل Selo دکھا کر اس کی تاریخی اہمیت بتائی جاتی ہے۔ اُن کے آرام اور تفریح کے لیے ہر طرح کا انتظام کیا جاتا ہے اور وہ نہایت آرام سے اس پُر تکلف مکان میں رہتے ہیں۔ ایسے بہت سے "بچوں کے گاؤں" تمام ملک میں جا بجا پھیلے ہوئے ہیں جو اسکول کے بچوں کی گرمائی تعطیل میں نگرانی کرتے ہیں اور اُن کے لیے ملک کی عمدہ آب و ہوا نفیس غذا اور کھیل کود اور میدانی ریاضتوں اور کرتبوں سے دل بہلانے کے مواقع مہیا کرتے ہیں۔ کارخانوں میں کام کرنے والے بچوں کو ہر سال

ہیں ایک پندرہ روزہ تعطیل ملتی ہے جسکو وہ چھوٹے گاؤں میں جاکر گذارتے ہیں۔ مگر اخراجات حکومت برداشت کرتی ہے۔ علاوہ ایسی انجمنوں کے یا مجالس علمیہ کے تقریباً . . . . ۵ بتدائی مدرسے اور ہیں جنہیں غالباً . . . . . . ۲۰ نہایت ہی کم عمر دس سال بچے رکھے جاتے ہیں۔ ان کی مائیں چونکہ کاروبار میں مشغول رہتی ہیں۔ اس لیے ان بچوں کی پرورش اور نگرانی مدارس ہی میں سائنٹفک طریقوں پر کیجاتی ہیں۔ انقلاب نے یہ چیز بالکل ہی نئی اختراع کی ہے۔ اصولاً تعلیم لازمی ہونے کی وجہ سے ہر لڑکے کو جسکی عمر ۱۶ سال سے کچھ کم ہو اسکول میں رہنا چاہیے تاکہ اس کے تعلیم اور ضروریات کا انتظام حکومت اپنے صرفے سے کرے۔ لیکن جمہوریہ روس میں خوراک کی کمی اور دیگر دقتوں کے باعث بحیثیت اجتماعی عوام کی حالت سازوسامان کے لحاظ سے کافی بھی نہیں اسی وجہ سے طلبا کو بھی تھوڑی بہت دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ایک فرمان نافذ کیا گیا ہے جس کی رو سے مقامی اضلاع ایک خاص مقدار سامان خوردونوش اور دیگر ضروریات مہیا کرنے کے ذمہ دار ہیں تاکہ اس سے مرکزی حکومت کی امداد ہو۔ اس کا بھی اثر نہایت عمدہ ہوا۔

باوجود اُن تمام تکالیف اور دشواریوں کے جو باشندگان روس برداشت کرتے ہیں۔ زمانۂ انقلاب سے ہی ایک زبردست تحریک وہاں کی جہالت رفع کرنے کے لیے جاری ہے جس نے ایک سال سے بھی کم عرصہ کے اندر . . . . . ۸۰ ہم مردوں اور عورتوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیا۔ سرخ فوج میں اب ۵ ہم فیصدی ناخواندہ سپاہی ہیں جبکہ مقابلۃً پرانی فوج میں ۸۰ فیصدی سپاہی جاہل تھے۔ ایک گذشتہ تقریر میں کامریڈ ٹروٹسکی Comrade Trotsky نے زور دیکر کہا "ہماری سرخ فوج میں یکم مئی ۱۹۲۳ء تک ایک بھی ناخواندہ سپاہی نہ رہے گا"۔

کامریڈ لیونا کارسکی Comrade Lunacharsky کمشنر تعلیمات کا تخمینہ ہے کہ ۱۰ سال کے اندر اندر تمام ملک روس میں ایک فرد واحد بھی ناخواندہ نہ رہے گا۔

جمہوریت روس اپنی قوم کو تعلیم دینے کے زبردست کام کے علاوہ غیر اقوام خصوصاً مشرقی اقوام کو بھی تعلیم دینے کے لیے بہت کچھ کوشش کر رہی ہے۔ ماسکو میں ایک دارالعلوم یونیورسٹی .... مشرقی طلبار کے لیے قائم ہے جس میں تمام مشرقی ممالک سے آئے ہوئے تقریباً ایک ہزار طلبا تعلیم پا رہے ہیں۔ اُن کو نہ صرف تمام علوم کی بنیادی اور ضروری شاخوں پر لیکچر دیئے جاتے ہیں بلکہ تمام ضروریات جن میں خوراک لباس بستر اور مکان وغیرہ شامل ہیں حکومت خود اپنے روپیہ سے مہیا کرتی ہے۔ اس تعلیم گاہ کے متعلق اور بھی کئی درسگاہیں ہیں۔ جن میں تمام علوم جدیدہ کی تعلیم دیجاتی ہے اور مشرقی طلبا تعلیم کے شائق ہوں وہ آزادی سے ان میں داخل ہو سکتے ہیں۔ روس میں کسی قسم کا اختلاف قوم۔ مذہب اور رنگ کی بنا پر روا نہیں رکھا جاتا ہر وہ شخص جو علم کا دلدادہ ہو اور یہاں کے طرزِ حکومت سے اختلاف نہ رکھتا ہو روس میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آسکتا ہے۔ اُس کو بھی وہ تمام حقوق حاصل ہو گئے جو یہاں کے شہریاں شندوں کو حاصل ہیں۔ باوجود قحط اور معاشی نازک حالت کے جو عمدہ سے عمدہ خوراک دستیاب ہو سکتی ہے وہ طلبا کو ملتی ہے۔ لیکن جن کے پاس تھوڑا سا بھی زائد روپیہ ہے وہ بڑے آرام سے بسر کر سکتے ہیں۔ داخلہ کے لیے کوئی خاص اور دشوار قوانین نہیں کہ بغیر کسی خاص امتحان کے پاس کئے ہوئے طالب علم داخل نہ ہو سکے۔ یہاں صرف ذاتی قابلیت و لیاقت درکار ہے۔

حافظ منظور حسین متعلم جامعہ

ہندوستان عربوں کی نظر میں

اس عنوان سے ڈاکٹر زبیر صاحب پروفیسر عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا ایک مضمون مئی کی اشاعت میں رسالہ ناظرین جامعہ ہو چکا ہے۔ آپ نے اسی سلسلہ میں ایک دوسرا مضمون لکھا ہے جس کا ماخذ ایک عربی تصنیف ہے۔ عبداللہ محمد دبیر کی ۹۶۳ھ میں ہندوستان آئے اور مختلف امراء کے ہاں بسلسلہ ملازمت رہے۔ اس عرصہ میں موصوف نے یہاں کے حالات جو بچشم خود دیکھے قلمبند کر لیے یہ دو حصوں پر مشتمل ہیں۔ پہلا حصہ گجرات کی تاریخ ۱۳۹۶ء سے اکبر کی فتح تک ہے۔ دوسرے میں شمالی ہند کے مسلمانوں کی عام تاریخ ہے۔ عنوان مضمون سے جو واقعات متعلق تھے انھیں ڈاکٹر موصوف نے نہایت محنت کے ساتھ یکجا کیے ہیں۔ جن کا ترجمہ ناظرین جامعہ کے تفنن طبع کے لیے درج ذیل کیا جاتا ہے۔ (سعید)

اس سلسلہ میں یہ بخوبی بیان کیا جا سکتا ہے کہ لوگ پہلے زمانہ میں کس قدر سفر کرتے تھے اور مختلف ممالک اسلامی میں آمد و رفت کس قدر جاری تھی، ان تمام واقعات کا بلفظہ ذکر کر دینا یہاں کچھ سود مند نہ ہوگا، لیکن انھیں پڑھ کر ہر شخص یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی اسقدر سفر کیا جاتا تھا جتنا آج کیا جاتا ہے۔ الدبیر نے گنایا ہے کہ یمن کے عرب، یافعی (یمن) کے عرب، حبش کے باشندے رومی، ترک، افغانی، غوری، سادات بخارا، اور ایک قوم جسے اس نے بلیم کے نام سے موسوم کیا ہے، یہ سب ہندوستان میں موجود تھے۔ سفر کے متعلق مثلاً ایک قاضی کے حالات سنئے، وہ حضر موت میں پیدا ہوئے، زبید میں تعلیم پائی، صوفی ہوئے، حج کو گئے، شہر کے قاضی مقرر ہوئے پھر وہاں سے عدن چلے گئے "یہاں کے امیر نے ان کا بہت اعزاز و احترام کیا۔ اس کے بعد وہ پھر لوٹ کر مظفر شاہ کے ہاں آئے اور ہندوستان میں ۱۵۲۲ء میں انتقال کیا۔ اس قسم کی آمد و رفت کے اور واقعات بھی آئندہ آئیں گے۔

ہمارا مصنف اس عہد کے قصص و افسانے پر بھی نظر رکھتا ہے۔ ضیاء الدین برنی کی سند سے

اس نے علاء الدین خلجی کی تخت نشینی کا قصہ بیان کیا ہی۔ وہ کہتا ہی کہ اس نے اپنے چچا کی ایک لڑکی سے شادی کر لی اور ساتھ ہی اس کے اس نے ایک دوسری عورت ماہرو کے عشق کو اس سے چھپانا چاہا۔ شہزادی کو اس عشق و محبت کا پتہ لگ گیا، چنانچہ اس پر اس نے اپنے شوہر کو بڑی لعنت ملامت کی لیکن علاء الدین اس واقعہ سے صاف انکار کرتا رہا۔ آخر تا بہ کے ایک دن شہزادی نے اسکو اسکی محبوبہ کے ساتھ پکڑا اور اس راز کو دوسروں پر بھی افشا کر دیا۔ غصہ میں آکر علاء الدین نے تلوار اُٹھا کر ماری، نیام چونکہ کٹہ تھی اس لیے خراش سی آگئی اور خون نکل آیا۔ یہ آس عداوت کا آغاز تھا جس کا خاتمہ فیروز الدین شاہ جلال الدین کے قتل پر ہوا۔ اسی طرح ایک دوسرا قصہ وہ یہ بیان کرتا ہی کہ علاء الدین نے ملک کافور کو ۱۳۱۰ء میں سیلون پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا وہاں اس نے مشہور بُت رام لنگ مہادیو کی کو توڑ ڈالا۔ سپاہیوں نے کوئی مدافعت نہ کی لیکن وہاں کے برہمنوں نے جو گو صاحب شمشیر نہ تھے جنگ کی لیکن وہ یا تو سب کام آئے یا گرفتار کر لیے گئے۔

اس زمانہ کی بعض عیش پسندیوں کا بھی پتہ چلتا ہی۔ جنمیں چھوٹے چھوٹے سلاطین تک مبتلا تھے۔ غیاث الدین محمد خلجی مانڈوی نے اجین کے قریب ایک عیش باغ بنوایا تھا جس میں ہرن پلے تھے۔ ہر چہار فرسنگ پر ایک عمارت بنی ہوئی تھی جس میں ایک احاطہ ہوتا تھا۔ کمرے فرش فروش اور دیگر سامان آرائش سے مزین رہتے تھے، گھوڑوں کے لیے اصطبل، خورد و نوش کی تمام اشیا، عورتیں، خدمتگار، پہرہ دار غرض تمام سامان عیش ہر وقت موجود رہتا تھا جس چیز کو جی چاہتا، حاضر ہو جاتی۔ احاطہ میں ہر قسم کے جانور رہتے تھے جنکا سلطان شکار کرتا، ان صیدگاہوں میں وہ اپنی بیگمات کو ساتھ لیکر جاتا جن کے ساتھ وہ چوگان یا شکار کھیلتا۔

محمود ثالث گجراتی نے اس سے کچھ زیادہ کیا۔ اس نے بھی اسی قسم کا ایک عیش باغ بنوایا تھا۔ وہ درختوں کے تنوں کو رنگین کپڑوں سے منڈھوا دیا کرتا جو سال میں دو بار بدلے جاتے تھے۔

مشہور ہے کہ ہندوستانی مسلمان مُسکرات کے بہت عادی ہوتے تھے۔ نصیر الدین قادر شاہ

مانڈوی نے ایک دن اپنے محل میں شراب پی اور نشہ میں آکر ایک تالاب میں گر پڑا۔ اس کی بیگمات میں سے چار نے اسے کھینچ کر نکالا اور اس کی جان بچالی جس کا اسے کچھ بھی علم نہ ہوا لیکن جب سلطان ہوش میں آیا اور اس کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو اس نے ان چاروں کو مروا ڈالا۔ ایک دوسرے شخص کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ہلال کی طرح مہینہ میں ایک مرتبہ سنجیدہ و باحواس نظر آتا تھا۔ رستم خاں ایک امیر نے شراب پی اور ایک تالاب میں جا بیٹھا۔ اس نے اپنے ایک نوکر کو دیکھا۔ آواز دی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر پانی میں لے ... را۔ بیچارے اٹھایا اور خیال کیا کہ ہنس رہا ہے اور اس کے ساتھ مذاق کرنے لگا۔ اس نے بیچارے پانی میں دبا یا یہاں تک کہ وہ ڈوب گیا اور جس وقت اس کے منہ اور دانت کھلے ہوئے دیکھے اس نے یہی سمجھا کہ وہ ہنس رہا ہے۔ بالآخر اسکی دیر تک کی خاموشی سے اسے اپنی حرکت کا علم ہوا۔ اس کی سزا میں اس نے دو چند دیت ادا کی لیکن چونکہ متوفی کا کوئی وارث نہ تھا اس نے زر دیت غربا میں تقسیم کر دیا۔

بظاہر یہ سلاطین حد سے زیادہ محتاط ہوتے تھے بالخصوص اس وقت جبکہ ان کے مفاد کا معاملہ ہوتا تھا۔ محمد بن ابراہیم جونپوری نے گجرات کے سلطان سے اجازت چاہی کہ کالپی پر قبضہ کرے اس لیے کہ وہاں کے حاکم نے کافروں سے شادی کر کے قانون شریعت کی خلاف ورزی کی تھی۔

گجرات کے امرا اسقدر مغرور تھے کہ اپنے سے بالاتر حکام کی ماتحتی پسند نہیں کرتے تھے تاوقتیکہ وہ حکام خاص طور پر مشہور نہوں لیکن انہیں سلطان کے ایک غلام کے زیر علم کام کرنے میں بھی کوئی عذر نہو تا وہ ہمیشہ مسلح رہا کرتے تھے۔ مظفر شاہ کے عہد میں یہ دستور تھا کہ اولاد نوکروں کی حیثیت میں رکھے جاتے تھے۔ وہ لکڑی اور گھاس لاتے، پانی کھینچتے یا گھوڑوں کی دیکھ بھال کرتے تھے جب وہ بڑے ہوتے تو ان کی شادی رشتہ داروں میں ہوتی تھی۔ اس عرصہ میں انہیں سُرمہ لگانے کی اجازت نہ تھی، نہ وہ پان کھا کر لب کی سُرخی دکھا سکتے تھے نہ اجنبی یا اپنے سے بڑے اشخاص کی صحبت میں رہ سکتے تھے اور نہ عورتوں سے میل جول رکھ سکتے تھے۔ الدبیر

نے لکھا ہے کہ جس شخص نے اس سے یہ رسم بیان کی وہ ایک سوال کے پوچھنے پر نکال دیا گیا تھا۔ اس نے ایک دن ایک شخص کو نوکروں کے لباس میں دیکھا، دوسرے دن وہی شخص ایک بڑے امیر کی پوشاک میں نظر آیا۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے وقت میں یہ رسم نکلی تھی۔

وہ زمانہ گو بہت ہی پرآشوب تھا لیکن لوگوں میں حسنِ اخلاق کا احساس باقی تھا۔ ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک شخص ایک امیر کے مکان میں مار ڈالا گیا۔ جب قاتل نے پھانسی پائی تو کسی نے یہ کہا اگر انھوں نے اسے سربازار مار ڈالا ہوتا تو کوئی کچھ نہ کہتا لیکن یہ نہایت شرم کی بات ہے کہ اسے اپنے وطن کے اندر مارا گیا، ذمّی کو اپنے حقوق کے مطالبہ کا حق حاصل ہے۔ خانہ جنگیوں میں قیدیوں کے مار ڈالنے کا دستور نہ تھا لیکن چنگیز خاں نے اس رسم کو توڑا۔ بہرحال مورخ مذکور نے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے جس میں ایک شخص کی جان بخشدی گئی اس لیے کہ اسکے اور گرفتار کرنے والے کے درمیان برادرانہ تعلقات تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عمل اور نظریہ میں تطابق ہونا ضروری نہیں۔ یہ دربار کے حلقہ سے باہر کی زندگی کی چند تصویریں ہیں ۱۳۰۰ء میں محمود مانڈوی ایک مقام پر آیا جو ہندو گر کے نام سے موسوم تھا۔ یہاں کے لوگ سیاہ فام اور پست قد ہوتے تھے۔ ان کے کپڑے بہت اُٹنگے ہوتے تھے یا ان کے الفاظ میں "آگے کی جانب چھوٹے ہوتے ہی تھے پیچھے کی جانب تو آگے سے بھی آدھے ہوتے تھے"۔ مرد اور عورت دونوں ایک ہی لباس پہنتے تھے۔ جہاں کہیں سلطان کا قیام ہوتا، وہ لوگوں کو کھانے، کپڑے عطا کرتا اور انھیں زر وسیم بھی دیتا تھا۔ وہ بھی اس سے محبت کرنے لگے تھے اور ہاتھی اس کی نذر کرتے تھے جو وہاں عام طور پر پائے جاتے تھے چونکہ وہ ان سے بہت زیادہ خوش ہوتا تھا اس لیے جو کچھ انھیں شکار میں ہاتھ آتا تھا، وہ اُسے دیدیتے تھے۔ سندھ کے قریب جو جزائر تھے ان میں کچھ لٹیرے بستے تھے۔ دکن میں چند ایسی قومیں آباد تھیں جو اپنے کو مسلمان کہتی تھیں لیکن حقیقت میں وہ اس مذہب سے ناواقف تھیں۔ اس لیے کہ وہ کافروں سے دوستی رکھتی تھیں اور باہم شادی بیاہ بھی کرتے تھے۔

۱۵۰۵ء میں کچھ لوگوں نے جو راجپوت کہلاتے تھے، ایک بڑے حاکم کو مار ڈالا۔ یہ لوگ

گاؤں میں بستے تھے اور تمبیوں کی طرح تھے صرف فرق یہ تھا کہ ان کے پاس گھوڑے ہوتے تھے، وہ اپنی سواری کے لیے گھوڑیاں رکھتے تھے۔ اس جرم کی سزا میں وہ یا تو ترک وطن پر مجبور کیے گئے یا مار ڈالے گئے۔ اسی سلسلہ میں مصنف کی یہ رائے بھی نقل کر دینے کے قابل ہے کہ وہی گھوڑا جنگ کے سرد گرم برداشت کرنے کے لیے مناسب ترین جانور ہے۔ کسی موجودہ مصنف کی رائے ہے کہ عرب نیزے سے سوروں کے شکار کے لیے بہترین فادر انداز سوار ہوتے ہیں جب اکبر نے برہم پور پر چڑھائی کی تو اس وقت ان راجپوتوں نے شکست خوردہ فوج کو راستہ میں جالیا اور خوب اچھی طرح لوٹا، یہاں تک کہ خود ان کی شہرت اس دولت کی وجہ سے بڑھ گئی۔

محمد جونپوری نامی ایک شخص ۱۴۹۰ء کے قریب احمد آباد میں آیا اور ایک مسجد میں ٹھہرا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے صوم وصلوٰۃ اور وعظ و پند سے اعتبار حاصل کیا، اس کے بعد مہدی ہونے کا دعویٰ کر بیٹھا۔ ایک بزرگ نے اس سے ملاقات کی اور اگرچہ ان کے مابین گفتگو آیات قرآنی کے ذریعہ تھی، اس نے ان کے متعلق یہ رائے قائم کی کہ "وہ عوام سے برگزیدگان الٰہی کی زبان میں بولتا ہے، اس کا عمل قول کے مطابق نہیں، لوگوں سے ان کی سمجھ کے مطابق بات کرو مجھے معلوم ہے کہ اس کے مقلدین فتنہ و فساد برپا کریں گے" اس کے معتقدین اسے مہدی کہتے تھے اور تھوڑے ہی عرصہ میں ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہا جہاں اس کے مقلد نہ پائے جاتے ہوں۔ جو اس پر ایمان نہ لاتے اُن پر وہ کفر کا الزام لگاتے تھے۔ ان کا قتل کر ڈالنا روا سمجھتے تھے۔ وہ بالکل اسماعیلی فرقہ کی طرح تھے۔ محمود ثالث (۱۵۳۷ء سے ۱۵۵۳ء) نے انھیں گجرات سے نکال باہر کر دیا۔ اکبر کے عہد میں ایک افسر سنجر خاں نے انھیں ایک دعوت پر بلایا اور سب کو قتل کر ڈالا۔ خود محمد نے لوگوں سے وعدہ کیا کہ اگر وہ خدا کو دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ ان کو ان جسمانی آنکھوں سے دکھائے گا۔ بہرحال اس نے ہندوستان چھوڑا اور خراسان جاتے ہوئے قندھار میں مار ڈالا گیا۔

خلیفہ مستنصد نے ۱۴۶۶ء میں محمود شاہ خلجی مانڈوی کو خلعت بھیجا اس کے بعد سلطان کو نجم الدین الکبریٰ کا لبادہ بھی عطا کیا گیا جو خوارزم میں تاتاریوں کے ہاتھ شہید ہو گئے تھے۔ اس کی برکت سے اسے فلاح دارین حاصل ہوئی۔ ۱۵۰۹ء میں چنگیز خاں نے احمد آباد میں محرم کے مراسم ادا کیے۔ شہر کے لوگ چونکہ سنی المذہب تھے اس لیے اس کا یہ فعل اچھی نظروں سے نہ دیکھا گیا۔

ایک عجیب و غریب قصہ اس طرح پر بیان کیا جاتا ہے، نورالدین علی بن حسن الدین ایک بزرگ مکہ سے آئے سلطان ان کی تمام ضروریات کا خود کفیل ہوا۔ نماز کے لیے سلطان نے جس طریقہ سے وضو کیا، وہ ان کو پسند نہ آیا اور خود کر کے بتایا اور کہا کہ تم شیطان کے دھوکے میں آ گئے۔ اس کے بعد پھر وہ مکہ لوٹ گئے اور سلطان کی فیاضی سے انھوں نے وہاں اپنے معتقدین کے لیے ایک خانقاہ کھولی جس میں محتاجوں کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔ ان کی شہرت قسطنطنیہ تک پہنچی اور سلیمان نے ان سے التجا کی کہ آپ دعا کیجیے اور پھر اپنی حاجت بیان کی۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ پھر ہندوستان آئے اور سلطان سے عرض کیا کہ میں آپ کے وزرا کے اعمال کے احتساب کے لیے آیا ہوں، تاکہ ان کو میزان شریعت میں تولوں۔ سلطان ممنون ہوا اور تمام ضروری اختیارات انھیں تفویض کیے اس کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس پر وزرا بہت بدل ہوئے اور نظام حکومت رک گیا۔ بہرحال کسی طرح اُن وزرا نے انھیں ایک تحفہ قبول کرنے پر آمادہ کیا اور پھر اس کے بعد سلطان کے ہاں جا کر یہ الزام لگایا کہ انھوں نے رشوت لی ہے۔ سلطان اس پر بہت خفا ہوا اور وزرا کو پھر انکے اختیارات سپرد کیے۔

ایک ایسے شخص کا بھی ذکر ہے جو اللہ ہو کرتے کرتے دیوانہ ہو گیا تھا

مکہ معظمہ کو ہندوستان سے خاصی آمدنی ہوتی تھی۔ مظفر شاہ (۱۵۱۱ء سے ۱۵۲۶ء) نے وہاں ایک مدرسہ اور ایک تالاب بنوایا اور طلبہ، اساتذہ اور دیگر متعلقین کے مصارف خود دیتا تھا۔ اس نے ایک جہاز، کپڑے دو قرآن شریف اور انکے دو اجزا اور طلبہ کے لیے اوقاف جاری کیے۔ محمود نے (۱۵۳۷ء سے ۱۵۵۴ء) قندہار کو جس کی آمدنی ایک لاکھ اشرفیاں تھیں، مکہ مدینہ کی

...کر دیا۔ رقم کے ساتھ بیل اور کپڑا بھی شاہی جہاز میں بندرگاہ لایا جاتا تھا جہاں انھیں کوئی محصول نہیں ادا کرنا پڑتا تھا۔

ضلع بنیتہ واقع گجرات میں جو ملک گجرات کا ایک چوتھائی حصہ بیان کیا جاتا ہے۔ مگر اس کے نسل کے راجپوت رہتے تھے۔ بتایا یہ جاتا ہے کہ تنہا یہ ضلع ۵ ہزار سوار فراہم کر سکتا تھا، لہذا وہاں سے راجپوتوں کا اخراج کیا جانا طے پایا اور اس طرح اسلام کی رونق پھیلی۔ چنانچہ اس کے لیے حکم صادر ہوا، لیکن راجپوت جنگ پر آمادہ ہو گئے۔ سلطان نے حکم دیا کہ انھیں قتل کر ڈالا جائے یا جلاوطن، لیکن ملازمین ہاتھوں پر داغ کر کے چھوڑ دیے گئے تاکہ وہ قتل نہ کیے جائیں۔ سلطان نے ہولی اور دیوالی کی رسومات ادا کرنے اور تعمیر مندر کی ممانعت کر دی تھی۔ اسطرح پر اسلام کو وسعت دی گئی۔ لیکن آخر شش تمام حالات بدستور سابق ہو گئے۔ کافروں نے سلطان محمود کے قاتل کا ایک بت بنایا اور اسکی پرستش کرنے لگے۔

رسم کے مطابق مظفر شاہ ثانی کے مقبرے پر ایک چھتر نصب کر دیا گیا تھا۔ اکثر رفاہ عام کے کاموں کا بھی ذکر ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ سنہ ۱۴۴۳ء میں مقام شاہدی آباد ایک شفاخانہ تعمیر کرایا گیا جس میں ڈاکٹر (اطبا) مقرر کیے گئے اور اس کے مصارف چند مواضع کی آمدنی سے کیے جاتے تھے۔ قتل و خونریزی کی داستان میں احمد آباد کی شان و شوکت کا کچھ ذکر کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ احمد شاہ نامی ایک شخص سلطان احمد کے مقبرہ سے کچھ ہٹ کر ایک کنج میں مدفون ہوا۔ اس کی قبر ہر چہار طرف ترشے ہوئے جالیدار پتھروں کے پردے سے گھری ہوئی تھی۔ مردوں کی یہ آرامگاہیں ہمیشہ محفوظ نہیں رہا کرتی تھیں، اس لیے کہ ابراہیم مرزا (سلطان حسین خراسانی کی اولاد سے) کے پیادے اکثر سرکیج کی قبروں کی تعمیرات چرا لیا جایا کرتے تھے۔

لہ و لہ سلاطین ہند کے اس قسم کے امتناعی احکامات کی تحقیق کرنے سے ثابت ہوا ہے کہ تاوقتیکہ کوئی سیاسی سازش یا تحفظ عام کا اور کوئی خطرہ اس کے اندر مخفی نہ ہوتا تھا، وہ رعایا کے مذہبی معاشرتی معاملات میں دخل نہیں دیتے تھے۔" وسعت اسلام اور رونق اسلام" میں ان تدابیر سے جو مدد پہنچی، وہ خود اپنے ثبوت کی محتاج ہے۔ (مترجم)

محمود جو سلاطین مالوہ کا آخری چراغ تھا، اپنے ہندو وزیر رائے مانڈی پر بہت اعتماد رکھتا تھا اور یہ اعتماد اسوقت سے اور بڑھ گیا تھا جب سے اس وزیر نے محمد بن ناصر الدین پر جو دہلی کی لشکر کا سپہ سالار رہا، فتح حاصل کر لی تھی۔ وزیر نے جہاں تک ممکن ہو سکا تمام مسلمانوں کو عہدوں سے ہٹا کر ہندوؤں کو ان کی بجائے مقرر کیا۔ اس کے وقت میں بجز باڈی گارڈ کے شاید ہی کوئی اور مسلمان سپاہی رہا ہو۔ رائے مانڈی جو چاہتا کرتا، اس نے مندر بنوائے اور اس کے زمانہ میں ہندو مذہب سرعت سے پھیلا۔ بعض حبشی سپاہیوں نے اس سے ناراض ہو کر بغاوت کر دی لیکن ہندوؤں کو نقصان عظیم پہنچانے کے بعد شکست کھا گئے، پھر تو وزیر کے فخر و ناز کی کوئی حد نہ رہی۔ خود سلطان کے معزول کرنے کی گفتگو بھی ہونے لگی لیکن پھر صلح ہو گئی۔ اس کے بعد ہی سلطان نے کسی طرح اس کو مروا ڈالا۔

موضوع گفتگو اب ذرا بدل دینا چاہیئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۵۴۰ء میں ڈیو کا قلعہ پرتگیزیوں کے ہاتھ میں تھا اور بندرگاہ سلطان کے قبضہ میں۔ پرتگالی جہازوں کے ساتھ کوئی مداخلت نہ کر سکتے تھے بلکہ اس کے عوض انھیں بندر کے محصول کا نصف حصہ ملتا تھا۔ اگر ضرورت ہوتی تو قلعہ کی فوجیں بھی سلطان کے صوبہ دار کے زیر حکم آ جاتی تھیں۔

ایاز جو علاقہ سواحل کا حکمراں تھا کوئی جہاز سمندر میں جانے نہ دیتا تاوقتیکہ وہ محفوظ طور پر لدا نہ ہوتا اس کے زمانہ میں جہازات صرف یورپ سے بغرض تجارت بندر تک آتے تھے۔

مصنف نے محصولوں کے متعدد حوالے دیے ہیں جن پر وہ خود متحیر ہے۔

مانڈو قبضہ ہو جانے کے بعد ہمایوں سر تا پا سرخ پوشاک میں ملبوس ہوا۔ یہ مغلوں کے ہاں ایک رسم تھی اور اس بات کی علامت سمجھی جاتی تھی کہ اب قتل عام کی اجازت ہے۔ لیکن یہ خونریزی اس طرح رکی کہ ایک مغنّی شہنشاہ کے حضور میں بلایا گیا اور بہ اصرار اس سے گانے کے لیے درخواست کی گئی نتیجہ یہ ہوا کہ شہنشاہ محظوظ ہو کر سرخ لباس بدل سبز پوش ہو گیا جو امن عامہ کی دلیل سمجھی گئی اس مغنی کا نام بجھو تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ سلطان کا نشہ بھنگ اور

نیون کے ایک مرکب سے جس میں سانپ کا خون شامل ہوتا تھا تیار کیا جاتا تھا۔ جب اسے زہر دیا گیا تو اس نے صندل کا ایک مرکب مانگا جس کی خاصیت ٹھنڈی ہوتی ہے۔

یہ بھی دستور تھا کہ لوگ تیل کے حمام میں بیٹھا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ موسم سرما میں ایک بسی (یا پلاؤ، اس لفظ کے جو معنی ہیں) کھانے کے بعد ایک ایسے ہی حمام میں داخل ہوا۔ اتفاق سے اس کا پاؤں پھسل گیا اور قبل اس کے کہ وہ نکالا جائے وہ بہت سا تیل پی گیا۔ باوجود علاج کے وہ جانبر نہ ہو سکا۔

ایک شخص بہت ہی عیاش تھا اور قوت کے لیے وہ ہر روز ایک مثقال ورق طلا استعمال کرتا تھا۔ اس نے اس کو اسقدر کمزور کر دیا کہ وہ نہ اسلحہ پہن سکتا، نہ دیر تک گھوڑے پر بیٹھ سکتا۔ اور نہ رکاب میں پیر رکھ سکتا تھا۔ ہمارے نزدیک اس کا کچھ اور سبب ہے۔ اس کے بہت سی عورتیں تھیں جن سے بیس لڑکے تھے اور ایک لڑکی۔ اگر اس کے کوئی لڑکی پیدا ہوتی، تو دایہ فوراً اس کا گلا گھونٹ دیتی اور اس کے صلہ میں اسے تین مثقال سونا ملتا۔

ایک الوداع کا ذکر اس طرح پر کیا گیا ہے۔ اس نے اس پر آب زعفران چھڑکا، خوشبو لگائی، ہندوستانی دستور کے مطابق پان دیا اور الوداع کہا۔ بعد کی تشریح سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زعفران کو شادی سے کچھ نہ کچھ تعلق ہے، کہیں اور یہ مذکور ہے کہ ایک طبیب اپنے ہمراہ زعفران لے آیا۔ امراء میں پان کا استعمال بہت تھا اور جنگ یا یا دالی سے قبل خوشبو لگایا کرتے تھے۔

جنگ میں افسر چہروں پر نقاب ڈالتے تھے۔ صرف چند سپاہی پورے طور پر مسلح رہتے تھے ایک فوج میں صرف ایک حبشی تمام اسلحے پہنے ہوئے تھے۔ باقی سپاہی نہ تو وردی پہنے ہوئے تھے اور نہ ان کے جسم پر کوئی ہتھیار تھا۔ کسی جنگ میں ایک فریق کے پاس توپ تھی جس میں سے لیمو کے برابر گولے پھینکے جا سکتے تھے۔ اور دوسری جانب جو وہ بندوقیں مختلف سماؤ کی تھیں۔ یہ تفصیلات گجرات کے خانہ جنگیوں کے سلسلہ میں ہاتھ آئی ہیں۔ اسوقت شین گن

کی قسم سے بھی ایک چیز ایجاد ہوئی تھی۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ مثل ایک گاڑی کے تھی جس میں بندوقیں قطار سے لگی ہوئی تھیں اور ایک کے داغنے سے سب ایک ساتھ چھوٹتی تھیں۔

سلطان محمود ہر سال جدہ سے ایک ہزار تلواریں منگایا کرتا تھا، نیز جنوبی ممالک مراکش مصر، اور دیلم سے بھی آتی تھیں۔ ان کی بہت سخت جانچ ہوا کرتی تھی۔ جو جانچ پر پوری اترتی تھیں، وہ اسلحہ خانہ میں رکھی جاتیں، اور چیزیں مثلاً چاقو اور تیر کے سرے خاص سلطان کے استعمال کے لیے آتی تھیں۔ تیر کا سر تلوار کے پھل کے برابر چوڑا ہوتا تھا، اور جنگلی جانوروں کے شکار کیلیے استعمال کیا جاتا تھا۔

اس کے ہاں اشخاص کی ایک ایسی جماعت رہا کرتی تھی جو 'شیر افگن' کے لقب سے موسوم ہوتے تھے۔ اگر کوئی شخص اس جماعت میں داخل ہونا چاہتا تو اس سے پہلے وہ ایک اکھاڑے میں آتا تھا جہاں ایک شیر کھول دیا جاتا تھا جس سے وہ لڑتا اور سلطان تماشا دیکھتا۔ اگر وہ شخص کامیاب ہوجاتا تو اس جماعت میں داخل کر لیا جاتا اور اس کو بڑی تنخواہ ملتی تھی۔ خاص اس غرض کے لیے بہت سے شیر پلے رہتے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہترین سپاہی باہر کے ہوتے تھے۔ یہ دیکھکر اس میں شبہ نہیں کہ ہر شخص کے دل میں یہی خیال پیدا ہوتا ہے (اگرچہ عموماً غلط ہی سہی) کہ ہندوستان غیر ملک والوں کے لیے ایک بہترین شکار گاہ تھا[1]۔ بیان کیا جاتا ہے کہ سورت میں ہر قوم کے لوگ مثلاً شریف ترکی، (حضر موت)، سرداران یمن، فضلائے حجاز، امرائے مصر اور تجار رہتے تھے۔ جب اکبر نے اسیر گڈھ کو فتح کیا تو اس کی فوج میں یمن کی یافعی قوم کی ایک جماعت بھی اپنے افسر کے ماتحتی میں تھی۔ برار اور مالوہ میں کچھ حبشی بھی ملازم تھے، گجرات میں اسوقت ایک ہزار سوار کا ایک عباسی لشکر بھی تھا

۱۵۴۶ء میں سلطان گجرات کو یہ صلاح دی گئی کہ وہ بارہ ہزار غیر ملکی ملوک کی ایک فوج مرتب

---

[1] اور اب بھی ہے۔ مترجم

کرسے جو وزدلے مفوضہ اپنے افسران کے ماتحت رہیگی۔ یہ لوگ یافنی، قہرہ، ترکی، حبشی، جاوا، اور یورپ سے آئے ہوئے تھے۔ وہ باڈی گارڈ اور خزانہ کے نگراں کا کام اور دیگر خفیہ فرائض انجام دیتے تھے۔ جب اکبر گجرات گیا تو فوجوں کی تعداد حسب ذیل تھی:۔

۱۲۰۰۰ مکمل مسلح سوار

۷۰۰	حبشی	۳۰۰	ترک
۴۰۰	جلیم	۶۰۰	غوری
۵۰۰	مغل	۵۰۰۰	سادات بخارا
۱۰۰۰۰۰	پیادے اور سوار	۳۰۰	ہاتھی
۵۰۰	پیتل کی بندوقیں	۱۲۰۰۰	معمولی پرانے قسم کی بندوقیں

۶۰۰ کو کبانز

مترجمہ سعید انصاری متعلم جامعہ

مطبوعات جدیدہ

تنبیہ الوسنان فی احکام رمضان

اس نام کی ایک کتاب جو مولوی شفیق الرحمن صاحب کاندھلوی کی تالیف ہے، بغرض تنقید وصول ہوئی ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس رسالہ میں صوم رمضان کے مسائل اور رویت ہلال، افطار، سحر، اعتکاف، تراویح، عید الفطر، صدقۂ فطر کے تمام احکام و فضائل پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ مسائل کی تمام تر فقہ پر بنیاد رکھی گئی ہے۔ صرف صلوٰۃ تراویح کی بحث میں جس میں اس کے جواز و عدم جواز اور آٹھ اور بیس رکعات کے نزاعی مسائل کی تنقیح کی گئی ہے۔ احادیث کی طرف بھی رجوع کیا گیا ہے۔ ان غیر ضروری اور مضر نزاعات سے قطع نظر کر کے جن کے لئے تقریباً پچاس صفحے وقف ہیں کتاب عامہ مسلمین کے لیے نہایت مفید ہے۔ اگرچہ حالت زمانہ مقتضی ہے کہ اس قسم کی کتابوں میں بھی تبلیغی پہلو نظر انداز نہ کیا جائے اور غیر مسلم کے لیے بھی ان کو موزوں بنایا جائے۔ حجم ۱۴۰ صفحے۔ تقطیع ۲۶ × ۲۰ طباعت متوسط درجہ کی۔ حاجی محمد محی الدین صاحب سوداگر کتب موچی بازار بنگلور سے ایک روپیہ پر مل سکتی ہے۔

ترقی

اس نام کا ایک ماہوار علمی رسالہ مولوی ابو المکارم محمد انوار اللہ صدیقی کے زیر ادارت حیدرآباد دکن سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ ساتواں نمبر بابت رمضان المبارک ہمارے سامنے ہے۔ کیا بلحاظ خوبی مضامین اور کیا بلحاظ نفاست طبع مدیر صاحب مستحق مبارکباد ہیں اشاعت ہذا میں نطشے، یا نیتشے یا نیچے مشہور جرمن فلسفی کا فلسفہ معاشرت رقم زدہ مولوی سید

داستان العلماء بی اے ، ابوالعلاء المعری مرتبہ مولوی جمیل الرحمٰن ایم اے ، اور حیات تمدنی از مولوی محمد مرتضیٰ مولوی فاضل نہایت قابل قدر اور عالمانہ مضامین ہیں۔ اگر ایسے اہل قلم ترقی کی مستقل اعانت جاری رکھیں تو کوئی شک نہیں کہ ترقی بہت جلد ادب اُردو کے بلند ترین زینۂ ترقی پر نظر آئیگا۔ معارضہ بر غزل غالب کے عنوان سے جو مراسلہ شائع ہوا ہے وہ ذاتی تو تو میں میں کے سبب سے ترقی کے روئے نیکو پر ایک بدنما دھبہ معلوم ہوتا ہے جس سے امید ہے کہ ہم آئندہ اسے پاک دیکھینگے۔ کاغذ ولایتی حجم ۵۶ صفحہ تقطیع ۲۰×۲۶ چندہ سالانہ صہ

ملنے کا پتہ:- دفتر رسالہ ترقی اندرون چادرگھاٹ حیدرآباد دکن۔

الفلاح

اس نام کا ایک مذہبی رسالہ مولوی غازی رحمت اللہ صاحب کے زیر ادارت اور انجمن اشاعت اسلام جالندھر کے زیر سرپرستی مہینہ میں دوبار شائع ہوتا ہے۔ اس کا مقصد اس آیت سے ظاہر ہے جو سرورق کا زیب سرنامہ ہے۔ ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر واولئک ھم المفلحون ۔ یعنی ارشاد و تبلیغ اس کا مقصد ہے۔ عموماً جوش تعصب اور سب و شتم اس مقدس فعل کے تقدس کو غارت کر دیا کرتا ہے مگر خوشی کی بات ہے کہ الفلاح اب تک اس آلودگی سے پاک ہے۔ غیر مذاہب کے ساتھ مباحثہ میں اس کا لہجہ شرافت و متانت کی حد سے متجاوز نہیں ہوتا۔ فرقہائے اسلام کے باہمی رواداری کا برتاؤ اور بے تعصبی و بلند نظری اس کے ایک مضمون اسلام اور مسلم رقم زدہ مولوی سید عبدالقیوم صاحب سابق اڈیٹر الاسلام سے ظاہر ہے جس کا مختصر اقتباس ناظرین جامعہ کی بصیرت و دلچسپی کے لیے درج ذیل ہے:-

"خدا تعالیٰ نے یا اس کی سچی الہامی کتاب نے کسی اسلامی فرقہ کا کوئی خاص نام نہیں رکھا۔ خدا نے سب کو مسلمان ہی کے نام سے پکارا ہے۔

مسلمان بھرے پڑے ہیں مگر وہ کسی مختص حیثیت یا امتیاز کے مدعی نہیں۔ اس جماعتی خصوصیت سے قطع نظر کر کے رسالہ اپنے مقاصد کی تکمیل میں قابل قدر سعی کرتا ہے اور ہر طرح مفید ہے۔ سالانہ چندہ للعہ، متوسط احباب سے ۔لے طلبہ سے ۔ حجم ۲۴ صفحے تقطیع ۲۰×۳۰ طباعت خفیف د کاغذ متوسط۔

رونق منزل امرتسر سے منگوایا جا سکتا ہے

"ناقد"

خواجہ عبید زاکانی

شیراز میں شاہ ابو اسحاق حکمراں ہے، فضلا، وشعرا راس کے دربار میں کھنچ کھنچ کر جمع ہو رہے ہیں۔ عیش وطرب، لہو ولعب، نغمہ وسرود سے شیراز کا ہر ہر کوچہ رشکِ فردوس بنا ہوا ہے۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ امن ومسرت کی زندگی سے لطف وکامرانی کی لذتیں اُٹھا رہا ہے کہ خاکِ شیراز سے ایک شخص خواجہ عبید زاکانی پیدا ہوتا ہے اور تحصیل علوم میں مشغول ہو جاتا ہے۔

چونکہ عبید زاکانی ایک غریب گھر کا لڑکا تھا۔ اس لیے تحصیل علوم کے بعد اس نے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کی خواہش کی اور ایک رسالہ علم "بیان ومعانی" کا مرتب کر کے لے گیا۔ جب وقت دربار میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس وقت بادشاہ کو فرصت نہیں ہے کیونکہ ایک مسخرہ آیا ہوا ہے اور وہ اس کے لطائف سے لطف اُٹھا رہا ہے۔

عبید زاکانی جسنے اپنی عمر کا بڑا حصہ تحصیل علوم وفنون میں صرف کر دیا تھا صرف اس امید پر کہ حکومت وسلطنت اسکی قدر کرے گی، بے انتہا متاسف وملول ہوا اور اسی وقت اُس نے اپنی زندگی کا ایک نیا ورق اُلٹ دیا۔ جس کی تمہید اُس کی اِس رُباعی کو سمجھنا چاہیئے۔

در علم و ہنر مشو چو من صاحب فن   تا نزدِ عزیزاں نہ شوی خوار چو من
خواہی کہ شوی قبول ارباب زمن   کنگ آور و کنگری کن و کنگرہ زن

اسنے لوگوں سے کہا کہ جب سلطان کا تقرب مسخرگی سے حاصل ہو سکتا ہے اور علما و فضلا کو کوئی نہیں پوچھتا تو دماغ کو دُود چراغِ مدرسہ سے خراب کرنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ اس کے بعض احباب نے سمجھایا بھی کہ علم وفضل بجائے خود اک عمدہ چیز ہے اور ضرورت نہیں کہ کوئی اس کی قدر کرے، لیکن اسنے اپنا خیال ترک نہیں کیا اور اپنے عزم پر اس قطعہ سے اک اور مُہر ثبت کر دی:۔

اے خواجہ مکن تا بتوانی طلب علم   کاندر طلب راتب ہر روزہ بمانی

رو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز   تا داد خود بستانی از کہتر و کہتر قہستانی

چنانچہ یہ اپنی بعد کی زندگی میں مشہور مسخرہ اور ہزل گو ہوگیا۔ چنانچہ خواجہ سلمان نے لکھا ہے کہ

جنمی و ہجا گو عبید زاکانی   مقرر است بہ بے دولتی و بے دینی
اگرچہ نیست ز قزوین و روستا زادست   ولیک می شود اندر حدیث قزوینی

ایک بار یہی خواجہ سلمان سفر میں تھے کہ عبید زاکانی اتفاقاً وہاں پہونچگیا۔ چونکہ سلمان نے اس سے قبل اس کو کبھی دیکھا نہ تھا، اس لیے پہچانا نہیں اور پوچھا کہ "تم کہاں سے آرہے ہو" اس نے جواب دیا کہ "قزوین سے" خواجہ نے دریافت کیا "تمھیں سلمان کے بھی کچھ شعر یاد ہیں" جواب دیا "ہاں"۔ اور یہ دو شعر پڑھے:۔

من خراباتیم و بادہ پرست   در خرابات مغاں عاشق و مست
می کشندم چو سبو دوش بدوش   می برندم چو قدح دست بدست

اس کے بعد کہنے لگا کہ خواجہ سلمان ایک فاضل بزرگ ہیں اور مجھے تعجب ہے کہ ایسے ندانہ شعر ان کے قلم سے کیونکر نکلے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشعار خواجہ کی بیوی نے لکھے ہیں اور اُسی کے حال پر زیادہ مطابق ہو سکتے ہیں۔ خواجہ سلمان سمجھ گیا کہ یہ عبید زاکانی ہے اور اس سے پوچھا کہ "تو زاکانی تو نہیں" اس نے پہلے تو انکار کیا اور پھر بتا دیا۔ خواجہ سلمان نے اسی وقت بہت کچھ انعام و اکرام دیکر اپنے ساتھ لے لیا اور آخر وقت تک اس کے رعایت کرتا رہا کہ مبادا پھر یہ کوئی ایسا ہی حملہ نہ کرے۔

یہ تھا عبید زاکانی کا وہ پہلو جس نے اُسے علماء و فضلاء کے زمرہ سے علیحدہ کرکے ہجا گو اور مسخرہ طبقہ میں شامل کر دیا۔ لیکن اگر نفس شاعری در رنگ تغزل کے لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کس پایہ کا شعر تھا اور اس کے کلام میں کسقدر حلاوت تھی۔ ہم یہاں اس کی ایک غزل لکھتے ہیں:۔

(۱) رسد بہ پستی ہرویت جمال بہ کمال | برد ز نکہت ہویت صبا نسیم بہ شمال

(۲) زند بہ تیر نظر غمزہ ات نشانہ بسر | کشد بگوشہ چشم ابروئیت کمان ہلال

(۳) تولی کہ آب حیات از لبت بود سائل | خوشا کسے کہ کند از لبت جواب سوال

(۴) صبا پریشتی زلفت نہاد در دم صبح | ہزار سلسلہ بر دست و پائے تا بہ زلال

(۵) فگندہ دربیاں ہر ہفت پردہ مردم چشم | بانتظار تو پیوستہ جائے خواب خیال

(۶) حرام گشت بغیر از جبینہ در شفقت | بشاعران تخیل نمائے سحر حلال

نیاز فتحپوری

یاد ایام

از رشحات فکر حضرت مسیح الملک شیدا دہلوی

یاد ایامے کہ فریاد و فغانے داشتم | ہر در دسینہ سوزاں زبانے داشتم

یاد ایامے کہ من از بہر تقدیم نیاز | ہم جبینے داشتم ہم آسمانے داشتم

آن شب مہ شد کجا یاراں کہ یاد سنبلے | زلف پیچانے در دے زر فشانے داشتم

از کمین بر جست برق ناگہاں آتش بسوخت | گرچہ من از کنج گلشن آشیانے داشتم

چوں تو اکنوں بنگری دل از خزانہ پیش نیست | پیش ازیں آرزو دردے جہانے داشتم

زیں نیفتادم بہ دام آرزو مرغ مراد | داشتم یارے و لے نا مہربانے داشتم

صہبائے عشق

(تازہ غزل حضرت مولانا حسرت موہانی)

محمل نشین ذرہ جو لیلائے عشق ہے | سوز و گداز مذہب دنیائے عشق ہے

مستی ہی اصطلاح محبت میں آگہی | بیگانہ خرد ہے جو دانائے عشق ہے

کیوں ایک بار ہو نہیں جاتے نثارِ حسن؟ ہر دم یہی دلوں سے تقاضائے عشق ہے
کونین سے ہے خاطرِ عشاق بے خبر کس درجہ تیز نشۂ صہبائے عشق ہے
ہو بندگانِ حرص و ہوا کو تلاشِ عقل جو طالبِ کمال ہے شیدائے عشق ہے
پاتا ہے نورِ حسنِ رُخِ حق سے اُس کا نور روشن جو دل میں شمعِ تجلائے عشق ہے

حسرت کو پائے بندیٔ ایماں سے کیا غرض
وہ کافرِ جمال ہے ترسائے عشق ہے

معیارِ فضیلت

نظم ذیل مولانا تمنا عظیم آبادی نے اپنے ایک معزز عزیز، خلف الرشید سجادہ نشین خانقاہ عمادی مجیبی پٹنہ کی رسم دستار بندی کی تقریب میں پڑھی تھی۔ نظم تو ہنگامی ہے مگر شاعر نے اس موقع پر رسمی مدّاحی و سخن آرائی کے عوض مواعظ و حقائق کے جو پھول کھلائے ہیں ان کی مشام نوازی سے ہم ناظرینِ جامعہ کو محظوظ کیے بغیر نہ رہ سکے۔ مدیر

دستور ہے جب باندھیے دستارِ فضیلت لیکن نہیں دراصل یہ معیارِ فضیلت
سودائے عمل و علم کا یاں چاہیے سر میں پگڑی سے نہیں گرمیٔ بازارِ فضیلت
حاجت تو نہ تھی کچھ کہ بندھے نام کی پگڑی تو آپ ہے اک گوہرِ شہوارِ فضیلت
تو تو کرم و فضل کی گود دل میں پلا ہے بچپن سے ہے تو محرمِ اسرارِ فضیلت
مدت سے ترا کوچہ ہے مرجع فضلا کا صدیوں سے ترا گھر ہے چمنزارِ فضیلت
یہ سب تو ہوا، تو مگر اس کو بھی سمجھ رکھ اٹھتا کوئی آسان نہیں بارِ فضیلت
تکلیف اٹھانی ہے تو کر سیر یہاں کی گلزار نہیں وادیٔ پُرخارِ فضیلت
اب خانقہ و مدرسہ ما وا نہیں اس کا اب جیل میں ہے گرمیٔ بازارِ فضیلت

موقع ہو اگر جان بھی دو راہِ خدا میں — ثابت ہو حقیقت میں سزاوارِ فضیلت
باندھو دین داروں سے عمامہ تم اس وقت — سردار بنو ہے کے سرِ دارِ فضیلت
کر دین کی خدمت کہ فضیلت ہے اسی میں — مخدوم ہو ہر خادمِ دربارِ فضیلت
افضل ہے وہ دراصل جو افضل ہے عمل میں — ہے علم میں شیطاں بھی سزاوارِ فضیلت
ہے منکسر و عاجز و مخلص کا اسے کوچ — خود بین متکبر نہیں درکارِ فضیلت
فخر اس پہ نہ کرنا جو ہوا عالم و فاضل — ذلت کا سزاوار ہے فخّارِ فضیلت
گر نخوتِ علم اس کی ہر اک تہ میں بھری ہے — شیطان کا دھوکہ ہے یہ دستارِ فضیلت
ہو جس کی فضیلت ختمِ دستار کی پابند — ننگِ عمل و علم ہے اور عارِ فضیلت
کی قدر نہ اس کی تو یہ دستار نہیں ہے — لپٹا ہے سر و دوش سے اک مارِ فضیلت
بن جائے جو تو شمعِ ہدیٰ کسبِ عمل سے — خود منہ پہ برسنے لگے انوارِ فضیلت
خود مست ہو اوروں کو بھی کر مستِ بادہ سے — اے بادہ کشِ خانۂ خمّارِ فضیلت
دیتا ہے دعا تجھکو تمنائے بھی خواہ — ہو ذات تری شمعِ شبِ تارِ فضیلت

قطعہ

کسے را نہ حاصل شد اے ہوشمند — بہ عمامۂ علم و بدستارِ فضل
بجہل است فضل از عمل علم را — عمل کن عمل بس بدستارِ فضل

شذرات

'جامعہ' کا یہ چھٹا نمبر ہے، اس طرح ایک ششماہی جو مرنے رسالے کے لیے پر خطر زمانہ ہوتا ہے وہ پورا کر چکا ہے۔ چھ مہینہ کی مدت رسائل و اخبارات کے لیے (جن میں سے بعض ایک صدی سے زائد عمر پا چکے ہیں اور بظاہر ابھی مدتوں زندہ رہنے والے ہیں) کچھ بڑی بات نہیں، اس کو نہ عالم طفلی کہا جا سکتا ہے اور نہ عہد جوانی بلکہ ہندوستانی آب و ہوا کے اعتبار سے تو ایام شیر خوارگی بھی اس قلیل عرصہ میں ختم نہیں ہوتے اس لیے کہ ہندوستانی صحافت جس دور سے آج گذر رہی ہے وہ اپنی گوناگوں مشکلات اور نئی نئی دقتوں کے باعث ہنوز منزل اول بھی طے نہیں کر سکی ہے کتنے ہی اخبار و رسائل ایسے جاری ہوئے جنکے عدم اور وجود کی تمیز ہی نہ ہو سکی اور جو امتحان میں پورے اترے بھی تو آگے چند قدم نہ چل سکے۔

جن رسائل نے اپنے مقاصد اور اپنے مضامین کو عام سطح سے کسی قدر بلند رکھنے کی کوشش کی اون کو زیادہ تر دو قسم کی دشواریوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اول مضمون نگاروں کی کمی اور دوسرے پبلک کی بے توجہی۔ جامعہ کو بھی ان ہی دقتوں کا سامنا تھا، لیکن اُس نے اپنے مضمون نگار خود ہی پیدا کرنے کی کوشش کی اور پبلک کی توجہ و قدردانی سے اُس وقت تک بے نیاز رہنے کا قصد کر لیا کہ صاحبان ذوق خود ہی 'جامعہ' کے ناچیز خدمات کی قدر افزائی پر آمادہ ہوں۔ چنانچہ 'جامعہ' کو بفضل خدا اس طرح پوری کامیابی ہوئی جس کی بڑی وجہ اُس قومی تعلیم گاہ کا تعلق تھا جس کی مقبولیت و عزت ملک میں مُسلم ہے۔

'جامعہ' کو معاصرین کرام اور ہندوستان کے علمی حلقوں میں جس نظر سے دیکھا گیا اُس کا اندازہ کسی قدر اُن تحریرات سے ہوتا ہے جو اس عرصہ میں مختلف اخبارات و رسائل میں بہ سلسلہ تنقید شائع ہوئی ہیں۔ بعض بزرگوں کے نزدیک 'جامعہ' کو عام رسائل کے خلاف کسی خاص مبحث کو اپنا کر لینا چاہیے

تاکہ اس کے لیے امتیازی شان ہو سکے۔ اس نیک مشورہ کو ہم نے شروع ہی سے اپنے پیش نظر رکھا ہے اور اگرچہ جن خصوصیات کے قایم کرنے کو دل چاہتا ہے اُن کو اپنی موجودہ بے بضاعتی کے باعث ابھی تک شروع نہیں کیا لیکن رسالہ کی ترتیب اور اُس کی بنیاد ابتدا ہی سے اُس طرز پر رکھی گئی ہے جو یقیناً جامعہ کے لیے مخصوص ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کا آرگن ہونے کی حیثیت سے رسالہ جامعہ کی خصوصیات وہی ہوسکتی ہیں جو اس قومی درسگاہ کی ہیں، اور اگر اُن کو مختصراً شمار کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آزاد قومیت اور اشاعت علوم ہی دو اصول ہیں جنکے ماتحت جامعہ ملیہ اپنی کوششوں کو جاری رکھنا چاہتی ہے اس اعتبار سے ہمارا مقصد بھی ترقی تعلیم کے ساتھ ہی قومی نصب العین اور اُس کے اہم پہلوؤں کو جو موجودہ حالات میں اکثر تبدیل ہوتے رہتے ہیں پیش نظر قرار پائے گا۔ چنانچہ رفتار تعلیم کے نام سے ایک مستقل عنوان قایم کر دینے کے علاوہ ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ ہر نمبر میں کوئی معقول تعلیمی مضمون شائع ہو، نیز قومی و سیاسی مضامین کے لیے بھی خاص اہتمام کیا گیا اور کوشش کی گئی کہ مضامین اپنی اہمیت و افادہ کے لحاظ سے ممتاز ہوں۔ چنانچہ مسئلہ ترکی پر بعض قابل قدر و پُر از معلومات مضامین کافی مقبول ہوئے۔

ہماری یہ جسارت بھی قابل ذکر ہے کہ اکثر اہم مضامین کئی کئی نمبروں میں شائع کئے گئے اور ایسا تو بہت ہی کم ہوا کہ ہمارے مضامین صرف چار یا چھ صفحات پر ختم ہوئے ہوں بلکہ بعض اوقات پورا ایک جزو ایک مضمون کے لیے وقف کرنا پڑا۔ طویل و مسلسل مضامین جو کئی کئی نمبروں میں ختم ہوں ملک میں مقبول نہیں اور بالعموم دوسرے ممالک میں بھی اون سے اجتناب کیا جاتا ہے اور صرف وہی رسائل اوس کے شائع کرنے کی ہمت کرتے ہیں جن کا حجم اسقدر ہوتا ہے کہ وہ اس کو ایک دفعہ ہی شائع کر سکیں ہم کو اعتراف ہے کہ رسالہ کے حجم کا لحاظ کرتے ہوئے یہ کوشش ہماری حدود سے خارج تھی۔ لیکن اس قسم کے مضامین کی اہمیت و ضرورت نے ہم کو مجبور کر دیا کہ اگر یہ خدمت اس وقت دوسرے رسائل انجام نہیں دے سکتے تو باوجود کمی ضخامت ہم کو اپنے سر لینا چاہیے

اور یہی وجہ سلسلہ وار مضامین کی اشاعت کی ہوئی۔

لیکن بعض خصوصیات کو ہم اس وقت تک اپنے رسالہ میں پیدا نہ کر سکے اون کی کمی بھی بار بار محسوس ہوتی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہندوستان کے بعض اہم مسائل پر خصوصی مضامین و علمی مباحث کا ایک سلسلہ شروع کیا جائے نیز اقتباسات کا مستقل عنوان ہو جو دوسرے ممالک کے اہم ترین مباحث، اور ذہنی و علمی ترقیات کا آئینہ ہو، اور سیاسیات ملکی پر ہر مہینہ ایک جامع تبصرہ کی ضرورت ہے جو واقعات حاضرہ کی صحیح قومی حیثیت کو پیش کر سکے۔

یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ "جامعہ" نے ادبی خدمت میں نمایاں حصہ نہیں لیا اور جن معاصرین نے بالخصوص ادب و زبان اُردو کے خدمت اپنا مقصد قرار دیا ہے اُن کی کافی اعانت نہ کر سکا محض نظموں یا خالص ادبی مضامین کی اشاعت نہ سہی خدمت ادب کے دوسرے مواقع بھی ہیں جن پر ملک نے ابھی تک پوری توجہ نہیں کی ہے اور ضرورت ہے کہ جامعہ بھی اس فرض سے غافل نہ ہو جسکو نہایت کامیابی کے ساتھ بعض دوسرے معاصرین پورا کر رہے ہیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جو قدر دانی بیرونی ممالک میں ہوئی ہے اُسی کا اقتضا ہے کہ رسالہ "جامعہ" بھی یورپ و ممالک اسلامی کے اکثر حلقوں میں جو حالات حاضرہ سے دلچسپی رکھتے ہیں خاص قدر دانی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ چنانچہ ابتدا ہی سے ہمارے ہندوستانی طلبہ مقیم یورپ کو ہمارے مقاصد سے نہایت ہمدردی رہی ہے اور علاوہ بعض قابل قدر مضامین کے ہم کو خاص جامعہ کے لیے ایسے مضامین بھی حاصل ہوئے ہیں جو دنیا کے بعض مشہور ارباب قلم نے ہم کو عنایت فرمائے۔ چنانچہ ہیرولیلم شواتز کا مضمون جو گزشتہ نمبر میں شائع ہوا ہے اور جس کو ہم صلح کا پیغام کہنا چاہیے مختلف حیثیتوں سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔

گزشتہ عالمگیر جنگ تمام یورپ کے لیے جن انقلابی خصوصیات کا سرچشمہ تھی اُسی کا نتیجہ ہو کہ اس کے ختم ہوتے ہی تمام دنیا یورپ اور اُس کی نام نہاد تہذیب کو متزلزل پاتی ہے۔ مغربی سیاست آج جس انتشار میں ہو اوس کا ذکر روزانہ اخبارات میں رہتا ہے، معاشی انقلابات نے نظام تمدن کی بیخ و بنیاد کو بھی باقی نہیں چھوڑا ہے، مذہبی و اخلاقی حالت نظر ثانی کے محتاج ہو اور یہ اس طرح اپنے مرکز کو چھوڑ چکی ہے کہ اب اپنی گزشتہ حیثیت کو حاصل کر لینا اُس کے لیے تقریباً ناممکن ہو گیا ہے ع۔ نہ جائے کہ برخاست مشکل نشیند، کا عمل ہر جگہ نظر آتا ہے۔ اور موجودہ کشمکش نے اکثر سلطنتوں و تقریباً تمام اقوام کو اپنی عظمت رفتہ کا نوحہ خواں بنا دیا ہے اور بہت کم ایسے ممالک ہیں جو محض اپنی کوششوں سے دوبارہ اس گرتے ہوئے گھر کو تھام سکیں۔ لیکن سلطنت برطانیہ کے جوان ہمت وزیر اعظم مسٹر بالڈون کے نزدیک انگریزی قوم اور برطانوی سلطنت تہذیب مغرب کے اس نیم مردہ جسم اور جسد بے روح کو دوبارہ اعجاز مسیحائی سے زندہ کر سکتی ہے لیکن اس معجزہ کے کامیابی کے لیے وہ ولیم پٹ کی جرات اور لنکن کے عزم راسخ کی ضرورت بتاتے ہیں!

پٹ کی جرأت نپولین جیسے جلیل القدر دشمن کے خلاف تھی اس لیے اُس کا ظہور اب بھی ناممکن نہیں مگر لنکن کا عزم راسخ آزادی کی خاطر تھا جس کا یورپ میں آج ایسا قحط ہے کہ جس کی وجہ سے توقع نہیں ہوتی کہ مسٹر بالڈون اپنے خواب کی تعبیر دیکھ سکیں۔

مغربی تہذیب کا جو عنصر اُس کی تباہی کا باعث ہوا ہے وہ محض غارتہ جنگی نہیں بلکہ جنون ملک گیری میں باہمی رقابتیں اور دوسروں کو غلام بنانے کی خواہش ہے۔ اسکا انسداد اگر ہو جائے تو شاید اس قوم کی گفتگو بے معنی نہ ہو ورنہ موجودہ حالات میں تو مسٹر بالڈون کا ارشاد غالب کے مشہور مصرعہ کا مصداق ہے کہ

ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا

خواجہ کمال الدین صاحب کی خدمات اسلامی کا اعتراف ملک کے ہر گوشہ سے ہوا ہے؛ اُن کے ایثار وخلوص اور جوش و انہماک کا ہر شخص مدح خواں ہو اور اُن کے مشن کو مسلمانان مقیم انگلستان کے لیے ہمیشہ باعث تقویت خیال کیا گیا ہو۔ ابتداءً اون کے رسالۂ اسلامک ریویو نے اسلامی سیاسیات میں بھی حصہ لیا اور خواجہ صاحب نے مسئلہ خلافت کے متعلق اپنی ہمدردی کا بھی ثبوت دیا۔ لیکن حال ہی میں لندن سے اطلاع موصول ہوئی ہے کہ حکومت انگورہ کے جدید تجاویز متعلقہ خلافت سے خواجہ صاحب کو اتفاق نہیں اور وہ خلیفہ اسلام کی اُس حیثیت کو تسلیم نہیں کرتے جو مسلمانان عالم کے نزدیک ہمیشہ سے مسلم ہو چنانچہ انہوں نے مسجد ووکنگ کے خطبہ میں خلیفۂ اسلام کا نام بھی شامل کرنا چھوڑ دیا ہو اور اس طرح اپنے اختلاف رائے کا ایک عملی و تکلیف دہ ثبوت بھی پیش کر دیا۔ مسئلہ خلافت کی جس بحث کی طرف ان سطور میں اشارہ کیا گیا ہو اور جس سے مراد وہ تفریق ہو جو حکومت انگورہ خلیفہ کے اختیارات ملکی و سیادت مذہبی میں کرنا چاہتی ہو ایک اہم مسئلہ ہو اور امید ہے کہ انشاء اللہ جلد اُس کے متعلق جامعہ میں مستقلاً بحث کی جائیگی۔ لیکن خواجہ صاحب کے اس طرز عمل کے متعلق ہم اظہار تعجب و افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے، اس لیے کہ ہمارے خیال میں وہ احمدی جماعت کے اُس حصہ سے تعلق رکھتے تھے جو مسئلہ خلافت میں جمہور مسلمانان ہند کا ہم رائے ہے۔

جرمنی کی موجودہ دشواریوں کا صحیح اندازہ کرنا ناممکن ہے لیکن جو چیز عام طور پر زیادہ مشہور ہے وہ اُس کے سکہ کی بے قدری ہے۔ جس کو اب کوڑیوں کے مول بھی خریدنے والے لینا پسند نہ کریں گے۔ اس حالت کا لازمی نتیجہ عام فلاکت و بربادی کے علاوہ تمام دنیا میں جرمنی تجارت اور ساکھ کا خاتمہ ہو۔ اور اب یہ رسوائی اس حد تک پہنچ گئی کہ اس کے خلاف کوئی بات قابل تسلیم نہیں ٹھہرتی۔ لیکن بعض اخبارات نے ظاہر کیا ہو کہ جرمنی کے ۱,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰ ایک ارب ڈالر کی مالیت کا سونا امریکہ میں موجود ہے جس کو وہ جب چاہے حاصل کر سکتا ہے یا اُسکی

ضمانت پر ایک بڑی رقم قرض لے سکتا ہے۔ لیکن مسٹر ویلس جو اس مسئلہ کے ماہر سمجھے جاتے ہیں، اس کے خلاف رائے رکھتے ہیں اونکے نزدیک تمام امریکہ میں تین ارب ڈالر سے زیادہ سونا موجود نہیں ہے اور اس میں کل سلطنتیں شامل ہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ جرمن تاجروں نے امریکہ میں اپنا کاروبار اس کثرت سے پھیلا دیا ہے کہ جرمن سرمایہ کی مقدار تمام دوسری یورپین سلطنتوں کے مجموعی سرمایہ سے زائد ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ حکومت امریکہ کو یہ کامل یقین رکھتے ہیں کہ اگر مسئلہ تاوان جنگ کا کوئی معقول فیصلہ ہوگیا تو جرمنی کو امریکہ میں دو ارب ڈالر کی رقم بطور قرض مل جانا یقینی ہے۔

آغاز جولائی ۱۹۲۳ء سے جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کا نیا سال شروع ہوتا ہے۔ یونیورسٹی کے اعلیٰ جماعتوں کے لیے جدید اساتذہ کا تقرر ہوا ہے اور بعض جدید شعبہ جات کا افتتاح بھی کیا گیا ہے مثلاً صحافت و اصول تجارت نیز صنعتی تعلیم کے لیے بھی بعض نئے کام جاری کئے گئے ہیں۔ اور ان شعبہ جات کے لیے لایق و باکمال صاحبان فن کی خدمات حاصل کرلی گئی ہیں طلبہ کی تعداد میں امسال کافی اضافہ کی توقع ہے لیکن مکانات کی قلت بدستور تکلیف دہ ہے۔ اس لیے ارکان جامعہ نے ایک جدید دارالاقامہ کی تعمیر شروع کردی ہے اور امید ہے کہ جلد وہ مکمل ہوجائیگا۔ ہمیں کامل امید ہے کہ جامعہ کا سال نو اوس کی ترقی و استحکام کا باعث ہوگا اور اُس کی کامیابی قومی تعلیم کی عظیم الشان فتح قرار پائے گی۔

کلام جوہر" پر جو دلاویز تنقید اس نمبر میں شائع کیجاتی ہے وہ جس طرح موضوع کی دلکشی بیان کے لطف اور ذوق و شوق کے رنگینوں سے لبریز ہے، اپنی علمی و تنقیدی حیثیت میں بھی خاص مرتبہ رکھتی ہے۔ اور ہم نے اُس کو ایک خاص مقصد سے حاصل کیا ہے۔

ماہ جنوری سنہ حال میں مجموعہ کلام جوہر پہلی مرتبہ جامعہ ملیہ سے شائع ہوا تھا جو اپنی مقبولیت کی وجہ سے ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگیا۔ اس سے قبل اپنی جامعیت و طباعت کے

جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ
کے
شعبہ تصنیف و تالیف کی شایع کردہ کتابیں

کتاب		قیمت
(۱) انوار العرب - مؤلفہ مولانا سورتی	قیمت غیر مجلد	۸ر
(۲) تاریخ الامت - مصنفہ مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری	قیمت	۱۲ر
(۳) ایضاً (حصہ دوم) " " (حصہ سوم)	"	۱۲ر، ۸ر
(۴) مبادی معاشیات - از پروفیسر ذاکر حسین خاں صاحب	"	۱۰ر
(۵) اخبار الدولتین - از مولانا نیاز فتحپوری		(زیر طبع)
(۶) انتخاب کلام میر - مرتبہ مولوی نور الرحمن بی اے		(")
(۷) خطبہ شیخ الہند - (بہ تقریب افتتاح جامعہ)	قیمت	۲ر
(۸) خطبہ مسیح الملک - حکیم اجمل خاں صاحب	"	۲ر
(۹) انتخاب مضامین جوہر - معہ تصویر	"	۱۰ر
(۱۰) ترکوں کی کہانیاں	"	۴ر

المشتہر

مہتمم مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

فہرست مضامین

جلد دوم	ماہ ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ مطابق جولائی ۱۹۲۳ء		نمبر ۱
نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ

دیوان غالب مطبع کاویانی برلن جو علوم فارسی جدیدہ و علوم شرقی کی خدمت کے لئے مشہور ہی ہمارے لیے دیوان غالب (پاکٹ ایڈیشن) کمال صحت و عمدگی کے ساتھ طبع کر رہا ہی جو اس ماہ کے آخر تک وصول ہو جائے گا اور سوائے مکتبہ جامعہ ملیہ کے کسی دوسری جگہ نہیں مل سکے گا نہایت خوشنا جلد اور نفیس کاغذ و طباعت

مطبع شرکت کاویانی برلن

کے سول ایجنٹ ہونے کی حیثیت سے مندرجہ ذیل کتابیں مکتبہ ہذا میں موجود رہتی ہیں۔

۱۔ سفر نامہ ناصر خسرو مع سعادت نامہ و روشنائی نامہ	۶ روپیہ ۸ آنہ
۲۔ تاریخ سنی ملوک الارض مصنفہ حمزہ اصفہانی	۲ روپیہ ۸ آنہ
۳۔ تیاتر (ڈراما) مصنفہ نظام الدولہ مرزا ملکم خاں	۲ روپیہ ۸ آنہ
۴۔ موش و گربہ (نظم) مصنفہ عبید زاکانی	۵ آنہ ۶ پائی

علاوہ ان کتابوں کے اردو زبان کی تمام مستند و مقبول تصانیف اور جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کے نصاب کی درسی کتابیں مکتبہ ہذا میں مل سکتی ہیں۔

المشتہر

مہتمم مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

ہر قسم کے بلاک ربڑ کی مہریں

ہمارے مطبع میں ہر وقت اور نہایت کفایت سے طیار ہو سکتی ہیں اور رسالہ ہذا میں جو عکسی تحریر شائع ہوئی ہی وہ بھی ہمارے مطبع کی ایک خاص صنعت ہی۔

مہتمم مطبع ملیہ علی گڑھ

اللہ اکبر

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

کا

ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ نور الرحمٰن

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

قیمت سالانہ للعہ

فہرست مضامین

جلد دوم	ماہ ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ مطابق جولائی سنہ ۱۹۲۳ء		نمبر ۱
نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	نمبر صفحہ
۱	تعلیم و آزادیٔ فکر	پروفیسر ذاکر حسین خاں صاحب بی۔ اے	۹
۲	اندلس پر قبطی اثر	پروفیسر محمد نعیم الرحمن۔ ایم اے	۱۰
۳	جدید عالم اسلامی	یوسف حسین خاں صاحب متعلم جامعہ	۲۱
۴	اسلام اور سرمایہ داری	مولوی ابو الجلال ندوی	۳۸
۵	رفتار تعلیم	"معلم"	۴۶
۶	مطبوعات جدیدہ	"ناقد"	۴۷
۷	تلافیٔ مافات	سید عابد حسین صاحب بی اے	۵۳
۸	نوائے بہار	مولوی محمد حسین صاحب محوی	۵۵
۹	شذرات	مدیر	۵۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

جلد ۲ ماہ ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ مطابق جولائی ۱۹۲۳ء نمبر ۱

تعلیم و آزادی فکر

ہم کسی پچھلی اشاعت میں ہیئت اجتماعی کی تعمیر نو کے متعلق انگلستان کے مشہور فلسفی مسٹر برٹرنڈ رسل کے خیالات ہدیۂ ناظرین کر چکے ہیں۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ اپنے فلسفہ سیاسی میں فاضل موصوف نے ہیجانات کی دو قسمیں کی ہیں یعنی تخلیقی و تملیکی۔ اور اول الذکر کے تحت میں آپ تعلیم، مذہب، اور ازدواج کو سب سے موثر قوتیں تصور کرتے ہیں۔ ہم ذیل میں مسئلہ تعلیم پر موصوف کے خیالات کا اقتباس درج کرتے ہیں۔ انشاء اللہ وقتاً فوقتاً اس مسئلہ پر دیگر حکماء فرنگ کے افکار پیشکش کرتے رہینگے کہ ان سے آگہی ہمارے پیچیدہ مسئلہ تعلیمی کے صحیح حل کے لیے ازبس ضروری ہے۔

تعلیم معمولاً حالات موجودہ کی موافقت اور ہر بنیادی تغیر کی مخالفت میں سب سے قوی طاقت ہوتی ہے۔ موجودہ نظام اجتماعی جب اپنے کو خطرہ میں پاتا ہے، تو فوراً، (اگر ابھی اس کا اقتدار باقی ہے)، تعلیمی نظام پر قبضہ کر لیتا ہے اور کم عمر بچوں کے اثر پذیر دماغوں میں اپنے محاسن کا یقین اور ان کی عظمت

جاگزیں کرنے لگتا ہے ادھر مصلحین ان لوگوں کو اس مورچے سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ غریب بچوں کا طرفین میں سے کوئی خیال نہیں کرتا۔ یہ گویا بے سیکھے سپاہی ہوتے ہیں جنھیں چاہے اس لشکر میں شامل کر لیا جائے اُس میں۔ اگر بچوں کا لحاظ کیا جائے تو تعلیم کا مقصد یہ نہ ہو کہ بچے اس فریق کے ساتھ ہوں یا اُس کی، بلکہ انھیں اس قابل بنایا جائے کہ وہ معقولیت کے ساتھ فریقین میں انتخاب کر سکیں۔ تعلیم کا مقصد پھر یہ نہ ہو کہ لڑکے وہ سوچیں جو ان کے اُستاد سوچتے ہیں، بلکہ ان میں خود فکر کا مادہ پیدا کر دیا جائے۔ چنانچہ اگر بچوں کے حقوق کا خیال ہو تو تعلیم کا وجود بہ حیثیت ایک سیاسی حربے کے باقی نہ رہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

عدل اور حریت کے وہ دو اصول جو ہیئت اجتماعی کی تعمیر نو میں بہت سی چیزوں پر حاوی ہیں تعلیم میں آکر بجائے خود کافی نہیں رہتے۔ عدل اگر اسے مساوات حقوق کے معنی میں لیا جائے تو ظاہر ہے کہ بچوں کے معاملہ میں ممکن نہیں۔ رہی حریت تو اول تو یہ اصلاً ایک منفی چیز ہے۔ یہ آزادی میں ہر ممکن الدفع مداخلت کی مخالف ہے لیکن کوئی مثبت اصول تعمیر اس سے فراہم نہیں ہوتا۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ تعلیم میں ایک حد تک تسلط اور اختیار ناگزیر ہے۔ ہاں، معلموں کو اس تسلط کے استعمال کا ایک ایسا راستہ دریافت کرنا ہے جو حریت کے منشا کے مطابق ہو۔ جہاں تسلط ناگزیر ہو وہاں ضرورت ہوتی ہے حرمت و تکریم کی۔ جو شخص بچوں کو دراصل اچھی تعلیم دینا چاہتا ہے۔ اور ان کی صلاحیتوں کو درجۂ کمال پر پہونچانے کا آرزومند ہے، اسے اس جذبۂ تکریم سے لبریز ہونا چاہیے۔ مشین میں ڈھلے ہوئے آہنی نظاموں کے موئیدین میں یہی جذبہ ناپید ہوتا ہے۔ حربیت سرمایہ داری فاپی، اشتراکی اور حکمی جماعتیں، اور وہ تمام زندان و محبس جو مصلحین اور ان کے مخالفین روح انسانی کو مقید کرنے کے لیے بناتے ہیں اسی ذیل میں ہیں۔ اس تعلیم میں جسکے قواعد و ضوابط دفتر حکومت سے نکلتے ہوں مع اپنی بڑی بڑی جماعتوں، مقررہ نصاب، اور کثرت کار سے شل اساتذہ کے اور مع اپنے اس تہیہ کے ایک ہی ڈھنگ کے متوسط استعداد کے لوگ پیدا کر دیے جائیں، یہ فقدان تکریم تقریباً ہمہ گیر ہے۔ اس حرمت و تکریم کے لیے ضرورت ہے تخیل اور حرارت زندگی کی۔ اور پھر جن کی طاقت یا

ماتحتی حسیں سب سے کثرت سے انہیں کے باب میں سب سے زیادہ یہ تخیل درکار ہے۔ بچہ کمزور ہوتا ہے اور بظاہر بیوقوف۔ استاد مضبوط ہوتا ہے، اور اصطلاح عام میں بچہ سے زیادہ دانشمند۔ بے مروت استاد یا بے تکریم دفتریت کا دلدادہ بآسانی بچہ کو ان کمزوریوں کے باعث تحقیر سے دیکھنے لگتا ہے۔ یہ برہم خود بجھتا ہے کہ میرا فرض ہے کہ بچے کو فلاں سانچے میں ڈھالوں۔ یہ اپنے تخیل میں خود کو ایک کمہار تصور کرتا ہے جس کے ہاتھ میں بچہ بمنزلہ مٹی کے ہے۔ چنانچہ بچہ کو کوئی غیر فطری شکل دیتا ہے جو زیادتی سن کے ساتھ پختہ ہوتی جاتی ہے۔ پھر ذہنی کشاکش اور روحانی بے اطمینانیاں پرورش کرتی ہیں، اور ان سے حسد و برہمی۔ نیز یہ یقین بھی ترقی کرتا ہے کہ اوروں کو بھی اسی مسخ کن منزل کے طے کرنے پر مجبور کرنا چاہیئے جس استاد میں جذبہ تکریم موجود ہے وہ بچہ کو کسی سانچہ میں ڈھالنے کا خیال نہ کرے گا۔ وہ تو ہر ہستی میں، خصوصاً وجود انسانی اور پھر اس میں بھی سب سے زیادہ بچہ میں، ایک مقدس، غیر محدود، ناقابل تشریح، اس سے مختص اور ایک عجیب بیش بہا چیز یعنی دنیا کی بے نداسی کمال کے ایک ریزۂ مجسم کے وجود کا احساس کرتا ہے بچہ کے سامنے یہ ایک ناقابل توجیہ انکسار محسوس کرتا ہے، ایک انکسار جو عقلی وجوہ سے بآسانی قابل پذیرائی نہ سہی لیکن بہرحال اس سہولت پسند، برخود غلط اعتماد کے بہ نسبت عرفان سے قریب تر ہے جو اکثر والدین اور اساتذہ میں ہوتا ہے۔ بچہ کی بیچارگی اور کسی کا سہارا ڈھونڈھنے کی التجا اس میں ایک امانت کی ذمہ داری کا احساس پیدا کرتی ہے۔ اس کا تخیل اسے بتاتا ہے کہ بچہ خیر یا شر دونوں کے لیے کیسے کیسے ممکنات اپنے اندر رکھتا ہے؛ اس کے ہیجانات کس کس طرح نشو و نما پا سکتے یا دبائے جا سکتے ہیں؛ اس کی امیدیں کس طرح مرجھا جائینگی؛ اس کی زندگی کس طرح کم زندہ رہ جائیگی؛ اس کی امانت کیونکر مجروح اور اس کی آرزوئیں کیونکر ارادہ میں مبدل ہو جائینگی۔ یہ سب احساسات اس میں ایک خواہش پیدا کرتے ہیں کہ اس معرکہ میں بچہ کی مدد کرے۔ وہ بچہ کو کسی خارجی غرض کے لیے نہیں (جو ریاست نے متعین کی ہو یا کسی اور غیر شخصی استبداد نے) بلکہ خود ان اغراض کی خاطر تقویت پہونچانا اور مسلح کرنا چاہتا ہے جنھیں بچہ کی روح پوشیدہ

طور پر تلاش کر رہی ہے جس شخص میں یہ احساس ہو وہ معلم کے اختیار کو اصول حریت کے توڑے بغیر استعمال کر سکتا ہے۔

. . . .

جب تک تعلیم کا مقصد فکر وخیال کے بجائے یقین و اعتقاد پیدا کرنا باقی رہیگا آزادی تحقیق کا خون ناگزیر ہے۔ تعلیم کا مقصد آرزوئے صداقت کی پرورش ہونا چاہیے، نہ یہ عقیدہ پیدا کرنا کہ کوئی خاص مسلک سچا ہے۔ لیکن دقت یہ ہے کہ اتحاد مسلک ہی لوگوں کو جارحانہ نظام میں منسلک رکھ سکتا ہے۔ جس قدر مسلک پر اعتقاد شدید ہے اسی قدر جدال میں کارکردگی زیادہ ہوگی۔ یہ شدت اعتقاد اور کارکردگی پیدا کرنے کے لیے بچہ کی فطرت پس پشت ڈالی جاتی ہے اس کا مطمح نظر تنگ کر دیا جاتا ہے ...... لیکن آزادی فکر کو دبا کر جنگ وجدال میں جو کامیابی حاصل ہوتی ہے وہ بہت آنی اور بے قیمت ہے۔ آخر کار کامیابی کے لیے بھی دماغی اور نفسی قوت اتنی ہی ضروری ہوتی ہے جتنی کہ حیات حسنہ کے لیے بدقسمتی سے تعلیم کا یہ تصور کہ یہ قواعد کی ایک شکل اور غلامی کے ذریعہ اتحاد عمل پیدا کرنے کی ایک سبیل ہے بہت عام ہے اور زیادہ تر اس بنا پر اس خیال کی ترویج کیجاتی ہے کہ یہ حصول فتح کا ذریعہ ہے۔ تاریخ قدیم کی تمثیلوں کے شائق اس کی تائید میں ایتھنس پر اسپارٹا کی فتح کی مثال دینگے۔ لیکن یاد رہے کہ لوگوں کے فکر وتخیل پر فرمانروائی ایتھنس کی رہی نہ کہ اسپارٹا کی آج ہم میں سے ہر ایک اگر وہ کسی گذشتہ عہد میں پیدا ہو سکتا تو ایتھنس میں پیدا ہونا چاہتا۔ اسپارٹا میں نہیں۔

تعلیم دینے والے عموماً بعض عادات کی تلقین کرتے ہیں، مثلاً اطاعت اور ڈسپلن، دنیاوی کامیابی کی بے پناہ کشمکش، مخالفین سے نفرت وحقارت، بے چون وچرا باور کرنے کی عادت، اور استاد کے عقل وفہم پر مجہول یقین یہ ساری کی ساری عادتیں زندگی کی منافی ہیں۔ اطاعت اور ڈسپلن کے بجائے ہمیں چاہیے خود مختاری اور ہیجان کی حفاظت؛ بیرحمی کی تلقین کے

بجائے تعلیم کا مقصد ہونا چاہیے کہ خیال و فکر میں مدل کی پرورش کرے؛ تحقیر کے بجائے
اسے تکلم پیدا کرنی چاہیے اور تفہیم و تفہم کی کوشش؛ دوسروں کی رائے سے یہ ضروری نہیں
کہ اتفاق پیدا کیا جائے بلکہ اگر مخالفت ہو تو وہ جس کے ساتھ تخیل اور وجوہ مخالفت کا واضح جائز
شامل ہو۔ بجائے زود عقیدگی کے اشتباہ تعمیری و تخلیقی اور ذوق ہمات ذہنی کو تحریک دینا
اور ان عالمہائے گوناگوں کا احساس پیدا کرنا چاہیے جو فکر کی حوصلہ مندی اور خیال کی جرأت
سے فتح کیے جا سکتے ہیں۔

ہمارے مدارس میں ڈسپلن اور ضبط نفس پر جو اصرار پایا جاتا ہے وہ زیادہ تر ایک عیب
ہے۔ ضبط نفس کی ایک قسم ہے جو ہر حصول مقصد کے لیے لازمی ہے۔ لیکن یہ پسندیدہ قسم خود اندر سے
پیدا ہوتی ہے اور ایک بعید مقصد کے لیے استقلال کے ساتھ کوشش کرنے اور اس کی راہ میں
بہت سی چیزیں ترک کرنے اور بہت سے مصائب برداشت کرنے سے عبارت ہے۔ اس میں
بہت سے چھوٹے چھوٹے ہیجانات کو ارادہ کا ماتحت کرنا پڑتا ہے اور اس کے لیے مہتم بالشان تخلیقی
آرزوؤں سے عمل کی رہنمائی کرنی ہوتی ہے، ایسے موقعوں پر بھی کہ یہ آرزوئیں خود روشن طور پر
زندہ نہوں۔ اس ضبط کے بغیر کوئی حوصلہ، اچھا ہو یا بُرا، پورا نہیں ہو سکتا۔ یہ ضبط خود اپنے ارادہ
سے پیدا ہوتا ہے نہ کہ کسی خارجی جبر سے۔ لیکن یہ قسم جو بُری نہیں اسی پر مدارس میں زور نہیں دیا جاتا۔
معاشی کشمکش میں بیرحمی اور سفاکی کی تعلیم اس وقت ناگزیر ہے تاکہ ہمارے جماعتی نظام کی ساخت
میں تبدیلی نہ ہو۔ یہ چیز علی الخصوص متوسط طبقہ کے مدارس میں اور بھی پائی جاتی ہے کیونکہ مدرسہ
کی کامیابی کا مدار والدین میں اس کی نیک نامی پر ہے اور یہ نیک نامی طلباء کی کامیابی کی
تشہیر پر منحصر ہے۔ یہ منجملہ ان بہت سی صورتوں کے ایک صورت ہے جس میں ریاست کا نظام
مسابقت و مقابلہ اپنا نقصان پہونچاتا ہے۔ علم کی فطری اور بے لوث آرزو بچوں میں کچھ کمیاب
نہیں ہوتی، اور اکثر صورتوں میں جہاں یہ دبی ہوتی ہے اسے ابھارا جا سکتا ہے۔ لیکن اساتذہ
اسے نہایت بیدردی سے کچلتے ہیں، اس لیے کہ انھیں تو سند، فضیلت، اور امتحان کا خیال

ہوتا ہے۔ مدرسۂ ابتدائی میں داخلہ سے لیکر اعلیٰ تعلیم کے ختم تک قابل لڑکے کو فکر و خیال اور
مذاق ذہنی کی پرورش کی مہلت ہی نہیں ملتی۔ از اول تا آخر سوائے امتحان کے لیے اشارات
اور درسی کتابوں میں مندرج حقایق کی ایک لمبی داستان کے اور کچھ ہوتا ہی نہیں۔ طلباء میں جو
سب سے ذہین ہوتے ہیں وہ آخر میں تعلیم سے بیزار ہو جاتے ہیں اور اسے کسی طرح فراموش کر کے
دنیائے عمل میں داخل ہونے کے آرزومند رہتے ہیں۔ لیکن یہاں بھی معاشی نظام انھیں مقید
رکھتا ہے اور ان کی تمام فطری خواہشات مجروح اور پامال ہو جاتی ہیں۔

استاد کے فہم و دانش پر مجہول قبول و تسلیم اکثر لڑکے لڑکیوں کے لیے نہایت سہل
کام ہے۔ اس میں اپنی فکر ذاتی کی ضرورت نہیں پڑتی اور پھر بات بھی معقول معلوم ہوتی
ہے کہ استاد اپنے شاگردوں سے زیادہ جانتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر استاد غیر معمولی اچھا
نہیں تو اس کی نظر میں اچھا بننے کا بھی یہ ایک ذریعہ ہے۔ لیکن مجہول قبول و تسلیم کی یہ عادت
آگے چل کر بہت مضر اثرات پیدا کرتی ہے۔ یہ انسانوں میں ایک قاید کی آرزو پیدا کر دیتی ہے
اور پھر جو کوئی اس حیثیت میں ملتا ہے اسے یہ اپنا راہنما تسلیم کر لیتے ہیں۔ کلیساؤں، حکومتوں،
سیاسی فرقہ بندیوں، اور ان تمام نظاموں کی قوت، جو سادہ لوح انسانوں کو اپنی اور
اپنی قوم کی اغراض کے منافی نظامہائے کہنہ کی تائید پر آمادہ کرتے ہیں اسی عادت سے
پیدا ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ باوجود تعلیم کی تمام ممکن مساعی کے آزادی فکر بہت عام نہو گی۔
لیکن اس وقت کے مقابلہ میں یقیناً زیادہ ہوگی۔ اگر لڑکے سے
بعض نتائج کا قبول کرانا مقصود نہو بلکہ اس میں فکر کی عادت پیدا کرنا تو تعلیم یقیناً بالکل دوسرے
رنگ سے دیجائے۔ مثلاً تدریس کی یہ سرعت کم ہو اور بحث مباحثہ زیادہ، طلبا کو اظہار خیال
کے زیادہ مواقع ملیں اور تعلیم ان چیزوں سے واسطہ رکھنے کی زیادہ کوشش کرے جن میں
طالبعلم کو دلچسپی ہے۔ اور ان سب باتوں سے بڑھ کر یہ کہ ذہنی حوصلہ مندی کے ذوق کو تحریک
دینے اور ابھارنے کی کوشش ہو۔ یہ عالم جس میں ہم رہتے ہیں بہت حیرت خیز اور رنگارنگ

ہے۔ بعض چیزیں جو بہت سادہ معلوم ہوتی ہیں غور کرو تو اتنی ہی دشوار نظر آتی ہیں۔
(اینہا ہمہ ہیچ است کہ معلوم عوام است) بہت سی چیزیں جن کا اکتشاف ناممکن معلوم ہوتا ہے انھیں
محنت اور ذہانت آشکار کر دیتی ہے۔ خیال کی قوت، وہ وسیع میدان جو یہ سر کر سکتا ہے اور وہ
وسیع تر میدان جن کی ایک دھندلی سی تصویر یہ متخیلہ کے سامنے پیش کرتا ہے، یہ چیزیں ان لوگوں
کو جو روزمرہ کے جھگڑے ذرا پرے پہنچ گئے ہیں ایک عجیب متاع گراں ارزاں پہنچاتی اور
انھیں آئے دن کی کم حیثیت اور ماندگی جزئیات سے نجات دلا دیتی ہیں جس سے ان کی
ساری زندگی دلچسپیوں سے پُر اور حیات عامیانہ کے زندان کی دیواریں شکست ہو جاتی ہیں
وہی حوصلہ مندی اور ذوق اور امنگ جو لوگوں کو قطب جنوبی لیجاتی ہے، جو قوت کے ایک
فیصلے کے امتحان کے لیے بہتوں کو آمادۂ پیکار بنا دیتی ہے، وہی تخلیقی فکر و خیال میں اپنے
لیے ایک راستہ نکال سکتی ہے، جو نہ مضرت رساں ہو نہ بیرحم؛ بلکہ حیات بشری میں اس
جمال روشن کو شامل کر کے جو روح انسانی "غیر معلوم" کی بلندیوں سے لا رہی ہے، وقار انسانیت
میں افزونی کا باعث ہو۔ اس مسرت کو تھوڑا یا بہت، ہر اس شخص تک پہنچا دینا جو اس کی صلاحیت
رکھتا ہے وہ مقصد اصلی ہے جس کے لیے دماغی تعلیم کی قدر کرنا چاہیے۔ لوگ کہینگے کہ ذہنی حوصلہ مندی
کی مسرت لازماً کمیاب ہوگی، بہت کم لوگ ہیں جو اس سے محظوظ ہو سکیں گے اور معمولی تعلیم اس
موثر خوبی کا کس طرح خیال کر سکتی ہے۔ میرا یہ عقیدہ نہیں۔ دماغی حوصلہ مندی کا انبساط جوانوں
میں بڈھوں سے بہت زیادہ عام ہے اور بچوں میں تو بہت ہی عام۔ لیکن بعد کی زندگی میں یہ
اس لیے نادر و کمیاب ہو جاتا ہے کہ تعلیم کے ذریعہ اس کے قتل کی ہر ممکن کوشش کیجاتی ہے۔
انسان جتنا خیال سے ڈرتا ہے دنیا میں کسی اور شے سے نہیں ڈرتا؛ نہ تباہی سے حتیٰ کہ موت
تک سے نہیں۔ خیال انقلاب انگیز ہے اور تہ و بالا کرنے والا، تباہ کن ہے اور ہیبت ناک، یہ
قایم شدہ رسوم اور رواج، مراعات، آرامدہ عادات، غرض کسی پر رحم نہیں کھاتا۔ یہ نراجی
ہے اور بے آئین، یہ اختیار و استبداد کی طرف سے بے نیاز ہے اور قرنوں کی آزمودہ دانش

سے بے پروا۔ خیال دوزخ کے قعر تاریک تک میں جھانکتا ہے اور ڈرتا نہیں۔ یہ اس بے بضاعت انسان، کو خاموشی کی گہرائیوں میں محصور دیکھتا ہے، لیکن ایک انداز تفاخر سے اسے اس طرح بے متاثر ہوئے جھیل جاتا ہے گویا یہی کائنات کا مالک ہے۔ خیال عظیم ہے، سریع ہے اور آزاد۔ یہ دنیا کا نور ہے اور انسان کی شوکت خصوصی۔

لیکن اگر خیال کو بجائے معدودے چند لوگوں کے حق کے اکثر کی ملک ہونا ہے تو ہم کو خوف سے منہ موڑ لینا چاہیئے۔ خوف ہی انسانوں کو روکتا ہے۔ اس کا خوف کہ کہیں ان کے عزیز عقائد دھوکہ نہ ثابت ہوں؛ اس کا خوف کہ جن کیفیات اساسی میں وہ زندگی گذارتے ہیں وہ مضر نہ قرار پائیں، اس کا خوف کہ کہیں وہ خود عزت کے اس سے کم مستحق نہ نکلیں جتنا وہ سمجھا کیے ہیں۔" کیا مزدور املاک کے متعلق آزادی سے سوچے؟ پھر ہم امیروں کا کیا حشر ہوگا؟ کیا نوجوان مرد عورتیں اپنے تعلقات باہمی کے متعلق آزادی سے سوچیں؟ پھر اخلاق کی کیا گت ہوگی؟ سپاہی جنگ کی بابتہ آزادئ خیال رکھیں؟ تو فوجی نظام کی کیا نوبت ہوگی؟ نہیں نہیں۔ خیال سے باز آؤ۔ خدا کی پناہ۔ پھر تعصب کی تاریکیوں میں لوٹ چلو کہ کہیں املاک، اخلاق اور جنگ معرض خطر میں نہ آجائیں۔ بہتر ہے کہ انسان بے شعور رہے، کاہل رہے، ظالم رہے، لیکن اس کا خیال آزاد نہ ہو! اگر خیال آزاد ہوا تو ممکن ہے یہ اس طرح نہ سوچیں جیسے ہم سوچتے ہیں۔ اور یہ وہ مصیبت ہے جس کے ٹالنے کے لیے ہر قیمت کم ہے"۔ اپنی روح کی غیر شعوری گہرائیوں میں حریت خیال کے مخالفین یوں دلیلیں کرتے ہیں۔ اور اسی کے مطابق اپنے کلیساؤں، اپنی حکومتوں، اپنے مدارس اور کلبوں میں عمل پیرا ہوتے ہیں۔

کوئی اساس جس کی آبیاری خوف سے ہوئی ہو معاون حیات نہیں ہو سکتی۔ معاملات انسانی کا اصول تخلیقی و تعمیری امید ہے نہ کہ خوف۔ وہ سب کچھ جس نے انسان کو بڑا بنایا یا خیر کے حصول کی کوشش سے پیدا ہوا ہے، شر کے دفع کرنے کی کشمکش سے نہیں۔ جدید تعلیم میں چونکہ بہت کم کسی بڑی امید کی روح ہوتی ہے اسی لیے اس درجہ کم اچھے نتائج اس سے مرتب ہوتے ہیں۔ بچوں

کے معلمین کے دماغ پر تخلیق مستقبل کے مقابلہ میں قیام ماضی کا خیال زیادہ مستولی ہے۔
لیکن تعلیم بس واقعات مردہ سے ایک مجہول آگہی پر مشتمل نہ ہونی چاہیے۔ اسے ایک عملی کیفیت
ہونا چاہیے جس کی سمت اس دنیا کی طرف ہو جسے ہماری مساعی پیدا کرینگی۔ اس کی روح رواں
یونان اور نشاۃ الثانیہ کے معدوم حسن کی غمناک جوع نہ ہونی چاہیے بلکہ جماعت کی ہیئت مستقبل
کا ایک درخشاں منظر، ان فتوحات کا تصور جو خیال آیندہ حاصل کریگا، اور کائنات پر نظر انسانی
کا روز افزوں اور ہر آن وسعت پذیر اُفق۔

ذاکر حسین خاں

(از برلن)

اندلس پر قبطی اثر

مصر کی قدیم قوم قبط کی تاریخ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس نے اپنے گرد و نواح کے ممالک و اقوام پر اس نوع کے اثر چھوڑے ہیں، جن کو نظر انداز کرنا تاریخ کے مطالعہ میں ایک سخت فروگزاشت کا مترادف ہے۔ اس میں تو شک ہی نہیں کہ مصر کی اسلامی حکومت اور معاشرت وغیرہ پر قبطیوں کا گہرا اثر تھا۔ مگر اُس سے آگے بڑھ کر اگر اندلس پر نگاہ ڈالی جائے، تو اور بھی زیادہ دلچسپ حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔

مؤرخ گبن کا بیان ہے کہ حضرت عمرو ابن عاص اور اُن کی فاتح فوج کو قبطی دشمن نہیں بلکہ مصائب سے ذریعہ نجات و فلاح سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر بٹلر کا خیال ہے کہ قبطیوں کے سرگردہ فرضی یعنی مقوقس نے مصری عیسائیوں سے غدارانہ سلوک کیا، اور اُسے مسلم فاتحین کے پنجوں میں پھنسا دیا۔ لیکن لطف یہ ہے کہ بٹلر نے گبن کے اس خیال کی تائید کی ہے کہ مسلمان فاتحین نے مصر فتح کرنے کے بعد اپنی خاص شرائط کے بعد عیسائیوں کو اپنے مذہب کی پیروی کی پوری پوری اجازت دے دی تھی، چنانچہ اُس کا قول ہے کہ "اِس مذہبی آزادی کی نئی فضا میں کلیسائے قبطی دوبارہ زندہ ہو گیا، اور اس قابل ہو گیا کہ اس قوم کے کلیسا کو ایک جداگانہ اور معزز جگہ دی جائے"۔ قبطی تحریروں سے پایا جاتا ہے کہ وہ اُس زمانہ کو "یونانی کفار کے آوردہ مصائب و آلام کے بعد امن و امان کا زمانہ" سمجھتے تھے۔ اور یہ کہ ان دنوں قبطیوں کا حال "ان بچھڑوں کا سا تھا جن کی رسّی کھول کر اجازت دے دی جائے کہ وہ بہ امن و آرام آزادی کے ساتھ اپنی ماؤں کا دودھ پی لیں"۔ ۶۴۳ء عیسوی کے ایسٹر کا ہفتہ تھا جب حضرت عمرو بن عاص نے اپنی مسجد میں ایک تقریر کے دوران میں کہا تھا کہ "ہماری ہمسایہ قوم یعنی قبطیوں کا خیال رکھو۔ حضرت امیر المومنین

---

[۱] کتاب "مصر کی عربی فتوحات" صفحہ ۴۳۹ - ۴۴۰۔

[۲] ایضاً۔ صفحہ ۴۴۵۔

عمرو نے مجھ سے فرمایا ہے کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "اللہ تعالیٰ میرے بعد مصر کو تمہارے ہاتھ سے فتح کرائیگا - اس ملک کے قبطیوں کا خیال رکھنا - وہ تمہارے اعزہ اور تمہاری نگاہداشت کے محتاج ہیں - اپنی نگاہیں نیچی رکھو اور ان پر دست درازی سے باز رہو" - اسی حدیث کی ایک اور روایت یوں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الموت میں تین بار فرمایا کہ "گھونگروالے بالوں کا بخوبی خیال رکھنا" اور ان الفاظ مبارکہ کی یہ تشریح فرمائی تھی کہ "مصر کے قبطی تمہارے اعمام واصہار ہیں - وہ تمہارے دشمنوں کے خلاف تمہارے معاون ہونگے اور تمہارے مذہب کی اشاعت میں مدد دینگے - وہ دُنیا کے اذکار میں تمہارا ہاتھ بٹائینگے کہ تم کو عبادت کے لیے کافی وافی وقت ملے" ام المومنین حضرت ماریہ قبطی قوم سے تھیں - پھر مصر کی فتح کے بعد مسلمانوں نے قبطیہ عورتوں کو اپنے نکاحوں میں لاکر احترام بخشا تھا -

سادہ لوح، سادہ خیال عرب فتح مصر کے وقت تک نہایت سادہ زندگی بسر کرنے کے عادی تھے - انھیں آرائش مکان اور تکلفات غیر ضروری کی نہ ضرورت تھی اور نہ وہ اس سے اور اُس کے ذرائع سے واقف[1] تھے - ظاہر ہے کہ ایسے حال اور ایسے زمانے میں (ساتویں صدی مسیحی) عرب فاتحین کے قبطی قوم سے کس قدر مدد ملی ہوگی، اور اُن سے اُنھوں نے صنعت وحرفت کے بدائع میں سے کیا کیا کچھ نہ سیکھا ہوگا - اس زمانے کے حالات کوائف کی بازجست سے واضح ہوتا ہے کہ مورخین نے اس وقت کے قبطیوں اور مسلمانوں کی صنعت وحرفت کی بدیع کاری کے بیانات ہرگز مبالغہ پر مبنی نہیں ہیں - ان ایام کی پارچہ بافی کے جو نمونے دستیاب ہوئے ہیں، یا جن کے حالات معلوم ہوتے ہیں، اُن سے خاص ملک مصر کی جدت طرازی اور نفاست آفرینی کا پتہ چلتا ہے - زائد سے زائد یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ اس صنعت پر ایران اور بازنطین کا کچھ اثر پڑا ہو -

[1] یمن کے عرب البتہ اس لحاظ سے عام اعراب سے ممتاز تھے، ان کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ان تکلفات سے واقف نہ تھے -

صنعت پارچہ بافی میں نہایت وسیع تجارت ہوتی تھی، اور عجیب و غریب اقسام کے کپڑے تیار ہوتے تھے۔ جیسا سفید باف کپڑا وہ لوگ تیار کرتے تھے، قدیم مصری شاید ہی کسی طرح اس بارے میں اُن سے فایق ہوں۔ ریشم کا رواج عام ہوگیا تھا، اور وہ لوگ نہایت شوق سے سوتی اور ریشمی کپڑوں پر زر دوزی اور کشیدہ کاری کیا کرتے تھے۔ کشیدہ والی بیلیں، جُراب اور بنیان، اور ہر نوع کے اونی کپڑے عربوں کے ہاں ہر وقت کی چیزیں تھیں۔ آثار قدیمہ کے فرانسیسی عالم گایہ کا بیان ہو کہ اُس نے قبطیوں اور تیرھویں صدی کے یورپین صلیبی سپاہیوں کے کفن میں یہ سب مختلف الانواع کپڑے دیکھے ہیں۔ ڈاکٹر بٹلر کا قول ہو کہ پانچویں صدی مسیحی کے اواخر سے دسویں صدی کے اوائل تک کے مصری ساخت کے کپڑوں میں ان تمام سیاسی تغیرات کا جو اُس ملک میں اُن صدیوں میں رونما ہوتے رہے، اس قدر صاف اور صحیح پتہ چلتا ہو جیسے کوئی آئینہ میں دیکھے۔" گایہ نے اس قول پر یہ اضافہ کیا ہو کہ ان کپڑوں کی یہ آئینہ صفتی صلیبی جنگیوں کے زمانے تک کے واقعات تک پھیلتی ہو۔ مورخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہو کہ اس زمانے میں مصر کے کئی مقامات میں جالی، کمخواب، دھاری دار ریشم، مخمل، شبنم، زربفت، بادلہ، تمامی، منقش طلاکار پڑے، قالین، غالیچے اور طرح طرح کے خوبصورت پردے بُنے جاتے تھے اور بکثرت استعمال ہوتے تھے۔

ازمنۂ وسطیٰ کے مصریوں نے صرف پارچہ بافی ہی میں کمال نہیں پیدا کیا تھا، بلکہ سونے کے زیور، سفال، چینی، ظروف سازی، ملمع سازی، بلور سازی میں دھات، لکڑی، ہاتھی دانت اور سیپ پر نقش و نگار کرنے میں، پھر سنگ تراشی، نقاشی اور فن عمارت میں — غرض یہ کہ بقول بٹلر کے "قبطیوں نے صنعت و حرفت کے ہر ہر شعبے میں اپنے ملک کی صنعتی روایات کو قائم و باقی رکھا"[2]

---

[1] گایہ کی کتب "تیسری صدی سے تیرھویں صدی تک کے مصری لباس" "عربی صنعت" اور "قبطی صنعت"۔

[2] بٹلر کی کتاب "عربی فتوحات"۔ باب ہشتم۔

صنعا یمن کے حوبوں میں اگر یہ تمام نہیں تو ان میں اکثر صنائع ضرور موجود تھیں۔ اور بہت قدیم روایات رہی تھیں۔ مصر قدیم کی تہذیب کے زمانے میں یمن کی تہذیب اور اس کا تمدن نہایت اعلیٰ پیمانے پر تھا۔ پھر ایرانی تسلط کے دور میں کسریٰ نے ایرانی تکلفات اور سامان تعیش کا اس پر اور بھی اضافہ کیا تھا بالخصوص صنعا میں تہذیب و تمدن کا یہ عالم تھا کہ اس وقت کی دنیا میں اس پر شاید ہی کوئی ملک مقدم تھا۔ تبلیغ اسلام سے قبل اہل یمن نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا، مصر کے قبطیوں کی طرح وہ لوگ بھی حضرت مسیح کی وحدت طبیعت کے قائل تھے۔ چنانچہ صنعا کے گرجا کی ساخت و وضع کے بیانات سے اب بھی مصر کے قبطی گرجاؤں کی وضع سے بہ آسانی مقابلہ ہو سکتا ہے۔ اندرونی تفاصیل میں بھی صنعا اور مصر کے گرجاؤں میں بہت کچھ مماثلت پائی جاتی ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اہل صنعا کے ہاں ہر قسم کے بیش قیمت لوازم استعمال ہوتے تھے، مگر قبطی چونکہ غریب تھے معمولی اشیاء سے کام لیتے تھے۔ بہر کیف ان دونوں مقامات کے گرجا اور راہبوں کے ڈیرے آپس میں نہایت مشابہ تھے۔ دیواروں کے بیرونی حصوں پر بھی دونوں جگہ نہایت خوشنما نقاشی سے کام لیا جاتا تھا۔

ممکن ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے یمن (عرب) اور مصر (قبطی) کی اسی نوع کی باہمی مشابہت اور یگانگت پر خیال فرما کر یہ فرمایا ہو کہ "مصری تمہارے بھائی ہیں"۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اہل یمن تبلیغ اسلام کے وقت اپنے اور مصر کے اِن مذہبی تعلقات کو فراموش کر چکے ہوں۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں عرب کے مسلم فاتحین نے مصر کے باشندوں سے برادرانہ تعلقات قائم کیے ہوں، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ مصر کی عربی فتح کے بعد تھوڑے ہی سے عرصہ میں دیکھا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے قبطیوں کو اپنی حکومت کے متعدد سربر آوردہ عہدے دیئے اور بہت عرصہ تک قبطیوں نے سلطنت کا کام سنبھالے رکھا۔

سطور بالا میں مسلمانوں (اور بالخصوص اہل یمن) اور قبطیوں کے اِن برادرانہ تعلقات پر اس لیے بالتفصیل بحث کی گئی ہے کہ اس کا آسانی سے اندازہ ہو سکے کہ اندلس کے جنوب مغربی

حصے میں خصوصاً اور دوسرے حصوں میں عموماً، جہاں جہاں اہل یمن آباد ہوئے، قبطی اقوام تعدد نمایاں کیوں تھا۔ اندلس میں آٹھویں صدی کے شروع سے گیارھویں صدی کے آخر تک (جب کہ اشبیلیہ کا آخری یمنی تاجدار تخت سے اتارا گیا اور وہ افریقیہ کے قیدخانے میں جلاوطنی کے عالم میں راہیٔ ملک بقا ہوا) یہی حال رہا۔

موسیٰ ابن نصیرؔ، فاتح افریقیہ کے متعلق مختلف بیانات پائے جاتے ہیں۔ مگر اصل یہ ہے کہ وہ بھی یمن کے رہنے والے تھے۔ اور گوان کے دشمن اُن کو باندی بچہ بتاتے ہیں، لیکن اس کے قائل ہیں کہ وہ ایک یمنی سردار کی اولاد میں سے ہیں۔ فتح اندلس کے وقت موسیٰ افریقیہ کے گورنر تھے سب سے پہلا کام جو انھوں نے افریقیہ میں کیا وہ یہی تھا کہ اہل افریقیہ کو پوری طرح قابو میں لایا جائے اور اس میں انہوں نے جس فوج سے مدد لی اُس میں زیادہ تر مصری شامل تھے ۷۰۲ء میں جب وہ بربریوں سے جنگ میں مشغول تھے، ان کا بیٹا مصریوں کا ایک زبردست دستہ لیکر اُن کی کمک کو پہنچا تھا۔ گو یہ ضروری نہیں کہ اس دستہ میں سب کے سب قبطی سپاہی ہی تھے۔ (کیونکہ قبطی سپاہی نہیں واقع ہوئے تھے)، مگر اس قدر سمجھ لینے میں تو کوئی دقت نہیں معلوم ہوتی کہ فوج کے ہمراہ قبطیوں کی ایک معقول تعداد ضرور ہوگی۔ علامۂ مقری نے نفح الطیب میں ذکر کیا ہے کہ ۶۷۰ء (یا اُس کے قریب قریب) میں موسیٰ کی نصیحت کی خلاف ورزی میں ایک "مصری بیڑا" سردانیہ کو گیا اور یہ کہ ۷۰۰ء کے قریب "عبداللہ ابن مرہ مصریوں کا ایک دستہ لیے ہوئے پہنچا"۔

فتوحات اسلامی کے آغاز میں مسلمان جہازرانی نہیں جانتے تھے۔ اس کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشہور و معروف قول کو یاد کر لینا کافی ہوگا۔ جہازرانی اور سفر دریائی کی یہ ممانعت امیر معاویہ کے زمانے تک بجنسہٖ قائم رہی۔ لیکن جب رفتہ رفتہ مسلمان یہ فن سیکھ گئے تو اُن کی فتوحات میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہونے لگی۔ چنانچہ پہلی صدی ہجری ہی میں ایک طرف شام اور مصر کی بندرگاہوں میں اُن کے جہاز موجود تھے، اور دوسری طرف موسیٰ نے افریقیہ کے نومفتوحہ سواحل پر تونس میں ایک اچھا خاصہ بیڑا تیار کر لیا تھا۔

مصری بیڑے اور جہاز رانوں کے مذکورۂ بالا حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ ابن نصیر نے اپنے بیڑے کی تیاری میں مصریوں سے بہت کچھ مدد لی تھی، اور چونکہ اسلامی فتح کے بعد یونانی اور رومی اقوام مصر سے نکل گئی تھیں، ظاہر ہے کہ مصری بیڑے میں عرب سرداروں کے ماتحت عربوں کے ساتھ ساتھ قبطی جہاز راں بہت اچھی تعداد میں موجود ہونگے۔ ایک اور بات یہ ہے کہ عرب مؤرخین جب "مصریوں" کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے اُن کی مراد ضرور قبطیوں ہی سے ہوتی ہے کیونکہ اُس وقت مصر میں قبطی ہی تھے۔ غرض یہ کہ موسیٰ نے قبطی قوم سے ضرور کام لیا ہے۔ اسی طرح جب عبدالرحمٰن اول اندلس پر تسلط قائم کرنے کے خیال سے وہاں پہنچے ہیں، تو اُن کے ہمراہ بجایہ میں ایک مصری لشکر تھا، جس نے اموی حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی۔ ۷۴۲ء کے بعد عقبہ، بجایہ اور تدمیر میں مصری فوج آباد ہو گئی تھی۔

بجایہ میں اور اندلس کے مغربی حصے میں پارچہ بافی کے فن میں مصری اثر اس قدر صاف اور نمایاں تھا کہ شاید، سوا اشبیلیہ کے، اندلس کے کسی اور حصے میں نہ تھا۔ حالت یہ تھی کہ مصر کے سیاح اور تاجر جو اندلس میں تازہ وارد ہوتے تھے، وہاں کے بعض کپڑوں کو دیکھ کر فوراً کہہ اُٹھتے تھے کہ "یہ مصری وضع ہے"۔ تدمیر میں (جو آجکل صوبۂ مرسیہ میں شامل ہے) اسلامی حکومت کے زمانے میں ایسے نفیس ریشمی کپڑے بنتے تھے کہ نہ صرف تمام اندلس میں مشہور تھے بلکہ مصر اور مشرق کو بھی بھیجے جاتے تھے۔

فتح اندلس کے دو سو سال بعد کا واقعہ ہے کہ عبدالرحمان ثالث نے اپنے ایک اشبیلی رشتہ دار کے نام ایک خط میں قبطیوں کا ذکر کیا ہے۔ علامہ مقری نے سنت یاقوہ کی فتح (۹۹۷ء) کے بیان میں لکھا ہے کہ "سینٹ جمیز کا گرجا پرہیزگار عیسائیوں کے نزدیک نہایت مقدس و متبرک جگہ تھی۔ اور نوبہ، سرزمین قبط، اور دوسرے دُور دراز ممالک سے عیسائی وہاں آتے تھے"۔ یہ امر شاید زیادہ قرین قیاس نہیں ہے کہ نوبہ اور مصر کے عیسائی اتنی دور کا سفر کر کے اندلس جا کر سینٹ جمیز کے گرجا کا حج کرینگے۔ لیکن یہ بات ناممکن نہیں ہے کہ اندلس کے قبطی عیسائی اور نوبہ کے وہ عیسائی غلام

یا سپاہی جو اندلس میں لائے جاتے تھے، اُس گرجا کا حج کرنے جاتے ہوں، کیونکہ اُن دنوں اُن کے ہم مذہب لوگوں کا بہت لحاظ کیا جاتا تھا۔

عبدالرحمان ثالث کے دورِ حکومت میں مشرق کی سیاسی ہلچل نے اندلس کی تجارت کو معرضِ خطر میں ڈال دیا، اور اندلسی مال تجارت کی نہایت کساد بازاری ہو گئی۔ آخر کار ۳۵۵ھ میں خلیفہ کے حکم سے مصری اور صقلی تجارت کے لیے اشبیلیہ میں ایک جہاز بنوایا گیا۔ اُس جہاز کا پہلا ہی بحری سفر تھا کہ راستے میں اُس کی ایک افریقی جہاز سے مڈبھیڑ ہو گئی جو معز الدولہ وزیر بغداد کی طرف سے صقلیہ کے گورنر کے نام خطوط لیے جاتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں لڑائی ہوئی جس میں اندلسی جہاز کو فتح ہوئی۔ اہل جہاز نے وزیر کے جہاز پر مع اُس کے کُل مافیہ کے قبضہ کر لیا، اُسے اپنے ہمراہ اسکندریہ کو لے گئے، اُس کا مال و اسباب وہاں فروخت کیا اور وہاں سے مصری پیداوار اور سامان تجارت لے کر اندلس کو واپس ہوئے۔ اس واقعہ نے طول کھینچا اور ان دونوں کے آپس میں کچھ عرصے تک اسی طرح کا مناقشہ رہا، جس کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ عبدالرحمٰن ثالث کی حکومت کو مصر سے تجارتی تعلق تھا۔

اس امر کی کافی شہادت موجود ہے کہ قبطی لوگ کافی تعداد میں اندلس گئے تھے، اور وہاں جا کر اُنھوں نے اسلامی حکومت کے امورِ داخلہ میں وہی حصہ لیا جو وہ اپنے وطن مصر میں لیا کرتے۔

اسی طرح اندلس میں جہاں جہاں بنی عربوں کا قدم پہنچا ہے، وہاں کی عمارات کی طرزِ تعمیر اور وضع میں قبطی اثر صاف نمودار ہے۔

تعمیرات میں ان اثرات کے لیے وہ گرجا شاہد ہیں، جو سولھویں اور سترھویں صدی کے مؤرخین کے قول کے موافق "پہلے مسجدیں تھیں" اور بعد میں گرجا کی صورت میں بدل دی گئیں۔ اشبیلیہ کے گرد و نواح میں، قادس کے مضافات میں، مرسیہ میں اور ان کے علاوہ اور مقامات میں، گرجاؤں کی بہت بڑی تعداد اس قسم کی ہے کہ اسلامی حکومت کے اُٹھ جانے کے بعد ان کی تعمیرِ دوبارہ نہیں ہوئی اور اب تک اُسی حالت میں ہیں جیسے اصل میں تھے۔ خواہ وہ عمارتیں اصل

میں مسجدیں جوں یا نہ ہوں، اس قدر ضرور ظاہر ہے کہ ان میں قبطی اثر نہایت صریح طور پر نمایاں ہے، عمارات کی بلندی اور دالانوں کی وضع صاف کہہ رہی ہے کہ وہ قبطی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں؛ مگر چھت کی ساخت بالکل عربی ہے تقریباً سب پر کھپریل ہے، اور اندر کی طرف کڑیاں دکھائی دیتی ہیں جن پر اقلیدسی شکلوں کی خاص اور خالص عربی طرز کی گلکاری اور منبت کاری ہے۔ اشبیلیہ کے گرجاؤں میں یہ بات خاص طور پر نظر آتی ہے۔ اس قسم کے گرجا جہاں جہاں پائے جاتے ہیں، ان کی خصوصیت یہ ہے کہ اُن کے مغربی حصے میں گول گول کھڑکیاں ہوتی ہیں، جن میں عربی طرز کے تراشے ہوئے پتھر لگے ہیں۔ اطراف میں جو حجرے ہیں ان کی وضع بالکل وہی ہے جو مصر کی مسجدوں سے ملحق مقبروں کی ہے۔ ان مقبروں کی وضع کی شناخت یہ ہے کہ ان میں سب سے نیچے ایک مستطیل چبوترہ ہے۔ جس پر ایک اور ہشت پہلو چبوترہ ہے، سولہ اضلاع کی دیواروں پر ایک گنبد قائم ہے جس کے نیچے اصلی قبر واقع ہے، پھر سب سے اوپر گنبد کے کلس پر روشنی کے لیئے چراغدان بنا ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اندلس کے ان مذکورہ گرجاؤں کی ساخت خاص مصری طرز کی ہے، اور یہ وضع اخمیم کے قبطی دیر رہبان کی ہے جس کی تعمیر ۵۰۰ء کی ہے۔

مصر کے فاطمی خاندان کی تباہی کے وقت تک مصر کی عمارات میں قبطی اور عربی عمارات کی طرز کوئی خاص فرق نہیں معلوم ہوتا۔ قبطی معماروں سے جب مسجد بنانے کو کہا جاتا تھا، تو وہ اُسی نمونے پر تیار کر دیتے تھے جس پر اپنے گرجا بناتے تھے۔ اس کی مثال یوں بہ آسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ مصر کی پرانی عمارتوں کو دیکھا جائے تو قبطیوں کی بنائی ہوئی عربی اور عیسائی عمارتوں میں تقریباً ہر جگہ یہ دکھائی دیتا ہے کہ ایک اقلیدسی شکل کے درمیان میں ایک صلیب بنی ہوئی ہے، اور ایک کثیر الاضلاع شکل کے چھوٹے سے حلقہ کے گرد ایک حاشیہ ہے جس میں ایک خرگوش کی شکل بنی ہوئی ہے۔ یہ خرگوش نجون کا تحریری نام ہے، جو سیرس دیوتا کا (جو مردوں کا حافظ و محافظ ہے) نشان ہے۔ اور اسی قسم کی اور ان گنت باتیں ہیں جو اس

قدیم طرز کی مشابہت کو پورا کر دیتی ہیں۔ اسی نوع کی تحریری علامات اور اقلیدسی اشکال کا نمونہ اشبیلیہ اور اُس کے گرد و نواح میں بھی پایا جاتا ہے۔ اندلس میں اب بھی اس قسم کے عجیب و غریب مجموعے عمارتیں تیار ہوتی ہیں، اور وہاں کی دیہاتی عورتیں اب بھی اپنی دستکاری میں اس کی پیروی کرتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صنعت و حرفت اور عام دستکاری میں یہ طریقہ قدیم زمانے سے اب تک نسلاً بعد نسلٍ جاری چلا آتا ہے۔

اس تمام بیان سے اتنا تو ضرور معلوم ہوا ہوگا کہ عبدالرحمان ثالث کے زمانے سے پہلے جو اشبیلیہ نے قرطبہ سے زیادہ ترقی کی تھی، اس کا اصلی سبب وہ فنون اور وہ تہذیب تھی جو تین طرح کی عناصر کے امتزاج سے پیدا ہوئی تھی۔ اول یہ کہ قوم گاتھ کے امرا نے (جن کا صدر مقام اشبیلیہ تھا) رومانی روایات کو برقرار رکھا تھا۔ دوم یہ کہ عربوں کا دارالسلطنت بھی وہی اشبیلیہ تھا (اور مسلمانوں کی حکومت اندلس کے تقریباً آخر تک رہا)، اور وہاں یمنی عربوں نے اپنے قدیم تمدن اور تعیش کے حالات اور سامان کو قائم و دائم کر دیا تھا۔ اور سوم یہ کہ یمنی عربوں نے مصر قدیم کے فنون و صناعات کی روایات کو اندلس میں بھی رائج کیا، اور اُن کے عمل اور ہر دلعزیز ہونے میں انہوں نے قرطبہ کے غالی المذہب سُنّی خیالات اور طرزِ عمل کو اُس میں دخل انداز نہیں ہونے دیا۔

اس مضمون پر اطلاع کے جس قدر ذرائع اس وقت تک ہم کو حاصل ہیں اُن سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اشبیلیہ میں کبھی یونانی معمار اور صناع نے کام کیا ہے۔ مگر اس قدر ضرور تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی اشبیلیہ کے شروع کے فنون و صناعات پر عیسائیوں کا زبردست اثر پڑا ہے۔ اس میں بھی شک کی گنجایش نہیں ہے کہ اسلامی حکومت کے تمام زمانے میں اندلس کے اکثر گرجاؤں میں مسلمانوں نے کسی طرح کی دست اندازی نہیں کی، خواہ اُس دست اندازی کا نتیجہ عمارات کے حسن کی صورت میں رونما ہوتا یا قبح کی۔ اور پھر آخر میں جب فرڈیننڈ نے ملک کو دوبارہ مسلمانوں سے فتح کیا ہے، تب تو ان تمام گرجاؤں کو واپس گرجا کی صورت

میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ اب رہی وہ عمارتیں، جن کی شکل یا انداز کو مسلمانوں نے تبدیل کر دیا تھا، ان کے متعلق اس امر کی شہادت موجود ہے کہ موحدین کے حملے اور حکومت سے قبل جس قدر تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کی ساخت و پرداخت کے لیے قبطی صناع یا اُن کے شاگردوں کو ان کی ترمیم پر لگا دیا گیا تھا، بعینہ جس طرح کہ مصر کے شیعی مسلمانوں نے قبطی معماروں سے چند عمارتوں کی ترمیم کا کام لیا تھا۔ اندلسی عمارتوں کی نوکدار محرابوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان علاقوں میں یمنی آبادکاروں کے علاقوں کی طرح، بازنطینی اثر نہ تھا بلکہ کوئی اور ہی اثر اپنا کام کر رہا تھا۔
یہ قبطی اثر مغربی اندلس کی عمارتوں کی صرف تعمیر ہی میں نمایاں نہیں ہے، بلکہ اگر عربی قلعوں اور گرجاؤں کو غور سے دیکھا جائے تو اُن کی دیواروں کی استرکاری اور اُن کی فصیلوں کی اینٹوں میں جو نقش و نگار ہیں وہ بھی اس قبطی اثر کا نمونہ ہیں۔ برعکس اس کے موحدین کے زمانے میں اس نوع کی جو تعمیرات ہوئی ہیں اُن کی صورت کچھ اور ہی ہے۔

افسوس ہے کہ آج کل ہمارے پاس پارچہ بافی، زرگری، شیشہ سازی اور سفال کاری کے وہ نمونے یا آثار موجود نہیں ، جو بقول ابن سعید، اشبیلیہ مُرسیہ وغیرہ میں اہل یمن کی حکومت کے دوران میں اس قدر نفاست اور حُسن کو پہنچ گئے تھے کہ اُن کے کمال کو پہنچنا مشکل ہے۔ یہ گیارھویں صدی عیسوی کا ذکر ہے، اور ظاہر ہے کہ اُس وقت تک قبطی صناعوں کے اندلسی شاگرد اپنے استادوں کے کمال کو حاصل کر چکے ہونگے۔ صنعت و حرفت کا یہ کمال صرف حرفت پیشہ لوگوں تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ شاہزادے تک اس کام میں شریک تھے؛ چنانچہ گیارھویں صدی (عیسوی) کے ایک طلائی ظرف پر کے ایک کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک یمنی شاہزادے کی دستکاری کا نمونہ ہے اور اُس نے اپنے دادا معتمد اشبیلی کے لیے بنایا تھا۔

اشبیلیہ میں موحدین کے زمانے میں بھی یمنی قبائل کے افراد ارکان دولت اور عمائد سلطنت میں شامل تھے۔ اُن کو نہ صرف امور شاہی بلکہ کوائف ملکی میں جو درخور حاصل تھا۔

اس کا ایک عمدہ نمونہ جیرالڈا کے مینار میں نظر آتا ہے۔ پھر اس مینار اور معتمد ابن عباد کے قصر کے حصۂ زیرین کی ساخت میں جو غائر مناسبت اور مشابہت ہے، اس سے بھی اس اثر کا پتہ چلتا ہے۔ موحدین کے خروج کے بعد عیسائیوں نے اشبیلیہ کی چند عمارتوں میں جو دست اندازی کی اور ان کے حسن و شان کو برباد کیا ہے اُس کا جس قدر رنج کیا جائے بجا ہے۔ اس نافہمی اور کمینہ خیالی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اشبیلیہ کے متعدد قیمتی نمونے ہماری آنکھوں سے ہمیشہ کیلیے اوجھل ہو گئے۔ مسلمانوں کی عمارات کی اندرونی زیبائش، اُن کے شیشہ آلات کی نازکی، سامان نشست و برخاست کی خوبی و لطافت، پردوں کی چمک ایسی چیزیں تھیں کہ قشتالہ کے عیسائیوں کی آنکھیں چوندھیا گئیں۔ یہ تمام چیزیں خالص عربی ساخت کی تھیں۔ ایک لباس کا ٹکڑا اب بھی میڈرڈ کے عجائب خانے میں محفوظ ہے۔ قشتالی عیسائیوں نے، اس میں شک نہیں، کہ ان اشیاء کے حسن و لطافت کی بخوبی داد دی۔ چند ہی عرصہ میں یہ سامان عیش و زندگی لوگوں میں اس طرح عام ہوا کہ حکومت کی طرف سے اس کی بندش کی تدبیریں اختیار کی گئیں۔ پھر خود اہل دربار اور صاحب دربار کا دل ان چیزوں سے اس قدر پُر ہو گیا کہ نتیجہ بالکل برعکس ہوا اور اُنھوں نے دیدہ و دانستہ اور نہایت بے رحمی کے ساتھ اپنے پیش رو اسلامی حکومت کے ہر طرح کے نشانات کو مٹانا شروع کیا، اور مٹا کے چھوڑا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(ماخوذ)

محمد نعیم الرحمن۔ ایم اے۔ ایم آر اے۔ ایس

(مدراس)

جدید عالم اسلامی

مسٹر لوتھروپ اسٹوڈرڈ کی کتاب جدید عالم اسلامی کے مختلف بابوں کا اقتباس ہدیۂ ناظرین ہے۔ موصوف امریکہ کے مشہور ماہر سیاست ہونے کے علاوہ سیاسیات اسلامی کے ساتھ خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ کتاب مذکور اس کا بین ثبوت ہے۔

اسلام کی محیر العقول کامیابی کے متعدد اسباب تھے۔ ان میں خاص طور پر ممتاز عربی نسل کی خصوصیات محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات اور اس زمانہ میں مشرقی دنیا کے حالات ہیں۔ پیروان مذہب زرتشت اور عیسائیوں میں آپس کے مذہبی اختلافات پھیلے ہوئے تھے۔ ایران اور روم کی سلطنتوں میں حال ہی میں ایک ہولناک جنگ ہو چکی تھی، مزید برآں یہ کہ دونوں سلطنتیں پنجۂ استبداد میں گرفتار تھیں جس کی وجہ سے رعایا میں وطن خواہی نیز حکومت کی وفاداری کا خیال مفقود تھا۔ ان لوگوں نے اسلام کے جمہوری اور سادہ اصول بہت جلد قبول کر لیے اور اسلام کے حلقہ میں داخل ہو گئے۔
علاوہ بریں عربوں میں حکومت قائم کرنے کی خداداد قابلیت موجود تھی۔ وہ غیر مہذب اور خونخوار قوم نہ تھی (جیسا کہ بعض کا خیال ہے)، وہ اپنے سے پرانے تمدنوں کے اصول معلوم کرنے کے مشتاق تھے۔ شادی بیاہ کے ذریعہ محکوم اقوام کے ساتھ بہت جلد مل گئے اور اس اختلاط نے ایک نئی تہذیب کی بنا ڈالی جو یونان، روما اور ایران کی قدیم تہذیبوں کی ترکیب، عربی حرارت اور روح اسلامی کی رہین منت تھی۔ اپنے ابتدائی تین صدیوں تک (۷۵۰ سے ۱۰۰۰ء) ممالک اسلامی دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ بڑے بڑے شہر، عالیشان مساجد اور شور و شغب سے علٰحدہ دارالعلوم جہاں قدیم دنیا کے علم و عقل کے محافظ اور قدرداں جمع رہتے تھے ہر جگہ موجود تھیں۔

اسلامی مشرق اور مسیحی مغرب میں اس وقت تضاد تھا کیونکہ تمام یورپ پر جہالت کی اندھیری گھٹا چھا رہی تھی۔ دسویں عیسوی میں عربوں کی اس تہذیب میں تنزل کے آثار صاف نمایاں ہونے لگے۔ خانہ جنگی، حقیقی رہبران ملت کا فقدان اور سب سے بڑھکر ریگستان عرب کی قوت بخش فضا سے محرومی، یہ اسباب تھے جنہوں نے ملت اسلامیہ کا شیرازہ بکھیر دیا۔

جب غیر عرب اقوام نے اسلام قبول کیا تو انہوں نے رسول عرب (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیغام کی تاویل اپنے رجحانات طبع اور نسلی روایات کے مطابق کرنی شروع کی۔ ایران و ہندوستان کا تصوف اور مسئلہ ہمہ اوست، شمالی افریقہ کی پیر پرستی انہیں رجحانات طبعی کا نتیجہ ہیں۔ اسی قسم کے مابعد الطبعی خیالات نے اصل روح اسلامی کو بالکل منقلب کر دیا۔

ان اعتقادی اختلافات کے ساتھ سیاسی اختلافات بھی واقع ہوتے رہے۔ عباسیوں کی جانشینی کے وقت پہلا اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ خاندان بنی امیہ کا ایک مغرور فرد قرطبہ میں اپنی علیحدہ خلافت قائم کرتا ہے اور تمام شمالی افریقہ اس کی خلافت کو تسلیم کر لیتی ہے۔ ادھر مصر میں فاطمی خلافت کا قیام عالم اسلامی کے سیاسی اتحاد کے حق میں سم قاتل کا حکم رکھتا ہے۔

مذہبی اور سیاسی اختلافات نے قوم عرب کی دماغی نشو و نما اور قوت فکری کی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کر دیں۔ عرب اپنے مذہب کے سخت پابند تھے لیکن ان میں تعصب نہ تھا۔ وہ اپنے دماغوں کو ہمیشہ کشادہ رکھتے تھے۔ مشرقی دنیا کے فاتحوں (یعنی عربوں) کے اسلام کے اصول میں حد درجہ سادگی تھی اور اس سادہ مذہبیت نے عربی دماغ کے لئے جو فلک پیما جستجو پسند اور علوم کا متلاشی تھا کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کی۔ انہوں نے قدیم علوم و فنون کی صرف قدردانی اور سرپرستی ہی نہیں کی بلکہ اپنی مادری زبان میں تمام یونانی اور ایرانی علوم کی کتابوں کو تراجم کے ذریعہ منتقل بھی کر لیا۔

فرقہ معتزلہ صرف فلسفیانہ بحث و مباحث تک محدود نہ رہا بلکہ ان تمام تر تحریک کا تنوع مذہبی اور سیاسی استبدادیت کے خلاف رہا۔ انہوں نے عوام الناس میں خلافت کے

انقلاب اور خلیفہ کی عامۃ المسلمین کو جوابدہی کے متعلق تبلیغ شروع کی۔ حکومت کی طرف سے اس تحریک کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اس زمانہ سے مسلمانوں کی دماغی نشوونما ایسی رُکی کہ اب ہمارے زمانہ میں اس کے احیا کے کچھ آثار نظر آتے ہیں۔

عباسیوں میں اپنے آبا و اجداد کی سی تاب و توانائی نہ رہی تھی اس لئے ترکوں کی جماعت جو پہلے سے معاملات حکومت میں اپنا اثر رکھتی تھی برسر اقتدار ہوگئی۔ ترکوں کے زمانہ میں مشرق و مغرب کے تعلقات کی ناخوشگواری بڑھ گئی۔ تمام مسیحی مشرق ترکوں پر آندھی کی طرح ٹوٹ پڑا۔ ترکوں کی فتوحات کے بعد "مسیحی جہاد" تمام دنیا کے لئے بہت بڑی بدنصیبی تھی۔

جب اسلامی مشرق ترکوں اور مغلوں کی فتوحات کا آماجگاہ تھا عین اسی زمانہ میں یورپ میں بیداری اور زندگی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ ہندوستان اور براعظم امریکہ کے بحری راستوں کی دریافت نے اور سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ اب ملکۂ بحر یعنی یورپ کی جانب قوت کا پانسہ پھر تاہے۔ سائنس کے طلسم سے یورپ نے میدان ترقی کی مسافت بہت قلیل عرصہ میں طے کرلی۔

بایں ہمہ مسلمانوں نے کروٹ تک نہ بدلی۔ آہستہ آہستہ میراث اسلامی یورپ کے قبضہ میں آگئی۔ اب خدا خدا کرکے مسلمانوں میں یورپ کی یورش کا احساس پیدا ہوا۔ یہ جنگِ عظیم مسیحی یورپ کا مسلمانوں کے خلاف آخری حربہ تھا۔ عالم اسلامی کی غلامی کم از کم "کاغذ" پر تو پایۂ تکمیل کو پہونچ ہی گئی۔ میں نے قصداً لفظ "کاغذ پر" اس لئے استعمال کیا کہ عین اسی زمانہ میں جبکہ "مسیحی مغرب" نے اپنے پندار میں اپنے آپ کو "اسلامی مشرق" پر مسلط کرلیا تھا اس وقت مغربی اقتدار کے خلاف جہاد عام بولا جا چکا تھا۔ گزشتہ صدی میں عالم اسلامی میں ایک عظیم الشان انقلاب کی آگ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ آخر کار مغرب کی موج تند نے غیر متحرک جسم کو اپنی جگہ سے ہٹا دیا۔ مراکش سے چین اور ترکی سے کانگو تک مسلمانوں کو اپنی رسوائی کا احساس پیدا ہوگیا۔ پہلی چنگاری ریگستان عرب ہی میں بھڑکی جو اسلام کا گہوارہ ہے۔ تحریک وہابی مسلمانوں کی اصلاح کے لئے اٹھائی گئی اور اسی کی آغوش میں احیا و اتحاد

اسلامی کی تحریکوں (پن اسلامزم) نے پرورش پائی جس قدر یورپ کی طرف سے یورش بڑھتی گئی احیاے ملت کے لئے مسلمان زیادہ آمادہ ہوتے گئے۔ یہ صدہاے جانستاں تھے جو گزر گئے اور اب "جدید عالم اسلامی" کی تعمیر شروع ہوتی ہے۔

عالم اسلامی اٹھارویں صدی عیسوی میں اپنی انتہائی ذلت کا زمانہ دیکھ چکا ہے۔ علم و مذہب دونوں مردہ ہو چکے تھے۔ مستبدانہ طریق حکومت رائج تھا۔ لیکن اسی زمانہ میں عبدالوہاب کی ریگستان عرب میں گونجتی ہوئی آواز نے تمام عالم اسلامی کے لئے برق کا اثر دکھایا یہ احیاے اسلامی کی ابتدا ہے۔ محمد بن عبدالوہاب شہر نجد میں ۱۷۰۳ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے علم کا شوق اور رجحان طبع مذہب کی طرف تھا۔ باوجودیکہ ان کے بعد ان کی سیاسی طاقت بہت جلد فنا ہو گئی لیکن ان کا روحانی تصرف اور زاہدانہ زندگی کا اثر برابر قائم رہا۔ ان کی تمامتر تعلیم توہمات کے خلاف تھی لیکن ان کے بعد تنگ نظری ان کے پیرووں میں پیدا ہو گئی۔

اب دوسرا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ آزاد خیالی اس تنگ نظری کا لازمی ردعمل ہوئی آزاد خیال مسلمان مدبرین ہندوستان، ترکی اور مصر میں پیدا ہوئے۔ مدحت پاشا اور رشید پاشا نے ترکی کو ذمہ دار اور جمہوری حکومت بنانے کے لئے جو کوششیں کیں ہمیشہ یادگار رہینگی۔

مصر میں شیخ محمد عبدہ جو آزاد خیال مدبر اور تحریک "احیاء اسلام" کے علمبردار تھے موجودہ تاریخ اسلام کی قابل احترام ہستیوں میں ہیں۔

پن اسلامزم درحقیقت تحریک "اتحاد اسلام" تو اسی وقت سے موجود ہے جب کہ رسول عربی کی بعثت ہوئی اور انہوں نے آپس میں ان کافروں کے خلاف ایمان کا عہد کیا جو ان کی تباہی و بربادی کے درپے تھے۔ عالم اسلامی کی یکجہتی فریضۂ حج اور خلافت کے ساتھ قائم ہے۔ عام خیال کے خلاف میری یہ ذاتی رائے ہے کہ صرف حج کی وجہ سے شیرازہ اسلامی منتشر ہونے سے بچا رہا۔ حج درحقیقت "اتحاد اسلام"

کی اسلامی کانگریس ہے جہاں عالم اسلامی کی مدافعت اور بہبود و فلاح کی تدابیر سوچی جاتی ہیں۔ یورپ کے اکثر مدبرین اور اخبارنویس طبقہ کا اب تک یہ خیال ہے کہ اگر "خلافت" کا خاتمہ کر دیا جائے یا شریف مکہ کو خلیفہ بنا دیا جائے تو تحریک" اتحاد اسلام خود بخود فنا ہو جائے گی۔

اتحاد اسلام سے یورپ کی مخالفت اس وقت سے خیال کی جانے لگی جس وقت سے کہ انگریزوں نے ہندوستان، فرانس نے الجیریا اور روس نے ترکستان فتح کیا۔ تمام سنجیدہ مزاج مسلمانوں کو بھی یقین ہو گیا کہ عنقریب باقی ماندہ ممالک بھی یورپ کے زیر تصرف ہو جائیں گے۔ خوف و نفرت بڑھتی رہی اور اٹھارویں صدی سے اس کا اظہار شروع ہو گیا۔ شمالی افریقہ، الجیریا اور ترکستان کی حکومت کے خلاف بغاوتیں موئیں اور افغانستان، وسط ایشیا اور مغربی چین میں نقشبندیہ برادری کی شورشیں دراصل اندرونی اضطراب کے مظاہر تھے۔ اس کے بعد جزائر مشرقی میں ڈچ گورنمنٹ کے خلاف جنگ اچین اور مہدی سوڈانی کی انگریزوں سے جنگ اُسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

ان تمام تحریکوں میں عالم اسلامی کی خصوصیت فقدان نظام ہے۔ "تحریک اتحاد اسلام" کا باقاعدہ آغاز انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں شروع ہوتا ہے۔ اس تحریک کے دو علیحدہ مرکز قائم ہوتے ہیں لیکن دونوں مقاصد میں مشترک۔

(۱) مذہبی برادریاں — مثلاً سنوسی برادری۔ یہ لوگ اپنے مقاصد کا ذریعہ حصول خالص مذہبی تبلیغ کو ٹھیراتے ہیں اور پیری مریدی کے ذریعہ ان لوگوں کے خیال میں اسلام کو گزشتہ شوکت پھر حاصل ہو سکتی ہے۔

(۲) تبلیغ سیاسی — جمال الدین الافغانی کے رفقائے کار کا یہ طریقہ ہے۔

مذہبی برادریاں شمالی افریقہ میں صدیوں سے موجود ہیں۔ ان کا نظام تقریباً ہر جگہ ایک سا ہے۔ ہر قریہ میں ایک "زاویہ" اور "مقدم" ہوتا ہے "مقدم" اُس قریہ کی تمام

برادری کا سردار ہوتا ہے۔ ان برادریوں میں "سنوسی برادری" ممتاز حیثیت رکھتی ہے
سید محمد بن سنوسی۔ نظام سنوسیہ کے بانی ہیں۔ انہوں نے طرابلس میں اپنا مشن شروع
کیا۔ ان کے بعد ان کے چھوٹے بیٹے سنوسی المہدی جانشین ہوئے جن وجوہ سے ان کو اپنے
بڑے بھائی پر ترجیح دی گئی وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ سید محمد کے دو بیٹے تھے انہوں نے
اپنے جانشین کے انتخاب کے لئے دونوں کا امتحان لینا چاہا۔ چنانچہ تمام "زاویہ" کے روبرو
ان دونوں کو حکم دیا کہ سب سے اونچی کھجور کے درخت پر چڑھ جاؤ۔ جب وہ چوٹی پر پہونچ گئے
تو کہا کہ "اللہ اور رسول کے نام پر فوراً کود پڑو" چھوٹا بیٹا بلا تامل کود پڑا اور چونکہ دل میں
اعتقاد تھا اس کے چوٹ بھی زیادہ نہ لگی۔ بڑے صاحبزادہ نے انکار کیا اور کہنے لگے کہ "یہ تو
خودکشی ہوگی"۔ اسی طرح سنوسی المہدی جانشین ہوئے۔ اس واقعہ سے ان لوگوں کی مذہبیت
کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ تمام شمالی افریقہ میں ان کے "زاویہ" موجود ہیں۔ ایک "زاویہ اکبر"
ہے جہاں سے سب کو ہدایات بھیجی جاتی ہیں۔ ان کا امیر السنوسی کہلاتا ہے۔

ان کا مقصد ہے کہ افریقہ کو اور بعد ازاں "عالم اسلامی" کو ایک امام کے ماتحت لایا جائے
اور ان کے نزدیک سیاسی غلامی سے اسوقت تک نجات نہیں مل سکتی جب تک کہ سب مسلمانوں
میں رشد و ارشاد کے ذریعہ روحانی تعلق نہ قائم ہو جائے۔

انہوں نے ہر جگہ اپنے مدارس قائم کرلئے ہیں جہاں تبلیغ مذہب طلبا کو سکھلائی جاتی ہے۔
یہ لوگ ہر سال اپنی جماعت میں لاکھوں مسلمانوں کا اضافہ کرتے ہیں۔

تاتار عرصہ سے روسیوں کے زیر تسلط ہے اور یہاں کے مسلمانوں کو حکومت کی طرف سے
عیسائی بنانے کو زور ڈالا گیا لیکن یہ لوگ سب مصائب اپنے ایمان کی خاطر برداشت کرتے رہے
انیسویں صدی کے نصف میں جب کہ "اتحاد اسلام" کی موج ہر طرف لہریں مار رہی تھی یہ
دور دراز راہ ملک بھی اثر سے علیحدہ نہ رہ سکا۔ یعقوب بیگ نے ترکستان اور مغربی چین کے
مسلمانوں میں حکومت کے خلاف آزادی کامل کا اعلان کرا دیا۔ سلطان ٹرکی کی طرف سے

ان کو خطاب دولت بھی عطا ہوا۔ اگرچہ بعد میں گورنمنٹ نے ان کی تحریک کا خاتمہ کر دیا لیکن یہ بڑی غلطی ہوگی اگر تحریکوں کے عارضی دب جانے کو فنا ہونا کہا جائے:

سید جمال الدین الافغانی تحریک "اتحاد اسلام" میں سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ انیسویں صدی کے اوائل میں وہ مقام اسد آباد نزد ہمدان پیدا ہوئے۔ ان کے نام سے واضح ہے کہ وہ افغانی نسل سے تھے اور ان کی رگوں میں عربی خون بھی تھا۔ برخلاف سنوسیوں کے انہوں نے تمام تر توجہ میدان سیاست کی طرف منعطف کی۔ یہ سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے مغربی اقتدار پسندی کی ماہیت کو سمجھا اور اپنی عمر "عالم اسلامی" کو اس کے خلاف مدافعت کے لئے تیار کرنے میں صرف کی۔ تھوڑے عرصے ہندوستان میں قید رہنے کے بعد وہ ۱۸۷۱ء میں مصر پہونچے۔ یورپیوں کے خلاف عربی پاشا کی تحریک انہیں کے ایما سے ہوئی۔ ۱۸۸۲ء میں جب انگریزوں کا قبضہ مصر مکمل ہوگیا تو سید موصوف جلاوطن کر دیئے گئے کچھ عرصہ تک بے خانماں پھرنے کے بعد قسطنطنیہ پہونچے۔ سلطان عبدالحمید خاں پرجوش "اتحاد اسلامی" کے حامی تھے انہوں نے بہت جلد اپنا اثر جمایا۔ محکمۂ تبلیغ و اشاعت کا افسر اعلیٰ ان کو بنا دیا گیا۔ ۱۸۹۶ء میں انہوں نے انتقال کیا اور آخر وقت تک اپنے مقاصد کی تکمیل میں کوشاں رہے۔

عبدالحمید خاں ۱۸۷۶ء میں تخت سلطنت پر متمکن ہوئے جنگ روس سے قبل ٹرکی میں ان مدبرین کا گروہ برسراقتدار تھا جو ٹرکی کو یورپ کی دوسری حکومتوں کی طرح موجودہ تہذیب و تمدن کا مرکز بنانا چاہتا تھا۔ انہوں نے جمہوری حکومت کو رائج کیا لیکن جب عبدالحمید خاں کا زمانہ شروع ہوا تو انہوں نے عطا کردہ اختیارات ضبط کرلئے اور مستبدانہ حکومت قائم کر دی۔ عبدالحمید خاں نے "اتحاد اسلام" کے استحکام کے لئے باقاعدہ ایک نظام تیار کیا تھا لیکن ۱۹۰۸ء میں نوجوان ترکوں کے انقلاب نے ان کی اسکیم کو دگرگوں کر دیا۔

اسی زمانہ میں ایران میں بھی انقلاب رونما ہوا۔ دستوریت، قومیت اور اشتراکیت

کے خیالات عالم اسلامی میں پھیل رہے تھے۔ ان گوناگوں خیالات کی وجہ سے "اتحادِ اسلام" کا مفہوم خبط ہوگیا لیکن سنہ ۱۹۱۲ء میں یورپ کی طرف سے دباؤ پڑنے کی وجہ سے یہ تحریک پھر اپنے اصل رنگ میں ظاہر ہوئی۔ اٹلی نے سنہ ۱۹۱۲ء میں طرابلس پر جو ٹرکی کے ماتحت تھا حملہ کیا اور اس کے فوراً بعد جنگ بلقان شروع ہوگئی جس کے خاتمہ پر یورپین صوبے جو ٹرکی کے ماتحت تھے مین قسطنطنیہ کی دیواروں تک چھین لیے گئے۔ انگلستان اور روس نے ایران پر اپنی دیرینہ آرزوئیں پوری کیں اُدھر فرانس نے مراکش پر تسلط جمانے کی ٹھانی غرضکہ یورپ کی عنایات سے "تحریک اتحادِ اسلام" میں جان پڑگئی۔

جنگ طرابلس سے قبل ترکوں اور عربوں کے تعلقات ناخوشگوار تھے۔ اس جنگ بلقان نے ان کے تعلقات میں یگانگت پیدا کردی۔ جنگ طرابلس کے موقعہ پر فرانس کے وزیر اعظم نے بالکل درست کہا تھا:۔ "اٹلی نے جد جامد کو متحرک کیا ہے نہ صرف اس کو بلکہ ہم سب کو اس کا نتیجہ بھگتنا پڑیگا"

ہندوستان اور چین کے مسلمان اب تک اپنے ملکوں کی حکومت کے خلاف تحریکوں میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ لیکن اب انھوں نے بھی اپنے غیر مذہب ملکی بھائیوں کے ساتھ جو آزادی کی جدوجہد کر رہے تھے عملی ہمدردی ظاہر کرنا شروع کردی۔ جنگ عظیم کے دوران میں مسلمان اس لیے خاموش رہے کہ وہ اپنی کمزوریوں کو جانتے تھے اور فیصلہ کن جنگ کے لیے تیاری کرنا انکے نزدیک قرین مصلحت نہیں معلوم ہوا۔ صلح ورسلیز نے یورپین ارادوں کی توضیح کردی اور مسلم لیڈروں کو تمام دنیا کے مسلمانوں کی اخلاقی و مادی مدد حاصل کرنے کا زرین موقعہ مل گیا۔

مغربی اثر اس وقت عالم اسلامی میں مغرب کی کورانہ تقلید نہیں کی جارہی ہے بلکہ مشرقی مقاصد کے حصول کے لیے مغربی ذرائع اختیار کیے جارہے ہیں۔

مشرق پر مغرب کا اثر پڑنے کی اصل وجہ تو اس کی سیاسی حکمرانی ہے۔ مغرب کے گوناگوں خیالات نے زیادہ تر تعلیم یافتہ جماعت پر اثر کیا لیکن وہی یورپ پرست نوجوان اپنی امیدوں میں ناکام ہوئے تو مغرب کے تمام محاسن کے منکر ہوگئے اور ان کے سخت ترین دشمن بن گئے۔

درحقیقت مغرب کی طرح مشرق کی خصوصیات زندگی علٰحدہ ہیں لیکن گزشتہ دس صدیوں میں عادات حسنہ کے بجائے برائیاں زیادہ تر اختیار کی جارہی ہیں جس کا نتیجہ عدم ترقی، جمود، ذلت و غلامی ہے۔

مشرقیوں کے نزدیک یورپیوں کا ان کے ممالک میں رہنا چاہے وہ کتنے ہی علٰحدہ کیوں نہ رہتے ہوں ایک مستقل ذلت ہے۔ مشرق میں یورپین کا وجود نہ صرف ایک غیرملکی کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ اجنبی حاکم کی جسکا تعلق دوسری نسل سے ہے بنی نوع انسان کی نسلی تقسیمیں انسانی تجربہ میں سب سے زیادہ اہم، دیرپا اور کبھی نہ محو ہونے والے نقوش ہیں۔ اختلاط نسل کے ذریعہ مخصات فنا ہو جاتے ہیں اور امتیازات کو مٹانے کی کوشش سے بجائے نفع کے نقصان کا زیادہ اندیشہ ہے۔ علٰحدہ رہکر دو نسلیں تبادلہ خیالات کے ذریعہ تہذیب و تمدن کے میدان میں زیادہ پیشقدمی کرسکتی ہیں۔

سیاسی تبدیلی

مشرق کی ترقی کی سب سے بڑی سدراہ اسکی سیاسی روایات ہیں۔ طریقہ استبدادیت یہاں قدیم زمانہ سے رائج چلا آتا ہے۔ بادشاہ اپنی مرضی ومنشار کے موافق سفید وسیاہ کرسکتا ہے۔ رعایا کی حیثیت بمنزلہ غلام کے ہوتی ہے۔ جس کی ذاتی ملکیت، عزت وشرف یہاں تک کہ اس کی جان بھی حاکم کی مرضی کے تابع ہوتی ہے۔ مشرق کی یہ خوش قسمتی ہے کہ بادشاہوں کی استبدادپسند طبائع پر مذہب کا خوشگوار اثر رہا۔ خوف خدا کی وجہ سے یہ لوگ رحم وانصاف کی حدود سے متجاوز نہیں ہونے پاتے تھے۔ بایں ہمہ ایک رحم دل بادشاہ کے یہ اختیار کی بات تھی کہ راتوں رات اپنی مستقل عادت بدل ڈالے یا کسی عورت پر فریفتگی یا اپنے معدہ کی کسی خرابی کی وجہ سے پوری سلطنت کی قسمت کو معرض خطر میں ڈالدے۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں یہ طریقہ حکومت ہرجگہ رائج تھا۔ تحریک "احیائے اسلام" نے نہ صرف مذہبی امور کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا بلکہ اس زمانہ کے مستبدانہ طرز حکومت کے خلاف بھی انہوں نے صدائے احتجاج بلند کی۔ انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں ٹرکی میں

اعتدال پسند جماعت نے کمزور سلطان سے پارلیمنٹ کے اختیارات کی منظوری لے ہی لی۔ لیکن اس کے فوراً بعد عبدالحمید خاں نے وہ سب اختیارات عملاً واپس لے لیے۔ دیگر ممالک اسلامی میں بھی آزاد خیال، اور تعلیم یافتہ جماعت میں اسی قسم کی سیاسی امنگیں موجود تھیں۔

دنیا کے تمام مذاہب میں مسلمانوں کی سیاسی روایات سب سے زیادہ جمہوریت کی طرف مائل ہیں۔ مذہبی اصول کے علاوہ اس مذہب نے عربوں کی حریت پسند قوم کے گہوارہ میں ابتدائی زندگی گزاری ہے۔ اسی لیے حریت و مساوات کے رجحانات مسلمانوں سے زیادہ اور کسی قوم میں نہ ملیں گے۔ دمبری نے ٹھیک کہا ہے:۔ "دنیا میں سب سے زیادہ جمہوریت نواز اور حریت پسند و مساوات، پسند مذہب اسلام ہے۔ دنیا میں اگر کبھی آئینی دستوری حکومت قائم ہوئی ہے تو یقیناً وہ خلفائے راشدین کے عہد میں ہوئی"۔

قومیت

قومیت موجودہ سیاسیات عالم کی روح رواں ہے انیسویں صدی میں قومیت کے جذبہ نے یورپ کی صورت حالات کو بالکل منقلب کر دیا۔ اسی لیے اس زمانہ کو "عہد قومیت" سے تعبیر کرتے ہیں۔ قومیت کے جذبات صرف یورپ ہی تک محدود نہیں ہیں۔ اب تو دنیا کا گوشہ گوشہ اسی جذبہ کے زیرِ اثر ہے۔ آخر قومیت ہے کیا؟۔ اس کی بہت سی تعریفیں کی گئیں ہیں۔ اکثر نے نسل و زبان کو بعض نے تہذیب و مذہب اور جغرافی حدود کو، اور بعضوں نے سیاسی و اقتصادی اغراض کے اشتراک کو اسکا مرادف ٹھہرایا ہے۔ لیکن قومیت اپنے ان اجزائے لاینفک سے بالاتر ہے۔ درحقیقت یہ ایک کیف نفسی ہے۔ یہ انسانوں کی ایک جماعت کے اعتقاد کا نام ہے۔ قوم کی جامع تعریف یہ ہے کہ جو لوگ مخصوص و متعین جغرافی حدود میں آباد ہوں، ایک مقصد رکھتے ہوں اور سب ایک ہی حکومت کے ماتحت ہوں قومیت اور نسل کے فرق کو اچھی طرح ذہن نشیں کرنا چاہیے۔ قومیت کا وجود دماغی کیفیت سے زیادہ نہیں برخلاف اس کے نسل Physiological واقعیت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اسکی علمی تحقیق و تصدیق ہو سکتی ہے مثلاً سر کی پیمائش، بالوں کی ساخت، آنکھوں کا رنگ وغیرہ

میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ سیاسی نقطۂ نظر سے لوگوں کے ایک خاص خیال کو قومیت کہہ سکتے ہیں۔

موجودہ عہد میں قومیت سیاسی زندگی پر حکمراں ہے اور عملی سیاسیات میں لوگ یہ نہیں خیال کرتے کہ وہ اتحادہ کیا ہیں بلکہ وہ کیا خیال رکھتے ہیں۔ رنگ و نسل کے نام پر شاید ایک یورپین اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کرے لیکن وہ اپنی خیالی نسل کی خاطر (جس کو وہ قوم کہتا ہے) جان فدا کر دینے میں بھی دریغ نہ کریگا۔

قومیت اور مسلمان

سید جمال الدین الافغانی کی تعلیمات میں بھی قومی رجحانات پائے جاتے ہیں۔ سید موصوف بادی النظر میں بین الاقوامی آدمی ہیں لیکن اگر بہ نظر تدقیق دیکھا جائے تو ان کی مثال "قومیت اسلامی" اور "اتحاد اسلام" کو منسلک کرنے والی کڑی کی ہے۔

ترکوں میں اپنی تعلیم کی وجہ سے جذبۂ قومی سب سے پہلے پیدا ہوا۔ قومی رہنماؤں نے عہد ماضی کے قومی کارنامے یاد دلا کر اور مستقبل کا یقین رکھتے ہوئے قوم میں بیداری پیدا کر دی۔ جیسا کہ قاعدہ ہے کہ قومی بیداری کے ساتھ نہضت علوم از خود عمل میں آجاتی ہے ترکوں نے بھی اپنی زبان ترکی کو بہت ترقی دی اور تمام علوم اس میں منتقل کر لیے۔ یورپ کی طرف سے سیاسی دباؤ نے قومیت ترکی کے ارتقا کے لیے اکسیر کا اثر کیا۔

عربی قومیت

عرب قوم پرستوں کے ایماسے شام میں جو بغاوت ظہور پزیر ہوئی اگرچہ بہت جلد فرو کر دی گئی لیکن اس نے تمام دنیا کی نگاہیں تحریک "اتحاد عرب" کی طرف متوجہ کر دیں۔ عبدالحمید خاں کے دوران حکومت میں عربوں میں دو متضاد قوتیں عمل کر رہی تھیں۔ اگر ایک طرف قومی امنگیں ان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کو مجبور کرتی تھیں تو دوسری طرف جذبۂ "اتحاد اسلامی" ان کو ترکوں کے خلاف کوئی ایسی کارروائی کرنے سے مانع تھا جس سے اسلام کے مفاد عام کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

نوجوان ترکوں نے انقلاب کے بعد عربوں کی امیدیں پوری نہ کیں۔ پارلیمنٹ ان کے لیے دراصل فریب نظر تھا۔ چنانچہ عرب وطن پرستوں نے مصر اور شمالی افریقہ کے باشندوں کے ساتھ جو عربی زبان بولتے تھے رشتۂ اتحاد قائم کیا۔ ۱۹۱۳ء میں انھوں نے پیرس میں کانگرس منعقد کی اور اس کے بعد ترکوں کے خلاف پروپگنڈہ شروع کر دیا۔ جب جنگ عظیم شروع ہوئی تو عربوں کے جذبات بے چینی اور اضطراب کی حد تک پہنچ گئے تھے۔ مزید برآں اتحادیوں کے سبز باغ دکھانے سے عربوں کو ترکوں کے خلاف جان توڑ کر لڑنے کو آمادہ کیا۔ ۱۹۱۶ء میں شریف مکہ کا ترکوں سے آمادۂ پیکار ہونا دراصل ترکوں کی شکست کا پیش خیمہ تھا۔

مصر یورپ سے قریب ہونے کی وجہ سے مصر نے وہاں کے خیالات کا سب سے زیادہ اثر قبول کیا۔ محمد علی نے اپنی گورنمنٹ کے تمام محکموں اور شعبوں میں مغربی طریقے رائج کرائے اور ان کے انتقال کے بعد ان کے جانشین بھی عرصہ تک انھیں اصول کی پیروی کرتے رہے۔ خدیو اسمٰعیل جس کی مسرفانہ زندگی نے یورپ کی مداخلت کے لیے ایک بہانہ مہیا کر دیا تھا اپنی مغربیت پر فخر کرتا تھا۔ مصریوں کی قومیت کا جذبہ اس مسرف خدیو کے خلاف پیدا ہوا۔ چونکہ اسمٰعیل نے بے تحاشہ قرض لے کر پورے مصر کو یورپ کی قوموں کے پاس رہن رکھ دیا نیز ان کو ہر قسم کی داخلی مراعات عطا کیں۔ اسی بیداری کے زمانہ میں سید جمال الدین الافغانی کی شخصیت نے اپنا اثر قائم کیا۔ فی الواقع مصری قومی تحریک کے اصلی بانی سید موصوف ہیں۔ نہ صرف شورش پسند طبائع نے انکا اثر قبول کیا بلکہ دوراندیش اور اعتدال پسند مصلح محمد عبدہ وغیرہ جو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ذرائع ارتقائی میں یقین رکھتے تھے ان کے حاکمانہ اثر سے نہ بچ سکے۔

انگلستان نے بغیر کہے سنے از خود تمام یورپ کے نمایندہ کی حیثیت سے مصری سیاست میں دخل دینا شروع کیا۔ انگلستان کی اس غیر ذمہ دارانہ حرکت پر یورپ میں اظہار ناراضگی کیا

گیا۔ لیکن انگلستان نے بالآخر قبضہ کر ہی لیا اور اس اعلان کا اعادہ کیا کہ قبضۂ مصر محض عارضی ہے تاکہ فرانس وغیرہ کی مخالفت کم ہو۔ مصر میں ۱۸۸۲ء میں جو تحریک انقلاب عرابی پاشا کے زیرِ نگرانی ہوئی اس میں اور اس کے بعد ہی فرانس کا انگلستان کی رقابت کی وجہ سے ہمدردانہ رویہ بھی قابل اعتنا ہے۔ اس کے بعد مصطفیٰ کامل نے جو تمام رہنمایان مصر میں اپنی فصاحت و بلاغت کی وجہ سے ممتاز تھے تحریک آزادیٔ مصر شروع کی۔ ۱۹۰۸ء میں انھوں نے صرف ۳۴ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کی عمر نے وفا نہ کی ورنہ مصر کو ان کی ذات سے بڑی بڑی امیدیں تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد فرید بیگ جو اگرچہ ان کے شاگرد تھے لیکن اس پایہ کے نہ تھے تحریک آزادی میں پیش پیش ہوئے۔ لارڈ کچنر کے ظلم و تعدی نے ان عیسائی فلاحین کو جو اب تک تحریک آزادی میں شرکت نہ کرتے تھے قوم پرستوں کے دوش بدوش کھڑا کر دیا۔ جنگ عظیم کے آغاز پر خدیو عباس حلمی نے بالاعلان ترکوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ ۱۹۱۴ء میں جب ترکی نے بھی محاربین سے ایک کا ساتھ دیا تو انگریزوں نے عباس حلمی کو برطرف کر کے ان کے بھتیجے حسین کامل کو سلطان نامزد کیا۔ لارڈ ملنر کے کمیشن کیساتھ میرے خیال میں زاغلول پاشا بہت جلد مصالحت کر لیتے اگر انگلستان واقعی مصالحت کی خواہش کرتا۔ چونکہ انگلستان کی گورنمنٹ نے لارڈ ملنر کی سفارشات قبول کرنے سے انکار کیا۔ مجبوراً وہ مستعفی ہو گئے۔

ہندوستانی قومیت

ہندوستان کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ یہ سرزمین اپنی گوناگوں بوالعجبیوں کی وجہ سے ہمیشہ سے مشہور رہے۔ باوجود جغرافی حدود ایک ہونے کے ہندوستان کو آج تک سیاسی اتحاد نصیب نہیں ہوا۔ اگرچہ یہ ملک جنگجو قوموں کا گہوارہ ہے بایں ہمہ یہ بیرونی حملہ آور کے مقابلہ کی کبھی تاب نہ لایا۔ مدت مدید سے یہاں متعدد نسلیں پہلو بہ پہلو بستی ہیں لیکن ہمیشہ ایک دوسرے سے علیحدہ اور متنفر رہیں۔ اس لیے ہندوستان جو تقریباً یورپ کے برابر ہے نہ یورپ کا سا مخصوص قومی تباین پیدا کر سکا اور نہ چین کی طرح عام قومی وحدانیت کی تعمیر میں اسکو کبھی کامیابی ہوئی۔ اس قسم کے دونوں رجحانات یہاں ہمیشہ موجود رہے لیکن کسی ایک کو بھی ترقی کے لیے موافق اسباب میسر نہ آئے۔

ہندوستان کی تاریخ تین بیرونی حملوں سے اثر پذیر ہوئی ہے۔ آرین حملہ ۱۵۰۰ ق م میں اسلامی حملہ ۱۰۰۰ء میں، اور انگریزی حملہ ۱۸۰۰ء میں ہوا۔ ظاہر ہے کہ جس ملک میں معاشرتی یکجہتی اور سیاسی اتحاد مفقود ہوں وہ کیونکر حملہ آور کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے بچ سکے گا۔

یہاں کے لوگوں کا جمود اور بے توجہی اس سے عیاں ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کے (۱۸۸۵ء) قیام سے قبل کوئی منظم تحریک آزادی حاصل کرنے کے لیے بیس صدیوں میں نہیں کی گئی۔ اتنے بڑے ملک میں اگر تھوڑا سا ہیجان پیدا ہوا تو اس کو باقاعدہ تحریک نہیں کہہ سکتے۔ ہاں یہ بھی درست ہے کہ جو آسانیاں اس زمانہ میں موجود ہیں قدیم زمانہ میں بادشاہوں کے استبداد کی وجہ سے میسر نہ تھیں۔

کانگریس عرصہ تک معاشرتی اصلاح کی طرف متوجہ رہی اور ہندوستانی قومیت بہت زمانہ تک ہندو تحریک کے مرادف رہی۔ مسلمان کانگریس کی کارروائیوں کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے تھے نیز برطانیہ عظمیٰ کی وفاداری کو اپنا طغرائے امتیاز قرار دیتے ہوئے مخالفت کرتے رہے اس میں شک نہیں کہ مشرق میں جو بیداری کی روح پیدا ہو رہی تھی ہندوستانی مسلمان بھی اس کے اثر قبول کرنے سے مستثنیٰ نہ تھے۔

۱۹۰۴ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیان مغرب مشرق کیساتھ بڑا ہی خطرناک کھیل کھیل رہا تھا۔ روس و جاپان کی جنگ نے مشرق کو مغرب کے خلاف آمادۂ پیکار کر دیا تھا۔ اس جنگ کے بعد تقسیم بنگالہ کے معاملہ نے اصلی معنی میں ہندوستانی سیاسی تحریک کا آغاز کیا۔

جان مارلے نے اس وقت اپنی حکمت عملی سے ہندوستان کی صورت حالات کو سنبھال لیا۔ انڈین کونسل ایکٹ انہیں کی جانفشانی کا نتیجہ تھا۔ اس کے ذریعہ اعتدال پسندوں اور قوم پرستوں کی معتد بہ جماعت مطمئن ہو گئی۔ اگرچہ مسلمانوں نے اپنا علیحدہ سیاسی نظام "مسلم لیگ" قائم کی تھی لیکن آہستہ آہستہ مسلمان بھی کانگریس میں شریک ہونے لگے نیز عملی حصہ لینے لگے۔

دوران جنگ میں ہندوستان ایسا خاموش رہا جیسے اس کو سانپ سونگھ گیا ہو۔

۱۹۰۶ء میں مسٹر مانٹیگو ہندوستان گئے اور اپنی مسودہ رپورٹ پیش کی مرکزی اور صوبہ کی گورنمنٹ کو اصلاحات بھی دئیں اور گورنمنٹ کو ایگزیکیٹو کونسلروں اور وزیروں کے ذریعہ ذمہ دار بنانے کی رائے ظاہر کی گئی۔

ترکوں کے ساتھ انگریزوں کی بدسلوکی نے ہندوستانی مسلمانوں میں اضطراب پیدا کر دیا وہ کانگریس میں ہندوؤں کے ساتھ شریک کار بن گئے۔

۱۹۱۸ء ہندوستان کی تاریخ میں یادگار رہیگا۔ اسی سال افغانستان سے جنگ چھڑ گئی اور لاکھوں جانیں قحط اور انفلوئنزا کے نذر ہوئیں جب ہندوستان کے سیاسی مطلع نے خطرناک صورت اختیار کرنی شروع کی مسٹر مانٹیگو کی رپورٹ قانون کی شکل میں پارلیمنٹ میں منظور کی گئی۔

جسٹس رولٹ نے اپنے خاص کمیشن کی جو رپورٹ پیش کی جبر و سخت گیری کی پالیسی اختیار کرنے کی سفارش کی اور امپیریل کونسل میں یہ بل انگریز نامزد ممبروں کی مدد سے منظور کیا گیا باوجودیکہ تمام ہندوستانی ممبروں نے اس کی مخالفت کی تھی۔ اپریل ۱۹۱۹ء میں پورے ملک میں سوگ منایا گیا اور امرتسر کا مشہور واقعہ انھیں ایام میں وقوع پذیر ہوا۔ اس کے بعد مسٹر گاندھی کے زیر سرکردگی تحریک عدم تعاون شروع ہوئی۔

معاشی تغیر موجودہ تاریخ عالم کا سب سے زیادہ دلچسپ باب مغرب کی مشرق پر کامیابی ہے۔ سیاسی فتحمندی ہی نہیں بلکہ معاشی بھی اور یہ اور بھی زیادہ اثر رکھنے والی اور دیرپا ہے جس طرح کولمبس اور وسکوڈی گاما کی بحری دریافتوں نے سیاست عالم کی کنجی یورپ کے ہاتھ میں دیدی اسی طرح اٹھارھویں صدی کی ایجادات سائنس نے صنعتی انقلاب کے بعد یورپ کو معاشی حکمراں بنا دیا۔

مغرب کے مقابلہ میں مشرق کی عدم قابلیت طریق پیدایش نیز سرمایہ کی کمی اور مزدوروں کی خاص ذہنی کیفیت کی وجہ سے ہے۔ روپیہ مشرق میں بادشاہ اور کسان دونوں کے نزدیک

ذریعہ تبادلہ نہیں خیال کیا جاتا۔ ان کے نزدیک بہترین صورت دفینہ رکھنا ہے۔ قرض کا رواج ہے لیکن مزید منافع حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ تعیشات کے لیے۔ اس لیے قرض بجائے مزید دولت آفرین ہونے کے تباہ کن ہے۔

معاشرتی تغیر مشرق کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر رسوم کا ایسا گہرا اثر ہے کہ سطح بیں اصحاب بلا تامل کہہ دیتے ہیں کہ مشرق میں باوجود مادی ترقی کے معاشرتی زندگی میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوا۔ لیکن یہ معاشرتی زندگی کے حقائق کے بالکل خلاف ہے۔ ہیئت اجتماعیہ مادی تبدیلی کا ویسا ہی اثر قبول کرتی ہے جس طرح خیالات و اعتقادات کا۔ کیا یہ صحیح نہیں کہ ترکی، مصر اور ہندوستان کے تعلیم یافتہ جماعت نے لباس، طرز بود و باش اور شرابخواری یورپ کی تقلید میں اختیار کی ہیں؟ عوام میں بھی مدنی زندگی کی وہی خرابیاں جو یورپ میں موجود ہیں ان ممالک کے صنعتی شہروں میں پائی جاتی ہیں۔

عام بے چینی اضطراب ہر تغیر کا اور خاصکر اچانک انقلاب کا لازمی نتیجہ ہے۔ گذشتہ کے تسلسل واقعات کا انقطاع خواہ ناگزیر ہی کیوں نہ ہو تبدیل شدہ حالات کے ساتھ مطابقت کی ضرورت محسوس کراتا ہے جس کا نتیجہ ہیئت اجتماعیہ میں اضطراب و بے چینی ہے اور جبتک کہ مطابقت کلی حاصل نہو جائے ہیجان برابر جاری رہتا ہے۔ ہیجان کوئی غیر معمولی مظہر نہیں ہے! جب تک انسانی سوسائٹی جمود میں مبتلا نہو جائے اس کا پایا جانا ضروری ہے۔ دراصل ہیجان صحت نمو کی نشانی ہے نہ کہ علامت بیماری۔ معمولاً ہیئت اجتماعیہ کی کارگذاری بعینہ فرد واحد کی سی ہے۔ زندگی کی گوناگوں تبدیلیوں کے ساتھ مطابقت حاصل کرنے کے لیے اس میں بھی تخلیق و تخریب برابر جاری رہتی ہیں۔ ہیجان عمیق عدم صحت کی علامت ہے اور اس دشوار حالت کا پیش خیمہ ہے جس کو "انقلاب" کہتے ہیں۔

جنگ عظیم نے ہیجانات اندرونی کے اظہار کا موقعہ بہم پہنچا دیا۔ مشرق قریب اور مشرق وسطےٰ بالشویک اثر سے محفوظ نہ رہے لیکن ان ممالک کے قوم پرست رہنماؤں نے اس مثل کی حقیقت

گوارا و گوش بنا یا کہ: شیطان کے ساتھ شوربہ پینے کے لیے بہت بڑا چمچہ درکار ہے :
چنانچہ انہوں نے اصول اشتراکیت سے بیزاری ظاہر کی اور روسیوں کو اپنی ریشہ دوانیوں
میں ویسی کامیابی نہ ہوئی جس کے وہ متوقع تھے۔
غرضکہ مسلمانان عالم کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی میں مغرب کے جدید خیالات
کی اثر پذیری کی وجہ سے اور نیز اپنی ناگفتہ بہ حالت کو سدھارنے کے خیال سے ایک عظیم الشان
ہیجان پیدا ہے جیسا کہ صدیوں کبھی نہ ہوا تھا بادی النظر میں یہ ہیجان بالکل سطحی معلوم ہوتا ہے
لیکن نہیں اس کی جڑیں عمیق ترین خیالات میں پوشیدہ ہیں۔
تاریخ بتلاتی ہے کہ جب کسی قوم میں اصلاح کے لیے ہیجان اور خواہش دونوں پائی جاویں
اس قوم میں اصلاح ضرور ظہور پذیر ہوتی ہے۔
ان گوناگوں اثرات سے موجودہ تاریک مستقبل کی امید افزا جھلک سے مبدل ہو جاتی
ہے کیونکہ اب تو ہم اپنے روبرو جدید عالم اسلامی کی تعمیر دیکھ رہے ہیں۔

یوسف حسین

دیوان غالب

مطبوعہ جرمنی

جس کو مکتبہ جامعہ ملیہ علی گڑھ نے خاص اہتمام سے طبع کرایا ہے۔ جرمنی سے چھپ کر آگیا
ہے۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے۔ اُردو زبان میں کوئی کتاب آج تک اس سے بہتر
طبع نہیں ہوئی۔ قیمت صرف تین روپیہ سے

ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ ملیہ علی گڑھ

اسلام اور سرمایہ داری

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ، فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ، فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ، فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ، فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ، وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ، وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ، اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ، وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ، اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ ۔

غارتگروں کے گھوڑے جو دوڑتے ہوئے ہانپتے ہیں، جن کی ٹاپوں سے چنگاریاں اڑتی ہیں، جو گرد اڑاتے ہوئے علی الصباح غارتگری کرتے ہیں اور جماعتوں میں گھس پڑتے ہیں، اس امر حقیقت کا ثبوت ہیں کہ انسان اپنے پروردگار کا ناشکرا ہے، اسے اس کا اعتراف بھی ہے، اور اسے مال و دولت کی سخت محبت ہے کیا وہ نہیں جانتا کہ جب گور والوں کو اٹھایا جائے گا اور جب سینوں کے مخفی اسرار معلوم ہونگے اس دن خدا بھی ان کے حالات سے خوب ہی باخبر ہوگا۔

اس سورۂ پاک میں انسان کے دو اخلاقی معائب کا ذکر ہے، (۱) ناقدردانی حق (۲) مال و دولت کی محبت، اسلام جب مال کو سخت ترین گناہ بتاتا ہے، مگر دنیا ہے کہ روپیہ کی بندہ ہو رہی ہے جن چیزوں کو دولت کہا جاسکتا ہے، ان کے لیے ہماری زبانوں پر "مال" کا لفظ مستعمل ہے "مال" میلان (خواہش) کے لفظ سے بنا ہے، مال کا اصلی ترجمہ "قابل رغبت" ہے۔ یہ لفظ ہمارے اس باطل اور نا راست عقیدہ کی تصویر ہے جو مدتوں سے ہمارے ذہنوں میں قایم ہے، یعنی روپیہ، پیسہ، سونا، چاندی وغیرہ چیزیں خدا کی نعمتیں ہیں، اور خداوندعالم جن سے خوش ہوتا ہے انہیں کو دیتا ہے، عرب کا عقیدہ تھا کہ آل و مال کی زیادتی خوشنودی الٰہی اور تقرب بارگاہ ایزدی کے امتیازی نشانات ہیں، قرآن مجید نے سورۂ نون میں اس خیال کی تکذیب کی ہے اور فرمایا کہ مال اور دولت خداوند کی خوشنودی کا ثمرہ نہیں بلکہ قادر علیم کی طرف سے ابتلا و آزمائش بنکر نازل ہوتے ہیں

اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۔

عرب کی عام زبان نے اس قسم کی چیزوں کو مال (وفاہل رغبت) خیر (سرمایہ نکوکاری) اور فضل من اللہ (خدا کی مہربانی) کے القاب دے رکھے تھے مگر اسلام نے بقدر کفاف کو مستثنی کرنے کے بعد دولتمندی کو ایک بری شئے قرار دیا عرب نے مال و دولت کا نام خیر (سرمایہ نکوکاری) رکھا تھا، شیخ سعدیؔ نے دولت و فقر کا موازنہ کرتے ہوئے، دولتمندوں کو ترجیح دی ہے اور فرمایا کہ دولتمند تو، اطمینان خاطر سے ابت نیک کام کر سکتے ہیں۔ فقیر کو نیعت میسر نہیں۔

پراگندہ روزی پراگندہ دل

تو کے بدولت ایشاں رسی کہ نتوانی ٭ بجز دو رکعت وآں ہم بصد پریشانی

لیکن خدائے اسلام جو تمام اسرار و حکم کا خالق ہے اس باطل خیال کی سخت تردید فرماتا ہے، ارشاد ہوتا ہے۔ اگر خدا وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ اپنے بندوں کی روزی فراخ کردے تو وہ زمین میں فساد مچانے لگیں۔

اسی مضمون کو سورۂ تکاثر میں دوسرے پیرائے کے ساتھ ادا فرمایا

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ	دولت کی بہتات تم کو قبر تک لہو ولعب میں مشغول رکھتی ہے۔ لیکن نہیں عنقریب تم کو نتیجہ معلوم ہو جائیگا۔

(اور تم دیکھو گے کہ ہم کیا سزا دیں گے) دنیا والوں نے مال و دولت اور جاہ و ثروت کے وجود کو رضائے ایزدی کی ضمانت قرار دیا تھا کہ خدائے علیم نے فرمایا۔

وَلَوْلَا اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ وَزُخْرُفًا	تمام لوگوں کے ایک مذہب پر ہو جانے کا خطرہ نہ ہوتا تو جو لوگ رحمان کی نافرمانی کرتے ہیں ان کے گھروں کی چھتوں چڑھنے کی سیڑھیوں کو اور ان گھروں کے دروازوں کو، اور ٹیک لگانے کے تختوں کو چاندی سونے کی بنا دیتے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ وہی چیزیں جن کو ہم نے خدا فضل قرار دیا ہے ایک گونہ عذاب ہے،

دنیا جس چیز کے لیے بے چین رہا کرتی ہے وہ درد ہے درمان نہیں، روپیہ جن کو ہم بہت محبوب رکھتے ہیں وہ امراض کا علاج نہیں بلکہ خود مرض ہیں۔

قرآن مجید نے دولت کے متعلق مندرجہ بالا خیالات قایم کرنے کی ہدایت کی ہے، پھر بھی ہر مسلمان پر کسب حلال فرض کیا گیا ہے، اور حکم دیا گیا ہے کہ وَابْتَغُوْا فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا اور اللہ کی رضامندی اور اس کے فضل کی تلاش کرو۔

اصل یہ ہے کہ "دولت" بری چیز نہیں اصلی برائی "تکاثر" ہے، خدا کی مرضی یہ ہے کہ اس کے کسی بندہ کے پاس بہت زیادہ دولت جمع ہو، اسلام کے بہت سے احکام اسی "تکاثر" کی مخالفت پر مبنی ہیں، ہمارا قانون وراثت صرف "تکاثر" کو مٹانے کا ایک آلہ ہے، زکوٰۃ فرض کی گئی ہے تاکہ تکاثر پیدا ہو، جمع مال کی سخت ممانعت ہے۔

وَیْلٌ لِّکُلِّ ھُمَزَۃٍ لُّمَزَۃِ ۣالَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَہٗ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَہٗٓ اَخْلَدَہٗ کَلَّا لَیُنْۢبَذَنَّ فِی الْحُطَمَۃِ وَمَآ اَدْرٰىکَ مَا الْحُطَمَۃُ نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ اِنَّھَا عَلَیْھِمْ مُّؤْصَدَۃٌ فِیْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَۃٍ ۝

ہر عیب چین پر افسوس جو آوازے کستا ہے، مال جمع کرتا ہے، اور گن گن کر رکھتا ہے، گمان کرتا ہے کہ مال کی بدولت وہ ہمیشہ زندہ رہیگا ہرگز نہیں۔ ایک نہ ایک دن وہ حطمہ میں ڈالا جائے گا۔

تم کو کیا معلوم حطمہ کیا چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ایک آگ ہے، جو دلوں میں بھڑکتی ہے، جو بڑے بڑے ستونوں کی شکل میں انکو گھیرے رہتی ہے۔

اس سورہ پاک میں، جمع مال کی مذمت بیان کی گئی ہے، اور عرب کے اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ کثرت اموال ہمیشہ کی زندگی (نجات) کی ضمانت ہے، بلکہ کثرت اموال کا نتیجہ بہت برا ہوتا ہے، مالدار کا نتیجہ ایک دن یہ ہونے والا ہے، کہ اسکی ساری دولت حسرت و افسوس کی جہنمی آگ میں جل کر خاک ہو جائے گی۔

دنیا میں خدا کا پیغام آیا، مگر دنیا نے قبول نہ کیا، لوگوں نے جمع مال کو نہایت عقلمندی کا کام سمجھا کہ خدا نعمت کی نعمت نے اپنے عیوری ہاتھ کی زبردست طاقت سے اب دنیا پر ظاہر کر دیا کہ سرمایہ داری ایک لعنت ہے جسے ہماری بداعمالیوں نے آسمان سے بلایا ہے - اور ہر شریف آدمی کا فرض ہے کہ اسے بیخ و بنیاد سے اکھیڑ پھینکنے کی کوشش کرے۔

سورہ حشر میں خدا نے مال کو یتامے و مساکین میں تقسیم کرنے کی غرض یہ بتائی ہے کہ مال و دولت

کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَاۗءِ مِنْکُمْ ط گھوم پھر کر صرف اغنیا میں نہ رہے

اس سے معلوم ہوا کہ خداوند عالم کا منشا ہے کہ اس کے نیکوکار بندے ہر اس جائز تدبیر پر کاربند ہوں جس کی وجہ سے دولت کو اغنیا کے لیئے برکت خزانوں سے نکل کر مساکین اور بے مایہ لوگوں میں چکر لگانا پڑے۔

سود کی حرمت اسلام میں صرف اس لیئے ہے کہ اس سے دولت کا ذخیرہ بے مایہ جیبوں سے نکل کر بے مفاد خزانوں میں جمع ہو جاتا ہے ایک شخص کے بہت زیادہ مالدار ہونے کے بعد یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے، کہ وہ خود اور اس کے اہل خاندان طرح طرح کے اخلاقی معائب میں گرفتار ہو جاتے ہیں - سورۂ نٓ میں ایک نہایت بدکار آدمی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے -

وَلَا تُطِعْ کُلَّ حَلَّافٍ مَّھِیْنٍ ھَمَّازٍ مَّشَّاۗءٍ بِنَمِیْمٍ مَّنَّاعٍ لِّلْخَیْرِ مُعْتَدٍ اَثِیْمٍ عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِکَ زَنِیْمٍ -	تو کسی ایسے شخص کا کہنا مان، جو بہت قسم کھاتا ہے ، آبرو باختہ ہے لوگوں پر آوازے کستا ہے، چغلیاں کھاتا ہے، انتہا درجہ کنجوس ہے حد سے گذر ہوا ہے، بدکار ہے، اکھڑ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بد اصل بھی ہے

ان تمام برائیوں کا منبع صرف یہ ہے کہ

اَنْ کَانَ ذَا مَالٍ وَّ بَنِیْنَ	وہ بہت آل واولاد والا اور دولت مند ہے

اس بنا پر ہر ایمان دار کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ سرمایہ داری کے خلاف اپنی پوری طاقت سے جہاد کرے -

یورپ کے اشتراکیوں نے، سرمایہ داری سے پیدا ہونے والی برائیوں کا جو علاج سوچا ہے وہ ٹھیک نہیں، سرمایہ داری کی ملعون ماں صرف سود خواری ہے، جب تک دنیا میں سود کا ہوا قایم رہے گا دنیا کو حقیقی راحت میسر نہیں ہو سکتی۔ جدید تمدن نے "سود" کو ایک ناگزیر چیز بنا دیا ہے بنکوں کا رواج، لین دین میں سود، تبادلہ سکہ میں سود، غرض دنیا کا ہر معاملہ آج کل معاملہ ہو رہا ہے، اشتراکیوں نے سوچا ہے کہ ساہوکاروں کو لوٹ لو، زمینداریوں کا خاتمہ کر دو، بجبر دولتمندوں سے انکی دولت حاصل کر لو، وہ سمجھتے ہیں کہ ایک شخص صرف خلاف قدرت قوانین کے ماتحت دولتمند ہوتا ہے، لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے، ہر شخص کو اتنی ہی طاقت اور محنت کی قابلیت نہیں ملی ہے جتنی دوسرے کو، اسی طرح روزی کی کمی و بیشی کل قوانین قدرت پر مبنی ہے، عالم مساوات اقتصادی دنیا میں کبھی قائم نہیں ہو سکتی، خدا نے فرمایا

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا	ہم نے دنیا میں ان کے درمیان انکی روزی کو تقسیم
وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ	کر دیا ہے اور ایک کا درجہ دوسرے سے بلند رکھا ہے۔
لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا	تاکہ ایک دوسرے کو اپنا تابع بنا سکیں۔

قدرت کی طرف سے جو اقتصادی فرق مراتب قائم رکھا گیا ہے اوس کو مٹانے کی کوشش کرنا بے سود ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ کسی انسان کو یہ حق نہیں کہ خدا کی نعمتوں میں سے کسی حصہ کا تنہا مالک ہو جائے۔ اسی طرح کسی خاص طبقہ انسانی کو بھی حق نہیں کہ وہ دوسرے طبقوں کے حقوق کو اپنے حقوق سے کم قرار دے۔

"سرمایہ داری" کی ملعون ہستی کو مٹانے کی سب سے بہتر تدبیر صرف یہ ہے کہ دنیا کی طرز حکومت کو بدل دیا جائے ایک مسلمان کا مذہبی فرض ہے کہ وہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ کا صحیح مطلب سمجھے اور لوگوں کو سمجھائے، رسول مقبول نے فرمایا۔ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ (مسلم) زمین کا مالک اور حاکم صرف اللہ اور اس کا رسول ہے، خدا کے علاوہ کوئی کسی چیز کا حاکم و مالک نہیں ہو سکتا اسی طرح دنیا کی تمام قدرتی چیزیں، جنگل، پہاڑ، کانیں، کنوئیں، دریا، سمندر وغیرہ سب خدا کی ملک ہیں، اور ان چیزوں

میں ہر انسان کا حق مساوی ہے، اس لیے ہمارا سب سے پہلا فرض ہے کہ ان چیزوں کو واقعی معنوں میں خدا کی ملک یعنی ہر بندہ خدا کے مصرف کی چیز بنا دیں، ان حکومتوں کو دنیا میں قائم رہنے کا کوئی حق نہیں ہے جو اس اصول کو تسلیم نہیں کرتیں۔

حضرت مسیح جس آسمانی بادشاہت کا اعلان فرماتے تھے جس میں دولتمندی کے لیے کوئی جگہ نہ تھی اس کو صرف اسلام قائم کر سکتا ہے، جو سود کا سخت مخالف ہے، اور جس کے مختلف مقاصد میں ایک اہم مقصد یہ ہے کہ دولت گھوم پھر کر صرف اغنیا میں نہ رہنے پائے۔

ابو الجلال ندوی

گلستان سعدی

مطبوعہ کاویانی پریس برلن (جرمنی)

شیخ سعدی شیرازی کی شہرہ آفاق کتاب آج نئے قالب میں نظر آتی ہے۔ اور اس خوبی و صفائی سے طبع ہوئی ہے کہ دیکھنے کے لایق ہے۔ قیمت ۱۲؎

رفتار تعلیم

دو سال کا عرصہ گزرا کہ بابو گوکل چند نے ۴۰ ہزار روپے کی ایک رقم ہندی ساہتیہ سمیلن (انجمن ترقی ہندی) کو عطا کی کہ اس کے منافع سے ہر سال ۱۲۰۰ روپیہ کا انعام ہندی زبان میں سائنس، لٹریچر، فلسفہ یا تاریخ کی بہترین تصنیف پر ان کے بھائی منگل پرشاد مرحوم کی یادگار میں دیا جایا کرے۔ اس سال یہ انعام پہلی بار پنڈت پدما سنہا شرما کو اُن کی ناقدانہ تصنیف پر ملا ہے جو اُنھوں نے ہندی شاعر بھاری پر لکھی ہے۔ یہ دیکھکر قدرتاً ہماری نگاہیں قدردانانِ اُردو کی طرف اٹھتی ہیں کہ کیا ان میں سے بھی کوئی ایسی نظیر قایم کرنے کے لیے آمادہ ہوتا ہے؟

پروفیسر جان برنٹ نے اکسفرڈ میں ۱۰ مئی کو "جہالت" کے عنوان پر لکچر دیتے ہوئے یہ بیان کیا کہ موجودہ علمی ترقی کے ساتھ ساتھ جہالت میں بھی اضافہ ہوا ہے، ان کا خیال ہے کہ آج کل کے نوجوان ۴۰ سال قبل کے نوجوانوں سے زیادہ نادان نظر آتے ہیں۔

عنوان بالا کے تحت میں ناظرین یہ دیکھ کر شاید اجتماع ضدین کا گمان کریں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یورپ کا آفتاب علم اپنے نصف النہار پر پہنچ چکا، جب فضلاے یورپ اس یونانی فلسفہ کی طرف مائل ہوئے ہیں جس کو مرزا ے مرحوم نے اس طرح ادا کیا ہے۔

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے،
وہ بھی اک عمر میں ہوا معلوم!

جاپان کی ایک تازہ اطلاع سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ۵۰۴ پروفیسر جاپان کے محکمہ تعلیمات کی طرف سے بغرض تعلیم باہر بھیجے گئے ہیں تاکہ وہ پھر واپس آکر انہی کالجوں میں جواب یونیورسٹی بنائے

جانے والے ہیں زیادہ بہتر کام انجام دے سکیں۔

آل برہما نیشنل ایجوکیشنل کانفرنس میں جو مئی ۱۹۲۳ء میں بمقام رنگون منعقد ہوئی ۔ ناظم نے دو سال کی کارروائی پڑھکر سنائی جس میں یہ بتایا گیا کہ اپریل ۱۹۲۱ء سے جب گزشتہ کانفرنس ہوئی تھی، اس وقت تک قومی مدارس کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے ۔آج کل قومی اسکولوں کی مجموعی تعداد ۹۱ ہے جن میں قریباً ۱۶ ہزار طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔

قومی تعلیم پر ایس ۔ وی رام مورتی صاحب نے اظہار خیالات فرماتے ہوئے اپنا ایک تجربہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایکبار وہ بحری سفر کر رہے تھے کہ جہاز میں ایک مسیحی پادری نے انھیں ایک کتاب دی جس میں مصنف کتاب نے تمامتر زور اس امر پر دیا تھا کہ کوئلہ سے اقتصادی ترقی ہوتی ہے جس پر یورپ کی تہذیب جدید مبنی ہے، پھر وہ لکھتے ہیں کہ اگر ہندوستان میں کوئلہ کی بہتات نہیں ہے تو یہاں آدمیوں کی کیا کمی ہے اور اگر کوئلہ سے قوت پیدا کیجا سکتی ہے تو انسانوں سے بدرجۂ اولیٰ یہ کام لیا جا سکتا ہے۔ کوئلہ اس وقت تک بیکار محض ہے تاوقتیکہ وہ روشن نہ کیا جائے تو کیا وجہ ہے کہ انسان میں بھی روشنی اور بیداری پیدا کر کے وہ کام نہ لیا جائے۔ ہندوستان میں تعلیم عام کرنے کے لیے ضروری ہے کہ یہاں کے لوگوں میں قوت پیدا کیجائے ۔ایشیا سے بھر میں تین چیزیں اکثر پائی جاتی ہیں، جہالت، افلاس اور عدم صفائی اس کے لیے موصوف نے ایک عملی اسکیم پیش کی ہے۔

ہر گاؤں میں جو لوگ نوشت وخواند سے واقف ہیں۔ ان کو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ دوسروں کی امانت ہے۔ ہر روز ایک دو گھنٹے جو بیکاری میں گزرتے ہیں، لوگوں کو پڑھانے میں صرف کرنا چاہیے اپنے عملی تجربات کو کتابی صورت میں گاؤں والوں کے سامنے پیش کرنا چاہیے، ہندوستان کی تاریخ کے موٹے موٹے واقعات بھی ان کو بتانے چاہئیں ۔گاؤں کے اسکول جو اس

طریقہ پر قائم ہوں، ایک پنچایت کے ماتحت میں ہوں اسی طرح سے ضلع کے مدارس بھی قائم کیے جائیں۔ اس طریقہ پر دس سال تک عمل کرنے سے نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان میں ایک تغیر عظیم پیدا ہو جائے گا۔

مطبوعات جدیدہ

اسوہ صحابیات - از مولانا عبد السلام ندوی - مطبوعہ مسلم پرنٹنگ پریس اعظم گڈھ قیمت عمر

مولوی صاحب کی یہ تازہ تصنیف درحقیقت اُن کی اصل کتاب اسوہ صحابہ سے ماخوذ اور اسی کا نتیجہ ہے جس میں صحابیات کے حالات اور جستہ جستہ واقعات اس انداز سے بیان کیے گئے ہیں کہ اکثر جلیل القدر صحابیات کے بعض واقعات زندگی اور اُن کی عادات وخصائل کے بعض نمایاں پہلو پیش نظر ہو جاتے ہیں اور سلسلہ کلام کسی جگہ بے ربط نہیں ہونے پایا۔ واقعات کے انتخاب میں لحاظ رکھا گیا ہے کہ زیادہ تر ایسے معاملات، گھر کے کام کاج، تعلقات باہمی اور آداب معاشرت کی ہوں جو بالعموم ہماری خواتین کے لیے زیادہ مؤثر اور زیادہ سبق آموز ہیں۔ زبان بھی باوجود ادبی وعلمی ہونے کے ایسی دقیق نہیں کہ کم استعداد طلبہ یا خواتین کے لیے بار ہو کتاب کا حجم صرف ۹۸ صفحہ ہے اور مسلم پرنٹنگ پریس، اعظم گڈہ سے مل سکتی ہے۔

انتخاب صحاح ستہ - مسلمانوں میں حدیث کی چھ کتابیں مستند اور صحیح قرار پا چکی ہیں۔ بخاری، مسلم۔ ترمذی، ابن ماجہ، ابوداؤد اور نسائی شریف۔ علامہ رزین متوفی ۵۲۰ھ نے ان کل کتابوں کی احادیث کو سلسلۂ اسناد حذف کرکے ایک جگہ جمع کر دیا۔ اس کے بعد علامہ ابن اثیر جزری متوفی ۶۰۶ھ نے اسی کتاب کو از سر نو مرتب کرکے اس کا نام جامع الاصول رکھا۔ قاضی القضاۃ شرف الدین نے اس میں سے مکررات کو نکال کر تجرید الاصول کے نام سے اس کو مرتب کیا۔ پھر امام زبیدی شافعی متوفی ۹۴۴ھ نے اس کے الفاظ مشکلہ کو حل کرکے اس کا نام تیسیر الاصول

رکھا۔ ۱۳۲۲ھ میں مولوی سید ابوالحسن محمد محی الدین صاحب جج ہائیکورٹ حیدرآباد دکن نے اس کا اُردو میں ترجمہ کیا اور اس کا نام تلخیص الصحاح رکھا۔ اب مولوی نیاز علی صاحب پنشنر اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس پنجاب نے وہ حدیثیں منتخب کر کے جو مسلم اور غیر مسلم کے لیے یکساں مفید ہوں انتخاب صحاح ستہ کے نام سے شائع کیا ہے۔ ترجمہ میں تلخیص الصحاح سے زیادہ مدد لی ہے۔ کہیں کہیں تشریح کی غرض سے فوائد کا بھی اضافہ کیا ہے لیکن جا بجا اشعار جو اس میں بھرے گئے ہیں وہ حدیث کی ثقاہت کے منافی ہیں۔ ترجمہ صاف ہے۔ اور کتاب بہر نوع مفید ہے اسکی ضخامت ۳۶۰ صفحے اور قیمت صرف عہ۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط ہے۔

ملنے کا پتہ: ملک فضل الدین تاجر کتب قومی کشمیری بازار لاہور

الوراثۃ فی الاسلام۔ اسلامی فن وراثت ائمہ کے زمانہ میں جس طرح مرتب ہو گیا تھا۔ اسی طرح آج تک چلا جاتا ہے زمانہ مابعد میں علماء و فقہائے نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ ہمارے جامعہ کے استاد تاریخ اسلام مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری نے اس فن پر محققانہ طریقہ سے بحث کی ہے اور عربی زبان میں نہایت اختصار اور صفائی کے ساتھ بالکل جدید طرز سے اس فن کو مرتب کیا ہے۔ پہلے ان بنیادی اور اصولی خرابیوں کو دکھلایا ہے جو اس فن کی ترتیب میں واقع ہوئی تھیں۔ اس کے بعد قرآن مجید کی صرف چار آیتوں کی جو وراثت سے متعلق ہیں تفصیل کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ اور انھیں سے فرائض کے کل اصول مستنبط کیے ہیں۔ اس کے بعد پھر انھیں اصول پر اس فن کی نئی تعمیر کھڑی کی ہے۔ مطبع ملیہ علیگڑھ میں ٹائپ میں نہایت عمدہ کاغذ پر یہ کتاب چھاپی گئی ہے۔ قیمت فی نسخہ ۸ر ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ علی گڑھ

ہوم اینڈ یو جدید بین الاقوامی زبان پر نئی تصنیف ہے جو حال میں جرمنی سے موصول ہوئی ہے
مطبوعہ تیبزنگ۔ جرمنی

زندہ جاوید

از سیدہ الف۔ ف بیگم حیدرآبادی، عظیم آبادی مطبع انقلاب، توت باڑی گیا

یہ دو جزکا ایک مختصر رسالہ ہے جس میں واقعہ کربلا کو نظم کیا گیا ہے۔ اور اس مختصر نظم سے مقصد یہ ہے کہ "حیات ملیہ اسلامیہ کی تعمیر امام الشہدا حضرت حسین علیہ السلام کی سیرت پاک" سے متشکل کی جائے۔ ابتدا میں ایک مختصر مقدمہ بھی شامل کیا گیا ہے جو زبان و طرز بیان دونوں کے لحاظ سے دلچسپ ہے لیکن اس کے مطالب و مقاصد میں بجائے شرح و بسط کے اشارہ و کنایہ سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً "تمام فلسفوں اور تمام افکار کا دائرہ عمل بس اسی قدر ہے کہ جب قید ہستی میں ہمارا ہونا لاعلاج ہے تو پھر ہم اس طور پر گزر کریں کہ ہمارے مابین کشمکش حیات نہ پیدا ہو اور کوئی کسی کو دکھ نہ دے"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور "سب کو یکساں سہولت دنیا میں رہنے سہنے کی ملے"۔ "یزید نے اسی توازن حیات میں خلل ڈالا"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور "بظاہر حضرت حسین کو زک ہوئی، یزید نے فوری غلبہ پایا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر مظلوم حسین کی روح پاک قالب جمہوریت میں روز افزوں جاہ و جلال کے ساتھ جلوہ فرما ہے اور جب جب اور جہاں جہاں حقوق عوام کی حمایت ہوئی اور ہو رہی ہے اسی زندہ جاوید کی فتح کا ڈنکا بجا ہے اور بجا رہے گا"

جن اقتباسات کو اوپر پیش کیا گیا ہے نظم انہیں کی تفسیر کی ایک کوشش ہے۔
قیمت فی جلد ۵ مصنفہ سے مل سکتی ہے

جذبات آزادی

از ہلال احمد زبیری ہلال مارہروی قریشی اینڈ کو، لال کنواں دہلی۔
قیمت ۲/

یہ سیاسی نظموں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے جو نہایت خوش سلیقگی سے جیبی تقطیع پر قریشی اینڈ کو

بنے شائع کیا ہے۔ کاغذ سفید اچھا ہے اور لکھائی چھپائی نہایت خوب ہے۔ شہید جفا، یاد وطن، درد نہاں، تمنائے شہادت، فتوحات احرار، فتح سمرنا کی نذر، عنوانات نظم ہیں۔ کتاب بہ حیثیت مجموعی دیکھنے کے قابل ہے پہلی نظم کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

اُسے سوز غم بھی سرور ہے اسے روز عشرہ بھی عید ہے
رہ حق پہ چل کے جو باوفا ستم و جفا کا شہید ہے

مرا بخت آج ہی اوج پر مرے امتحان کی عید ہے
مجھے پیچھے ہیں وہ قید میں مرے حق میں وہ سفید ہے

اُدیا بمبئی نیشنل کالج میگزین گجرات ودیاپیٹھ کے زیر اثر بمبئی قومی درسگاہ دو سال سے قائم ہے جو اگرچہ بمبئی میڈیکل کالج کی طرح مشہور نہیں لیکن بہ اعتبار تعداد طلبہ و اپنی اعلیٰ تعلیم کے اس لائق ہے کہ ملک میں عام طور پر اُس سے اظہار دلچسپی کیا جائے جامعہ ملیہ کی طرح وہاں بھی طلبہ ایک عرصہ تک اپنا ماہوار رسالہ قلمی نکالتے رہے لیکن گذشتہ مارچ سے اُنھوں نے اُدیا نام سے اپنا آرگن مطبوعہ شائع کیا ہے جو ظاہری صورت کے لحاظ سے نہایت ہی عمدہ ہے اور مضامین بھی اگرچہ مختصر ہیں مگر دلچسپی سے خالی نہیں۔ اٹھارہ صفحے انگریزی اور اسی قدر گجراتی زبان میں ہیں۔ انگریزی حصہ مضامین میں پرنسپل بنتھمکار ایم اے (آکسن) کی رپورٹ سالانہ نہایت دلچسپ ہے۔ اور اس قابل ہے کہ قومی تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اُس کا بغور مطالعہ کریں۔ طلبہ کے علاوہ بعض اساتذہ کے مضامین بھی ہیں۔ قیمت درج نہیں ہے۔ بمبئی نیشنل کالج۔ گرین و لاگرانٹ روڈ، بمبئی سے مل سکتا ہے۔

آئینہ (الہ آباد) اڈیٹر، ابوالمعانی سید وحیدالدین احمد کڑوی۔ سالانہ چندہ عہ

ماہ جون سے یہ رسالہ مشترک سرمایہ سے جاری ہوا ہے اور اس کے ڈائرکٹروں میں سر تیج بہادر سپرو بھی شامل ہیں جن کی تصویر بھی اس نمبر میں دی گئی ہے۔ حصہ مضامین میں ناول

وفسانے بھی ہیں اور معقول ادبی مضامین بھی جن میں سید مسعود حسن صاحب کا مضمون زبانِ اُردو کے متعلق اور وحید صاحب کا فسانہ قابلِ ذکر ہیں۔ رسالہ ہٰذا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مضامین کا ایک حصہ تمامتر خواتین کے افکارِ دماغی کا نتیجہ ہے اور بیشتر مضمون نگار رہنے صوبہ ہی کی ہیں۔ تین غزلیں، دو قصیدے ایک قطعہ، دو فسانے، ایک مضمون خواتین کے قلم سے شائع ہوئے ہیں۔ اور ان کی یہ کوشش شعریت، ادب لطیف، اور فسانہ نگاری تک محدود ہے۔ اور موخرالذکر صنف میں بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان مضمون نگاروں کو فسانہ کی صرف ایک ہی پہلو سے دلچسپی ہے یعنی داستانِ محبت۔

رسالہ کا حجم تقریباً ۹۴ صفحہ ہے تقطیع "ادیب" مرحوم کی یاد دلاتی ہے۔ حصہ نظم میں اقبال، اکبر، جلیل، صفی، ثاقب، صدق جائسی، جوش ملیح آبادی کا کلام ہے۔

"لمعاتِ اکبرؔ" کے عنوان سے حضرت اکبر کا غیر مطبوعہ کلام شائع کر کے "آئینہ" نے نہ صرف الہ آبادی ہونیکا حق ادا کیا ہے بلکہ ایک گرانقدر ادبی خدمت انجام دی ہے، ذیل میں ہم چار شعر نقل کرتے ہیں:۔

غم میں ہو جاتا ہی ہے امید فردا سے سکوں — وائے بر حالش جسے امید فردا بھی نہو
محترز فریاد سے ہوں زیرِ لب کرتا ہوں آہ — آپ کی مرضی ہے شاید یہ کہ اتنا بھی نہو
دل کے ٹکڑے کرتی ہی یارب خلش امید کی — بر نہیں آتی اگر ظالم تو پیدا بھی نہو
پوچھ ہی کر تلقین رہ گئے وہ جس کو اسکو ہی گلہ — اس کے دل سے پوچھیے جس کو کہ پوچھا بھی نہو

مرجع البحرین۔ اڈیٹر حافظ محمد باقر علی امین چشتی القادری دارالاشاعت قاسمی پریس دہلی

چندہ سالانہ دو روپے

یہ تین جز کا رسالہ ہے جو معمولی کاغذ اور ۲۲ × ۱۸ تقطیع پر دہلی سے شائع ہوا ہی۔ مضامین کا تنوع اور اختصار قابل داد ہے۔ دہلی کے تمام مشہور اہل قلم پہلے نمبر میں موجود ہیں۔

پہلا مضمون تمہیدی ہے جس میں مقاصد رسالہ سے آگاہ کیا گیا ہے۔ اوس کے بعد حمد و نعت اور تصوف پر تین مضمون ہیں ادبی مضامین نہایت پر لطف اور ایسے مذہبی رنگ سے متاثر نظر آتے ہیں جس میں پند و موعظت پوشیدہ ہے۔ بہ حیثیت مجموعی پہلا نمبر دلچسپ ہے۔

"ناقد"

مطبع کاویانی برلن (جرمنی)

کی تازہ ترین کتابیں

جو ہم کو اسی ڈاک سے وصول ہوئی ہیں شائقین علم کے لیے خاص نعمت ہیں۔ مختصر فہرست درج ذیل ہے۔ قیمت کا فیصلہ ابھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن درخواست خریداری بھیجیے تاکہ مایوسی نہو۔

۱۔ زاد المسافرین ۲۔ گلستان سعدی مجلد

۳۔ دستور تار (فن موسیقی) لہ عـــہ

۴۔ جرمن فارسی لغت ۵۔ رہنمائے پسران

تلافیِ مافات

شعر فطرتِ انسانی کا ایک پرتو ہے جو خیالات کی وسعت، لطفِ زبان اور اظہارِ مطلب کے تمام پہلو اپنی محدود و مختصر دنیا میں بند رکھتا ہے۔ "تلافیِ مافات" اسی قسم کی ایک نظم ہے جس میں یہ سب خوبیاں یکجا موجود ہیں۔ عابد صاحب کی یہ نظم اُن کوششوں میں شمار ہونے کے قابل ہے جو اپنی جدت طرازی، ندرتِ تخیل و بلند پروازی سے دوسروں کے لیے بھی اک نئی راہ پیدا کر دیتی ہیں، اور ظاہر ہے کہ یہ مرتبۂ بلند ہر شخص کا حصہ نہیں۔ فلسفہ و معرفت کا یہ درس زمینِ شعر کی رنگینی و دلفریبی میں کچھ ایسا بھلا معلوم ہوتا ہے کہ جی چاہتا ہے کہ عابد صاحب اسی طرز میں کچھ اور لطف فرماتے۔

مدیر

ہے جلوہ گاہِ صبحِ ازل عالمِ خیال ۔۔۔ حیرت کے ساتھ ذوقِ تماشا لیے ہوئے
پیشِ نظر ہے شاہدِ لاریب کا جمال ۔۔۔ اور دل ہی ممکنات کے پردے اُٹھے ہوئے

ہیں بے خبر وصال کی لذت سے کاف و نون ۔۔۔ وحدت کو آپ اپنی نظر سے حجاب ہے
شورش سکوں کے پردے میں بیٹھی ہے سرنگوں ۔۔۔ ہستی عدم کی گود میں مصروفِ خواب ہے

لیکن نہاں ہے پردۂ خلوت میں ایک شے ۔۔۔ جس کو نہیں قبول کسی طرح یہ جمود
جو جلوہ افگنی کے لیے بیقرار ہے ۔۔۔ تخلیق جس کی فطرتِ اصلی کی ہے نمود

اک بار کر کے شعلۂ قدرت سے کسبِ نور ۔۔۔ یوں ظلمتِ عدم میں جل اٹھتا ہے یہ چراغ
جیسے سیاہیِ شبِ موسیٰ میں شمعِ طور ۔۔۔ جیسے سوادِ ہجر میں عاشق کے دل کا داغ

اس نور کی کرن کہ ہی ہستی کا موقلم — بھرتی ہی نقشِ فکر میں صورتگا آب و رنگ
ارض و سما، زمان و مکاں، مہر و مہ بہم — پاتے ہیں بار صفحۂ امکاں پہ بے درنگ

ہے یوں تو اس مرقع میں ہر نقش دلفریب — پر اک طلسم رنگ کی کچھ اور شان ہی
اس کا فروغ حسن ہی اس انجمن کی زیب — گویا نگارخانۂ ہستی کی جان ہی

یہ پیکرِ جمال، بشر جس کا نام ہے — پہنے ہے کس بناؤ سے ایجاد کا لباس
پر کوئی اہل دل اسے دیکھے جو غور سے — اس ساری بزم میں نظر آتا ہی یہ اداس

شاید یہ بات ہی کہ یہ قدرت کا لختِ دل — جو آج تک پلا تھا حقیقت کی گود میں
ہے صدمۂ فراق سے اسدرجہ مضمحل — اس پر گراں ہیں عالم صورت کی کلفتیں

کہتا ہی کرکے بارگہ قدس سے خطاب — فریاد اے مجاز و حقیقت کے بادشاہ
کرتی ہی مجھ کو کشمکش آرزو خراب — مجھ سے نہ ہوگا عالمِ ایجاد میں نباہ

قدرت کہ جس پہ زیست کے اسرار ہیں عیاں — ہوتی ہی یوں زبان تخیل میں نغمہ ریز
غافل حیات عربدہ پرداز ہی یہاں — اس قوت جلیل سے بیکار ہی ستیز

پر شکر کر کہ ایک ابھی باقی ہی آسرا — تجھکو ملول دیکھ کے آلام زیست سے
عماں بیکراں حقیقت کے آشنا — لائینگے تین گوہر یکتا ترے لیے

سر عظیم جذبۂ وحدت کا ترجماں — جس کو شرف ملا ہی پیمبر کے نام سے
لائیگا تیرے پاس عقیدت کا ارمغاں — اٹھین گے بندگی کے ترے دل میں ولولے

پھر طالبِ حقیقت ادراکِ فلسفی، کھولیگا خنک کا بابِ دبستانِ عقل میں
پھر خارِ رہ جو ہے صنستانِ علم کی دل اسکی بیہودگی سے اٹھائے گا لذ میں

بعد اس کے عندلیبِ گلستانِ معرفت کہتے ہیں جسکی نغمہ سرائی کو شاعری
بتلائے گا جگر کو ترے درد کی صفت تلقین کریگا قلب کو سوزِ خموشی کی

یہ تین کیفِ بادۂ خمِ الست سے مل کر ہم بنینگے محبت کی سرخوشی
کر دینگے محوِ شکوۂ ہستی کو قلب سے نیرنگِ کن فکاں کی حقیقت ہے بس یہی

(نگار مارچ ۲۳ء)

سید عابد حسین

نوائے بہار

حسنِ جمالِ یار دیکھ آئینۂ بہار میں رُوئے حسین کہ لالہ ہے دامنِ کوہسار میں
ذکرِ بہار و سیرِ گل یادِ نگار و کیفِ مے آگئی ان سے تازہ روح پھر دلِ بادہ خوار میں

دل کی فسردگی کا حال پوچھتے کیا ہو دوستو عمر ہی سب گذر گئی اپنی غمِ بہار میں
حسن کی آرزو بری عشق کی بیکسی بری کیا کریں چارہ جو مگر دل نہیں اختیار میں

دامنِ دوست اور یہ حوصلۂ طوافِ شوق ذرے ہماری خاک کے ہیں مگر اِن غبار میں
ہمتِ آرزو نہ توڑ یاس کو دل میں جا نہ دے رہزنِ مدعا ہیں یہ عشق کی رہگذار میں

اہلِ وفا کے واسطے چھوڑ کے مر رہا ہوں میں ایک فسانہ دلگداز عشق کی یادگار میں
تازگی و شگفتگی دل میں کہاں سے لاؤں میں روحِ نشاط ہی نہیں اب کے گل و بہار میں

محویؔ و شاعرانِ عصر ہوش میں آئے اب تو کیا
عمر تو سب گذر گئی ذکرِ گل و بہار میں

محوی لکھنوی

شذرات

سیاسیات مغرب کی چند نمایاں خصوصیات ہیں جن سے "غیر مہذب وغیر سیاسی مشرق" بھی واقف ہوتا جاتا ہے، لیکن اخبارات و جرائد کے صفحات بہت کم ایسی مثالیں پیش کرتے ہیں جنکو اگر تہذیب و سیاسیات کے پردہ میں محض مغربیت کی عشوہ گری کہا جائے تو بیجا نہیں۔ انگلستان کے موجودہ پارلیمنٹ میں تین عورتیں ممبر ہیں جن میں سے کوئی بھی اُس سرگرم جماعت کے ذمہ دار اراکین میں سے نہیں جو اب تک حقوق نسوان کے متعلق جد وجہد میں مصروف رہی ہیں بلکہ ایک لارڈ کی بیوی اور ایک طبقہ امرار کی خاتون اور تیسری مسز فلپس اک مشہور رقاصہ ہے جو حال ہی میں اسٹیج سے نکل کر اب بزم سیاست کی ملکہ بننا چاہتی ہے یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ یہ تینوں خواتین اپنے اپنے شوہروں کی جگہ منتخب ہوئی ہیں چونکہ کسی نہ کسی وجہ سے یہ حضرات دارالعوام میں منتخب نہ ہوسکتے تھے یا امید کامیابی نہ رکھتے تھے۔

اگرچہ یہ ایک واقعہ بھی ہمارے سیاسی بزرگوں کے لیے کافی سبق آموز ہے۔ لیکن جب اس کے دوسرے پہلو پر غور کیا جائے تو مغربیت، کا صحیح رنگ نمایاں ہوجاتا ہے مغربی ممالک میں جنس نازک کے اقتدار کی اس سے زیادہ روشن مثال کیا ہوسکتی ہے کہ جہاں لارڈ اسٹر، مسٹر ونٹرنگھم، اور مسٹر ملٹن فلپس ناکام ہوں وہاں یہ بازی ان خواتین کے ہاتھ رہے جو انھیں کے نام سے پکاری جاتی ہیں اور اس دعوے سے میدان میں آتی ہیں کہ میدان سیاست و موجودہ دور تمدن میں ناکامی و کامیابی ہماری ذات سے وابستہ ہے۔

اس سے بھی زیادہ افسوسناک یہ واقعہ ہے کہ حقوق نسواں کی حمایت، غریب کام

کرنے والی لڑکیوں کی حفاظت و اعانت، تربیت اطفال، ازدواج و طلاق اور اسی قسم کے دوسرے اہم و پیچیدہ مسائل کا بار گراں سینٹ فلپس کے نازک کندھوں پر ڈالا جاتا ہے جن کو برسوں سے معمولی لباس کی گرانباری کے بھی برداشت باقی نہیں اور جن کو اپنے آرٹسٹ دماغ کو علمی و کاروباری بنانے میں معلوم نہیں کتنے ہی دشوار گزار و کٹھن منازل طے کرنا ہوں گے جن کے لیے وہ قدم جو صرف "ادپیرا" کی ہموار و منور زمین ہی کے عادی ہوں کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتے۔

کیا حقوق طلب عورتیں اپنی نمائندگی کے لیے "تھیٹر، گھوڑ دوڑ کے میدان، مانٹی کارلو" اور "رلو سیریا" کے تفریح گاہوں کو درسگاہ سیاست قرار دیتی ہیں جہاں سے وہ اپنی "حمایت کرنیوالیوں" کو حاصل کیا کرینگی؟ معاملات سیاسی میں عورتوں کی مساویانہ شرکت اور حقوق طلبی غلط ہو یا صحیح، لیکن یہ یقیناً غلط ہے کہ عورتیں اپنے حق انتخاب کا صحیح استعمال نہ کریں اور غلطی کی یہ انتہا ہو کہ میدان سیاست در بزم سرود کا امتیاز ہی اُٹھ جائے۔

انسداد مینوشی کا مسئلہ اب علمی حلقے سے گزر کر عملی میدان میں منازل ارتقائی طے کر رہا ہے گزشتہ چند ماہ میں امریکہ و سلطنتہائے یورپ کے مابین بار بار اختلافات رونما ہوئے ہیں، اسباب تجارت و جہازوں کی تلاشی لی گئی، بیرون امریکہ شراب کی مقدار ممنوعہ کو جائز قرار دینے پر صد ردکی بحث ہوئی اور بعض مرتبہ یہ معاملات سیاسی خطرہ کے نام سے بھی تعبیر کیے گئے خود ہندوستان میں بھی گزشتہ دو سال میں مسئلہ انسداد نے بڑی کامیابی حاصل کی اور مسٹر پوسی فٹ جانسن چپکے ہی چپکے آئے اور دل ہی دل میں خوش ہو کر چلے گئے۔ سلطنت ترکی نے انسداد کے متعلق قطعی احکام نافذ کر دیئے ہیں اور اب یہ تحریک حدود مصر میں بھی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے جس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کی رہنمائی زیادہ تر خواتین مصر کے ہاتھ میں ہے۔

ہندوستان میں انجمن آرائی و انجمن سازی اگرچہ بہ حیثیت فن کے مغربی عشوہ گروں

سکے وجہ کمال تک نہیں پہنچی ہے پھر بھی گزشتہ چند سال میں اس نے غیر معمولی ترقی کی ہے
الیشیار کی برکت کہئی یا ہندوستانیوں کی عداترسی کہ اس خاص شغل کی ابتدا بھی
بہبود خلایق و اصلاح قوم سے کی گئی اور پھر رفتہ رفتہ ترقی کے وہ مدارج بھی طے ہونے
لگے جو آج دوسرے ملکوں میں نظر آتے ہیں مثلاً اہل حرفہ، تجار، صاحبان علم، ماہرین
سیاست، سیر و تفریح، ورزش اور کھیل، غرض ہر قسم کی انجمنیں ہندوستان میں موجود ہیں
گو انجمن محافظ دندان" ابھی تک سننے میں نہیں آئی حالانکہ یورپ میں اسکا بھی وجود ہے۔ نہ صرف
وجود ہے، بلکہ ایک معاصر کے بیان کے مطابق اُس کے صدر نے یہ ہولناک و عبرت انگیز
پیغام بھی پہنچایا ہے کہ اگر لوگوں نے اپنے دانتوں کی طرف سے یسی ہی بے پروائی برتی تو کچھ
عرصے کے بعد سب اپنے دانتوں سے محروم ہو جائیں گے!

لیکن یورپ و ہندوستان میں ایک عظیم الشان اختلاف ہے یورپ خواہ اپنی انجمنوں
کے مقبول و دلچسپ بنانے کے لیے کیسے ہی ذرائع کیوں نہ استعمال کرے (اور بلاشبہ
بعض ذرایع قابل اعتراض بھی ہوتے ہیں) اُس کے نزدیک یہ انتہا درجہ کی بدمذاقی ہے کہ
دانتوں کی انجمن" سے اشتراعیات کے مقاصد میں مدد لی جائے یا "ایکٹروں کی جماعت"
وآئی-ایم-سی-اے (مسیحی جماعت) کا پرچار شروع کر دے۔ بخلاف اس کے ہندوستان کی
بعض جدید الشیوع و معتدد جماعتیں اسی مقصد سے قائم ہوئی ہیں اور اگرچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ
ایسا کریں گی بھی یا نہیں اس لیے کہ میدان عمل میں ہنوز کوئی قدم نہیں اُٹھا ہے اور اگر آغاز
سے انجام کے متعلق کوئی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے، تو شاید توقع بھی نہیں رکھنی چاہیے
کہ کچھ کریں!

ہمارا مقصد ایک اُس جماعت سے ہے جو سندھ کے بعض تعلیم یافتہ حضرات نے
تبلیغ تصوف کے لیے قایم کی ہے اور مقاصد میں سیاسی اتحاد و حصول سوراج کو جگہ دی ہے
اور دوسری وہ انجمن جو ہماری ہی صوبہ میں حلقہ الشیوخ کی حیثیت سے پیدا ہوئی ہے

لیکن مقاصد جو اہم کام ہم کو علم نہیں۔

حکومت ملیہ انگورہ کی جدید اصلاحات کی فہرست بفضل خدا روز بروز ترقی پذیر ہے۔ اقتصادی آزادی کے لیے جس جرأت و استقلال سے حکومت ترکی نے کوشش کی ہے اوس کی متعدد مثالیں ان صفحات میں پیش کی گئی ہیں۔ حال میں اطلاع ملی ہے کہ وائے ایم۔ سی۔ اے (مسیحی نوجوانوں کی انجمن) کو قسطنطنیہ میں کام کرنے سے روک دیا گیا ہے۔ وائی۔ ایم۔ سی۔ اے عیسائیوں کی مشہور و متعدد جماعت ہے جس کی شاخیں تقریباً تمام دنیا میں نہایت خوبی سے اپنا کام کر رہی ہیں اور اگرچہ اُن کے مقاصد سے سیاسیات کو قطعی تعلق نہیں ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قسطنطنیہ کے مسموم سیاسی آب و ہوا، اور سازشوں کی کثرت نے اس غیر سیاسی جماعت کو بھی "مذہبی دستبرد" میں اعانت پر آمادہ کیا اور اُنھوں نے اپنی کوششوں کو محض رفاہ عام تک محدود نہیں رکھا بلکہ مغربی اقتدار کی حمایت اور ترقی میں بھی اون ذرائع سے کام لیا جو خلق خدا کو آرام اور مظلوم دنیا کو امن و سکون پہنچانے کے لیے وضع کیے گئے تھے۔

صوبہ بہار میں عظیم آباد (پٹنہ) ادبی حلقوں میں اپنے شعرا کی وجہ سے محتاج تعارف نہیں۔ علاوہ مشاعروں کی گرم بازاری، شعر و سخن کی مجالس کے علمی تصانیف بھی یہاں سے شائع ہوئی ہیں اور کتب خانوں کے لیے تو سرزمین بہار دور و نزدیک مشہور ہے۔ حال میں ایک انجمن ترقی اُردو پٹنہ میں قایم ہوئی ہے جس کے مقاصد میں علاوہ قیام کتب خانہ و دارالمطالعہ کے مفید و مستند ادبی تصانیف کی اشاعت بھی ہے۔ ہم کو ارکان انجمن کے مقاصد سے دلی ہمدردی ہے اور توقع ہے کہ وہ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد کے تجربوں اور مفید مشوروں سے بھی فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرینگے جنہیں غالباً سب سے زیادہ اہمیت اُس کے استقلال کو حاصل ہے

جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڈھ

کے

شعبہ تصنیف و تالیف کی شایع کردہ کتابیں

(۱) ازہار العرب - مؤلفہ مولانا سورتی — قیمت غیر مجلد ۸ر

(۲) تاریخ الامت - مصنفہ مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری — قیمت " عہ ر

(۳) ایضاً (حصہ دوم) 6 " (حصہ سوم) — " " عہ ر ۸ر

(۴) مبادی معاشیات - از پروفیسر ذاکر حسین خاں صاحب — " " عہ

(۵) اخبار الدولتین - از مولانا نیاز فتحپوری — (زیر طبع)

(۶) انتخاب کلام میر - مرتبہ مولوی نورالرحمن بی اے — (")

(۷) خطبہ شیخ الہند - (بہ تقریب افتتاح جامعہ) — قیمت ۲ر

(۸) خطبہ مسیح الملک - حکیم اجمل خاں صاحب — " ۲ر

(۹) انتخاب مضامین جوہر - معہ تصویر — " عہ ر

(۱۰) ترکوں کی کہانیاں — " ۴ر

المشتہر

مہتمم مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

دیوان غالب اُردو

جس طرح نظم اُردو کی بہترین کتاب تسلیم کی جاتی ہی اسی طرح جو اڈیشن ہم نے خاص اہتمام سے جرمنی سے چھپوا کر منگایا ہی اُس کے متعلق بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہی کہ اس سے بہتر اُردو زبان میں آج تک کوئی کتاب طبع نہیں ہوئی نہایت نفیس ملائم سُرخ جلد پر سُنہرا کام ہی اندر مرزا صاحب کی رنگین تصویر ہی اور پھر مکمل دیوان مع قصائد و غزلیات رباعیات اور اس کے بعد بیاض کے لیے سادہ اوراق دئیے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ قابل قدر خود مرزا غالب مرحوم کا لکھا ہوا مقدمہ ہی جو شروع میں درج ہی اس اڈیشن کی مقبولیت کی یہ حالت ہی ہم کو کسی طرح امید نہیں کہ شائقین تک پہونچ سکے بہرحال درخواست خریداری بھیج دیجیے تاکہ نام درج رجسٹر ہو جائے اور اس وقت نہیں تو دوسرے اڈیشن پر مایوسی نہو۔ قیمت صرف تین روپیہ عہ

المشتہر

مہتمم مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ

نوٹ۔ گزشتہ ڈاک سے پہلا اڈیشن موصول ہوگیا ہی

اللہ اکبر

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

کا

ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ نور الرحمٰن

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

قیمت سالانہ للعہ

فہرست مضامین

جلد ۲ | ماہ محرم الحرام سنہ ۱۳۴۲ھ مطابق اگست سنہ ۱۹۲۳ع | نمبر ۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

جلد ۲ ماہ محرم الحرام سنہ ۱۳۴۲ھ مطابق اگست سنہ ۱۹۲۳ء نمبر ۲

جرمنی کی تعلیمی زندگی

---

(۱) جدید فلسفۂ تعلیم کی تاریخ

(ڈاکٹر فریڈرش ایرنٹ رایش نے خاص جامعہ کے لیے تحریر فرمایا)

یہ مضمون ایک سلسلہ کا پہلا نمبر ہے جو خاص جامعہ کے لیے جرمنی کے ایک نوجوان ماہر تعلیم ڈاکٹر ایرنشٹ رایش نے تحریر فرمایا ہے۔ ڈاکٹر ایرنشٹ رایش ویکرسڈورف کے مشہور مدرسہ میں معلم ہیں۔ یہ مدرسہ اپنی نوعیت میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے اور جرمنی میں ایک جدید تعلیمی تجربہ ہے۔ خود اس مدرسے کے اصول اور طریق عمل پر بھی ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس سلسلے میں ایک مضمون عنایت فرمایا ہے جو انشاء اللہ آیندہ ہدیہ ناظرین کیا جائے گا۔ اس سلسلہ مضامین سے ناظرین کرام کے سامنے جرمنی کی تعلیمی زندگی کا ایک اجمالی نقشہ پیش ہو جائے گا جو اس وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ وہ ایک جرمن ماہر تعلیم کے قلم سے نکلا ہے۔ اور ہمیں امید ہے کہ ہمارے ملک کے لئے اپنی موجودہ تعلیمی کشمکش میں فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ ترجمہ کے لئے ہم اپنے کرم فرما جناب سید عابد حسین صاحب بی۔ اے متعلم دارالفنون برلن کے ممنون احسان ہیں۔ مدیر

جرمنی، فرانس، اور انگلستان مغربی یورپ کی تعلیمی زندگی کے تین مخصوص نمونے پیش کرتے ہیں۔ انمیں فرانسیسی نظامِ تعلیم میں سب سے زیادہ مرکزیت (یعنی پیرس میں تعلیمی نظم و نسق کا مرکوز ہونا) اور انگریزی طریقہ میں سب سے زیادہ آزادی (یعنی معاملاتِ تعلیمی کا شخصی رجحان پر چھوڑ دینا) ہے۔ جرمنی میں نظم و نسق تعلیمی کا طریقہ ان دونوں کے بین بین ہے۔ طرزِ تعلیم ہر جگہ کم و بیش یکساں کیا گیا ہے، لیکن اس کا حل و عقد مرکزی دار الحکومت کے نہیں بلکہ مختلف ریاستوں کی مقامی حکومتوں کے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ طرزِ عمل میں مختلف ریاستوں کی مقامی خصوصیات کے لحاظ سے کچھ اختلاف بھی نظر آتے ہیں۔

اہلِ یورپ کی امتیازی خصوصیت تاریخ کے متعلق ان کا رویہ ہے۔ ان کے نزدیک زمانہ حال کے حالات و خیالات کا سچا علم اس وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ ان کے معرضِ وجود میں آنے کے طریقہ سے یعنی ان کی تاریخی رفتار سے بھی واقفیت ہو۔ اس اعتبار سے یورپ کا رویہ گویا روبہ قفا ہے۔ یہاں تک کہ سیاسی انقلاب کے کٹر حامیوں کا بھی بغیر اس کے کام نہیں چلتا کہ زمانہ گزشتہ کی تصویر اپنے (مثلاً اشتراکی) رنگ میں کھینچیں اور پھر اسے اپنے معنی پہنائیں۔ لیکن اہلِ یورپ کی یہ تاریخی پس بینی محض پردۂ خود فریبی نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد ان کی طبیعت اور ان کی کارگزاریوں کی حقیقی سیرت پر ہے۔ البتہ بالکل حال میں غالباً مشرقی فلسفہ کے اثر سے غیر تاریخی طرزِ خیال کی علامتیں دن بدن بڑھتی نظر آتی ہے۔ یہاں کی تعلیمی تاریخ کا تعلق صرف مغرب سے ہے اور چند دن کی بات ہے کہ مشرقی تعلیمی تجربات مثلاً ٹالسٹائے اور ٹیگور کی کوششوں کی طرف توجہ منعطف ہوئی ہے۔ تعلقاتِ تاریخی کی وسعت کے اعتبار سے جرمنی کی تعلیمی زندگی سب سے ممتاز حیثیت رکھتی ہے کیونکہ فرانس میں تو اس پر زیادہ تر ۱۷۸۹ء کے انقلاب اور نپولین اول کے اثرات کا پرتو ہے اور انگلستان میں یہ کہیں قرونِ وسطیٰ سے متعلق ہے اور کہیں بلا روایات۔

جرمنی کی یونیورسٹیاں مثل تمام مغربی یورپ کے دار العلوموں کے قرونِ وسطیٰ یعنی بارھویں صدی عیسوی سے پندرھویں صدی کے ختم تک عالمِ وجود میں آئیں۔ ان یونیورسٹیوں کے قیام

کی تحریک اس زمانہ کے فلسفہ سے ہوئی جو عقلی طریقہ سے فلسفۂ یونان اور کلیسا کے اصولوں میں تطابق کی کوشش کرتا تھا اور جسے عام طور پر "اسکولاسٹک" (Scholastic) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان یونیورسٹیوں میں سب سے مشہور پیرس میں تھی۔ ادھر کولون اور سٹراسبرگ کے دارالعلوم جرمنی میں بہت وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ لیکن جب پندرہویں صدی کے آخری حصہ میں قرون وسطیٰ کے مجموعی تعقل عالم کی عمارت مسمار ہوگئی تو ان یونیورسٹیوں کے سر بھی قضا منڈلانے لگی کیونکہ (Scholastic) کی ساری طاقت اب ختم ہو چکی تھی۔ اس موقعہ پر یونیورسٹیوں پر ایک وسیعے انداز خیال کا تسلط ہو گیا جو خود اسی عہد قدیم کا نام لیوا تھا جسے "ہومانزم (Humanism) کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اسی کے زیر اثر پندرہویں اور سولہویں صدی میں یہ یونیورسٹیاں اپنے عالم شباب تک پہونچیں۔ پھر خود کلیسائی تجدید سے جو لوتھر (Lutne) لوتھر اور میلانکتون (Melanchton) کے ہاتھوں عمل میں آئی اس سے بھی یونیورسٹیوں کو کچھ نہیں تو اتنی تقویت تو ضرور پہونچی کہ بزرگ ترین (Humanist) فاضل اراسمس (Erasmus) راٹرڈمی کے یونانی علوم میں فضل و کمال سے۔ لیکن تجدید کلیسا کی تحریک سے عقائد کا تضاد یونیورسٹیوں تک پہونچا، چنانچہ اب تک کیتھولک اور پروٹسٹنٹ یونیورسٹیاں الگ الگ ہیں یہاں تک کہ ایک ہی ریاست میں دونوں موجود۔ مثلاً بادن میں فرائی برگ کیتھولک یونیورسٹی ہے، بخلاف اس کے ہائیڈلبرگ پروٹسٹنٹ۔ ہومانزم کے اثر سے بتدریج مغربی علوم و فنون، یعنی قانون، طب اور فلسفہ علوم دین سے علٰحدہ ہوگئے، لیکن آج تک یونیورسٹیوں کی اسناد اور دفتری کاروبار کا لاطینی زبان میں ہونا اس کا شاہد ہے کہ یونیورسٹیوں کے تمدن کا مورث اعلیٰ کون عنصر ہے۔ اس طرح آج تک جرمن یونیورسٹیوں کی روایات کی بنیاد (اگرچہ اس حد تک نہیں جیسے انگلستان میں) زمانہ پیشیں پر اس سے زیادہ ہے جس قدر کہ جدید صنعتی اور فلسفیانہ اسپرٹ کے مطابق ہونا چاہیے تھی۔ پہلے پہل سترہویں صدی یعنی مشہور فلسفی لائبنز (Leibnitz) کے زمانہ میں لوگوں کو ڈرتے ڈرتے یہ ہمت

ہوئی کہ یونیورسٹی کی کرسی سے جرمن زبان کا استعمال کریں۔ یونیورسٹیوں کو اپنے ارتقا میں تین مدارج طے کرنے پڑے۔ پہلے یہ کلیسا کی لونڈی بنی، پھر قدیم یونان و روما کی تعلیم کی فروش اور آخر میں اعلیٰ مغربی تعلیم کا جامع مرکز کیونکہ آج کل خود دینیات تعلیم دنیوی کا ایک جز بن گئی ہے۔ اگر انیسویں صدی میں سائنس کے داخلہ اور صنعتی یونیورسٹیوں کے قیام سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو سترہویں صدی کے بعد یونیورسٹی میں کوئی نمایاں تغیر نہیں ہوا۔

قرون وسطیٰ کی تمام تر درسی تعلیم مذہبی حیثیت رکھتی تھی اور کلیساؤں اور خانقاہوں میں اس کا مقام تھا۔ معاشرتی مدارج کے لحاظ سے یہ امیروں کی تعلیم تھی۔ عوام شہری، اور کسان کسی باقاعدہ مدرسہ میں تعلیم نہ پاتے تھے، ان کی تعلیم عموماً جاہل آدمیوں کے سپرد ہوتی تھی جو خود بھی مشکل سے کچھ پڑھ سکتے تھے اور اپنا کم مایہ علم فہمی کے ذریعہ شاگردوں کے گلے اتارتے تھے۔

لوتھر نے آکر تعلیم کو عوام تک وسعت دینے کی تحریک کی۔ اس نے قرون وسطیٰ کی خانقاہ کی تعلیم پر الزامات لگائے۔ کہ "راہبوں نے اپنے شاگردوں کو اس طرح مقید رکھا ہے جیسے پنجرے میں چڑیاں بند کی جاتی ہیں" اس نے تمام شہروں کے سرپنچوں، مجلس انتظامی کے اراکین، اور میر مجلسوں کو ایک تحریر بھیجی (۱۵۲۴ء) تاکہ وہ پبلک مدارس قائم کریں جس میں عوام کم سے کم انجیل پڑھنا سیکھ سکیں۔ اس طرح تعلیم عوام کی ابتدا پھر مذہب سے ہوئی اگرچہ بنیادا رو کا انجیل اور پروٹسٹنٹ فرقہ کی بیاض و اصول ایمان پر مبنی تقویٰ زمانہ پیشین کے کلیسائی اور راہبانہ عقائد سے بالکل مختلف تھا۔ لیکن لوتھر شروع ہی سے اپنی عملی جد و جہد میں مدرسوں کے خیال سے بہت متاثر معلوم ہوتا ہے۔ "ہمیں لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لیے عمدہ مدارس کی ضرورت ہے تاکہ مرد ملک اور قوم پر بخوبی حکمرانی کر سکیں اور عورتیں گھر بار۔ بال بچوں اور نوکروں چاکروں کی اچھی طرح دیکھ بھال کر سکیں"، تاہم ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک مدت درکار تھی۔

سب سے پہلے اعلیٰ طبقوں کی تعلیم ہومانی (Humanistic) مدارس میں جن کے جانشین مدارس ہمارے نزدیک موجود ہیں ان مصلحین اور جیسوئٹ لوگوں (Jesuits) کے اہتمام میں

ہوتی رہی۔ ان میں لاطینی زبان کا درس سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ اسکول کی زبان لاطینی تھی، مدارس کے تماشہ گاہوں میں تماشے لاطینی میں ہوتے تھے۔ اس تعلیم میں سب سے زیادہ توجہ کتابی سبق یعنی تدریس پر کی جاتی تھی نہ کہ اس چیز پر جو انسان کو انسان بناتی ہے یعنی تعلیم و تربیت۔ یونہی جرمن اسکولوں نے تعلیم کے حقیقی مسائل کو کچھ دن پہلے تک ہمیشہ درسیات کے پردہ میں پوشیدہ رکھا۔ چنانچہ جرمن مدارس صنعتی تعلیم میں تو ہمسایہ ملکوں پر بہت ترجیح رکھتے تھے لیکن یہاں وہ حقیقی مردم آفریں تعلیم نہ تھی جس پر انگلستان اور امریکہ کے مدارس بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں۔

سترھویں صدی میں اعلیٰ مدارس کی اصلاح کے لئے دو پہلوؤں سے معرکہ آرائی شروع ہوئی۔ ایک طرف تو درس و تدریس سے لاطینی زبان کو خارج کرنے اور جرمن زبان کو اس کے شایاں شان جگہ دینے کی کوشش شروع ہوئی اور دوسری طرف اس کی منطقی خشونت اور سختی پر حملہ شروع ہوا۔ ان دونوں مقاصد کے لیے لڑنے والے راٹکے (Ratke) اور کامینیس (Commenius) تھے، جنھوں نے تجربہ کے لیے خود اپنے مدارس قائم کیے۔ مار پیٹ اور بیجا سختی کے ذریعہ تعلیم دینے کے خلاف اس اصول کی تلقین شروع ہوئی کہ "ہر چیز بغیر جبر کے" "ہر چیز قدرت کے نظام قانون کے مطابق"۔ اس طرح تعلیم کا ایک جدید مطمح نظر قائم ہوا جس کی بنیاد بہتر درسیات اور آسان طرز تعلیم پر تھی۔ اس موقع پر میرے نزدیک جزوی تفصیل کی بہ نسبت نشو و نما کی عام رفتار کا دکھانا زیادہ اہم ہے۔ اس مذکورہ بالا معرکہ آزادی کے بعد عوام کی ابتدائی تعلیم کا مسئلہ نئے سرے اُٹھایا گیا۔ اس بار بھی اس کی کفیل پروٹسٹنٹ مذہب کی وہ کلیسائی تحریک تھی جو عقائد جمود کے خلاف بلند ہوئی۔ دیہات کی خاموشی میں رہنے والے مذہبیں (Pietists) نے اس نئی تعلیمات کی بنیاد ڈالی جس نے دینیات اور جرمن زبان کے درس کے ساتھ دستکاری اور علم الاشیاء کو بھی مدرسہ میں داخل کیا۔ چنانچہ بلا پس و پیش کہا جا سکتا ہے کہ ان مدارس میں وہ تخم بویا گیا جس کا پھل ہمارے زمانہ کے اوبر ریال شولے (Oberrealschule) ہیں یعنی وہ مدارس جن میں تعلیم کا جزو غالب سائنس ہے۔ اس تعلیم میں

بس ایک چیز کی کمی تھی یعنی ہنسی خوشی اور کھیل کود کی جو بچوں کے سن کے لیے مناسب ہوں۔
اس کی وجہ یہ کہ بچہ کی ذات کی گہری واقفیت ابھی حاصل نہ کی گئی تھی۔ یہ واقفیت اٹھارہویں صدی
کا الہام وانکشاف تھی بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ اس شدید عقل پرست صدی کا حریف کہا جائے کیونکہ تعلیم
کا درس سرد صرانہ اور خشک معقولیت پر مبنی نہیں بلکہ اس کی رگوں میں ایک نہایت شدید احساس کا
خون دوڑتا ہے۔ اس حقیقی و تعلیمی صدی میں "فطرت" کا نعرہ گونجتا ہے جسے سب سے پہلے راٹکے
(Ratke) ڈرتے ڈرتے زبان پر لایا تھا۔ انگریز لاک نے اس درس کی بنیاد رکھی
فرانسیسی روسو نے اپنے مہتم بالشان تعلیمی ناول میں اس کی تکمیل کی اور المانی سوئیزرلینڈ
کے پستالوزی نے اپنی قلمی اور عملی جدوجہد سے اس کی تائید کی۔
انسان کے خاطی اور عاصی ہونے کے خلاف روسو یہ بانگ دہل کہتا ہے کہ "انسان قدرتاً نیک
ہوتا ہے، تمدن نے اسے خراب کر دیا ہے" روسو ہی کے زمانہ سے یورپ کی جدید تمدنی یاس مشربی
شروع ہوتی ہے۔ روسو خراب شدہ دنیا کو مخاطب کر کے کہتا ہے "واپس چلو، لوٹو، اسی ابتدائی
بدی سے محفوظ فطری زندگی کی طرف!" کہ یہی اس کے نزدیک خدا شناسی کی زندگی ہے۔ بچے کے
دماغ میں علوم و فنون کا ٹھونسنا اسے برباد کرنا ہے۔ پس پبلک مدارس سے دور رہنا چاہیئے۔
ایک شاگرد کے لیے ایک اُستاد درکار ہے جو اپنے آپ کو بس اسی کے لیے وقف کر دے یہاں تک
کہ وہ بیس سال کی عمر تک پہونچ جائے اور یہ اس انسانی پودے کو مضر اثرات سے بچاتا ہے
اور اسے اپنے آپ بڑھنے اور پھلنے پھولنے دے۔ انسان کے کردار کے لیے درست وہ چیز ہے
جو قلب اور جذبات سے پیدا ہو نہ وہ جس کا تقاضا عقل و فہم کریں۔
ہر بچے کے لیے علیٰحدہ اتالیق کی تجویز کو روسو عملی جامہ نہ پہنا سکا لیکن اس سے پستالوزی نے
کام لیا۔ اس نے باوجود خارجی مصائب کے بیشتر غریب ترین لوگوں کے بچوں کے لیے پدرانہ شفقت
کے ساتھ تعلیمی جماعت قائم کی چنانچہ جرمن دیہاتی مدرسوں نے آج تک اس کے مشفقانہ طرز تعلیم
سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ یہی نہیں، اس سے بڑے بڑے مشاہیر نے استفادہ کیا ہے۔ مثلاً فروبل

(Froebel) نے خورد سال بچوں کی تعلیم میں، گوئٹے (Goethe) نے اپنے ناول "ولہلم مائسٹر" (Wilhelm Meister) میں جہاں اس نے ایک تعلیمی حکومت کی تجویز پیش کی ہے (جس کا بنیادی قانون خود اختیاری ادب ہے) اور فشٹے (Fichte) نے قومی تعلیم کے خیالات میں۔ یہ الفاظ مختصر پستالوزی ہماری فطرت کی قوت مجموعی یعنی ہماری "انسانیت"، ہماری "آدمیت" کی ایسی تربیت چاہتا ہے جو واضح علمی نظر پر مبنی ہو۔

پستالوزی سے کچھ عرصہ پہلے ہی جرمن میں "حب الناس" کی تعلیمی رو نما ہو چکی تھی۔ اس کے متبعین اعلیٰ تعلیم میں روسو کے اصول پر عمل پیرا تھے اور بہ حیثیت محبان انسانیت انھوں نے اپنے خاص نمونہ کے مدارس کی بنیاد ڈالی تھی۔ ان مدارس نے محض مادی اور خارجی علم کو نوشت ڈالا، اور تربیت قلب پر زیادہ توجہ کی اور طالب علم کے لیے بہت وسیع آزادی بہم پہونچائی۔ بہت سے خیالات جدیدہ کو ہم اُن کے مدارس میں اچھی ترقی یافتہ شکل میں موجود پاتے ہیں۔

جذبات کی اس رو نے اگرچہ تعلیمات کو بھی اپنی قوت اور اہمیت سے بہت کچھ حصہ دیا تاہم اسے خود بھی منظم اور مرتب ہونے کی بڑی سخت ضرورت تھی۔ یہ کام کانٹ (Kant) کے عقلی خیالات نے انجام دیا اور اس کے بعد ہربارٹ (Herbart) نے اگرچہ اس کی استدلالیت نے اس تحریک کو کچھ نقصان بھی پہونچایا۔ ساری کی ساری انیسویں صدی خیالات تعلیمی کی توسیع میں صرف ہوئی اور یہ اس طرح کہ قدیم تعلیمات انفرادی کے بجائے جدید تعلیمات اجتماعی یعنی خودیت اجتماعی کی تعلیم کا مسئلہ روز بروز زیادہ قوی ہوتا گیا۔ ہمارے معاصرین میں سے ماربرگ کے مشہور فلسفی ناٹورپ (Natorp) نے اس مسئلہ پر اور اس کے نظری اصولوں پر خاص طور سے بحث کی ہے۔ بہت سی علامتیں اس امر کا پتہ دیتی ہیں کہ بیسویں صدی کو بھی تعلیمی اعتبار سے ایک مخصوص اہمیت حاصل ہوگی۔ چنانچہ جرمنی میں آج ہر طرف جدید تعلیمی تجاویز کی بھرمار ہے جن کا ذکر میں اگلے مضامین میں کروں گا۔

ایک مختصر سے مضمون کی حدود میں مختلف مذاہب تعلیمی کی تاریخ کا محض ایک بیرونی خاکہ ہی

دیا جا سکتا تھا لیکن امید ہے کہ تربیت عقلی و ذہنی کے مقابلہ میں تربیت قلبی و جذباتی کی ترجیح کا نکتہ واضح ہو گیا ہو گا، نیز یہ امر کہ قرون وسطیٰ سے لیکر جب بچہ کی ذاتی قدر سے بہت کم واقفیت تھی اور تصویروں تک میں اسے گویا ایک بڑے آدمی کو چھوٹا بنا کر ظاہر کیا جاتا تھا، بچہ کی کیفیات دماغی کے انکشاف تک کیا تغیر ہوا ہے، تربیت و تعلیم کے مسئلہ کی اہمیت نے محض مضامین درسی کے مقابلہ میں کس طرح اپنے کو آگے بڑھایا ہے اور میدان تعلیم میں جو اصلاً انفرادی تھا شعور اجتماعی کس طرح داخل ہو چلا ہے۔

بس ایک بات اور قابل ذکر ہے، وہ یہ کہ اگر اٹھارویں صدی نظریات تعلیم کی پیدائش میں بہت پیش پیش تھی تو انیسویں صدی کی خصوصیت امتیازی سرکاری مدارس کی تنظیم کو بتایا جا سکتا ہے۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی نے اگر تعلیمی فلسفی پیدا کیے تو انیسویں نے اس کے مقابل مدارس کے محنتی عہدہ دار اور متدین منتظم۔ یوں تو "مذہبیت" کے اثر سے ۱۷۱۷ء ہی میں پروشیا کے اندر ۵ سے ۱۲ سال تک بچوں کے لیے تعلیم لازمی ہو گئی تھی، بادشاہ وقت نے تقریباً دو ہزار مدارس قائم کرا دیئے تھے لیکن جدید مدارس کے قیام کا باضابطہ کام، مختلف نمونوں کی تکمیل، امتحانات اور نصاب کی تنظیم اساتذہ کی تعلیم، یہ سب انیسویں صدی ہی میں عمل میں آئے۔ چند اہم واقعات درج ذیل ہیں:-

۱۷۸۸ء میں پروشیا میں میٹرک کا امتحان جاری کیا گیا تقریباً اسی زمانہ میں جدید ہومانسٹک (Humanistic) تحریک کے باعث گنازیم (جرمنی میں ایک خاص قسم کے مدارس کا نام ہے، مختلف اقسام کی مضامین میں ہو گی) زیادہ بار آور ہوئے۔

۱۸۰۹ء میں وہ جامع حیثیات اور ہمہ داں عالم ولیم ہمبولٹ برلن میں وزارت داخلیہ اور تعلیم پر مامور ہوا۔

۱۸۱۰ء میں فوقانیہ مدارس میں درس دینے والے اساتذہ کے لیے امتحان کے قواعد شائع ہوئے ۱۸۱۷ء میں وزارت تعلیمی کا بجائے خود ایک مستقل عہدہ قائم کیا گیا، نصاب تعلیم تیار ہوئے اور ان میں ترمیم و تنسیخ برابر جاری رہی یہ تمام کارروائیاں زمانہ جنگ عظیم تک جاری رہیں۔ پھر یہاں پہونچکر جدید تعلیمی اصلاحات کا باب شروع ہوا۔ اس ساری داستان میں ایک چیز برابر محسوس ہوتی ہے یعنی احساس تاریخی کی روز افزوں شدت۔

مرزا کرمانی

مرزا رضا کرمانی سید جمال الدین افغانی کے ان خاص معتقدین میں تھے جو انقلاب ایران کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔ ناصرالدین شاہ فرمانروائے ایران کا قتل انہیں کے ہاتھ سے عمل میں آیا اور بیان کیا جاتا ہے کہ اس کا علم سید موصوف کو بھی تھا۔

(مدیر)

قدرت کی بہترین طاقتیں عموماً کبھی کبھی ظہور پذیر ہوتی ہیں اور جو طاقت جس قدر دیر میں نمایاں ہوتی ہے اسی قدر اس کے نتائج مفید اور خوشگوار ہوتے ہیں۔ نسیم سحر کے جھونکے روز چلتے ہیں لیکن ان سے کوئی موسمی انقلاب پیدا نہیں ہوتا۔ آندھیاں سال کے خاص خاص اوقات میں چلتی ہیں اور انہیں کے ساتھ ساتھ برق و سحاب کا قافلہ بھی چلتا ہے جو بظاہر مہیب اور خوفناک نظر آتا ہے لیکن دنیا کی کھیتیاں انہی سے سرسبز و شاداب ہوتی ہیں۔

مادی دنیا کی طرح غیر مادی دنیا میں بھی قدرت اسی اصول پر عمل کرتی ہے مثلاً سیاسی دنیا میں تملق، خوشامد، چاپلوسی، عجز، درماندگی اور طوع و رضا کی نمائش روزانہ ہوتی رہتی ہے اور معمولی سے معمولی حکام کی چوکھٹ بھی سجدہائے نیاز کا بہترین ذخیرہ اپنے پاس محفوظ رکھتی ہے لیکن ان شخصی، انفرادی اور جزوی فوائد کے سوا کوئی قابل یادگار نتیجہ نہیں نکلتا مگر بہترین اخلاقی طاقتیں یعنی عزم و استقلال، صبر و ثبات، جوش و از خود رفتگی، ایثار و قربانی، شجاعت و دلیری ایک باوقار اور ضابط النفس شخص کی آغوش روح میں پرورش پاتی رہتی ہیں اور جس طرح آندھیاں دامن کوہ سے اٹھ کر تمام دنیا میں زلزلہ ڈال دیتی ہیں اسی طرح اس عظیم الشان آدمی کے اندر اور طاقتوں کا طوفان اٹھتا ہے اور جبر و استبداد، ظلم و جور اور قساوت و سنگدلی کی بنیادوں کو دفعۃً متزلزل کر دیتا ہے۔ سیاسی اصلاح میں اس شخص کو باغی، فتنہ گر اور مفسد کہا جاتا ہے لیکن قومی دنیا میں اسی شخص کا نام قوم پرست، جاں نثار ملک اور محب وطن ہے اور کسی قدر بے پروائی

کے ساتھ کبھی کبھی اسی کو "انقلاب کوش" بھی کہہ دیتے ہیں۔

یہ مقصد، یا محبِ وطن، یا انقلاب کوش انسان جب اپنے مقاصد کو عمل میں لانے کے لیے اُٹھتا ہے تو جبر و استبداد اور ظلم و جور کی تمام طاقتیں اس کے مقابلہ میں صف بستہ ہو جاتی ہیں اور فریقین کی آویزش و کشمکش اپنے معمولی درجے سے شروع ہو کر نہایت خوفناک حد تک پہنچ جاتی ہے اور جب تک ان کے ترکشِ عمل و قوت کے تمام تیر ختم نہ ہولیں یا ان میں سے ایک فنا نہ ہو جائے اُس وقت تک کوئی بھی فتح و شکست کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا اور یہ آویزش ختم نہیں ہوتی۔ فریقین اپنے کام کو تدریجی طور پر بڑھاتے اور پھیلاتے ہیں مثلاً استبداد سب سے پہلے ترغیب و تحریص کے ذریعے اس کا مقابلہ کرتا ہے وہ اس کے سامنے ہر قسم کے اعزاز و اکرام، جاہ و منصب اور خطاب و امتیاز کو پیش کرتا ہے۔ اب اگر اس کی انقلابی روح اپنے اندر استقامت، استقلال، پختگی اور کمال نہیں رکھتی تو وہ اسی جام سے مدہوش ہو کر اپنے مقاصد کو فراموش کر جاتا ہے لیکن یہ روح کامل ہے اور اپنے اندر استقلال و استقامت رکھتی ہے تو وہ نہایت آسانی کے ساتھ اس منزل سے آگے بڑھ جاتا ہے۔

اس ناکامی کے بعد استبداد فوراً اپنی دوسری قوتوں کی طرف توجہ کرتا ہے اور جس روح پر مال و زر، اعزاز و اکرام اور منصب و امتیاز کے ذریعے فتح حاصل نہ کر سکا تھا اب خشم و عتاب، تشدد و سخت گیری، بند و زنداں اور دار و رسن کے ذریعے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ حملہ پہلے سے کسی قدر سخت ہوتا ہے لیکن انقلابی روح کی پختگی و استقامت اس کو بھی آسان کر دیتی ہے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ استبداد کی دردناک سختیاں انقلاب کوش انسان کی جسمانی کمزوری و اضمحلال کا ذریعہ بن جائیں لیکن وہ اس کے مقاصد کی بالیدگی اور ترقی کو نہیں روک سکتیں۔ تشدد اور سخت گیری خود استبداد کے لئے زہرِ قاتل ہے لیکن انقلابی روح کے لیے آبِ حیات۔ انقلاب کی روح ہنگامی طور پر دبائی جا سکتی ہے لیکن فنا نہیں کی جا سکتی۔ یہ وہ پودا ہے جو ایک مرتبہ جم کر برگ و بار لائے بغیر خشک نہیں ہوتا۔ فقید الشرق سید جمال الدین افغانی نے کس قدر صحیح لکھا ہے کہ

"[illegible] جو تم نے پیدا کر کے فنا کر دیا ان کی نیت کو فنا کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکے
[illegible] فنا کر دیئے گئے لیکن ان کا مقصد فنا نہیں کیا جا سکا۔ مرزا صاحب مرحوم کی موت
نے تمام [illegible] انقلاب کی روح پھونک دی اور جو کچھ اپنی زندگی تک صرف وہی کہتے تھے
ان کی موت کے بعد ہر شخص کہنے لگا۔

لیکن آؤ ہم یہاں ان واقعات کی تشریح سے الگ ہو کر صرف مرزا مرحوم کی انقلابی روح
کا مطالعہ کریں اور یہ دیکھیں کہ وہ اپنے اندر کیا خصوصیات رکھتی تھی؟

نظام عالم کی مشین خیالات، عقائد اور ایمان ہی کے کل پرزوں سے چلتی ہے۔ جو عقیدہ بھی
دنیا میں پھیلا دیا جائے اور لوگ اس کو قبول کر لیں وہی نظام عالم کے قیام و بقا کا ذریعہ یقین کر لیا
جاتا ہے۔ قدیم زمانہ سے استبداد کا وجود اسی طرز عمل کا نتیجہ ہے۔ غالب و فاتح اقوام نے استبداد
کو برحق سمجھ لینے پر مفتوح و مغلوب قوموں کو مجبور کیا اور رفتہ رفتہ اقوام عالم میں یہ عقیدہ راسخ
ہو گیا اور وہ استبداد کو جائز و برحق سمجھنے لگیں۔ لیکن ایک طویل زمانہ گزر جانے کے بعد آہستہ آہستہ
ہر شخص یہ محسوس کرنے لگا کہ ہر ذی روح جو زندگانی اور حیات کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ وہ اپنے اندر
کچھ خاص قوتیں رکھتا ہے اور یہ اس کی فطرت و طبیعت کا اقتضا ہے کہ اس کو ان قوتوں کے بڑھانے
ان کو اپنے صحیح موقع پر عمل کرنے اور ہر طرح تکمیل کو پہنچنے کا پورا موقع ملے۔ اس احساس کے ساتھ
اس نے استبداد کے طرز عمل پر غور کیا تو اس کو معلوم ہوا کہ وہ اس کے اس فطری اقتضا کے
بالکل مخالف ہے۔ اس کو زندگی کی ہر منزل میں قدم قدم پر یہ علانیہ نظر آیا کہ اس کو اپنی قوتوں کے
بڑھانے اور تکمیل تک پہنچانے کے لیے جگہ نہیں ملتی۔ اس احساس نے دنیا کی ہوا بدل دی اور خیالات
میں عام انقلاب پیدا ہو گیا تو اس عام عقیدہ کے خلاف دوسرا عقیدہ پیدا ہوا یعنی اب استبداد کی
جگہ حریت، آزادی اور مساوات نے لے لی لیکن جانتے ہو کہ جن عظیم الشان انسانوں نے
انسانیت کے اس مخفی و ضعیف احساس کو تیز، قوی اور مشتعل کر کے دنیا میں بڑے بڑے انقلابات
برپا کیے ان کے آئینہ اخلاق کا نمایاں جوہر کیا تھا؟

(۱) صبر و استقلال اور ہر قسم کی مصیبت کو خوشی سے برداشت کر لینا

"جب لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ تم اپنے عقائد کے لیے نہایت خوشی سے مصائب برداشت کرتے ہو اور اپنے مذہب کی خاطر موت کو قبول کرنا پسند کرتے ہو تو وہ اس وقت یہ یقین کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ تم میں کوئی خاص بات ضرور ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک کسی بات کی سچائی کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا جب تک وہ یہ دیکھ نہ لے کہ لوگ اس حقیقت کے لیے جان دینے پر آمادہ ہیں۔ خطرات کا مقابلہ، قید کی زنجیریں اور پھانسی یہ تینوں دلیلیں لوگوں کو سچائی کا یقین دلا سکتی ہیں۔ اگر تم ان مصیبتوں کو خوشی سے برداشت کرنے سے انکار کرو گے تو گویا تم دوسرے اشخاص کو اپنے مذہب میں لانے کے تمام ذرائع کو اپنے ہاتھ سے کھو دو گے" (ٹالسٹائی)

مرزا ارضا نے اپنے عقائد و خیالات کی خاطر نہایت خندہ پیشانی سے مصائب برداشت کیے تم نے ان کے بیان میں پڑھا ہوگا کہ ان کی جائداد و املاک سے ان کو محروم کر دیا گیا لیکن وہ اس پریشان حالی میں بھی اپنے مقاصد کی طرف سے ایک لمحہ کے لیے غافل نہ ہوئے۔ ان کو بدہا قید و بند کی سختیاں برداشت کرنا پڑیں لیکن ان کی پیشانی ہمت پر نہ بل تھا نہ شکن۔ ان کو وحشیانہ جسمانی تکلیفیں پہنچائی گئیں مثلاً ڈنڈے اور کوڑے لگائے گئے لیکن اس حالت میں بھی ان کی زبان حق گوئی سے باز نہ رہی۔ بیوی اور بچے دنیا میں بڑی چیز ہیں اور ان کے لیے انسان ہر قسم کی کفر بے ایمانی پر آمادہ ہو جاتا ہے لیکن مرزا ارضا نے اپنے اعلیٰ ترین مقاصد کے مقابلہ میں ان متاع گرانمایہ کو بھی کوئی وقعت نہ دی۔ اپنی زندگی کے پیہم مصائب کا ایک غم نمایاں نتیجہ انھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ ان کی بیوی نے ان سے طلاق لے لی۔ ایک بچہ اپنے والدین کے آغوش محبت سے جدا ہو کر غیر کے سایۂ رحم و شفقت میں پناہ لینے پر مجبور ہوا اور ایک کمسن اور محبوب بچے نے بیکسی و کس مپرسی کے عالم میں سر راہ جان دی۔ لیکن ان تمام مصائب شدائد کے باوجود مرزا ارضا کے صبر و استقلال میں کوئی فرق نہ آیا۔ بلکہ مصائب کی سختیاں جتنی بڑھتی گئیں، ان کا عزم و استقلال، صبر و ثبات بھی اور زیادہ ترقی کرتا گیا۔ سچ ہے دنیا کی مصیبتیں ایک بلند پایہ انسان کے اخلاقی قوتوں

کرتی ہیں کیونکہ [illegible] عقیدہ یا قوت یقینی ذریعہ ان کے اخلاقی معیار کو بلند سے بلند تر کرتی ہے۔

۲۲۔ مقاصد کے ساتھ عشق و شیفتگی

لیکن اگر یہ سوال کیا جائے کہ یہ غیر معمولی صبر و ثبات، یہ ناممکن فنا ضبط و استقلال کہاں سے پیدا ہو جاتا ہے؟ تو جواب یہ ہو گا کہ مقاصد کے ساتھ عشق و شیفتگی سے۔ جب تک یہ کیفیت پیدا نہ ہو گی ناممکن ہے کہ انسان جانکاہ مصیبتوں کے لیے تو کیا کسی معمولی سے معمولی مصیبت کو بھی برداشت کرنے کے لیے آمادہ ہو۔ دنیا میں جن عظیم الشان لوگوں نے بڑی بڑی مصیبتوں کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا، وہ سراپا عشق و شیفتگی کا پیکر مجسم تھے۔ مرزا رضا نے بھی آزادی کی راہ میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اور جس جانبازانہ طریقے سے انجام دیے ہیں، ان میں بھی اپنے مقاصد کے ساتھ اسی جذبۂ عشق و شیفتگی کو دخل تھا۔ وہ قطعاً ان لوگوں میں سے نہ ہیں جن کو خوف و ہراس نے دلیر اور بہادر بنا دیا ہو۔ مصائب و شدائد کے مقابلہ میں ان کی دلیری اور بہادری اپنے عظیم الشان مقاصد کے ساتھ عشق و شیفتگی کا نتیجہ تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر وہ چاہتے تو ایران سے باہر قسطنطنیہ میں اطمینان و عزت کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ ان کے بیان کے گزشتہ صفحات میں تم یہ پڑھ چکے ہو کہ جب وہ قسطنطنیہ گئے تو نہایت عزت و احترام کے ساتھ سید جمال الدین افغانی کے یہاں رہتے تھے لیکن وہ اس اطمینان و احترام کے طالب نہ تھے۔ وہ اپنے عظیم الشان مقاصد کے آگے ان چیزوں کی کوئی قیمت نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب ان سے یہ سوال کیا گیا کہ آپ اگر قسطنطنیہ میں اس عزت و احترام کی زندگی بسر کرتے تھے تو پھر ایران کیوں چلے آئے کہ یہاں اگر زید، عمر، بکر سے امن و امان کے لیے درخواستیں کرنا پڑیں تو انھوں نے صاف طور پر کہا کہ

"ہاں میں یہاں آیا اور امن و امان کا طالب رہا۔ لیکن میرے آنے کا اصلی مقصد یہ تھا کہ اپنے مقصد (قتل نائب السلطنت یا قتل شاہ) کو عمل میں لاؤں"

کیا ان الفاظ سے کہ پردے میں مقصد کے ساتھ عشق و شیفتگی کا وہ حسن جلوہ گر نہیں ہو جس نے ان کو دنیا اور دنیا کی لذتوں اور نعمتوں سے بے نیاز کر دیا تھا۔

ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ناصر الدین شاہ کا قتل ہے جس کے ذریعے انھوں نے تمام ایران کو نہ صرف نہایت خوفناک و وحشیانہ مظالم سے نجات دلائی بلکہ ایک مسلک کو تباہی و بربادی سے بچا لیا۔ اگر قتل فی نفسہ کوئی قابل تعریف اور پسندیدہ عمل نہیں لیکن کیا ایک سفاک خونریز اور قاتل انسان کا قتل بھی جرم ہے۔ اور اگر ایسا تسلیم کر لیا جائے تو پھر اسلامی شریعت بھی قتل قصاص کے جواز کی بنا پر مورد الزام قرار پائیں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر عمل میں عامل کی نیت کو دیکھنا چاہیے۔ مرزا احمد رضا نے اپنی نیت کو ایک سوال کے جواب میں ان الفاظ میں ظاہر کر دیا ہے۔

”مغرب (یورپ) کی تاریخ پر نظر ڈالو جب تک کسی بڑے مقصد کے لیے قتل اور خونریزی عمل میں آئی وہ مقصد پورا نہ ہوا؟“

مرزا رضا نے بھی ایک بڑے مقصد (آزادی ایران) کی خاطر اور اس مقصد کے ساتھ عشق و شیفتگی کے جذبے میں آکر ناصر الدین شاہ کو قتل کیا۔ پھر کون کہہ سکتا ہے کہ ایک ظالم و سفاک انسان کو قتل کر کے ایک قوم اور ملک کو زندہ کر دینا کوئی جرم ہے۔

(۲) قناعت و استغنا۔

دنیا میں اس قسم کے جتنے جانباز و سرفروش گزرے ہیں ان سب کے آئینۂ اخلاق کا مشترک جوہر قناعت و استغنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک انسان میں قناعت و استغنا نہ ہو وہ کبھی جانبازانہ خدمت کے لیے اپنے کو پیش نہیں کر سکتا۔ وہ شخص جس نے مال و زر کو اپنا مطمح نظر بنا لیا ہو، صرف زر و مال ہی کا پرستار ہو کر رہے گا۔ تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ ایک نادار و حریص انسان ایک دولتمند انسان کے آگے انتہائی عاجزی و فروتنی کے ساتھ کیوں دست بستہ کھڑا ہوتا ہے۔ سبب یہ ہے کہ اس نے اپنی زندگی کا اصلی و حقیقی مقصد حصول زر قرار دے لیا ہے اور یہ اس کو صاف

دریوزہ گری کے مقابلہ میں انسان اس کے اس تصور زندگی کا مالک ہے اس لیے وہ اس امید پر کہ شاید اس کا مقصد حاصل ہو سکے کامیاب ہو اس کے گھر والوں کی ذلت و بے عزتی کو اپنی انتہائی عزت دے کر برداشت کر لیتا ہے۔ بخلاف اس کے جس شخص نے سونے اور چاندی کے انبار اور تو دہ خاک کو برابر سمجھ لیا ہو وہ ایک گدا کو جس طرح بے نیازانہ نگاہ سے دیکھے گا اس سے کہیں زیادہ بے پروائی کے ساتھ ایک شاہنشاہ دوراں پر بھی اس کی نظر پڑے گی۔ وہ دنیا کے بڑے سے بڑے دولت مند انسان کی عزت احترام کے لیے اپنے اندر کوئی جذبہ نہ پائے گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایسے شخص کی زندگی دولت و امارت کے ساز و سامان سے خالی ہو گی۔ اور وہ تنگ خیال مفلس کہا جائے گا لیکن کیا افلاس کوئی عیب ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ افلاس فی نفسہ کوئی عیب نہیں یہ صرف اس وقت مذموم ہے جب کاہلی، بے اعتدالی تن آسانی یا بیکاری اس کا سبب ہو۔ مگر اس دلیر، جفاکش، جانباز اور پرستار حق و صداقت انسان کے لیے جو ان اوصاف کے ساتھ ساتھ قانع اور بے نیاز بھی ہو افلاس درحقیقت بلند حوصلگی اور عالی ظرفی کی دلیل ہے۔

مرزا احمد رضا بھی دنیا کے ایسے ہی بلند حوصلہ اور عالی ظرف لوگوں میں تھے۔ ان کی زندگی ان کی تنگحالی و پریشان حالی کی ایک زبردست شہادت ہے۔ انہوں نے انتہائی عسرت و افلاس میں زندگی بسر کی لیکن اپنی قبائے قناعت کو حرص و طمع کے گرد و غبار سے آلودہ ہونے نہ دیا بلکہ اس سے کچھ اور زیادہ یہ کہ غیر تو غیر اپنے دوستوں کا رہین منت ہونا بھی گوارا نہ کیا۔ ان کے بیان میں تم نے پڑھا ہو گا کہ بہت سے ایرانی ان کے ساتھ خدمت ملک و ملت کے لیے ہم قول و ہم عہد ہوئے تھے لیکن جونہی مرزا رضا گرفتار کر لیے گئے، سبھوں نے اپنی اپنی راہ لی اور خوف سے چھپے چھپے رہنے لگے۔ مرزا رضا نے باوجود مصائب و شدائد ان میں سے کسی ایک کا نام ظاہر ہونے نہ دیا۔ اس اخفائے راز کی وجہ سے یہ حالت پیدا ہو گئی تھی کہ مرزا صاحب آزادی کے بعد اگر ان کے پاس جاتے تو وہ یقیناً شکریہ کے طور پر ان کی بڑی مدد کرتے اور اس طرح مرزا رضا کے پاس مال و دولت کا خاصہ سرمایہ جمع ہو جاتا۔ لیکن اس نازک اور سخت نازک موقع پر مرزا رضا کی

قناعت پسندی، بلند نگاہی نے ان کو جس فیصلہ پر آمادہ کیا، اس کے الفاظ یہ ہیں

دیدم بلندان پستند گرسنگی خوردم و ذلت نکشیدم دست پیش ایشان دراز نکردم	میں نے دیکھا یہ لوگ نابود ہیں۔ میں بے [illegible] میں بھوکا رہا۔ لیکن کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا۔

(۴) اخفائے راز

روحِ انقلاب کا ایک ممتاز خاصہ اخفائے راز بھی ہے۔ یعنی یہ روح رکھنے والے اشخاص انتہا درجہ اپنے راز کو مخفی رکھتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو استبداد کی ذکی الحس اور خوفناک قوت کے مقابلہ میں وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یہ بہت واضح اور ظاہر امر ہے اس لیے اس پر کچھ زیادہ لکھنا محض تضیع اوقات۔ تمام دنیا کی انقلاب پسند جماعتوں کا ابتدائی اور اساسی اصول اخفائے راز رہا ہے۔ ہر قوم اور ہر ملک کی انقلاب پرست جماعتوں میں یکساں طور پر اس کو بنیاد کار قرار دیا گیا ہے۔ مرزا احمد رضا نے بھی انتہا درجہ رازداری کا ثبوت دیا۔ مذکورہ بالا واقعہ کے علاوہ تم کو وہ واقعہ یاد ہوگا کہ جب وکیل الدولہ کے گھر پر ان سے اصرار کیا گیا کہ اپنے ہمخیالوں اور ساتھیوں کے نام بتائیں تو اس نازک اور تنگ حالت سے نکلنے کے لیے مرزا رضا نے اپنا پیٹ چاک کیا اور ہر طرح کی مصیبت برداشت کی لیکن اپنے ساتھیوں میں سے ایک کا بھی نام نہ بتایا۔ مرزا رضا کے اس زبردست کیرکٹر کی شہادت ناظم الاسلام کرمانی مصنف تاریخ "بیداری ایرانیاں" ذیل کے لفظوں میں دی ہے:۔

در فتوت و مردانگی مسلم و متفق علیہ است چہ در حبس اینچہ کردند یکنفر از آشنایاں و دوستاں خود را گیر ندد و نام نیک خود را در صفحہ روزگار باقی گزارد	ان کی جوانمردی و مردانگی مسلم تھی۔ ان کے استقلال و پامردی پر ہر شخص کو اتفاق تھا، کیونکہ قید خانہ میں ان پر کیسی کچھ سختیاں نہ کی گئیں لیکن اُنھوں نے اپنے دوستوں میں سے کسی کا نام ظاہر نہ کیا اور اس طرح دنیا میں اپنی نیکنامی چھوڑ گئے

(۵) فخر و ناز

کمال کی داد چاہنا انسان کا فطری جذبہ ہے اور اپنے کمال پر فخر و ناز کرنا اس جذبہ کی تسکین کی

"میں آیا، میں نے دیکھا، اور میں فتحیاب ہوا"

کیا ان الفاظ کے پردہ میں کمال پر فخر و ناز کی روح نہیں پائی جاتی؟ واقعہ یہ ہے کہ دنیا کے ہر صاحب کمال نے اپنے کمال کی داد چاہی ہے اور یہ کوئی معیوب امر نہیں۔ یہ صرف اسی حالت میں معیوب ہے جبکہ بیجا طور پر فخر و ناز کا اظہار کیا جائے۔ جس قول کی تائید عمل سے ہوتی ہو وہ یقیناً بیجا فخر و ادعا کے اثر سے باہر ہوگا اور ایک عمدہ کارنامہ کا اظہار خواہ کسی قدر بلند و شاندار الفاظ میں کیا جائے ہرگز معیوب نہیں کہا جا سکتا۔

مرزا رضا نے بھی جا بجا اپنی حیثیت، اپنی شخصیت، اور اپنے قابل فخر کارنامہ پر اظہار فخر کیا ہے۔ مثلاً

"اس جگہ بحمد اللہ یہ بڑا کام (قتل شاہ)، قضا و قدر کے حکم سے میرے ہاتھوں عمل میں آیا"

"بڑے تعجب کی بات ہے، میں ایک ضعیف العقل انسان کے ساتھ ایسی صحبت رکھوں جس میں وہ گفتگو سے صحبت کی مناسبت سے کوئی شعر پڑھے"

"یقین کرو میں حاجی احمد کو ایک سفیہ انسان سمجھتا ہوں۔ میری جیسی حیثیت کا شخص جو اس قسم کے بڑے کام کرنا چاہتا ہو، وہ ہرگز ایسے لوگوں سے اپنی قصد و نیت کو ظاہر نہیں کر سکتا"

"اس کے بعد ہی بادشاہ آئے اور پھر پیش آیا جو کچھ پیش آیا۔ میں نے ایران اور اہل ایران کی یہ بہت بڑی خدمت انجام دی ہے"

بے شبہ ان الفاظ کے پیکر میں فخر و ناز کی روح موجود ہے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ مرزا احمد رضا مرحوم کے لیے بھی یہ فخر بیجا ہے۔

مرزائے مرحوم کی یہی وہ اخلاقی خوبیاں تھیں جنھوں نے ان کی انقلابی روح کو پختہ و مستحکم تر کر دیا

تھا۔ چنانچہ انھوں نے استبداد کے انتہائی ظلم موت تک کو نہایت خوشی خوشی برداشت کر لیا۔
انسان کے تمام محامد و محاسن میں اگر سب سے اول درجہ دیا جا سکتا ہے تو اخلاقی محاسن ہی کو دیا جا سکتا ہے
یہ وہ فضیلت ہے جس کو تمام انسانی فضائل پر تفوق حاصل ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انسان کے اخلاقی محاسن
دوسری بہت سی فضیلتوں کا سرچشمہ ہیں۔ اخلاقی محاسن اپنے اندر کچھ ایسی حقانیت و صداقت رکھتے
ہیں کہ دشمن دوست سب کو ان کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ دیکھو مرزا رضا نے ناصر الدین شاہ کو قتل کیا
باپ کے قاتل پر کس بیٹے کو رحم آسکتا ہے؟ مظفر الدین، شاہ مقتول کا لڑکا ہے، حکمران وقت ہے،
وہ ایک مرزا نہیں بلکہ ایسے ایسے سیکڑوں اشخاص کو آن کی آن میں قتل کرا سکتا ہے لیکن با ایں ہمہ وہ
مرزا رضا کے قتل کو ٹال جانا اور ان کو چھوڑ دینا چاہتا ہے۔ اس کے ارکان حکومت اصرار کرتے
ہیں، قتل قصاص پر اس کو ابھارتے ہیں مگر اخلاقی فضائل کا کس قدر قوی اثر ہے کہ وہ اب بھی اس کے
لیے آمادہ نہیں نظر آتا اور اپنے مشیروں کو اس اعتراف آمیز جملہ میں جواب دیتا ہے کہ

این شخص قابل کشتن نیست — یہ شخص قتل کیے جانے کے قابل نہیں ہے

بہر حال بالآخر مرزا رضا کو موت آنا تھی، آئی اور دنیا میں آج تک وقت آجانے پر کس نے اس کے
پنجہ سے رہائی پائی ہے۔ وجود بجائے خود عدم کا پیغام ہے لیکن بعض موتیں ایسی موتیں ہوتی ہیں جن پر
ہزاروں زندگیاں قربان کر دی جاتی ہیں۔ ہم بغیر کسی شک و تذبذب کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ
مرحوم مرزا رضا کی موت بھی اسی قسم کی موت تھی۔

ابوالحسنات ندوی

جہانگیر و نورجہاں

ایک تاریخی غلطی کا ازالہ

مسٹر بنی پرشاد اسسٹنٹ پروفیسر تاریخ ہند الہ آباد یونیورسٹی کی ایک محققانہ تصنیف "تاریخ جہانگیری" کے نام سے انگریزی زبان میں حال میں شائع ہوئی ہے۔ فاضل مصنف نے "نورجہاں" کے عنوان سے ایک باب میں جہانگیر اور نورجہاں کے متعلق بعض مشہور واقعات کی تغلیط کی ہے۔ "زیب النساء" اور "مضامین عالمگیر" کے قارئین کے لیے ہمارے خیال میں یہ بحث دلچسپی سے خالی نہ ہوگی، لہذا مصنف کے ذرائع معلومات سے کام لے کر یہ بحث روایت و درایت دونوں حیثیتوں سے ناظرین جامعہ کی ضیافت طبع کے لیے پیش کی جاتی ہے۔

تاریخ کے بعض واقعات کچھ اس طرح مسلم اور صحیح سمجھے جاتے ہیں کہ ان کے متعلق نہ صرف معمولی تعلیمیافتہ اور متعلمین مدرسہ یقین رکھتے ہیں بلکہ اہل علم اور اساتذۂ فن بھی کسی قسم کے شک و شبہ کے روادار نہیں۔ اسی قسم کے واقعات میں جہانگیر و نورجہاں کے درمیان زمانۂ ولیعہدی عاشقانہ تعلقات، اکبر کا نورجہاں کی شادی جہانگیر کے بجائے شیر افگن کے ساتھ کرا دینا اور پھر موخر الذکر کا جہانگیر کے ایماء سے قتل کیا جانا ایسے واقعات ہیں، جو آج بچہ بچہ کی زبان پر ہیں اور جنھیں الفنسٹن اور اس قبیل کے دوسرے انگریزی مورخین نے اپنی تصانیف کا مایہ افتخار سرمایہ بنا لیا ہے۔ اس واقعہ پر تفصیل سے بحث کرنے اور نقلی و عقلی دلائل سے غلط ثابت کرنے کے لیے ضرورت ہے کہ پہلے وہ سادہ واقعات جو عام طور پر مشہور ہیں ایک بار نظر کے سامنے آجائیں۔

واقعات جو عام طور پر مشہور ہیں

مرزا غیاث بیگ[1] مغربی تاتار کا ایک غریب تعلیمیافتہ، شریف النفس شخص تھا۔ ایک خاتون سے محبت ہوگئی اور بالآخر اس سے شادی کر لی۔ تنگدستی اور افلاس سے عاجز آکر اس نے ہندوستان کا رخ کیا، ایک گھوڑے پر اپنی بیوی کو بٹھایا اور

---

[1] یہ پورا قصہ ڈاؤ کی "تاریخ ہند" اور دوسری انگریزی تصانیف نیز فارسی تاریخوں میں ملتا ہے۔

خود پاپیادہ ہمراہ ہولیا۔ تھوڑا بہت جو کچھ بھی سرمایہ تھا راستہ ہی میں ختم ہو گیا۔ مجبوراً فقروفاقہ پر گزرنے لگی۔ تین دن کی فاقہ کشی کے بعد اس کی بیوی کے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ تھوڑی دیر وہ اس انتظار میں رہے کہ شاید کوئی مسافر ادھر آجائے اور ان کی کچھ دستگیری کرنے لیکن آخر کار شب کے خوف سے وہ اس صحرائے لق و دق کو چھوڑ کر آگے بڑھے۔ 'اقتضائے بشریت' اور اقتضائے ضرورت میں کچھ دیر بحث و تکرار رہی لیکن انجام کار اُنھوں نے اس نوزائیدہ بچے کو پتوں سے چھپا کر ایک درخت کے نیچے ڈال دیا۔ ابھی تھوڑی دور بھی نہ گئے تھے کہ ماں کی مامتا نے بچہ کو یاد کیا، گھوڑے سے اُتر آئی اور بے اختیار پکاری "بچہ! بچہ!" باپ بچہ کو لینے کے لیے اُلٹے پاؤں پھرا اور کیا دیکھتا ہے کہ بچے کے گرد ایک کالا سانپ حلقہ باندھے بیٹھا ہے۔ اس نے بچہ کو موت کے منہ سے نکالا اور لاکر ماں کی گود میں رکھ دیا۔ غرض بہ ہزار دقت وہ لاہور پہونچے۔ خوش قسمتی سے کسی ایک دوست کی معرفت دربار شاہی تک اُس کی رسائی ہوگئی اور جلدی کسی اونچے منصب پر جگہ مل گئی۔

لڑکی کا نام اُنھوں نے مہرالنسا رکھا جو اپنے سن شعور کو پہنچکر حسن و جمال، موسیقی و مصوری، شعر و سخن میں تمام خواتین مشرق پر فوقیت لے گئی۔ مہرالنسا نے شہزادہ سلیم کے کشور دل پر بھی قابو پانا چاہا اور بالآخر ایک دعوت کی تقریب میں سلیم اس کے دام محبت میں آہی گیا لیکن اس کی شادی ایک ایرانی امیر شیر افگن کے ساتھ کردی گئی۔ جہانگیر جب تخت حکومت پر جلوہ افگن ہوا تو اس نے مہرالنسا کو شیر افگن کے پنجہ سے چھڑانے کی تدبیریں کیں۔ بالآخر ایک ملاقات کے بہانہ سے بنگال کے گورنر قطب الدین نے اس کو مار ڈالا اور مہرالنسا امرائے شاہی کے ہاتھ آئی۔ اس نے ان سے کہا کہ جب میرے شوہر کو اپنی شکست کا پورا یقین ہوگیا تو اس نے یہ وصیت کی تھی کہ میں بلا تامل بادشاہ کی خواہشات پر راضی ہوجاؤں۔ لیکن بادشاہ نے اپنے رضاعی بھائی قطب الدین کے غم میں اس کو دیکھنا تک گوارا نہ کیا لیکن کچھ عرصہ مہرالنسا کا جادو چل ہی گیا اور جہانگیر اس کے بس میں ہو گیا۔

واقعہ بہ روایت دیگر | تغیر الفاظ اور اختلاف جزئیات کا لحاظ کیا جائے تو یہ واقعہ متعدد طریقوں سے

نقل کیا جاسکتا ہے لیکن تمام روایتوں میں صرف ایک روایت ایسی ہے جو نوعیت کے اعتبار سے مذکورہ بالا بیان سے بہت کچھ مختلف ہے اور جو انگریزی مدارس کی درسی کتابوں کے ذریعہ عام طور پر مشہور ہے۔ مذکورالصدر روایت میں عشق و محبت کا اظہار نورجہاں کی جانب سے ہے لیکن اس روایت میں اُنس و شیفتگی کا اظہار تمام تر جہانگیر کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس بنا پر زمانۂ ولیعہدی میں جہانگیر کا نورجہاں پر عاشق ہونا، اکبر کا نورجہاں کی شادی جہانگیر کے بجائے شیر افگن سے کرا دینا، عہد حکومت میں جہانگیر کے ایما پر شیر افگن کا قتل کیا جانا اور پھر نورجہاں کا اپنے عزیز شوہر کے سوگ میں کئی سال گزار دینا اور بالآخر جہانگیر کے اصرار سے شادی کرنے پر مجبور ہونا یہ تمام واقعات اس سلسلۂ روایت کی مختلف کڑیاں ہیں۔ بہرحال اس سے غرض نہیں کہ اقدام عشق کس کی جانب سے ہوا اور آیا نورجہان جہانگیر سے روٹھی یا یہ اس سے ناراض رہا۔ کیونکہ ان دونوں میں سے ایک کی مدافعت کرکے دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرانا ہمیں منظور نہیں بلکہ سرے سے واقعہ کی اس نام کن صورت کو مٹانا مقصود ہے اور ان جزئی واقعات کی تغلیط کرنی ہے جنھوں نے ایک سادہ واقعہ کو بدل کر اسے حسن و محبت کا افسانۂ رنگیں اور جور و ستم کی داستانِ خونیں بنا دیا ہے۔ اور جو کچھ بیان کیا گیا وہ عام روایت کی رو سے ہے جو بہ اختلاف جزئیات ہر خاص و عام کی زبان پر ہے اور جو تمام انگریزی تصانیف اور بعض بعد کی فارسی تاریخوں میں مذکور ہے۔ اسی کے متوازی ہم مصنف کی تحقیق کی رو سے اصل واقعہ کو بیان کر دینا مناسب سمجھتے ہیں اور پھر جہاں ہر دو روایات میں فرق یا تناقص نظر آئے گا، اس پر آگے چل کر بحث کریں گے۔

اصل واقعہ مصنف کی تحقیق کی رو سے — نورجہاں کے جد امجد خواجہ محمد شریف تاتار سلطان بگلر بیگی خراسانی کے وزیر تھے سلطان کی وفات کے بعد وہ قزاق خاں (جانشین سلطان بگلر بیگی) کے عہد میں بھی اپنے عہدہ پر معمور رہے۔ اس کے انتقال کے بعد شاہ طہماسپ کے زمانہ میں وہ اس جگہ سے منتقل کر دیا گیا۔ ۹۸۴ھ میں اس کا خود انتقال ہو گیا اس کے بعد اس کا ستارۂ اقبال بھی ڈھلنے لگا۔ اس کے بیٹے مرزا غیاث الدین محمد کو جو عام طور پر غیاث بیگ کے نام سے مشہور

ہ: ایران کی زمین تنگ معلوم ہوئی اور اُنھوں نے ہندوستان کا قصد کیا۔ اپنے دو بیٹوں محمد شریف اور ابوالحسن، اپنی لڑکی اور بیوی کو جو اس وقت حاملہ تھی، ہمراہ لیکر ایک بڑے تاجر ملک مسعود کے کارروان کے ساتھ روانہ ہوا۔ ایران سے ہندوستان تک کا راستہ ایسا پُرخطر اور غیر محفوظ تھا کہ بڑی سے بڑی جماعت کی بھی رفاقت سفر حفاظت جان و مال کی ضامن نہیں ہو سکتی تھی ابھی نصف راستہ بھی طے نہیں ہوا تھا کہ غیاث بیگ کا سارا مال و اسباب بجز دو خچروں کے لٹ گیا۔ قندھار پہنچکر اس کی بیوی کے لڑکی پیدا ہوئی مفلسی میں آٹا گیلا۔ غریب زچہ و بچہ کی اس حالت میں پرداخت و پرورش بھلا کیونکر ممکن تھی۔ ملک مسعود کو ان کی اس حالت پر رحم آیا اور اس نے ان کی تمام ضروریات کی کفالت کر لی۔ اس بنا پر دونوں میں دوستانہ تعلقات پیدا ہو گئے۔ ہندوستان پہنچکر ملک مسعود نے غیاث بیگ کو شہنشاہ اکبر کے دربار میں روشناس کرایا اور وہ فوراً خدمات شاہی کے سلسلہ میں لے لیا گیا۔

غیاث بیگ مرزا غیاث بیگ جس کی زندگی میں ولادت بچہ نے ایک نیا دَور پیدا کیا، ایک تعلیمیافتہ شخص تھا۔ ذہانت کے ساتھ ساتھ محنت و جفاکشی کی بھی عادت تھی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں کافی اثر اور عزت پیدا کر لی۔ ۱۵۹۵ء تک وہ سہ صدی کے منصب پر پہنچ گیا اور اخیر میں دیوان کابل کے عہدہ پر معمور کر دیا گیا۔

مہرالنسا اسی دوران میں وہ چھوٹی لڑکی بھی جس کا نام مہرالنسا رکھا گیا سن بلوغ کو پہنچی اور ایک ایرانی نوجوان مسمّٰی بہ علی قلی استاجلو کے ساتھ بیاہ دی گئی۔

شیر افگن علی قلی، ایران کے بادشاہ اسمٰعیل ثانی (۱۵۷۶ء سے ۱۵۷۸ء) کا سفرچین تھا۔ سلطان کی وفات یا قتل کے بعد اسے اپنا ملک چھوڑنا پڑا۔ ایک مدت کی بادیہ پیمائی کے بعد وہ قندھار کے راستہ ملتان پہنچا اور وہاں عبدالرحیم خانخاناں کی فوج میں شامل ہو گیا جو اس وقت ٹھٹھہ فتح کر رہی تھی۔ اس مہم میں علی قلی نے اپنی دلیری اور پامردی کی بدولت کافی شہرت حاصل کر لی۔ خانخاناں کی نظر جب اس پر پڑی تو اس نے اپنی مراسلت میں شہنشاہ سے تذکرہ کیا

اور اس کے لیے ایک عہدہ حاصل کر لیا۔ اس مہم کے ختم ہونے پر ۱۵۹۲ء میں خانخاناں اسے اپنے ہمراہ لاہور (جو اس وقت سلطنت مغلیہ کا پایہ تخت تھا) لے گیا اور اسے حلقۂ خواص میں متعارف کیا۔ کچھ عرصہ بعد غیاث بیگ کی لڑکی سے اس کی شادی ہوگئی۔ ۱۵۹۹ء میں وہ شہزادہ سلیم کے [illegible] میں داخل کر لیا گیا جو اس وقت میواڑ کی مہم پر بھیجا گیا تھا۔ علی قلی نے ایک بار ایک شیر مارا اور اسی ہمت و دلیری نے شہزادہ کی زبان سے اسے "شیر افگن" کا لقب دلایا۔ نیز اس کارنامہ پر شہزادہ اس سے بیحد خوش ہوا۔ بغاوت میں اس نے جہانگیر کا ساتھ دیا لیکن پھر چھوڑ کر اکبر کے پاس چلا گیا اور تخت نشینی کے بعد جہانگیر نے اس کی بے وفائی سے چشم پوشی کی اور بردوان (بنگال) میں جاگیر دیکر ایک بڑے عہدہ پر مقرر کر دیا۔

شیر افگن کا قتل

بنگال اس زمانہ میں بدامنی اور شورش، بغاوت اور سازش کا منبع تھا اور تمام ناراض شدہ افغانیوں کا مرکز۔ جہانگیر کو شیر افگن کے متعلق بغاوت کا شبہ ہوا۔ قطب الدین خاں کو جو مان سنگھ کی بجائے ۱۶۰۶ء میں بنگال کا گورنر مقرر ہوا تھا، یہ حکم ملا کہ شیر افگن دربار میں حاضر کیا جائے اور بہ صورت عدم حاضری قطب الدین کو سزا دینے کا اختیار بھی دیا گیا۔ مارچ ۱۶۰۷ء میں قطب الدین، بردوان کو روانہ ہوا اور کہلا بھیجا کہ شیر افگن اس سے آکر ملے۔ شیر افگن مع دو آدمیوں کے گورنر کی ملاقات کو آیا۔ خیمہ میں داخل ہوتے ہی لشکر شاہی کو حکم ہوا کہ اسے ہر چہار طرف سے گھیر لیں۔ یہ دیکھ کر وہ بہت غصہ ہوا اور قطب الدین سے پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے؟ قطب الدین یہ بتانے کے لیے آگے بڑھا، شیر افگن غصہ میں تو تھا ہی، تلوار نیام سے کھینچی اور گورنر پر ایک وار کیا۔ پھر اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ انبہ خاں کشمیری نے ایک ہاتھ مارا گو خود بھی زخم کاری کھایا۔ بیچارے شیر افگن پر تمام سپاہی ہر طرف سے ٹوٹ پڑے اور ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ انبہ خاں تو اسی دم ختم ہو گیا لیکن قطب الدین کوئی بارہ گھنٹہ تک زندہ رہ کر دم توڑا۔
اس واقعہ نے جہانگیر پر اس قدر گہرا اثر ڈالا کہ وہ اس کو بیان نہیں کر سکتا تھا۔

جہانگیر و نور جہاں کی شادی

شیر افگن کے قتل کے بعد اس کی بیوی مہرالنسا اور لڑکی جس کا نام

لاڈلی بیگم تھا، دونوں دربار شاہی میں چلی آئیں۔ یہاں آ کر مہرالنسا سلطان سلیمہ بیگم کی خدمت میں مقرر ہوئی۔ مارچ ۱۶۱۱ء میں اتفاقیہ جہانگیر کی نظر اس پر پڑ گئی اور اخیر مئی تک دونوں میں شادی ہو گئی، یہ ہے حقیقت اس مشہور و معروف شادی کی۔

فن تاریخ اور محکمۂ قضا | یہ صحیح ہے کہ فن تاریخ اور محکمۂ قضا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ مورخ کا واقعہ نگار قلم اور جج کا فیصلہ کن بیان دونوں ایک نہیں ہو سکتے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ تاریخ میں اکثر ایسے بحث طلب متنازعہ فیہ مسائل آتے ہیں جہاں مورخ کو جج کا قلم ہاتھ میں لینا پڑتا ہے، اس بنا پر عام تاریخی روایتیں اور ہمارا تحقیق کردہ بیان دونوں آپ کے سامنے موجود ہیں۔ ان کے پڑھنے کے بعد اختلاف واقعہ اور تناقض روایت کے لحاظ سے حسب ذیل چار تنقیحات قائم کی جا سکتی ہیں:۔

۱۔ آیا جہانگیر کے زمانۂ ولیعہدی میں جہانگیر و نورجہاں کے درمیان عشق و محبت کے تعلقات تھے؟

۲۔ آیا اکبر نے جہانگیر کو شادی کرنے سے باز رکھا اور نورجہاں کی شادی شیرافگن کے ساتھ کرادی؟

۳۔ آیا جہانگیر نے شیرافگن کو قتل کرایا اور اس غرض سے کہ اس کی بیوی ہاتھ آئے؟

۴۔ آیا نورجہاں نے جہانگیر کی شادی کے متعلق متعدد درخواستوں کو ٹھکرایا؟

معاصرانہ تاریخیں | تنقیحات بالا پر عقلی دلائل سے بحث کرنے سے قبل دیکھو کہ معاصرانہ تاریخیں کہاں تک ان واقعات کی تائید کرتی ہیں۔ بلاشبہ سب سے پہلے جس تاریخ کا نام زبان پر آئے گا وہ تزک جہانگیری ہے جو اواخر سولھویں صدی اور سترھویں کے ابتدائی نصف صدی کی مستند ترین تاریخ سمجھی جاتی ہے جہانگیر نے اس میں شیرافگن کے بعض حالات اور اس کے قتل کا تذکرہ کیا ہے لیکن یہ کہیں نہیں لکھا کہ اس نے نورجہاں سے شادی کرنے کی غرض سے اس کو قتل کرایا۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ انسان اخلاق کے اس بلند درجہ تک ابھی تک نہیں پہنچا ہے کہ وہ اپنے معائب کو اسی صحت و صداقت کے ساتھ بیان کرے جس خوبی سے وہ اپنے محاسن کا ذکر کرتا ہے لیکن یہ بھی کیا ضرور تھا کہ جہانگیر ضمناً بھی

[illegible] اپنے دامن اخلاق پر ہلکی بدنامی کا دھبہ لگانے کے لیے سامان خود ہی
[illegible] نے جوک کی تکمیل شاہجہاں کے عہد حکومت میں کی۔ کامگر حسینی کی
[illegible] شاہجہاں کو بہت کچھ دخل تھا۔ شاہجہاں اور نورجہاں کے تعلقات جس قدر کشیدہ
[illegible] سے مخفی نہیں۔ ایسی صورت میں ناممکن تھا کہ ہر دو مورخین اپنے آقا شاہجہاں کی خوشنودی
اور [illegible] کے خیال سے اس قسم کا کوئی واقعہ جو نورجہاں اور جہانگیر کے اخلاق پر برا اثر ڈال سکے
[illegible] باز رہتے۔ لیکن صراحتاً یا کنایتاً اس قتل اور متعلقہ واقعات کا کوئی ذکر نہیں۔ عبدالحمید لاہوری
اور [illegible] کے دوسرے مورخین نورجہاں کا تذکرہ کرتے ہیں لیکن اس کو کوئی نہیں لکھتا کہ نورجہاں نے
اپنے سابق شوہر کے "قاتل" کے ساتھ "مجبور ہو کر" شادی کی۔

یورپین مورخین ممکن ہے ہمارے معترضین حضرات اس کے مقابل میں یہ پیش کریں کہ درباری مورخین نے
جہانگیر کی ذاتی بدنامی سے پورے خاندان مغلیہ پر دھبہ لگنے کے اندیشہ سے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔
ہو تو ان مورخین سے اس دور اندیشی اور پیش بندی کی توقع رکھنی بعید از قیاس ہے، دوسرے اگر انھوں نے
ایسا کیا بھی ہے تب بھی یہ حالات یورپین سیاحین اور تجار کے قلم سے کیونکر چھوٹ سکتے تھے۔ یہ وہ زمانہ
تھا جبکہ مشرق و مغرب میں آمد و رفت کا سلسلہ قائم ہو چکا تھا اور یورپین اشخاص تجارت، سیاحت
سفارت نیز دیگر اغراض سے ہندوستان آتے رہتے تھے اور کبھی کبھی طویل قیام بھی اختیار
کر لیتے تھے۔ ہندوستانیوں کے عادات و اطوار، رسم و رواج، سیاست و معاشرت غرض
ہر چیز ان کی نظر میں عجیب و غریب معلوم ہوتی، جس کا ذکر وہ عموماً اپنے خطوط یا تحریروں میں کرتے
رہتے تھے۔ معمولی سے معمولی واقعہ بھی اگر سن پاتے تو اس کا ذکر بھی کسی طرح کر دیتے تھے۔ شہزادہ سلیم اور
اس کی سوتیلی ماں، نورجہاں اور اس کے سوتیلے بیٹے کے درمیان ناجائز تعلق کی کہیں سے اڑتی پڑتی
سن پائی اور اس کو فوراً لکھ لیا۔ پھر بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ نورجہاں و جہانگیر کے یہ واقعات جس کے لیے
انہیں کافی مواد بھی مل سکتا تھا، ان کے قلم سے بچ نکلتا۔ نورجہاں کے ابتدائی حالات، اس کے شوہر
کا قتل، جہانگیر کے ساتھ شادی اور آخر زمانہ حکومت میں اس کا ہمہ گیر اثر ان میں سے ہر ایک کا

ذکر ان یوروپین مصنفین کے ہاں ملے گا لیکن اس کا کہیں نہیں پتہ چلتا کہ ہر دو کے درمیان ابتداً عشق و محبت کے تعلقات تھے اور اس وجہ سے جہانگیر نے شیر افگن کے خون سے اپنا ہاتھ رنگین کیا۔ ہاکنس جو ترکی زبان سے بخوبی واقف تھا، شیر افگن کے قتل سے کچھ عرصہ بعد شاہی دربار میں پہنچا، منصبداروں کے زمرہ میں داخل ہوا، بہت سی ملاقاتیں پیدا کیں اور جہانگیر سے شادی ہونے کے کچھ عرصہ بعد چلا گیا لیکن اس مفروضہ داستان عشق و محبت اور اس مصنوعی قتل کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ سر طامس رو بسلسلہ سفارت ۱۶۱۶ء میں یہاں آیا بعض تجارتی مراعات حاصل کرنے کے لیے بڑے بڑے امرائے ملا۔ خود جہانگیر کی معیت میں مانڈو اور احمد آباد تک سفر کیا۔ اس عرصہ میں اور اس طرح کے قیام میں جہانگیر اور نور جہاں کے یہ واقعات اس کے کانوں تک پہونچنے سے رہ نہ گئے ہونگے۔ سر طامس رو نے جہانگیر، نور جہاں اور شاہجہاں وغیرہ سب کے حالات سے بحث کی ہے، ناممکن تھا کہ ان واقعات سے چشم پوشی کرتا۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے خوشامد یا خوف کے خیال سے ایسا کیا ہو جبکہ اس کو اپنے مقصد میں بھی جہانگیر کی طرف سے ناکامی ہوئی اور جس کی جرأت اخلاقی اور خودداری کا یہ حال کہ دربار شاہی میں پہنچا ہے تو آداب سلام کے خلاف اس کا سر نیاز زمین سے جا نہیں لگتا بلکہ معمولی طریقہ کے مطابق سلام کرتا ہے۔ ایڈورڈ ٹیری بھی کئی برس دربار مغلیہ میں مقیم رہا اور اس وقت جبکہ نور جہاں کے اثر و اقتدار کا عین شباب تھا لیکن وہ صرف اس قدر لکھتا ہے کہ جہانگیر نے "نور جہاں[۵۱] کو ایک معمولی خاندان سے رتبہ اعلیٰ پر گویا فرش سے عرش پر پہنچا دیا"۔ ۱۶۲۳ء میں پیٹر ڈیلا ویل نے گو اپنا سفر مغربی سواحل تک محدود رکھا لیکن شاہی دربار کے یہ حالات اس سے مخفی نہ رہے ہوں گے وہ اپنے سفرنامہ میں ایک جگہ لکھتا ہے:-

"وہ[۵۲] (نور جہاں) ایک ایرانی کپتان کی بیوی تھی جو مغلیہ خدمات کے سلسلہ میں تھا۔ اپنے شوہر کی

---

[۵۱] "مشرقی ہند کا سفر" صفحہ ۴۰۴، مصنفہ ایڈورڈ ٹیری

[۵۲] "سفرنامہ پیٹرو ڈیلا ویل" حصہ اول صفحہ ۵۳

وہاں کبھی... دربار کے ایک بہتر موقع ہاتھ آگیا جیسا اکثر نوجوان سلطان محمد کو ہو جاتا ہے
... دیکھ لیا اور دونوں میں محبت ہو گئی۔

گو یہ بیان قابل وقعت نہیں کہا جا سکتا لیکن اس کے پیش کرنے سے مقصود صرف یہ تھا کہ جب صاحب سفرنامہ نے اس واقعہ کا ذکر بھی کیا تو مبحوث فیہ مسائل کی تصدیق کے کیا معنی اسکی طرف اشارہ تک نہیں کیا۔ سر طامس ہربرٹ جہانگیر کے اخیر زمانہ حکومت میں آیا۔ اس نے جہانگیر کے عہد حکومت کے بہت سے حالات قلمبند کیے۔ پیٹر منڈی نے اپنے سفرنامہ میں یورپ اور ایشیا کے حالات ۱۶۰۸ء سے ۱۶۶۷ء تک کے لکھے ہیں اور وہ خود بھی ۱۶۲۸ء سے ۱۶۳۴ء تک ہندوستان میں موجود تھا، جہانگیر اور نور جہاں کے حالات دونوں نے تحریر کیے ہیں لیکن ان واقعات کے متعلق ان میں سے کسی کے ہاں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ برنیر ایک عرصہ کے بعد آیا اور واپس جو اپنا سفرنامہ لکھا ہے اس میں جہانگیر کے اخلاق، نور جہاں کے اثر، شاہجہان، جہاں آرا اور روشن آرا کے متعلق بہت سی افواہیں نقل کی ہیں لیکن ان نام نہاد تاریخی واقعات کی طرف کوئی اشارہ نہیں غرض ان یورپین مورخین کے سفرناموں اور تحریروں میں شروع سے آخر تک چراغ لیکر ڈھونڈھو لیکن جہانگیر اور نور جہاں کے درمیان عشقیہ تعلق اور اس کی وجہ سے اول الذکر کے ایما سے نور جہاں کے شوہر شیر افگن کے قتل کا سراغ کہیں نہیں پاؤ گے۔ یہ مغربی مصنفین ہندوستان کی بری بھلی ہر بات پر گوش بر آواز رہا کرتے تھے، ناممکن تھا کہ یہ واقعات ان کے قلم سے بچ جاتے۔

واقعات کی تحقیق فن درایت کی رو سے	جہاں تک روایت کا تعلق تھا خواہ وہ درباری مورخین کی رہی ہو یا غیر ملکی سیاحین و مصنفین کی ہم نے ہر چند چھان بین کی ان واقعات

کا کہیں نہیں پتہ چلتا۔ آیئے لگے ہاتھوں درایت کی کسوٹی پر بھی پرکھیں۔ سب سے پہلے دیکھنا یہ ہے کہ جب جہانگیر و نور جہاں میں شادی کی ٹھہر گئی تھی تو اکبر کو اس سے انکار کر کے شیر افگن کے ساتھ کرا دینے کی کیا وجہ تھی؟ ہمارے گزشتہ بیان سے آپ نے اندازہ کیا ہو گا کہ مرزا غیاث الملقب بہ شیر افگن، کوئی معمولی شخص نہ تھا۔ اس کے آباؤ اجداد کے ہاتھ میں کبھی حکومت

ایران کا قلمدان وزارت رہ چکا تھا۔ گردشِ ایام سے مرزا غیاث کو ہندوستان آیا لیکن اقبال نے یہاں بھی ساتھ نہ چھوڑا اور وہ حرم شاہی کا "افسر مطبخ" (جو بے شبہ حکومت مغلیہ میں ایک معزز اور ممتاز عہدہ سمجھا جاتا تھا) مقرر کیا گیا۔ ایسی صورت میں کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اکبر نے شادی کے معاملہ میں مداخلت کی ہو جبکہ سلاطین مغلیہ میں شادی کے متعلق نسل و قوم کا چنداں لحاظ بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ یہ امر ناممکن سا معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر کی منظورِ نظر اس سے چھوڑ کر شیر افگن سے منسوب کی جاتی اور جہانگیر و شیر افگن کے تعلقات میں کوئی کشیدگی پیدا نہ ہوتی۔ برعکس اس کے دیکھا جاتا ہے کہ ۱۵۹۹ئہ میں اکبر جیسا دوراندیش حکمراں اسی شیر افگن کو میواڑ کی مہم میں جہانگیر کے ہمراہ کرتا ہے۔ اس حالت میں تم بس سے انکار کر دگے، شہنشاہ اکبر کی دوراندیشی سے یا نفسِ واقعہ کی صحت سے؟ نہ صرف یہی بلکہ آگے چل کر دیکھو کہ اس کے ساتھ کیا کچھ سلوک کرتا ہے۔ کنایۃً یا صراحتہً اس مہم میں جہانگیر کے رویہ کی کوئی شکایت نہیں معلوم ہوتی بلکہ خود شیر افگن جہانگیر کی بغاوت میں اس کا ساتھ چھوڑ کر اکبر سے مل جاتا ہے لیکن جب ہی جہانگیر عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لیتا ہے تو انتقام کی بجائے اس کے اعزاز و اکرام میں مزید اضافہ کرتا ہے اور "شیر افگن" کا لقب خود اس کی شہادت دیتا ہے۔ جہانگیر کو شیر افگن کا "قاتل" بتانے والے مورخین نہ جانے اس کا کیا جواب دیں گے؟ تیسرے یہ کہ نور جہاں جیسی عالی نسب اور شریف و پاکباز عورت اگر یہ سمجھتی ہوتی کہ جہانگیر کا ہاتھ اس کے عزیز شوہر کے خون سے لال ہے تو وہ کبھی اس کی رفیقِ حیات بننے پر آمادہ نہ ہوتی۔ اس نے جہانگیر کے ساتھ جس اُنس و محبت، اخلاص و وفاشعاری کی زندگی گزاری، وہ خود اس کی عفت و عصمت کی ایک بین دلیل ہے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ بنگال میں قطب الدین خاں کا تقرر گورنری اس مصلحت خاص سے کیا گیا تھا کہ شیر افگن کو قتل کر کے نور جہاں حاصل کی جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خسرو کی بغاوت ختم ہونے پر جہانگیر نے بعض سابق حکاموں کو جو اس کی پالیسی کے موافق نظر نہ آتے تھے علحدہ کر دیا۔ راجہ مان سنگھ، سابق گورنر بنگال اسی وجہ سے وہاں سے ہٹائے گئے اور ان کی

جگہ پر تعلیلیوں کا تقرر عمل میں آیا۔ رہا شیر افگن کا قتل اس کا سبب معلوم کرنے کے لیے اس زمانہ کی بنگال کی تاریخ کا مطالعہ کرو۔ ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ اس وقت بنگال کی سیاسی فضا شورش بغاوت اور سازشوں سے پُر تھی۔ سترہویں صدی کی ایک شخصی حکومت میں ان جرائم کا انسداد قتل و گردن زدنی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ اور پھر ایک ایرانی جانباز سے جو ایک بار بغاوت کے سلسلہ میں بے وفائی کا ثبوت دے چکا ہے، یہ کچھ بعید نہ تھا کہ ایسی فضا میں وہ کسی دن علم بغاوت بلند کر دے، ایسی حالت میں اگر شیر افگن کے قتل کی یہ وجہ سمجھی جائے تو اس کے تسلیم کرنے میں کیا عذر مانع ہو سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس سلسلہ میں دیگر اشخاص کا خون ہوا یا خود شیر افگن کی سزا کا کوئی اور استعمال کیا جا سکتا تھا بہرحال ان کا ذمہ دار اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ قطب الدین کا طرز عمل ہے۔ خاوند کے انتقال کے بعد نور جہاں کا دربار شاہی میں آنا لازمی امر تھا کیونکہ اس کے باپ اور بھائی اب تک یہاں بڑے بڑے عہدوں پر موجود تھے۔ یہاں مینا بازار[1] میں جہانگیر کی نظر نور جہاں پر پڑی اور پھر بعد میں اس کا حرم شاہی میں داخل کیا جانا یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں۔

<u>یہ واقعات کیونکر اور کیسے مشہور ہوئے</u> روایۃً آپ نے دیکھ لیا کہ معاصرانہ تاریخوں میں ان واقعات کا کہیں نشان نہیں۔ درایت کے دربارے سے بھی یہی حکم ملا کہ واقعات کسی طرح قرین قیاس نہیں ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ مروجہ تاریخوں میں یہ اس قدر جلی حروف میں کیسے نظر آ رہے ہیں؟ جہانگیر سے تقریباً دو نسل گزر جانے تک ان واقعات نے تاریخ میں جگہ نہیں پائی تھی۔ اس کے بعد سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصل واقعہ کے شرارے نے رفتہ رفتہ کوہ آتش فشاں کی صورت اختیار کر لی۔ شیر افگن کے قتل کے بعد نور جہاں کے حرم شاہی میں داخل ہونے نے دو صدی بعد تاریخ کی غبار آلود فضا میں یہ شبہ ضرور پیدا کر دیا ہوگا کہ شیر افگن کے قتل سے جہانگیر کا مقصد حصول زن تھا۔ اس کے لیے یہ امر ثابت کرنا ضروری ہوا

---

[1] ایک قسم کا بازار لگا کرتا تھا جس میں نفیس اور عمدہ اشیاء سے دکانیں مزین ہوتی تھیں۔ شہزادیاں اور امراء کی خواتین کا منتظم ہوتیں اور شہزادے و امراء خریدنے آتے۔ خرید و فروخت میں جو لطف اندوزی ہوتی وہ ان کے عیش پسندی کا ایک طریقہ تھا۔

کہ جہانگیر و نورجہاں میں ابتدا از عشق و محبت کے تعلقات تھے۔ اس کے باوجود بھی نورجہاں، جہانگیر کی بجائے شیر افگن سے منسوب ہوئی، اس کی تاویل اس سے بہتر اور کیا کی جاسکتی تھی کہ شہنشاہ اکبر مانع رہا اور اسی نے شیر افگن سے شادی کرا دی۔ یہ ہیں ان واقعات کی تصنیع کے متعلق فضا فی تحقیق۔ رہی یہ بحث کہ یہ واقعات کن ذرائع سے رائج ہوئے اس کے لیے تاریخی سرمغوسانی یہ پتہ دیتی ہے کہ محمد صادق تبریزی کے بیان پر خافی خاں، بحن رلے اور دیگر مصنفین نے حاشیہ آرائی کرتے ہوئے یہ تمام واقعات نقل کیے ہیں کہ کس طرح شہزادہ سلیم اور مہرالنسا دونوں باہم کھیلا کرتے تھے اور جب سلیم نے اُسے اپنی آغوش میں لیا تو کس طرح مہرالنسا نے اسکی شکایت حرم سرا کی دوسری شہزادیوں سے کی اور کیسے یہ خبر اکبر کے کانوں تک پہنچی اور اس نے غصہ ہو کر شادی کو روک دیا پھر کس طریقے سے جہانگیر نے قطب الدین کی وساطت سے نورجہاں کے حاصل کرنے کی کوشش کی، وغیرہ وغیرہ یہ قصہ طبع انسانی کے لیے جس قدر دلچسپ ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قلم سے نکلتے ہی آتش صحرا کی طرح ہر چہار طرف پھیل گیا۔ سترہویں صدی کی ابتدائی نصف میں اس کا کہیں پتہ نہیں لیکن بعد کی تصنیفوں میں صاف نظر آنے لگا۔ فارسی مورخین اس کا ذکر تفصیل سے کرتے ہیں۔ راجپوت بھاٹوں نے اس کی مزید تائید کر دی۔ اختتام صدی کے قریب اطالوی سیاح منوسی نے اس پر خوب رنگ آمیزی کی۔ اٹھارہویں صدی میں ڈاؤ وغیرہ نے اس کے بقیہ خدوخال کو بھر کر ایک اچھا خاصہ مرقع بنا دیا۔ انیسویں صدی میں الفنسٹن نے خافی خاں سے لیکر بعد کے مورخین کو دیا اور یہی آج عام طور پر زینت دہ تاریخ ہے اور بچہ بچہ کی زبان پر رائج، تصویر کا ایک طرف وہ پہلو سامنے آتا ہے اور دوسری جانب یہ رخ دیکھ کر بے ساختہ زبان سے نکل پڑتا ہے کہ

ع۔ کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا!

سعید انصاری، متعلم جامعہ

معاشی تاریخ ہند

کا

ایک ورق

"یہ مختصر سا مضمون اُس عہد سے تعلق رکھتا ہے جبکہ یورپی سوداگروں کی جماعتیں ہندوستان میں بحیثیت تاجر مقیم تھیں اور انجام کار ایسٹ انڈیا کمپنی (انگلستان کی ایک سوداگر جماعت) ایک مدت کے بعد نہ صرف تاجروں کی حیثیت سے رہی بلکہ جیسا کہ معلوم ہے رفتہ رفتہ منافقانہ و جارحانہ حکمت عملی کے ساتھ ایک حکمراں جماعت بن گئی۔ اس کا عہد عروج جنگ پلاسی (۱۷۵۷ء) سے شروع ہو کر عہد تخت نشینی ملکہ وکٹوریہ (۱۸۳۷ء) تک جبکہ حکومت ہند تاج انگلستان (کراؤن آف انگلینڈ) کو منتقل ہوتی ہے ختم ہو جاتا ہے۔ یہ عرصہ اسی برس کا تاریخ ہند میں بلحاظ تباہی صنعت و تجارت و افلاس عامہ ایک حیرت انگیز و خوفناک عہد ہے جس کی مثال کسی ملک کی تاریخ بھی آسانی سے نہیں پیش کر سکتی۔"

مورخین تاریخ ہند نے جو زیادہ تر انگریز ہی ہیں ہندوستان میں برطانیہ کے سیاسی و فوجی کارناموں و حسن انتظام کی مدح سرائی میں نہایت قابلیت کے ساتھ اعلیٰ معلومات کا ایک کثیر ذخیرہ بہم پہونچایا ہے لیکن تاریخ باشندگان ہند، اُن کی تجارت، صنعت و حرفت، زراعت اور نیز اُنکی اقتصادی حالت کے متعلق تقریباً خاموشی ہی اختیار کی ہے۔

سلطنت برطانیہ کی ترقی مشہور ولیم پٹ (۱۷۰۸-۱۷۷۸ء) کے عہد وزارت میں ہوئی۔ فریڈرک اعظم حلیف انگلستان نے پرشیا (جرمنی) کو زیر کیا اور فرانس کو شکست دی۔ وولف نے ۱۷۵۹ء میں کوبلیک (کناڈا) فتح کیا اور تمام کناڈا فرانسیسیوں سے لے لیا۔ کلایو نے ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی میں فتح حاصل کی اور جنرل آیر کوٹ نے فرانسیسیوں کو ۱۷۶۱ء میں شکست دی۔ اس قلیل عرصہ میں انگلستان یورپ کی ایک طاقتور سلطنت شمار کی جانے

گی۔ اور ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی اب ایک تجارتی حیثیت ہی نہیں رکھتی تھی بلکہ ہندوستان کے سیاسی اُمور میں بھی کسی نہ کسی طرح حصہ لینے لگی۔ بنگال اور مدراس کے نوابوں اور راجاؤں کی لڑائی میں (جو اکثر انہیں کے ہتھکنڈوں کا نتیجہ ہوتی تھیں) ساتھ دیا اور انجام کار ایک دوسرے کو آپس میں لڑا کر اُن کو سخت نقصان پہونچایا اور اپنی حکومت قائم کر لی۔

آجکل قحط و گرانی کا غیر مختتم سلسلہ اور افلاس عامہ اس قدر عام ہوگیا ہے کہ سرے سے یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہندوستان کبھی خوشحال بھی رہا ہے یا نہیں۔ کیا اس کی یہ وجہ ہے کہ یہ ملک غیر فطری ہے یا یہاں کے باشندے کاہل الوجود واقع ہوئے ہیں؟

یہ نہایت فخر کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ انگریزوں نے ہندوستانیوں پر بہت سے احسانات کیے ہیں جو دوسرے ممالک میں دیگر حکومتوں کے ماتحت حاصل نہیں۔

اوّل تو ایک ملک کی بہبودی کے لیے جو چیز سب سے بڑی نعمت ہو سکتی ہے امن و امان ہے۔

دوم۔ نظام حکومت ایسی مضبوط بنیادوں پر قائم کیا ہے کہ غیر ممالک کے حملہ کا اندیشہ قریب قریب بالکل ناممکن ہے اور اندرونی فتنہ و فساد کا بہت ہی کم خطرہ ہے۔

سوم۔ اعلیٰ و بہترین قوانین بنائے اور جابجا عدالتیں قائم کیں۔

چہارم۔ ہندوستان کی قدیمی تہذیب کو مغربی تہذیب و علوم و فنون جدیدہ سے منور کر دیا۔

پنجم۔ ہر شخص کو اُس کا فطری حق یعنی آزادی دی اور اشیائے آسائش اور وسائل آمد و رفت ریل و ڈاکخانہ وغیرہ قائم کیے۔

آجکل ہندوستان کا ہر ایک شخص جاہل سے جاہل بھی جانتا ہے کہ ان تمام احسانات سے وہ کس قدر متمتع ہوا ہے اور دیگر ممالک کے مقابلہ میں وہ کس قدر خوشحالی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ علاوہ ازیں کیا کسی مصنف نے ایمانداری کے ساتھ اس سبب کے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ہندوستان اس قدر مفلس کیوں ہے؟ اور ۱۸۰۰ء سے ۱۹۰۰ء تک پندرہ ملین آبادی جو

انگلستان کی آبادی کا نصف ہی کیوں فنا ہو گئی؟ قحط اس کا سبب بتلایا جاتا ہے۔ کبھی تو یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی آبادی پیداوار کے تناسب سے بہت بڑھ گئی تھی اور کبھی یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ کاشتکاروں کی عدم واقفیت اور لاپرواہی اس کا سبب ہیں اور مہاجنوں کی بڑھتی ہوئی شرح سود وغیرہ اس کا باعث ہے۔ لیکن اگر واقعی جواب حاصل کرنا ہو تو مندرجہ ذیل امور میں تلاش کیجیے۔

(۱) ناقابل برداشت ٹیکس مالگزاری۔ اُس کے حصول کے مختلف طریقہ اور غیر محل خرچ۔

(۲) تجارت، صنعت وحرفت وغیرہ کی تباہی اور برطانیہ کی خودغرضی کی پالیسی۔

(۳) نظامِ حکومت میں عدم اختیارات۔

(۴) انگلستان کے لیے اُصول امتناعی قانون تجارت اور ہندوستان کے لیے آزاد تجارت

(۵) قرضہ ہند

ان میں سے ہر ایک پر ایک طویل مضمون لکھا جا سکتا ہے لیکن اس وقت یہاں ہندوستان کی تجارت صنعت وحرفت ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانۂ اوائل اور مابعد کی حالت پر نظر ڈالنا مقصود ہے کیونکہ کسی ملک کی ترقی وبہبودی کا دارومدار زیادہ تر اسی پر ہوتا ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی اور بنگال — ایسٹ انڈیا کمپنی انگلستان کی ایک تجارتی جماعت تھی جو دیگر یورپین اقوام کی تجارتی جماعتوں کی طرح ہندوستان میں آئی تھی۔ یوں تو ہندوستان کی زرخیزی اور کثیر پیداوار نے ہر ایک کو گرویدہ کر لیا تھا لیکن انگلستان کی جماعت کامیاب ہے۔ فرانسیسی اور ڈچ (ہالینڈ کے باشندے) کمپنیاں نیست ونابود ہو گئیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے صرف سات ہزار پونڈ کے سرمایہ سے تجارت شروع کی تھی اور ایک صدی کے اندر ہی اندر نہ صرف بے انتہا منافع اُٹھایا بلکہ اپنی حکومت کی بنیاد بھی ڈال دی اور یہاں کی فرمانروا بن گئی۔ بنگال اور جنوبی ہند کے نوابوں اور راجاؤں سے شروع میں تو چند مراعات حاصل کیں اور بعدہٗ جارحانہ پالیسی سے کام لینا شروع کر دیا۔

بنگال کے نواب میر قاسم نے انگریزوں کو اندرون تجارت کی آمد و رفت پر محصول معاف کر دیا اور کلکتہ میں ایک فیکٹری قائم کرنے کی اجازت دیدی اور ان کی درخواست پر اُس کی حفاظت کے لیے انگریزوں کی ایک جماعت کے رکھنے کا بھی حکم دے دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی کو آہستہ آہستہ دست درازی کا خوب اچھا موقع ہاتھ آیا۔ جن جن طریقوں سے عوام اور ملازمین نواب کو پریشان، ذلیل و رسوا کیا اُس کی داستان بہت طویل ہے۔ نواب میر قاسم نے اس کو روکا تو انگریزوں نے میر جعفر سے مل کر اُس کو تخت سے معزول کر دیا۔ اس کے صلہ میں میر جعفر نے ۱۲۳۸۵۷۵ پونڈ عطا فرمایا اور کلائیو نے علاوہ اس کے ایک اعلیٰ جاگیر اور ۳۱۵۰۰ پونڈ حاصل کیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد ان سے بھی بگڑ گئی اور میر قاسم دوبارہ تخت نشین ہوئے۔ اس مرتبہ کمپنی نے ۲۰۰۲۶۹ پونڈ حاصل کیا لیکن کمپنی نے دست درازی بدستور جاری رکھی۔ میر قاسم نے تنگ آ کر کمپنی کے ساتھ پھر سختی شروع کی۔ نتیجہ ظاہر تھا میر قاسم معزول کر دیے گئے اور میر جعفر پھر نواب بن گئے۔ اس دفعہ ۵۰۰۱۶۵ پونڈ کمپنی کو ملا اور بعدہٗ ۱۷۶۵ء میں نجم الدولہ تخت پر جلوہ افروز ہوئے اور ۲۳۰۳۵۶ پونڈ اور ملا۔ غرضکہ اس آٹھ سال کے عرصہ میں بنگال کے نوابوں سے ۵۹۴۰۴۹۸ پونڈ وصول کیا اور ہمیشہ کے لیے بنگال دیوالیہ ہو گیا۔ یہ کمپنی بہت مالدار ہو گئی اور ۱۷۶۵ء میں شاہ دہلی سے دیوانی کا فرمان حاصل کر کے بنگال کی مالک بن گئی۔

اب کمپنی کو پورے اختیارات حاصل تھے اور تجارت کو جائز و ناجائز طریق سے بے انتہا فروغ دیا جس کی وجہ سے مقامی کاریگروں کو بے حد نقصان پہونچا اور ان کے وجوہ سے قحط پڑ گیا۔ ۱۷۷۰-۷۱ء میں بنگالہ کی ایک تہائی آبادی موت کے گھاٹ اُتر گئی۔ اموات اس کثرت سے ہوئیں کہ لوگوں میں ہمدردی کا مادہ قریب قریب مفقود ہو گیا تھا۔ اور مابعد ہیسٹنگز نے کڑہ اور الہ آباد بھی حاصل کر لیا اور نواب اودھ کو ۵۰۰۰۰۰ پونڈ کے عوض دے دیا (یہ قبضہ عارضی ہی تھا)۔ روہیلوں کے خلاف نواب اودھ کو ایک فوجی دستہ دیکر ۴۰۰۰۰۰ پونڈ وصول کیا۔ جنوبی ہند میں بھی یہی بازار گرم تھا۔ اور ملکی قبضہ روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ

مقامی تجارت کی تباہی کی کوشش بھی شروع ہو جاتی تھی۔ اور انگریزی مال جو ساخت میں بھدا اور کمزور ہوتا تھا بازاروں میں بکنے لگا۔ لوگ مجبوراً خرید کرتے تھے اور زیادہ گراں ملتا تھا۔

کپڑے کی تجارت

اٹھارھویں صدی عیسوی تک ہندوستان نہ صرف ایک عالی زراعتی ملک تھا بلکہ دنیا کے بہترین تجارتی ملکوں میں شمار ہوتا تھا۔ خاصکر کپڑے کی تجارت کے لیے دنیا میں اس سے بہتر کوئی ملک نہ تھا۔ جیسا کہ آیندہ چل کر معلوم ہوگا یہاں کا اونی۔ سوتی۔ ریشمی زربفت غرضکہ ہر قسم کا کپڑا تمام ایشیا۔ یورپ حتی کہ امریکہ کے بازاروں میں بکثرت جاتا تھا۔

جنگ پلاسی (۱۷۵۷ء) کے بعد جو واقعات و تغیرات وغیرہ ظہور پذیر ہوئے اُس کی تیزی رفتار حیرت انگیز ہی۔ انگلستان کو جو اسی عہد میں مختلف قسم کی ایجادیں کر رہا تھا۔ اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اُن کے لیے خام اشیاء خاصکر روئی وغیرہ حاصل کی جائے۔ ہندوستان اس کے لیے نہایت موزوں نظر آیا۔ اب کیا تھا انگلستان میں سیکڑوں کارخانے کھل گئے۔ ہندوستان میں کپڑے کی تجارت تو بالکل ختم ہوگئی اور روئی بہت زیادہ پیدا کرنے لگا۔ یہاں ایجنٹوں کے ذریعہ روئی بہت سستی خرید کی جاتی تھی اور انگلستان سے سوتی مال تیار ہو کر آنا شروع ہوگیا اور بہت گراں فروخت ہوتا تھا۔

ان وسٹمنٹ

ہندوستان کی اقتصادی حالت یونہی کیا کم خستہ تھی کہ ایک نئی اسکیم کا نفاذ اور ہوگیا جس کو انوسٹمنٹ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہی۔ ۱۸۱۲ء میں دارالعلوم (انگلستان) میں جو رپورٹ پیش ہوئی اُس سے معلوم ہوتا ہی کہ بنگال کی مالگزاری کا ایک حصہ خام اشیاء کے خرید کے لیے علحدہ کر لیا جاتا ہی جو انگلستان بھیجی جاتی تھیں اور حکومت انگلستان اُس کو گراں فروخت کرکے کثیر منافع حاصل کرتی تھی۔ ہزاروں جہاز یہاں کی تمام اشیاء سے بھرے ہوئے انگلستان جاتے تھے۔

ہندوستانی تجارت کی تباہی | کمپنی کے انگریز ملازمین ہندوستان میں اپنے گماشتوں کے ذریعہ مقامی اشیاء سستی خرید کرتے اور مہنگی فروخت کرتے۔ حتیٰ کہ چھوٹی چھوٹی دکانیں بھی ان کے قبضہ میں تھیں۔ جو اشیاء کہ انگریز فروخت کرتے ہندوستانی اُن کو نہیں بیچ سکتے تھے۔ یہ کوئی سرکاری قانون نہ تھا لیکن بُری طرح انسانیت سوز سزائیں دے کر زیر کر لیا تھا۔ اور کپڑا وغیرہ تو ولایتی ہی فروخت ہونے لگا تھا۔ ہندوستان کے تاجر جو کچھ بھی اپنا مال باہر ملکوں میں بھیجے اُن پر محصول اتنا زیادہ تھا کہ فائدہ تو درکنار مال کی قیمت بھی مشکل سے ملتی تھی اور برخلاف اس کے ولایتی مال پر بہت کم محصول لیا جاتا تھا۔ تباہ کرنے کی کوئی صورت نہ چھوڑی۔ مقامی کاریگروں پر محصول لگا دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ملازمین کمپنی نے یہاں کارخانہ کھولے اور کاریگروں کو جو محصول ادا نہیں کر سکتے تھے طرح طرح کی سزائیں دی جاتی تھیں۔ اور اگر یہ نہیں ہوتا تو کم تنخواہوں پر (جو ضرورت زندگی کے لیے ناکافی ہوتی تھیں) ملازم رکھ لیا جاتا تھا۔ خام ریشم بہت تیار ہوتا تھا جو انگلستان بھیجا جاتا تھا۔ اِنوسٹ منٹ کا روپیہ ۱۷۹۳ء سے ۱۸۱۳ء تک ۲۵۱۳۴۶۷۲ پونڈ ہوا۔ اس زمانہ میں (مزو) نے اپنی شہادت میں پارلیمنٹ انگلستان کے سامنے بیان کیا کہ ہندوستان کی اقتصادی حالت بالکل تباہ ہوگئی ہے۔ ہندوستانی جس کی ماہواری اوسط آمدنی ۶ شلنگ یعنی تین روپیہ ہے وہ کیونکر انگریزی مال خرید سکتا ہے۔
۱۸۱۳ء میں چارٹر کی رو سے کمپنی کا اجارہ موقوف کر دیا اور انفرادی تجارت کا عام استحقاق حاصل ہو گیا۔ ایچ ایچ ولسن مشہور مورخ لکھتا ہے کہ ۱۸۱۳ء کے پارلیمنٹ کے مباحثات میں ہندوستانی لوگوں کی اقتصادی ترقی کے لیے کوشش کی گئی لیکن تاجران انگلستان نے اس کی بہت سخت مخالفت کی کیونکہ اس سے ان کو اپنے مفاد کا خطرہ تھا اور وہ کامیاب ہو گئے۔
۱۸۱۳ء کے چارٹر کی رو سے کمپنی کے ہندوستانی تجارتی حقوق بالکل منقطع ہو گئے لیکن چین اور دیگر جزائر سے ہنوز باقی تھے۔ کمپنی نے مدراس۔ بمبئی اور بنگال سے روئی بہت زیادہ خرید کی۔ اِنوسٹ منٹ سے ۸۰۰۰ گٹھے ۲۵۰ پونڈ وزنی خریدے اور ۱۸۲۶ء میں

۶۰ ملین پونڈ وزنی روئی خریدی جس کی قیمت ایک ملین اسٹرلنگ پونڈ (۱۵ ملین روپیہ) ہوئی انگلستان کو غلہ۔ شکر۔ جار۔ شورہ۔ لوہا۔ چاندی۔ سونا۔ تانبا وغیرہ بکثرت جاتا تھا۔

وہ اشیاء جو انگلستان کو ۱۸۰۰ء سے ۱۸۲۹ء تک گئیں۔

روئی	۱۶۰	سے	۱۲۷،۲۴	تک گھٹے گئے
سوتی کپڑا	۱۴۸۱۷	″	۱۰۴	″ ″ ″ ″
ریشم خام	۲۱۳	″	۷۰،۰۰۰	″ ″ ″ ″
ریشمی کپڑا	۱۵۵۸	″	۴۲۸	″ ″ ″ ″
نیل	۱۲۸۱۱	″	۲۷،۰۰۰	صندوق گئے

نقشہ بالا سے معلوم ہوگا کہ انگلستان کو جس چیز کی ضرورت تھی وہ کس قدر گئی اور باقی اشیاء کس قدر کم گئیں۔

نیل :- یورپین پلانٹرز جن کی تعداد ایک ہزار سے زائد تھی ہندوستانی کاشتکاروں کو زر پیشگی بطور ٹھیکہ دے کر ایک مقررہ آراضی پر نیل کی کاشت کراتے تھے۔ اگر کاشتکار اس کام سے فراغت پا کر اپنی ذاتی زمین جوتتے تو سخت سخت سزائیں دیجاتی تھیں۔ کوڑے لگوائے جاتے تھے زمین۔ کھیتیاں وغیرہ ضبط کر لی جاتی تھیں۔ بڑے بڑے جرمانے کیے جاتے تھے۔ جیلخانہ میں لمبی لمبی سزائیں کاٹتے تھے اور اسی حالت میں کارخانوں میں کام کرنے پر مجبور کیے جاتے تھے۔ بعض ہندوستانی بھی نیل کی تجارت کرتے تھے مگر وہ مخالفانہ کارروائیوں کی وجہ سے تباہ و برباد ہوگئے۔ ان انگریز پلانٹروں میں سے اکثر بہت ہی کم سرمایہ رکھتے تھے۔ جس قدر سرمایہ کی ضرورت ہوتی تھی سرکاری ایجنسی ہاؤس سے قرض دیا جاتا تھا۔ بنگال میں جیسور کرشنا گڈھ اور ترہٹ میں ۴۰۰ سے زائد فیکٹریاں قائم تھیں۔ نیل کی کاشت دہلی تک کرائی جاتی تھی۔ ۱۸۰۵ء میں ۹۰،۰۰۰ پونڈ وزنی نیل انگلستان گیا۔ جس وقت کلکتہ میں آ کر نیل جمع ہوتا تھا تو ۲،۴۰۳،۰۰۰ پونڈ قیمت کا ہوتا تھا۔ اور انگلستان میں ۴،۰۰۶،۰۰۰ پونڈ کو

فروخت ہوتا تھا۔ نیل کی کاشت اس کثرت سے ہوئی کہ سینٹ ڈامنگو جو انقلاب فرانس سے بیشتر ممالک کو نیل مہیا کرتا تھا اب تباہ و برباد ہو گیا۔ یہ سب کچھ غریب ہندوستانی مزدوروں کے گاڑھے پسینہ کی کمائی اور محنت شاقہ کا نتیجہ تھا جس کو انگریز صاحبان اپنی حلال روزی سمجھتے تھے۔

سنہ ۱۸۳۷ء میں جب کمپنی کی حکومت مستحکم ہو گئی تو ایک چارٹر کی رو سے تاج انگلستان کو منتقل ہو گئی۔ ملکہ وکٹوریہ تخت پر جلوہ افروز ہوئیں۔ اور ہندوستانی تاریخ کا نیا باب شروع ہو گیا۔ جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے کمپنی کے عہد گزشتہ سے بالکل مختلف ہے۔

محمد عبدالحمید خاں متعلم جامعہ

اقطاب انگورہ

علامہ فہمی بے وزیر داخلہ انگورہ

۴ر اگست ۱۹۱۴ء کا دن جبکہ جنگ زنگ کا آغاز ہوا، اپنے اندر بصیرت و عبرت کے بہت سے مظاہر پوشیدہ رکھتا تھا، چنانچہ جس طرح دنیائے امن و سکون میں جنگ جرمنی نے ایک تہلکہ ڈالدیا اُسی طرح مارچ ۱۹۱۷ء میں روسی قوم کا انقلاب و ریالشویزم تحریک نے کائنات عالم کو چونکا دیا۔ مغرب کی یہ دونوں تحریکیں "قومیت" کے نقطۂ نظر سے اپنی اپنی جگہ نہایت درفیع اور منفعت بخش تھیں، لیکن اسی کے ساتھ ان دونوں تحریکوں نے سوسائٹی کے لیے جو تباہ کن اثرات پیدا کیے اُس کے نتیجہ میں بلجیم کی عبرت اندوز تباہی شمالی فرانس کی اندوہناک بربادی، یوگوسلافیہ کی دلگداز برہمی اور مملکت روسیہ میں خونریز طوائف الملوکی اور قتل عام کے مناظر انسان کو ہمیشہ آبدیدہ کرتے رہیں گے، ظاہر ہے کہ ان دونوں عیسوی تحریکوں نے جس طرح انسانی سوسائٹی کو ہلاکت بار گڑھے میں دھکیل دیا، اُس کے مقابل ۲۰ر مارچ ۱۹۲۰ء کی وہ ایک کمزور تحریک جو انگورہ سے شروع ہوئی انسانی سوسائٹی کے لیے ایک حیاۃ آفریں پیغام لیکر آئی، مارشل مصطفےٰ کمال پاشا نے جس تحریک کا آغاز کیا، کون جانتا تھا کہ اس تحریک کے ذریعہ ایشیا کی ان گنت آبادی میں عروج و ارتقاء اور "نظم و جامعیت" کی ایک نئی روح پیدا ہو جائے گی؟ مگر چند سالہ واقعات نے بتلا دیا کہ تحریک انگورہ نے اناطولیہ کے ویرانوں سے لیکر حدود چین تک لاتعداد بنی نوع بشر میں حیاۃ کامرانی، عزت و خودداری، اور نظم و وحدت کے وہ ولولے پیدا کر دیئے جن کے ذریعہ سے مشرق کا دھندلا اُفق از سر نو جگمگا اُٹھا۔

سیاست شناس دماغ جانتے ہیں کہ ترکان انگورہ نہ صرف اناطولی میدانوں میں سرگرم عمل تھے بلکہ اُن کی یہ نہایت محتاط تحریک قفقاز و ترکستان اور خیوا و افغانستان میں بڑی

سرعت سے کام کر رہی تھی، ہزا کسلنسی انور پاشا، نوری پاشا، خلیل پاشا اور جمال پاشا اس بیدار کُن تحریک کے ممتاز ترین لیڈر تھے، جن کی حیرت انگیز جد و جہد اور سیاسی و ریشہ دوانیوں نے آج سارے مشرق کو مغرب کے مقابل لا کھڑا کر دیا ہے، اور اسی طرح ایشیائے کوچک میں جن ترکی دماغوں نے کار ہائے نمایاں انجام دیئے اُن کے باعث مغرب کی وہ خطرناک تحریک ہمیشہ کے لیے ملیامیٹ ہو گئی جو پورے ایشیا کو چٹ کر جانے کے لیے پاؤں پھیلا رہی تھی، لہذا بر بنائے حالات کہا جا سکتا ہے کہ آج مشرق میں حیات و کامرانی کا جو چمکیلا آفتاب طلوع ہو رہا ہے وہ ترکان انگورہ ہی کے دم قدم کا نتیجہ ہے، اور ایشیائے کوچک میں جو میدان کارزار گرم ہوا تھا وہ انسانی موت و زندگی کا ایک متضاد مظاہرہ تھا جس کے ذریعہ بعض اقوام عرصۂ دراز کے لیے فنا ہو گئیں اور بعض نے ایک نئی زندگی حاصل کی، بارے اس کشمکش کی آخری ساعت ۲۴ رجولائی ۱۹۲۳ء کو "لوزان" میں ختم ہو گئی اور ایک معاہدہ کے ذریعہ مغرب نے مشرق کے کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ تسلیم کر لیا اور بہ ہمہ وجوہ تسلیم کر لیا ضرورت ہے کہ آپ کے سامنے اُن ارباب بست و کشاد اور اصحاب فکر و عمل کے سوانح لائے جائیں جنھوں نے انگورہ کی بلندیوں سے پورے ایشیا کو نہضت و بیداری اور استقلال و خودداری کا روح پرور پیام پہونچایا،

کسے خبر تھی کہ ایشیا کا وہ "مرد بیمار" جو یورپ میں اپنی تلخ و ناکام زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا اپنے آغوش میں ایسے نوجوان و ہونہار فرزند بھی رکھتا ہے جو ایک تبر اپنی شجاعت و سیاست سے دانایان فرنگ کے چھکے چھڑا دے گا، لیکن جب "لوزان" میں حکیمان انگورہ کی ایک بالغ نظر جماعت نے عقلائے فرنگ کو بساط سیاست پر نیچا دکھایا تو دنیا نے معلوم کر لیا کہ سیاست و دانش آموزی دانایان فرنگ ہی کی جائداد نہیں بلکہ اُس سے ارباب انگورہ بھی بدرجہ وافر بہرہ اندوز ہو چکے ہیں اور اُن کا ایک سپاہی جو عمر کے تیئس ۲۳ سال میدان جنگ و قتال میں گزار چکا ہے وہ سیاسیات کے نکات و غوامض پر بھی حاوی ہے

اور اچھی طرح حاوی ہیں۔

ترکی میں کئی فتحی بے گذرے ہیں، ایک فتحی بے وہ ہیں جو جنگ بلقان میں ہوائی جہاز سے گر کر شہید ہوئے، دوسرے فتحی بے جنگ طرابلس میں سرگرم عمل رہ چکے ہیں، لیکن ہمارے فتحی بے کا نام نامی احمد فتحی بے آف قازان ہے، آپ کا سلسلۂ خاندان قازان کے ایک ممتاز پاشا سے ملتا ہے آپ کی عمر ۴۴ برس کی ہے، آپ "ترکی" فارسی، عربی، فرنچ، اور "انگریزی" زبان میں کامل مہارت رکھتے ہیں، آپ زبردست اور ممتاز ادیب ہیں، علامہ فتحی بے عام ترکی مدبرین کی طرح ترکی اجتماعی زندگی میں ایک سپاہی کی حیثیت سے داخل ہوئے لیکن خداداد قابلیت کی وجہ سے بہت جلد آپ کیپٹن بنا دیئے گئے، اور کوئی چار سال تک آپ فوج میں معقول خدمات انجام دیتے رہے، اس کے بعد کچھ عرصہ تک آپ شاہی باڈی گارڈ کے افسر اعلیٰ رہے، پھر انتظاماً آپ ارض روم بھیج دیئے گئے جہاں آپ کو ایک سال تک رہنا پڑا، فتحی بے نے فوجی لائین میں جو خدمات انجام دیں اُن کے ساتھ ہی ساتھ آپ کی انتظامی قابلیت نے آپ کو ترکی وزارت کی نظروں میں زیادہ وقیع بنا دیا یہ وہ زمانہ ہے کہ آپ "انقلابی" خیالات سے بہت زیادہ متاثر تھے، آپ کے ایک دوست جو ۱۹۱۳ء میں ترکی وزیر مال تھے انھوں نے آپ کو مشورہ دیا کہ وہ ملازمت ترک کرکے ترکی میں انقلابی جماعتیں مرتب کریں۔ چنانچہ فتحی بے نے ملازمت سے استعفاء دیدیا، مگر سلطان المعظم نے اسے منظور نہ کیا اسی عرصہ میں مملکت فرانس میں ترکی سفارت بدل گئی اور آپ فرانسیسی سفارت میں بحیثیت ملٹری اتاچی پیرس بھیجدیئے گئے۔ جہاں آپ کامل دو برس تک ترکی سفارت خانہ میں فرائض انجام دیتے رہے، پیرس کے قیام میں فتحی بے نے علاوہ فرنچ زبان کے فرانسیسی رائے عامہ اور سیاسیات کا فی مطالعہ کیا، اس کے بعد آپ سالونیکا میں کمانڈر مقرر ہوئے، یہ وہ زمانہ ہے جب سلطان المعظم اعلیٰحضرت حضور مغفور سلطان عبد الحمید خاں سالونیکا میں نظر بند تھے، جب سلطان مرحوم نے نظر بندی سے تنگ آکر احتجاجاً فتحی بے سے شکایت کی تو ممدوح نے یہ نہایت قیمتی مشورہ دیا کہ آپ زمانہ نظر بندی میں اپنی سوانح اور عہد حکومت کے

حالات ملکیۂ اس کے بعد فتحی بے مملکت بلغاریہ میں ترکی سفیر مختار کی حیثیت سے بدل دیے گئے اور یہی وہ زمانہ ہے جبکہ ترکی وزارت نے فتحی بے کی سیاسی علومرتبت کو پہچان کر انہیں یہ جلیل القدر سیاسی عہدہ تفویض کیا، جب آپ صوفیہ میں سفارت کے عہدہ پر مامور ہوئے تو موجودہ ترکی کے مجدد مارشل مصطفےٰ کمال پاشا آپ کے ملٹری اٹاچی مقرر ہوئے، صوفیہ میں ان دونوں انقلابی خیالات کے آدمیوں کا ایک جگہ جمع ہونا ملک قوم کے لیے نہایت مفید تھا، اگرچہ مارشل مصطفےٰ کمال پاشا سے فتحی بے کی ملاقات سالونیکا میں ہو چکی تھی لیکن اس قربت نے دونوں کے عزائم میں مزید تقویت پیدا کر دی، اب فتحی بے ممدوح کا اصل عہد سیاست شروع ہوتا ہے یعنی آپ "انجمن اتحاد و ترقی" کے سکرٹری منتخب ہوئے ظاہر ہے کہ انجمن اتحاد و ترقی کی نظامت ایک پادشاہ کی حیثیت رکھتی تھی، جہاں تمام امور جہاں بانی اور داخلی اصلاحات کے فرائض انجام دینے پڑتے تھے چنانچہ فتحی بے نے اس عہدہ کا چارج لیتے ہی اس قدر محنت و قابلیت سے کام لیا کہ دوسرے ترکی مدبرین آپ کی سیاست دانی پر ششدرر رہ گئے، آپ کی محنت و سرگرمی کا اس سے اندازہ کیجئے کہ ایک مرتبہ آپ نے رومانوی سفیر سے خفیہ ملاقات کی جس کا سلسلہ کامل پانچ گھنٹہ رہا، اس کے بعد آپ ترکی صدر اعظم سے ملنے گئے جہاں آپ کو شام ہو گئی، پھر آپ سیدھے دفتر تشریف لے آئے جہاں آپ رات بھر کام میں مصروف رہے اور اس تمام عرصہ میں آپ نے صرف دو مرتبہ چار پی، جب بلغاری فوجوں نے ایڈریانوپل پر چڑھائی کی تو فتحی بے چالیس ہزار جرار لشکر کے ساتھ گیلی پولی میں مصروف کارزار ہو گئے گویا یہ دوسرا موقع تھا جب آپ ملک و ملت کی مدافعت کے لیے سیاسیات سے نکل کر فوجی لائن میں کام کرنے لگے، گیلی پولی میں تنہا فتحی بے ایسا عظیم الشان کمانڈر تھا جس نے بلغاری فوجوں کو ایڈریانوپل پر حملہ کا موقع ہاتھ نہ آنے دیا غرض یہ اور اسی قسم کی متعدد جنگی و سیاسی خدمات تھیں جن کے ذریعہ ترکی میں ممدوح کی گوناگوں قابلیتوں کا شہرہ ہو گیا، اور آپ ترکی کے مسلمہ لیڈر مان لیے گئے، جب جنگ فرنگ کا آغاز ہوا اس وقت آپ عارضی طور پر بصرہ کے لفٹنٹ گورنر تھے، لہٰذا جب برطانی فوجوں نے مقام "قرنہ" پر حملہ کیا تو آپ نے ان کی پرزور مدافعت کی

لیکن کافی سامان رسد اور کمک کے نہ ملنے پر آپ کی فوجوں کو ہتیار ڈال دینا پڑا، اور آپ شام میں مارشل جمال پاشا کے پاس چلے آئے، آپ نے اس معرکہ کے متعلق گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے جو اطلاع شائع ہوئی تھی وہ یہ ہے، دہلی ۹ دسمبر ۱۹۱۴ء سرکاری طور پر اعلان کیا گیا ہے کہ فتحی بے گورنر بصرہ نے شمالی بصرہ کے مقام "قرنہ" میں کمانڈ کرتے ہوئے ہتیار ڈال دیئے"،
اس وقت آپ شام و کردستان میں علی احسان پاشا کے ساتھ فوجیں بھرتی کرتے رہے یہاں تک کہ جب مارشل عزت پاشا صدر اعظم مقرر ہوئے تو فتحی بے ترکی کے وزیر داخلہ بنائے گئے جو آپکی سرکاری خدمات کا آخری عہدہ تھا،

۱۹۱۴ء کا وہ خونریز سال شروع ہوا جس میں ترکی قوم کی تباہی و بربادی اور ہلاکت خیزان کے نہایت ہی صبر آزما زمانہ تھا، جب اکتوبر ۱۹۱۸ء میں مشہور معاہدہ سیورے مرتب ہوا اُسی وقت فتحی بے ایوان حکومت کے رُکن رکین تھے لیکن حقیقت میں یہ ایوان حکومت فتحی بے ایسے سچے خیر خواہ ملک و وطن کے لیے ایک قید خانہ سے زیادہ تکلیف دہ تھا کیونکہ ایک طرف تو قومی سیاسیات کا تقاضہ تھا کہ ملک و ملت کی رہنمائی اور خدمت سے خود کو کسی طرح علیحدہ نہ کیا جائے لیکن سیاسی ماحول خصوصاً اتحادیوں کی مداخلت روز بروز آپ کو دل برداشتہ کرتی جاتی تھی، یہ حالات آخر ۱۹۱۸ء کے ہیں جبکہ آپ مارشل احمد عزت پاشا اور مارشل رضا پاشا کے ساتھ کام کرتے تھے لیکن آپ بڑی جرأت سے اُس پالیسی کے مخالف تھے جو اتحادیوں کے مفید مطلب بعض ملت فروش ترکی وزراء اختیار کر رہے تھے، یہاں تک کہ فتحی بے نہایت جرأت و دیانت سے ملک و قوم کی خدمت میں مصروف رہے، ادھر انگورہ تحریک کا آغاز ہو چکا تھا جب ترکی دار المبعوثین میں احرار انگورہ کے خلاف تجاویز سوچی گئیں تو آپ نے نہایت دلیری سے ان کی مخالفت کی، بس یہی وجہ تھی کہ اتحادیوں نے آپ کی حریت پسندی اور وطن پرستی کا اندازہ کرتے ہوئے اوائل ۱۹۲۰ء میں آپ کو گرفتار کرکے جزیرہ مالٹا میں نظر بند کر دیا، آپ کی نظر بندی محض ترکان احرار

کی حمایت میں تھی اور اسی طرح آپ کے تمام وہ رفقاء بھی گرفتار کر لیے گئے تھے جو آپ کے خیالات کے مؤید تھے، ان معزز رفقاء میں سعید حلیم پاشا صدر اعظم، کوچک جمال پاشا، حسین رؤف پاشا، کرنل قرہ وصاف پاشا، ڈاکٹر عمر نسیم پاشا، ڈاکٹر جلال نوری بے ایڈیٹر "جون ترک"، شاہزادہ ابراہیم آفندی، خصوصیت سے قابل ذکر ہیں فتحی بے اور آپ کے رفقاء کی یہ وہ مقتدر جماعت تھی جو ڈیڑھ دو سال مالٹا میں نظر بند رہی چونکہ اس جماعت میں ہر شخص علم و فضل میں ممتاز مرتبہ رکھتا تھا بالخصوص علامہ فتحی بے ایسا فاضل روزگار ادیب مالٹا میں بیکار نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ ممدوح نے بعض نادر الوجود انگریزی کتابوں کا ترجمہ شروع کر دیا، علامہ فتحی بے کی یہ خدمت ایسی تھی جس پر تمام یورپی اخبارات نے علامہ ممدوح کی علمی مرتبہ پر مقالات لکھے تھے، علامہ فتحی بے نے ان انگریزی کتابوں کو ترکی زبان میں ترجمہ کر کے ثابت کر دیا کہ وہ ایام تعطیل میں بھی اپنی قوم کی خدمت سے غافل نہیں۔

اگست سنہ ۱۹۲۱ء میں معرکہ سکاریہ کے بعد ترکان انگورہ کی جنگی و سیاسی پوزیشن نہایت مستحکم ہو چکی تھی، اتحادیوں کے حوصلے پست ہو چکے تھے خود اندرون قسطنطنیہ ترکان احرار کے مؤیدین کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا تھا کہ اسی دوران میں علامہ فتحی بے مالٹا سے رہا ہو کر انگورہ پہونچ گئے، علامہ ممدوح کی سیاسی قابلیت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب آپ مالٹا سے رہا ہو کر انگورہ جانے والے تھے اسی وقت سے انگورہ پارلیمنٹ نے علامہ ممدوح کے لیے وزارت داخلہ کی کرسی خالی کر کے آپ کو وزیر داخلہ نامزد کر دیا تھا، جس وقت یہ حضرات انگورہ پہونچے تو تمام اعیان حکومت نے آپ کا پرتپاک استقبال کیا، خود رئیس جمہوریت مارشل مصطفیٰ کمال پاشا مع اپنے جنگی اسٹاف کے اسٹیشن پر موجود تھے، علامہ فتحی بے اگرچہ دو سال کی نظر بندی اور قید کی تکالیف سے چور ہو رہے تھے مگر جب وطنی کا جوش اس قدر غالب تھا کہ آپ نے انگورہ پہونچتے ہی وزارت داخلہ ایسی اہم ذمہ داری کو قبول فرما لیا، اور نہایت قابلیت سے فرائض انجام دینے لگے اور حضرت حسین رؤف پاشا صدر اعظم انگورہ مقرر ہوئے، ان حضرات کے تقرر سے یورپ کے سیاسی حلقوں میں تہلکہ مچ گیا۔ اور اخبارات

نے صاف صاف لکھ دیا تھا کہ اب انگورہ گورنمنٹ کا ترقی کن دور شروع ہو گیا ہے علامہ فتحی بے اُس وقت سے لیکر اس وقت تک کاروز بر داخلہ کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

فروری ۱۹۲۱ء میں جب حضرة بکر سمیع کا مصالحانہ وفد انگلستان میں ناکام رہا تو انگورہ گورنمنٹ نے اتمام حجت کے لیے وسط ۱۹۲۲ء میں پھر ایک سیاسی مشن یورپ روانہ کیا جس کا منشا یہ تھا کہ اتحادیوں کو جنگ ترکی و یونان کے التوا اور مصالحت کے لیے آمادہ کیا جائے، لہذا اس اہم سیاسی مقصد کے لیے انگورہ گورنمنٹ نے علامہ فتحی بے ہی کو منتخب کیا جن کی انگریزی دانی اور ذریعہ آگاہی ترکوں میں مشہور تھی، علامہ فتحی بے اس سیاسی مشن کو لیکر جب انگلستان پہونچے تو انگلستان میں لارڈ کرزن ایسے عالی دماغ اور سیاست آگاہ شخص نے فتحی بے سے ملنے کی درخواست نامنظور کر دی کیونکہ مآل اندیش لارڈ کرزن سمجھتے تھے کہ ترکان انگورہ بالآخر یوناں سے شکست کھائیں گے، جب لارڈ کرزن نے فتحی بے سے ملنا نامنظور کیا تو یہ سیاست آگاہ اور ترکی کا عظیم الشان جنگی و سیاسی ماہر انگلستان سے مسکراتا ہوا چلدیا اور پیرس پہونچکر اُس نے انگورہ کے ہیڈ آف دی اسٹاف کو تار دیدیا کہ بڑھو اور بزدل یونانی افواج پر ٹوٹ پڑو۔

حضرة فتحی بے کی انگلستان میں موجودگی کو عام طور پر سمجھا گیا تھا کہ انگورہ گورنمنٹ نے آپ کو انگلستان و فرانس اس لیے بھیجا ہے کہ وہ ان دونوں عیسوی حکومتوں کی منت سماجت کر کے کسی طرح یونانیوں سے پیچھا چھڑا لیں لیکن اصلیت اس کے بالکل خلاف تھی بلکہ واقعہ یہ تھا کہ ترکان انگورہ کو اتحادیوں سے نہ کبھی پہلے کوئی توقع تھی نہ اس وقت اُنھیں صلح و امداد کی توقع پیدا ہوئی تھی البتہ یہ انگورہ گورنمنٹ کی بے مثل سیاسی چال تھی کہ اُس نے فتحی بے ایسے جنگی و سیاسی لیڈر کو دول اتحاد کے دارالحکومتوں میں بھیجا تاکہ وہ وہاں یونانیوں کے حق میں دول اتحاد کی رائے عامہ کا اندازہ کریں اور معلوم کریں کہ اگر ترکی لشکر یونانیوں پر حملہ آور ہوں تو دول اتحاد کی رعایا اُس وقت کیا طرز عمل اختیار کریگی؟ یہ تھا وہ اہم سیاسی مقصد جس کے حصول کے لیے فتحی بے یورپ تشریف لائے تھے اور گو لارڈ کرزن کے نہ ملنے پر انگریزی حلقوں میں خوشیاں منائی گئیں مگر فتحی بے

نے اس چند روزہ خموش قیام میں یہاں کی حالت کا صحیح اندازہ کر لیا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد ہی انگورہ
گورنمنٹ کا وہ عظیم الشان اور تاریخی حملہ شروع ہو گیا جس نے یونانیوں کا استیصال کامل کر دیا۔
جب ۹ ستمبر ۱۹۲۲ء کو یہ حملہ فتح سمرنا کی کامیابی پر ختم ہو گیا تو انگورہ کی وزارت داخلہ کے لیے
نظم و انصرام اور داخلی بندوبست کا ایک عظیم الشان سلسلہ شروع ہو گیا، دہانہ سکاریہ سے لیکر اسکی شہر
افیون قرہ حصار، اور اسمر، وسمرنا تک تمام برباد شدہ علاقہ اور غیر منتظم اور پراگندہ رعایا کا
حفظ و اجتماع، تجارتی کاروبار کی اصلاح، برباد شدہ آراضی کو قابل کاشت بنانا، آبپاشی، سلسلہ
رسل و رسائل، شہروں میں سیاسی و انتظامی محاکم کا انعقاد سرکاری اور غیر مصافی عمارتوں کی تعمیر، مدارس
مکاتب کا افتتاح، ریلوے لائن کی تعمیر و درستی، ٹیکس و محاصل کا انصرام وغیرہ یہ تمام اہم داخلی معاملات
وزارت داخلہ ہی سے متعلق تھے لہذا فتح سمرنا کے بعد ہی علامہ فتحی بے بحیثیت وزیر داخلہ ان
مہمات مسائل کی اصلاح کے لیے سرگرمی اور پوری محنت کے ساتھ مصروف عمل ہو گئے حکومت
انگورہ کی اس سرکاری رپورٹ میں جو نومبر ۱۹۲۲ء کے اجلاس میں پڑھی گئی ان خدمات کے مفصل
اعداد و شمار بتلائے گئے ہیں اور یہی وہ اعداد ہیں جو فتحی بے کے متجر دماغ اور عملی سرگرمیوں کے
آئینہ دار ہیں، اس رپورٹ میں وزارت داخلہ انگورہ کی خدمات کو اس طرح ظاہر کیا گیا ہے۔

"وزارت داخلہ نے امن و انتظام کو قائم کرنے کے بعد اپنے افسر مقرر کیے جو قوانین کی تنفیذ اور اجراء کریں،
چونکہ محکمہ تفتیش دو سال قبل توڑ دیا گیا تھا اس لیے بعض لوگوں کو شکایت پیدا ہو گئی تھی اس بنا پر پھر محکمہ
تفتیش (خفیہ) قائم ہو گیا، جس نے نہایت جانفشانی سے اپنے کاموں کو انجام دیا۔ اس محکمہ نے (۹۴)
افسروں کے متعلق رپورٹ کی جس میں سے تحقیق کے بعد (۲۰) کلکٹر اور (۵) ڈپٹی کلکٹر برخاست
کیے گئے، محکمہ تفتیش نے (۲۶۲) حلقوں کی تحقیق کی اور ہلال احمر کی جماعتوں میں سے (۱۵) جماعتوں
میں کام کیا، وزارت داخلہ نے واپس شدہ علاقوں میں جو عدالتیں قائم کیں ان میں (۱۴)
کورٹس آف اپیل عدالت ہائے خفیفہ محاکم شرعیہ (۹۰) جنیں (۵۶۰) قاضی اور (۲۲) جج مقرر ہو چکے ہیں"

(نوید، ۱۶-اپریل ۱۹۲۳ء)

یہ ہیں وہ مختصر خدمات علامہ فتحی بے کی جو مجھے میسر آئیں ورنہ اصلیت میں فتحی بے مدوح کی خدمات اس سے کہیں زیادہ کثیر اور اہم ہیں، جب کوئی ترکی قلم "تاریخ انگورہ" لکھے گا تو محترم فتحی بے کی خدمات اور سرگرمیوں سے اس کے صفحات جگمگا اُٹھیں گے، اور دنیا کو معلوم ہوگا کہ ممدوح جہاں ایک بڑے جنگی لیڈر تھے وہاں ایک نازک دماغ سیاسی مدبر بھی تھے کاش ہمارے نوجوانوں میں بھی خصوصاً طلبہ میں اس قدر وسیع ہمہ دانی کا ولولہ پیدا ہو "اور یونیورسٹی کی ڈگریوں کو منتہائے کمال سمجھنے کی حوصلہ شکن عادت اُن سے دور ہو۔

حُلیہ اور خصائل علامہ فتحی بے نہایت خلیق اور نرم مزاج آدمی ہیں، بہت کم بولتے ہیں مگر دوستوں کی جماعت میں وہ زیادہ خوش طبع آدمی واقع ہوئے ہیں، فیلڈ مارشل فوزی پاشا کمانڈر انچیف انگورہ آپ کے خاص دوست ہیں، سیر و تفریح کا بہت کم شوق ہے البتہ اخبارات کا مطالعہ آپ کے لیے نہایت دلچسپی کا سامان ہے قد درمیانہ بھرا ہوا جسم، بلکا نیلی آنکھیں، یورپی فیشن کی نصف مونچھیں ڈاڑھی صاف باوجود یورپ میں عرصہ تک قیام رکھنے کے آپ نے کبھی یورپی ٹوپی استعمال نہ کی۔

"توحیدی"

رفتار تعلیم

رایل ایشیاٹک سوسائٹی کا زمانۂ حیات ایک سو برس ہو چکا گزشتہ ماہ جولائی میں اس کی صدسالہ سالگرہ بڑی دھوم سے منائی گئی جس میں سلطنت برطانیہ میں تقریباً تمام علمی انجمنوں کے مندوبین شریک ہوئے۔ شہزادہ ویلز نے اس کا افتتاح کیا۔

سوسائٹی مذکور کی طرف سے جو سہ ماہی رسالہ نکلتا ہے اس کے گزشتہ صدی مجلدات کے مضامین اور اہم شذرات کی فہرست سے جو بہ لحاظ مصنفین اور بہ لحاظ ممالک ترتیب کی گئی تھی، ہر مندوب کو تقسیم کی گئی۔ ہندوستان سے متعلق مقالات و شذرات ضخامت میں تمام دیگر ممالک سے متعلق مضامین کے برابر ہیں، غرض اس ایک صدی میں سوسائٹی مذکور نے ایشیا اور بالخصوص ہندوستان کے علوم و فنون کی تحقیق و تفتیش اور نشر و اشاعت کے سلسلہ میں جو گرانبہا خدمات انجام دی ہیں ان کو پیش نظر رکھ کر کوئی شخص جو ذرا بھی علوم شرقیہ سے مس رکھتا ہے، لارڈ مکالے کے ان جذبات کے اظہار کی جو اس نے ۱۸۳۵ء کی "تعلیمی یادداشت" میں کیے ہیں، جرأت نہیں کریگا۔ سوسائٹی نے نہ صرف علوم شرقیہ کی نشر و اشاعت سے عام اشخاص کی معلومات میں اضافہ کیا ہے بلکہ اس نے نوجوانوں میں بھی علوم قدیمہ کی تحقیق کا مذاق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ بیس سال سے اس نے تاریخی مضامین پر تمغے اور کتابیں بہ طور انعام دے کر بہت افزائی کرتی رہی ہے۔ ہر طرف مزید ایشیائی انجمنیں کھل رہی ہیں، یہ اس امر کی کافی دلیل ہے کہ سوسائٹی مذکور کے اصول کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ لارڈ چالمرس کی صدارت میں سوسائٹی کی دوسری صدی شروع ہو رہی ہے۔ جس کی آیندہ ترقی کا دارومدار علمائے فن کی کوشش و عمل پر ہے۔ اخیر میں ہماری بھی یہ خواہش ہے کہ اراکین و کارکنان ایشیاٹک سوسائٹی" میں "ایشیائی" اشخاص کی تعداد میں اضافہ ہو۔

انجمن قومی تعلیم، امریکہ نے تمام عالم کی مجالس تعلیمی کا ایک اجلاس بمقام سین فرانسسکو منعقد کیا ہے

جس کا مقصد یہ بتایا جاتا ہے کہ تمام اقوام میں باہمی اتحاد و اتفاق قائم ہو، برکات تعلیم عام ہوں اور ایسی تدابیر اختیار کی جائیں جو شاہراہِ امن کی طرف لیجاتی ہوں۔ چنانچہ مضامین زیر بحث یہ ہوں گے۔ بین الاقوامی اتحاد عمل، معلومات تعلیمی کی اشاعت، تخیلات بین الاقوامی، تعلیم صحت جسمانی وغیرہ وغیرہ دنیا اپنے درد کا علاج مختلف طریقوں سے ڈھونڈھ رہی ہے۔ دیکھئے کوئی نسخہ اکسیر کب ہاتھ آتا ہے جس سے امن چین نصیب ہو۔

واقعاتِ عالم اور رفتار زمانہ کا گہرا مطالعہ کرنے والے حضرات اس امر سے بے خبر نہ ہوں گے کہ تہذیب و تعلیم ایشیا و یورپ سے کھسکتی ہوئی امریکہ کی طرف جا رہی ہے۔ چنانچہ حال میں خواتین امریکہ نے ۲۰ لاکھ ڈالر (۶۰ لاکھ روپئے) اس غرض سے فراہم کیے ہیں کہ ان سے عورتوں کو علوم شرقیہ کی تعلیم کے لیے کالج قائم کیے جائیں۔ اس وقت، تعلیم گاہوں کے کھولنے کا قصد کیا جا رہا ہے جن میں سے ۳ ہندوستان میں ہونگی۔

مصر کے جدید نظام دستوری کی رو سے ذکور و اناث ہر دو اصناف کے لیے ابتدائی تعلیم لازمی قرار دی گئی ہے اور اس کے لیے مصر کے چل سالہ (۱۸۸۲ء سے ۱۹۲۲ء تک) تعلیمی ترقی کی ایک یادداشت شائع کی گئی ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ ۱۸۸۲ء میں حکومت مصر اور محکمہ اوقاف کے ماتحت مدارس کی مجموعی تعداد ۰۵ ۱۰ تھی جن میں ۳۸۴۳ ۱۰ طلبہ تعلیم پاتے تھے۔ آج ۵ ۴۷ سرکاری اسکول ہیں اور ۳۱۹۱ صوبہ کی کونسل کے ماتحت ہیں، ان ہر دو اقسام کے مدارس میں طلبہ کی مجموعی تعداد ۲۲۱۸۲۱ ۳ ہے۔

روپیہ کی کمی کے سبب سے پہلے تعلیم کا کوئی معقول بندوبست نہ تھا، ابتدا میں وظائف طعام و قیام کے اخراجات نیز آیندہ ملازمت کی امیدیں دے دلا کر طلبہ فراہم کیے جاتے تھے۔ اور گورنمنٹ کو چونکہ اشخاص کی ضرورت تھی اس لیے اس نے دل کھول کر ایسا کیا۔

تعلیم نسواں کے معاملہ میں یہ ترقی ذرا دھیمی تھی۔ سب سے پہلا اسکول لڑکیوں کی ابتدائی تعلیم

کے لیے ۱۸۷۳ء میں کھولا گیا لیکن ۱۸۸۲ء تک اس میں کچھ ترقی نہ ہوئی۔ صرف ایک سکول تھا جس میں ۹۹ لڑکیاں تعلیم پاتی تھیں اور پھر بھی ان کی تعلیم کے لیے عورتیں نہ تھیں ۱۹۲۰ء میں ۵ لڑکیوں نے پرائمری سرٹیفکٹ امتحان پاس کیا جس سے وزارت کو امید ہوئی اور عورتوں کے لیے ایک ٹرننگ کالج کھولا گیا۔ آج قریباً ۲۴۷ گرلز اسکول ہیں جن میں ۵۸۹۴۹ لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں۔

اعلیٰ تعلیم میں معقول ترقی ہوئی ہے۔ طلبہ اسکول ۱۸۲۶ء میں، جانوروں کے علاج، دایوں کی تربیت، قانون کی تعلیم کے لیے مدارس کھلے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سی تعلیمگاہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے قائم ہیں۔ ۱۹۲۰ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے طلبہ انگلستان بھیجے گئے، اس کے بعد سے فرانس، سویزرلینڈ بھی بھیجے جانے لگے، صنعت و حرفت اور تجارت کی تعلیم کا بھی انتظام ہے ایک اسٹیٹ یونیورسٹی کھولنے کی بھی کوشش کی جا رہی ہے۔

بصرہ کے اراکین وزارت آیندہ سال متعدد مدارس کھولنے پر غور کر رہی ہے جن میں ایک لڑکیوں کا اسکول بھی ہوگا جس کے اساتذہ مصر سے بلا لیے جائیں گے۔

بالخصوص قومی تعلیم کے حلقہ میں یہ خبر بہت ہی رنج و افسوس کے ساتھ سُنی جائیگی کہ آکسفرڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیوں میں سے ہر ایک نے ۲ ہزار پونڈ سالانہ حکومت انگلستان سے لینا منظور کر لیا ہے۔

سر رابرٹ بیڈن پاول تحریک سکاوٹ کے مشہور بانی ہیں، اُنھوں نے امپیریل ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں اپنی تحریک کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اس تحریک کا منشا تندرست ہشاش بشاش اور کارآمد شہری پیدا کرنا ہے۔ اس کا طریقہ عمل صرف چند کھیلوں پر مبنی ہے۔ اپنی زندگی کے قلیل عرصہ میں (پندرہ سال جن میں پانچ سال گزشتہ جنگ کے بھی شامل ہیں) اس تحریک نے اس قدر مقبولیت حاصل کر لی ہے کہ اس کے ممبروں کی تعداد ۲۰ لاکھ لڑکے

اور لڑکیوں پر مشتمل ہے۔ طلبا کے سرپرستوں اور ماہر تعلیم نے بھی اسے پسند کیا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج اس کی شاخیں تمام متمدن ممالک میں قائم ہوگئی ہیں۔ جس کی وجہ سے تحریک کی صورت "بین الاقوامی قوت" کی سی ہوگئی ہے۔ بانی تحریک نے یہ دیکھ کر کہ تعلیم خواہ علمی حیثیت سے کتنی ہی ترقی کر جائے لیکن معاشرتی ضروریات کے لیے پھر بھی ناکافی رہ جاتی ہے اور آئندہ کی مزید ضروریات کے لیے اور بھی نیز ارتکاب جرم، بداخلاقیاں، افلاس، خرابی صحت، باہمی و قومی مناقشات غرض ہر طرح کی برائیاں موجودہ سوسائٹی میں پائی جاتی ہیں اور جو خود انسانوں کی پیدا کردہ ہیں اور جن کا بہترین علاج وہی خود کر سکتے ہیں، اس لیے بہترین طریقہ علاج اخلاق انسانی کی اصلاح ہے جو تحریک اسکاؤٹ کا مقصد عظیم ہے۔

تحریک کے اغراض اور وجوہ آغاز سے اس کے مفید ہونے سے کسے انکار ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس "پردہ زنگاری" میں کوئی "معشوق" پنہاں نہ ہو۔

"معلم"

مطبوعات جدیدہ

— فتح المعانی ترجمہ صحف الغزالی ۔ مترجمہ حضرت حافظ فیض احمد صاحب مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ قیمت عہ
یہ رسالہ جیساکہ دیباچہ میں ظاہر کیا گیا ہو امام غزالی کی وفات کے بعد اُن کے بھائی نے فضائل الانام کے نام سے مرتب کیا تھا جو درحقیقت امام صاحب کے مکتوبات کا مجموعہ ہو جس کا ایک قلمی نسخہ سرسید احمد خاں کے پاس تھا اور اُنہیں نے پہلی مرتبہ اُس کو طبع کرایا۔ اس رسالہ کا ترجمہ اب حاجی محمد محی الدین صاحب تاجر کتب بنگلور کی فرمائش سے ہوا ہو۔ ترجمہ برجستہ و بامحاورہ ہو لیکن جناب مترجم نے اکثر مقامات پر اپنے نوٹ اور اپنی رائے اس بے ترتیبی سے شامل کی ہو کہ بہ یک نظر امتیاز مشکل ہو جاتا ہو کہ یہ اصل مضمون کتاب ہو یا حاشیہ مترجم۔
رسالہ ہذا میں سلاطین، و امرا، و وزرا کے نام بھی خطوط ہیں اور علمائے عصر و فقہائے عہد کے نام بھی مختلف مسائل پر مکتوبات موجود ہیں۔ آخر میں بعض نصائح شامل کیے گئے ہیں۔
امام غزالیؒ کی تصنیف کا ترجمہ شائع کر دینا بجائے خود ایک خدمت ہو جس کے لیے ہم جس قدر ممنون ہوں بجا ہے۔
کتاب معمولی کاغذ پر صاف چھپی ہو اور حاجی محی الدین سوداگر کتب لشکر بنگلور سے ملتی ہو۔

— مثنوی بحر المحبت ۔ مصنفہ شیخ مصحفی، مرتبہ مولوی عبد الماجد، بی۔ اے مطبوعہ مطبع معارف اعظم گڈھ۔ قیمت ۱۲ ار
میر تقی میر کی مثنوی دریائے عشق کا اگرچہ اس زمانہ میں کچھ زیادہ چرچا نہیں ہو لیکن ایک وقت گزرا ہو کہ شائقین ادب کے لیے وہ سرمایہ ناز تھی اور اب بھی پچھلی صحبتوں کے دیکھنے والے دریائے عشق کا اس شوق سے نام لیتے ہیں گویا ادب اردو کا ایک انمول موتی ہو۔ غالباً اسی شہرت و ہر دلعزیزی سے متاثر ہو کر میر کے ہمعصروں کو اسی زمین میں بادیہ پیمائی کی فکر ہوئی، اور بھی مثنویاں ہوئی ہوں گی لیکن شیخ مصحفی کی بحر المحبت نے خصوصیت سے لوگوں کی توجہ اپنی طرف

کھینچی۔ کچھ تو شاعری کی شخصیت، پھر بحر المحبت کی ٹکر، اور [illegible] نیا تحفہ کہ آخری مثنوی نے پہلی
کا تتبع اس شدت سے کیا تھا کہ جزئیات، خیالات اور طرز بیان تک کی تقلید میں دریغ نہیں کیا
خواہ مخواہ پڑھنے والوں کو مقابلہ کرنا پڑتا اور اس طرح بحر المحبت کا چرچا بھی زبان زد
خلائق ہو گیا۔ لیکن بہت کم ایسے لوگ تھے جنھوں نے بحر المحبت کو خود دیکھا ہو۔ یہ جناب عبدالماجد صاحب
کا احسان ہے کہ اس نادر الوجود ادبی یادگار کو اُنھوں نے نہایت خوبی سے حال میں طبع کرایا ہے
اوّل ایک مختصر دیباچہ، پھر مقدمہ اور اس کے بعد ایک مفصل تبصرہ ہے جس میں یہ دکھانے کی کوشش
کی گئی ہے کہ بحر المحبت شاید دریائے عشق سے بھی بہتر ہے۔ شاید کا لفظ اس لیے استعمال کیا جاتا ہے
کہ خود جناب عبدالماجد صاحب کو بھی اپنی رائے پر پورا وثوق نہیں معلوم ہوتا۔ اس لیے کہ دونوں
مثنویوں کا بالتفصیل مقابلہ کرنے کے بعد اُنھوں نے اپنا فیصلہ ان الفاظ میں قلمبند فرمایا ہے:-

"تصریحات بالا سے معلوم ہوا ہوگا کہ میر و مصحفی دونوں نے ایک ہی بحر میں شناوری کی
ہے۔ میر کی افضلیت و اولیت تمام اردو شاعروں کے مقابلہ میں مسلم ہے، لیکن اس مخصوص
میدان میں جیسا کہ اوپر کئی بار اشارہ کیا جا چکا ہے مصحفی کا پلہ جھکتا ہوا نظر آتا ہے، اس کا
سبب خواہ یہ ہو کہ اُن کے سامنے ایک نمونہ پیشتر سے موجود تھا اور نقش ثانی ہمیشہ نقش اول
کے مقابلہ میں آسان تر و بہتر ہوتا ہے، خواہ کچھ اور ہو واقعہ بہر صورت یہ ہے کہ مصحفی کی
مصوری مقتضائے حال سے قریب تر اور جذبات بشری کے زیادہ مطابق ثابت ہوئی۔
بایں ہمہ میر پھر میر ہیں۔ اُن کے قلم سے متعدد اشعار اس قدر دلنشیں اور ڈھلے ہوئے
نکلے ہیں، اور جن میں اس مخصوص افسانہ سے قطع نظر کر کے عام واردات قلب اس خوبی
سے بیان کیے گئے ہیں کہ بے اختیار زبانوں پر چڑھ جاتے ہیں۔"

واقعات اور بڑی حد تک طرز بیان چونکہ ایک ہے اس لیے مقابلہ کا بہت موقع ہے جس سے
جناب مرتب نے کافی فائدہ اُٹھایا ہے لیکن بہت کم ایسے مواقع ہیں جہاں مصحفی کی برتری ثابت ہو گئی
ہو۔ اور ایسے مقامات بھی بہ کثرت نظر آتے ہیں جہاں مصحفی کا بیجا طول یا بے لطف بیان بغیر نقل کیے

چھوڑ دیا گیا ہے۔ حسین بیتی۔ درویش پریس۔ دہلی قیمت ۸ ر

حکیم سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی کی یہ تازہ تصنیف ہے جو واقعات کربلا و حادثۂ شہادت کے بیان میں اُنھوں نے حال میں مثنوی کی بحر میں مرتب فرمائی ہے اور جس کو ملا محمد الواحدی صاحب نے شائع فرمایا ہے۔ چار جزو کی مثنوی چھوٹی نہیں ہوتی اور جناب فراق نے ان صفحات میں کربلا کے واقعات پر شاعرانہ حیثیت سے خوب گلفشانی کی ہے۔ زبان صاف اور بیان موثر ہے۔ خواہ مرثیہ کے طرز سے بہتر ان واقعات کے لیے کوئی دوسرا انداز بیان نہ ملے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ کربلا کے چند واقعات کو جس طرح وسعت دی گئی ہے اور جس طرح نئے اسلوب اور نئے انداز سے اس کی اشاعت اور اس کے مظاہرے ہوتے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے تعجب ہوتا اگر مثنوی کے عام فہم سلیس اور رواں بحر کو اس داستان کے لیے انتخاب نہ کیا جاتا۔

مجموعہ کلام جوہر (طبع ثانی) مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ قیمت ۶ ر

مولانا محمد علی مدظلہ کا مجموعہ کلام جس میں زیادہ تر غزلیں ہیں پہلی مرتبہ مکتبہ جامعہ ملیہ نے ماہ دسمبر میں شائع کیا تھا جو اپنی خوبی و دلکشی و نیز کلام کی مقبولیت و عام عقیدتمندی کے باعث ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا۔ کارپردازان مکتبہ نے اب دوسرا اڈیشن شائع کیا ہے جس میں علاوہ دوسری خوبیوں کے ایک گرانبہا اضافہ عبدالماجد صاحب بی۔ اے کے قابل قدر مقدمہ کی صورت میں ہوا ہے۔ عبدالماجد صاحب نے علاوہ مولانا کے کلام کے ریویو کرنے کے اُن عظیم الشان انقلابات کا بھی ذکر کیا ہے جو مولانا کی سیاسی زندگی میں خاص اہمیت رکھتے ہیں، اس کے علاوہ مذہبی و سیاسی مباحث کے بعض نکات پر اس طرح خامہ فرسائی کی ہے کہ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہے۔

مولانا کے کلام کے متعلق اُن کا ایک جملہ ملاحظہ ہو۔

"محمد علی کا اصلی موضوع حُسن کی رعنائی، جمال کی زیبائی نہیں، بلکہ وہ دل کی چوٹ، عشق کی تڑپ، جذبات کے سوز کو سامنے لاکر کہہ دیتا ہے، اور یہی اُس کے کلام کی تاثیر کا راز ہے آقا لاکھ کریم و فیاض ہو، اُس کے بیان میں وہ درد و اثر کیسے پیدا ہو سکتا ہے جو غلام کی جانب سے

محتاجی و درماندگی کے عرض حال میں ہوگا"
اوّل ابتدائی کلام ہے جس میں بعض غزلیں زمانۂ طالب علمی علیگڈھ کالج (۱۹۰۰ء) کی شامل ہیں۔
س کے بعد وہ مجموعہ ہے جو اس سے قبل بھی شامل ہو چکا ہے۔
آخر میں کلام جدید کے عنوان سے وہ تمام غزلیں ہیں جو حال میں بیجاپور جیل میں تصنیف ہوئی
ہیں اور ایک زندانی کی واردات قلب ہیں۔ وہ زندانی جو ہندوستان کی آب ہو میں
ن آزاد روح کے لیے قید و بند کی پابندیوں کو نام نہاد آزادی سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔
مجموعہ جیبی تقطیع پر نہایت خوشنما چھپا ہے۔ سرورق رنگین و نہایت دیدہ زیب ہے۔ شروع میں مولانا
محمد علی صاحب کا دستخطی فوٹو ہے جو مقدمہ کراچی کے دوران میں لی گئی تھی اور اس اعتبار سے
گویا اُن کی تازہ ترین تصویر ہے۔ حجم ۵۰ صفحہ سے زاید ہے۔ قیمت ۶ر
درویش، پندرہ روزہ رسالہ۔ اڈیٹر ملا محمد الواحدی دہلی چندہ سالانہ دو روپیہ عہ۔
رسالہ خطیب کی قدیم تقطیع پر "درویش" نئی آب و تاب سے حال میں شائع ہوا ہے دو نمبر اس وقت
تک نکل چکے ہیں جو ترتیب مضامین، خوبی کتابت و طباعت کے لحاظ سے بلاشبہ قابل داد ہیں
رسالہ کی حیثیت مذہبی و تمدنی ریفامر کی ہے لیکن سیاسیات و ادبیات نیز علوم و فنون کے متعلق
بھی کافی دلچسپ مضامین ہوتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی صاحب کے زور قلم کا جولانگاہ اس
وقت "درویش" معلوم ہوتا ہے اور چونکہ خواجہ صاحب کو مسئلہ تبلیغ اسلام سے اس زمانہ
میں بہت دلچسپی رہی ہے اس لیے "درویش" کے متعدد صفحات اسی مبحث سے پُر ہوتے ہیں
مقالات، سیاسیات، مواعظ حسنہ، اصلاح اعمال، قصص، خرافات وہ عنوانات ہیں جو
ہر اشاعت میں نظر آتے ہیں اور اکثر نامور اہل قلم کے قابل قدر مضامین پیش کرتے ہیں۔ تجلیات
البتہ خواجہ حسن نظامی صاحب کے مخصوص انداز میں اُنھیں کے قلم سے جلوہ افگن ہوتی ہیں
ملا محمد الواحدی صاحب کی ادارت میں جو رسالہ بھی شائع ہو اُس کے متعلق کسی بد مذاقی
کا تو تصور بھی نہیں ہو سکتا لیکن موضوع کے اختلاف سے ممکن ہے کہ مختلف طبائع کے لیے وہ

یکساں دلچسپ ہو۔ لیکن "درویش" کے متعلق بلا خوف و تردید کہا جا سکتا ہی کہ وہ ہر طبقہ و ہمذاق کے علم دوست حضرات کے لیے دلچسپی کا سامان رکھتا ہے اور ۴۰ صفحہ کا حجم اور مضامین کی خوبی دیکھتے ہوئے قیمت دو روپیہ سالانہ بہت کم معلوم ہوتی ہی۔ ہمیں یقین کامل ہی کہ رسالہ خاطر خواہ کامیابی حاصل کرے گا۔

لسان الملک۔ اڈیٹر سید محمد ضامن کنتوری و سید منظر علی اشہری

مطبوعہ عماد پریس حیدر آباد قیمت سالانہ ۵ر ریاست حیدر آباد سے یہ دوسرا رسالہ ہی جو نہایت خوبی کے ساتھ حال ہی میں شائع ہوا ہی اور جس کا پہلا نمبر ہمارے پیش نظر ہی۔

حیدر آباد کو وضع اصطلاحات کے سلسلہ میں وضع الفاظ کا بھی موقعہ ہاتھ آجاتا ہی اس لیے وہاں کے کاغذات و اخبارات میں نئے الفاظ نظر پڑتے ہیں مجلس "تقدم العلوم" کے عنوان سے ایک علمی انجمن کی بنیاد ڈالی گئی ہی اور اُسی کے زیر نگرانی "لسان الملک" کا اجرا عمل میں آیا ہی۔

یہ رسالہ ۲۶ × ۲۰ سائز اور سفید کاغذ پر اچھا صاف چھپا ہی حجم چار جزو ہی۔ مضامین میں نوع کا خاص اہتمام ہی تاریخ، فلسفہ، ادب، ہر قسم کے مضامین قابل مضمون نگاروں کے قلم سے شائع ہوئے ہیں جہاں "اردو بل" ایسے ٹھوس مضامین ہیں وہاں فسانہ و ادب لطیف کو بھی جگہ دی گئی ہی۔ امید ہی کہ دو چار نمبر دیکھنے کے بعد ہم اُس کے متعلق بہتر رائے قائم کر سکیں گے۔

کلام اقبال

(خاص "جامعہ" کے لیے مرحمت فرمایا)

علامہ اقبال کی نظر لطف کا یہ ثمر اولین ہے جس کو ہم کمال افتخار و انبساط کے ساتھ آج جامعہ میں شائع کرتے ہیں، شکر نعمت و اظہار عقیدتمندی کے لیے الفاظ کہاں سے آئیں کہ جذبات دلی کی ترجمانی کر سکیں۔ لیکن یہ توقع بیجا نہیں کہ مولانا محمد علی مدظلہ کی تشریف آوری کے بعد ہم کو اس بار سے سبکدوشی ہو جائے گی اس لیے کہ ڈاکٹر صاحب اس وقت جو کچھ عنایت فرمائیں گے وہ ملک کا عطیہ ہوگا محض ہماری خاطر نہیں۔ - مدیر

عرب از سرشک خونم ہمہ لالہ زار بادا
عجم رمیدہ بو را نفسم بہار بادا

حذر از خرد کہ بندد ہمہ نقش نامرادی
دل ما برد بسازے کہ گسستہ تار بادا

نہ بہ جادہ قرارش نہ بہ منزلے مقامش
دل من مسافر من کہ خداش یار بادا

تپش است زندگانی تپش است جاودانی
ہمہ ذرہ ہائے خاکم دل بے قرار بادا

تو جوان خام سوزے سخنم تمام سوزے
غزلے کہ مے سرایم بتو سازگار بادا

چو بجان من در آئی دگر آرزو نہ بینی
مگر اینکہ شبنم تو یم بے کنار بادا

(اقبال)

جامعہ ملیہ

(نتیجہ فکر جناب سید نواب علی صاحب ایم۔ اے۔ پروفیسر بڑودہ کالج)

مندرجۂ ذیل نظم "جامعہ ملیہ" کی وہ تحسین ہے جو ناشناسوں کے قلم سے نہیں بلکہ ایک نکتہ سنج کی زبان سے ادا ہوئی ہے نیز سید صاحب کی یہ عنایت اُس غائبانہ و بے منت شفقت کا تقاضہ ہے جو داد طلبی کجا، دنیا کی اکثر نعمتوں سے زیادہ عزیز و بالطف ہے۔ مدیر

جامعہ چرچے ترے اب جابجا ہونے لگے
آئینہ جوہر ترے نام خدا ہونے لگے

درد ملت دل میں، سودائے محبت سر میں ہے
چاہنے والے ترے تجھ پر فدا ہونے لگے

کامیابی کے لیے دیوانگی اک شرط ہے
کیوں نصیب دشمناں عاقل بھلا ہونے لگے

سیکھ لیں بیتابیوں سے تیری چشمک برق کی
وہ جو جگنو کی طرح جلوہ نما ہونے لگے

مسلم اے بندہ خدا کے کچھ تو غیرت چاہیئے
بت کے جو بندے تھے وہ بھی باخدا ہونے لگے

زندہ باد اے "جامعہ" تو ہے حیاتِ طیبہ[۱]
تھے جو فرسودہ طریقے وہ فنا ہونے لگے

[۵۲]والضحٰے سے ہو گیا نواب پھر روشن ہمیں
وہ جو تھے بھٹکے ہوئے خود رہنما ہونے لگے

---

[۱] اس میں آیۂ شریفہ فَلَنُحْیِیَنَّهٗ حَیَاةً طَیِّبَةً کی طرف اشارہ ہے۔

[۵۲] اس میں آیۂ شریفہ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی کی طرف اشارہ ہے۔

شذرات

آج متمدن دنیا کا ہر فرد اور مغربی ممالک کے تمام ممتاز مدبرین جن کو سیاسیات مشرق سے کچھ بھی تعلق ہو اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ آل عثمان کی عظمت گزشتہ کو دوبارہ حاصل کرنے میں لازین کانفرنس سے زیادہ کامیاب اور جنرل عصمت پاشا سے بہتر وکیل کوئی ثابت نہیں ہوا۔ خدائے کارساز کی رحمت کاملہ کے جو منظر ان مجالس اور اس میدان میں نظر آئے اُن کے لیے ایک مدت سے آنکھیں بیتاب تھیں اور خدا کا شکر ہے کہ دنیائے اسلام کی یہ کامیابی ہی نہیں بلکہ لائڈ جارج، لارڈ کرزن اور اُن کے رفقا نے بھی وہ سب کچھ دیکھا جس کو وہ نہ دیکھنا چاہتے تھے۔

بلاشبہ یہ تاریخ کا پہلا موقع ہے کہ مسلمانوں نے دول اتحاد سے بالکل مساویانہ صلح کی ہے" (سر آغا خاں) اور اس میں بھی شک نہیں کہ یہ عظیم الشان کامیابی محض ترکوں ہی کی نہیں بلکہ ترکوں کے ذریعے تمام ایشیا کے فتح قرار دیجائے تو بیجا نہیں۔

مولانا محمد علی مدظلہٗ کی رہائی محض ایک واقعہ کی حیثیت نہیں رکھتی کہ اُس پر صحافی طرز میں چند سطور لکھ دی جائیں بلکہ شوق و عقیدت کی فراوانی، طوفان تکلم و ذوق خامہ فرسائی دونوں سے بے نیاز، جوش عقیدت نہ اظہار جذبات کی تاب لاسکتا ہے اور نہ خیر مقدم کے رسمی قیود سے اُس لطف خاص کو بے مزہ کرنے پر آمادہ ہے جو محض مولانا کی زیارت اور ع

"وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے" کے بلیغ و نشاط انگیز الفاظ میں مضمر ہے:

یوں تو انتظار کے دن اور بیقراری کی راتیں اِن دو برس میں بارہا آئیں اور گزر گئیں لیکن اس مہینے کی بیقراریاں اور انتظار کی گھڑیاں کچھ عجیب شان محبوبی رکھتی تھیں، اطلاع رہائی پر بعض حضرات نے دیوان حافظ کھولا تو یہ غزل نکلی۔

در نمازم خم ابروے تو چوں یاد آمد | حالتے رفت کہ محراب بفریاد آمد
از من اکنوں طمع صبر و دل ہوش مدار | کاں تحمل کہ تو دیدی ہمہ بر باد آمد
بادہ صافی شد و مرغان چمن مست شدند | موسم عاشقی و کار بہ بنیاد آمد
اے عروس ہنر از دہر شکایت منمے | حجلہ حسن بیارائے کہ داماد آمد
بر زلیخا ستم اے یوسف مصری مپسند | زانکہ از عشق بر او اینہمہ بیداد آمد
دلفریبان نباتے ہمہ زیور بستند | دلبر ماست کہ با حسن خدا داد آمد
زیر بارند درختاں کہ تعلق دارند | اے خوشا سرو کہ از بند غم آزاد آمد

مولانا نے زندان فرنگ سے ایسے وقت قدم باہر نکالا ہی کہ ملک کی آب و ہوا جیل کی تنگ تاریک فضا سے بھی زیادہ مسموم اور اہل ملک کی حالت زندانیوں سے بھی زبوں ہی لیکن مولانا کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں۔ بیتول جیل کا دروازہ جب اُن کے لیے کھلا تھا تو زمین پنجاب اور واقعہ جلیانوالہ باغ کسی خیر مقدم و تقریب تہنیت کی دعوت نہیں دے رہے تھے بلکہ اُن آنے والے طوفانوں کی طرف اشارہ کر رہے تھے جو بالآخر برپا ہوئے اور انجام کار کراچی اور بیجاپور کی آبادی کا بھی باعث بنے۔ اُس وقت مولانا نے جیل سے نکلتے ہوئے یہ شعر پڑھا تھا

یوں قید سے چھٹنے کی خوشی کس کو نہ ہو گی | پر تیرے اسیروں کی دعا اور ہی کچھ ہی!

آج بھی وہ اسی طرح اُن کے حسب حال ہی جس طرح اسی غزل کا دوسرا شعر جو صدارت مسلم لیگ کی طرف اشارہ کرتا ہی' اور مولانا کی موجودہ حیثیت یعنی منتخب شدہ صدر انڈین نیشنل کانگریس کے لیے بھی یکساں موزوں ہی۔

یہ صدر نشینی ہو مبارک تجھے جوہر
لیکن صلۂ روز جزا اور ہی کچھ ہی!

یورپ نے علوم شرقیہ کی تحصیل و تحقیق میں جو ناموری حاصل کی ہے محتاج بیان نہیں۔ فرانس، جرمنی
اور ہالینڈ نے جو مستشرق پیدا کیے ان کی تحقیقات علمیہ کے آگے خود فضلائے مشرق کو سر تسلیم
خم کرنا پڑا ہے۔ افسوس ہے کہ اس بزم میں انگلستان کی کرسی بہت نمایاں نظر نہیں آتی۔ اگرچہ
مصر اور ہندوستان کے دیرینہ اور حاکمانہ تعلقات کے سبب سے اسے اس مجلس میں چمکنے کا
موقع ہر ملک سے زیادہ تھا۔ یوں تو آجکل ولایت میں لائق ہندوستانی طلبہ کی بدولت مستشرق
کا لقب بہت گراں نہیں۔ پھر بھی انگلستان کے معدودے چند شائقین علوم مشرقی میں سر جیمس لائل
کی ذات مغتنم روزگار تھی۔ افسوس ہے کہ ادبیات عربی کا یہ شیدائی بھی سنہ ۱۹۲۰ء میں ۷۶ سال
کی عمر میں راہی ملک عدم ہو گیا اور انگلستان کو علمائے زبان عربی سے خالی کر گیا۔ جب ہم یہ خیال کرتے
ہیں کہ اس شخص کو تین سال ہندوستان کے نظم حکومت میں اور بارہ سال انڈیا آفس میں نہایت
مصروف زندگی بسر کرنا پڑی ہے تو اس کی تحصیلات اور تحریرات پر سخت حیرت ہوتی ہے۔ اپنی فرصت
کے گھنٹے اس نے عربی نظموں کے مطالعہ پر صرف کیے اور اس کمال سے ان کے ترجمے کیے کہ جرمنی
کی علمی مجلس ڈی ایم جی کا اعزازی ممبر بنایا گیا اور سٹراسبرگ یونیورسٹی کے ڈاکٹر آف فلاسفی
کی اکسفرڈ کے ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگریاں عطا ہوئیں۔ ان کی دو تالیفات نے انھیں
زندہ جاوید بنا دیا ایک تو سبعہ معلقہ، قصائد اعشیٰ، مالعہ عبید بن الابرص کی تحتی دوسرے مفضلیات
کے متن و ترجمہ و حواشی کی اشاعت۔ ان کے علاوہ ان کی مرتبہ کتب ذیل قابل ذکر ہیں۔
دیوان عبید بن الابرص اسدی۔ دیوان عامر بن الطفیل، عامر بن صعصعہ جو دنیا میں پہلی
مرتبہ برٹش میوزیم کے قلمی نسخوں سے مرتب کر کے مع ترجمہ و حواشی شائع ہوئے۔ کلام عمر
بن قمیئہ کی تدوین و ترجمہ۔ کلام جاہلیین کا ترجمہ مع مقدمہ و حواشی دوسرے تراجم کے
مقابلہ میں نہایت مستند تسلیم کیا جاتا ہے اور بہت مقبول و مشہور ہے۔ ان اشعار عرب کی

ترتیب ترجمہ تحشیہ کے علاوہ جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں ان کے بہت سے عالمانہ و محققانہ مضامین شائع ہوئے۔ مثلاً قدیم کلام عرب کی مصوری، قدیم کلام عرب اور معلومات تاریخی کی حیثیت سے، قدیم کلام عرب کا تعلق عبری ادبیات تورایت سے، نابطہ شرار کے چار قصائد۔

سرلایل کی علمی زندگی میں نوجوانان مشرق کے لیے سخت عبرت و بصیرت پوشیدہ ہے جن کو ہمیشہ علمی مشاغل کے لیے وقت کی کمی اور افکار دنیاوی کی زیادتی کی شکایت رہتی ہے مگر سرلایل کے سیاسی اور انتظامی فرائض کے ساتھ یہ دماغی مشقت ایسے عذرات کو ہیچ کیے دیتی ہیں۔

بقدر الکد تکتسب المعالی ومن طلب العلی سھر اللیالی

ماہ جون میں ہم نے مولانا محمد علی کی ایک غزل کا عکس شائع کیا تھا تاکہ لطف کلام کے ساتھ اُن کے سواد خط سے بھی ناظرین محظوظ ہو سکیں ہمیں اپنی اس خدمت کی داد ایک خریدار سے جن الفاظ میں ملی ہے اُس کو بجنسہ نقل کیے دیتے ہیں اور اپنے ناظرین کی سخن فہمی سے امید ہے کہ وہ اس معمہ کو حل کر سکیں گے۔

"جامعہ ۲ موصول ہوا، افسوس ہے کہ صفحۂ اول میں" تحریر دستخطی خاص جناب مولانا محمد علی مدظلہ"، جو شائع ہوئی تھی وہ کاٹ لیکر اس کے بجائے ایک قلمی غزل بعنوان "غزل دیگر" لگائی گئی ہے جو ۹ بیتوں پر مشتمل ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

بے خوف غیر دل کی اگر ترجماں نہ ہو
بہتر ہے اس سے یہ کہ سرے سے زباں نہ ہو

براہ کرم وہ تحریر خاص ضرور بھیجیے اور تحقیق کیجیے کہ کس انسان کی یہ کارروائی ہے؟ تاکہ آیندہ ایسی شرمناک کارروائیوں کا انسداد ہو۔"

یورپ کے ساتھ جب مذہبیت کا ذکر ہوتا ہے تو بالعموم اس سے مراد کسی ایسی جدت سے ہوا کرتی ہے جس سے مذہب پرست لوگ قطعاً نا آشنا ہوں چنانچہ حال میں نیویارک (امریکہ) کے مقام بروکلین میں چند عیسائی، یہودی اور مسلمان اشخاص نے باہم ملکر ہر سہ مذاہب کی ایک متحدہ انجمن قائم کی ہے سوسائٹی مذکور کا آغاز اگرچہ گزشتہ ماہ دسمبر میں ہوا لیکن اس کا اعلان ابھی حال میں بروکلین کی "مجلس موسیقی" کے ایک جلسہ عام میں کیا گیا ہے۔ انجمن کے صدر ریورنڈ الفرڈ بے مینی ہیں۔ ان کے خیال میں ان کی یہ کوشش جو وہ "توحید کے قائل تین بڑے مذاہب کی انجمن قائم کرنے کے لیے فرما رہے ہیں تعصب کے مٹانے اور تمام معتقدات و رمذاہب میں یگانگت پیدا کرنے کی ایک بڑی تحریک ہوگی" انجمن نے جو مقصد پیش نظر رکھا ہے وہ یہ کہ "مسائل متفقہ پر مزید زور دیا جائے اور جن امور میں اختلاف ہے انھیں مٹایا جائے"

ان نا آشنایان دین ومذہب سے کوئی پوچھے کہ اس سعی لاحاصل سے کیا نتیجہ۔ اس اتحاد و یگانگت کی کیا ضرورت۔ یہ تینوں مذہب نہ تو کوئی جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں اور نہ ہر ایک دوسرے سے کوئی غیر متعلق وجود ہے۔ بلکہ یکے بعد دیگرے ایک دوسرے کی تکمیل کو آیا اسلام اس سلسلہ کی آخری کڑی تھا اس ترتیب کا ذکر آج سے تیرہ سو برس قبل بہ بانگ دہل کیا جا چکا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ — بے شک ہم نے توریت نازل کی جس میں ہدایت اور نور ہے۔ ۵/۱

آگے چلکر یہ بیان کرنے کے بعد کہ کس طرح سے یہودیوں نے احکام توریت کو پامال کیا خدا تعالیٰ نے انجیل کے نزول کا ذکر فرمایا۔

وَقَفَّيْنَا عَلٰٓي اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا — اور بعد کو ان ہی کے قدم بقدم ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو چلایا کہ وہ تورات کی جو ان سے پہلے بھی تصدیق کرتے تھے اور ان کو ہم نے انجیل دی

بَیْنَ یَدَیْہِ مِنَ التَّوْرَاۃِ — جس میں ہدایت اور نور ہے اور توریت جو اس سے پہلے

وَ ھُدًی وَّ مَوْعِظَۃً لِّلْمُتَّقِیْنَ — سے موجود تھی یہ انجیل اس کی تصدیق بھی کرتی ہے اور

۸ ع — پرہیزگاروں کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے۔

توریت کی طرح جب انجیل کے احکام کی بھی نافرمانی کی گئی اور دنیا ظلمت و تیرگی کا گھر بنی ہوئی

تھی اس وقت اس سلسلہ کی آخری کڑی آئی اور خدا تعالےٰ نے اس طرح ارشاد فرمایا۔

وَ اَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الْکِتَابَ بِالْحَقِّ — اور اے پیغمبر ہم نے تمہاری طرف کتاب برحق اُتاری

مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ مِنَ — کہ جو کتابیں اس کے پہلے سے ہیں ان کی تصدیق کرتی ہے

الْکِتَابِ وَ مُھَیْمِنًا عَلَیْہِ ۵ ع — اور ان کی محافظ بھی ہے۔

---

۲۶ اگست کی تاریخ ہندوستان کے ہر گوشہ میں فیصلہ کینیا پر بطور احتجاج کے منائی گئی۔ کینیا کیا ہے؟ کہاں ہے؟ مسئلہ کینیا سے کیا مراد ہے؟ فیصلہ کی کیا نوعیت ہے؟ ان کے جوابات کے لیے ان صفحات میں گنجائش نہیں لیکن مختصراً یہ کہنا کافی ہوگا کہ کینیا جنوبی افریقہ کے شرقی ساحل پر ایک نوآبادی ہے جہاں پر کچھ عرصہ قبل ہندوستانی کثیر تعداد میں بہ "تلاشِ روزگار" جاکر بس گئے۔ اسی طرح کچھ باشندگان فرنگ بھی اپنا وطن مالوف چھوڑ کر وہاں بس گئے لیکن ان کا مقصد "تلاشِ زر" تھا۔ اس اجتماع اضداد یعنی "سفید و سیاہ" "زر و محنت" کے فرق کو نمایاں کر دیا۔ ہندوستانیوں اور یورپینوں کے علاوہ بعض دوسرے ممالک کے باشندے بھی آباد ہیں ان کے نام اور اعداد ذیل میں ملاحظہ ہوں۔ سنہ ۱۹۴۸ء کی مردم شماری کے مطابق

یورپین	۹۰۶۵۱
ہندوستانی	۲۲،۸۲۲
عرب	۱۰۰،۱۰۲
افریقی	۲۵،۵۰۰۰۰۰

ان اعداد کو پیش نظر رکھکر وہاں کی حکومت میں ان کا جو عنصر ہے وہ بھی دیکھیے۔

	ممبران
یورپین	۱۱
ہندستانی	۵ "
عرب	۱ منتخب ممبر علاوہ سرکاری نامزد کے
افریقی	۱ غیر سرکاری نامزد ممبر جو وہاں کے مسیحی مشنریوں میں سے منتخب کیا جاتا ہے

اعداد بالا سے صاف ظاہر ہے کہ ہندوستانی اور یورپین آبادی میں ۲ : ۱ کی نسبت ہے اور حکومت میں ۱ : ۲ کی ہے یعنی نمایندگی کا تناسب ۱ ہندوستانی بمقابلہ ۴ یورپین کے ہے اور جبکہ ایک جماعت جمع مال کے لیے ہمہ تن مصروف ہو اور حکمران طبقہ کی ہم قوم ہم مذہب اور ہمرنگ بھی تو پھر ایسی صورت میں ان مشکلات کا پیش آنا ایک لابدی امر تھا۔ جب کبھی حکومت "نوآبادیات میں بلند مقامات ہندوستانیوں کو دیے جانے" اور "انتخاب عام" کا سوال آتا، اس وقت یورپین باشندے تیغ و تفنگ کی دھمکی دیتے۔ لیکن باوجود اس کے اب کے بار امپیریل کانفرنس کے رزولیوشن کے مطابق امید تھی کہ وہاں کے ہندوستانی باشندوں کے حقوق میں انصاف سے کام لیا جائے گا اور ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے گا۔ اسی کوشش میں ہندوستان سے ایک وفد گیا لیکن تمام امیدوں کے خلاف نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو ان کے جائز حقوق سے محروم رکھا گیا فیصلے سے سفید و سیاہ کا صاف امتیاز نظر آرہا ہے۔ ہندوستان متعجب ہے کہ اس کی پذیرائی کیوں نہ ہوئی لیکن شاید وہ اس حقیقت سے ناآشنا ہے کہ "جب تک وہ اپنے بند غلامی نہ توڑے، دوسرے کو آزاد نہیں کرا سکتا"

مندرجہ صدر شمار و اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی باشندوں سے بدتر حالت وہاں کے

جامعۂ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

کے

شعبہ تصنیف وتالیف کی شایع کردہ کتابیں

(۱) ازہار العرب - مؤلفہ مولانا سورتی — قیمت غیر مجلد ۸ر

(۲) تاریخ الامت - مصنفہ مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری — قیمت ۰ ۸ر

(۳) ایضاً (حصہ دوم) ۶ ۶ (حصہ سوم) — ” ” ۸ر

(۴) مبادی معاشیات - از پروفیسر ذاکر حسین خاں صاحب — ” ” عہ

(۵) اخبار الدولتین - از مولانا نیاز فتحپوری — (زیر طبع)

(۶) انتخاب کلام میر - مرتبہ مولوی نور الرحمٰن بی اے — (”)

(۷) خطبہ شیخ الہند - (بہ تقریب افتتاح جامعہ) — قیمت ۲ر

(۸) خطبہ مسیح الملک - حکیم اجمل خاں صاحب — ” ۲ر

(۹) انتخاب مضامین جوہر معہ تصویر — ” ۵ر

(۱۰) ترکوں کی کہانیاں — ” ۴ر

المشتہر

مہتمم مکتبۂ جامعۂ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

دیوان غالب اُردو

جس طرح نظم اُردو کی بہترین کتاب تسلیم کی جاتی ہے اسی طرح جو اڈیشن ہم نے خاص اہتمام سے جرمنی سے چھپوا کر منگایا ہے اُس کے متعلق بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس سے بہتر اُردو زبان میں آج تک کوئی کتاب طبع نہیں ہوئی نہایت نفیس ملائم سرخ جلد پر سنہرا کام ہے اندر مرزا صاحب کی رنگین تصویر ہے اور پھر مکمل دیوان مع قصائد و غزلیات و رباعیات اور اس کے بعد بیاض کے لیے سادہ اوراق دیئے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ قابل قدر خود مرزا غالب مرحوم کا لکھا ہوا مقدمہ ہے جو شروع میں درج ہے اس اڈیشن کی مقبولیت کی یہ حالت ہے ہم کو کسی طرح امید نہیں کہ شائقین تک پہونچ سکے بہر حال درخواست خریداری بھیجدیجئے تا کہ نام درج رجسٹر ہو جائے اور اس وقت نہیں تو دوسرے اڈیشن پر مایوسی نہو۔ قیمت صرف تین روپیہ ہے،

المشتہر

مہتمم مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ

اللہ اکبر

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

کا

ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ نور الرحمٰن

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

قیمت سالانہ للعہ

فہرست مضامین

جلد ۳	ماہ صفر ۱۳۴۲ھ مطابق ستمبر ۱۹۲۳ء		نمبر ۳
نمبر شمار	مضامین	مضمون نگار	صفحہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

جلد ۲	صفر ۱۳۴۲ھ مطابق ستمبر ۱۹۲۳ء	نمبر ۳

جرمنی کی تعلیمی زندگی

(۲) اعلیٰ مدارس

(ڈاکٹر فریڈرش ایرنٹ رایش نے خاص جامعہ کے لیے تحریر فرمایا)

پہلے مضمون میں ہم دکھا چکے ہیں کہ جرمن تعلیمات کی تاریخ میں یونیورسٹی نے کس قدر اہم حصہ لیا ہے۔ ساتھ ہی یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ مجموعی تعلیمی زندگی میں یونیورسٹی گویا قدامت پسند عنصر رہا کی ہے۔ جرمنی میں آجکل ایک درجن سے زیادہ یونیورسٹیاں ہیں جن میں سب سے قدیم قرون وسطیٰ میں قائم ہوئی تھیں اور بعض مثلاً (Frankfort) فرانکفورٹ اور ہمبرگ Hamburg بالکل حال میں معرض وجود میں آئی ہیں۔ علوم کے لحاظ سے یونیورسٹیاں چار (Faculties) شعبوں میں تقسیم ہوتی ہیں دینیات (پروٹسٹنٹ یا کیتھولک) فلسفہ (جس میں علم الالسنہ، سائنس اور ریاضی وغیرہ بھی شامل ہیں) قانون اور طب۔ بعض یونیورسٹیوں نے ریاضی اور سائنس کو فلسفہ سے الگ کر کے پانچواں مستقل شعبہ بنا دیا ہے۔ یونیورسٹیوں کا نظم و نسق ایک ریکٹر (ناظم) کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو جماعت اساتذہ میں سے ہر سال منتخب کیا جاتا ہے جماعت اساتذہ یا مجلس شوریٰ (Senate) مستقل پروفیسروں عارضی پروفیسروں پرائیویٹ درس دینے والوں اور لکچراروں

کا ملال ہوتا ہے۔ یقیناً یہ بہت ضروری بات ہے کہ اسکول کی پابندی اور نگرانی سے نکل کر دفعتاً جو (Academic) یونیورسٹی کی زندگی کی آزادی ملتی ہے اُس کا استعمال احتیاط کے ساتھ اور صحیح کیا جائے بہت سے نوجوان ابتدا میں اس بات کو نہیں سمجھتے اور اپنا سارا وقت لہو و لعب میں گزارتے ہیں، اس اعتبار سے انگلستان کی یونیورسٹیوں میں اپنے طالبعلموں کو تضیع اوقات سے بچانے کا بہتر انتظام ہے اور ان کے لیے دارالاقامے بھی مہیا کیے جاتے ہیں درآنحالیکہ کوئی جرمن طالبعلم یونیورسٹی یا "کالج" میں نہیں بستا ہے لیکن پھر بھی یونیورسٹی کی آزادی کا صحیح استعمال سیکھنا جرمنی میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ یونیورسٹی کے اکثر شعبوں میں بالخصوص سائنس میں تعلیم کا ایک جزو علمی سفر (Tour) بھی ہے

بالعموم طالبعلم لکچروں کے اہم حصوں کے متعلق ایک کاپی پر یادداشت لکھ لیتے ہیں۔ بعض پروفیسر اپنے درس کے ختم پر اس کا خلاصہ بھی لکھوا دیتے ہیں سب سے اہم علمی کام سیمینار میں ہوتا ہے۔ سیمیناروں میں داخلہ کئی (Term) کے بعد اور اکثر ایک مختصر سا امتحان لیکر کیا جاتا ہے۔ یہاں طالبعلم پروفیسر کی نگرانی میں اور اُس کی مدد سے اپنے مضمون میں پوری طرح کام کرتے ہیں اور انہیں علمی تنقید کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہاں ایک طرح سے امتحان کی ضروریات کے لیے طیاری ہوتی ہے۔ پروفیسروں اور طالبعلموں کے تعلقات تعلیم و تعلم سے گزر کر ذاتی دوستی تک بدقسمتی سے جرمن پروفیسروں کی عدیم الفرصتی اور کام کی بیحد کثرت کے سبب سے صرف بعض صورتوں میں پہونچ پاتے ہیں۔ یونیورسٹی کے طالبعلموں کو اُن معاملات میں جو خود اُن سے تعلق رکھتے ہوں (مثلاً جلسے اور جشن وغیرہ، ممالک غیر کے طالبعلموں کا مسئلہ ورزش جسمانی، پبلک تقریریں) بڑی حد تک خود مختاری حاصل ہے جس کا استعمال طالبعلموں کی پارلیمنٹ کرتی ہے جو ۱۹۱۸ء میں انقلاب کے بعد قائم ہوئی تھی۔ بدقسمتی سے جرمن طالبعلموں میں سیاسی اختلافات کے سبب سے سخت نااتفاقی ہے اور اس اعتبار سے سیاسی رواداری

پرشتمل ہوتی ہی۔ شعبوں کے صدر (Deacon) کہلاتے ہیں۔ معلمی کی کرسی پر وہ شخص جگہ
پاسکتا ہی جس نے ڈاکٹر کی سند حاصل کرنے کے بعد کوئی علمی تصنیف کامیابی کے ساتھ انجام کو
پہونچائی ہو یہ (ab BiBittenschritf) معلمانہ تصنیف کہلاتی ہی۔ پرائیویٹ درس دینے
والوں کو حکومت کی طرف سے کوئی مشاہرہ نہیں ملتا۔ چنانچہ صرف مرفہ الحال لوگ اس شغل کو اختیار
کرسکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے قیام اور ترقی کا مدار ظاہر ہی کہ محض اُن کی علمی قابلیت پر ہی۔ لیکچرار وہ
تنخواہ دار نائب ہیں جو یونیورسٹی میں ہر طرح کے علمی کام خصوصاً ممالک غیر کی زبانوں کے درس
کو انجام دیتے ہیں پروفیسروں کا تقرر وزارت تعلیم/معارف کی طرف سے ہوتا ہی۔

جرمن یونیورسٹیاں اپنے نشو و نما اور نظم و نسق کے لحاظ سے کتنی ہی قدامت پسند کیوں نہ ہوں
تاہم اُن کا وہ مخصوص حق جس پر اُنھیں ناز ہی پڑھنے اور پڑھانے کی آزادی ہی۔ یعنی یونیورسٹی
کا ہر معلم جس مضمون پر چاہے لیکچر دینے کا اعلان کرتا ہی۔ بہ خلاف اس کے ہر طالب العلم اپنی مرضی
سے فیصلہ کرتا ہی کہ کون کون سے لیکچر سُنے گا۔

پروفیسروں میں طالب علموں کی حاضری نہیں لیجاتی۔ اس معاملہ میں ہر طالب العلم اپنی ذاتی ذمہ داری
سے کام لیتا ہی جس کا حساب اُسے آخری امتحان کے وقت دینا ہوتا ہی جس میں ۸ سے لیکر
۱۲ ٹرم تک (۴ سے لیکر ۶ سال تک) لگتے ہیں۔ اصل میں یونیورسٹی کا صرف ایک امتحان
ڈاکٹر کی سند کے لیے ہی۔ یونیورسٹی میں تعلیم پانے کی اجازت عام طور پر ہائی اسکولوں
کے آخری امتحان (Abiturient) کے پاس کرنے پر ملتی ہی یعنی عام طور پر یونیورسٹی کے
داخلہ کا کوئی علحدہ امتحان نہیں ہوتا۔

پروفیسروں کے لیکچر جن کا اعلان سیاہ نوٹس بورڈ پر ہوتا ہی اکثر پرائیویٹ ہوتے
ہیں یعنی سامعین کو کچھ معاوضہ دینا پڑتا ہی۔ ان کے علاوہ بعض مختصر۔ عام۔ بلا معاوضہ
لیکچر ہوتے ہیں جو اکثر فنون لطیفہ یا عام علوم پر ہوتے ہیں۔ لیکچروں کے ساتھ ساتھ علمی
مشق کے کلاسوں کا (جو ایک طرح سے اسکول کے کام کا مزید سلسلہ ہیں) اور سیمیناروں

کا اعلان ہوتا ہی۔ یقیناً یہ بہت ضروری بات ہی کہ اسکول کی پابندی اور نگرانی سے
نکل کر دفعتاً جو (Academic) یونیورسٹی کی زندگی کی آزادی ملتی ہی اُس کا استعمال
احتیاط کے ساتھ اور صحیح کیا جائے بہت سے نوجوان ابتدا میں اس بات کو نہیں سمجھتے
اور اپنا سارا وقت لہو و لعب میں گزارتے ہیں، اس اعتبار سے انگلستان کی یونیورسٹیوں
میں اپنے طالبعلموں کو تضیعِ اوقات سے بچانے کا بہتر انتظام ہی اور ان کے لیے دارالاقامے
بھی مہیا کیے جاتے ہیں درانحالیکہ کوئی جرمن طالبعلم یونیورسٹی یا "کالج" میں نہیں رہتا ہی
لیکن پھر بھی یونیورسٹی کی آزادی کا صحیح استعمال سیکھنا جرمنی میں بڑی عزت کی نظر سے
دیکھا جاتا ہی۔ یونیورسٹی کے اکثر شعبوں میں بالخصوص سائنس میں تعلیم کا ایک جزو علمی
سفر (Tour) بھی ہی

بالعموم طالبعلم لکچروں کے اہم حصوں کے متعلق ایک کاپی پر یادداشت لکھ لیتے ہیں۔ بعض
پروفیسر اپنے درس کے ختم پر اس کا خلاصہ بھی لکھوا دیتے ہیں سب سے اہم علمی کام سیمینار میں
ہوتا ہی۔ سیمیناروں میں داخلہ کئی (Term) کے بعد اور اکثر ایک مختصر سا امتحان لیکر
کیا جاتا ہی۔ یہاں طالبعلم پروفیسر کی نگرانی میں اور اُس کی مدد سے اپنے مضمون میں پوری طرح
کام کرتے ہیں اور انھیں علمی تنقید کی تعلیم دی جاتی ہی۔ یہاں ایک طرح سے امتحان کی ضروریات
کے لیے طیاری ہوتی ہی۔ پروفیسروں اور طالبعلموں کے تعلقات تعلیم و تعلم سے گزر کر ذاتی
دوستی تک بد قسمتی سے جرمن پروفیسروں کی عدیم الفرصتی اور کام کی بیحد کثرت کے سبب سے
صرف بعض صورتوں میں پہونچ پاتے ہیں۔ یونیورسٹی کے طالبعلموں کو اُن معاملات میں جو
خود اُن سے تعلق رکھتے ہوں (مثلاً جلسے اور جشن وغیرہ، ممالک غیر کے طالبعلموں کا مسئلہ،
ورزش جسمانی، پبلک تقریریں) بڑی حد تک خود مختاری حاصل ہی جس کا استعمال طالبعلموں
کی پارلیمنٹ کرتی ہی جو ۱۹۱۸ء میں انقلاب کے بعد قائم ہوئی تھی۔ بد قسمتی سے جرمن طالبعلموں
میں سیاسی اختلافات کے سبب سے سخت نااتفاقی ہی اور اس اعتبار سے سیاسی رواداری

اور مخالفین کی رائے کی وقعت کے معاملہ میں اُنھیں ابھی بہت کچھ سیکھنا باقی ہے۔ جنگ کے بعد ضروریات زندگی کی بے انتہا گرانی کے سبب سے طالبعلموں کی مالی حالت روزمرہ بدتر ہوتی جاتی ہے۔ ان کی غالب تعداد کو آجکل کوئی پیشہ ضمنی طور سے اختیار کرکے تعلیم کے مصارف نکالنا ہوتا ہے۔ حالانکہ جنگ سے پہلے ان کے خاندان والے ان کی کفالت کیا کرتے تھے۔ مالی مصیبت میں علاوہ طالبعلموں کے خود دارالعلوم اور اُن کے علمی ذخائر بھی گرفتار ہیں۔ ان میں سے اکثر ضروری علمی رسالوں اور جدید ایجادات کو اُن کی گرانی کے سبب سے مہیا نہیں کرسکتے۔

بڑی سخت جنگ و جدل عورتوں کے یونیورسٹی میں داخلہ کے بارے میں ہوئی تھی یہاں تک کہ بیس سال ہوئے پہلے پہل عورتوں کو بہ حیثیت طالبعلم داخل کیا گیا۔ تاہم انفرادی حیثیت سے بعض پروفیسر کچھ دن پہلے تک عورتوں کو اپنے سیمناروں (Seminars) میں داخل نہیں کرتے تھے۔ عام طور پر عورتوں نے نہایت انہماک اور محنت کے ساتھ اپنی تعلیم کو اختتام تک پہونچایا ہے اور اکثر مردوں کے لیے کام کرنے کا عمدہ نمونہ پیش کیا ہے۔

جرمن طالبعلم اس بات کے لیے مشہور ہیں کہ انھیں نہایت مکمل طور پر علمی تربیت دی جاتی ہے جو انھیں تحقیق و تدقیق کے سرچشموں تک پہونچاتی ہے اور انھیں آزاد اہل نظر اور محقق بناتی ہے۔ عام طور پر لوگ متعدد یونیورسٹیوں میں تھوڑے تھوڑے دن رہ کر اپنی تعلیم پوری کرسکتے ہیں۔

طالبعلموں کے Union یونین جو خاص قواعد کے ماتحت باہمی رابطہ پیدا کرنے کی غرض سے قائم کیے جاتے ہیں صدیوں پہلے سے قائم ہیں۔ ان میں ہمیشہ سے گانے بجانے۔ شراب و کباب۔ تلواروں سے کشتا کھیلنے کا مشغلہ جاری ہے۔ آجکل بھی مختلف طرح کی انجمنیں موجود ہیں (Empire Corps یعنی ہم وطنوں کی جماعتیں جو اصل میں ایک ہی مقام میں رہنے والے طالبعلموں کی انجمنیں ہیں) اور معاشرتی سیاسی انجمنیں جو تقریباً سو سال پہلے حب وطن اور آزادی کی تحریک کے سلسلے میں قائم ہوئی تھیں جابجا موجود ہیں۔

قدیم طلبہ کی Union انجمنوں میں یارباشی اور تیغ آزمائی کی مشق نے جنگی غرض بہادری کو ابھارا تھا، حال میں کہیں کہیں مقابلۃً عیاشی اور قوائے ذہنی کو حرکت دینے والی صورتیں بھی اختیار کر لی ہیں اور جہاں وہ اپنی اصلی صورت میں باقی بھی ہیں وہاں ان پر فی نفسہ ادھم مچانے بدمستی اور لڑائی جھگڑے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان پرانی انجمنوں نے طالبعلموں کو علم مجلس اور رفاقت کی تعلیم دینے میں بڑا کام کیا ہے۔ ان کے مقابلہ میں نئی خشک اور سنجیدہ انجمنیں جو آزاد جرمن مجالس کے نام سے موسوم ہیں قائم ہوئی ہیں جنھوں نے شراب اور تمباکو کے استعمال اور ڈوئل کو بالکل ترک کر کے پیدل سیر و سیاحت، اسپورٹ اور بحث و مباحثہ کے ذریعہ سے تنگ حلقوں میں ایک نئی روح یارباشی کی پھونک دی ہے۔

ان انجمنوں کے ساتھ ساتھ تعلیمی، علمی اور سیاسی انجمنیں، اسپورٹ کلب، بے غرض جماعتیں اور بے نظام حلقے ہیں طالبعلموں کی غالب تعداد آجکل کسی پرانی یونین سے تعلق نہیں رکھتی صرف ان یونینوں کے ممبر مخصوص رنگ کی ٹوپیاں پہنتے ہیں اور رنگ برنگ کے فیتے سینے پر لگاتے ہیں۔ پرانے طالبعلموں کو ناولوں، ڈراموں اور چھوٹی لڑکیوں کو مخصوص دلچسپیوں کے حلقہ میں گھیر رکھا ہے۔ لیکن یہ دلچسپیاں اور جذبات پرستی اس مصروف زندگی اور کاروباری زمانے کے لیے کسی طرح موزوں نہیں۔

صدیوں سے یونیورسٹی کی اصلاح کے خیال پر زور دیا جا رہا ہے ابتک اس کے محض دو نتائج مترتب ہو سکے ہیں ایک تو عورتوں کا یونیورسٹی میں داخلہ اور دوسرے طلبا کی پارلیمنٹ کا قیام۔ بعض پروفیسروں کے دل میں سیاسی حیثیت سے پرانے خیالات ابتک نقش کالحجر ہیں۔ پچھلے انقلاب کی باگ بہ خلاف سو سال پہلے کے یونیورسٹی کے ہاتھ میں نہ تھی لیکن اب ایک تعداد باہمت نوجوان پروفیسروں کی یونیورسٹیوں میں پہونچ گئی ہے جو نئی حکومت کے خیال کی حامی ہے اور جن کے گرد نئے خیالات کے طالبعلموں کا ایک حلقہ ہے۔

یونیورسٹی کی اصلاح چاہنے والوں کی کوشش یہ ہی کہ بے جان مشین کی طرح کے نظام امتحانات کو بدلیں اور امتحانوں کی مخالفت ہمیشہ سے بڑھتی رہی ہی۔ لکچروں کی تعداد کم کیجائے اور مشق کے کلاسوں کے اوقات میں اضافہ کیا جاے اور علوم کو جن کی موجودہ تاریخ اور خاص شعبوں کی مہارت پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جاتا ہی اور جو نئے سرے سے ترتیب دئے گئے ہیں، اشتراکی اور (Communist) یونیورسٹی کے خلاف اسی حیثیت سے معرکہ آرا ہیں کہ یہ خالص سرمایہ داروں کا (Institution) ہی اور یہ لوگ علمی دولت کا فیض ہر فرد بشر کے لیے عام کر دینے کے حامی ہیں۔

اسی تحریک کی بنا پر ۱۹۱۹ء سے تمام شہروں میں وہ دارالعلوم جن کو لوگوں نے Volks hoch schulen عام لوگوں کی یونیورسٹی کا نام دے رکھا ہی قائم ہوئے ہیں جو عام علوم کے تمام شعبوں میں اوسط اور ادنی طبقہ کے لوگوں کو بلا امتحان کے تعلیم دیتے ہیں۔ اسی طرح سے برسوں پہلے وہ طالبعلم جو اشتراکیت سے متاثر تھے بڑے شہروں کے بے مایہ لوگوں میں اور گاؤں کے کسانوں میں جا کر ابتدائی تعلیم مثلاً حساب، ممالک غیر کی زبانوں، علم ادب اور تھیٹروں کے تماشوں وغیرہ کے ذریعہ سے تربیت مذاق کرتے ہیں۔ چنانچہ جینا۔ فرائی برگ۔ بادن اور میونک میں ساری یونیورسٹیوں کی خوبصورت عمارتیں جو تعمیر کے اعتبار سے محض سرمایہ والوں کے مذاق کے Facade اور علمی متانت سے نہیں بلکہ اشتراکیت کا احساس بھی ظاہر کرتی ہیں اس اعتبار سے ابھی اور تغیرات ہوں گے۔ یونیورسٹیوں کے پہلو بہ پہلو نئے ہاتھ بٹانے والوں کی حیثیت سے انیسویں صدی میں اعلی صنعتی مدارس قائم ہوئے ہیں جو مساوی داخلہ کے شرائط کے ساتھ سائنس، میکینکل اور ترقی انجنیری، فن تعمیر اور جہاز سازی وغیرہ کی تعلیم دیتے ہیں۔ اسے عظیم الشان معملوں کے سبب سے ان کو بڑی اہمیت حاصل ہوگئی ہی اور ان کی تعداد میں ہمیشہ اضافہ ہوتا جاتا ہی۔ طرز تعلیم اور نظم و نسق ان میں یونیورسٹیوں کے مطابق ہے۔

اگر اعلیٰ صنعتی مدرسہ کو یونیورسٹی کا سب سے چھوٹا بچہ کہا جائے تو اس کے کئی اور بھائی بہن ہیں مثلاً فنون لطیفہ کی اکاڈمی، موسیقی کا اعلیٰ مدرسہ لیکن یہ دونوں فن لطیف کے قدردان کے کام کے نہیں ہیں بلکہ یہ صرف ان لوگوں کے لیے ہیں جنھیں نقاشی تجسمہ سازی یا موسیقی کے خاص مناسبت ہو۔ گانے اور آرگن بجانے کی تعلیم کے لیے کلیسائی موسیقی کا اعلیٰ مدرسہ ہے اور خود یونیورسٹیوں میں بھی فن موسیقی پر عام لکچر ہوتے ہیں۔ اسی طرح تھیٹر کے مدرسہ میں ایکٹری کی تعلیم دی جاتی ہے لیکن اسے اعلیٰ مدرسہ کی حیثیت حاصل نہیں ہے ان میں سے اکثر کسی بڑے شہر کے تھیٹر سے ملحق ہوتے ہیں۔

تجارت پیشہ لوگوں کے لیے بھی کچھ دن سے ایک طرح کے پیشہ وری کے سے اعلیٰ تجارتی مدرسوں کے نام سے قائم ہوئے ہیں اور ان کی تعداد بڑھتی جاتی ہے اور یونیورسٹیوں کی طرح ان میں بھی لکچر اور سمینار کے کلاس کا خصوصاً اقتصادیات اور قانون میں انتظام کیا گیا ہے لیکن ان مدرسوں کے لڑکوں کا طالبعلموں میں شمار نہیں

اصل معنی میں اعلیٰ مدارس صرف یونیورسٹیاں، اعلیٰ صنعتی مدرسے، اکادمی ہیں لیکن ان کے بعد اس لفظ کے بہت وسیع معنی اختیار کر لیے گئے ہیں۔ دروس جسمانی اور جمناسٹک کے لیے بھی ایک مخصوص اعلیٰ مدرسہ برلن میں قائم ہوا ہے۔

سیاسی معلومات اور مدنیت کی تعلیم کے لیے حکومت نے ایک اعلیٰ سیاسی مدرسہ قائم کیا ہے جس میں ہر سیاسی پارٹی کے نمایندے لکچر دیتے ہیں تصور عالم رکھنے والی جماعتیں خیالات میں عبدویت اور ہندو فلسفہ سے مخلوط ہوتے ہیں اور اپنے خاص اعلیٰ مدرسے رکھتے ہیں دروس جسمانی اور فن لطیف کے مطابق رقص کے لیے بھی ایک دو مدرسے قائم ہیں جو ایک طرح کے پوشیدہ اعلیٰ مدرسہ ہیں۔

اس خاکہ سے جرمن اعلیٰ مدارس کے نظم و نسق اور یونیورسٹی کی زندگی کا کسی حد تک تصور حاصل ہو گیا ہوگا۔ یونیورسٹیاں اب تک عہد قدیم کے ستونوں کی طرح مستحکم کھڑی ہیں لیکن آجکل کے

موسم بہار کے طغیان ابر و باد سے گرتی ہوئی ہیں۔ علم النفس، تعلیمات، برقی کیمیا وغیرہ اور پرانے کلاسیکل پہلو بہ پہلو جگہ پاتے ہیں۔ صنعت و تجارت مستقل مضمون بننے کا استحقاق جتانے ہیں اشتراکیت کا نعرہ تعلیم عام کر لینے کے لیے قدیم علم و فضل، جمہوریت یونیورسٹیوں کے دروازہ سے ٹکرا رہا ہے۔ چنانچہ عین اسی زمانہ میں ہر چیز کے عضو عضو میں نئی زندگی کا احساس ہو رہا ہے اور نئی روح، نئے علوم اور زندگی سے آشنا علم و دانش پیدا کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔

گیتا

ہندوؤں میں جو مقبولیت اور وقعت گیتا کو حاصل ہے وہ ویدانت - سانکھیہ - نیائے وغیرہ ہندوستانی فلسفے کے کسی شعبہ کو نہیں حاصل ہے - مگر ساتھ ہی اس کے خرابی یہ ہے کہ گیتا کے مداحوں نے اس کی تعلیم کو ایک لاینحل معمہ بنا رکھا ہے - جس قدر اختلافات گیتا کے مطالب و نکات کے متعلق ہیں دنیا میں کسی تحریر یا تقریر کے متعلق نہیں ہیں - مختلف اشخاص نے مختلف شرحیں لکھی ہیں اور ہر شارح کے مقلدین کی ایک جماعت ہے جو دوسری جماعتوں کے بیان کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے بلکہ اُن پر غلط بیانی کا الزام لگاتی ہے - چنانچہ ایک گروہ سری شنکر اچاریہ کا مقلد ہے اور انھوں نے جو شرح لکھی ہے اُس کے مقابلہ میں تمام دوسری شرحوں کو غلط سمجھتا ہے - دوسرا گروہ وَلبھ کی شرح کو مانتا ہے - تیسرا رامانوج کا قایل ہے چوتھا مادھو کا مقلد ہے - پانچواں گروہ پنڈت گورہ گووندے کو صحیح سمجھتا ہے - چھٹا گروہ ارباب تھیاسوفی کا ہے جن کا خیال ہے کہ گیتا کے اصلی مطالب صرف مسز اینی بسینٹ کے (گیتا کے) انگریزی ترجمہ میں پائے جاتے ہیں - ساتواں گروہ اُن لوگوں کا ہے جو کسی طرح کے پابند نہیں ہیں بلکہ اپنی آزاد رائے رکھتے ہیں البتہ دوسری جماعتوں کی طرح اس بات کے قایل ضرور ہیں کہ گیتا کی تعلیم مکمل اور بے نقص ہے - آٹھواں گروہ بھی گیتا کے پڑھنے اور سمجھنے میں اپنی آزاد رائے سے کام لیتا ہے مگر اس کی تعلیم کو ناقص خیال کرتا ہے - ان حالات میں گیتا پر کوئی ایسا مضمون لکھنا جو ہر لحاظ سے جامع ہو اور ہر شارح کے نقطہ نظر سے مطابقت کر سکے ناممکن ہے بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ ایک ضخیم کتاب بھی اس مدعا کو بہت مشکل سے پورا کر سکتی ہے -

یہاں پر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قدر اختلاف آرا کا اصلی سبب کیا ہے ؟ حقیقت یہ ہے کہ گیتا کی تعلیم میں اکثر بے ربطی اور اجتماع ضدین پایا جاتا ہے اور اس کے اشلوک جابجا بعید مغلق ہیں - اس لیے ہر شرح لکھنے والے نے جداگانہ مطالب بیان کیے ہیں اور ہر شخص اپنے

مطلب کی بات نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔

بہرحال ان جھگڑوں سے قطع نظر کرکے میں گیتا کی تعلیم مختصراً قارئین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

گیتا کی تعلیم کے دو حصے ہیں۔ ایک فلسفیانہ۔ دوسرا مذہبی۔

فلسفیانہ حصہ میں خدا۔ روح اور جسم کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔

حقیقت خدا

گیتا کا وجود خداوندی کی تین صورتیں بیان کرتا ہے۔

پہلی صورت یہ ہے کہ خدا نرگن (تمام اوصاف و خواص سے معرا یعنی وجود محض) ہے اور کوئی فعل اُس سے صادر نہیں ہو سکتا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ خدا سارے عالم کا پیدا کرنے والا۔ قائم رکھنے والا اور نیست کر دینے والا ہے۔ اور عالم کا ہر جزو اس کے اندر ہے اور وہ عالم کے ہر جزو میں ہے۔ وہ سب سے اعلیٰ۔ برتر اور ہمہ گیر ہستی ہے جس کے اندر تمام ہستیوں کا وجود ہے اور وہ تمام عالم میں جاری و ساری ہے۔ ہر شے اُس میں ہے اور وہ ہر شے میں ہے۔ وہی نگاہ حقیقت بیں ہے جو اُس مالک کل کو موجودات کے ہر فرد میں یکساں طور پر موجود دیکھے۔

یہ عالم جس کو خدا نے پیدا کیا ہے چار قسم کے موجودات پر مشتمل ہے:—

(الف) قوائے دماغیہ:—

(۱) بُدھی (یعنی قوت فیصلہ)

(۲) اہنکار (یعنی احساس خودی)

(۳) مَن (یعنی قوت فکریہ)

(۴) حواس خمسہ علمیہ اور حواس خمسہ عملیہ

(ب) کوائف دماغی مثلاً خواہش۔ حظ۔ کرب وغیرہ

(ج) حواس علیہ کے محسوسات یعنی صورت۔ ذائقہ۔ بو۔ لمس۔ اور موت۔ اور
(د) عالم مادی جو خاک۔ باد۔ آب۔ نور۔ اور بسط سے مرکب ہے۔
یہ تمام عالم جو خدا کا مخلوق ہے بحیثیت مجموعی پراکرتی یا شیتر یعنی جسد خدا وندی کہلاتا ہے۔
اس پراکرتی کے علاوہ ایک اور پراکرتی ہے جس کا تعلق خدا سے ہے۔ اس کو اَوِیکتا۔ یا مول پراکرتی یا پرادھا کہتے ہیں۔ اس (یعنی مول) پراکرتی کو ماننے کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ گیتا کار کے قول کے مطابق خدا یا برہما خود نرگن ہے اور نہ تو عالم کو پیدا کر سکتا ہے نہ قائم رکھ سکتا یا مٹا سکتا ہے۔ لہذا اُس سے افعال صادر کرنے کے لیے ایک دوسری ہستی کی ضرورت ہوئی اور وہ مول پراکرتی یا پرادھا ہے۔ جب اس سے وہ متصادم ہوتا ہے تو خالق ہو جاتا ہے۔ چنانچہ برہما کہتا ہے۔ "اپنی پراکرتی پر قابو حاصل کر کے میں ان تمام ہستیوں کو بار بار پیدا کرتا رہتا ہوں۔" "پراکرتی میرے ذریعہ سے تمام متحرک اور غیر متحرک اشیاء کو پیدا کرتی ہے۔" "مہت برہما (یعنی مول پراکرتی) میرے لیے رحم کا کام دیتی ہے جس میں میں بیج ڈال دیتا ہوں اور اُس سے تمام چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔"
اسی طرح۔ گویہ کہا گیا ہے کہ خدا یا برہما اِس عالم کو نیست کر دینے اور مٹا دینے والا ہے۔ نیستی اور بربادی سے مراد تمام موجودات کا مول پراکرتی میں جذب ہو جاتا ہے۔
پس مول پراکرتی کی عدم موجودگی میں تخلیق و تخریب دونوں برہما کے لیے ناممکن ہے۔
اس دوسری صورت میں خدا سب کا دوست ہے۔ یا تمام مخلوقات کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتا ہے۔ نہ کسی سے نفرت کرتا ہے۔ نہ کسی سے محبت۔ وہ توبہ کو قبول کرتا ہے اور معافی دینے والا ہے اور قربانیوں سے خوش ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ تمام موجودات اور تمام کائنات کا مالک ہے وہ کرتو ہے۔ سوادہ ہے۔ جھاڑیوں کا پھول اور پھل ہے۔ مقدس کتاب ہے۔ اگنی ہے۔ قربانی ہے۔ اس عالم کی ماتا۔ پتا۔ خالق اور مالک ہے۔ اوم ہے منتہائے نظر ہے۔ نگہبان ہے۔ قیامگاہ ہے۔

جائے پناہ ہے۔ دوست ہے۔ وسیلہ ہے۔ حیات ابدی بھی ہے اور موت بھی۔ موجود بھی۔ اور معدوم بھی۔

وجود خداوندی کی تیسری نوعیت یہ ہے کہ بسا اوقات وہ اپنے کو انسانی صورت میں ظاہر کرتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے "گو کہ میں کسی سے پیدا نہیں ہوا ہوں اور لاانتہا ہی ہوں اور تمام موجودات کا مالک ہوں تاہم میں اپنی پراکرتی کو قابو میں لاتا ہوں اور اپنے مایا کے ذریعہ سے پیدا ہوں"۔ جب کبھی تقوٰی اور پرہیزگاری روبہ انحطاط ہوتی ہے اور فسق و فجور میں ترقی ہوتی ہے تو میں اپنے کو پیدا کرتا ہوں۔ "میں نیک کرداروں کی حفاظت۔ بدکرداروں کی تباہی اور لوگوں کو متقی بنانے کے لیے ہر زمانہ میں پیدا ہوتا رہتا ہوں"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برہما پراکرتی کے علاوہ مایا بھی رکھتا ہے اور یہاں پر مایا سے مراد وہ صفت خداوندی ہے جو اُس کو پیدا ہونے کے قابل بناتی ہے۔ گو حقیقتاً وہ کسی سے پیدا نہیں ہوا ہے مگر مایا کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور اپنی اصلیت اور حقیقت سے مختلف نظر آتا ہے ایک دوسرے موقع پر برہما کی اصلی شان میں بظاہر فرق پیدا کرنے والی چیز کو بجائے مایا کے یوگ کا نام دیا گیا ہے۔ چنانچہ برہما کہتا ہے "سارے عالم میں غیر محسوس طریقہ پر حاوی۔ وساری تمام ہستیاں مجھ میں ہیں لیکن میں اُن میں نہیں ہوں اور پھر بھی تمام ہستیاں مجھ میں نہیں ہیں میرے یوگ کو دیکھو"۔ یعنی اصل میں برہما ہر شے میں ہے اور ہر شے اُس میں ہے۔ وہ ساری کائنات میں ہے اور ساری کائنات اُس میں ہے۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ میرے یوگ کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "تمام ہستیاں مجھ میں ہیں مگر میں اُن میں نہیں ہوں" اور کبھی ایسا بھی نظر آتا ہے کہ "یہ ہستیاں بھی مجھ میں نہیں ہیں"۔ چنانچہ ایک جگہ گیتا کار کہتا ہے کہ "برہما یوگ مایا کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس لیے ہر شخص کو اُس کا علم نہیں ہو سکتا۔

الغرض۔ خدا ہر اُس شے کو جانتا ہے جو موجود ہے۔ یا موجود رہی ہے یا آیندہ وجود میں آنیوالی ہے۔ اُس سے برتر کوئی ہستی نہیں۔ وہ پانی میں پانی کا مزہ ہے۔ وہ آفتاب و ماہتاب کی

روشنی ہے۔ ویدوں میں "اوم" ہے۔ بسط میں صوت ہے اور جو انسانیت میں انسانیت ہے۔ زمین میں وہ خوشبو ہے۔ آگ میں آگ کی لپٹ ہے۔ تمام موجودات کی زندگی ہے اور ہر شے کا ازلی اور ابدی بیج ہے وہ قوت ہے جس کے ساتھ صاحب قوت کی طرح تمنائیں اور خواہشیں وابستہ نہیں ہیں۔ وہ محبت ہے جو تقوے کے مخالف نہیں ہے۔ نیکی۔ تاریکی۔ جذبہ حیوانی سب اُسی سے ہے۔ وہ ان میں نہیں ہے۔ لیکن یہ سب اُسی میں ہیں جو کچھ ہم دیکھتے یا سنتے ہیں ان سب سے جدا ایک غیر محسوس ازلی ہستی ہے جو دائم وقائم ہے۔ تمام ہستیاں برباد ہو جاتی ہیں مگر وہ برباد نہیں ہوتی۔ وہی ہر شے کی ابتدا ہے اور انتہا اُس کی صورتیں بے شمار ہیں۔ نہ اُس کی ابتدا ہے۔ نہ انتہا۔ نہ اُس کو موجود کہہ سکتے ہیں۔ نہ معدوم۔ اُس کے ہر طرف ہاتھ۔ پاؤں۔ آنکھیں۔ سر۔ چہرہ اور کان ہیں اور وہ دنیا کی ہر چیز میں ہے۔ وہ تمام حواس کی صفات سے متصف ہے۔ پھر بھی تمام حواس سے معرا ہے۔ وہ بے تعلق ہے۔ تاہم سب کو سنبھالے ہوئے ہے۔ وہ تمام اوصاف سے خالی ہے۔ پھر بھی اوصاف سے محظوظ ہوتا ہے۔ وہ ہر شے کے اندر ہے اور ہر شے سے باہر۔ متحرک بھی ہے اور غیر متحرک بھی۔ اُس کے وجود کی نزاکت و لطافت اُس کے علم کی مانع ہے۔ وہ نزدیک بھی ہے۔ اور دور بھی۔ وہ مختلف چیزوں میں مختلف نہیں ہے۔ البتہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ وہی ساری کائنات کا سنبھالنے والا اور ہر شی کا پیدا کرنے والا ہے۔ اور پھر سب کچھ اپنے میں جذب کر لیتا ہے۔ وہ روشن اجسام کی روشنی سے پرے ہے۔ وہ علم ہے۔ مقصود علم ہے۔ حاصل علم ہے اور سب کے دل میں ہے۔

حقیقت روح

آتما یا روح انسانی اور چیزوں کی طرح خدا کی مخلوق نہیں ہے۔ بلکہ ہر انسان کی آتما خدا کا ایک جزو ہے۔ (جزو کا لفظ محض استعارۃً استعمال کیا گیا ہے) جب تک آتما کا تعلق جسم اور حواس سے رہتا ہے اُس تک اُس کو جیو کہتے ہیں۔ ایسی حالت میں اس کو ایشور یا مالک بھی کہتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ جسم و حواس پر حکومت کرتی ہے۔ جب آتما جسم اور حواس کو چھوڑتی ہے تو حواس اور

توسط دماغیہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ جس طرح ہوا خوشبو اُڑا لے جاتی ہے۔ آتما یعنی اصلی روح انسانی کو پُرش بھی کہتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ وجود خداوندی کی جو تین صورتیں بیان کی گئی ہیں اُن میں سے روح انسانی کس کا جزو ہے؟ اس کا جواب گیتا کار یہ دیتا ہے کہ روح انسانی وجود خداوندی کی پہلی صورت کا جزو ہے۔ اگر ہم کسی فرد انسانی میں سے جسم اور تمام جسمانی افعال وخواص علیحدہ کردیں تو آتما یا پُرش ہی باقی رہ جاتا ہے اور وہی روح انسانی کی اصلی حالت ہے۔ اور جسم کے اندر بھی یہی حالت قائم رہتی ہے اس لیے کہ روح میں تغیر نہیں ہوتا اور یہی وہ حالت ہے جس کو روح مکتی یا آخری آزادی حاصل کرنے پر "اپنی اصلی حالت" کی حیثیت سے معلوم اور محسوس کرے گی۔ پس جبکہ آتما وہی ہے جو جسم اور تمام جسمانی افعال وخواص مثلاً بدی۔ اہنکار۔ من۔ جنانا اندریاں (حواس علیہ) کرم اندریاں (حواس عملیہ)۔ خواہش۔ خوشی۔ نفرت۔ حظ۔ کرب وغیرہ کے علیحدہ کرلینے پر بچ جاتا ہے تو بجز اس کے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ روح انسانی کی اصلی حالت یعنی آتما یا پُرش وجود خداوندی کی پہلی نوعیت کی طرح نرگن اور کرتا ہے۔

چونکہ آتما اور خدا یا برہما کی حقیقت ایک ہے اس لیے آتما بھی کسی سے پیدا نہیں ہوئی ہے۔ نہ مردہ یا معدوم ہوسکتی ہے۔

آتما کے لیے جسم سے قطعی طور پر رہائی حاصل کرلینا (جس کو مکتی کہتے ہیں) بہت ضروری ہے مگر موت کے ذریعہ سے یہ ممکن نہیں۔ آتما کو جسم سے قطعی طور پر چھٹکارا اُسی وقت نصیب ہوسکتا ہے جبکہ اپنا اور خدا کا اور اپنے اور خدا کے تعلقات کا پورا گمان یا علم ہوجائے اور یہ علم کرم جوگ بھگتی اور ابھیاس جوگ پر (جن کا ذکر آئندہ عرض کیا جائے گا) عمل کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ موت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آتما۔ پراکرتی یا جسم سے قطعی طور پر آزاد ہوجاتی ہے بلکہ اس کے صرف یہ معنی ہیں کہ آتما ایک پراکرتی سے دوسری پراکرتی میں چلی جاتی ہے۔ جس طرح ہم جوانی سے بڑھاپے میں داخل ہوتے ہیں یا پُرانے کپڑے پھینک کر نئے کپڑے پہن

لیتے ہیں۔
چونکہ آتما اور حقیقت خداوندی میں عینیت ہے اس لیے آتما ماری نہیں جا سکتی اور چونکہ وہ نرگن اور کرتا ہے اس لیے خود کسی کو مار بھی نہیں سکتی۔ چنانچہ گیتا کار کہتا ہے "جو یہ خیال کرتا ہے کہ آتما مار سکتی ہے اور جو یہ خیال کرتا ہے کہ آتما ماری جا سکتی ہے۔ وہ دونوں کچھ نہیں جانتے۔ آتما نہ کسی کو مارتی ہے۔ نہ خود ماری جا سکتی ہے"
اس سے صاف اور لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر انسان کی آتما جو اس وقت موجود ہے۔ ازلی اور ابدی ہے۔ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگی۔ جیسا کہ گیتا کار کہتا ہے۔ "کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نہ رہا ہوں۔ یا تم نہ رہے ہو۔ یا یہ لوگ نہ رہے ہوں جو انسانوں پر حکومت کرتے ہیں۔ اور نہ آئندہ کبھی ایسا ہوگا کہ ہم میں کسی کا وجود مٹ جائے" انسان میں جو شئی خراب و برباد ہوتی ہے وہ اُس کی پراکرتی یا جسم ہے۔ یہ خیال کرنا سخت غلطی ہے کہ جسم کی خرابی و بربادی کے ساتھ آتما بھی خراب و برباد ہو جاتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ جبکہ آتما جسم کے اندر موجود ہوتی ہے اُس وقت بھی وہ جسمانی نقصانات سے متاثر نہیں ہوتی۔ جسم کو کچھ نہ کچھ تکلیف۔ کرب یا بے چینی ہو آتما پر اُس کا مطلق اثر نہیں پڑتا۔ بقول گیتا کار کے کہ کوئی ہتیار اُس کے کاٹ کا نہیں ہو سکتا آگ اُس کو جلا نہیں سکتی۔ پانی اُس کو تر نہیں کر سکتا۔ ہوا اُس کو خشک نہیں کر سکتی"
اس کے علاوہ آتما ہمہ گیر ہے اور سب میں جاری و ساری ہے۔ یہ تغیر پذیر نہیں ہے۔ اس کا وجود محسوسات سے بالاتر ہے۔ اس کو خیال میں لانا محال ہے۔

حقیقت جسم

پراکرتی یا دیہہ یا قالب انسانی مخلوق اور تغیر پذیر ہے اور تباہ و برباد ہونے والی شئی ہے۔ تمام افعال انسانی کی فاعل بھی ہے۔ آتما کرتا ہے۔ اُس کو افعال انسانی میں کوئی دخل نہیں۔ قالب انسانی میں رہ کر اُس کا صرف یہ کام ہے کہ پراکرتی کے افعال انسانی اُٹھائے نیز اُس کے تمام اوصاف و خواص سے محظوظ ہو۔ گو اس مجسمہ پر اُس کی حکومت ہوتی ہے اور

وہ تمام محسوسات کے لطف سے بہرہ اندوز ہوتی ہے۔

یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آتما اپنی حقیقت سے ناواقف کیوں ہوتی ہے؟ اور باوجود نرگن اور اکرتا ہونے اور شان الوہیت رکھنے کے قالب انسانی میں (جس کو گیتا کار برائی سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس سے قطعی طور پر چھٹکارا حاصل کر لینا آتما کے لیے از بس ضروری ہے) پھنستی کیوں ہے؟ اور دوسرے (پراکرتی) کے اعمال کا خمیازہ کیوں بھگتی ہے؟

پہلے سوال کے جواب میں بجائے کسی دلیل کے گیتا کار صرف ایک واقعہ پیش کرتا ہے۔ وہ یہ کہ جوں ہی آتما قالب انسانی میں داخل ہوتی ہے۔ اُس کی نیز دوسری چیزوں کی حقیقت کا علم اس سے پوشیدہ ہو جاتا ہے اور صرف گیتا کے بتائے ہوئے طریقۂ عمل پر کاربند ہونے سے یہ علم حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن (جیسا کہ ہم نے اوپر سوال کیا ہے) اگر جہالت۔ انسانی قالب میں داخل ہونے کا لازمی نتیجہ ہے تو آتما اُس میں داخل ہی کیوں ہوتی ہے؟ اس کے جواب میں گیتا کار کہتا ہے کہ آتما قالب انسانی میں اس وجہ سے آئی کہ پچھلی زندگی میں اُس کو اعمال اور اُن کے نتائج سے وابستگی اور تعلق تھا۔ اور پچھلی زندگی میں اس وجہ سے جسم اختیار کرنا پڑا تھا اُس سے پہلے کے جنم میں اُس کو اعمال اور اُن کے نتائج سے وابستگی تھی۔ اور یہی سلسلہ برابر جاری ہے۔ جسم سے ہمیشہ کے لیے اُسی وقت رہائی مل سکتی ہے جبکہ کرم جوگ بھگتی کے مطابق عمل کیا جائے۔ جہاں آتما کو ایک بار اپنا اور خدا کا اور اپنے اور خدا کے باہمی تعلقات کا علم ہوا پھر اُس کی جہالت اور اعمال سے وابستگی ہمیشہ کے لیے جاتی رہے گی اور جب یہ حالت حاصل ہو جائیگی تو اُس کو جسم اختیار کرنا پڑیگا اور ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جائے گی۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جو آتما اس وقت جسم کے اندر موجود ہے وہ ہمیشہ سے جاہل چلی آرہی ہے اور معلوم نہیں کتنے قالبوں سے گزر کر موجودہ قالب میں آئی ہے۔ مگر یہ سلسلہ لامتناہی نہیں ہے۔ کرم جوگ بھگتی پر عمل کرنے سے اس کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔

اب ہم کو اپنے تیسرے سوال کا جواب تلاش کرنا ہے۔ کہ دوسرے کے اعمال کا بھوگ آتما کو کیوں اٹھانا پڑتا ہے؟ اس سوال کا جواب گیتا کار یہ دیتا ہے کہ گو آتما اصلی فاعل نہیں ہے لیکن اپنی

فطری جہالت کے باعث پراکرتی کے تمام افعال و اعمال کو غلطی سے اپنے افعال و اعمال سمجھتی ہے۔
اس غلط فہمی کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُس کو پراکرتی کے تمام اعمال اور اُن کے نتائج سے وابستگی
ہو جاتی ہے اور اسی وجہ سے اُس کو اُن کا بھوگ اُٹھانا پڑتا ہے۔ اور اُس وقت تک بھوگ اُٹھاتی رہتی ہے
جب تک کہ کرم جوگ بھگتی پر کما حقہٗ عمل نہ کیا جائے۔ لیکن اگر جسم میں آتما کی گرفتاری پچھلی زندگی
کے اعمال کا نتیجہ ہے تو سوال یہ ہے کہ یہ گرفتاری عمل میں کیونکر آتی ہے اور آتما جسم میں کس طرح
بندھ جاتی ہے؟ گیتا کا رکتا ہے کہ پراکرتی کے تین گن یا خواص ہیں۔ ستو۔ راجو اور تامو۔ یہ گن رسی کا
کام دیتے ہیں جس سے گویا آتما جسم بندی ہوتی ہے۔ اور جیوں ہی تر گن آتما۔ گنوں سے متصادم
ہوتی ہے بڑے بڑے نتائج ترتیب ہونے شروع ہوتے ہیں۔ چنانچہ ستو گن سے متصادم ہونے کا
نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آتما کا رجحان انبساط اور علم کی طرف ہوتا ہے۔ راجو گن سے متصادم ہونے کا
نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آتما کو حرص۔ خواہش۔ بے اطمینانی وغیرہ سے تعلق پیدا ہوتا ہے۔ تامو گن سے متصادم
ہونے پر آتما۔ لاپروائی۔ سستی۔ خواب وغیرہ کی طرف مائل ہوتی ہے۔

واضح ہو کہ یہ تینوں گن ہر شخص میں موجود ہوتے ہیں۔ مگر مساوی درجہ پر نہیں۔ کسی میں ستو گن
زیادہ ہوتا ہے۔ بقیہ دو گن کم ہوتے ہیں۔ کسی میں تامو گن کی زیادتی ہوتی ہے۔ اور کسی میں راجو گن
کی۔ یہ کمی بیشی ہر شخص کے پچھلے جنم کے طرز زندگی پر منحصر ہے۔ اور ہر شخص کے فرائض اُس گن
کے مطابق ہوتے ہیں جس کی اُس میں زیادتی ہوتی ہے۔

ان تینوں گنوں کو بحیثیت مجموعی مایا بھی کہتے ہیں۔

مندرجہ بالا سطور میں میں نے گیتا کی فلسفیانہ تعلیم (بالاجمال اور بالاختصار) بیان کرنے
کی کوشش کی ہے۔ مگر گیتا کی خصوصیت اس کا فلسفہ نہیں ہے بلکہ اس کی مذہبی تعلیم ہے۔ اس کا
وہ حصہ جس میں روح۔ خدا۔ اور جسم کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے صرف مذہبی تعلیم کو قوی اور بارآور
بنانے کے لیے ہے۔ جب تک انسان کو یہ نہ معلوم ہو جائے کہ روح۔ جسم اور خدا کیا ہے اور
ان کے تعلقات کیا ہیں اور جو معیار زندگی یا نصب العین مذہب اُس کے سامنے پیش کرتا ہے

اُس کی حقیقت کیا ہی۔ اُس وقت تک مذہبی تعلیم بے سود ہی۔ اس لیے کہ اُس سے دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ نہ اُس پر عمل کرنے کا شوق پیدا ہو سکتا ہی۔
گیتا کی مذہبی تعلیم کرم جوگ بھگتی اور ابھیاس جوگ پر مشتمل ہی جس کے ذریعہ سے آتما ہمیشہ کے لیے جسم سے آزاد ہو سکتی ہی اور انسان مکتی اور حیات ابدی حاصل کر سکتا ہی۔
راس وقت (مع تنقید) انشاء اللہ آیندہ قارئین کی خدمت میں پیش کروں گا۔

سید کامل حسین ایم۔ اے

تاریخ صلح لوزان کانفرنس

در صنعت زبر و بنیات غیر منقوط

(فن تاریخ میں یہ وہ صنعت ہی جس کو غیر معمولی کمال سمجھا گیا ہی۔ سب سے اول بلگرامی نے دربار اودھ میں اس صنعت میں تاریخ پیش کر کے داد علم حاصل کی تھی۔ اس زمانہ میں مرزا طاہر مرادآبادی نے دربار رامپور میں اس کمال کو دکھا کر انعام و اکرام حاصل کیے۔ اب یہ فخر قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم سیوہاروی کو حاصل ہی کہ صاحب موصوف نے دربار خلافت کے لیے اس صنعت میں تاریخ پیش کر کے اہل علم و قلم سے داد لی ہی)

حصول کام دل کردہ امام عاصم و کامل
ملک عبدالمجید سرور اہل ہمم و اصل
وددو ودا ورد او رکرد الہام ناظم را
سرو سالار عصر و احلم عامل حد دل عادل

سنہ ۱۳۴۱

۱۴۵

پیام مشرق

ڈاکٹر اقبال کا یہ تازہ دیوان میں نے پڑھا۔ مجھے اس سے جو حظ اور لطف حاصل ہوا وہ بیان سے باہر ہے۔ لیکن بعض احباب کا اصرار ہے کہ میں اس کو تحریر میں لاؤں۔ اس لیے سرسری طور پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں۔ اس کو نہ تنقید سمجھنا چاہیے نہ تقریظ۔

یہ دیوان جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے کے دیوان کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ جرمن زبان سے ناواقف ہونے کی وجہ سے چونکہ میں گوئٹے سے آشنا نہیں ہوں اس لیے مقابلہ کی جلوہ آرائی کا لطف نہیں اٹھا سکا۔ لیکن مشرقی شاعری کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ اس نے مغرب کو مخاطب کیا۔ اور ایشیا کے سینہ کی برقی حرارت یورپ کے برفستان میں پہونچانے کی کوشش کی۔

دیباچہ | شروع میں ایک چھوٹا سا دیباچہ ہے جس میں گوئٹے کی شاعری میں جو مشرقی رنگ ہے اس کا ذکر کیا ہے۔ اسی ذیل میں جرمن ادبیات پر عجمی شاعری کا جو اثر پڑا ہے اس کی نہایت مختصر تاریخ لکھی ہے۔ یہ مضمون مفید اور پُر از معلومات ہے۔ اگرچہ اگانہ بسط کے ساتھ لکھا جائے تو نہایت کار آمد ہو۔

دیباچہ بھی بجائے اردو کے اگر فارسی میں ہوتا تو زیادہ بہتر تھا۔ کیونکہ سارا دیوان فارسی میں ہے۔

زبان | ڈاکٹر صاحب نے جب فارسی زبان میں شعرگوئی اختیار کی تو شروع شروع میں ان کی بعض مثنویوں کی زبان پر لوگوں نے اعتراضات کیے۔ لیکن اب انھوں نے اپنے ذہن نقاد اور طبع نقادسے زبان میں ایسی لطافت اور شستگی پیدا کر لی کہ صائب اور نظیری کے رنگ میں آ گئے۔ اس تمام مجموعہ میں زبان کی صفائی اور پختگی اور کلام کی بے ساختگی اور برجستگی پر مشکل سے کہیں انگلی رکھی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ہندوستان میں رہ کر فارسی زبان کو جو اظہار خیالات کا ذریعہ بنایا ہے حقیقت میں انھوں نے کو کہنی کی زحمت گوارا کر کے ایشیائی اقوام مسلمہ کے لیے جو بالعموم فارسی سمجھتی ہیں اپنی فائدہ رساں تعلیمات کی ایک جوئے شیر نکالی ہے ورنہ آج یہ نہ کہہ سکتے ؎

نوائے من بہ عجم آتش کہن افروخت　　　عرب ز نغمۂ شوقم ہنوز بے خبر است

لیکن مجھے یقین ہے کہ جب اٹالین اور انگریزی وغیرہ مغربی زبانوں میں کلام اقبال کے ترجمے

ہو چکے ہیں تو اہل مصر جو اس معاملہ میں یورپ کے کسی ملک سے پیچھے نہیں ہیں اور جنھوں نے ٹیگور تک
کا ترجمہ عربی میں کر لیا ہی اس اپنی بضاعت علیہ کو بلا عربی میں منتقل کیے ہوئے نہیں رہیں گے۔

شاعری | بعض لوگوں نے لکھا ہی کہ شاعری وہی اچھی ہوتی ہی جو زمانہ جہالت میں ہوتی ہی۔ لیکن
میرے نزدیک ؎

دُکانِ عاشقی را بسیار مایہ باید

بے شک جاہلی شاعری کی زبان میں سادگی اور طرز ادا میں بے ساختگی ہوتی ہی۔ لیکن شعر کی خوبی
انھیں چیزوں پر محدود نہیں ہی بلکہ ان کے سوا اس میں معنوی خوبیاں بھی ہوتی ہیں جو زیادہ قدر کے
قابل ہیں۔ اور یہ بلا علم کے پیدا نہیں ہو سکتیں۔ خواجہ حافظ کہتے ہیں ؎

بافہم و عقل و دانش دادِ سخن تواں داد | چوں جمع شد معانی گوئے بیاں تواں زد

ذوقِ صحیح جذبات عالیہ کی اُن لطیف تحریکات پر وجد کرتا ہی جن سے دل کے تار بجتے ہیں۔ یہی سبب
ہی کہ ڈاکٹر صاحب کی شاعری اہل فہم کی دماغی راحت اور روحانی لذت کے لیے ایک میوۂ پُرمایہ
ہو گئی ہی۔ کیونکہ وہ علوم دینی و دنیوی اور مشرقی و مغربی کے مجمع البحرین ہیں۔ ذوقِ صحیح۔ دلِ دردمند
اور طلاقت لسانی رکھتے ہیں۔ ان کی چشم بصیرت انسانی خیالات کی انتہائی بلندیوں پر پہونچی
ہوئی ہی۔ اور ان کے دیدۂ تخیل کے سامنے زمین سے آسمان تک کے پردے اُٹھے ہوئے
ہیں۔ وہ عرش کے پایوں میں جھولتے ہیں۔ مرغانِ اولی اجنحہ کے ساتھ اُڑتے ہیں۔ ساکنانِ حرم
قدس سے ملتے ہیں۔ بزم انجم و کواکب کے رموز سنتے ہیں۔ شبنم اور آفتاب کے باہمی راز۔ گل و
بلبل کے ناز و نیاز اور پروانہ و شمع کے سوز و ساز سے آشنا ہیں۔ پہاڑوں کی چٹانوں میں
برق کی موجیں۔ سمندروں کی موجوں میں زندگی کی لہریں۔ قطرۂ اشک میں سوزِ عشق کا تب و
تاب اور دانۂ گوہر میں حیات معنوی کی آب دیکھتے ہیں۔

غرض عالمستان معنی ہی جس کے چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ سے جواہر پارے چنتے ہیں اور جذبات
علیہ و دینیہ کا پیکرستان تیار کرتے ہیں۔ ان کی نگاہ اس قدر تیز بین ہی کہ ایک ہی چیز پر نہیں رکتی

بلکہ تنزلی سے اسباب ور اسباب سے متعلقات پر بلندی سے پستی تک اور خشکی سے تری تک ایک ساتھ دوڑ جاتی ہے۔

تہدیہ یا کتاب کو کسی کے نام سے معنون کر دینا ایک عام رسم ہوگئی ہے۔ حالانکہ اس کا موقع صرف وہ ہے جہاں کتاب کے مقصد کو اس سے مدد مل سکے۔ ورنہ اہل نظر اس کو کتاب کی خواری اور مصنف کی سبکساری کی دلیل سمجھتے ہیں۔

اس سے پیشتر ڈاکٹر صاحب کی ایک مثنوی کا تہدیہ میری نظر سے گزرا تھا۔ جس کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوگئی تھی کہ اللہ اکبر۔ اسرار خودی کی تعلیم۔ اور اس پر یہ بیخودی سے

چو رُوئے خویش در آئینہ می توانی دید چرا نظر بجمال کسے دگر داری

گر یہ تو خود اللہ تعالےٰ نے شاعروں کے حق میں فرما دیا ہے کہ "یقولون مالا یفعلون"۔ شکر ہے کہ اس دیوان کے بارے میں مجھے یہ شکایت نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں اُنھوں نے کسی شخص کو نہیں بلکہ درحقیقت ایک قوت کو خطاب کیا ہے۔ جو اُن تعلیمات کی جو اس کتاب میں دی گئی ہیں صحیح مخاطب ہے۔ یعنی امیر امان اللہ خاں فرمانروائے افغانستان۔

خطاب کا مضمون اور انداز نہایت دلکش اور بلیغ ہے۔ عالم اسلامی کی موجودہ حالت کا صحیح نقشہ صرف چند شعروں میں کھینچ دیا ہے۔

دیدہٗ اے خسروِ کیواں جناب — آفتاب ما توارت بالحجاب
ابطحی در دشتِ خویش از راہ رفت — از دمِ او سوزِ الا اللہ رفت
مصریاں افتادہ در گردابِ نیل — سست رگ تورانیانِ ژندہ پیل
آلِ عثماں در شکنجِ روزگار — مشرق و مغرب ز خونش لالہ زار
عشق را آئینِ سلمانی نماند — خاکِ ایراں ماند و ایرانی نماند
سوز و سازِ زندگی رفت از گلش — آں کہن آتش فسرد اندر دلش
مسلمِ ہندی شکم را بندۂ — خود فروشے دل ز دیں برکندۂ

در مسلماں شانِ محبوبی نماند　　خالد و فاروق و ایوبی نماند

درخواست یہ ہے۔

اے ترا فطرت ضمیرِ پاک داد　　از غمِ دین سینۂ صد چاک داد
جانِ تو بر محنتِ پیہم صبور　　کوشش در تہذیبِ افغانِ غیور
تا ز صدیقانِ ایں امت شوی　　بہرِ دیں سرمایۂ قوت شوی

لالہ طور دیوان کا پہلا جز ہے۔ اس میں ۵۵ رباعیاں ہیں جو ایک ہی وزن پر ہیں۔ یہ فلسفہ زندگی کے اسرار اور معدن حکمت کے گوہرہائے آبدار ہیں۔ دو چار درج کرتا ہوں۔

دلِ من روشن از سوزِ درون است　　جہاں بیں چشمِ من از اشکِ خون است
ز رمزِ زندگی بیگانہ تر باد　　کسے کو عشق را گوید جنون است

دمادم نقشہائے تازہ ریزد　　بیک صورت قرارِ زندگی نیست
اگر امروزِ تو تصویرِ دوش است　　بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

مگو کارِ جہاں نا استوار است　　ہر آنِ ما ابد را پردہ دار است
بگیر امروز را محکم کہ فردا　　ہنوز اندر ضمیرِ روزگار است

رمیدی از خداوندانِ افرنگ　　ولے بر گور و گنبد سجدہ پاشی
بہ لالائی چناں عادت گرفتی　　ز سنگِ راہ مولائے تراشی

افکار دیوان کا دوسرا جز کم و بیش ۰ ۴ صفحہ ہے۔ اس میں قطعات اور مختلف عنوانات پر نظمیں ہیں۔ ہلالِ عید کے متعلق کہتے ہیں۔

نتواں ز چشمِ شوق رمید اے ہلالِ عید　　از صد نگہ براہِ تو دامے نہادہ اند

بخود نظر کشا ز تہی دامنی مرنج — در سینۂ تو ماہ تمامے نہادہ اند

تسخیر فطرت کے عنوان سے ابلیس و آدم کا جو قصہ لکھا ہے اس کا پرواز نہایت شاندار ہے۔ سجدے سے انکار کے وقت ابلیس کا متکبرانہ لہجہ اس کی تعلی کی کیسی عجیب تصویر ہے۔

نوری نادان نیم۔ سجدہ بآدم برم — او بہ نہاد است خاک۔ من بہ نژاد آذرم

می تپد از سوزِ من۔ خونِ رگِ کائنات — من بہ دو صرصرم۔ من بہ غوِ تندرم

من ز تنک مائگاں گدیہ نکردم سجود — قاہر بے دوزخم۔ داور بے محشرم

آدم ایک نافرماں لڑکے کی طرح جو باپ کے گھر سے نکلنے پر آزادی کا سانس لیتا ہے جنت سے خارج ہو کر خوشی کا راگ گاتا ہے۔ یہ راگ نہایت دلفریب ہے۔ خاصکر یہ شعر

بگداز ہاے پنہاں۔ بہ نیاز ہاے پیدا — نظرے ادا شناسے بحریم ناز کردن

لیکن صبح قیامت کو جناب باری میں اس کا یہ جواب

تا شود از آہِ گرم ایں بتِ سنگیں گداز — بستنِ زنار او بود مرا ناگزیر

عقل بدام آورد فطرت چالاک را
اہرمن شعلہ زاد۔ سجدہ کند خاک را

مبہم ہے۔ اس کے سمجھنے سے میں قاصر رہا۔ کیونکہ ابلیس کی تعبیر فطرت کے ساتھ کسی طرح قرآن سے مطابقت نہیں کھاتی۔ اس جواب کا دوسرا شعر۔

ریخت ہنر ہاے من بحر بیک نائے آب — تیشۂ من آورد از جگر خارہ شیر

کسی قدر فصاحت سے گر گیا۔ کیونکہ گو جائز سہی لیکن بہر صورت ماضی اور مضارع کا تقابل ناہموار ہے۔
بوئے گل کی حقیقت پر شاعرانہ تخیل کی لطافت قابل دید ہے۔

حورے بکنجِ گلشنِ جنت تپید و گفت — مارا کسے از آنسوئے گردوں خبر نداد

ناید بفہمِ من سحر و شام و روز و شب — عقلم ربود اینکہ بگویند مُرد و زاد

گردید موجِ نکہت و از شاخِ گل دمید — پا اینچنیں بعالمِ فردا وے نہاد

داکر دچشم وغنچہ شد وخندہ زدمے　　گل گشت برگ برگ شد وبرزمیں فتاد

دندانئے کہ بندز پائش کشادہ اند
آبے گذاشتست کہ بونام دادہ اند

لیکن پہلے مصرع میں تپید کا لفظ برمحل نہیں واقع ہوا۔کیونکہ بے خبری تپش کی وجہ نہیں ہو سکتی۔ اور آخری مصرع میں "آبے گذاشتست" مکروہ معلوم ہوتا ہی۔اسی مفہوم کو دوسرے لفظ سے ادا کرتے تو بہتر تھا۔

شاہین و ماہی کی گفتگو کس قدر ترانہ انگیز لہجہ میں لکھی ہی۔

ماہی بچہ شوخ بشاہیں بچہ گفت　　ایں سلسلۂ موج کہ بینی ہمہ دریاست
دارائے نہنگان خروشندہ تر از میغ　　در سینۂ او دیدہ و نادیدہ بلاہاست
باسیل گراں سنگ زمیں گیر و سبک خیز　　باگوہر تابندہ و بالولوئے لالاست
بیروں نتواں رفت زسیل ہمہ گیرش　　بالائے سرماست۔تہ پاست۔ہمہ جاست
ہر لحظہ جوان است و رواں است و دوان است　　از گردش ایام نہ افزوں شد و نے کاست
ماہی بچہ را سوز سخن چہرہ برافروخت　　شاہیں بچہ خندید و ز ساحل بہ ہوا خاست
زد بانگ کہ شاہینم و کارم بزمین چیست　　صحرا است کہ دریاست تہ بال و پر ماست

بگذر ز سر آب و بہنائے ہوا ساز
ایں نکتہ نہ بیند مگر آں دیدہ کہ بیناست

نئے باقی　یہ تیسرا جز بھی کم و بیش چالیس صفحوں کا ہی۔اس میں غزلیں ہیں جن کی زبان کی سلاست ترنم ریز اور معنوی لطافت وجد انگیز ہی دو ایک نمونتاً درج کرتا ہوں۔

می تراشد فکر ما ہردم خداوندے دگر　　رست از یک بند تا افتادہ در بندے دگر
بر سر بام آ نقاب از چہرہ بیباکانہ کش　　نیست در کوئے تو چوں من آرزو مندے دگر
بسکہ غیرت می برم از دیدۂ بینائے خویش　　از نگہ بافم بر خسار تو روبندے دگر

یک نگہ، یک خندۂ دزدیدہ، یک تابندہ اشک
بہ پیمانِ محبت نیست سوگندے دگر

عشق را نازم کہ از بے تابیِ روزِ فراق
جانِ ما را بست با دردِ تو پیوندے دگر

تا شوی بیباک تر در نالہ اے مرغِ بہار
آتشے گیر از حریمِ سینہ ام چندے دگر

رہ مدہ در کعبہ اے پیرِ حرم اقبال را
ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

بلا زمانِ سلطاں خبرے دہم ز رازے
کہ جہاں تواں گرفتن بہ نوائے دلگدازے

بمتاعِ خود چہ نازی کہ بشہرِ دردمنداں
دلِ غزنوی نیرزد بہ تبسّمِ ایازے

ہمہ نازِ بے نیازی ہمہ سازِ بے نوائی
دلِ شاہ لرزہ گیرد ز گدائے بے نیازے

ز مقامِ من چہ پرسی بہ طلسمِ دل اسیرم
نہ نشیبِ من نشیبے نہ فرازِ من فرازے

رہِ عاشقی رہا کن کہ بہ او تواں رسیدن
بدلِ نیازمندے بہ نگاہِ پاکبازے

بہ رہِ تو ناتمامم، ز تغافلِ تو خامم
من و جانِ نیم سوزے، تو و چشمِ نیم بازے

رہِ دَیر تختۂ گل ز جبینِ سجدہ ریزم
کہ نیازِ من نگنجد بہ دو رکعتِ نمازے

ز ستیزِ آشنایاں چہ نیاز و ناز خیزد
دلکے بہانہ سوزے، نگہے بہانہ سازے

ز خاکِ خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست
تجلّیِ دگرے درخورِ تقاضا نیست

اگرچہ عقلِ فسوں پیشہ لشکرے انگیخت
تو دل گرفتہ نباشی کہ عشق تنہا نیست

تو رہ شناس نۂ و ز مقام بیخبری
چہ نغمہ ایست کہ در بربطِ سلیمیٰ نیست

نظر بخویشتن چناں بستہ ام کہ جلوۂ دوست
جہاں گرفت و مرا فرصتِ تماشا نیست

بیا کہ غلغلہ در شہرِ دلبراں فگنیم
جنونِ زندہ دلاں ہرزہ گردِ صحرا نیست

ز قید و صیدِ نہنگاں حکایتے آور
مگو کہ زورقِ ما روشناسِ دریا نیست

مریدِ ہمتِ آں رہروم کہ پا نگذاشت
بہ جادۂ کہ درو کوہ و دشت و صحرا نیست

شریکِ حلقۂ رندان بادہ پیما باش　　حذر ز بیعتِ پیرے کہ مردِ غوغا نیست
برہنہ حرف نہ گفتن کمالِ گویائی ست
حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

ایک غزل میں ایک شعر کیا بلند حوصلگی کا کہا ہے۔

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے　　یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

مولانا روم نے بھی فرمایا ہے ؎

بزیرِ کنگرۂ کبریاش مردانند　　فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

لیکن شاعرانہ خیالات کا تضاد احسن تقویم اور اسفل سافلین کا کیسا صحیح منظر پیش کرتا ہے۔ کہ کہاں آدمِ خاکی کا یہ جوش و خروش اور کہاں وہ نگاہ میں اس قدر حقیر کہ اللہ تعالےٰ سے یہ درخواست کی جاتی ہے کہ

نقشِ دگر طراز دہ آدمِ پختہ تر بیار　　لعبتِ خاک ساختن می نہ سزد خدائے را

نقشِ فرنگ: یہ چوتھا جز ۰ہم صفحہ سے کچھ کم ہے۔ اس میں اہلِ مغرب کے خیالات اور ان کے متعلق رائیں ہیں۔ ان مضامین سے ایشیائی شاعری ابتک قطعاً روشناس نہ تھی۔ آغاز اس پیام سے ہوتا ہے۔

از من اے بادِ صبا گوئے بدانائے فرنگ　　عقل تا بال کشود است گرفتار تر است
برق را ایں بہ جگر می زند آں رام کند　　عشق از عقل فسوں پیشہ جگر دار تر است
چشم جز رنگِ گل و لالہ نہ بیند ورنہ　　انچہ در پردۂ رنگست پدیدار تر است
عجب آں نیست کہ اعجازِ مسیحا داری　　عجب آنست کہ بیمارِ تو بیمار تر است
علم و حکمت اگرش خوئے سگی باز دہد　　آدمی زادۂ دانا زدَدَاں خوار تر است
خواجہ را قیمتِ عیش است اگر مزدِ غلام　　بندہ آزاد تر و خواجہ گرفتار تر است

رفتگانِ عالمِ بالا کی صحبت بھی نہایت دلچسپ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مغربی حکمائے نے وہاں جاکر

سیاسی مذاہب سے شروع کرتے ہیں

روس کا مشہور حکیم ٹالسٹائے کہتا ہے

بارکش اہرمن لشکری شہریار — از پئے نانِ جویں تیغِ ستم برکشید
زشت بچشمش نکوست۔ مغز نداند ز پوست — مردکِ بیگانہ دوست سینۂ خویشاں درید
دار پئے بیہوشی است تاج۔ کلیسا۔ وطن — جانِ خدا داد را خواجہ بجامے خرید

مزدکِ ایران سے اباحیہ مذہب کا پیشوا اپنی تعلیم کو کامیاب دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔

دانۂ ایراں ز کشتِ زار و قیصر بردمید — مرگِ نو میر قصد اندر قصرِ سلطان و امیر
مدتے در آتشِ نمرود می سوزد خلیل — تا تہی گردد حریمش از خداوندانِ پیر
دورِ پرویزی گذشت اے کشتۂ پرویز خیز — نعمتِ گم گشتۂ خود را ز خسرو باز گیر

"کشتۂ پرویز" ناکام گرسنہ مزدور طرب گاہِ رقیب کوہکن بھی اس مجلس میں شامل ہے۔ وہ کہتا ہے۔

نگارِ من کہ بسے سادہ و کم آمیز است — ستیزہ کیش و ستم کوش و فتنہ انگیز است
برونِ او ہمہ بزم و درونِ او ہمہ رزم — زبانِ او ز مسیح و دلِ اش ز چنگیز است
اگرچہ تیشۂ من کوہ را ز پا آورد — ہنوز گردشِ گردوں بکامِ پرویز است

ایک نظم میخانۂ فرنگ کی یاد میں ہے۔ اس میں کہتے ہیں۔

چشمِ مستِ مے فروشش بادہ را پروردگار — بادہ خواراں را نگاہِ ساقیش پیغمبر است

یہی وہ جرم ہے جس پر ملا شیدا غریب شاہجہانی علماء کے فتووں کی بنیاد پر دہلی سے نکالا گیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفّا جوہرے — حسن را پروردگارے عشق را پیغمبرے

مولانا نظامی گنجوی کا یہ قطعہ بہت مشہور ہے اور اکثر ایرانی استادوں نے اس کے جوابات لکھے ہیں:

دوش رفتم بخرابات و مرا راہ نبود / می زدم نالہ و فریاد کس از من نشنود

یا نبد ہیچ کس از بادہ فروشاں بیدار / یا کہ من ہیچ کسم ہیچ کسم در نگشود

پاسے از شب بگذشت بیشتر ک یا کمتر / رندے از غرفہ بروں کرد سر و رخ بنمود

گفت خیر است دریں وقت کرا میخواہی / بے محل آمدنت بر در ما بہر چہ بود

گفتمش در بکشا گفت برو ہرزہ مگوئے / کاندریں وقت کسے بہر کسے در نگشود

ایں نہ مسجد کہ بہر لحظہ درش بکشایند / کہ تو دیر آئی و در صف پیش استی زود

ایں خرابات مغانست درو رندانند / شاہد و شمع و شراب شکر و نائے سرود

ہر چہ در جملۂ آفاق دریں جا حاضر / مومن و برہمن و گبر و نصارے و یہود

گر تو خواہی کہ دم از صحبت ایشاں بزنی
خاک پائے ہمہ شو تا کہ بیابی مقصود

ڈاکٹر صاحب خرابات فرنگ کے عنوان سے اسی نہج پر ایک قطعہ لکھتے ہیں۔

دوش رفتم بتماشائے خرابات فرنگ / شوخ گفتاری رندے دلم از دست ربود

گفت ایں نیست کلیسا کہ بیابی در وے / صحبت دخترک زہرہ وش و نائے و سرود

ایں خرابات فرنگست و ز تاثیر مئش / آنچہ مذموم شمارند نماید محمود

نیک و بد را بترازوئے دگر سنجیدیم / چشمۂ داشت ترازوئے نصارا و یہود

خوب زشت است اگر پنجۂ گیرات شکست / زشت خوبست اگر تاب و توان تو فزود

تو اگر در نگری جز بریا نیست حیات / ہر کہ اندر گرو صدق و صفا بود نبود

دعوی صدق و صفا پردۂ ناموس ریاست / پیر ما گفت مس از سیم بباید اندود

فاش گفتم تو اسرار نہانخانۂ زیست
بکسے باز مگو تا کہ بیابی مقصود

ملل مغربیہ نے جو جمعیت اقوام قائم کی ہے وہ شاعر کو اس شکل میں نظر آتی ہے۔

برقند مارو سخن رزم درین بزم کہن — دردمندانِ جہاں طرح نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند — بہرِ تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

دردمندانِ جہاں کا لفظ خاص توجہ کے قابل ہے۔
مولانا وحشی کا یہ قطعہ "برادر و تقسیم نابرابر" مشہور ہے۔

زیبا ترا نچہ ماندہ ز بابا از آنِ تو — بدلے برادر از من و اعلیٰ از آنِ تو
ایں طاسِ خامی از من و آں کوزہ کہ بود — یا رینہ پر ز شہد مصفّا از آنِ تو
یا بوئے ریسماں گسل و میخ کَن ز من — ہمیز کلہ تیز مطلّا از آنِ تو
ایں دیگ لب شکستۂ صابون پزی ز من — واں چمچۂ حریرہ و حلوا از آنِ تو
ایں اشتر خموش لگد زن از آنِ من — واں گربۂ مصاحب بابا از آنِ تو

از صحنِ خانہ تا لبِ بام از آنِ من
وز بام تا بہ سقفِ ثریا از آنِ تو

اسی لطیف طرز پر ڈاکٹر صاحب نے قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور لکھا ہے۔

غوغائے کارخانۂ آہنگری ز من — گلبانگِ ارغنونِ کلیسا از آنِ تو
نخلے کہ شہ خراج بروی نہد ز من — باغِ بہشت و سدرہ و طوبیٰ از آنِ تو
تلخابہ کہ دردِ سر آرد از آنِ من — صہبائے پاکِ آدم و حوا از آنِ تو
مرغابی و تدرو و کبوتر از آنِ من — ظلِ ہما و شہپرِ عنقا از آنِ تو

ایں خاک و آنچہ در شکمِ او از آنِ من
وز خاک تا بہ عرشِ معلّیٰ از آنِ تو

پیغام | عجمی شاعری نے اوّل اوّل حسن وعشق کے گہوارہ اور سلاطین و امرا کی مداحی کے آغوش میں پرورش پائی۔ کچھ زمانہ کے بعد صوفیانہ خیالات کے بزرگوں نے اس پر تصوف کا رنگ چڑھایا۔ خاصکر مولانائے روم نے اس صور کو اس بلند آہنگی سے

پھونکا کہ شاعری نے حریم دین میں بار پالیا۔ یہاں تک کہ آج بھی مسجدوں کے منبروں پر سے ان کی آواز باز گشت سنائی دیتی ہے۔

اب زمانہ نے دوسری کروٹ بدلی۔ اور امت اسلامیہ غیروں کے پنجۂ تسلط میں پڑ کر مصائب و آلام میں مبتلا ہو گئی۔ اس وجہ سے شاعری نے بھی نیا رنگ اختیار کیا۔ اور اس کے ساز پر قومی اور وطنی راگ گائے جانے لگے۔ مصر۔ ایران۔ ہندوستان نیز افغانستان ہر جگہ شاعری سے یہ کام لیا جانے لگا۔

ہم ان تمام نغموں کو سنتے ہیں۔ لیکن ان سب میں ڈاکٹر صاحب کی نَے ایک جداگانہ انداز رکھتی ہے۔ وہ دو باتوں میں خصوصیت کے ساتھ ممتاز نظر آتی ہے۔

(۱) ان قومی شعرا کی نگاہیں اپنی قومی اور ملکی حدود سے باہر کم پہونچتی ہیں۔ اور ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر کل امت اسلامیہ ہے یعنی ان کا خطاب صرف جذبۂ اسلامی سے ہے نہ کہ ایرانی یا تورانی سے۔ اس لیے اوروں کے کلام کو ہم صرف "قومیات" یا "وطنیات" کہہ سکتے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کی نظمیں "ملیّات" کے لقب کی مستحق ہیں۔

(۲) دوسرے شعرا جذبات عام کو لیکر نظم کا لباس پہناتے ہیں۔ بخلاف اس کے ڈاکٹر صاحب کی طبع خداداد حِکَمِ لطیفہ کے اسرار خود اخذ کر کے ان کو شاعری کے قالب میں ڈھالتی ہے۔

کسی کا قول ہے۔

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار ‏ ‏ ‏ ‏ زیک جامند در بزم سخن مست
ولے با بادہ بعضے حریفاں ‏ ‏ ‏ ‏ خمارِ چشم ساقی نیز پیوست
مبیں یکساں کہ در اشعار ایں قوم ‏ ‏ ‏ ‏ ورائے شاعری چیزے دگر ہست

"چیزے دگر" وہی رموز لطیفہ ہیں جن کو پیغامی شاعر کے سوا کوئی دوسرا نہیں پا سکتا۔ ڈاکٹر صاحب امت اسلامیہ کے لیے ایک پیغام رکھتے ہیں ان کا یہ دعوےٰ صحیح ہے۔

بخامہ کہ خطِ زندگی رقم زدہ است ‏ ‏ ‏ ‏ نوشتہ اند پیامے بہ برگِ لالۂ نیم

وہ اپنا پیغام بھی صاف ظاہر کرتے ہیں۔

زشاخ آرزو برخوردہ ام من | بہ راز زندگی پے بردہ ام من
مترس از باغباں اے ناوک انداز | کہ پیغام بہار آوردہ ام من

ان کے پیغامی شاعر ہونے کے متعلق غالباً آئندہ آنے والے لوگ ہم سے بہتر لکھ سکیں گے۔
عجمی شاعری جس نے تصوف کی خدمت گزاری کی اس میں اور ڈاکٹر صاحب کی شاعری میں
بھی بڑا فرق ہے۔ وہ فنا اور نفس کشی کی تلقین کرتی ہے۔ اور یہ خودی اور زندگی کی۔ وہ تند
مزاجوں کو برف بناتی ہے اور یہ افسردہ دلوں کو برق۔

تعلیمات! ڈاکٹر صاحب حسن و عشق کے شاعر نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے دل کو اللہ تعالےٰ نے
حیاتِ طیبہ کے اسرار سے بھر دیا ہے۔ وہی شیرہ ان کے کلام سے ٹپکتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

تا مرا رمزِ حیات آموختند | آتشے در سینہ ام افروختند
یک نوائے سینہ تاب آوردہ ام | عشق را عہدِ شباب آوردہ ام
آشنائے من ز من بیگانہ رفت | از خمستانم تہی پیمانہ رفت
من شکوہِ خسروی او را دہم | تختِ کسریٰ زیرِ پائے او نہم
او حدیثِ دلبری خواہد ز من | رنگ و آبِ شاعری خواہد ز من
کم نظر بیتابیٔ جانم ندید | آشکارم دید و پنہانم ندید
فطرتِ من عشق را در بر گرفت | صحبتِ خاشاک و آتش در گرفت
حق رموزِ ملک و دیں بر من کشود | نقشِ غیر از پردۂ چشمم ربود

ان کی ساری شاعری انہیں رموز کی تعلیمات سے لبریز ہے۔ یہاں تک کہ قطعات اور غزلیات
بھی۔ اس جگہ اجمالاً چند عنوانات لکھتا ہوں۔

خودی| یہ ڈاکٹر صاحب کا خاص مضمون ہے۔ جس پر ان کی مستقل مثنوی موجود ہے۔ خودی سے
مراد خود پسندی نہیں بلکہ خود شناسی ہے۔ یہ مجموعہ بھی اس تعلیم سے خالی نہیں۔ فرماتے ہیں۔

چہ پرسی از کجا یم چیستم من ... بخود پیچیدہ ام تا زیستم من
دریں دریا چو موج بے قرارم ... اگر بر خود نہ پیچم نیستم من

شبنم

گفتند فرود آئے زاوجِ مہ و پرویز ... بر خود زن و با بحر پر آشوب بیامیز
با موج درآویز
نقش دگر انگیز
تابندہ گہر خیز
من عیش ہم آغوشیِ دریا نخریدم ... آں بادہ کہ از خویش ربایدِ نچشیدم
از خود نرمیدم
ز آفاق بریدم
بر لالہ چکیدم

زندگی| اس عالم کائنات کا ذرہ ذرہ سرگرم پیکار ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ یہی پیکار اصل زندگی ہے۔ اخلاقیات کے نامور معلم شیخ سعدی نے کہا تھا کہ

اگر خواہی سلامت برکنار است

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا ... نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش درآویز ... حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

مولانا بیدل نے کسی غزل میں کہا ہے "بشکند رنگم بدریا چوں حباب بشکند" اس پر کہتے ہیں۔

از نزاکتہائے طبعِ موشگافِ او مپرس ... کز دم بادے زجاج شاعر ما بشکند

کسے کو داند گفتن ز کارزارِ زندگی   می پرد در نگش بدریا چوں حباب بشکند

وہ اس عالم ہی کو پسند نہیں کرتے جس میں یزداں کے مقابلہ میں اہرمن نہ ہو۔

مزی اندر جہانِ کور ذوقے   کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

عمل | ڈاکٹر صاحب کا سارا کلام درحقیقت درسِ عمل ہے۔ اور یہی نوائے وقت ہے۔ ستاروں کی زباں سے فرماتے ہیں۔

خنک انساں کہ جانش بے قرار است   سوارِ راہوارِ روزگار است

قبائے زندگی بر قامتش راست   کہ او نو آفرین و تازہ کار است

اُنا کے جواب میں کہا ہے

ساحلِ افتادہ گفت۔ گرچہ بسے زیستم   ہیچ نہ معلوم شد۔ آہ کہ من چیستم

موجِ ز خود رفتۂ۔ تیز خرامید و گفت   ہستم اگر میروم۔ گر نروم نیستم

اسلام | ڈاکٹر صاحب کی شاعری کا اصلی سرچشمہ قرآنِ عظیم ہے۔ اسی کے رموز کو لیکر وہ اس ساز پر نغمہ سرائی کرتے ہیں۔ وہ پکار پکار کے کہہ رہے ہیں کہ دینِ اسلام ہر قسم کی انسانی صلاح و فلاح پر حاوی اور دینی و دنیوی ترقیات کا کفیل ہے۔

ایک غزل میں کہتے ہیں۔

تو رہ شناس نئی و ز مقام بے خبری   چہ نغمہ ایست کہ در بربطِ سلیمیٰ نیست

ایک دوسری غزل میں کہا ہے۔

برکش آں نغمہ کہ سرمایۂ آب و گلِ تست   اے ز خود رفتہ تہی شو ز نوائے دگراں

مغربی تہذیب جو بدبختی سے مسلمانوں کی نگاہوں کو خیرہ کیے ہوئے ہے ان کے نزدیک نہایت نااستوار بنیاد پر قائم ہے۔ اور وہ ایک ملمع کاری ہے جس کی تہ میں انسانیت اور ہمدردی کا نام و نشاں نہیں ہے۔ فرماتے ہیں۔

فرنگ گرچہ سخن با ستارہ می گوید   حذر کہ شیوۂ او رنگِ جوزنی دارد

رندِ ایں میخانہ را یک لغزشِ مستانہ نیست　　　　در ہوایش گرمیِ یک آہِ بے تابانہ نیست

مسلمانوں پر مدتہائے دراز سے عجمی ادبیات نے اثر ڈال کر ان میں جو افسردگی پیدا کر رکھی ہے اس سے بھی وہ سخت بیزار ہیں۔ اور پھر ان کو اصل عربی اسلامی رنگ میں لانا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

مے گذشتہ و جامے شکستنی دارد　　　　دگر بدشتِ عرب خیمہ زن کہ بزمِ عجم

اخوۃ اسلامی | مسلمانوں نے جہالت کی وجہ سے جو نسلی اور ملکی امتیازات پیدا کر کے باہمی تفرقے ڈال رکھے ہیں ان کو وہ حرام سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ قرآن نے کل مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی بنا دیا ہے۔ اور یہی اخوت اسلامی ملت کی اصلی طاقت ہے۔ فرماتے ہیں۔

چمن زادیم و از یک شاخساریم　　　　نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم

کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم　　　　تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است

محنت | دنیا میں ہر شخص فطرتاً اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اس کی محنت کا کل ثمرہ اس کو ملے۔ لیکن دول مغربیہ کی سرمایہ پرستی کی وجہ سے عالم کی اقتصادی حالت اس قدر پر پیچ ہو گئی ہے کہ مزدور اپنا پورا حق نہیں پا سکتا۔ بلکہ سرمایہ دار بھی اس میں شریک ہو جاتا ہے۔ یورپین ممالک میں سرمایہ اور محنت کی جنگ نہایت اہمیت پکڑ گئی ہے۔ اور کچھ تعجب نہیں کہ روس کی طرح دیگر مغربی سلطنتیں بھی اس کی رو میں بہ جائیں۔

ڈاکٹر صاحب سرمایہ داری کے خلاف جہادِ عظیم میں مصروف ہیں۔

موسیو لینن صدر جمہوریۂ روس کی زباں سے کہتے ہیں۔

مثالِ دانہ تہِ سنگ آسیا بودہ است　　　　بسے گذشت کہ آدم دریں سرائے کہن

اسیرِ حلقۂ دامِ کلیسیا بودہ است　　　　فریبِ زاری و افسونِ قیصری خوردہ است

قمیصِ خواجہ کہ رنگیں ز خونِ ما بودہ است　　　　غلامِ گرسنہ دیدی کہ بر درید آخر

ردائے پیرِ کلیسا قبائے سلطاں سوخت　　　　شرارِ آتشِ جمہور کہنہ ساماں سوخت

کارل مارکس کی زبان سے جو رفتگان عالم بالا میں سے ہے یہ آواز سنائی دیتی ہے۔

رازدان جزو و کل از خویش نامحرم شدہ است　　آدم از سرمایہ داری قاتل آدم شدہ است

ثالثاً کہتا ہے۔

عقل بدورد آفرید فلسفۂ خود پرست　　درس رضا مید ہد بندۂ مزدور را

یہ درد اُن کے دل میں اس قدر ہے کہ کشمیر جنت نظیر کے دلفریب مناظر میں بھی اس کو یہی نتیجہ

کشیری کہ با بندگی خو گرفتہ　　بتے می تراشد ز سنگ مزارے

ضمیرش تہی از خیال بلندے　　خودی ناشناسے ز خود شرمسارے

بریشم قبا خواجہ از محنت او　　نصیب تنش جامۂ تار تارے

نہ در دیدۂ او فروغ نگاہے　　نہ در سینۂ او دل بیقرارے

تبلیغ اسلام! اسلام کی تبلیغ اہم ترین فریضۂ امت ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس زمانہ میں جو بعض ہندوستانی مغربی ممالک میں تبلیغ کے لیے جاتے ہیں یہ کہاں تک بجا ہے جبکہ خود ہندوستان اور اس کے ہمسایہ ممالک میں لاکھوں کروڑوں مسلمان جاہل اور گمراہ پڑے ہوئے ہیں۔ غیروں کو مسلمان بنانے کی بہ نسبت ان کی تعلیم اور ہدایت مقدم ہے۔ اسی بنیاد پر ڈاکٹر صاحب فرنگستان میں تبلیغ کی اس وقت ضرورت نہیں سمجھتے۔ اور ایسے مبلغوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

زمانہ باز برافروخت آتش نمرود　　کہ آشکار شود جوہر مسلمانی

بیا کہ پردہ ز داغ جگر بر اندازیم　　کہ آفتاب جہانگیر شد ز عریانی

ہزار نکتہ زدی پیش دلبران فرنگ　　گداختی صنمان را بعلم برہمانی

خبر ز شہر سلیمیٰ بدہ حجازی را　　شرار شوق فشاں در ضمیر تورانی

رہ عراق و خراساں زن اے مقام شناس　　بہ بزم عجمیان تازہ کن غزل خوانی

بسے گذشت کہ در انتظار زخمہ وریست　　چہ نغمہا کہ نخفتہ بہ ساز افغانی

حدیث عشق با اہل ہوس چہ میگوئی　　بچشم مور مکش سرمۂ سلیمانی

جمہوریت | ڈاکٹر صاحب کا سارا کلام دیکھنے سے یہ صاف نمایاں ہوتا ہے کہ ان کا آب و گل حریت اور مساوات اور خمیر جمہوریت کا ہے لیکن ان کا یہ قول

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو — کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

نہایت تعجب انگیز ہے۔ اس لیے کہ اگر وہ "پختہ کار" صاحب بھی خر نما شخص نکلے تو پھر کیا ہوگا۔ کیونکہ یہ کون کہہ سکتا تھا کہ ملائکہ کا جو استاد ہے وہی راندۂ درگاہ اور ملعون بارگاہ ہوگا۔ وہ غریب خود اس سے بے خبر تھا۔ چنانچہ کہتا ہے۔

بر در نوشتہ بود کہ ملعون شود یکے — بردم گماں بہر کس و بر خود گماں نبود

اس میں کچھ شک نہیں کہ رائے صواب ہر معاملہ میں صرف ایک ہی ہوتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ ایک شخص سے حاصل کی جائے یا ایک جماعت سے۔ مشورہ میں دو فائدے ہیں۔

(۱) نتیجہ خراب ہونے کی صورت میں ملامت کا خوف نہیں رہتا۔ اسی بنیاد پر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی جن کی رائے کے قطعی درست ہونے میں شبہ نہیں تھا "شاورہم فی الامر" کا حکم دیا گیا۔

(۲) بہ نسبت ایک شخص کے جماعت میں اغلباً مذاق صحیح موجود ہوتا ہے۔ اس لیے عام مسلمانوں کے واسطے "امرہم شوریٰ بینہم" نازل ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کی اس رائے کی کوئی توجیہ میری سمجھ میں بجز اس کے نہیں آتی کہ میں اس کو ان کی تعلیمات سے نکال کر مطائبات میں شمار کرلوں۔

خاتمہ | ڈاکٹر صاحب کا کلام اگرچہ تمام تر آورد ہے۔ لیکن اس میں انتہائی لطافت اور انتہائی ایجاز ہے۔ یعنی فصاحتِ لفظی اور بلاغتِ معنوی دونوں کی پوری پوری رعایت ملحوظ ہے۔ جو مضمون ہے وہ نہایت صاف۔ برجستہ اور نکتہ سنجی اور ندرتِ خیال کا پسندیدہ ترین نمونہ ہے۔ اندازِ بیاں اور طرزِ ادا انوکھا اور دلکش ہے۔ ان کی توجہ خیالات کی رفعت اور معانی کی بلندی کی طرف زیادہ رہتی ہے۔ صنائع و بدائع اور تشبیہات و استعارات کے پیچھے وہ نہیں پڑتے۔ لیکن باوجود اس کے لفظوں کی لطافت اور ترکیبوں کی نزاکت کو کہیں ہاتھ

ے جانے نہیں دیتے۔

ان کا قدم کسی کے جادۂ تقلید سے قطعاً بری ہے۔ گو کہیں کہیں مغز سخن اُنہوں نے مولانائے روم
سے اخذ کیا ہو لیکن اپنا راستہ جو بالکل اچھوتا اور نیا ہے خود ہی نکالا ہے۔

ان کا جام شاعری اس سوگواری کی تلخی سے بھی پاک ہے جو قومی مرثیہ گویوں کے کلام میں
پائی جاتی ہے۔ وہ ماضی کے ماتمی نہیں ہیں بلکہ شاندار مستقبل کے مژدہ گو ہیں۔ ان کی شگفتہ
طبیعت ایک بلبل ہے جو خزاں کی نوحہ خوانی نہیں کرتی بلکہ بہار کی آمد کا نغمہ گاتی ہے۔ حقیقت
یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری سے ملت جدیدہ کی دماغی تعمیر میں بہت بڑا حصہ لے رہے ہیں۔

طباعت | اس دیوان کی چھپائی کی خوبیوں کی داد نہ دینا بھی ایک قسم کی بیداد ہے۔ ہمارے ملک
میں مطبوعات کی تصحیح بڑی مشکل چیز ہے۔ میں خود اپنی تصنیفات ہر چند اہتمام سے چھپواتا ہوں
لیکن پھر بھی ان میں غلطیاں رہ جاتی ہیں جن سے خونِ جگر پینا پڑتا ہے۔ لیکن اس دیوان میں مجھے
شروع سے آخر تک کہیں ایک نقطہ کی بھی غلطی نظر نہیں آئی۔ کاغذ چکنا دبیز۔ لکھائی اعلیٰ درجہ
کی اور چھپائی بہت صاف ہے۔

الغرض یہ دیوان صورتاً اور معناً ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے۔

اقطابِ انگورہ

ڈاکٹر رضا نور بے وزیر حفظان صحت حکومت انگورہ

مشاہیر انگورہ میں ڈاکٹر رضا نور بے کی شخصیت وہ ممتاز و سربلند شخصیت ہے جو جدید ترکی تحریک میں ایک خاص مرتبہ رکھتی ہے' یہ وہی ڈاکٹر رضا نور بے ہیں جنھوں نے مشہور مجلس ''لوزان'' میں حکومت عالیہ انگورہ کی نمایندگی کرتے ہوئے موسیو پوانیکار صدر اعظم حکومت فرانس، سائینور مسولینی صدر اعظم حکومت اٹلی اور لارڈ کرزن وزیر خارجہ حکومت انگلستان ایسے عظیم الشان یوروپی مدبرین کا دندان شکن مقابلہ کیا۔

ممدوح کا سال پیدائش ۱۸۷۸ء ہے' ابتدائی تعلیم ''قسطنطنیہ کالج'' ''موسومہ مکتب سلطانی'' میں ہوئی' اُس کے بعد آپ نے فرانس میں سلسلہ شروع کیا اور پیرس یونیورسٹی سے ڈاکٹری بہ اعلیٰ نمبروں سے کامیابی حاصل کی' پھر آسٹریا اور روس کی سیاحت کے بعد آپ نے آستانہ میں ڈاکٹری شروع کی' چونکہ ڈاکٹر صاحب ممدوح کو مبدا فیاض سے غیر معمولی دل و دماغ عطا ہوا ہے اس لیے گو آپ ڈاکٹری پیشہ آدمی تھے لیکن ترکی سیاسیات کے ماحول نے آپ کو ملکی و قومی معاملات و مسائل میں حصہ لینے کی طرف ہمیشہ مائل رکھا اور آپ برابر سیاسیات میں حصہ لیتے رہے، ڈاکٹر صاحب ترکی زبان کے نہایت ممتاز شاعر و ادیب بھی ہیں اور تقریر میں تو اس درجہ ملکہ بڑھا ہوا ہے کہ اپنے ملک کے بہترین مقرروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ''ترکی'' ''فرنچ'' اور ''روسی'' زبانوں میں کامل مہارت رکھتے ہیں ڈاکٹر صاحب کے علمی اور سیاسی بلند پایگی سے تمام ارکان حکومت اچھی طرح واقف تھے، لہذا ۱۹۰۸ء کے انتخاب پارلیمنٹ کے موقع پر آپ مقام ''سینوب'' کی طرف سے ترکی پارلیمنٹ میں نمایندہ مقرر ہوئے' لیکن پارلیمنٹ میں ابھی ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ آپ کو ارکان انجمن اتحاد و ترقی کے ساتھ بعض اصول کار میں اختلاف پیدا ہو گیا' چونکہ ڈاکٹر صاحب ایک زبردست اور مضبوط دل و

دماغ کے آدمی ہیں لہذا آپ نے اپنے ضمیر کے موافق نہایت جرأت و بے باکی سے ارکان انجمن اتحاد و ترقی کی مخالفت شروع کردی اور یہ مخالفت اس درجہ بڑھی کہ ارکان حکومت کو ڈاکٹر صاحب کی مقتدرانہ حیثیت سے خوف پیدا ہو گیا آخر کار انجمن اتحاد کے سربرآوردہ ارکان نے آپ پر انجمن کے خلاف سازش کا الزام لگا کر ۱۹۰۹ء میں آپ کو قید کر دیا۔[۹۵]

ڈاکٹر صاحب کے عائد شدہ الزامات میں ایک الزام یہ بھی تھا کہ آپ فرید پاشا اور کامل پاشا کے موئد و معاون ہیں حالانکہ واقعہ اس کے خلاف تھا، چند ماہ بعد جب آپ رہا ہوئے تو آپ نے آستانہ کی سکونت کو ترک کر کے سوئٹزرلینڈ چلے گئے اور شہر "برن" میں ڈاکٹری پریکٹس شروع کر دی، گو ڈاکٹر صاحب اس وقت ارکان انجمن اتحاد و ترقی سے سخت نقصان و تکلیف اٹھا چکے تھے لیکن اس پر بھی آپ نے ان اصول کی مخالفت سے منہ نہ موڑا جن کی بنا پر آپ قید و گرفتار کیے گئے تھے، اور سوئٹزرلینڈ سے آپ نے مشہور اتحادی صدر الصدور حسین جاہد بے کو ایسے معرکۃ الآرا خطوط لکھے کہ بالآخر انھیں اخبار "طنین قسطنطنیہ" میں ڈاکٹر صاحب سے معافی مانگنا پڑی، ڈاکٹر صاحب شہر "برن" میں چند ماہ قیام فرمانے کے بعد "جینوا" چلے گئے، شہر جینوا سوئٹزرلینڈ کا ایک نہایت دلکش و پر فضا مقام ہے جہاں ڈاکٹر صاحب کے ادبی کمالات نے آپ کو چین سے نہ بیٹھنے دیا، اور چونکہ آپ فرانسیسی زبان کے بے مثل ماہر ہیں لہذا آپ نے جینوا میں دو فرانسیسی ڈراموں موسومہ "شمسون" اور "دلیلہ" کا ترکی زبان میں منظوم ترجمہ کیا، اور موسیقی کے راگوں کو ترجمہ میں اپنی اصلی حالت پر چھوڑ دیا، ترجمہ کے اختتام پر آپ پیرس گئے تا کہ یہاں ماہرین فن کے مشورہ

سلہ [۹۵] جمال پاشا مرحوم نے اپنے تذکرہ میں اس واقعہ کو تفصیل سے لکھا ہے اور انھیں کی کوشش سے ڈاکٹر رضا نور کو اس وقت انجمن اتحاد و ترقی کی حکومت نے کافی روپیہ دیکر اس عدہ پر یورپ بھیجا تھا کہ وہ ایک مدت تک قسطنطنیہ واپس نہ آئیں۔ خاندان شاہی کے بعض افراد جو حکومت قسطنطنیہ کے مخالف تھے واقعی ڈاکٹر رضا نور کے مربی تھے اور ڈاکٹر کو ان سے خاص تعلق تھا (مدیر)

سے ان ڈراموں کے گانے کو ترکی گانے کے طریقوں پر ترتیب دیا اور پھر فرانسیسی گانے
ان کا مقابلہ کریں، ڈاکٹر صاحب کی اس گزارش سے اندازہ ہوا ہوگا کہ ڈاکٹر ممدوح نے
غربت و مسافرت کی حالت میں بھی اپنی قوم کی دماغی و ذہنی خدمت و اصلاح سے گریز
نہ کیا، اور اپنے علمی تبحر اور فیضان سے وہ قوم و زبان کو برابر فائدہ پہونچاتے رہے۔

مذکورہ واقعہ اپریل ۱۹۱۴ء کا ہے جبکہ ڈاکٹر صاحب پیرس میں مقیم تھے، ابھی آپ سوئٹزرلینڈ
واپس ہونے والے تھے کہ جنگ یورپ کا آغاز ہوا، اور آپ ڈاکٹر صاحب کا سوئٹزرلینڈ یا قسطنطنیہ
جانا نا ممکن ہو گیا، دوسری مصیبت یہ پیش آئی کہ آپ کے پاس خرچ بھی نہ رہا جس کے ذریعہ وہ پیرس
کے شاہانہ مصارف برداشت کرتے، لیکن پھر بھی باحوصلہ ڈاکٹر نے ان مشکلات کو اہمیت نہ دی
اور اپنی اہلیہ کے زیورات فروخت کر کے اوقات بسر کرنے لگے، یہاں تک کہ جب آپ اپنے مقصد
میں کامیاب ہو گئے تو آپ ستمبر ۱۹۱۴ء میں مصر چلے گئے جہاں آپ نے "شارع عبدالعزیز" پر
اپنا مختصر سا مطب کھولا، ابتداء میں مصر والوں نے آپ کی اچھی طرح خاطر مدارت کی اور کافی تعداد
میں مریضوں نے آپ کی طرف رجوع کیا، لیکن یکایک آپ کا کام رُک گیا، اور اس کی وجہ یہ
ہوئی کہ آپ کے بعض ترک دشمنوں نے برطانوی فوجی حکومت سے آپ کی شکایت کی اور اُدھر
آپ کے ہم پیشہ ڈاکٹروں میں یہ افواہ اُڑائی کہ ڈاکٹر رضا نوربے برطانیہ کی فوجی حکومت کی
نگرانی میں ہیں اور سادہ لوح عوام پر ظاہر کیا کہ جو لوگ ڈاکٹر رضا نوربے کے مطب میں جاتے
ہیں وہ ممکن ہے کہ نظر بند کر لیے جائیں۔

ڈاکٹر صاحب کے دشمنوں نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ وہ برابر برطانوی فوجی حکومت کے
افسروں کے پاس جا کر ڈاکٹر ممدوح کی طرف سے اُن کو بدگمان کرتے رہے، اور اس کا نتیجہ یہ نکلا
کہ بار بار ڈاکٹر صاحب کو فوجی حکام نے بُلایا اور جوابات طلب کیے روز روز کی اس مصیبت
نے ڈاکٹر صاحب کے صبر و استقلال کو رخصت کر دیا اور دنیا اُنکی آنکھوں میں تاریک ہو گئی

ایسی حالت میں اگر اُن کے ساتھ اُن کی اہلیہ محترمہ ہوتیں تو وہ اس پریشان کن زندگی سے
تنہا رہ کو بہتر خیال کرتے کہ اپنے کو قید یا نظر بند کرا لیتے جیسا کہ آپ نے اپنے دوستوں سے
بارہا اس خیال کا اظہار کیا تھا۔
جب وسط دانیال پر معرکہ آرائی نے شدت اختیار کر لی اور انگریزی بحری بیڑہ کو متواتر
ناکامیاں اُٹھانی پڑیں تو برطانوی اس سے بہت متاثر ہوئے اور اسی زمانہ میں مصر کی
فوجی حکومت نے ڈاکٹر رضا توبے کو طلب کیا۔ اس بلاوے سے ڈاکٹر صاحب نے خیال کیا
کہ اب وہ گھر واپس نہ آئیں گے اور نظر بند کر دیئے جائیں گے اُس وقت آپ کے پاس کافی روپیہ
نہ تھا جو اپنی اہلیہ کی ضروریات کے لیے محفوظ کر دیتے اس لیے آپ نے اپنے بعض دوستوں
کو وصیت کی کہ وہ اُن کی بیوی کی خبر گیری کرتے رہیں اور شام کے ایک معتمد شخص سے خواہش
ظاہر کی کہ وہ اُن کی بیوی کے پاس اپنی بیوی کو رکھیں، اور مصائب و آزمائش کا دور ختم ہونے تک
اس احسان کو جاری رکھیں، یہ تمام انتظامات کرنے کے بعد ڈاکٹر رضا توبے "سولے ہوٹل"
میں پہونچے اور اُس چھوٹے سے کمرہ میں داخل ہوئے جس میں چھ فوجی افسر بیٹھے ہوئے تھے،
ان میں دو افسر بڑے درجہ کے تھے، ڈاکٹر صاحب اپنی کرسی پر بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک
بڑے افسر نے اُن کو مخاطب کر کے کہا،
"ڈاکٹر شاید آپ ہمارے احسانات بھول گئے، ہم نے اُس وقت تک وہ معاملہ آپ کے ساتھ
نہیں کیا جو دشمن کی رعایا کے ساتھ کرنا چاہیے"!
ڈاکٹر صاحب۔ میں آپ کے اس سلوک کا شکر گزار ہوں۔
افسر۔ لیکن افسوس ہے کہ آپ نے اپنے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا، اور آپ نے اطمینان
و سکون سے رہنا پسند نہیں کیا جس کی ہم کو آپ سے امید نہ تھی بلکہ آپ نے اتحاد و ترقی
کا پروپیگنڈا مصر میں شروع کر دیا، اور آپ یہاں بھی برابر تبلیغ و اشاعت کا کام کر رہے ہیں۔
ڈاکٹر صاحب۔ آپ کو جو اطلاع ملی ہے غلط ہے، میں انجمن اتحاد و ترقی کا دشمن ہوں اور

عثمانی پارلیمنٹ میں بحیثیت ایک ممبر کے میں ہمیشہ انجمن اتحاد و ترقی کا مخالف رہا ہوں اور اس کا ثبوت میرے مضامین اور وہ پمفلٹ ہیں جو میں نے شائع کیے ہیں علاوہ ازیں میری حیثیت مصر میں ایک اجنبی شخص کی سی ہے، نہ مصری زبان سے واقف ہوں اور نہ مصری لیڈروں سے میرے تعلقات ہیں، لہذا میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایسی حالت میں مجھ پر کیوں یہ الزام لگایا گیا کہ میں برطانیہ کے خلاف پروپیگنڈا کر رہا ہوں؟ آپ کو معلوم ہے کہ میں ایک عزلت نشین شخص ہوں اور بجز ڈاکٹری کے میرا اور کوئی کاروبار یا تعلق نہیں ہے۔

افسر۔ کیا آپ اس کا وعدہ کرتے ہیں اور حلف اٹھاتے ہیں کہ آپ سیاسیات میں کسی قسم کا کوئی حصہ نہ لیں گے اور کوئی کام ایسا نہ کریں گے جو ہمارے لیے نقصان رساں ہو۔

ڈاکٹر صاحب۔ میں آپ کو کسی قسم کا ضرر پہونچانے سے عاجز ہوں، میں ایک غریب الوطن آدمی ہوں، ہاں اگرچہ مجھ میں اس کی قدرت ہوتی کہ میں اپنے وطن کی کوئی خدمت کر سکتا اور یہاں رہ کر آپ کے خلاف کوئی کارروائی کر سکتا تو میں ضرور ایسا کرتا، لیکن اب کہ میں ایسا نہیں کر سکتا مجھے توقع ہے کہ آپ میرے خلاف شکایتوں پر کان نہ دھریں گے اور اگر آپ کا ایسا ہی ارادہ ہے تو میں قید و نظر بندی کے لیے تیار ہوں، آپ جہاں چاہیں مجھے اور میری بیوی کو نظر بند کر دیں۔

افسر۔ آپ کے ایک دوست نے آپ کے متعلق ہم سے جو باتیں بیان کی ہیں اور اگر آپ فی الحقیقت انجمن اتحاد و ترقی کے دشمن ہیں تو پھر آپ کیوں نہیں ہماری مدد کرتے؟ ہم چاہتے ہیں کہ آپ کو اپنے بیڑہ کے ساتھ درہ دانیال کے معرکہ میں بھیج دیں جہاں آپ انگریزی فوجوں کی رہنمائی کریں اور انھیں داخلہ قسطنطنیہ میں مدد دیں۔

ڈاکٹر صاحب۔ جناب! الادرہ دانیال پر آپ کی ڈیڑھ لاکھ سپاہ پڑی ہوئی ہے اور پوری کوشش سے کام کر رہی ہے لیکن بایں ہمہ وہ آستانہ میں داخل نہیں ہو سکتی ایسی صورت میں کیا آپ مجھ کو اپنے بڑے بڑے جنگی اور ہوائی جہازوں سے بھی زیادہ طاقتور سمجھتے ہیں، اس موقع پر میں آپ کو اس امر سے آگاہ کر دینا چاہتا ہوں کہ میں "ترکی النسل" ہوں، قوم پرست

ہوں، پھر مسلمان ہوں، پھر کیا آپ مجھ سے ملک مذہب کا خائن بنانا چاہتے ہیں؟ میں نے
یہ ضرور کہا تھا کہ میں ارکان انجمن اتحاد و ترقی کا دشمن ہوں لیکن یہ نہیں کہا تھا کہ میں ملک مذہب
اور اپنی قوم کا خائن بھی ہوں، یاد رکھیے میں ترک ہوں اور مجھ سے اس قسم کا مطالبہ میری توہین ہے۔
افسر۔ معاف کیجئے اس گزارش سے آپ کی توہین مقصود نہ تھی بلکہ مقصد یہ تھا کہ آپ
اپنے اثر و اقتدار سے انجمن کے ارکان کو نقصان پہونچانے میں مدد دیں جو ترکی قوم کو
تباہی کی طرف سے جا رہے ہیں۔
ڈاکٹر صاحب۔ اس وقت آپ سے تنہا ارکان انجمن جنگ آزما نہیں ہیں بلکہ پوری ترکی
قوم آپ کے مقابلہ میں درہ دانیال پر کھڑی ہے، بہتر ہو کہ آپ مجھ سے اس قسم کا مطالبہ کریں
ورنہ بصورت دیگر آپ شوق سے میرے ساتھ دشمن کی رعایا کا سا سلوک کریں،
افسر۔ ڈاکٹر صاحب آپ شریف آدمی ہیں اور آپ کی بات پر ہم کو کامل یقین ہے، اس لئے
آپ مصر میں آزاد زندگی بسر کریں آپ پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جائے گی۔
یہ کہہ کر دونوں فوجی افسروں نے ڈاکٹر صاحب کو دروازہ تک رخصت کیا اور گفتگو کے
درمیان جو غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی اس کی معذرت چاہی، اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے جنگ
یورپ کا سارا زمانہ مصر میں گزارا اور پھر ان سے کوئی بازپرس نہ ہوئی۔

اگست ۱۹۱۸ء میں جب ترکی اتحادی معاہدہ پر دستخط ہو گئے تو ڈاکٹر رضا نور بے آستانہ
تشریف لے آئے، اس وقت قسطنطنیہ کی حالت نہایت ابتر ہو رہی تھی، ترکی گورنمنٹ پر خائنوں
کا قبضہ تھا جو سب کے سب اتحادیوں کے زیر اثر تھے، اور تمام ترکی مدبرین اپنی آزاد خیالی کے باعث
قید و گرفتار ہو رہے تھے، ترکی ممالک پر اتحادی اور یونانی فوجیں قبضہ جما رہی تھیں غرض ان حالات
کے لحاظ سے ڈاکٹر صاحب گو نہایت رنجیدہ اور افسردہ خاطر تھے لیکن وہ تنہا اس غاصبانہ غلبہ
کا مقابلہ بھی نہ کر سکتے تھے آخر کار ۱۹۱۹ء میں غازی اعظم مارشل مصطفیٰ کمال پاشا کی تحریک کا

آغاز ہوا، اور آزاد خیال ڈاکٹر رضا نور بے گو غازی اعظم کی جماعت میں جا ملے، اور اسی وقت سے ڈاکٹر صاحب کی شہرت کا زمانہ شروع ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب کی سیاسی قابلیت ترکی حلقوں میں پہلے ہی مسلم تھی اس لیے اس وقت ڈاکٹر صاحب کا انگورہ پہونچکر احرار کی تحریک میں حصہ لینا محرکین کے لیے عین امداد سے کسی طرح کم نہ تھا، چنانچہ یہ آپ کی مسلمہ اہلیت ہی کا نتیجہ تھا کہ آپ سب سے پہلے قومی وزارت میں "وزیر حفظان صحت" مقرر ہوئے، اور انگورہ کیبنیٹ میں آپ کی شرکت اطمینان و مسرت کی نظر سے دیکھی گئی،

مارشل مصطفیٰ کمال پاشا کی موجودہ تمام حیرت انگیز کارگزاریاں آج دنیا جہان سے جو خراج تحسین وصول کر رہی ہیں وہ در اصل اُس عہد و ضابطہ کے نتائج و برکات ہیں جو فروری ۱۹۲۰ء کو انگورہ کی قومی مجلس نے منظور و نافذ کیا تھا اور جو "جدید ترکی" کی تاریخ میں ہمیشہ "میثاق ملی" کے نام سے یاد کیا جائے گا، ترکی سیاسیات کا مطالعہ کرنیوالے حضرات اس "میثاق ملی" کی اہمیت اور اُس کی سیاسی مرتبت سے اچھی طرح واقف ہیں جس کی رو سے انگورہ میں ترکی قوم پسندوں نے استقلال و حریت کی آخری مگر خونریز قسم کھائی تھی، یہ اہم ترین میثاق ملی ڈاکٹر رضا نور بے کی سیاسی مآل اندیشی اور دور بینی کا بہت زیادہ مرہون ہے جس میں متعدد واقعات کی ترمیم ڈاکٹر صاحب نے فرمائی تھی، ڈاکٹر صاحب نے اس عہد نامۂ قومی میں جن دفعات کا اضافہ فرمایا ہے وہ ترکی کے تابناک مستقبل کی زبردست ضامن ہیں، ڈاکٹر رضا نور بے اگرچہ وزیر حفظان صحت تھے لیکن کام کرنے والوں کی ذمہ داریاں ہمیشہ بڑھتی رہتی ہیں چنانچہ اسی زمانہ میں آپ کو محکمۂ تعلیمات عامہ میں بھی خدمات انجام دینی پڑتی تھیں اور خالدہ ادیب خانم کی مشہور وزارت میں آپ "ڈائرکٹر تعلیمات" کے فرائض انجام دیتے تھے، ان خدمات نے انگورہ اور مجلس وطنی میں ڈاکٹر صاحب کے اعتماد کو حد درجہ ممتاز بنا دیا لہٰذا آخر ۱۹۲۰ء میں آپ حکومت عالیہ انگورہ کے محکمۂ وزارت خارجیہ میں لے لیے گئے جہاں چند ماہ کام کرنے کے بعد فروری ۱۹۲۱ء میں مشہور سیاست داں

یوسف کمال بے وزیر خارجہ انگورہ کے ہمراہ ماسکو تشریف لے گئے، مملکت روس کے سفر کا منشاء یہ تھا کہ حکومت روس سے دوستانہ روابط و علائق پیدا کیے جائیں، انگورہ گورنمنٹ اور روس کی بالشویک گورنمنٹ کے درمیان کسی معاہدہ سیاسی کا قیام ایک اہم ترین کام تھا جسے بالغ نظر اور پختہ کار ڈاکٹر رضا نور بے نے بکمال خوش اسلوبی انجام دیا، چونکہ ڈاکٹر صاحب اپنے زمانِ سیاحت میں عرصہ تک "ماسکو" میں رہ چکے تھے اس لیے روسی ارباب سیاست آپ کی مسلمہ قابلیت سے پہلے ہی مرعوب تھے اس لیے ڈاکٹر صاحب کی تمام تر جد و جہد نہایت مفید و منفعت بخش طریق پر کامیاب ہوئی انگورہ گورنمنٹ اور روس گورنمنٹ کے دوستانہ تعلقات کے حصول و قیام کے سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب کو دو مرتبہ مملکت روس کا سفر کرنا پڑا، اور یہ دونوں سفر سیاسی نقطۂ نظر سے نہایت کامیاب رہے، اس کے بعد اندرون انگورہ خصوصاً مجلس وضع آئین و قوانین میں ڈاکٹر صاحب کی خدمات و اصلاحات کا تذکرہ ایک طویل فرصت چاہتا ہے جس کی حیرت انگیز اہمیت کو جدید ترکی کی تاریخ ہی پیش کر سکتی ہے۔

اکتوبر ۱۹۲۲ء میں بندرگاہ مدانیہ میں ترکی اتحادی فوجی افسروں کی کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس کا مقصد ترکی و یونانی جنگ کا التوا اور اتحادیوں کے ساتھ سوئٹزرلینڈ میں ایک عام مجلس صلح کا انعقاد تھا، مدانیہ کانفرنس میں متارکہ قرار پایا تھا اس کی تعمیل میں ۲۰ نومبر ۱۹۲۲ء سوئٹزرلینڈ کے مقام "لوزان" میں وہ ہنگامہ آرا صلح کانفرنس منعقد ہوئی جو سیاسیات مشرقیہ اور بین الاقوامی مجالس میں اپنی نظیر آپ ہے۔

انگورہ گورنمنٹ کی طرف سے جو وفد مصالحت تدبیر پناہ مارشل عصمت پاشا کی سرکردگی میں منتخب ہوا اس میں ڈاکٹر رضا نور بے نائب رئیس وفد کی طرف سے نومبر ۱۹۲۲ء میں لوزان بھیجے گئے، اس وقت لوزان میں جن ممالک کے وفود آئے تھے اُن کی تعداد دس تھی، ان میں حسب دستور وفد کے ۳۵ ممبر تھے جن کی مجموعی تعداد ۳۵۰ تھی، گویا ۳۵۰ مغربی سیاست دان اصحاب کے مقابلہ میں یہ ۳۵ آدمی تھے جنہیں سیاسیات و معاشرت، تجارت و قانون،

مالیات، وبین الاقوامی مسائل جیسے میں ان پختہ کار مغربی سیاست آگاہ افراد کا مقابلہ کرنا تھا اور اطلاعات سے ثابت ہے کہ ترکی وفد کی طرف سے ڈاکٹر رضا نور بے نے جس قدر کام کیا ہے اور آپ نے جس قدر دماغی محنت کی ہے عصمت پاشا کے بعد کسی دوسرے ترکی نمایندہ نے نہیں کی، جس کے دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ لارڈ کرزن، موسیو پانیکا، اور سائنور مونٹینی ایسے عظیم المنزلت سیاسی نمایندوں کو "لوزان" میں جو شکست ہوئی وہ وہ ڈاکٹر رضا نور بے ہی کے دانش پناہ دماغ اور سیاسی تبحر کا نتیجہ ہے۔

۲۱ دسمبر ۱۹۲۲ء میں لارڈ کرزن ایسے پختہ کار مدبر نے جس وقت مسئلہ موصل کے متعلق بحث چھیڑی اور موصل کو عراق کا جزو صحیح ثابت کرنے کے لیے اُس نے دلائل و براہین سے کام لیا، تو یورپ کے اعلیٰ طبقوں میں خیال کیا جانے لگا تھا کہ لارڈ کرزن کے دلائل کا رد ترکی وفد کے لیے ناممکن ہے اور یہ واقعہ ہے کہ لارڈ کرزن نے مسئلہ کو جس اہم پیمانہ پر مجلس صلح میں اُٹھایا تھا اُس کی اہمیت اسی قدر وقیع تھی، کیونکہ اس وقت سب سے بڑی مشکل ترکوں کے لیے یہ تھی کہ لارڈ کرزن کی موافقت میں فرانس و اٹلی اور جاپان و امریکہ کے تمام نمایندے شامل تھے ادھر خود عراق میں غدار فیصل اور اوس کے باغی اسلام بھائی امیر عبداللہ اور زید نے موصل اور علاقہ عراق میں ترکوں کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا تھا، پھر اندرون کانفرنس غدار شریف مکہ کا بے حمیت نمایندہ جعفر پاشا موجود تھا جو بڑے پیمانہ پر یہ ثابت کرنے آیا تھا کہ موصل ہر طرح عراق کا حصہ ہے اور یہ عراقی حکومت یعنی انگریزوں ہی کے قبضہ میں رہنا چاہیے لارڈ کرزن کی اس تیاری کے بعد ترکی وفد کے لیے جس قدر مشکلات پیدا ہو گئی تھیں اُنھیں کچھ سیاسی دماغ ہی خوب سمجھ سکتے ہیں، بالآخر ڈاکٹر رضا نور بے کو جوش آیا اور ممدوح نے ہزار گونہ سیاسی مصروفیتوں کے ہوتے ہوئے لارڈ کرزن کی یادداشت متعلقہ موصل کا جواب لکھنا شروع کیا، اور جس وقت یہ جوابی یادداشت مجلس صلح میں آپ نے پیش کی تو اس کے استدلال اور تاریخی استناد، اہم اعداد و شمار اور بے مسکت جوابات کا یہ اثر ہوا کہ لارڈ کرزن کو یہی کہتے

بی کہ اچھا تو اس مسئلہ کو اب "جمعیۃ الاقوام" ہی کے سپرد فرما دیجئے۔ ڈاکٹر تو فیق رشدی بے (ترکی کے وزیر خارجہ) کے بیان کے مطابق "عالمیت ملیہ انگورہ" اور مسٹر وارڈ پرائس نامہ نگار ڈیلی میل نے بارہا ایک موقع پر بیان کیا تھا کہ ہم ڈاکٹر رضا نور بے کی اس جوابی یادداشت کی بالغ نظری اور ہمہ گیر جامعیت پر مجلس صلح میں حیران رہ گئے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ طرز عمل بھی قابل ذکر ہے کہ اُنھوں نے اس مجلس میں جس میں چاروں طرف طاقتور سے طاقتور دشمن نظر آ رہے تھے اور اتحادی جنگی جہازوں کا سمرنا و درّہ دانیال اور شمالی شام میں فرانسیسی فوجوں کا مظاہرہ ہو رہا تھا آپ نے قومی ترجمانی اور نمایندگی میں اس جرأت و بے باکی سے کام لیا کہ گویا ان مشکلات کا ایک حق پرست پر کوئی اثر نہ تھا مثلاً جس وقت قلیل التعداد اقوام کے تحفظ اور آزادی کے لیے مجلس صلح میں بحیثیت صدر جلسہ لارڈ کرزن نے آرمن قوم کے حفاظت و آزادی کے لیے ایک مدلل استدعا پیش کی اور ترکی حکومت کے ایک سرکاری اعلان مصدرہ ۱۷ فروری ۱۹۲۰ء کے حوالہ سے اس استدعا کو قانونی مرتبہ دیا تو باستثنائے روسی نمایندہ تقریباً تمام نمایندوں نے لارڈ کرزن کی اس استدعا سے اتفاق رائے کیا خصوصاً موسیو بیرّر اور موسیو بمپارڈ فرانسیسی نمایندوں اور موسیو وینز یلاس یونانی نمایندہ، اور مسٹر گورونی نمایندہ امریکہ نے اس تحریک کا پُرزور خیر مقدم کرتے ہوئے اپنے اتفاق کا اظہار کیا، لیکن غیور و شیر دل ڈاکٹر رضا نور بے فوراً اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور بآنگ دہل ان یورپی نمایندوں سے کہہ دیا کہ

"خدارا رمنوں کے لیے ترکی میں نہ کوئی زمین ہے اور نہ ہی ہم اس مسئلہ کو جمعیۃ الاقوام میں پیش کرنا چاہتے ہیں، اور ہم اپنی ماتحت رعایا کو فوجی خدمت سے کبھی مستثنیٰ نہیں کر سکتے"

ڈاکٹر موصوف کی اس جرأت و گرم گفتاری سے شرکائے مجلس جس قدر مرعوب ہوئے اُس کا معمولی نمونہ یہ ہے کہ ایک موقع پر ڈاکٹر اس قدر غضب ناک ہوئے کہ کرسی کو پھینک کر مجلس سے چل دیئے جس پر تمام شرکاء نے مارشل عصمت پاشا سے شکایت کی یورپی مجلس صلح میں شاید یہ

سب سے پہلا واقعہ تھا کہ ایک ایشیائی نمایندہ یا ترکی وکیل نے مغرور و سرکش یوروپین مدبرین کو اس قدر درشت اور منہ توڑ جواب دیا۔

۳۔ ڈاکٹر صاحب کا تیسرا کارنامہ یہ ہے کہ اگرچہ آپ ترکی وفد کے نائب مشیر لیکن قومی حمایت کا یہ عالم تھا کہ اپنے سردار مارشل عصمت پاشا کی تمام کارگزاری کی نگرانی کرتے تھے اور ایک موقع پر آپ نے مجلس علیہ انگورہ کو صاف صاف لکھ دیا کہ عصمت پاشا مجلس مصالحت میں نرمی اور اعتدال سے کام لے رہے ہیں جو قومی وقار کے منافی ہے۔

غرض یہ اور اسی قسم کے طویل واقعات ہیں جو شیر دل اور سیاست آگاہ ڈاکٹر رضا نور بے کی ممتاز و مستثنیٰ فضیلت کے آئینہ دار ہیں، اور جن کی شرح ایک طویل داستان کو چاہتی ہے، کاش ہمارے وہ نوجوان طلبہ ڈاکٹر صاحب کی ہمہ داں اور فضیلت پناہ شخصیت کا اندازہ کریں جو میٹرک پاس کر کے کسی اخبار کی ایڈیٹری یا ملک و قوم کی لیڈری اختیار فرمانے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔

حلیہ ڈاکٹر رضا نور بے ایک دراز قامت اور نہایت تنومند شخص ہیں، رنگ نہایت سفید اور نیلی آنکھیں، سر کے بال اڑے ہوئے، اور یوروپین لباس خصوصاً ٹائی کالر کا ہر وقت خیال رکھتے ہیں۔

"توحیدی"

تصحیح

گزشتہ نمبر میں علامہ فتحی بے کی جو سوانح عمری شائع ہوئی ہے اس میں ان کا نام غلطی سے احمد فتحی بے لکھا گیا، حالانکہ علی فتحی بے ہونا چاہیئے۔

مطبوعاتِ جدیدہ

برہان القرآن } پنجاب میں مولانا عبداللہ صاحب مرحوم چکڑالوی حجیت حدیث کے قائل نہیں تھے۔ اس وقت سے یہ مسئلہ مابین اہل قرآن و اہل حدیث کے زیر بحث چلا آتا ہے۔ اس سلسلہ کی ایک کڑی کتاب مذکورہ بالا ہے۔ جس میں مولوی احمد الدین صاحب امرتسری امام اہل قرآن اور مولانا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری صدر اہل حدیث کے مابین اس مسئلہ پر جو تحریری مناظرہ ہوا ہی تفصیل کے ساتھ مندرج ہے۔ دونوں فرقوں کے علماء فحول جس بحث میں تقریباً ایک ربع صدی کا زمانہ گزار چکے اور اب تک کسی متفقہ فیصلہ پر نہیں پہونچے اس کے متعلق ہمارا کوئی فیصلہ ناطق نہیں ہو سکتا لیکن اس بحث کی نوعیت کے متعلق ہم کچھ لکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔

حدیث حجت ہے یا نہیں۔ مسئلہ زیر بحث صرف اسی قدر ہے۔ اور یہ آج سے نہیں ہے بلکہ جس زمانہ میں حدیث کی تدوین شروع ہوئی اسی زمانہ سے ایک جماعت اہل اسلام کی حجیت حدیث کی منکر چلی آتی ہے۔ اور دینی امور میں حدیث کو لاشی سمجھتی ہے۔

مگر یہ بحث صرف اس بات پر مبنی تھی کہ آیا حدیث ذریعہ علم ہے یا نہیں۔

منکرین حدیث یہ کہتے تھے کہ دنیا کی کسی عدالت سے تم اس قسم کی شہادت پر کہ میں نے زید سے سنا۔ اس نے بکر سے سنا اس نے خالد سے سنا۔ اس نے عبداللہ سے سُنا۔ اس نے احمد سے سنا۔ اس نے محمد سے سنا ایک پیسہ کا بھی فیصلہ اپنے حق میں نہیں لے سکتے۔ پھر کس اصول سے تم ہم کو مجبور کرتے ہو کہ حدیثوں کو جو تمامتر اسی قسم کی شہادت پر مبنی ہیں ہم امور دین میں دلیل سمجھ لیں۔

قائلین حدیث کہتے تھے کہ چونکہ معتمد اور موثوق ذرائع سے ہم کو موصول ہوئی ہیں اس لئے قابل استناد ہیں۔ ان میں جو متواتر ہیں ان سے علم یقینی حاصل ہوتا ہے۔ اور جو غیر متواتر ہیں ان سے ظنی۔

منکرین کہتے تھے کہ متواتر کوئی حدیث نہیں ہے۔ تمامتر احاد ہیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ ظنی ہو سکتی ہیں لیکن دین کے معاملہ کو ظنیات پر رکھنا ممنوع ہے۔ قرآن یقینی ہے وہی ہمارے لیے کافی ہے۔

الغرض بحثیں اس قدر بڑھ گئیں کہ ان کے نقل کرنے کی یہاں گنجایش نہیں۔ مگر ان تمام بحثوں میں کل دارومدار صرف اس امر پر تھا کہ حدیث مفید علم ہوتی ہے یا نہیں۔ اس امر میں سب متفق تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت واجب ہے۔

اب اس بحث میں ایک نیا باب کھلا۔ یعنی خود آنحضرتؐ کے متعلق لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ آپ کے اقوال شرعی وہی ہیں جو بذریعہ وحی کے فرماتے تھے۔ اور وہ صرف قرآن ہے۔ باقی عام معاملات میں جو اقوال تھے وہ تشریعی نہیں۔ تشریع کا اختیار صرف اللہ تعالےٰ کو ہے رسول کا کام محض احکام الٰہی کی تبلیغ ہے۔

ان لوگوں کے نزدیک حدیث چاہے متواتر ہو یا غیر متواتر تاریخ دینی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ نہ اس کی تحلیل سے کوئی چیز حلال ہو نہ اس کی تحریم سے کوئی شئے حرام۔ اب قرآن وحدیث کے متعلق مسلمانوں میں کئی خیال کی جماعتیں ہوگئی ہیں۔

(۱) قرآن اور حدیث دونوں اصل دین ہیں۔ اور دونوں کے رتبے جہاں تک عمل کا تعلق ہے برابر ہیں۔

یہ جمہور کا مذہب ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس عقیدہ میں افراط اور تفریط ہے۔ چنانچہ یہ لوگ اس کے بھی قائل ہیں کہ کہیں آیات قرآنی حدیثوں کو اور کہیں حدیثیں قرآنی آیتوں کو منسوخ کردیتی ہیں۔

(۲) قرآن کو حدیث پر فوقیت حاصل ہے۔ اس کی آیتیں حدیثوں کو منسوخ کرسکتی ہیں لیکن حدیثیں ان کی ناسخ نہیں ہوسکتیں۔

یہ امام شافعیؒ کا مذہب ہے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ بھی حدیثوں کا یہ منصب رکھتے ہیں کہ وہ قرآن کے عام کو خاص اور خاص کو عام۔ مقید کو مطلق اور مطلق کو مقید کرسکتی ہیں نیز ان سے زیادت علی الکتاب بھی ہوسکتی ہے۔

(۳) دین اسلام صرف قرآن ہے۔ حدیثوں کا ثبوت چونکہ آنحضرتؐ تک یقینی نہیں ہے۔

اس لیے وہ امر دین میں کار آمد نہیں۔
اہل علم کی ایک مختصر جماعت اس خیال کی چلی آتی ہے۔ خود امام شافعیؒ نے کتاب الامّ
میں ایک منکر حدیث کا ذکر کیا ہے۔ اور اس کے دلائل لکھ کر ان کی تردید کی ہے۔
مصر میں بھی علماء اور ادباء کا ایک گروہ اس عقیدہ کا ہے۔ جن میں حافظ ابراہیم وغیرہ
شامل ہیں۔ ڈاکٹر توفیق صدقی مرحوم بھی اس خیال کے تھے۔
(۴) قرآن ہی اصل دین ہے۔ حدیثیں دین میں مطلقاً حجت نہیں۔ خواہ ان کا ثبوت ہو
یا نہ ہو۔
یہ دعویٰ ہند کی جماعت اہل قرآن کا ہے۔ یہ لوگ خالق اور مخلوق کی اطاعت میں فرق کرتے
ہیں۔ ان کے نزدیک سرچشمۂ شریعت صرف خالق ہے جو اپنی منشا کو بذریعۂ وحی نبی کے قلب پر
نازل کر دیتا ہے۔ نبی اسی پر عمل کرتا ہے اور اسی کی تعلیم دیتا ہے۔
اہلحدیث نبی کو بہ تفہیم الٰہی قرآن کا مفسر اور شارح قرار دیتے ہیں اس لیے حدیث جو اقوال و
اعمال نبویہ کا نام ہے ان کے نزدیک واجب العمل ہے۔
جماعت سوم کی بحث تک جو نوعیت حدیث کے متعلق ہے کہ ان کا ثبوت آنحضرتؐ تک یقینی نہیں
ہے ہم حصہ لے سکتے تھے۔ کیونکہ وہ ایک علمی بحث ہے جس میں بدعقیدگی کا شائبہ نہیں ہے۔ اس لیے
کہ خود ائمہ حدیث کی تصریح ہے کہ اخذ حدیث میں حسن ظن جائز نہیں ہے خوب تحقیق کر لینی چاہیئے۔
لیکن جماعت چہارم کی بحث نفس رسول اللہ کی ذات کے متعلق ہے جن کی نسبت خود قرآن
تصریح کے ساتھ کہ رہا ہے کہ وہ معلم۔ مزکی اور مطاع امت ہیں۔ اس لیے اس تلخ بحث میں پڑنا ہم روا
نہیں سمجھتے۔ جس کو دونوں فریق کے دلائل دیکھنے کا شوق ہو وہ اس کتاب کو جو ۱۸۰ صفحہ کی ہے
اور جس کی لکھائی چھپائی اچھی ہے چار آنہ کا ٹکٹ بھیجکر میاں مولا بخش و اللہ بخش صاحبان سوداگران
صابون بازار سر کی بنداں امرت سر سے طلب کرے۔

جغرافیہ برہما۔ مصنفہ عبدالرحمٰن ندوی مطبوعہ مسلم پرنٹنگ پریس اعظم گڈہ

اُردو زبان میں جو درسی کتابوں کا اضافہ ہو رہا ہے اُسی سلسلہ میں عبدالرحمٰن صاحب ندوی کی اس کوشش کا بھی شمار کرنا چاہیئے جنھوں نے برہما کا جغرافیہ نہایت عمدہ طرز پر اُردو زبان میں ترتیب دیا ہے۔ اُمید ہے کہ برہما کے قومی مدارس اس کی خاص طور پر قدر کریں گے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

رپورٹ قومی تعلیمی کانفرنس۔ کاشی ودیاپتھ۔ بنارس

قومی تعلیم کا مسئلہ ہنوز فیصلہ کن صورت نہیں اختیار کر سکا تھا کہ بعض اکابرین قوم سوراج کی تعریف اور اس کی ہیئت کو واضح کرنے کے لیے برابر اصرار کرتے رہے بالآخر بابو بھگوانداس صاحب مشہور فلسفی و عالم کی پیہم کوشش نے مسٹر سی آر داس کو مجبور کیا کہ وہ سوراج پارٹی کی طرف سے ایک مکمل دستور اساسی شائع فرمادیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اگرچہ ملک نے اُس پر ایسی توجہ نہیں کی جس کا وہ مستحق تھا۔

اسی طرح مسئلہ قومی تعلیم کے متعلق کافی اختلاف خیالات رہا اور مختلف حضرات نے جداگانہ نقطہ نظر سے اس مسئلہ کو دیکھا۔ بالآخر بھگوان داس صاحب نے ایک تعلیمی کانفرنس کا انعقاد ضروری سمجھا جس میں تقریباً پندرہ دن کی مسلسل نشست کے بعد تقریباً تمام اصولی و فروعی مسائل کے متعلق قابل عمل تجاویز منظور کی گئیں۔ یہ رپورٹ انہیں تجاویز سے بحث کرتی ہے جس پر مفصل تبصرہ انشاء اللہ آئندہ کیا جائے گا۔

نویدِ امید

از مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری استاد جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

مولانا محمد علی کی تقریب تشریف آوری نے مولانا اسلم صاحب کو اپنی عرصہ کی خاموشی کو خیرباد کہنے پر مجبور کر دیا اور اس موقع پر جو نظم آپ نے تحریر فرمائی وہ بلاشبہ اُن خاص چیزوں میں ہے جو دل ہی سے نکلتی ہیں اور دل ہی میں گھر کرتی ہیں۔ ہم فیصلہ نہیں کر سکتے کہ اس گرانقدر تحفہ کے لیے صاحبِ نظم کا شکریہ ادا کریں یا مولانا محمد علی صاحب کا جن کی دوبارہ رہائی نے یہ دوسری نظم اسلم صاحب سے لکھوائی ہے۔ مدیر

امتحانگاہِ عمل ہے یہ جہانِ گیر و دار
ذرّہ ذرّہ اس کے عُنصر کا ہے گرمِ کارزار

ہے غرض حُسنِ عمل۔ بازیچۂ طفلاں نہیں
یہ حیاتِ بے بہا ملتی نہیں ہے بار بار

سعیِ پیہم ہے نشانِ قیس و شانِ کوہکن
عشق نے آباد کر ڈالے ہیں دشت و کوہسار

سوزِ دل نے پھونک ڈالے خطرہائے موت و زیست
ہو گیا پروانۂ آتش بجاں شعلہ شکار

مایۂ ارزندگی ہیں یہ تکالیفِ عمل
ہے بقدرِ سعیِ مَردوں کا جہاں میں اعتبار

جو عزیزِ حق ہے اُس کو خوار کر سکتا ہے کون
عزّت و ذلّت کا بندوں کو نہیں ہے اختیار

گو شہیدوں کی یہ صورت ہے کہ خاک و خوں میں ہیں
اُن کی رعنائی پہ ہوتی ہیں مگر حوریں نثار

شانِ منصوری کوئی پیدا کرے تو دیکھ لے
تختِ شاہی سے بھی ہے رُتبہ فزوں بالائے دار

ہے یہ شرطِ عشق محمل پر نظر ہر دم رہے
پاؤں مجنوں کے ہوں گو خارِ بیاباں سے فگار

رہروانِ راہِ حق کو کب ہے منزل کی تلاش
ہر قدم پر شاہدِ مقصود سے ہیں ہمکنار

سوز و ساز بندگی ہے اصل رازِ زندگی
ہے اسی قوت کے قبضے میں عنانِ روزگار

ساری دنیا ہے وراثت بندگانِ خاص کی
دوسرے ہرگز اُٹھا سکتے نہیں عالم کا بار

ہے سلیمانی کا منصب کارِ نظمِ ملک و دیں
اس کو کیا انجام دے سکتی ہے مورِ زلّہ خوار

اِس جہاں کا دورِ مستقبل ہے صرف اسلام کا
آ رہا ہے اپنے مرکز پر زمانہ کا مدار

چند گھڑیاں رہ گئی ہیں آزمائش کی فقط
مژدہ باد اے حامیانِ دینِ داورِ دوالمنن داوَرِ داں کا

خدا بھی ہے

تری قسمت میں ہے سِرِ خدا کا راز داں ہونا
تو مشتِ خاک ہے لیکن ہے تجھ کو اک جہاں ہونا

ابھی ہے تو وہ قطرہ جو نہیں شرمندۂ ساحل
تجھے صحرائے ہستی میں ہے بحرِ بیکراں ہونا

ابھی بے بال و پر ہے مرمرِنا اتفاقی سے
اخوت کے گلستاں میں ہے تجھ کو نغمہ خواں ہونا

تجھی کو اے اسیرِ دامِ آب و گل بتا بھی ہے
تجھی کو زور والوں سے یہ کہنا ہے "خدا بھی ہے"

"صدائے خاموش"

ہوالموجود

(از نتائج افکار جناب مولوی فضل الحق صاحب آزاد عظیم آبادی)

امین راز ہستی ہی کہیں نابود ہوتا ہی
ہمیشہ درد دل میں کچھ نہ کچھ موجود ہوتا ہی

نظر آتا تو ہی دریائے عرفان خوب ہی دلکش
سمجھ کا دائرہ لیکن بہت محدود ہوتا ہی

بچھا کر دیکھ لے آنکھیں تو اسکی راہ میں کوئی
وہ خود اپنی خوشی سے آپ آ موجود ہوتا ہی

پڑے پرتو جو خورشید تجلی کا تو روشن ہو
کہ ذرہ بھی کوئی اس دشت کا نابود ہوتا ہی!

فنا کیا ہی بقا کیا ہی ہم اُس کو کچھ نہیں سمجھے
مگر اتنا کہ جو موجود تھا موجود ہوتا ہی

خزاں کیا ہی بہار بوستان آفرینش کیا!
فقط اک انقلاب دور بہست و بود ہوتا ہی!

مقدر ہی حقیقت میں اگر نابود ہو جانا
عبث یارب ظہور ہستی نابود ہوتا ہی

حصول مدعا ہی مدعا سے ہاتھ اُٹھا لینا
نقاب چہرۂ مقصود خود مقصود ہوتا ہی

ہم اُس توحید کی باز آئے تصدیق تصور سے
انا لا غیر جس میں حرف شرک آلود ہوتا ہی

خود اپنی بندگی کیجئے خدا کی بندگی کیسی
جو معشوق خیالی ہی وہی معبود ہوتا ہی

ہزاروں دل میں ایسے سوسے آتے ہی ہیں پیہم
جو اک مقبول ہوتا ہی تو اک مردود ہوتا ہی

ہم اُس معبود کے صدقے ہم اُس معبود کے قربان
کہ جب کوئی نہیں ہوتا تو وہ موجود ہوتا ہی

حریف نغمۂ آزاد ہوتا ہی وہ محزوں دل
جو درد آلود ہوتا جو غم فرسود ہوتا ہی

گاندھی جی کی جے

وہ خوشی کی دھن وہ خاطر خواہ لے
مژدہ لایا قاصد فرخندہ پے

غم کو لازم ہو کہ اب ہم کم کریں
جام و مینا پر بڑھائیں چنگ و نے

چار دن کے سب تماشے ہیں یہاں
اب کہاں بزم جم و کسریٰ و کے

ہو گئے سرکار کے بھی دستخط
صلح کی شرطیں تو تھیں پہلے سے طے

ہو گئی ترک اور انگلش سے بھی صلح
بولیے آزاد گاندھی جی کی جے!

نوحہ

از افادات مولانا محمد علی جوہر مدظلہٗ

نوحہ غم سے گھٹاتے نہیں ہم شانِ حسین
حق ہی شاہد کہ شہادت ہی تھی شایانِ حسین

آج ہے اُمت احمد کے لیے فخر کا دن
آج کے روز ہوئی فتح نمایان حسین

حشر تک چھوڑ گئے ایک درخشندہ مثال
حق پرستوں کو نہ بھولے گا یہ احسان حسین

جو اُفق پر نظر آتا ہے محرم کا ہلال
ہے ہمارے لیئے وہ مہر درخشان حسین

کربلا تب سے شہادت کا بنی ہے کلمہ
دین ہی امی و عالم کا اب ایمان حسین

شکر حق ہی کہ ابھی حق کی حمایت کے لیے
جان دینے کو ہیں موجود غلامان حسین

اُن سے پوچھو کہ جنھیں جان ہو ایماں سے عزیز
کم تھی کس جان سے بتلاؤ تمہیں جان حسین؟

اس کو سینچا ہے شہیدوں نے لہو سے اپنے
سبز و شاداب نہ پھر کیوں ہو گلستانِ حسین

یاں نہ گلچیں کی رسائی نہ خزاں کا ہے گزر
غم سے واقف ہی نہیں بلبلِ بستانِ حسین

تب سے جاری ہے یہاں صبر و رضا کا لنگر
دلِ حاسد کی طرح تنگ نہیں خوانِ حسین

دولتِ ایثار کے بٹتی ہے یہاں صدیوں سے
ختم ہوتا ہی نہیں گنجِ فراوانِ حسین

حق و باطل کی ہے پیکار ہمیشہ جاری
جو نہ باطل سے دبیں ہیں وہی شیعانِ حسین

نہیں میدانِ عمل تنگ مسلماں کے لیے
ہے یہ ہی گوئے حسین اور یہ ہی میدانِ حسین

ان کی تقلید کے دعوے کی کسے جرأت ہے
کہہ سکے کون کہ ہیں ہم بھی مریدانِ حسین

نام میں اُن سے اب جدے ہے نسبت تو مگر
اور دل سے بھی ہے ہر وقت ثناخوانِ حسین ق

گر شہادت کہیں جوہر تجھے مل جائے تو پھر
رہے کوثر یہ بھی وابستہ دامانِ حسین

شذرات

ہندوستان کا سیاسی مطلع اختلافِ آرار، باہمی مناقشات اور مختلف فسادات نے اس قدر تیرہ و تاریک کر رکھا تھا کہ عام مایوسی بڑھتی جاتی تھی اور اکابرین قوم کی معذوری و خاموشی نے ملک کو اور زیادہ بےچین کر دیا تھا کہ بالآخر کانگریس کے اجلاس خاص کی تجویز منظور ہوئی اور دہلی میں ایک ہفتہ سیاسی مباحث اور ہنگامہ آرائی کی نذر ہوا۔

کانگریس کا یہ جلسہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے کلکتہ کے اجلاس خاص سے کسی طرح کم نہ تھا، کلکتہ نے اگر ترک موالات کی ابتدار کی تھی تو دہلی میں اُس عظیم الشان تحریک کو اُس کے پُر خطر دور سے بچانے اور آیندہ کے لیئے وسائل کامیابی تلاش کرنے کا اہم و نازک مسئلہ درپیش تھا۔ عام طور سے جو تجاویز دہلی میں منظور ہوئی ہیں اُس پر اطمینان ظاہر کیا جاتا ہے اور اس حیثیت سے دہلی کا اجلاس کامیاب خیال کیا گیا ہے۔

مولانا ابو الکلام آزاد کا خطبہ صدارت علاوہ اپنے خطیبانہ انداز اور ادبی خوبیوں کے سیاسی مباحث و معاملات ملکی کے متعلق اس قدر واضح، روشن، اور قطعی دلائل سے بحث کرتا ہے جس کے بعد اختلافی مسائل میں جو ناگواری پیدا ہوگئی تھی وہ باقی نہیں رہتی۔ نکتہ چینی کے لیے بہت گنجایش ہے اور بالخصوص وہ حضرات جو خود میدان عمل کے تلخ و ناگوار تجربوں سے دور اپنے نشیمن میں لطف و راحت کی زندگی بسر کر رہے ہوں اُن کے لیے تو یہ کام علاوہ دلچسپ ہونے کے بعض حالات میں ضروری بھی ہو جاتا ہے اس لیے اس قسم کے بعض مضامین جواب بہ کثرت شائع ہو رہے ہیں خطبہ صدارت کی وسعت نظر اور اصابت رائے کے مقابلہ پر ایک لمحہ کے لیئے بھی قابل التفات نہیں قرار دیئے جا سکتے

علم کے ساتھ جو شیفتگی انسان کو ہر زمانہ میں رہی ہے اُس کا لازمی نتیجہ وہ عظیم الشان کارنامے ہیں جو صاحبان علم و دانش نے ہر زمانہ اور ہر ملک میں انجام دیئے اور جن کی یاد آج بھی دنیا کیلئے سرمایۂ افتخار ہے۔ مسلمانوں نے اپنی علم دوستی و علم پروری کے جو ثبوت دنیا کے سامنے پیش کیے اُن کی نظیر اس زمانہ میں اُن کی قوم میں تلاش کرنا تو عبث ہے لیکن اللہ کی مخلوق میں دوسری قومیں ایسی ہیں جو آج بھی لیلائے علم کے لیے اپنے جنون عشق کو اُسی منزل پر پاتے ہیں جس کا لطف صرف مجنوں کی خود فراموشی اور منصور کی سرفروشی ہی میں حاصل ہو سکتا ہے۔

مارگریٹ پولیو، سرماریس پولیو کی لڑکی ہے جس نے اپنے رجحان فطری کے تقاضے سے علم طب کی تحصیل اپنا مقصد حیات قرار دیا اور بالآخر ڈاکٹری کی سند حاصل کر لی۔

اس عرصہ میں اس کو خیال پیدا ہوا کہ علم طب ہنوز سرطان کے علاج سے عاجز ہے اس لیے ہر شیدائے طب کا پہلا فرض سرطان کا علاج دریافت کرنا ہے چنانچہ مارگریٹ نے سرطان کے متعلق اپنی تحقیقات اور تجربے شروع کیے یہاں تک کہ خود وہ بھی اس سم قاتل سے محفوظ نہ رہ سکی اور بالآخر سرطان میں مبتلا ہو گئی۔

اس مہلک مرض کا اُس نے نہایت مسرت سے خیر مقدم کیا اور اُس کو اپنی کامیابی کا ذریعہ سمجھکر حالت مرض، نتیجہ علاج، اور مختلف تبدیلیوں کے اثرات کے متعلق نہایت صحیح معلومات فراہم کرتی رہی یہاں تک کہ مرض کی شدت نے بالآخر اس شیدائے علم کا خاتمہ کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ موت سے کچھ قبل تک وہ برابر اپنے نوٹ طیار کرتی رہی!

ایک عرصہ کی خود فراموشی کے بعد سرسید کے "صحیح جانشینوں" کی طرف سے حرکت عمل میں آئی ہے جس نے بیساختہ ہماری توجہ اپنی طرف کھینچ لی اور ع

بازخواں از نجد و از یاران نجد

کہتے ہوئے ہم جناب شیخ عبداللہ صاحب کی ایک "پرایوٹ و کانفڈنشل تحریر" پر اظہار رائے

کرنے پر مجبور ہوئے جس کو وہ صرف "بعض مسلمان رہنماؤں" کی خدمت میں بھیجنا چاہتے ہیں۔
لیکن مطبوعہ گشتی تحریر کے لیے پرایوٹ اور صیغہ راز کا لفظ استعمال کرنا بجائے خود
مضحکہ خیز ہی اور لسان الغیب ان صاحبان دانش کی خام خیالی کی طرف پہلے ہی اشارہ
کر چکا ہے کہ

نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا!

بہر حال! یہ تحریر جو ایک جدید انجمن "مجلس اسلامیہ ہند" کے قیام کی تحریک کرتی ہی اردو میں
نہیں بلکہ اپنے "برادران ملت" کے مطالعہ کے لیے انگریزی میں شائع کیگئی ہی' اور ہمارے سنجد
کی روایات قدیم کے مطابق سرسید کی پالیسی اُس کے بعد اور اُس کے نتائج سے ابتدا رکی
گئی ہی، نواب محسن الملک کا لارڈ منٹو کی خدمت میں کامیاب وفد' ہزہائنس سر آغاخاں کی زیر ہدایت
مسلم لیگ کا انعقاد گویا کامیابیوں کی غیر محدود فہرست ہی اور تاریخ قدیم کے وہ عظیم الشان
کارنامے ہیں جن کی یاد دلاکر "برادران ملت" کو پھر راہِ حق کی طرف دعوت دی جاتی ہی۔

کیا یہ قابل افسوس نہیں کہ اب بھی فریب نفس اس قدر آسان ہی کہ نواب محسن الملک مرحوم کے
وفد کو ایک محیر العقول کارنامہ قرار دیا جائے اور اُس قرارداد کو جو لارڈ منٹو سے کی گئی
مسلمانان ہند اور ہندوستانی قومیت کی فتح عظیم شمار کی جائے؟

ہندوستان گزشتہ دو چار سال میں سیاسیات کے میدان میں کافی ترقی کر چکا ہی
یہاں تک کہ اب وفد کا وجود سیاسیات ہند میں قابل وقعت نہیں بلکہ ایک گونہ قابل ملامت
ہوگیا ہی نیز لارڈ مارلے کے تذکرہ کی اشاعت نے منٹو۔مارلے اصلاحات کے متعلق جو
اظہار خیال کیا ہی اُس نے لارڈ منٹو کی اُس قرارداد اور وفد کی حقیقت کو اچھی طرح بے نقاب
کر دیا ہی لیکن وہ جماعت جس نے وفد کی خاطر شملہ کے سفر کے بعد پھر زاویہ عزلت سے قدم ہی
نہ نکالا ہو بلکہ بالقصد اپنے کانوں اور آنکھوں کو واقعات عالم اور سیاسیات ملکی سے بیگانہ محض

بنا رکھا ہو اگر اُن ہندکو فتح بیت قرار دیکر تو اُس کو معذور رکھا جائے کہ واقعی اُن کی فکر رسا اور اُن کے ماسوائی مضمون زندگی کا یہی نتیجہ ہو سکتا ہے۔

شیخ عبداللہ صاحب نے اپنے اس مختصر رسالہ میں جن امور کا ذکر کیا ہے اگرچہ اُن میں کوئی بات بھی قابل اخفا نہیں لیکن شاید اس رازداری کے حصار سے فائدہ اُٹھا کر اُنھوں نے ایک ایسی بات بھی کہدی ہے اور ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ واقعی راز کی بات ہے جس کو اب تک اُنھوں نے مجمع عام میں کہنا گوارا نہ کیا تھا۔ تحریک خلافت کا ذکر کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں کہ "مجھے اس تحریک سے کامل ہمدردی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ یہ اپنے جائز فرائض انجام دیتی رہے یعنی تمام مسلمانان یورپ، ایشیا، اور افریقہ کے جان و مال اور آزادی کے خلاف مسیحی یورپ کی پالیسی کی مخالفت"، اپنے راز کو اس طرح برملا ظاہر کردینے کے جو نتائج بد شیخ صاحب کو برداشت کرنا پڑیں اُس سے قطع نظر کیجئے پھر بھی ہم کو اُن کی یہ ادا پسند نہیں آئی اس لیے کہ اس میں تحریک خلافت کے "بعض ناسمجھ لیڈروں" کا انداز پایا جاتا ہے۔ لیکن شیخ صاحب نے اس افشائے راز کا کفارہ اپنے اگلے جملہ سے فرمادیا ہے جس میں آپ نے اُن ناسمجھ مسلمانوں کو نصیحت فرمائی ہے جو خلافت کمیٹی کے ہوتے ہوئے کسی دوسری انجمن یا جماعت کی مسلمانان ہند کے لیے ضرورت نہیں سمجھتے۔ غالباً ان "ناسمجھ لوگوں" کی یہ رائے آپ کے جذبۂ وطن پرستی کے لیے (جس کا اظہار آپ نے سب سے اول کیا ہے) ایک ناگوار ٹھیس ہے ہم کو شیخ صاحب کے جذبۂ وطن پرستی سے بحث نہیں، لیکن اس پردہ میں جو تجویز جناب نے فرمائی ہے اُس کے متعلق ضرور چند الفاظ عرض کریں گے۔

مجلس خلافت ہند کے گزشتہ چند سالہ کارنامے فی الحقیقت عام آزادی کے لیے ایک شدید و سخت جنگ تھی جس میں مسلمانان ہند کو اپنے فطری و جائز حقوق کے لیے ہر ہر قدم

پر لڑنا پڑتا تھا اور ایک وقت تو ایسا آگیا کہ خود مذہبی آزادی خطرہ میں نظر آتی تھی۔

دوسرا اہم مقصد مسلمانان عالم اور بالخصوص ترک بھائیوں کی مدد تھی جو اُس وقت بڑی مصیبت میں گرفتار تھے اور خلافت عثمانی کی حفاظت تھی جو ہر آن خطرہ میں نظر آتی تھی۔ ان اہم مقاصد میں کامیابی کے لیے سرفروشانہ جدوجہد کے علاوہ بڑی ضرورت اس امر کی تھی کہ مسلمانانِ ہند اپنی تمام تر سعی و ہمت کا آماجگاہ اس جماعت کو بنالیں۔ چنانچہ گزشتہ چند سال کے واقعات شاہد ہیں کہ مسلمانانِ ہند کی تمام سیاسی جدوجہد کا ذریعہ صرف خلافت کمیٹیاں رہی ہیں ایسی حالت میں کہ اُن کی وقعت ملک میں مسلم ہو کسی جدید جماعت کو قائم کرنا اور اپنے ایک زبردست آرگنائزیشن کو پس پشت ڈال دینا نہ مصلحت کہی جاسکتی ہے اور نہ ضرورت۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ خلافت کمیٹی کی کامیابی اور آئندہ مسئلہ جزیرۃ العرب کے متعلق جدوجہد ابھی سے مسلمانوں کے غمخواروں کو آزار پہنچا رہی ہو اور اُن کو اپنی طمع و فاسر شت کیلئے ایک نئے پلیٹ فارم کی ضرورت ہو۔

ہمارے ایک کرمفرما نے جب اس تجویز کو سُنا تو بے ساختہ مولانا رومی کا شعر پڑھا ؎

گفتہ او گفتہ اللہ بود نعوذ باللہ
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

ہم نہیں چاہتے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی یہ باور کریں کہ شیخ عبداللہ صاحب کی اس تحریر میں "استاد ازل" کا بھی حصہ ہے اور اُن کی "طوطی صفتی" صرف الفاظ ہی تک محدود ہے، لیکن مولانائے روم کا ارشاد نہیں جس سے تفاول نہ کیا جائے!

غضب الٰہی کے جو قصص و حکایات قدیم مذہبی کتابوں میں درج ہیں اُن کی اس زمانہ میں کافی تاویلیں کی گئیں اور ہر واقعہ کے لیے موجودہ حالات اور سائنس کے نظریات سے منطبق ہونا لازمی قرار دیا گیا۔ لیکن عین اسی زمانہ میں جبکہ یہ جنون دانش اپنے شباب پر ہے

دنیا کو ایسے واقعات سے بھی واسطہ پڑتا ہے جن کے متعلق بجز قہر الٰہی کے دوسرا لفظ زبان سے
نہیں نکلتا۔ جاپان کا زلزلہ اور اس کی تباہی قوموں کی تاریخ میں اہم ترین واقعہ کی حیثیت رکھتی
ہے۔ عین اس وقت جبکہ دولت و ثروت کی فراوانی، سامان تعیش و تنعم کی کثرت روز افزوں سیاسی
عظمت سے جاپان حالت سکر میں تھا اس کی غفلت و نشہ حکومت کے لیے یہ زلزلہ
تازیانہ کا کام دے گیا۔

حال میں جو صحیح اعداد و شمار ان نقصانات کے حکومت جاپان کی طرف سے شائع ہوئے
ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک لاکھ تیس ہزار آدمی ہلاک ہوگئے اور تقریباً پندرہ لاکھ مجروح
و معذور ہیں اور اسی قدر بے خانماں ہوچکے ہیں جو باوجود انسانوں کی آبادی اور شہروں میں
رہنے کے بہائم کی طرح بے در و دیوار میدانوں میں نظر آتے ہیں۔

اور یہ سب کچھ صرف دو روز کے اندر ہوگیا، نہ سامان ہلاکت کے لیے کسی اہتمام و صرف
کی نوبت آئی اور نہ تباہ ہونے والوں کو اپنی مدافعت و پسپائی کا موقع مل سکا!

ہمارے نامہ نگار خصوصی (برلن) نے خالدہ خانم ادیب مشہور ترکی خاتون سے ملاقات و
گفتگو کی جس کی نہایت دلچسپ کیفیت پچھلی ڈاک سے ہمیں موصول ہوئی ہے۔ جس کو ہم بجنسہ
نقل کیے دیتے ہیں۔

خالدہ خانم مشہور ترکی خاتون جو گزشتہ جنگ یونان کے موقع پر معمولی سپاہی کی حیثیت
سے خود شریک جنگ ہوئیں اور حکومت انگورہ کے پرخطر و نازک دور میں مختلف خدمات سیاسی
انجام دیتی رہی ہیں اب چند ماہ آرام کرنے کے خیال سے جرمنی تشریف لائی ہیں اور جس وقت
ہم کو اطلاع ملی وہ میونک میں مقیم تھیں۔ ہم جس وقت پہنچے ہیں وہ ہمبرگ جانے کی طیاری
میں مشغول تھیں اور باوجود گوناگوں مصروفیتوں کے انھوں نے از راہ کرم ہم کو ملاقات
کا وقت دیا اور تقریباً دو گھنٹہ سلسلہ کلام جاری رہا۔

ممدوحہ کے بچے امریکہ میں تعلیم پاتے ہیں۔ اُس وقت اُن کے ہمراہ تھے اور تعطیل جرمنی میں گزارنے کا ارادہ تھا۔

اثنائے گفتگو میں خالدہ خانم نے سیاسیات ہندوستان سے بہت دلچسپی کا اظہار فرمایا۔ مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی اور مہاتما گاندھی کے متعلق دیر تک تفصیلی حالات دریافت کرتی رہیں اور قومی تحریک کی عام حالت کے متعلق بھی سوالات کیئے۔

تعلیم نسواں سے آپ کو خاص دلچسپی ہے اور ہندوستانی عورتوں کے متعلق نہایت پُر لطف گفتگو رہی۔ ممدوحہ پردہ کی مخالف ہیں لیکن فرماتی تھیں کہ ہندوستان میں پردہ کے ترک پر ابھی اصرار نہ کرنا چاہیئے اول تعلیم دلاؤ پردہ خود ہی کم ہو جائے گا۔

اس کے بعد ہم نے ترکی کے متعلق سوالات کیئے آپ نے مختصراً جواب دیئے اور آخر میں فرمانے لگیں کہ یوں تو بڑے بڑے پروگرام پیش نظر ہیں لیکن جب کچھ ہو جائے تب کی بات ہے مسلسل جنگ کے باعث مردوں کی تعداد بہت کم ہو گئی ہے پھر یونانیوں نے پسپائی میں بستیاں کی بستیاں تباہ و برباد کر ڈالی ہیں کہ آج تودۂ خاک بھی نظر نہیں آتا ایسی حالت میں ہمارے لیے سب سے پہلا کام معاشی اور پھر تعلیمی ہے۔

گزشتہ جنگ کے ہولناک واقعات کی نسبت فرماتی تھیں کہ آج تک اُن کا کسی کو علم نہیں اس لیئے کہ جو قلیل التعداد جماعت اُس وقت دشمن کا مقابلہ کر رہی تھی اُس کو اپنی مصروفیتوں سے اتنی مہلت نہ تھی کہ بیرونی دنیا کو اپنے حالات سے مطلع کر سکے۔

خاتون موصوف نے ہندوستانی مسلمانوں کی اعانت و ہمدردی کا نہایت خلوص و سرگرمی سے شکریہ ادا کیا اور فرماتی تھیں کہ تمام ترکی قوم اُن کی ممنون احسان ہے۔

خالدہ خانم نہایت شستہ و رواں انگریزی بولتی ہیں۔ زمانہ قیام جرمنی میں اپنے ایک ناول کا ترجمہ بھی انگریزی میں کیا ہے جو امریکہ میں شائع ہو رہا ہے۔ بعد اشاعت اُس کے اُردو ترجمہ کی اجازت مرحمت فرمائی۔ رسالہ جامعہ کا بھی ہم نے ذکر کیا اور آپ نے فوراً مضمون عنایت فرمانے کا وعدہ کیا لیکن چونکہ اسی دن ہمبرگ تشریف لیے جا رہی تھیں اسلیئے

کچھ نہ لکھ سکیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڈھ

کے

شعبہ تصنیف و تالیف کی شایع کردہ کتابیں

کتاب	قیمت
(۱) ازہار العرب - مؤلفہ مولانا سورتی	قیمت غیر مجلد ۵ر
(۲) تاریخ الامت - مصنفہ مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری	قیمت " عہ ر
(۳) ایضاً (حصہ دوم) ۶ " (حصہ سوم)	" " عہ ر ۸ر
(۴) مبادی معاشیات - از پروفیسر ذاکر حسین خاں صاحب	" " عہ
(۵) اخبار الدولتین - از مولانا نیاز فتحپوری	(زیر طبع)
(۶) انتخاب کلام میر - مرتبہ مولوی نور الرحمٰن بی اے	(")
(۷) خطبہ شیخ الہند - (بہ تقریب افتتاح جامعہ)	قیمت ۲ر
(۸) خطبہ مسیح الملک - حکیم اجمل خاں صاحب	" ۲ر
(۹) انتخاب مضامین جوہر - معہ تصویر	" ۵ر
(۱۰) ترکوں کی کہانیاں	" ۴ر

المشتہر

مہتمم مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

دیوان غالب اُردو

جس طرح نظم اُردو کی بہترین کتاب تسلیم کی جاتی ہی اسی طرح جو اڈیشن
ہم نے خاص اہتمام سے جرمنی سے چھپوا کر منگایا ہی اُس کے متعلق بلاخوف
تردید کہا جاسکتا ہی کہ اس سے بہتر اُردو زبان میں آج تک کوئی کتاب
طبع نہیں ہوئی نہایت نفیس ملائم سُرخ جلد پر سُنہرا کام ہی اندر مرزا صاحب کی
رنگین تصویر ہی، اور پھر مکمل دیوان مع قصائد و غزلیات رباعیات اور اس کے
بعد بیاض کے لیے سادہ اوراق دئیے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ قابل قدر خود
مرزا غالب مرحوم کا لکھا ہوا مقدمہ ہی جو شروع میں درج ہی اس اڈیشن کی
مقبولیت کی یہ حالت ہی ہم کو کسی طرح امید نہیں کہ شائقین تک پہونچ سکے
بہرحال درخواست خریداری بھیج دیجیے تاکہ نام درج رجسٹر ہو جائے، اور
اس وقت نہیں تو دوسرے اڈیشن پر مایوسی نہو۔ قیمت صرف تین روپیہ ہے

المشتہر

مہتمم مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ

اللہ اکبر

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

کا

ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ نورالرحمٰن

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

قیمت سالانہ للعہ

فہرست مضامین

جلد ۲ | ماہ ربیع الاول سنہ ۱۳۴۲ھ مطابق اکتوبر سنہ ۱۹۲۳ء | نمبر ۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

جلد ۲ | ربیع الاول ۱۳۴۲ھ مطابق اکتوبر ۱۹۲۳ء | نمبر ۴

قسطنطنیہ کا تعلق اسلام کے ساتھ

از جناب مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ

قسطنطنیہ کا شمار اگرچہ مقدس مقامات میں نہیں ہے لیکن اسلام میں اس کی اہمیت نہایت عظیم الشان ہے۔ اس کا تاریخی تعلق اسلام کے ساتھ خود عہد نبوت سے شروع ہو جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت دعوتِ اسلام کے خطوط شاہانِ عالم کے نام بھیجے اُس وقت حارث بن عمیر ازدی کے ہاتھ ایک خط ملک شام کے غسانی بادشاہ شرجیل بن عمرو کے نام بھی بھیجا۔ جو قیصر کا ماتحت تھا اور اُس کے اثر سے عیسائی ہو گیا تھا۔ غسانی نے حضرت حارث کو قتل کر ڈالا۔ آنحضرتؐ نے اُن کے قصاص کے لیے جمادی الاولیٰ ۸ھ میں تین ہزار فوج بھیجی جس کا امیر اپنے عزیز صحابی حضرت زید بن حارثہ کو مقرر کیا۔ اور فرمایا کہ اگر

وہ شہید ہو جائیں تو جعفر بن ابی طالب اور جو وہ بھی شہادت پا جائیں تو عبداللہ بن رواحہ امیر ہوں۔

غسانی نے خبر پا کر مقابلہ کے لیے ایک لاکھ فوج جمع کی۔ ہرقل بھی اس زمانہ میں ملک شام میں آیا ہوا تھا۔ اس نے بھی امداد کے لیے اپنے بعض امراء کو فوجیں دیکر بھیجا۔

مقام موتہ میں جنگ ہوئی۔ حضرت زید شہید ہو گئے۔ اس کے بعد جعفر بن ابی طالب نے سو سے زیادہ زخم کھا کر چوب تیغ کی طرف سے شہادت پائی۔ پھر عبداللہ بن رواحہ نے جام شہادت نوش کیا۔ آخر میں خالد بن ولید نے علم سنبھالا۔ اور اس بہادری کے ساتھ لڑے کہ اس روز ان کے ہاتھ میں آٹھ تلواریں ٹوٹیں۔ دشمنوں کے نرغہ سے اپنی جماعت کو نہایت خوبی سے باہر نکال لائے۔ صرف بارہ مسلمان شہید ہوئے تھے۔ مزید مقابلہ کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اس لئے مدینہ واپس چلے آئے۔

اب غسانی قیصر کی مدد سے مسلمانوں پر حملہ کرنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ مدینہ میں اکثر اس کی طرف سے متوحش خبریں پہونچا کرتی تھیں یہاں تک کہ کبھی کبھی راتوں کو اس کے حملہ کی افواہ اڑ جاتی تھی اور لوگ مضطرب اور پریشان ہو جاتے تھے۔

آنحضرتؐ نے اسی وجہ سے دوبارہ سنہ ۱۱ھ میں ۹ ہزار فوج غسانیوں کے خطرہ کو مٹانے کے لیے تیار کی۔ لیکن یہ لشکر حضورؐ کی علالت کی وجہ سے رک گیا۔ وفات نبویؐ کے بعد حضرت ابو بکر نے اس کو بھیجا۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ لیا تھا کہ مسلمانوں کے لئے غسانی خطرہ کوئی چیز نہیں ہے۔ جو کچھ اضطراب ہے وہ رومیوں کی وجہ سے ہے اس لیے امت اسلامیہ کا رخ خطرہ کے اصل مرکز کو مٹانے کی طرف پھیرا۔ اور فرمایا کہ

اَوَّلُ جَیْشٍ مِنْ اُمَّتِی یَغْزُوْ مَدِیْنَۃَ قَیْصَرَ مَغْفُوْرٌ لَّھُمْ   میری امت کی پہلی فوج جو قیصر کے شہر پر حملہ آور ہوگی اس کو اللہ نے بخش دیا ہے۔

یہ روایت صحیح بخاری اور حدیث کی دیگر کتب میں موجود ہے۔
حضور کو اس امر کا علم دیا گیا تھا کہ پہلے حملہ آور فوج فتح نہیں کر سکے گی۔ اسی لیئے صرف حملہ
ہی پر مغفرت کا وعدہ فرمایا اور فتح کی شرط نہیں لگائی۔ اس کے بعد دوسری حدیث میں فتح
کی بھی بشارت دی اور فرمایا کہ
لتفتحن القسطنطنیۃ ولنعم الجیش تلک الجیش تم یقیناً قسطنطنیہ فتح کرو گے یہ فاتح فوج بھی اچھی ہوگی
ولنعم الامیر امیرہا۔ اور اس کا امیر بھی اچھا ہوگا۔
اس حدیث کو امام حاکم نیز امام احمد بن حنبل نے مسند میں۔ اور ابن عبدالبر نے استیعاب میں
حضرت بشر غنوی سے روایت کیا ہے۔
صدر اول میں ملک شام فتح ہو گیا غسانی بادشاہ اسلام لایا اور اس کا خطرہ جاتا رہا۔
لیکن جنگی مشغولیتوں کی وجہ سے قسطنطنیہ پر حملہ کا موقع نہ مل سکا۔
جب زمام خلافت امیر معاویہ کے ہاتھ میں آئی تو انھوں نے اس کی تیاری کی۔ اور ۴۹ھ
میں عظیم الشان لشکر فراہم کرکے بری اور بحری دونوں راستوں سے قسطنطنیہ کی طرف روانہ
کیا۔ سفیان بن عوف کو سپہ سالار عام اور اپنے بیٹے یزید کو ایک خاص حصہ کا امیر بنایا۔
مدینہ میں اس وقت جو صحابہ کرام موجود تھے ان میں سے اکثر مغفرت موعودہ کو حاصل کرنے
کے لیئے اس لشکر میں جا کر شریک ہوئے۔ مثلاً حضرت ابوایوب انصاری میزبان رسول اللہؐ۔
عبادہ بن صامت۔ ابوالدرداء۔ عبداللہ بن عمر۔ عبداللہ بن زبیر۔ عبداللہ بن عباس وغیرہ
رضی اللہ عنہم۔
لیکن قسطنطنیہ کی فصیل قدرتی طور پر نہایت محفوظ تھی۔ اور رسد کے لیئے راستے کھلے ہوئے
تھے۔ اس وجہ سے محاصرہ زیادہ کارگر نہ ہوا۔ علاوہ بریں عرب کے لیے وہاں کی سردی
بھی سخت تھی۔ اور اس موسم میں وہ جزائر میں آ کر رہتے تھے۔ ان سب پر مزید یہ کہ دشمنوں
نے لغدے بہت سی کشتیاں بھی جلا دیں۔ ان وجوہات سے نقصان اٹھا کر واپس چلے آئے

بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔ حضرت ابوایوب انصاری نے بھی وہیں وفات پائی اور قسطنطنیہ کی فصیل کے متصل دفن کیے گئے۔

دوسرا حملہ پھر بنی امیہ ہی کے عہد میں ۹۸ھ میں ہوا۔ اور سلیمان بن عبدالملک نے فتح موعودہ کی امید پر اپنے بھائی مسلمہ کو ایک فوج گراں دیکر بھیجا۔ وہ ایک سال تک محاصرہ کیے ہوئے پڑا رہا۔ اور کچھ نہ کر سکا۔ اس لیے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے عہد میں اس کو واپس بلا لیا۔

تیسرا حملہ پھر ہشام بن عبدالملک کے عہد میں ۱۲۱ھ میں ہوا۔ لیکن اس دفعہ بھی کامیابی نہیں ہوئی۔

خلفاء عباسیہ میں سے صرف مہدی نے فتح قسطنطنیہ کی کوشش کی۔ اور ۱۶۵ھ میں اپنے بیٹے ہارون الرشید کو ایک لاکھ فوج دیکر بھیجا۔ وہ باسفورس کے ساحل تک پہونچا۔ ملکہ ایرینی نے جو وہاں اپنے کمسن بیٹے قسطنطین سادس کی طرف سے حکمراں تھی خوشامد کر کے ہارون کو ۹۰ ہزار دینار سالانہ جزیہ پر راضی کر لیا۔ اس وجہ سے وہ صلح کر کے واپس چلا آیا۔

سلجوقیوں میں سے ملک شاہ بھی حدود قسطنطنیہ تک پہونچا تھا۔ وہاں کے امرا ء نے ہزار دینار سالانہ جزیہ پر صلح کر لی۔

آل عثمان نے جب ایشیائے کوچک میں اپنی سلطنت قائم کر لی تو یورپین بادشاہوں کے ساتھ ان کی مسلسل جنگ قائم ہو گئی۔ جس کے لیے یہ بھی کچھ کمزور نہ تھے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے پورا بلقان فتح کر لیا۔ صرف قسطنطنیہ رہ گیا تھا جس کی فتح ان کی نظر میں نہایت اہمیت رکھتی تھی۔ اس لیے کوشش شروع کی۔

بایزید یلدرم پہلا عثمانی سلطان تھا جس نے اس کا محاصرہ کیا۔ پھر مراد ثانی نے دو لاکھ فوج کے ساتھ اس کی فتح کی کوشش کی مگر ارضروم کی اندرونی شورشوں کی وجہ سے اس کو محاصرہ اٹھا کر واپس آنا پڑا۔

اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سلطان محمد ۸۵۵ھ میں تخت نشین ہوا۔ جس کی قسمت میں یہ سعادت روز ازل میں لکھی گئی تھی۔ تخت نشین ہونے کے ساتھ ہی اس نوزدہ سالہ نوجوان سلطان سے رومیوں نے غداری کی اور جنگ چھیڑ دی۔ سلطان ان کی دست درازیوں سے تنگ آ گیا تھا۔ کیونکہ ان کے پاس قسطنطنیہ ایک ایسا سنگین حصار تھا جس کی بدولت وہ ہر قسم کے خطرات سے پناہ میں تھے۔

سلطان محمد نے وہ حدیث بھی سُنی تھی جس میں اس کے فتح کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تعریف فرمائی ہے۔ نیز اس کا باپ اس کے لیے وصیت بھی کر گیا تھا۔ علاوہ بریں رومیوں کے بدعہدی سے اس کے انتقام کا جوش بھڑک اٹھا تھا۔ ان وجوہات سے اس کے دل میں اس شہر کے فتح کرنے کا عزم راسخ پیدا ہو گیا۔

اس فکر میں وہ اس قدر مضطرب رہتا تھا کہ ایک بار شب کو اُسے نیند نہیں آئی۔ آدھی رات کو جب زیادہ بے قراری بڑھی تو وزیر خلیل پاشا کو طلب کیا وہ اس بے وقت کی طلبی سے گھبرایا ہوا پہونچا۔ سلطان نے کہا کہ تم دیکھتے ہو کہ رنج و غم سے میری کیا حالت ہے۔ کروٹیں بدلتا ہوں اور کسی پہلو نیند نہیں آتی۔ میں تم سے صرف ایک درخواست کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ "قسطنطنیہ مجھکو دے دو"۔

دانشمند وزیر نے اس طلب صادق کو دیکھ کر سمجھ لیا کہ اب اس شہر کے فتح ہونے کا قطعی وقت آ گیا ہے۔ اس نے سلطان کو تسلی دلائی اور واپس گیا۔

اسی درمیان میں ایک مستجاب الدعوات بزرگ شیخ آقا شمس الدین کو کشف کے ذریعہ سے معلوم ہوا کہ اس سال فلاں تاریخ اور فلاں وقت میں مسلمان قسطنطنیہ میں داخل ہو جائیں گے۔ اس نے وزیر سے کہا۔ وزیر نے یہ بشارت سلطان کو سُنائی۔

سلطان ہر قسم کا ساز و سامان درست کر کے جمادی الاول ۸۵۷ھ کے آغاز میں ادرنہ سے ساٹھ ہزار سوار اور تیس ہزار پیادہ فوج کے ساتھ روانہ ہوا۔ شیخ آقا شمس الدین اور آقا بیگ کو بھی کہ ممتاز بزرگانِ دین میں سے تھے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ تا کہ ان کی دعاؤں

کی مدد سے کامیابی حاصل کرے۔ یہ دونوں حضرات بخوشی و رغبت صف مجاہدین میں شامل ہوگئے سلطانی فوج کے ساتھ رضاکاروں اور تماشائیوں کی تعداد بھی دو لاکھ سے کم نہ تھی۔

تین طرف سے محاصرہ کرکے جنگ شروع کی۔ قسطنطنیہ کے گرد جو خندق تھی اس میں خلیج کے دہانہ سے پانی آتا تھا۔ اس دہانہ پر مضبوط زنجیر رومیوں نے لگا دی تھی تاکہ اسلامی جہاز اور کشتیاں نہ آسکیں نیز حفاظت کے لیے جنگی جہاز بھی رکھ چھوڑے تھے۔ مسلمانوں کے لیے فصیل تک پہونچنے کی کوئی سبیل نہ تھی۔ اس لیے انھوں نے خندق کو پاٹنا شروع کیا۔ لیکن جو یہ دن کو پاٹتے تھے رومی رات کو اس کو صاف کر دیتے تھے۔

سلطان نے اب وہ تدبیر سوچی جو آج تک دنیا میں کسی سے نہیں ہو سکی۔ یعنی اس نے خندق سے سمندر تک دس میل لکڑی کے تختے بچھا دئیے اور ان پر موم اور چربی ڈلوا کر سمندر سے ۷۰ کشتیاں راتوں رات غلطہ کے بالائی حصہ سے لاکر خندق میں ڈلوا دیں۔ یہ کشتیاں سپاہیوں اور سامان جنگ سے لدی ہوئی تھیں۔ صبح کو رومیوں نے شہر پناہ سے ان پر آتش فشانی شروع کی۔ اور یہ کوشش کی کہ نفط سے ان کو جلا دیں۔ لیکن مسلمان ہوشیار تھے۔

آخر وہ وقت آگیا جو آقا شمس الدین نے مقرر کیا تھا۔ لیکن اس وقت تک شہر فتح نہیں ہوا وزیر دوڑا ہوا آقائے موصوف کے پاس آیا۔ دیکھا کہ وہ سجدہ میں پڑے ہوئے دعا کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں سر اٹھایا۔ اور کہا کہ فتح مبارک۔ اس وقت فصیل ٹوٹ چکی تھی اور مسلمان شہر میں داخل ہو رہے تھے۔ وزیر نے آقا کی مبارکباد سلطان کو پہونچائی۔ وہ فوراً سجدۂ شکر میں گر پڑا۔ اس کے بعد کہا کہ میں نے اس فتح پر یہ سجدۂ شکر نہیں کیا ہے۔ بلکہ اس بات پر کہ اللہ تعالیٰ نے میرے زمانہ میں ایسے بزرگوں کو باقی رکھا ہے۔

پورے ۵۱ دن کے محاصرہ کے بعد اسلام کی ساڑھے آٹھ سو سال کی امید سلطان محمد کے ہاتھوں سے بر آئی۔ ۲۰ جمادی الثانی یوم چہارشنبہ ۸۵۷ھ مطابق ۱۴۵۳ء میں وہ قسطنطنیہ میں داخل ہوا۔ اسی روز سے اس کا نام فاتح رکھا گیا۔

تمام عالم اسلامی میں اس فتح پر خوشی کے نعرے بلند ہوئے کیونکہ اس سے آنحضرتؐ کی وہ بشارت جو اُمت کو دے گئے تھے پوری اُتری۔

فتح کے بعد حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مزار شریف پر عالیشان جامع مسجد تعمیر فرمائی۔ پہلا جمعہ جب اس میں پڑھا گیا تو آقا شمس الدین نے سلطان کی کمر سے تیغ باندھی۔ اُس وقت سے اب تک یہ دستور چلا آتا ہے کہ آل عثمان میں سے جو سلطان تخت نشین ہوتا ہے اُس کی تاجپوشی اور شمشیر بندی کی رسم اسی مقدس مسجد میں ادا کی جاتی ہے۔

حدیثوں میں ایک دوسری فتح قسطنطنیہ کا بھی ذکر ہے جو قیامت سے پہلے ہوگی۔ صحیح مسلم شریف میں متعدد روایتیں ہیں جن کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت قائم ہونے سے پہلے بنی اسحاق میں سے ستر ہزار آدمی قسطنطنیہ پر یلغار کریں گے۔ اور اس کو بلا نیزہ اور بلا شمشیر بغیر اسلحہ کی تکبیر اور تہلیل کے نعروں سے فتح کرلیں گے۔

اس روایت میں بنی اسحاق سے غالباً اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ وہ غیر اہل عرب ہونگے۔ یعنی بنی اسماعیل میں سے نہ ہوں گے۔ تکبیر اور تہلیل سے عیاں ہے کہ وہ مسلمان ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ اس روایت سے پہلی فتح جو سلطان محمد فاتح نے حاصل کی نہیں مراد لی جاسکتی۔ کیونکہ وہ بزور اسلحہ شدید معرکوں کے بعد ہوئی تھی۔ اغلب یہ ہے کہ اس روایت میں اس فتح کی پیشین گوئی ہے جو اس وقت غازی مصطفیٰ کمال نے اس شہر پر حاصل کی ہے۔ اور جس کو دیکھنے کی سعادت ہم لوگوں کو حاصل ہوئی ہے۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ ۱۶ مارچ ۱۹۲۰ء سے یہ دار الخلافہ مسلمانوں کے ہاتوں سے نکل کر بالکل اتحادیوں کے قبضہ میں چلا گیا تھا۔ گو وہاں خلیفہ اور اُس کا وزیر داماد فرید پاشا برقرار تھے لیکن صرف نام کے لیے تھے۔ ان کے پوست میں اتحادی نواب حکومت کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۱ اپریل ۱۹۲۰ء کو وزیر مذکور نے شیخ الاسلام دری زادہ عبداللہ افندی سے فتویٰ لیکر ان حامیان دین وطن کو جو سرزمین اناطول میں جمع ہوگئے تھے باغی قرار دیا۔ اور اتحادیوں کے قرضہ سے مصطفیٰ پاشا کُردی کی ماتحتی میں اُن کے مٹانے کے لیئے

فوج بھی۔ پھر ۲۰ رمئی ۱۹۲۰ء کو مصطفےٰ کمال پاشا۔ فواد پاشا۔ قرہ واصف بک۔ مصطفےٰ فوزی پاشا
ڈاکٹر عدنان بک۔ رؤف پاشا وغیرہ پر غائبانہ موت کا فتویٰ صادر کیا گیا۔ اور ان سے کے ہر قسم
کے فوجی امتیازات اور شہری حقوق ضبط کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔
لیکن بتائید الٰہی ان راسخ العقیدت مجاہدوں اور غازیوں نے یونانیوں کو شکست دیکر اس شہر
کو بلا اسلحہ کے محض اپنے شیرانہ نعرہائے تکبیر وتہلیل سے پھر فتح کر لیا۔ اب ان کی جانباز فوجیں
وہاں داخل ہو رہی ہیں۔ ۲۵ نومبر کو خود غازی مصطفےٰ کمال کا داخلہ بھی انشاء اللہ نہایت دھوم
کے ساتھ ہوگا۔
اس کے بعد احادیث ہم کو کچھ اور بھی آگے لے چلتی ہیں۔ ابو داؤد شریف میں ہے کہ
بیت المقدس کی آبادی مدینہ کی ویرانی ہے۔ اور مدینہ کی ویرانی ابتدائے جنگ ہے۔
اس کے بعد فتح قسطنطنیہ ہے۔ پھر ساتھ ہی خروج دجال ہے۔
ترمذی اور ابو داؤد دونوں نے یہ روایت لکھی ہے کہ فتح قسطنطنیہ اور خروج دجال میں صرف
سات مہینہ کا فصل ہے۔
پیشین گوئیوں کے الفاظ میں چونکہ ابہام ہوتا ہے اس لیے آئندہ واقعات کے متعلق ہماری
تفسیر ابھی قبل از وقت ہے۔ انشاء اللہ جب موقع آئے گا تو لکھیں گے۔
اس مضمون میں صرف یہ دکھانا تھا کہ قسطنطنیہ کا تاریخی تعلق اسلام کے ساتھ عہد نبوت سے ہے
اور قیامت تک رہے گا۔ انشاء اللہ

شیر شاہ
اور
اُس کا نظام حکومت

تاریخ میں فرید ابن حسن کا نام مدتوں یادگار رہے گا۔ ایک معمولی جاگیردار کے رتبہ سے ترقی کرکے وہ اپنے زمانہ کا سب سے بڑا بادشاہ ہوا۔ اس نے وہ شہرت حاصل کی کہ اب تک اس کا نام تاریخ ہند کے مطالعہ کرنے والوں کے لیے ایک خاص لطف رکھتا ہے۔ اوائل عہد جوانی میں اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا بلکہ لوگوں سے کہا بھی کرتا کہ وہ اُس افغانی سلطنت میں جان ڈال کر رہے گا جسے بابر کی تلوار نے پانی پت (۱۵۲۶) کی لڑائی کے بعد بالکل نیست و نابود کر دیا تھا۔ ابراہیم لودی کی شکست سے افغانوں کے دلوں میں ایسا خوف بیٹھ گیا تھا کہ مدتوں مغل فاتحوں کے ظلم و ستم کی داستان دہراتے ہی رہے، ذی رائے اور باعزت افغان سردار کہا کرتے تھے کہ مغلوں کا ہندوستان سے نکلنا محال ہے اور فرید کے امید افزا خیالات کی ہنسی اُڑاتے تھوڑے ہی عرصہ میں نوجوان افغان نے اپنے قول کو عمل سے بدل کر دکھلا دیا اور ہمایوں کو ہندوستان سے نکال کر چھوڑا۔

اپنی زندگی کے اس بڑے مقصد کو حاصل کرنے کے بعد وہ دل و جان سے اس ابتری کے دور کرنے میں لگ گیا جو لودی سلطنت کی بربادی کے بعد ہندوستان میں ہر سمت نظر آتی تھی۔ وہ صرف ایک بڑا فوجی قائد ہی نہ تھا بلکہ اس کے ذہن میں چند اسکیمیں بھی تھیں جن کے عمل میں لانے کی کوشش وہ اس وقت سے کر رہا تھا جبکہ وہ خواص پور اور ٹانڈہ میں اپنے والد کی جاگیر کے انتظام میں مصروف تھا۔ وہ ایک قابل منتظم کی حیثیت سے مشہور ہو چکا تھا اور حکومت دہلی کے زمانہ میں تو اس کا انتظام اس قدر پسندیدہ رہا کہ اُس کا سب سے بڑا دشمن ابوالفضل بھی کوئی عیب نہ نکال سکا۔ بدقسمتی سے اس کے اس شعبۂ زندگی کے متعلق معلومات کا اتنا کم ذخیرہ

موجود ہے کہ کوئی لاعلمی کے پردہ کو ہلا سامنے سے نہ اُٹھا سکا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دربار مغلیہ کے
تاریخ نویسوں نے اس کی خوبیوں پر پردہ ڈالنے کی پوری کوشش کی ہے اور ان سب کو
بڑی خوشی کے ساتھ اپنے آقاؤں سے منسوب کر دیا ہے، پھر بھی یہ ممکن ہے کہ ساری معلومات کو
اکٹھا کرنے کے بعد اس کی حکومت کا ایک خاکہ نظروں کے سامنے آسکے۔

بادشاہت | بخلاف اپنے بہت سے ہمعصروں کے شیر شاہ نے کبھی اُن رسوم کی کورانہ تقلید نہ کی
جنھیں افغان اپنے کوہستانی وطن سے ان میدانوں میں لائے تھے بلکہ اس نے ہمیشہ عملی صورت
اختیار کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنی تیزی فہم کی بدولت یہ معلوم کر لیا کہ بہلول لودی کی قائم کردہ
سلطنت ایک بڑی سرداری سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اور اس کی بقا کا دار و مدار سرداران
قبائل کی خوش عقیدگی پر ہے جن میں سے بعض ۴۵ ہزار سے ۷۵ ہزار سواروں تک کے سردار تھے
اور شاہان لودی کی عظمت کو حسد کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ سلاطین لودی کی تاریخ نے یہ
ثابت کر دیا تھا کہ باوجود ان تمام فوائد کے جو ایک خون ہونے اور اتحاد مقاصد کی بنا پر حاصل ہو سکتے ہیں
بہت ممکن تھا کہ ان اُصولوں پر قائم کردہ سلطنت متلون مزاج سرداروں کے تلون طبع کا شکار
ہو جائے اور یہ صورت اُس وقت پیش آئی تھی جب مرکزی طاقت اپنی افضلیت محسوس کرانا چاہتی
یا بالکل کمزور ہو جاتی۔ اس لیے اس نے سلطنت کی بنیاد زیادہ مستحکم کرنے کا ارادہ کر لیا اور وہ
یوں کہ پھر انھیں اُصولوں کی پابندی کی جائے جنھیں ان سے قبل تاتاری بادشاہوں نے
فارس سے حاصل کیا تھا۔ بحیثیت ایک عملی انسان ہونے کے وہ اس کام کی دشواریوں سے
باخبر تھا مگر اپنے حیرت انگیز استقلال کی بدولت جس سے وہ ہمیشہ کام لیتا رہا اپنے مقاصد کے حاصل
کرنے میں کامیاب رہا اپنی فراست، تدبر، خوش بیانی، اور کامیابی کی وجہ سے اس نے با اثر افغان
سرداروں کی نظروں میں عزت حاصل کر لی۔ اُنھوں نے خوشی کے ساتھ اُسے بالاتفاق اپنا
بادشاہ منتخب کر لیا۔

بخلاف بہلول لودی کے وہ تخت پر بھی بیٹھا اور ان تمام مناصب مراتب کا خیال بھی رکھا

آداب سلطنت جن کے مقتضی تھے، اس نے قادر شاہ حاکم مالوہ کو سزا دینے میں بہت پیش بینی سے کام لیا جس نے اپنی برتری کا اظہار یوں کیا تھا کہ بجواب فرمان جو خط شیر شاہ کو لکھا اس میں اپنی مُہر سب سے پر لگا دی تھی۔ شیر شاہ نے ایسا رویہ اختیار کیا کہ سلطنت کے بڑے بڑے امرا بھی اس سے ڈرتے تھے۔ وہ کسی مجرم کو سزا دینے میں پس و پیش نہ کرتا تھا خواہ اس کا رتبہ کتنا ہی بڑا ہو خواص خاں، اپنے سب سے زیادہ معتبر اور وفادار وزیر کو بھی اس کی تقصیروں پر سب کے سامنے برا بھلا کہنے سے باز نہ آیا شجاعت خاں ایک ویسے بڑے امیر کی جاگیریں کم کر دیں اور ایسی تنبیہ کی کہ وہ گھبرا اُٹھا اور سب سے بڑے سردار ہیبت خاں نیازی نے تو اپنے قبیلے کے بہت سے لوگوں کو قتل کر ڈالا اُس کے ناراض کرنے سے زیادہ مناسب سمجھا عباس خاں نے بہت صحیح کہا ہے کہ:۔

"شیر شاہ کا رعب افغانوں کے دلوں پر ہمیشہ چھایا رہتا تھا خواہ وہ حاضر ہو یا غائب اور کوئی اس کی مخالفت میں سانس بھی نہ کھینچ سکتا تھا" یہ وہی افغان تھے جو اپنی سرکشی اور تلون طبع کے لیے سارے جہان میں مشہور رہے۔

لیکن باوجود اس خوف و دہشت کے کوئی اُس سے نفرت نہ کرتا تھا۔ کوئی ایسا صریح واقعہ نظر نہیں آتا جس سے ثابت ہو کہ کسی امیر نے بھی اس کے احکام کی تعمیل بجبر و اکراہ کی ہو چہ جائیکہ کوئی اس کی مخالفت میں کھڑا ہوتا، امرا اُسے افغانوں کا نجات دہندہ خیال کرتے تھے اور اس لیے اُس کے ہر حکم کی خوشی سے تعمیل کرنے کو تیار تھے۔ یہاں تک کہ اس کی وفات کے بعد سوا اعظم ہمایوں کے اور کسی نے اُس کے لڑکوں سے غداری کا خیال بھی نہ کیا اور خواص خاں و شجاعت خاں کی مثالیں تو مجسم وفاداری ہیں۔ اگر وہ کچھ دنوں اور زندہ رہتا تو بلاشک ایک زمانہ تک کے لیے اُن واقعات کا سدباب کر جاتا جنھوں نے نہ صرف لودی سلطنت بلکہ سوری حکومت کو بھی برباد کر دیا۔

احساس فرائض منصبی | شیر شاہ بلاشک و شبہ ایک جفاکش بادشاہ تھا۔ وہ دن رات مصروف رہتا تھا کوئی بات خواہ بڑی ہو یا چھوٹی اس کی تیز نگاہوں سے بچی نہ تھی۔ صبح تین بجے اُٹھتا غسل کرتا

اور نماز پڑھتا پھر مختلف افسروں کی عرضداشتیں سنتا اور اس کے بعد مختلف ملکوں سے صدر اپنے معاملات پیش کرتے تھے جن پر فارسی میں احکام صادر کرتا جو باقاعدہ لکھ لیے جاتے تھے۔ اس وقت تک سورج افق پر ظاہر ہو جاتا تھا اور وہ وضو کرکے نماز با جماعت ادا کرتا۔ اس کے بعد وہ امرا اور فوج کے سلام لیتا اور بعضوں سے ملاقات بھی کرتا یہاں تک کہ ایک گھنٹہ گزر جاتا اور نماز کا وقت آجاتا۔ نماز ادا کرنے کے بعد وہ سرداروں اور سپاہیوں کی ضروریات کے متعلق دریافت کرتا اور گھوڑوں کے انتظام کا معائنہ کرتا۔ اب فیصلہ مقدمات کا وقت آتا۔ یہ ایسا کام تھا جس سے شیر شاہ کبھی گھبراتا نہ تھا۔ اس کے بعد خزانوں کا معائنہ کرتا جو باہر سے برابر دارالسلطنت میں آتا رہتا تھا۔ پھر امیروں یا ان کے نائبوں کی رپورٹیں۔ زمینداروں کی عرضیاں اور دوسرے فرمانرواؤں کے پیغام سنتا اور سب کا مناسب جواب دیتا۔ اس طرح دن کا ابتدائی حصہ گزرتا۔ اب وہ اپنے دربار کے علما اور فضلا کے ساتھ کھانا کھانے کے لیے اُٹھتا کھانا کھا کر پھر کام شروع کر دیتا اور برابر دوپہر تک کام کرتا رہتا جبکہ تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے اُٹھ جاتا۔ قریب دو بجے وہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتا اور پھر کام میں لگ جاتا۔ اسی طرح وہ تمام دن اور رات کا زیادہ حصہ ان مشغلوں میں گزارتا۔ اس اعتبار سے وہ اورنگ زیب جیسے نفس کش آدمی کا ہم پلہ کہا جاسکتا ہے شیر شاہ کے انتظاموں میں کسی خاص اختراع کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ایک بڑا موجد نہ تھا لیکن اس نے اپنے زمانہ کے سارے آئین و قوانین نئے سرے سے مرتب کیے۔

عدل: اسلامی قوانین میں انصاف پر بہت زور دیا گیا ہے۔ ابن بطوطہ جس نے محمد بن تغلق کے زمانہ میں ہندوستان کا سفر کیا لکھتا ہے کہ بعض اوقات بادشاہ بھی قاضی کی عدالت میں ایک معمولی مجرم کی طرح کھڑا نظر آتا تھا۔ شیر شاہ ان معاملات میں خاص طور پر سخت تھا وہ اپنے ایک فرمان میں انصاف کی تعریف یوں کرتا ہے "صرف ظلم سے باز رہنے کو انصاف نہیں کہتے۔ بلکہ ہر شخص کے ساتھ مناسب سلوک کا نام عدل ہے" یہ ماننا پڑے گا کہ آمد و رفت کی دشواریاں

ا؎ نہ معلوم یہ کس وقت کی نماز تھی غالباً فجر کی خرابی کی گئی ہے۔ (احراری)

نصرام اور عمل میں تاخیر کا باعث ہوتی تھیں لیکن یہ کمی بادشاہ اور اُس کے جاسوسوں کے خوف اور ڈاک کے سلسلے سے بہت کچھ پوری ہو جاتی تھی۔ یہ دشواریاں تار ریل اور ڈاکخانہ کے جاری ہونے سے قبل ہر ملک میں پیش آتی تھیں۔ کوئی شخص بلا لحاظ منصب مرتبہ جرم یا قانون شکنی کی سزا سے بچ نہ سکتا تھا۔ باقاعدہ عدالتیں ہوتی تھیں جو دارالعدل کے نام سے مشہور تھیں۔ ان میں قاضی اور میر عدل مقدمات سننے اور انصاف کرنے کی خاطر اجلاس کیا کرتے تھے۔

شرعی فیصلے قرآن اور حدیث کے احکام کے مطابق فیصل کیے جاتے اور مقدمات جو قانون رائجہ کے تحت میں آتے مقامی رواجوں کے مطابق طے ہوتے تھے۔ ہندوؤں کے لیے کوئی علیحدہ انتظام معلوم نہیں ہوتا۔ غالباً یہ لوگ زیادہ تر پنچایتوں کی طرف رجوع کرتے تھے جو اسلامی عہد میں اس قدر ناکارہ نہ ہوئی تھیں جیسی کہ اب ہیں۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ شاہی عدالت سے محروم رکھے جاتے تھے بلکہ جب چاہتے اس میں مرافعہ کر سکتے تھے۔ ایسے مقدمات کے فیصلہ میں فریقین کی سوسائٹی کے رسم و رواج کا خیال کیا جاتا تھا۔

تعزیری قانون عام اور سخت تھا افغانوں کا قانون قصاص جاری تھا۔ سزائے قید۔ تازیانہ۔ قطع اعضا۔ جرمانہ اور دار عموماً مروج تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ سزا دینے کے لیے کچھ معمولی قوانین موجود تھے مگر عبرت دلانا اصل الاصول تھا اور اس لیے بعض اوقات چوری اور رشوت ستانی کی سزا بھی موت ہوتی تھی۔ شیر شاہ نے افسران جیل کو یہ حکم دے رکھا تھا کہ کسی قیدی کو اُس وقت تک سخت سزا نہ دی جائے جب تک کہ پند و نصائح کے سارے طریقے ناکام نہ ثابت ہو لیں۔

شیر شاہ کی سلطنت ۴۷ صوبوں میں منقسم تھی اور ہر صوبہ میں بہت سے پرگنے ہوتے تھے کم و بیش گیارہ ہزار تین سو (۱۱۳۰۰) پرگنے براہ راست بیت المال کے ماتحت تھے۔ ہر پرگنہ میں ایک شقدار، ایک امین، دو محرر (ایک ان میں سے فارسی میں اور دوسرا ہندی میں حساب رکھتا تھا) ایک منصف اور ایک خزانچی ہوتا تھا علاوہ ان عمال سرکاری کے ایک پٹواری

اور ایک چودھری بحیثیت نمایندہ رعایا ہوتے تھے اور حکومت انھیں مانتی تھی۔ ان کے اوپر ایک "افسر شق دار" اور "افسر منصف" ہوتا تھا جن کی عملداری پورے صوبہ (سرکار) پر ہوتی تھی۔ ان کے علاوہ ہر سرکار کے لیے ایک "امیر" ہوتا تھا جس کے اختیارات موجودہ زمانہ کے گورنر کے برابر ہوتے تھے۔

یہ متذکرہ بالا عمال اُن علاقوں میں ہوتے تھے جو بیت المال کے تحت میں تھے۔ زمیندار یا جاگیردار امیروں، جاگیرداروں اور متولیان وقف کو عام طور پر اپنی عملداریوں میں انتظام کی اجازت تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ جائداد موقوفہ ایک مجلس کے زیر اختیار ہوتی تھی جو مقامی باشندوں کی بنائی جاتی۔ مزید براں سرکاری عمال کا فرض تھا کہ وہ ان کی نگرانی کرتے رہیں اور رعایا پر ظلم نہ ہونے دیں۔ محرر پرگنہ کا فرض تھا کہ وہ رقبہ آراضی کا جو ہر کاشتکار کے پاس ہو اور مقدار لگان کا جو اسے حق ملکیت و کاشت کے عوض دینی ہو صحیح صحیح اندراج کرے علاوہ اس کے انھیں حکام بالادست کو نقص امن اور بارش وغیرہ کے متعلق معلومات بہم پہونچانی پڑتی تھیں مقامی حکام قیام امن کے بھی ذمہ دار ہوتے اور اگر کوئی جرم ان کے علاقہ میں بلا تفتیش رہتا تو وہ مستوجب معزولی سمجھے جاتے۔

محاصل و مالیات: یہ بیان کیا جاتا ہے کہ شیر شاہ سب سے پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس نے آراضی کی صحیح پیمائش کرائی عباس خاں کہتا ہے کہ شیر شاہ کے زمانہ سے پہلے پیمائش کا رواج نہ تھا بلکہ ایک قانون گو ہوتا تھا جس سے پرگنہ کے ماضی حال و مستقبل کے حالات دریافت کیے جاتے تھے۔ یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ پیمائش آراضی جیسی کارآمد چیز فرمانروایان دہلی کے علم سے باہر ہی ہو جبکہ ایران میں شیر شاہ سے مدتوں پہلے سے اس کا رواج چلا آتا تھا اور اُنھوں نے ایران کا طرز حکومت اختیار کیا یہ صحیح ہے کہ زمین کی عام پیمائش کا تذکرہ شیر شاہ سے پہلے فارسی تاریخوں میں نہیں آتا لیکن پیمائش کی اصطلاحیں مدتوں پہلے سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو معلوم تھیں جس سے پیمائش کا امکان ثابت ہوتا ہے ضیاء برنی میں ایک عبارت

جس سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے، حقیقت امر یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایسے مقامات کے قانون گو جہاں پیمائش خلاف رواج نہ سمجھی جاتی تھی اپنی ہدایت کے لیے ایسے اندراج کرتے تھے لیکن مرکزی حکومت کی طرف سے عام پیمائش کی کوشش شیر شاہ سے پہلے عمل میں نہیں آئی۔ کچھ بھی ہو یہ تو ظاہر ہے کہ شیر شاہ نے بھی ایسے مقامات پر پیمائش نہیں کرائی جہاں یہ خلاف رواج سمجھی جاتی تھی۔ ہمیں اس کا ایک حکم اعظم ہمایوں کے نام ملتا ہے جس میں اس نے پیمائش کو منع کیا ہے۔ اور پیداوار کا ایک جزء لینے کا حکم دیا ہے۔

پیمائش آراضی احمد خاں کی نگرانی میں لائق برہمنوں کی مدد سے عمل میں آئی تھی دفتر بیت المال میں ایک جسٹر ہوتا تھا جس میں حقوق مالکانہ اور صحیح رقبۂ آراضی قابل زراعت یا ناقابل زراعت درج ہوتا تھا زمین مختلف قسم کی ہوتی تھی اور ہر ایک کا نرخ علیحدہ مقرر ہوتا تھا۔ زمین ہر فصل کے وقت ناپی جاتی تھی اور اس کے مطابق لگان وصول ہوتا تھا۔ نقد مالگذاری وصول ہونے میں کوئی دقت نہ ہوتی مگر جنس کی وصولی کے متعلق صاف اور صریح ہدائتیں تھیں کہ کس قسم کا غلہ لینا چاہیئے تاکہ عمال کاشتکاروں کو ستا نہ سکیں اگر بارش کی کمی یا کسی غیر معمولی سبب سے فصل خراب ہو جاتی تو کاشتکاروں کو حکومت کی استعداد کے مطابق تقاویاں بھی دیجاتیں۔ اگر کاشتکاروں کو مالگذاری کے علاوہ اور کچھ نہ دینا پڑتا تو غالباً اُن کی حالت اچھی رہتی مگر اُس زمانے میں بہت سے چھوٹے چھوٹے محصول حکومت اور عمال کی طرف سے لگائے جاتے تھے اور رسم و رواج کی بنا پر مخصوص ہو گئے تھے۔ ابوالفضل نے "آئینہ اکبری" میں ان کی ایک طویل فہرست دی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ شیر شاہ کی وفات کے بعد بھی قائم رہے اُن میں سے خاص خاص یہ تھے۔ مویشیوں کا محصول۔ مختلف عمال کے حقوق۔ ٹھیکہ لینے کا نذرانہ۔ درختوں اور تیل پر محصول، فصل کاٹنے۔ مویشی بیچنے اور مچھلی مارنے کی اجازت کے محصول وغیرہم یہ ظاہر ہے کہ ان سے کاشتکاروں کو بہت دقت اور تکلیف ہوئی ہوگی۔

محاصل کی وصولی کے بارہ میں شیر شاہ بہت سخت تھا وہ کہا کرتا تھا کہ ایک بادشاہ

کے لیے بہتر ہی کہ پیمائش کے وقت کاشتکاروں کے ساتھ رعایت برتے لیکن جب وصولی کا وقت آئے تو کسی قسم کی رعایت نہ کرنی چاہیے۔ اور بہت سختی کے ساتھ لگان وصول کرنی چاہیئے۔ اس اصول کی پابندی حکومت اور کاشتکاروں کے مفاد کے لیے بہت ضروری تھی۔

آمدنی | مالیات کا مسئلہ شرع محمدی میں کچھ پیچیدہ ہی اگرچہ وہ اصول جن پر یہ مبنی ہی بہت سادہ اور آسان ہیں۔ شریعت کی رو سے آمدنی کی دو بڑی مدیں قائم کی جا سکتی ہیں۔ دنیادی اور دینی موخرالذکر میں زکوٰۃ داخل ہی جو مویشیوں کے گلے۔ سونے چاندی۔ تجارتی مال۔ پیداوار زمین پر عاید ہوتی تھی اور اول الذکر میں وہ محاصل شامل ہیں جو غیر مسلموں پر لگائے جاتے تھے مثلاً خراج۔ جزیہ۔ غیر مسلم تاجروں پر محصول۔ مال غنیمت اور کانوں پر محصول زمینوں اور لاوارث شخصوں کی جائداد پر محصول۔ ان ذرائع آمدنی کے علاوہ حکومت اور حاکم کی ضروریات اور نئے شرعی محصولوں کے اضافہ پر مجبور کرتی تھیں۔ یہ زمانہ گزرنے پر رواج میں داخل ہو جاتے تھے۔ اگرچہ ان اصولوں کی کماحقہٗ پابندی نہ ہوتی تھی اور اسلام کی بتائی ہوئی تفصیل محاصل پر کم عمل ہوتا تھا۔ تاہم مسلمانوں کے عہد میں یہ بنیادی اصول تھے برنی عفیف اور ابوالفضل کی تصانیف پر نگاہ ڈالنے سے یہ حقیقت روشن ہو جائے گی۔

اخراجات | بیت المال حقیقت میں رعایا کی ملک تھا اور بادشاہ کی ذاتی جائداد سے باہر خیال کیا جاتا تھا۔ قانون اسلامی کی رو سے آمدنی کا $\frac{1}{5}$ امیر کا حصہ ہوتا تھا اور $\frac{4}{5}$ مومنین کا لیکن آسانی کے لحاظ سے ہم اخراجات کی بھی دو مدیں قائم کر لیتے ہیں۔ دینی اور دنیوی۔ اول الذکر میں اخراجات متعلق نفع عامہ شامل ہیں مثلاً علما کے وظیفے لنگر خانے۔ سرائیں۔ غربا مساکین یتیم، بڈھوں اور بیواؤں کی امداد اور موخرالذکر میں حکومت کے اخراجات فوجی اور دیوانی اسی میں حاکم کے اخراجات خانہ داری بھی شامل ہیں جو ان کی مرضی پر منحصر تھے فیروز شاہ اگر نفس کش نہ تھا تو مسرف بھی نہ تھا اور عموماً اس کی ضروریات بہت سادہ ہوتی تھیں سپاہیوں

اور افسروں کی تنخواہ یا فوج کی آراستگی کے معاملے میں وہ بہت سخت تھا۔ اس کو ایک بڑی فوج رکھنی پڑتی تھی۔ وجہ ظاہر ہے۔ یہ فوج اکبر کی فوج سے بھی بڑی تھی چنانچہ فوجی مصارف بہت زیادہ تھے۔ محکمہ تعمیرات عامہ میں بھی خرچ بہت زیادہ ہوتا تھا اس لیے کہ یہ اس کے سارے عہد حکومت میں کام کرتا تھا۔

خیرات و اوقاف | خیرات کے کاموں پر بھی کافی خرچ ہوتا تھا۔ اس محکمہ کا صدر قاضی ہوتا تھا لیکن اکبر کی طرح شیر شاہ بھی عطیات کے مسئلہ میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ بہت سی سیاسی و اخلاقی مصلحتوں کی بنا پر وہ مستحق اور متشرع آدمیوں کو اور خیراتی مدارس کو اس خدمتی سے وظیفے دیتا کہ آخر زمانہ کے تاریخ نویسوں نے بہت سخت الفاظ میں اس کے خلاف لکھا ہے۔ لیکن وہ نہ تو لاپرواہ تھا اور نہ از حد مخیر۔ اس نے ان تمام عطیات کو منسوخ کر دیا جو اس نے قبل غیر افغانی ہاتھوں سے دی گئی تھیں لیکن اس نے لوگوں کو مفلس نہ بنا دیا۔ اس حکم کی وجہ یہ تھی کہ وہ عالم اور پابند مذہب طبقہ کو اپنی یعنی افغانوں کی طرف کر لینا چاہتا تھا۔ اور وہ ان عطیات کو پھر معقول و مناسب طریقہ پر تقسیم کرنا چاہتا تھا۔ اس کا اصول تھا کہ کوئی مستحق شخص محروم نہ رہ جائے لیکن ساتھ ہی ساتھ کوئی شخص اپنی ضروریات سے زیادہ نہ پا جائے۔

شیر شاہ نے اس معاملہ میں بہت زیادہ نرمی اور سہولت سے کام لیا اس سے وہ ان تمام الزامات سے بچ گیا جو علاء الدین خلجی اور خصوصاً اکبر پر عائد کیے جاتے ہیں۔ ایک پرگنہ کے سارے جاگیردار ایک ساتھ دربار میں بلائے جاتے تھے ان کے ساتھ بہت نرمی کا برتاؤ کیا جاتا اور واپس کرتے وقت انھیں زاد راہ بھی دیدیا جاتا تھا سب سے زیادہ اس کا خیال رکھا جاتا تھا کہ کاتب لوگوں کو پریشان نہ کریں اور دھوکہ نہ دے سکیں لہٰذا شیر شاہ ہر کاغذ کو خود دیکھ لیتا اور اُسے متعلقہ پرگنہ میں اپنے معتمد ملازموں کے ذریعہ سے بھیجتا تھا۔

مسجدوں اور مدرسوں کے انتظام کرنے کے علاوہ وہ حقدار طلبا اور معلموں کو وظائف بھی دیتا۔ ایک دفعہ اس نے ایک طالب کو ۵۰۰ روپیہ اور ۵۰۰ بیگہ زمین عطا کی۔ بیمار، ضعیف غربا، بیوگان اور اندھوں کے واسطے کافی انتظام تھا۔ غریب خانے جہاں قیام اور طعام مفت

تھا اکثر مقامات پر کھوسلے جاتے تھے سفر میں اس کے ہمراہ ایک لنگر خانہ ہوتا تھا جس میں محتاجوں کو ہر وقت کھانا ملتا خواہ وہ سپاہی ہوں یا کاشتکار یا فقیر۔ اس کے لنگر خانہ کا خرچ اس زمانہ میں ایک لاکھ اٹھارہ ہزار اشرفی تھا جبکہ چیزیں آج کل سے کئی گنی ارزاں ملتی تھیں۔

موجودہ ذرائع سفر کے ایجاد ہونے سے قبل سفر کرنا ایک زحمت تھی اور اس وجہ سے مسافر کے ساتھ ہر جگہ ہمدردی کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ مسلمان اور ہندو دونوں مسافر نوازی کو ایک اخلاقی فرض سمجھتے تھے۔ شیر شاہ بھی اور بڑے بڑے بادشاہوں کی طرح مسافروں کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے سڑکوں کو اچھی حالت میں اور خطروں سے محفوظ رکھنے کی بہت زیادہ کوشش کی کچھ نئی سڑکیں بنوائیں اور پرانی سڑکوں کی مرمت کرائی۔ شاہراہوں میں سے ایک گور (بنگال) سے اودھ تک دوسری بنارس سے مانڈو اور سرحد دکن تک تیسری آگرہ سے بیانا تک ہوتی ہوئی سرحد جودھ پور تک اور چوتھی بیانا سے جونپور تک جاتی تھی۔ اس نے آگرہ اور دہلی کے درمیان جنگل کاٹ کر ایک سڑک نکالی جس سے مسافت بہت کم ہو گئی ورنہ مسافروں کو دوآب سے گزر کر جانا پڑتا تھا اور اس میں چکر بہت تھا۔

سڑکیں آج کل کی سڑکوں کی طرح لمبی اور سنسان نہیں ہوتی تھیں۔ ہر بڑی سڑک پر اور خصوصاً شاہ راہ عظمیٰ پر جو سونارگاؤں سے انڈس تک جاتی تھی اور اس سڑک پر جو آگرہ سے برہان پور کے قریب تک جاتی ہے ہر ہر کوس پر ایک سرائے۔ ایک پختہ کنواں ایک باغ اور ایک مسجد ہوتی تھی۔ اور اوقات کی مدد سے جو اسی غرض کے لیے مخصوص تھے ہر ایک کی مرمت ہوتی رہتی تھی۔ ان سراؤں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے قیام کا علیحدہ علیحدہ انتظام تھا ہندو اور مسلمان ملازم مسافروں کے واسطے سرد اور گرم پانی پختہ یا خام جنس اور دیگر ضروریات کے مہیا کرنے کے لیے رکھے جاتے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ان سڑکوں پر مسافر نہایت اطمینان سے اپنا اسباب کسی درخت کے نیچے رکھ کر اپنے گھوڑے یا مویشی چرانے جا سکتا ہے اور ایک بڈھی عورت بھی بلا خوف خطر زر و جواہر ساتھ لے کر تنہا سفر کر سکتی ہے مسافروں کو سب سے زیادہ آرام ان اشرفیوں اور دونوں

سے پہنچا تھا جو دور دیہ سڑکوں کے کنارے لگے ہوئے ہوتے تھے۔ یہ صرف تمازت آفتاب سے
بچانے کے لیئے ہی نہ تھے بلکہ مسافر اکثر ان کے پھلوں سے بھی فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ آم۔ جامن
اور کھرنی کے درخت سڑک کے دونوں جانب لگائے جاتے تھے اور مسافر بغیر کسی قسم کی
مزاحمت کے مفت انھیں توڑ توڑ کر اپنی اشتہا دور کرتے تھے۔ یہ تحقیق نہ ہو سکا کہ یہ سڑکیں پختہ
تھیں یا خام غالباً خام ہی ہونگی۔

پولیس | مسلمانوں کے عہد میں ہندوستان میں بڑے بڑے پولیس کے محکمے نہ تھے تاہم مشہور
مقامات اور سراؤں میں کوتوال اور شحنے سپاہیوں کے دستوں کے ساتھ موجود رہتے تھے
شیرشاہ نے چوری ڈاکہ قتل یا اور جرائم کے انسداد کے لیے مقامی ذمہ داری کے اُصول سے
کام لیا تھا اگر کوئی ایسا واقعہ پیش آتا تو "مقدم" اس کی تفتیش کے ذمہ دار سمجھے جاتے تھے اور
اگر وہ تفتیش میں ناکام رہتے تو انھیں تاوان ادا کرنا پڑتا تھا اور شق دار تو برخاست ہی کر دیئے
جاتے تھے۔ اس طرح عمال سرکاری اور غیر سرکاری دونوں جرائم کی تفتیش اور انسداد کی کوشش
میں رہتے تھے۔ سارے مورخ اس طریقہ عمل کی تعریف میں یکزباں ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ
طریقہ بہت زیادہ قابل اطمینان تھا۔ معمولی پولیس کے علاوہ محتسب بھی ہوا کرتے تھے جو عوام
کے اخلاقی محافظ ہوتے اور شراب خواری یا دوسرے اخلاقی جرائم کے انسداد کی فکر میں کرتے
اور دیکھتے تھے کہ مذہبی احکام کی کہاں تک پابندی ہوتی ہے۔

فوج | افغانی سلطنت کی دوبارہ تنظیم اور غیر ملکی حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیئے ایک بڑی اور
مرتب فوج کی ضرورت ہوئی چنانچہ مقامی ضرورتوں کے لحاظ سے فوج کے دستے سارے
ملک میں پھیلا دیئے گئے۔ ملتان۔ رہتاس (غربی) سرہند۔ دیپال پور۔ دہلی۔ ہٹکانٹ
بیانا۔ گوالیار۔ چنار۔ رہتاس (شرقی) پٹنہ۔ ناگور۔ رنتھنبور۔ چتوڑ۔ رائسین۔
اور مانڈو میں فوجی چھاؤنیاں قائم کی گئیں۔ سب سے زیادہ فوج دہلی اور رہتاس
(غربی) میں رہتی تھی شیرشاہ ڈیڑھ لاکھ سوار اور پچاس ہزار پیادے اپنے ہمراہ رکھتا تھا

فوج کے چار حصے تھے۔ فیل۔ سوار۔ پیدل اور توپخانہ سوار ہی فوج کی ساری طاقت تھے۔ توپخانہ اس وقت تک بہت اچھی حالت میں نہ تھا۔ ہندوستان میں ہمیشہ جنگی ہاتھیوں سے کام لیا گیا اور ایک ہاتھی پانچ سو آدمیوں کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ شیر شاہ کا ہاتھیوں کا دستہ اکبر کے دستے سے چھوٹا نہ تھا۔ اس میں کم و بیش پانچ ہزار ہاتھی ہوتے تھے۔

فوج کی تنظیم عموماً قبیلہ وار ہوتی تھی۔ قبیلہ کا سردار اس کا فوجی قائد بھی ہوتا تھا اور اس کی طاقت یا فضیلت کا انحصار اس کے پیروؤں کی تعداد پر تھا۔ قبیلہ سور کی عظمت سب سے زیادہ تھی اگرچہ وہ سب سے بڑا قبیلہ نہ تھا۔ دوسرے نمبر پر نیازی تھے جن کا سردار ہیبت خاں اعظم ہمایوں تھا۔ اس کی کمان میں تیس ہزار سوار تھے ان کے بعد شروانی اور جلوانی قبائل کو اہمیت دی جاتی تھی جن کے سردار علی الترتیب عیسیٰ خاں اور جلال خاں تھے۔ ان کے علاوہ ہر سرکار میں ایک فوجدار ہوتا تھا جو اپنی عملداری میں فوج کے انتظام کے لیے مقرر ہوتا تھا اور بوقت ضرورت حکومت کو بغاوت فرو کرنے میں مدد بھی دیتا تھا۔

شیر شاہ خوب سمجھتا تھا کہ فوج کو خوش اور منتظم رکھنے میں کیا فائدے ہیں۔ افغان سپاہیوں کی جو کثیر تعداد میں اس کی فوج میں برابر داخل ہوتے رہتے۔ بہت خاطر مدارات کی جاتی تھی۔ غریب سپاہیوں کو اسلحہ اور گھوڑا بھی دیا جاتا تھا لیکن عام طور پر یہ امید کی جاتی تھی کہ سپاہی خود اپنا انتظام کر لیں گے۔ سپاہی جب چاہتے شیر شاہ تک پہونچ سکتے تھے۔ وہ ان سے بہت شوق سے ملتا اور ان کی عرضداشتیں سنتا۔ اکثر جب سپاہیوں کو تنخواہ تقسیم کی جاتی تو وہ بنفس نفیس موجود ہوتا اور اگر انھیں کوئی شکایت ہوتی تو اُسے دور کرتا۔ باوجود ان باتوں کے وہ ڈسپلن قائم رکھنے میں بہت سخت تھا اور قواعد کی خلاف ورزی پر سخت سزائیں دیتا بعض اوقات تو پھانسی کا حکم دینے سے بھی نہ چوکتا۔ جب فوج گاؤں سے ہو کر گزرتی تو سپاہیوں کو سخت تاکید کر دی جاتی تھی کہ رعایا کی جائداد کو ہاتھ نہ لگائیں اگر کاشتکاروں کا کچھ نقصان ہو جاتا تو انھیں کافی معاوضہ دیا جاتا تھا۔ کارگر توپوں کے استعمال سے قبل جنگ

میں قلعوں کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ ہر جنگی مرکز پر ایک قلعہ موجود تھا اور اگر کہیں نہ تھا تو وہاں شیر شاہ نے خود تعمیر کرا لیا۔ سب سے زیادہ اہم قلعے جو اس نے بنوائے پٹنہ اور رہتاس (مغربی) کے تھے۔

شیر شاہ ایک لائق مدبر تھا۔ لوگوں کے دلوں میں اس کا خوف تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کی عزت بھی کرتے تھے۔ شورش پسند افغان، قنوج اور روہیلکھنڈ کے رہنے والے، وسط اور مغربی پنجاب کے باشندے، جو اپنے تلون طبع کے لیے بہت کچھ مشہور تھے۔ مجبور کیے گئے کہ امن پسند شہریوں کی طرح زندگی بسر کریں۔ سڑکوں کی حفاظت تاجروں اور مسافروں کے ساتھ اچھا برتاؤ تجارت کی ترقی کا باعث ہوئے۔ تاجروں کو صرف دو محصول ادا کرنے پڑتے تھے ایک تو سلطنت میں داخل ہوتے وقت اور دوسرا بیچنے کی جگہ پر۔ حکومت کے اہلکاروں کو سخت تاکید تھی کہ وہ مقررہ نرخ سے کم قیمت پر کوئی چیز نہ لیں۔ اگر کوئی تاجر مر جاتا تو اس کے مال اسباب کی حکومت کی طرف سے نگرانی ہوتی تھی اور جب کوئی جائز وارث مل جاتا تو اس کے حوالہ کر دیا جاتا تھا۔ عام خریداروں کے مفاد کی بھی کافی نگہداشت کی جاتی تھی۔ دکانداروں اور تاجروں کو ہدایت تھی کہ اوزان برابر رکھیں، ایک قسم کی چیز کی ایک ہی قیمت لیں اور اس جدول کے مطابق فروخت کریں جو حکومت کی طرف سے وقتاً فوقتاً شائع ہوتا رہتا تھا۔ بازار کے شحنوں کا یہ فرض تھا کہ وہ ان قانونوں پر عمل کرائیں۔

شیر شاہ صرف حکم صادر کرنے پر ہی اکتفا نہ کرتا تھا بلکہ اس کے نفاذ کے متعلق پوری معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اُسے جاسوسوں اور ڈاک چوکیوں سے بہت مدد ملتی تھی۔ وہ خفیہ طور پر خود بھی لوگوں سے اہلکاروں اور زمینداروں کے متعلق دریافت کیا کرتا تھا اور دوسرے معاملات کی بھی خبر لیا کرتا تھا اس سے ہر شخص مل سکتا تھا وہ سب کی شکایتوں کو نہایت اطمینان سے سنتا اور انھیں دور کرنے کی کوشش کرتا۔

شیر شاہ خود تو سُنّی مسلمان تھا لیکن دوسرے مذہب اور عقیدہ والوں سے خواہ مخواہ

تعرض نہ کرتا۔ یہ صحیح ہے کہ کسی شخص کو اس کی اجازت نہ تھی کہ اسلام کے خلاف تبلیغ کرے لیکن ہر شخص اپنے مذہب کی پوری پابندی کرسکتا تھا اور کوئی مانع نہ ہوتا۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہندوؤں کو ان کے مدارس کے لیے اوقاف بھی عطا ہوتے تھے اور اس کا انتظام بالکل ان کے ہی ہاتھوں میں چھوڑ دیا جاتا تھا تاکہ وہ اپنے مفاد کے مطابق جو چاہیں کریں۔

وہ خود چست و چالاک اور جفاکش تھا اور اس نے حکومت میں زندگی کی ایسی روح پھونک دی کہ سارا ملک امن اور چین سے بسر کرنے لگا۔ اس کی تعریف میں مورخ بھی رطب اللسان ہیں جو اسی زمانہ میں رہتے تھے جبکہ افغانوں سے اظہار ہمدردی جرم سمجھا جاتا تھا۔ اگر وہ کچھ دن اور زندہ رہتا تو تاریخ کے صفحات پر اس کا نام اکبر سے زیادہ روشن نظر آتا تاہم اس قلیل عرصہ میں اس نے وہ کارہائے نمایاں کیے کہ لوگوں کے دلوں میں ایک مدت تک اسکی یاد تازہ رہی۔

(ترجمہ)

عبدالعلیم احراری

ترکی کا مستقبل

مشیر حسین صاحب قدوائی

میرا ایک پرانا شعر ہے

اوراقِ روزگار پہ ہم نے لکھا ہے نام — اب آسماں سے بھی وہ مٹایا نہ جائیگا

ہم سے یہاں مراد مسلماں ہیں۔ ترکوں کو اللہ سلامت رکھے۔ انھوں نے اس شعر کو محض
تخیل کی حد سے نکال کر واقعیت کا جامہ پہنا دیا۔ کیا کیا کوششیں گردش روزگار نے ترکوں کے
جو مدت دراز سے اسلام کے علمبردار ہیں مٹا دینے کی نہ کیں۔ مگر اللہ رے ہمت۔ اللہ رے اسلامی جوش
وہ متفقہ اور متحدہ قوتیں جنھوں نے سلطنت آسٹریا و سلطنت جرمنی کی سی قدیم مضبوط اور دولتمند
سلطنتوں کو اپنے احکام نادر شاہی کا مطیع بنا کر چھوڑا ترکوں کے آگے تو لوزان میں صلح کے وہ شرائط
ماننے پر مجبور ہوئیں جو ترکوں نے خود سے پسند کیے۔ اور جن کو وہ اپنی شکست کھانے پر ایک
قومی عہد میں اپنے لیے خود تجویز کر چکے تھے۔ جرمنی غریب کو شاق ہے کہ کسی طرح تاوان کا دباؤ
کم ہو۔ صلح نامہ ورسائی میں کچھ بھی رعایت ہو مگر اور سختی بڑھتی جاتی ہے۔ دشمن بچے ہوئے حصہ ملک پر
بھی قبضہ بڑھا رہے ہیں لیکن الحمدللہ کہ ترکوں نے عہد نامہ سیورے کی کبھی تصدیق نہ کی اور اب
چینی ہی کی طرح اس کو پاش پاش کر کے چھوڑا۔

ترکی کا مستقبل ۱۹۱۸ء میں کس قدر تاریک ہو گیا تھا اُس کا ذکر بھی دل کو ناگوار ہوتا
ہے۔ کون مسلمان ایسا ہوگا جو اُس وقت سراسیمہ نہ ہو گیا ہو۔ لیکن مقدر نے اُس سے بھی زیادہ
تاریک مستقبل قریب لکھا تھا۔ تین سال تک روز بروز حالت بدتر ہوتی جاتی ہے

۱۹۱۹ء میں جب کہ فاتح طاقتوں کے نمایندے بلگیریا۔ آسٹریا ہنگری۔ اور جرمنی
کی زبردست سلطنتوں کو اپنی مرضی کے موافق حکم سنا چکے۔ تو وہ غریب بے سر و سامان
ترکوں کی طرف بھی مخاطب ہوئے۔ ترکوں کی اُس وقت حالت عجیب تھی۔ اُن کے

دارالسلطنت اور مسلمان عالم کے دارالخلافت میں سب بردست طاقتوں کے جنگی جہاز لنگرانداز تھے۔ سلطان کے محل کے گرد غیر سیاہ کا پہرا تھا۔ خود جامع صوفیہ کو غیر سپاہ گھیرے ہوئی تھی کہ یونانی اُس کو پھر گرجا نہ بنادیں۔ یا ترک حالت یاس میں کسے ڈائنامائٹ ( ) سے اڑا دینا گرجا بننے سے بہتر نہ سمجھ بیٹھیں۔ ترکوں کی تمام فوجی قوت اُس وقت ٹوٹ چکی تھی سامان حرب و ضرب سب غنیم کے قبضہ میں آگیا تھا۔ دوران جنگ میں ترکوں نے قسطنطنیہ کو اس قدر محفوظ سمجھا تھا کہ سب کارخانہ بندوق و توپ کارتوس وغیرہ کے بنانے کے اُنہوں نے وہیں رکھے تھے۔ قسطنطنیہ جب قبضہ دشمناں میں آیا تو سب کارخانہ بھی انہی کے قبضہ میں آگئے۔ جو لڑائی کا متفرق سامان اسمرنا یا اناطولیہ وغیرہ میں بچ رہا تھا وہ بھی ترکوں کے یا تو ہاتھوں سے نکل گیا۔ یا بیکار کر دیا گیا۔ ترکوں کی فوجی تنظیم میں درہم برہم ہو گئی۔ اور ان کے بڑے بڑے فوجی ماہر و سپہ سالار یا تو جلاوطن ہو گئے۔ یا دشمنوں کے ہاتھوں قید۔ اُدھر ترکوں کی یہ حالت زار تھی۔ اِدھر فاتحین کی رعونت کی انتہا نہیں تھی۔ اور اُن کا جذبۂ انتقام (انگلستان نے سب سے زبردست بری اور بحری شکستیں ترکوں ہی کے ہاتھوں سے کھائی تھیں) پورے جوش پر تھا۔ وہ سمجھے تھے کہ ترکی اُس وقت اُن کے قدموں کے نیچے ہے۔ جو وہ حکم دینگے اُسے قبول کرنے پر مجبور ہوگا۔ چنانچہ ترکی کے متعلق جو یکطرفہ کمیشن یونان کے کہنے سے مقرر کیا گیا تھا اُس نے یہ فیصلہ قطعی سنادیا کہ ٹرکش امپائر مسٹ سیز ٹو اکزسٹ ( ) رئیوٹر ( ) نے یہ نادری حکم تمام دنیا کو پہونچا دیا۔ یہ سُن کر غریب ترکوں نے پیرس ( ) ایک کمیشن بھیجا۔ کہ وہ اس نادری حکم کے ہرگز مستحق نہیں ہیں۔ لیکن اس کو بھی ۲۷ جون ۱۹۱۹ء کو کاؤنس آف ٹن ( ) نے یہ رعونت مآب جواب دیا کہ ترکی قوم سے زیادہ ظالم اور سفاک کوئی قوم دنیا کے پردے پر نہیں رہی ہے۔ ترکوں میں حکومت کرنے کی مطلق قابلیت ہی نہیں۔ اس لئے وہ بلا فوج و قوت مدافعت اناطولیہ کے ایک مختصر سے رقبہ میں جو زیادہ تر بنجر ہے محدود

رہنے جائینگے ان کے چاروں طرف اُن کے پشتینی اور جانی دشمن صاحب حکومت اختیار ہونگے
جن کے پاس فوج بھی ہوگی۔ اور سب سامان حملہ آوری و جنگ۔ اور اُن دشمنوں کی پشت پناہی
یورپ کی متفقہ قوت رہے گی۔ یہ مایوسی بخش جواب سن کر ترکوں کا کمیشن واپس گیا۔ اور
دشمنوں نے اُسی مقصد کو زیر نظر رکھ کر ایک صلحنامہ (بلکہ عتاب نامہ) مرتب کیا جس کو کوئی حیادار
اُس پر دستخط کرنے پر راضی نہ ہوتا تھا حتی کہ فرید پاشا بھی پیرس (Paris.) سے بلا دستخط
کئے واپس گئے تھے۔ لیکن سلطان معزول وحید الدین نے ایک خبطی شخص (جو فیلسوف
مشہور بھی تھے) کو بھیجا۔ اور دشمنوں کے مرتب کردہ صلحنامہ پر پیرس کے ایک مشہور چینی
برتن بنانے کے کارخانہ میں دستخط ہوگئے۔ وہ فیلسوف صاحب قسطنطنیہ واپس جانے کی
بھی جرأت نہ کر سکے۔ بلکہ انگلستان تشریف لائے۔ میں نے پیرس کے اسٹیشن پر دور سے
اُن کی صورت دیکھی تھی۔ اس صلحنامہ سیورے (Sevres) رو سے سلطنت عثمانی عملاً فنا کردی
گئی تھی۔ اور اگر اُس کی ہستی اگر کچھ باقی رہتی بھی تو اُس سے بدتر اور کمزور تر جو ہندوستان
کی کسی چھوٹی سی ریاست کی ہے۔ ترکوں پر اس سے جو یاس طاری ہوئی اُس کا اظہار مشکل ہے۔
عارضی صلحنامہ کے بعد سے چونکہ ترکوں سے دنیا سے بالکل قطع تعلق ہو گیا تھا۔ غنیم نے سخت ترین
سنسر (Censor) خود قسطنطنیہ میں مقرر کر دیا تھا۔ خود اپنے ڈاکخانہ وغیرہ بھی کھول دیئے
تھے۔ اس طرح ترکوں کو باہر کا اگر کچھ حال معلوم ہوتا تھا تو یہ کہ ہر طرف سے انھیں پر ملامت پڑ رہی
ہے۔ اور ربع مسکون میں کوئی اُن کا ہمدرد نہیں۔ کاؤنسل آف ٹن Council of Ten نے نہایت
ذہانت و دلیری سے یہ تک اپنے جواب میں لکھ دیا تھا کہ "اگر یہ کہا جائے کہ ایک تاریخی اسلامی سلطنت
کے رقبہ کی کمی سے ہر جگہ مسلمانوں کے مقاصد کو نقصان پہونچیگا تو ہم یہ عرض کریں گے کہ یہ
ایک غلط خیال ہے۔ کیونکہ کل دنیا کے سمجھدار مسلمانوں کے لیے قسطنطنیہ کے حکمرانوں کی تاریخ
حال نہ کچھ ذریعہ مسرت ہے نہ قابل افتخار۔" اس کے علاوہ دوران جنگ میں ترک خود دیکھ
چکے تھے کہ باہر کے مسلمان آ آ کر اُن سے جنگ آزما ہوئے۔ معلوم نہیں کن مشکلوں سے

ترکوں پر یہ حال روشن کیا گیا کہ اُن کے باہر کے مسلمان بھائی اُن سے پوری ہمدردی رکھتے
ہیں اُدریں سنئے ترکی مسئلہ پر دوسری کتاب جو ۱۵ اگست ۱۹۱۹ء کو انجمن خدام الکعبہ کی طرف سے
لندن سے مجلس عشرہ کے ۲۸ جون کے جواب میں دی سورڈ اگینسٹ اسلام آر اے ڈفنس آف
اسلامس اسٹینڈرڈ بیررس (The Sword Against Islam or A Defence of Islam's Standard Bearers) کے نام
سے شائع کی اور اپنے ایک ترک دوست کے ذریعہ سے اُسے قسطنطنیہ بھجوایا (میں نے اس کتاب کو ہندوستان
میں شائع نہیں کیا۔ بلکہ دیباچہ میں خود لکھ بھی دیا کہ یہ کتاب صرف یورپ کے لئے ہے جس نے اسلام کے
خلاف تلوار اٹھا رکھی ہے) تو وہاں فوراً ہی اُس کا ترکی زبان میں ترجمہ کرکے پچاس ہزار جلدیں
ایک دم سے تشہیر کردی گئیں۔ (تشہیر کرنے والے کو انگریز اسی جرم میں مالٹا پکڑ لائے تھے) ایک نئی روح
ترکی قوم میں برق کی طرح دوڑ گئی جس سے نیشنلسٹ (   ) حرکت پیدا ہوئی۔ یہ میرے
دوستوں میں سے ایک نہایت قابل اعتبار شخص نے جو اُس زمانہ میں قسطنطنیہ میں موجود تھا پیرس میں
بعد کو اطلاع دی تھی) چونکہ اس سے پتہ چلے گا کہ ایک لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللهِ پر اعتقاد
رکھنے والا مسلمان تاریک سے تاریک حالت میں بھی آفتابِ امید کی کرنوں کو دیکھ سکتا ہے۔ اور
حالت جذب میں دنیا کو اُن کے نمودار ہونے کی اطلاع دے سکتا ہے۔ میں اُس ۱۵ اگست ۱۹۱۹ء
کے لکھے ہوئے رسالے کا (جب ترکی مستقبل تاریک ترین ہو رہا تھا) اختتام ترجمہ کرکے درج
ذیل کرتا ہوں۔

اختتام | کاؤنسل آف ٹن (Council of Ten مجلس عشرہ) نے ترکی کی قسمت کا فیصلہ اُس سے
زیادہ دردناک کرنے کی دھمکی دی ہے جو روم نے کارتھج کا کیا تھا۔

اوراقِ تاریخ عالم پر ایسے بہت سے موقع نقش ہیں جب کہ پر نخوت ہستیاں تختِ جبروت
اقتدار پر متمکن ہو کر اور تعصب ہوس کے جذبے سے اغوا پا کر اپنے سامنے سے شکست خوردہ
اور مصیبت زدہ لوگوں کو دور باش کہہ کر ہٹا دیتے ہیں۔ اُس وقت وہ اپنی رعونت میں نہ تو
اُس غائبانہ دست انصاف کی پرواہ کرتے ہیں جو گرتوں کو تھام لیا کرتا ہے اور نہ اُس صدائے انتقام

کی کڑک کو کان دیتی ہیں جو مغرورین کو ورطۂ تباہی سے متنبہ کرتا ہے۔ جوش غضب میں آکر وہ خود
اپنے سرغناؤں کے وعدوں کو فراموش کرکے مجلس عشرہ نے ایسے احکام جاری کیے ہیں
جن سے قوم عثمانی شدید اذیتیں اُٹھاکر فنا کردی جاویگی۔ مجلس عشرہ کے اراکین۔ بات
بالکل بھول بیٹھے کہ صاحب ہمت اور اولوالعزم ہمت اقوام حیات جاودانی اپنے قبضہ میں رکھتی ہیں شکستہ خاطر
وغم چشیدہ خون افشاں وزخم خوردہ ہونے کے باوجود اور عارضی طور پر مغلوب ہوجانے کے
باوصف وہ مکرر دوسرے رمرد میدان بنتی ہیں اور خم ٹھوک کر کھڑی ہوجاتی ہیں کہ ظلم وستم توڑنے
والوں یا اُن کی اولاد در اولاد سے وہ اپنا جبری ملک مال واپس لیں۔ وہ قوم جو فتح اور
کامیابی کے موقع پر دوراندیشی اور رحم سے کام نہیں لیتی بہت جلد وہ دن بھی دیکھتی ہے کہ خود
اُس کو دوسروں سے ترحم و مکرمت کی التجا کرنی پڑے فنا کا دست درازِ فاتحاں و جوانمردان
گیلی پولی د وقط کے جسموں تک پہونچ سکتا ہے۔ لیکن دشمنوں کی یہ امید رکھنا
عبث ہے کہ اُن کی کل قومی ہستی نیست و نابود کردی جاسکے گی۔
اسلام ترک جوانمردوں پر برابر ناز کرتا رہے گا کیونکہ وہ اُس کے صدیوں تک علم بردار رہے
ہیں اور ہمیشہ اُس کے نشان کو فلک رفعت بنائے رکھا ہے۔ اگر اب حوادثات زمانہ سے مجبور
ہوکر ترک اُس نشان مقدس کو اُسی بلندی پر نہ اُڑا سکیں جس پر اب تک اُنھوں نے اُسے
لاتعداد دشمنوں کے نرغہ میں بھی قائم رکھا تھا تو بھی اُن پر کوئی الزام عائد نہ ہوگا۔ حجاز پاک کے
عرب۔ اندلس کے مور۔ ہندوستان کے مغل علم اسلام کو خود اپنے ہاتھوں سرنگوں کر بیٹھے
اس لیے کہ وہ آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے۔ تعیش میں مبتلا ہوگئے۔ فرائض میں بھی غفلت برتنے لگے۔
سامان جنگ کی فراہمی سے لاپروائی دکھانا شروع کی۔ اوصاف عالی سے معرا ہوجانے اور
ہمت و مردانگی کی کمی کے باعث وہ اُس مبارک علم کو بلند نہ رکھ سکے۔
لیکن ترک اب بھی ایک نہایت شریف الخصال جوانمرد قوم ہیں۔ اگر مسلمانوں میں ایک رتی
برابر بھی اخوت کا جوش اور حق برادری ادا کرنے کی ہمت ہے۔ اور اگر وہ اپنے اعلی منزلت

مذہب کے بیمثال نظم کے سمجھنے کا مادہ اور اُس کی قیمت کرنے کا خیال رکھتے ہیں تو وہ ترکوں سے اُسی طرح پائیدار دائمی محبت کا برتاؤ برقرار رکھیں گے جیسا پیشتر رکھتے تھے۔ بلکہ ترکوں کے حال کی مظلومیت اور مصیبت جو غیروں کے قومی تعصب۔ ہوس حکمرانی و خونیاشی کی ان پر لائی ہوئی ہے ترکوں کے ساتھ مسلمانوں کی ہمدردی میں اور اضافہ کا باعث ہو گی۔

پیرس کی مجلس عشرہ نے ترکوں کی قوم کو موت کا حکم سُنادیا ہے لیکن دنیا کی روز افزوں ساڑھے تین کروڑ مخلوق کی برادری نے ایسا کوئی حکم نہیں سنایا ہے۔ نہ اسلام نے سنایا ہے۔ نہ قادر حقیقی نے سنایا ہے۔

قوم ترک ہرگز ہرگز تباہ نہ ہوگی۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ

اب کہ ۹ راگست ۱۹۲۳ء ہے۔ ترکوں کا مستقبل کس قدر درخشاں ہے۔ میرے سے مجذوب کے نزدیک نہیں جو "ہوا پر محل" بنانے کا عادی ہے۔ اور اب نہ جانے کیا کیا خواب اسلام کے آیندہ عروج کے دیکھ رہا ہے۔ بلکہ ایک نہایت تجربہ کار مدبر کی نظروں میں جو سراسر واقعات متدارہ پر نظر رکھتا ہو۔ اس کا اندازہ اس تار سے ہوسکتا ہے جو ہز ہائینس آغاخاں نے خود لوزان پہونچکر ترکی نمایندوں سے مل کر صلح کے بعد ہی ہندوستان بھیجا اور جو ۳۰ رجولائی کے پایونیر میں تفصیل کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ جس کا ترجمہ یکم اگست کے "ہمدم" میں حسب ذیل تھا۔

"میں یہ پیغام لوزان سے ارسال کر رہا ہوں جہاں تاریخ جدید میں سب سے پہلی بار ایک مسلم سلطنت نے مغرب کی دول عظام کے ساتھ مساوات کے درجہ پر صلحنامہ پر دستخط کئے ہیں۔ اس صلحنامہ سے غازی اعظم مصطفےٰ کمال پاشا اور عصمت پاشا کی اعلیٰ شان اور ثابت قدمانہ قیادت پر درخشاں تریں روشنی پڑتی ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ برطانیہ عظمیٰ فرانس اور دیگر دول مغربیہ ٹرکی اور اسلام کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی خواہشمند ہیں۔ اس اعلیٰ صلحنامہ کے بموجب ۲۰۰ برس بعد ترکی ایک آزاد، خود مختار اور پیوستہ قومی سلطنت بن جاتی ہے۔ اُس کے اقتدار فرمانروائی کو اب ان امتیازی حقوق سے مضرت نہیں پہونچے گی جن سے اجنبی لوگ مستفید ہوتے

تھے۔ اب سرزمین ترکیہ پر غیر ملکی افواج کے قدم نہیں رہیں گے اور اس کی آزادی وخود مختاری جاپان کی طرح سے کامل ہے۔ تاریخی ادارۂ خلافت علیہ آستانہ میں قائم رہے گا۔ ترکوں کو قسطنطنیہ آدرنہ اور تراقیہ واپس مل گئے ہیں۔ اسلام اس نہایت ہی قابل اطمینان فیصلہ کے لیے ترکوں کی عظیم الشان شجاعانہ قربانیوں اور اُن کی بہادرانہ قوت برداشت وتحمل کا ممنون احسان ہے لیکن ساتھ ہی برطانیہ فرانس اور اطالیہ میں اکثر افراد کی خوش اعتقادی اور پر خلوص مصالحت پسندی کا بھی مشکور رہے۔ نیز ہم بہت کچھ ہز ایکسلنسی وائسرائے اور حکومت ہند کی مسلسل حمایت کے بھی احسان مند ہیں۔

اس صلحنامہ کے معنی یہ ہیں کہ گذشتہ تنازعات ومناقشات کا خاتمہ ہو کر وہ فراموش ہو چکے ہیں اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ ترکی دولت علیہ۔ جو اب آزاد وخود مختار ہے۔ یورپ اور امریکہ کے ساتھ مستقل دوستانہ تعلقات بدرجۂ مساویانہ قائم رکھنے کے قابل ہو گئی ہے۔

مسلمانان ہند سے صرف اس قدر میں کہنا چاہتا ہوں کہ مدبرین ترکیہ انگلستان سے دوستی رکھنے کے تہ دل سے متمنی ہیں۔ اور مجھ کو یقین ہے کہ وہ انگلستان کے ساتھ اپنی تجارت کو وسعت دینا بنظر استحسان دیکھیں گے۔ میں اپنے احباب سے یہ بھی التماس کرتا ہوں کہ وہ کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے موجودہ بحال شدہ دوستی اور تعلقات میں بدمزگی واقع ہو جائے۔ بجائے وہ سرگرمیاں دکھانے کے جو اب قیانوسی ہو گئی ہیں اور جن سے ٹرکی کا کوئی فائدہ نہیں۔ مسلمانان ہند کو چاہیے کہ ٹرکی سلطنت کو اپنی خوشحالی بحال کرنے میں مدد دیں مسلمانان ہند کو معلوم ہونا چاہیے کہ صلحنامہ ٹرکی کی تائید ملک معظم کے مشیران سلطنت نے کی ہے۔ اور اپنے ہندی مسلمان بھائیوں کو جو بہترین نصیحت کر سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ اس جدید دولت علیہ کو اُس کی موجودہ حالت درماندگی میں مدد دیں۔ یہ کام عملی تدابیر اختیار کرنے سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

ٹرکی نے سخت خوفناک نقصانات برداشت کیے ہیں۔ اور اب اہل ٹرکی کو براہ راست اعانت کی ضرورت ہے۔ ہم کو چاہیئے کہ ٹرکی کو ہندوستان سے خاص وفود روانہ کریں۔ تاکہ وہاں

جا کر بیماری کا سدباب حفظ صحت کی بحالی صحت عامہ کی درستی - پرورش اطفال کی ہمت افزائی اور عام مجلسی فلاح و بہبود کو نشو و نما دینے کا انتظام کریں۔ ٹرکی کی نجات کی امید تو خود فرزند ٹرکی ہی سے ہے۔ مگر ہم یہ کام اُن کی امداد و اعانت کر کے انجام دے سکتے ہیں۔

میں ٹرکی نمایندہ مقیم لوزان کی معرفت ترکی یتامیٰ کے لیے ایک ہزار پونڈ روانہ کر چکا ہوں میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ اس صلحنامہ کی رو سے قوم عرب کی حالت ناقابل اطمینان رہ گئی ہے مگر میں یقین کرتا ہوں کہ معاملہ یاس انگیز نہیں ہے اگر ہم کوشش اور خوش اعتمادی کے ساتھ کام کریں تو اب بھی اس مسئلہ کا قابل اطمینان حل ہو سکتا ہے۔ برطانیہ عظمیٰ میں عربوں کے دوست بیشمار ہیں۔ میں مسلمانوں کی خدمت میں اس صلحنامہ کی دل سے تعریف کرتا ہوں جس کے ذریعے ٹرکی کو تاریخ میں ایک جدید مقام حاصل ہوتا ہے۔ اور امید ہے کہ وہ اس سے زیادہ کے اہل ثابت ہو گی۔ ہم مسلمانان ہند سیاسی طور پر ٹرکی کی مدد نہیں کر سکتے۔ مگر ہم اُسکی مدد اس طرح سے کر سکتے ہیں کہ یہ کام ہم اپنے ذمہ لے لیں کہ وہاں امن و صلح۔ بہبودی اور خوشحالی و صحت کی بحالی کی کوشش کریں۔ اور اس طرح اس کو تاج اسلام کا درخشاں ترین جوہر بننے میں مدد دیں۔ اس تار کے کچھ حصہ نظر انداز کرنے کے قابل ہیں۔ خصوصاً وہ جس میں دول متحدہ کی دوستی کا تذکرہ ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ ترکوں کی فتح اور اُن کی کامیابی محض قادر مطلق کی آسمان سے اعانت اور زمین پر ترکوں کی اپنی ہمت و جاں نثاری کا نتیجہ ہے۔ ورنہ یورپ نے اور سب سے زیادہ برطانیہ نے کوئی دقیقہ ترکوں کی سلطنت کو۔ اُن کی قوم کو۔ تباہ و برباد کر دینے کا اُٹھا نہیں رکھا تھا۔

اب بیشک امید کی جا سکتی ہے کہ انگلستان فرانس وغیرہ سب ترکوں سے دوستی کے خواہشمند ہوں گے۔ ترکی کی ایک مثل عرصہ ہوا ترکی سفارت انگلستان کے ایک مشیر نے سنائی تھی کہ جو ہاتھ کاٹا نہ جا سکے اُس کو چومنا چاہیے۔ یورپ و امریکہ اسی مثل پر عمل کرتے ہیں۔ خصوصاً انگریز اس لیے تعجب نہیں ہے کہ اب جب ترکی کو فنا کرنے کی ہر کوشش ناکامیاب ہوئی ہے تو اُس سے

دوستی کی خواہش چاہئے۔ خصوصاً اس حالت میں کہ اس سے نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں پر قابو پانے میں آسانی ہوگی بلکہ اس لیے بھی کہ ترکی دوستی سے بالشوک خطرہ بالکل زائل ہوجائیگا میں اپنے بات اپنے ہندوستانی بھائیوں سے پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتا ہوں کہ یہ خیال غلط ہے کہ ترکی فتح بولشوک مدد سے ہوئی۔ یا یہ کہ بولشوک ترکوں سے کسی خاص دوستی پر آمادہ ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ترکی اولوالعزمی کی یہ حد تھی کہ باوجود مغربی سلطنتوں کے ناقابل برداشت دباؤ کے ترکوں نے بولشوک شرائط امداد کو منظور نہ کیا۔ اور اپنی آزادی کو اُن کے ہاتھ میں فروخت کرنے سے انکار کیا۔ یہاں تک کہ اناطولیہ میں جو کچھ ہوا اُسمیں ایک اجنبی کا بھی ہاتھ نہ تھا۔ خود ترکوں نے توپیں درست کیں۔ ریل کے انجن درست کیے۔ اور روپیہ بھی بلا ایک پیسہ کا قرض لینے کے یا کاغذ کا سکہ چلانے کے مہیا کیا اور ایک قہار فوج کو سب سامان سے خود اس طرح مہیا کیا کہ وہ فوج بھی جس کو تمام یورپ نے سامان جنگ رسد وغیرہ سے مضبوط کیا تھا سر پہ پیر رکھ کر بھاگنے پر مجبور ہوئی۔ ترکوں کے دل بولشوک سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہیں۔ اس لیے انگلستان وغیرہ کو ترکوں سے دوستی کرنے میں شاید آئندہ آسانی ہو۔ لیکن یہ ایسی حالت میں ممکن ہوگا جب انگلستان موصل کے مسئلہ میں اور فرانس شام کے معاملہ میں اپنی حرص سے باز آئیں۔ ورنہ میں دس برس کے اندر ہی اندر ان دونوں قوتوں سے یکے بعد دیگرے ترکوں سے تصادم کا اندیشہ رکھتا ہوں۔

ترکوں کے آئندہ کے متعلق شروع سال رواں میں مجھ سے اور آغا خاں صاحب سے جو گفتگو ہوئی تھی اُس نے مجھے خطرہ پیدا ہوا تھا کہ موصوف یا تو اُس حد تک ترکوں کی قوم کے ضمیر سے واقف نہیں جس قدر میں ہوں۔ اور زیادہ چونکہ اور ذی اثر ہندوستانیوں کے سامنے مجھ سے گفتگو کر رہے تھے اس وجہ سے اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ یورپ (   ) یوں ہی ترکی کا دشمن ہے پین اسلازم کے ڈر سے ہو رہا ہے وہ ترکوں کے صرف ایک نیشنل اسٹیٹ رہنے کے ارادے پر زور دیتے تھے۔ کہ ترک اب اُسی طرح ایک پکیٹ (   ) جس کا ترجمہ

جالب صاحب نے ہمدم میں "پیوستہ" کیا ہی) دولت ملیہ National State بنا چاہتے ہیں جس طرح یورپ کی دوسری سلطنتیں مثل اسپین وغیرہ کے ہیں ۔ میں جانتا ہوں کہ بعض تنگ نظر ترکوں کا خود بھی یہی خیال ہی۔ اور اسی غرض سے خلافت کے متعلق وہ پالیسی برتی گئی ہی جو اسلامی نقطۂ نظر سے نہایت پست ۔ خطرناک اور ناروا ہی۔ باوجودیکہ اُس کی تعریف میں بھی ہمارے "علماء" رطب اللسان ہو رہے ہیں جنھوں نے عرصہ سے اپنی یہ عادت ڈال رکھی ہی کہ جو رطب و یابس اُن سرغناؤں کے منہ سے نکلے جن کا اثر عوام پر زیادہ ہی اُس پر جی بجا حضور" کہہ دیں ۔ بلکہ اگر ضرورت ہو تو ایک فتویٰ بھی حاضر کر دیں

ہز ہائینس آغا خاں نے اپنے لوزان سے فرستادہ تار میں بھی بار بار (نیشنل اسٹیٹ) National State کے جملہ کو دھرایا ہی۔ جس سے میں تو مایوس ہی ہو جاتا۔ اگر آخر میں خود آغا خاں سلطنت ترکی کے " تاج اسلام کا درخشاں ترین جوہر" بن جانے کی امید ظاہر کرنے پر مجبور نہ ہوئے ہوتے ۔

ظاہر ہی کہ اگر سلطنت ترکی صرف قوم ترک کی ایک سلطنت بننے کی ہوس رکھتی ہی۔ اور اگر اُس نے ارادہ کر لیا ہی کہ وہ خلیفہ کو اُسی طرح رکھے گی جس طرح مصر کے سلاطین نے ایک وقت رکھا تھا ۔ تو مسلمانان عالم کو اُس سلطنت میں کیسی وہ دلچسپی باقی رہ سکتی ہی۔ جو اُس کے علم بردار اسلام ہونے کا باعث ہی۔ آج تو مسلمانان عالم "چنگیز خانیوں" کو "قریشیوں" پر بھی محض اسلام کی خاطر ترجیح دے رہے ہیں ۔ اور اُن کو آئندہ بھی ایسی بات کی قوی اُمید ہی کہ سلطنت عثمانی صرف قومی محدود سلطنت نہ ہو گی بلکہ واقعی وہ تاج اسلام کا درخشاں ترین جوہر ہو گی ۔ میری امید تو سلطنت ترکی سے یہ ہی کہ وہ تاج ایشیا کا درخشاں ترین جوہر صدف ہو گی ۔ اور وہ ترکوں ہی کی تلوار ہو گی جو ایشیا کے پیر سے غلامی کی زنجیر کاٹ کر پھینک دیگی۔ ہم بھی شاہنشاہی شاہنشاہی پکارنے سے آزاد نہ ہوں گے ۔

لیکن میں اس اندیشہ سے کہ اس وقت " فاش اگر گویم جہاں برہم زنم" فاش گوئی سے پرہیز کرتا ہوں ۔ اور اس موقع پر صرف مستقبل قریب کی بابت تھوڑے سے تذکرے کو کافی سمجھتا ہوں ۔

ظاہر ہے کہ نہیں تو نہ صرف مقابلہ طرابلس جنگ سے پہلے سے بلکہ اس عالمگیر جنگ سے پہلے سے
ترکی سلطنت تو ان کی کامیاب صلح کے بعد بھی نہایت مختصر رہ گئی ہے۔ افریقہ میں جو سیادت مصر
پر برائے نام دولتِ عثمانیہ کی باقی تھی وہ بھی اب باقی نہیں۔ یورپ میں صرف ذرا سی چٹ ہی
باقی ہے۔ ایشیا میں ایک کثیر رقبہ دولتِ عثمانیہ سے بالکل نکل گیا۔ اور شام کا سا زرخیز ملک بھی
ہاتھ سے جاتا رہا جسکو مولانا محمد علی نے اپنے ترجمۂ قرآنِ پاک میں جنت سے تعبیر کیا ہے۔ ترکوں کو اب
بحرِ احمر سے نہ بحرِ ہند سے، نہ خلیج فارس سے کچھ سیاسی تعلق رہ گیا ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ لاہور
کے ایک ہندو اخبار نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اب اسلام کا زوال رُک نہیں سکتا جب سلطنت عثمانیہ
اُس حالت میں قوت نہ پکڑ سکی جبکہ وہ بہت وسیع تھی تو اب جبکہ وہ بالکل مختصر رہ گئی ہے
اُس کا یا اُس کے ذریعہ سے اسلام کا مستقبل کیسے درخشندہ ہو سکتا ہے۔

میں اس قسم کے معترضین کے سامنے تو یہ امر واقعہ پیش کرتا ہوں کہ رقبہ کی کمی سلطنت کے
عروج میں مانع نہیں ہوتی انگلستان ایک ذرا سا جزیرہ دنیا کے ایک گوشہ میں پڑا ہوا تھا زمین
جو تھوڑی سی میسر تھی وہ بھی زرخیز نہ تھی۔ آسمان ہر وقت اشک افشاں ہی رہتا تھا۔ کہرے
اپنا ہاتھ سوجھنا مشکل ہوتا تھا۔ خلقت غبی الطبع تھی۔ مگر آج وہی انگلستان دنیا کے ایک
بڑے حصے پر قابض ہے اور اُس کی سطوت کا سکہ کل عالم پر بیٹھا ہوا ہے۔ مٹھی بھر انگلستان کے
باشندے تیس کروڑ ہندوستانیوں کی گلہ بانی کر رہے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ترکوں کی سلطنت
کے رقبے کے کم ہو جانے سے اُن کی قوت میں کمی نہیں آئی ہے۔ اور انشاء اللہ پھر چند دنوں بعد
جب وہ پھر بڑھنا شروع کریں گے تو اُس مرتبہ اُن کو کوئی بھی روک نہیں سکے گا۔ زیادہ تر جو
حصہ ملک عرب کا ترکی کے قبضے سے نکل گیا ہے وہ ترکوں کی قوت کے بجائے اُن کی کمزوری
کا باعث تھا۔ مثلاً یمن جہاں ۲۰ سال سے ترک نوجوان آ آکر اپنی جانیں نثار کرتے تھے اور
سلطنت کو کچھ بھی فائدہ نصیب نہ ہوتا تھا اور اس جاں نثاری سے ترکوں کی چھوٹی سی قوم روز
بروز کم ہوتی جاتی تھی کیونکہ یمن کی دائمی جنگ میں وہی لوگ زیادہ تر کام آئے تھے جو قوم کی [illegible]

کے بڑھانے کا ذریعہ ہوتے انگریز جاتے۔ جنگ میں مشغول رہنے سے اقتصادی طور پر بھی ترکوں کا نقصان تھا اسلئے کہ ترکوں کے کاروباری قابل یا کھیتی کسانی کے قابل نوجوان جبری فوجی بھرتی کے باعث دور دراز مقامات پر اس وقت بھی بھیجدیئے جاتے تھے جب صلح ہوتی تاکہ قلعوں اور سرحد وغیرہ کی حفاظت کریں۔ اس طرح اُن کا سب کام خراب ہوتا تھا اور غیر مسلم رعایا جو جبری بھرتی سے مستثنیٰ تھی ہر وقت اپنے ذاتی کاروبار میں مستعد رہتی تھی اور اُس سے فائدہ اُٹھاتی تھی۔ عرب زیادہ تر قومی خدمت سے مستثنیٰ تھے۔ اس لیئے اُن سے ترکوں کی فوجیں قوت میں زیادہ فائدہ حاصل نہیں کرسکتی تھیں۔ جو حصہ ملک اب ترکوں سے نکل گیا ہے اُس میں کا بعض جزو ترکوں پر شدید مالی بار کا بھی باعث ہوتا تھا۔ مثلاً حجاز پر ترکی حکومت لاکھوں روپیہ سال خرچ کرڈالتی تھی بجائے اس کے کہ بطور اپنے مقبوضہ کے اس سے کچھ خراج وصول کرتی۔ جیسا عربوں نے گزشتہ جنگ کے عین خطرناک وقت میں ثابت کردیا۔ ترکوں کو دشمنان اسلام سے جنگ کی حالت میں عربوں سے بجائے نفع کے نقصانِ عظیم ہی پہونچنے کا اندیشہ رہتا تھا۔ الغرض یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ترکوں کو عربستان سے نکل جانے سے آیندہ کسی بڑی کمزوری کے محسوس کرنے کی کوئی وجہ ہے۔ گو میں سمجھتا ہوں کہ شام کو وہ پھر دیر یا سویرے ہی فتح کریں گے۔

عربستان کے نکلنے کے بجائے ان کو بحر اسود (   ) کے پاس کا وہ قطعہ زمین حال میں مل گیا ہے جو ان کے لیئے ہر طرح از بس مفید ہے۔ اُس کی آبادی ترکی زبان بولنے والی ترکوں ہی کی ہم نسل ہے۔ اُس کے قبضہ میں آجانے سے جنگی نقطۂ نظر سے سلطنت ترکی اب روس (   ) کے حملے سے زیادہ محفوظ ہوگئی ہے۔ معدنیات بھی اس قطعہ آرضی میں زیادہ ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اب بہت لمبی تورانی زنجیر کی یہ پہلی کڑی ترکوں میں آملی ہے۔ انشاء اللہ رفتہ رفتہ سب اسی طرح آکر مل جائیں گی۔ اور ایشیاء کا وہ کل حصہ ایک ہوجائے گا۔

میں پیدائشی مین اسلامسٹ (   ) ہوں۔ مگر جیسا میں نے اُس وقت

دوران جنگ میں انگریزی اخباروں میں لکھا تھا جب ہر طرف سے ترکوں سے بدظنی دشمنانِ
اسلام پھیلا رہے تھے۔ اور سب سے قوی ذریعہ اس بدظنی کے پھیلانے میں کامیاب ہونے کا نہ صرف
اہل یورپ بلکہ ہمارے کرمفرمایانِ حجاز بھی یہ سمجھتے تھے کہ ترکوں کی پین تورانین
خیال کی تشہیر کی جائے۔ میں پین تورانین جذبہ اور کوشش کو بھی
پین اسلامزم ( ) سمجھتا رہا۔ اس لیے سبب تورانی معاہیں اور کوئی
جذبہ اور کوئی تجویز جو اُن کو بیدار کرے وہ اسلام کی قوت کا باعث ہوگی۔ اصل تو یوں
ہے کہ عین عالمِ یاس میں بھی اسلام کے عروج کے لیے میری نظر اُسی قطعہ کی طرف لگی ہوئی
تھی جس نے نہایت اولوالعزم اور حملہ آور زمانہ گزشتہ میں پیدا کیے تھے۔ اب بھی میں
ترکوں کے زیرِ اثر اُسی سمت سے مدِ اسلام کی توقع رکھتا ہوں اور آیندہ کے لیے سلطنت
ترکی کو قارص آرادہاں وغیرہ کا پھر مل جانا نہایت اچھی فال سمجھتا ہوں۔ بلکہ میری صلاح تو
ترکوں کو یہ ہوگی کہ وہ عراق کے ریگستان کے پھر خود لینے کی کوشش کے بجائے اور ان
حیلہ ور باشندوں پر بھروسہ کرنے کے عوض جنکی اجلاف نے نبی پیغمبر کے عزیز نواسہ تک کو نہایت
بیرحمی سے دھوکا دے کر ذبح کر ڈالا تھا ایران کو اس کے حوالہ کردیں کیونکہ شیعہ گروہ کے
مقدس مقامات اُسی خطہ میں بہت زیادہ ہیں۔ اور خود ایران سے اس کے بدلے ایرانی
آذربائیجان لے لیں کیونکہ ایرانی آذربائیجان میں بھی ترکی زبان زیادہ رائج ہے۔ اور ترکی
نسل آباد ہے۔ الغرض رقبہ کے اعتبار سے اب ترکی حکومت زیادہ مضبوط ہے اور مستقبل منور ہے۔
مالی حیثیت سے بھی ترکی کی آیندہ یا موجودہ حالت بعد صلح لوزان بری نہیں اور پہلے سے
بہت اچھی ہے۔ بلکہ اس سے بھی بہتر ہو جانے کی امید ہے۔ ترکی کا باہر کا قرضہ اب بہت ہی کم رہ
جائے گا۔ گزشتہ عالمگیر جنگ نے علاوہ امریکہ کے اور بڑی سے بڑی دولت مند سلطنتوں
کی بھی مالی نقطۂ نگاہ سے کمر توڑ دی۔ حتیٰ کہ انگلستان بھی باوجود اس کے کہ اُس کے پھندے
میں سونے کی چڑیاں موجود ہیں اب ایک مقروض سلطنت ہو گیا ہے۔ لیکن عجیب اتفاق ہوا ہے

کہ جنگ عظیم نے قرضہ کا کچھ بھی بار اگر نہیں ڈالا تو اُس قوت پر جو سب سے زیادہ قلابچ تھی ترکوں نے دوران جنگ میں جس قدر قرضہ لیا تھا وہ دولتہائے متوسطہ سے اور وہ خود ترکی بعد جرمنی وغیرہ کے دشمنوں نے کالعدم کرا دیا۔ یعنی ترک لزام سے بھی بری ہو گئے۔ بعد عارضی صلح کے ترکوں نے جو جنگ چار سال تک جاری رکھی وہ محض اپنی قوت پر اور انھوں نے ایک پیسہ بھی کہیں سے قرض نہیں لیا نہ کاغذ کا سکہ ہی بنایا۔

قبل جنگ عظیم کے ترکوں پر باہر کا بہت قرضہ تھا اس میں جس قدر روس کا تھا وہ زار کی حکومت کے فنا ہونے کے بعد جس طرح ایران میں فنا ہو گیا اسی طرح ترکی میں۔ اب رہے دوسرے قرضے سو ان کی بابت لوزان میں یہ طے ہو گیا ہے کہ جنگ طرابلس و بلقان سے اس وقت تک جو ملک ترکی سلطنت سے الگ ہوئے ہیں ان کا قرضہ حصہ کے حساب سے علیحدہ شدہ ممالک پر ڈالا جائے گا۔ ترکی کے ذمہ سے وہ اتر جائے گا۔ اس طرح ایک کثیر رقم کے قرضہ سے ترک سبکدوش ہو گئے۔ اور تازہ رقبہ جو ان کو واپس ملا ہے وہ قرضہ سے پاک صاف ہے۔

لیکن سب سے دل خوش کن بات جو آیندہ کے عروج کی اور ترکی سلطنت کی بہتری کی سب سے زیادہ ضامن ہے وہ وہی ہے جس کی طرف آغا خاں صاحب نے توجہ دلائی ہے یعنی یہ کہ دو سو برس کے بعد ترکی حکومت کو واقعی خود مختاری نصیب ہوئی ہے اور آج ترکی اسی طرح آزاد ہے جس طرح جاپان یا خود انگلستان۔

کیپی چولیشن د   ) (مراعات) جو اول اول ترکی سلطان نے اپنی اسلامی رواداری کے باعث خود اپنے سر منڈھے تھے اب ترکی کی گردن کے لیے ایسا بھاری پتھر بن گئے تھے جو اس کو پانی کے اندر روز بروز زیادہ گہرائی میں لے جا رہا تھا۔ ان رعایات مخصوص کے باعث ترکی حکومت عرصہ دراز سے اپنی اصلی خود مختاری اور آزادی کھو بیٹھی تھی جبکہ نواب صاحب رام پور بھی اپنی ریاست میں ہر طرح کا ظلم و ستم برطانوی رعایا پر توڑ سکتے ہیں سلطنت عثمانی جو ہر سہ براعظم پر پھیلی ہوئی تھی اس بات پر مجبور تھی کہ وہ ہر اجنبی خطاکار

کو فوراً امن کی حالت سے جو سلطنت عثمانی کے اندر اجنبی دول نے قائم کرائی تھی پیش کرے۔
جبکہ نظام حیدر آباد کو اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے یہاں چنگی کا جو محصول چاہیں لیں دولت عثمانی کے لیے ایک حد مقرر تھی جس سے زیادہ وصول کرنے کا اُسے مطلق حق نہ تھا۔ دولت عثمانی کی نوبت یہ پہونچی تھی کہ جو آمدنی اُس نے اپنے کسی قرضہ میں کسی کمپنی کے پاس مکفول کی تھی اُسے وصول کرنے کے لیے وہ کمپنی خود اپنے عہدہ دار مقرر کر سکتی تھی جس طرح کوئی چھوٹے سے زمیندار کی اُس جائداد کا حال ہو جس پر قبضہ مرتہنانہ ہو گیا

ترکی سلطنت کے اجنبی باشندے ٹیکسوں سے بھی مستثنیٰ تھے۔ القصہ قبل منحوس غیر مصدقہ عہدنامہ سیورے کے بھی حکومت ٹرکی ہرگز کلی طور پر خود مختار نہ تھی۔ اصلی خود مختاری اسے اب ہی حاصل ہوئی ہے۔ اور قوی امید ہے کہ اسی طرح آزاد شدہ سلطنت ترکی جاپان سے بھی زیادہ قوت دار آیندہ ثابت ہو گی۔ اور دول عظمیٰ میں نمایاں رتبہ حاصل کرے گی۔

خداوند کریم کی عجب کارسازی ہے کہ جبکہ جرمن۔ اسٹریا ہنگری۔ بلگیریا سب پر شکست کے بعد سے فوجی قیود عائد کر دیئے گئے ہیں اور بحری قوت سب کی فنا کر دی گئی ہے ترکوں نے اپنے کو ان قیود سے بھی آزاد کر لیا ہے۔ ابھی میرے پاس پورا معاہدہ لوزان نہیں پہنچا، مگر چونکہ میں ترکوں کے رگ و ریشہ سے واقف ہوں مجھے یقین کامل ہے کہ انھوں نے جنگی جبری خدمت کے حق کو کسی طرح نہ دیا ہو گا۔ جو جرمنی وغیرہ سب سے لے لیا گیا ہے۔ اور یہ تو مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ ان کا جنگی جہاز گیوبن (جو جرمنی سے بھاگ کر آ گیا تھا) جس کو میں نے بعد جنگ مارسیلیز کے سمندر میں معمولی جہازوں کے ساتھ کھڑا دیکھ کر آہ سرد کھینچی تھی اُن کو واپس مل جائے گا۔ یونان نے بھی اُن کے سب گرفتار کردہ جہاز واپس دیئے۔ گو ترکوں کو اب بحری تیاری میں بہت نہ صرف کرنا پڑے گا اس لیے کہ ساحلی رقبہ سلطنت بہت گھٹ گیا ہے پھر بھی اگر ان کو ایک طاقت اور اثردار دولت بننا ہے تو بحری اور ہوائی سامان کی بھی خبر رکھنی ہی پڑے گی۔ اس لیئے آیندہ کے لیے ہمارے سب کے لیے یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ جبکہ جرمنی کا بیڑہ جہازات سمندر کی

تہ میں پڑا سڑ رہا ہے تو ترکوں کے دو چار جو جہاز تھے وہ ان کو واپس مل جاویں گے۔ سلطنت ترکی جنگ کے بارے بھی قریب قریب بالکل بچ گئی ہے۔ انگریزوں نے جو دو جہاز واپس نہیں کیے ان کی جگہ ترکوں کو چاہیے کہ جہاز خود اپنے یہاں بنالیں۔

سلطنت ترکی آیندہ اجنبی طلبگاران رعایات کی شکار نہ ہوگی۔ بلکہ اپنی اقتصادی ترقی اپنی حسب مرضی کرے گی۔ ترکوں نے یہ دوراندیشی کی ہے کہ اقتصادی ترقی میں مدد امریکہ سے حاصل کی ہے۔ بجائے حالت ماسبق کے کہ یورپ کی دول کے سپرد سب کچھ ہو جاتا تھا۔

معاہدہ چیسٹر ( ) بھی تاریخ عثمانی میں ایک نیا باب ہے۔ اور مستقبل کے لیے امیدافزا۔ لیکن میں ترکوں کو آگاہ کرتا ہوں کہ وہ "سگ زرد برادر شغال" کی مثل کو نہ بھولیں اور جلد سے جلد جاپان کی طرح خود اپنے ہات سے اپنی اقتصادی ترقی کی طرف متوجہ ہوں۔

خدا کا شکر ہے کہ اب اس میں ان کو آسانی حاصل ہوگئی ہے۔ اور کم سے کم چار پانچ سال تک تو اُنھوں نے سب اپنا کام خود ہی کیا ہے۔ بات یہ ہوئی کہ دوران جنگ میں چونکہ جرمنی ترکوں کا حلیف تھا اس لیے اُس نے اِس کی بہت کوشش کی کہ ترک صنعت وحرفت نیز فلاحت و زراعت میں ہوشیار ہوجائیں تاکہ اُس کو مدد دے سکیں اور خود بھی اپنے پیروں پر کھڑے ہوسکیں۔ تاکہ جرمنی کو ان کی زیادہ مدد نہ کرنی پڑے۔ اس غرض سے جرمنی نے معلم اور کتابیں وغیرہ ترکی کے ممالک میں پھیلا دیے تھے۔

عارضی صلح کے ہوتے ہی جرمن کا خود تو ایک متنفس بھی سرزمین عثمانی پر باقی نہ رہنے پایا لیکن تعلیم رائیگاں نہیں ہوئی۔ اور خود ترکی زبان میں بھی اک ذخیرہ جمع ہوگیا۔ پھر بھی ترکوں کو جاپانیوں کی حالت پر پہنچنے کے لیے جلد سے جلد ہزارہا نوجوان یورپ اور امریکہ حصول علم کے لیے بھیجنا چاہیے۔ تاکہ وہ واپس آکر دوسروں کو تعلیم دیں۔ اور خود بھی کمپنیاں وغیرہ قائم کریں۔ تعلیم صنعت وحرفت کی ایک ایسی مکمل جامعہ ( ) فوراً کھلنی چاہیے جہاں ہندوستان سے بھی طالب علم حصول علم کے لیے پہنچیں۔ جبکہ ترکوں کی آیندہ زندگی اُن کی ترقی

بحری و ہوائی قوت پر منحصر ہے اور لازمی ہے کہ وہ مضبوط اور آلات حرب حال سے مسلح فوج زبردست بیڑہ جہازات ہوائی و دریائی۔ نیز آبدوز کشتیاں موجود رکھیں۔ آیندہ کی ان کی بہبودی کا انحصار اس پر بھی ہے کہ وہ ہر قسم کی اقتصادی ترقی سے مطلق غافل نہ ہوں۔ اور سب سامان حرب و ضرب خود اپنے ہی ملک میں تیار کریں۔ وہ یہ یاد رکھیں کہ آیندہ جنگ کے لیے بھی لازمی ہے کہ وہ طبیعات وغیرہ میں ترقی کریں۔ ورنہ اُن کی بے عدیل بہادری و شجاعت بھی زیادہ کام نہ آئے گی۔ آیندہ جنگ میں علم کیمیات کام آئے گا اور کیمسٹری مسلمانوں کا اپنا ایجاد کردہ علم ہے۔ "اطلب العلم بالصین" ترکوں کا آیندہ موٹو ہو جرمنی ان کا بہترین معلم بنے گا۔ یہ سلطنت عثمانی کس طرح تاج اسلام کا درخشندہ ترین جوہر بن سکے گی اور قومیت کے محدود دائرہ سے نکل کر وہ کس طرح پھر ایک عالمگیر زبردست سلطنت بنے گی اور اس کے لیے مسلمانان عالم کو کیا کیا کوشش کرنی پڑیگی یعنی ترکی کے مستقبل کا پین اسلامک پہلو کیا کیا بنے ابھی ایک پین اسلامک دماغ ہی کے پردوں میں اُس کا خاکہ محفوظ رہنا مناسب ہے۔ لیکن ہندوستان کی موجودہ حالت پر نگاہ رکھ کر مجھے نہ صرف داس ہندو بلکہ مالوی شردھانند کے بھی یہ گوش گزار کر دینا ضروری ہے کہ ترکی کا مستقبل اور ہندوستان کا مستقبل ایک ہی زنجیر سے وابستہ ہے گو اس وقت درمیان میں بہت سی کڑیاں ہیں۔ بلکہ عرب کا ترکی سے علحدہ ہو جانے سے کچھ فاصلہ اور زیادہ ہو گیا ہے۔ مگر چونکہ ایشیا کا آیندہ اب ترکی سے اور زیادہ وابستہ ہو گیا ہے اس لیے ہندوستان کی حالت کا انحصار ترکی کی آیندہ حالت پر زیادہ ہے۔ یاد رہے کہ اب زمانہ آیندہ میں کل ایشیائے قریب کی رہنمائی ترکوں ہی کے ہاتھ میں ہوگی۔ جو ہندو ہندوستان کی آزادی کے لیے جاپان کی طرف آنکھ اُٹھاتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔

میرے سینہ میں پین اسلامک جوش نہیں ہے بلکہ پین ایشیاٹک بھی جب میں پین اسلامک سوسائٹی کو لندن میں چلا رہا تھا تو اسی زمانہ میں میں نے کوشش کی تھی کہ ایک پین ایشیاٹک سوسائٹی قائم کروں۔ چونکہ ایشیا کی سب سے زیادہ طاقت ور سلطنت جاپان کی تھی اسلیے

اس کے سفیر سے رجوع کیا۔ مگر اُس طرف سے مطلق کوئی ہمت افزائی نہ ہوئی۔ اس کے علاوہ اور بیسیوں طرح سے جاپان نے یہ روشن کر دیا کہ اُس نے اپنی قسمت کو مغرب کی دولتوں کی قسمت کے ساتھ آویزاں کر دیا ہے۔ اور اُس کی امکانی کوشش یہ ہے کہ وہ بجائے ایک ایشیائی قوم کے ایک مغربی قوم سمجھی جائے۔ برخلاف اس کے ترکوں نے چار سو برس یورپ پر حکومت کی لیکن اس صلح پر دستخط سے چند ہی روز پیشتر لوزان سے یہ فریاد اُٹھی تھی کہ لاکھ کوشش کی جاتی ہے کہ ترک ایک یورپی قوم نہیں اور گو وہ چار سو سال سے یورپ میں ہیں مگر وہ ہی ایشیائی قوم رہتے ہیں۔ میں نے مولانا ابوالکلام صاحب کے زبردست اخبار "الہلال" میں دس بارہ سال ہوئے یہی خیال ظاہر کیا تھا کہ ایشیا کی بہبود جاپان کے بجائے ترکی سے متعلق ہے۔ اور گنگا پرشاد ورما کے سے زبردست قوم پرست اور اپنے مذہب ہندو کے عاشق نے بھی میرے استدلال کو تسلیم کیا تھا۔ حال میں تو اپنے عمل سے جاپان نے اور بھی ثابت کر دیا کہ ایشیا کے فوائد پر اُس کی مطلق نظر نہیں بلکہ لوگوں کا خیال تو یہ ہے کہ اس جنگ میں اُس نے ایشیا کو ر ، کر کے خود ہی نقصان پہونچایا۔ جغرافیائی لحاظ سے بھی ایشیا کی رہنمائی ترکوں ہی کے ذمہ عائد ہوگی۔ ہندو بھائیوں کو یہ یاد رہے کہ دریائے انڈس سے لیکر دریائے مرتضیٰ تک یہ ایک طویل حصۂ عالم جس میں زیادہ تر ایشیائی ہی ہیں ایک ایک وقت ترکی سیادت میں متحرک ہوگا۔ اور ہندوستان کے لیے دو ہی راستہ ہوں گے یا تو اس عظیم حرکت کا وہ ساتھ دے اور بھائی کی طرح اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھے اور یا اس حرکت کو اسی طرح اپنی طرف کھینچ لے جس طرح پہلے ایک بار ہو چکا ہے۔ اور خود پھر دب کر رہ جائے۔ یاد رہے کہ شدھی اشدھی کی تحریکیں۔ یہ سنگٹھن یہ ہندو اکھاڑے کام آنے والے نہیں۔ اگر ہندوؤں کو غلامی سے نکلنا ہے اگر اپنے ملک کے لیے ان کو سوراج حاصل کرنا ہے تو ہندو مسلمانوں کو مل کر چلنا ہوگا۔ ورنہ ہندوستان کی تاریخ پھر اپنے کو دُہرائے گی اور ہندوستان پھر فاتحین کا جولانگاہ بنے گا۔ مسلمانانِ عالم بے تعلق ہو کر اور ہندوستان کے مسلمانوں سے بگاڑ کر کے ہرگز ہندوستان کی فلاح زمانہ

مستقبل میں ممکن نہیں۔
دنیا کا کوئی ملک اب سب سے الگ ہو کر زندگی نہیں بسر کر سکتا۔ ہندوستانی بھی اب
ہمالیہ کے اندر ہی دنیا کے حدود نہیں تصور کر سکتے۔ اب ایک قوم کو دوسری باہر کی قوموں
سے رابطہ اتحاد قائم کرنا ضرور ہوگا۔ نیشنلزم کی جگہ اسلام کی ذال اوّل قائم کردہ
آگے
نیشنلزم کا دور دورہ ہوگا۔ ہندوستان کے لیے ترک ہی فطرتی دوست ہوں گے۔
وہ مسلمانان ہند کے بھائی ہیں اور یہ برادرانہ سلسلہ اب مسلسل برابر قائم ہو جائے گا۔ جس وقت
تک جو بہت بڑی روک روس کی تھی وہ ٹوٹ گئی اور نہیں ٹوٹی تو جلد ٹوٹ جائے گی۔
اس وقت زار کی حکومت مانع تھی۔ قومی جوش مسلمانان روس میں نہیں پیدا ہونے پایا
تھا مگر اب ایسا نہیں ہے۔ اگر آج بالشوک بخارا اور خیوا کے اس طرف یا روسی آذربائیجان کے
دوسری طرف جانے میں کامیاب بھی ہوئے، ترکمانوں کی آزادی میں حائل بھی ہوئے تو
عنقریب ہی جب اس طرف افغانستان اور دوسری طرف ترکوں کا دباؤ پڑے گا۔
(اور زمانہ مستقبل میں ایران بھی بیچ میں دباؤ ڈالنے کی قابل انشاءاللہ ضرور ہو جائے گا۔
میں سمجھتا ہوں کہ عنقریب ہی ترک سورما اس کی فوجی حالت کو درست کرنے میں معاون ہوں گے)
تو روس کو اپنی ہی خیر منانا مشکل ہوگا۔ الغرض جہاں تک انسان مستقبل کا اندازہ کر سکتا ہے
وہ یہ ہے کہ اب ہندوستان کا ہم سرحد صرف ایک ذرا سا افغانستان نہ ہوگا بلکہ کل اسلامی ایشیا۔
اہل ہند کو چاہیے کہ اپنی اندرونی اور بیرونی سیاست میں اس امر کو فراموش نہ کریں۔
میں پھر کہتا ہوں کہ مستقبل ترکی مستقبل ہندوستان سے وابستہ ہے۔
ہندو مسلمان آٹھ نو سو سال سے بھائی بھائی کی طرح ہندوستان میں آباد ہیں۔ اگر اب
بھی ایک دوسرے کو دشمن سمجھیں تو دونوں پر لعنت۔ اب ہندوستان یہاں کے مسلمانوں
کی اسی طرح ماں ہے جس طرح ہندوؤں کی۔ مسلمان ہرگز غیر بن کر نہیں رہے ہیں۔ انھوں نے
ہندوؤں کے بہت سے رسم و رواج کو بھی قبول کر لیا ہے۔ ہندوستان کی بہتری مسلمانان ہند

کی بہتری ہی۔ ہندوستان کا نقصان، ہندوستان کی غلامی اُن کی غلامی ہی۔ جب تک
ہندو بھی آزاد نہ ہوں، ہندوستان میں فلاح نہ ہوگی، اور مسلمان ہرگز ہرگز آزاد
نہیں ہو سکتے۔ بلکہ اگر ہندوستان دست غیر میں اسی طرح آلہ بنا رہا جیسا اس وقت تک ہی تو
تمام ایشیا (ترک، عرب، ایران اور مصر) خطرہ میں رہیں گے۔ اس وجہ سے مسلمانان ہند
کو بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر وہ ترکی کی یا کسی اسلامی سلطنت کی بہبودی چاہتے ہیں تو ہندوستان
کے ہندوؤں کو اپنے ساتھ رکھیں۔ اور دست غیر میں ان کو آلہ بننے دیں۔ جس طرح ہندوؤں
کو اپنے ملک کی آزادی کا خیال ہو مسلمانوں کو بھی اسی طرح چاہیئے۔ جس طرح ہندوؤں کو
بیرونی حملہ سے ہندوستان کو بچانے کی فکر ہو۔ مسلمانان ہند کو بھی ویسی ہی فکر چاہیئے۔ ایک
مسلمان کو بھی اس کا حق اسلام نے نہیں دیا ہی کہ وہ دوسرے مسلمان کو غلام بنائے جس طرح
افغان و ترک اور عرب اپنے ملکوں کی آزادی میں کوشاں ہیں ہم مسلمان اپنے ملک ہند کی۔
جس طرح قادر مطلق مالک الملک نے اُن کی مدد کی اسی طرح ہماری بھی مدد کرے۔ آمین۔

کشمیر بہشت نظیر

"جو لوگ کیفیات نفسی کے حقیقت شناس ہیں اُن پر یہ امر ہرگز پوشیدہ نہیں کہ اگر ایک انسان سے کسی خاص شئے کے متعلق بیان کرایا جائے تو اس کے طرز بیان کی ترتیب اس کے دماغی رجحانات کے موافق ہوگی۔ وہ سب سے پیشتر اس رجحان کی طرف متوجہ ہوگا جس کے سب سے زیادہ گہرے اثرات اس کے دماغ نے قبول کئے ہیں۔ اگر اس وقت میں شاعرانہ کیفیات سے مدہوش ہو کر اس مضمون کی ابتدا کرتا تو شاید عشق کی کرشمہ سازیاں اور حسن کی جلوہ پاشیاں میرا موضوع بحث ہوتا۔ لیکن نہیں میرا مقصد دوسرا ہے۔ کشمیر کے حسن رنگارنگ سے زیادہ کشمیریوں کی ناگفتنی حالت نے مجھکو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ممکن ہے بدمذاقی کا الزام لگایا جائے کہ کشمیر بہشت نظیر کے تذکرہ میں محققانہ خشک مزاجی سے کام لیا گیا۔ ممکن ہے کوئی منچلا جس کو "فلسفۂ حسن" سے درک ہو کہہ اُٹھے کہ جمالیاتی پہلو بالکل نظرانداز کر دیا گیا۔ اس مضمون کا مقصد یہ ہے کہ صرف واقعات کو پیش کیا جائے اور ان مقامات کا جہاں سے گذرنے کا اتفاق ہوا تذکرہ کر دیا جائے۔"

حدود اربع | کشمیر کے شمال میں مغربی چین، مشرق میں تبت، مغرب میں روسی ترکستان اور افغانستان اور جنوب میں پنجاب ہے۔ اپنے جغرافی موقع کی وجہ سے کشمیر کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے کیونکہ پانچ خودمختار ممالک کے حدود اس کی سرحد سے ملتے ہیں۔ وسط ایشیا اور ہندوستان کی تجارت کا بھی یہی راستہ ہے۔

کشمیر کا رقبہ ۸۰۰۰۰ مربع میل ہے اور آبادی ۱۵ لاکھ ۵۰ ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔

گذشتہ تاریخ | اگرچہ کشمیر کی گذشتہ تاریخ کے متعلق ہمارے پاس صحیح واقعات اور مواد کی کمی ہے تاہم جو کتابوں اور مقامی مروجہ کہانیوں سے مستنبط کیا جا سکتا ہے وہ پیش کیا جائے گا۔

تمام ملکوں کے عہد قدیم کی تاریخ کے لیئے روایات قومی، مقامی مروجہ کہانیوں اور آثار کہن کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ بہرحال یہ کام شاید وہ شخص اچھی طرح کر سکے گا جو وہاں کی زبان، رسم و رواج

اور کشمیری قوم کی خصوصیات نسل سے واقف ہو۔

یہاں کی کہانیوں میں یہ بتلایا جاتا ہے کہ حضرت سلیمان کشمیر تشریف لائے اور لوگوں کو توحید کی تعلیم دی لیکن ہمارے پاس اس کے تاریخی شواہد موجود نہیں۔ کشمیر کی باقاعدہ تاریخ کا پتہ بدھ کے زمانے سے چلتا ہے بدھوں کے زمانے کی پرانی عمارتوں نیز آثار قدیم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر بدھوں کا بہت بڑا مرکز تھا۔ بدھوں کے بعد ہندوؤں (برہمنوں) کی حکومت اسی علاقہ پر ۱۰۱۵ء تک قائم رہی۔

اس زمانہ میں مسلمان تمام اقصائے عالم میں پھیلنا شروع ہو گئے تھے۔ چنانچہ ۱۰۱۵ء میں محمود غزنوی نے علاقہ کشمیر کو اپنی سلطنت سے ملحق کر لیا۔ چونکہ افغانوں نے کوئی باقاعدہ نظام حکومت یہاں قائم نہیں کیا تھا اس لئے تبت کے ہندو راجہ کو ۱۳۰۰ء میں کشمیر فتح کرنے میں کوئی موانع پیش نہیں آئے۔

اسی راجہ کی نسل میں شہزادہ یوفنچ مشرف باسلام ہوا اور اس کا نام صدر الدین رکھا گیا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا وزیر شمس الدین سریر آرائے سلطنت ہوا شمس الدین کے زمانہ میں مقابلۃً کشمیر نے بہت ترقی کی۔

مغلوں کے زمانہ تک کشمیر آزاد حکومت کی حیثیت رکھتا تھا۔ بالآخر اکبر اعظم نے ۱۵۸۶ء میں اس صوبہ کو سلطنت مغلیہ میں شامل کر لیا۔ جنرل قاسم خاں نے جو اکبر کے مشہور و معروف سرداروں میں تھا کشمیر کو فتح کیا لیکن اس کے بعد سے دربار شاہی کے تعلقات اس خطہ سے ایسے وابستہ ہوئے کہ یقیناً مغلوں کی حکومت کے آخر وقت تک قائم رہے۔ اکبر خود کشمیر گیا اور قلعہ ہری پت کی تعمیر اپنے سامنے شروع کرائی جس کو جہانگیر نے اپنے زمانہ میں پایۂ تکمیل کو پہونچایا۔ جہانگیر کو خطۂ کشمیر سے خاص انسیت تھی اس کے بنوائے ہوئے باغات اور عمارتیں اب تک موجود ہیں۔ جہانگیر کی محبت کا اظہار اس کے ان الفاظ سے ہوتا ہے جو اس نے اپنی عمر کے آخری لمحوں میں کہے۔ "مجھ کو ویری ناگ لے چلو" اس کی یہ آخری خواہش تھی جو کارکنان قضا و قدر کے ہاتھوں کبھی نہ پوری ہونے والی تھی۔ چنانچہ وہ پیر پنجال کے دشوار گزار راستوں سے ویری ناگ

روانہ ہو گیا لیکن مقام بنا سکا پر اس نے اپنی آخری آرزو کو لیے ہوئے اس جہان تیرہ کو خیرباد کہا۔ ع۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

کشمیر جہانگیر کے زمانہ حکومت میں اس کی تفریح گاہ تھا۔ اس کی دل لگی کا سامان تھا۔ اس کے بعد شاہجہاں نے بھی اس خطہ کی قدر دانی اپنے والد ماجد سے کسی طرح کم نہیں کی۔ وہ بھی ان طرب انگیز مناظرہ قدرت سے ویسا ہی محظوظ ہوتا تھا جس طرح جہانگیر۔ فطرت کی نیرنگیوں اور بوقلمونیوں کا وہ بھی اپنے والد کی طرح قدر دان تھا۔

سنہ ۱۷۵۲ء میں جب سلطنت مغلیہ کے دست و بازو بالکل شل ہو چکے تھے عبد البرکات نے جو ایک سردار تھا کشمیر کے صوبہ کو خود مختار کر لیا۔ کچھ عرصہ کے لیے پھر دوبارہ پٹھانوں نے کشمیر پر اپنا قبضہ کر لیا لیکن سنہ ۱۸۱۹ء میں رنجیت سنگھ نے پٹھانوں کو شکست دینے کے بعد اس کو سکھ حکومت میں شامل کر لیا۔

انگریزوں نے جب پنجاب فتح کیا تو ۱۸۴۶ء میں انہوں نے یہ صوبہ گلاب سنگھ کو فروخت کر دیا اس کے بعد سے گلاب سنگھ کے خاندان میں کشمیر کی زمام حکومت ہے۔

طرز حکومت | دیگر دیسی ریاستوں کی طرح یہاں بھی حکومت کے جمہوری اصول پر شاذ ہی عمل درآمد ہے۔ یہاں طریقہ استبداد کا نظارہ اپنی اصل آب و تاب کے ساتھ ہوتا ہے۔

چند سال سے دوسری ریاستوں کی طرح یہاں بھی نام نہاد کونسل وزرا قائم کی گئی ہے جس کی غرض و غایت مہاراجہ صاحب کو امور سلطنت میں مشورہ دینا ہے۔ یہ کونسل مختلف شعبہ جات کے وزیروں پر مشتمل ہے۔

کشمیر کی آبادی میں ایک کثیر عنصر مسلمانوں کا ہے لیکن سخت افسوس اور تعجب ہے کہ ریاست کے اعلیٰ حکام سے لے کر ادنیٰ تک مسلمان شاذ ہی نظر پڑتا ہے۔ باوجودیکہ مسلمانوں کی آبادی کی نسبت ۹۵ فی صدی ہے لیکن ان کے حقوق کی کما حقہ نگہداشت نہیں کی جاتی۔

تعلیم | مسلمانوں میں تعلیم کا فقدان اس کی سب سے بڑی وجہ بتلائی جاتی ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ

مسلمان غیر تعلیم یافتہ ہیں لیکن اس کی ذمہ داری بھی ریاست ہی پر آتی ہے۔
کیا ریاست کی طرف سے کوئی خاص انتظام کیا گیا؟ نہیں
کشمیر میں دو کالج ہیں۔ سری پرتاپ کالج سرینگر اور جموں کالج۔
سری پرتاپ کالج (موجودہ والی کشمیر کے نام کے ساتھ موسوم ہے) میں ۲۰۰ کے قریب طالبعلم ہیں اور ساتھ ہی کالجیٹ اسکول میں تقریباً ۵۰۰ طلباء ہیں۔ ان طلباء میں مسلمانوں کا اوسط ۵ فیصدی ہے۔ سرینگر کالج کے ایک پروفیسر صاحب سے مجھ کو یہ سُنکر تعجب ہوا کہ کالج کے مسلمان طلباء میں سے کوئی بھی کشمیری نہیں بلکہ سب پنجابی ہیں۔
مسلمانوں میں فقدان تعلیم کی یہی وجہ ہے کہ کسی قسم کی حوصلہ افزائی ریاست کی طرف سے نہیں کیجاتی۔
سرینگر میں ایک صنعتی کالج (ٹکنیکل انسٹیوٹ) بھی ہے۔ اس کا انتظام ظاہر میں اچھا معلوم ہوتا ہے۔ لوہاری، بڑھئی، معماری اور انجنیری وغیرہ کے علاوہ تصویر کشی کا خاص انتظام کیا گیا ہے۔ اسی کالج کے پرنسپل کی کوٹھی جو خود طلبا رکالج کی تعمیر کردہ ہے نہایت عمدہ عمارت ہے اور اس امر کا بین ثبوت ہے کہ طالبعلموں سے عملی کام یورپ کے صنعتی کالجوں کے طریقہ تعلیم کے موافق لیا جاتا ہے۔
میں نے خاص طور پر مسلمانوں کی حالت اس لیے بیان کی ہے کہ اب تک نہ صرف ان کے حقوق کی کافی نگہداشت کی طرف سے بے اعتنائی برتی گئی ہے بلکہ ان کی آیندہ ترقی اس بات پر منحصر ہے کہ جلد از جلد ان کی طرف قوم توجہ کرے۔

امرتسر میں کشمیریوں کی اصلاح و ترقی کے لیے ایک جماعت عرصہ سے قائم ہے۔ ہر سال کانفرنس بھی منعقد ہوتی ہے اور تجاویز بھی پاس کی جاتی ہیں لیکن عملی کام اب تک مطلقاً کچھ نہیں کیا گیا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب خود وہاں کی صورت حالات دیکھنے کے لیے تشریف لے گئے تھے اور کشمیریوں کی اصلاح کے لیے اُنھوں نے قوم سے اپیل بھی کی تھی۔ لیکن جس طرح ان کی دبی آواز کی اپیل تھی اس سے بھی گری ہوئی آواز میں قوم نے اس کا جواب دیا۔
بہر حال اب اس وقت ضرورت ہے کہ کشمیریوں کی اصلاح و ترقی کی طرف مسلمان بہت جلد توجہ کریں۔

معاشرت و اخلاق

کشمیریوں کے غربت افلاس کی حالت اس وقت اچھی طرح ظاہر ہو جاتی ہے جب ان کے
کسی گاؤں سے گزرنے کا اتفاق ہو۔ گاؤں کے بچے جن کی صورتیں فرشتوں کی سی ہوتی ہیں
چاروں طرف سے ہر مسافر یا سیاح کو گھیر لیتے ہیں۔ ہر طرف سے "بخشش" کی آواز بلند ہوتی ہے
تاآنکہ ہر سخت دل رکھنے والا بھی ان معصوم صورتوں پر رحم کھا کر جو چشم براہ بیٹھے رہتے ہیں کچھ نہ کچھ
دے دیتا ہے۔ ذلت و نکبت کی انتہائی حالت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے؟

اسی افلاس و عسرت کی وجہ سے کشمیریوں سے وہ تمام جذبات عالیہ فنا ہو گئے ہیں جو
دنیا میں کسی قوم کی بقا کے لیے ضروری ہیں۔ انھیں کے پڑوس میں افغانوں کی غیور اور اولو العزم قوم
آباد ہے لیکن دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

کشمیری قوم کے اخلاق کو برا نہیں کہا جا سکتا لیکن سخت افسوس کے ساتھ اس کا اعتراف کرنا
پڑتا ہے کہ سرینگر کی حالت اور خصوصاً ہانجی فرقہ (یہ لوگ عموماً ملاحی کرتے ہیں) کی اخلاقی حالت
ناگفتہ بہ ہے۔ شراب خواری، عورتوں کی عصمت فروشی اور بے حیائی یقیناً ایسی بد اخلاقیاں ہیں
کہ پوری قوم کو تباہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔ میں نے اس امر پر غور کیا ہے کہ آیا ان کی بد اخلاقیاں
ان کے افلاس و غربت کا نتیجہ ہیں یا ان کی خواری و رسوائی کے اعمال کی مکافات میں ہے۔
میرے خیال میں ان کی ان تمام برائیوں کا اصل سبب ان کی عرصہ کی غلامی ہے۔

ہندوستان کے اکثر حصوں کی طرح کشمیر میں بھی اسلام صوفیائے کرام کے تصرف سے پھیلایا گیا چنانچہ
عرصہ تک رشد و ارشاد کے سلسلے برابر جاری رہے لیکن اب دوسرے مقامات کی طرح تصوف کی روحانی کارفرمائی
ختم ہو چکی اور دنیا طلبی، حرص و آز کی گرم بازاری ہے۔ تصوف کے فیضان و برکات کی بجائے ہر طرف
توہمات کا ایک انبار نظر آتا ہے۔ افلاس و غلامی نے پہلے ہی کشمیریوں کی بلند حوصلگی کو خاک میں ملا دیا تھا
جب ایسے بالطبع نیاز کیش موجود ہوں تو مرشد کی پانچوں گھی میں ہیں۔ انھیں نیاز مندوں کی ان کو تلاش رہتی ہے۔

میرے خیال میں کشمیر کے موجودہ پیر وہاں کے تنزل اور عدم ترقی کی ایک بڑی وجہ ہیں
کشمیری دماغ کی جو نشو و نما دانائی، فراست، اور ملک پیمائی میں اپنا نظیر نہیں رکھتا تھا ایک

عرصہ سے توہمات نے روک دی ہے۔ تعلیم کا فقدان جہالت کی تاریکی اور سب سے بڑھ کر غیروں کی غلامی نے خودداری اور خودشناسی کے احساس کو بالکل محو کر دیا ہے۔

علامہ اقبال ذیل کے اشعار میں کشمیریوں کی حالت کا کن پر درد الفاظ میں نقشہ کھینچتے ہیں:-

کشمیری کہ با بندگی خو گرفتہ — بتے می تراشد ز سنگ مزارے

ضمیرش تہی از خیالے بلندے — خودی ناشناسے ز خود شرمسارے

بریشم قبا خواجہ از محنت او — نصیب تنش جامۂ تار تارے

نہ در دیدۂ او فروغ نگاہے — نہ در سینۂ او دل بے قرارے

بایں ہمہ ان میں اصلاح و ترقی کی استعداد موجود ہے۔ اس گئی گذری حالت میں بھی ان پر مذہب کا کافی اثر باقی ہے۔ نماز جمعہ میں مجھ کو دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہی لوگ جو دن بھر جھوٹ بولتے ہیں امام کے خطبہ کے وقت زار زار روتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سننے کے ساتھ ہی درود کی آواز سے تمام مسجد اُٹھ آتی ہے ان کے مذہب کا بین ثبوت یہ ہے کہ باوجودیکہ مسیحی مشنری تبلیغ عرصہ سے جاری ہے لیکن اب تک کسی کشمیری کے متعلق یہ نہیں سنا گیا کہ اس نے مذہب عیسوی کو قبول کیا ہو۔ سرینگر اور بارہ مولہ میں اسی غرض کے لیے مشنری اسکول قائم کیے گئے اور انجیل کا کشمیری زبان میں ترجمہ بھی کیا گیا لیکن عیسائیوں کو اب تک مطلقاً کامیابی نہیں ہوئی۔

مشہور مقامات | میں کشمیر جموں کے راستہ سے گیا اور راولپنڈی کے راستہ سے واپس آیا میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میری کشمیر کی سیر مکمل ہوئی کیونکہ اس کے لیے کم از کم چھ ماہ درکار ہیں لیکن میں نے وہ سب مقامات دیکھ لیے جو زیادہ مشہور ہیں اور جن تک راستہ کی آسانیاں ہیں۔

میں نے اپنا زیادہ وقت تین وادیوں کی گلگشت میں صرف کیا جو یقیناً خلاصہ کشمیر

کی جا سکتی ہیں یعنی وادیٔ کشمیر، وادیٔ لدر، وادیٔ سندھ۔

وادیٔ کشمیر یہ وادی سو میل طویل اور ۲۰ میل چوڑی ہے۔ ریاست کشمیر میں یہ وادی سب سے زیادہ زرخیز اور گنجان آباد ہے۔ ریاست کے مشہور شہر اور دارالسلطنت بھی اسی وادی میں واقع ہیں۔

سری نگر بہ حیثیت ایک شہر کے یہاں کوئی قابل تعریف نہیں۔ مقامات میں باغات کی بہتات ہے۔ جہانگیر کے عہد کی تعمیر کردہ جامع مسجد قابل دید ہے۔ اس کی عمارت عالیشان اور طرز تعمیر کعبۃ اللہ کے نمونہ پر ہے۔

قلعہ ہری پربت اکبر کے زمانہ کی تعمیر ہے جو جہانگیر کے عہد میں پایہ تکمیل کو پہونچی۔

تخت سلیمان۔ ہندوؤں کا ایک بہت پرانا مندر کوہ سلیمان پر واقع ہے۔ اشوکہ کے بیٹے جلاکہ نے ۲۰۰ سال قبل مسیح میں اس جگہ جہاں تخت سلیمان واقع ہے ایک مندر تعمیر کرایا تھا۔ راجہ گپادتھ نے سنہ ۲۵۳ء میں پرانے مندر کی جگہ یہ مندر بنوایا جو اب تک موجود ہے۔

اسلام آباد کی آبادی دس ہزار ہے۔ وادیٔ کشمیر میں سری نگر کے بعد بڑا شہر ہے۔ یہاں گندک کے چشمے ہیں جہاں لوگ دور دور سے نہانے آتے ہیں۔

بون اسلام آباد سے پانچ میل پر واقع ہے۔ یہاں ایک خوشنما چشمہ ہے جس کے قریب جہانگیر کے عہد میں ایک باغ تعمیر کیا گیا تھا۔ اس باغ کے چبوترہ کے نشانات اب تک باقی ہیں۔ اسی باغ کے قریب پانڈوں کے زمانہ کے غار ہیں جو ۲۰۰ فٹ پہاڑ کے اندر ہی اندر چلے گئے ہیں۔

مٹن سطح مرتفع پر واقع ہے۔ وہاں سے منظر نہایت شاندار ہے۔ یہاں ایک مندر ہے جس کی ازسرنو تعمیر آجکل ہو رہی ہے۔ علاقہ کشمیر میں یہ مندر سب سے زیادہ قدیم خیال کیا جاتا ہے۔

وادیٔ لدر اس مقام سے وادیٔ لدر شروع ہو جاتی ہے۔ اس وادی کے متعلق تمام سیاحان عالم کا متفقہ فیصلہ ہے کہ مناظر قدرت کی دلفریبیوں کے لحاظ سے یہ وادی دنیا کی سب سے زیادہ خوشنما وادیوں میں سے ہے۔ اور ہمالیہ کی تو بہترین وادی یہی ہے۔

فطرت معہ اپنی تمام رنگینیوں اور جلوہ آرائیوں کے یہاں ظاہر ہوتی ہے۔

عشمس مقام | یہاں زین الدین صاحب کا مزار ہے جو ان صوفیائے کرام میں سے ہیں جنہوں نے کشمیر میں اسلام کی روشنی پھیلائی - یہ زیارت پہاڑ کے اندر تاریک غار میں واقع ہے جہاں پہونچکر بالطبع انسان کو ایک قسم کی ہیبت معلوم ہوتی ہے۔

یہاں سے ایک میل کے فاصلہ پر نہر نکالی گئی ہے۔ نہر کے مصنوعی آبشار قابل دید ہیں۔

وادی سندھ | اس وادی سے وسط ایشیا کو راستہ جاتا ہے۔ دریا کے کنارہ کنارہ سڑک کے پیچ و خم بھی دور تک چلے جاتے ہیں۔ اس وادی سے پہاڑ رک مکہ (۰۰۰، ۱ فٹ) جو ہمیشہ برف سے ڈھکا رہتا ہے معہ اپنے وقار و تمکین کے صاف نظر آتا ہے۔

گاندربل - مانسبل اور کنگن اس وادی میں قابل دید مقامات ہیں۔

باغات | جہانگیر کو باغات کا بہت شوق تھا اور اس شوق کو پورا کرنے کے لیے کشمیر جیسی سامان اور جگہ نہیں ہم پہونچ سکتی تھیں۔ فطرت خود ہاتھ بٹانے کو تیار، بہترین مواقع موجود پھر قدر دان شہنشاہ کے لیے کونسے موانع درپیش تھے۔

باوجود ان کی کس مپرسی اور عدم اعتنا کے جب ان باغوں میں جا کر بیٹھئے جو جہانگیر نے بنوائے ہیں تو اٹھنے کو طبیعت نہیں چاہتی اور ایک عجیب روحانی کیف و انبساط اور دلی طمانیت حاصل ہوتی ہے۔

شہنشاہ جہانگیر کے عہد کے تعمیر کردہ باغوں میں سے یہ مشہور باغات موجود ہیں۔

شالامار باغ اور نشاط باغ | یہ دونوں باغات ڈل جھیل کے کنارہ واقع ہیں۔ یہ باغ عین اُس مقام پر واقع ہیں جہاں سے چشمے نکلتے ہیں اس لیے پانی کی قلت کبھی نہیں محسوس ہوتی۔ آبشاروں اور فواروں کا خاص اہتمام ہے۔ جو یقیناً کسی دوسری جگہ محال ہے۔

اچھابل | یہ باغ بھی جہانگیر کا تعمیر کردہ ہے۔ ایک مثلث پہاڑی پر چشمہ کے قریب واقع ہے۔ اس پہاڑ پر بہت گھنا چیڑھ کا جنگل ہے جس کی وجہ سے نظارہ دلفریب ہو گیا ہے۔ اور باغات

کی طرح یہاں بھی آبشار موجود ہیں اور کبھی کبھی فوارے بھی چھٹتے ہیں۔

ویری ناگ | سرینگر سے فاصلہ پر واقع ہونے کی وجہ سے اس باغ کی طرف بہت بے التفاتی برتی گئی ہے۔ حالانکہ موقع و محل کے لحاظ سے اس باغ کو کشمیر کے دیگر باغات پر فوقیت حاصل ہے۔ ویرناگ دراصل وہ چشمہ ہے جو دریائے جہلم کا منبع ہے۔ اس چشمہ کے چاروں طرف جہانگیر نے ایک عمارت تعمیر کرادی تھی اور اس کے بعد شاہجہاں نے آبشار بنوائے۔

شہنشاہ جہانگیر کو اس مقام سے انسیت تھی۔ کشمیر میں اس کا یہی مقام مرکز تھا۔ چنانچہ نورجہاں کے محلات کے آثار اب تک باقی ہیں اور دوسری عمارتیں ناقدری سے معدوم ہو گئی ہیں۔

جب جہانگیر کی زندگی کے چند لمحے باقی تھے اس وقت اس کی زبان پر اسی جگہ کا نام تھا اور اس کے دل میں کسی طرح پرواز کر کے اس مقام پر پہونچ جانے کی آرزو۔ یہ دراصل اسکی رنگینی مزاج کا اقتضا تھا کہ وہ ایسے مقام پر مرنے کی آرزو کرے۔

چشمہ کے گرد عمارت میں قطعات تاریخی بھی کندہ ہیں۔

"بادشاہ ہفت کشور شہنشاہ عدالت گستر ابوالمظفر نورالدین جہانگیر پادشاہ ابن اکبر بادشاہ غازی بتاریخ ۱۵ سنہ جلوس دریں سرچشمہ فیض آئین نزول اجلال فرمودند۔ ایں عمارت بحکم آنحضرت صورت اتمام یافت"

قطعہ

از جہانگیر شاہ حیدر شاہ — ایں بنا سر کشید بر افلاک
بانی عقل یافت تاریخش — قصر آباد و چشمۂ ورناک

دوسرا قطعہ یہ ہے

حیدر بحکم شاہجہاں پادشاہ دہر — شکر خدا کہ ساخت چنیں آبشار و جوئے
زیں جوئے دادہ است ز جوئے بہشت یاد — زیں آبشار یافتہ کشمیر آبروئے
تاریخ جوئے آب بگفت سروش غیب — از چشمۂ بہشت برون آمدست جوئے

گلمرگ مرگ مرغزار کو کہتے ہیں۔ یہ مقام سطح سمندر سے ۸۵۰۰ فٹ بلندی پر واقع ہے۔ گلمرگ ایک سبزہ زار ہے۔ جدھر آنکھ اُٹھتی ہے سبزہ ہی سبزہ نظر پڑتا ہے۔ بلندی پر واقع ہونے کی وجہ سے یہاں بمقابلہ وادیوں کے سردی زیادہ ہوتی ہے۔ گلمرگ سے دو میل پہاڑ کی چوٹی پر کھلن مرگ بہت وسیع مرغزار ہے۔ اس مقام سے دو میل فاصلہ پر ایک جھیل ہے جس کی سطح آب پر ہمیشہ یخ جمی رہتی ہے۔ یہاں سے ہندوستان سے سب سے بڑی جھیل وولر صاف دکھائی دیتی ہے بشرطیکہ ابر نہ ہو۔ یہ بھی کشمیر کے ان چند مقامات میں سے ہے جن کے بیان کے لیے قلم کی زبان کی بجائے شاعر کی زبان زیادہ موزوں ہے اور اچھی طرح ادائیگی فرض سے عہدہ برا ہو سکتی ہے۔ جذبات، کیفیات اور احساسات کی صحیح ترجمانی صرف شاعر ہی کر سکتا ہے اس لیے بہتر ہوگا اگر میں یہ ذمہ داری کسی شاعر کے لیے چھوڑ دوں۔

یوسف حسین خاں
متعلم جامعہ ملیہ اسلامیہ

رفتار تعلیم

ڈاکٹر بٹلر، صدر کولمبیا یونیورسٹی نے لندن کی ایک انجمن اساتذہ کے جلسہ میں یہ بیان کیا کہ تعلیم کا قدیم معیار یہ تھا کہ معلومات میں کس قدر اضافہ ہوا لیکن انھوں نے بتایا کہ درصل صحیح معیار تعلیم یہ ہونا چاہیئے کہ (۱) مادری زبان کا صحت و خوبی کے ساتھ استعمال کرنا آجائے۔ (۲) شریفانہ آداب و اخلاق پیدا ہوں (۳) حسن و خوبی، قدر و منزلت اور اخلاق آداب کے پرکھنے کا مذاق سلیم پیدا ہو (۴) نتائج پر غور و فکر کرنے کی قوت اور عادت ہو۔ (۵) نظم و نسق کے ساتھ کام کرنے کی قابلیت اور صلاحیت پیدا ہو۔ ڈاکٹر موصوف نے فرمایا کہ ہماری تعلیم میں یہ مقاصد ہمیشہ مد نظر ہونے چاہئیں، نہ یہ کہ بقول شخصے "چل پڑے اور معلوم نہو کہ کدھر جارہے ہیں" اس پر آپ نے پروفیسر ہکسلے اور گاڑی بان کا قصہ بیان کیا کہ ایک بار پروفیسر ہکسلے چلتے چلتے ایک سڑک کے سرے پر جا پہونچے۔ دیر ہو رہی تھی، وہ فوراً ایک گاڑی میں بیٹھ گئے اور گاڑی بان سے کہا کہ "ہانکو"، چلتے چلتے انھیں خیال آیا اور گاڑی بان سے پوچھا کہ "کہاں لے چل رہے ہو؟" اس نے جواب دیا "مجھے کیا معلوم؟ میں تو آپ کے حکم کے مطابق چل رہا ہوں"

ڈاکٹر بٹلر کے ان خیالات سے کسے انکار ہو سکتا ہے؟ ساتھ ہی اس کے کون نہیں جانتا کہ ہمارے طلبا کی کثیر جماعت ایک ایسی ہی راہ پر گامزن ہے جنھیں خود منزل مقصود کا پتہ نہیں اور ہندوستان کی کونسی یونیورسٹی ہے جو زبان حال سے یہ نہیں کہہ رہی ہے کہ "معلوم نہیں کہ ہم کہاں جارہے ہیں، آؤ ساتھ چلے چلو"

بابو جگل کشور برلا نے بنارس ہندو یونیورسٹی کے طلبہ کے لیے پندرہ روپے ماہانہ کے سو وظائف عطا کیے ہیں جنمیں سے ۲۵ برہمن طلبہ کے لیے مخصوص ہیں۔ ۵۰ دیگر ذات کے

طلبہ کو دیئے جائیں گے۔ ۵۰ وظیفے سکھ اور جینی طلبہ کو ملیں گے۔ اور ۲۵ وظائف نیچی ذات کے لڑکوں کو دیئے جائیں گے۔

---

۲۵ ہزار ڈالر کی سالانہ رقم جاپان کی طرف سے اس غرض کے لیے مقرر کی گئی ہے کہ اس سے جاپان کے چینی طلبہ کو ۵۰ وظائف دیئے جائیں۔ ہر وظیفہ کی رقم ۵۰۰ ڈالر ہے جو دس ماہ تک جاری رہے گا۔ چینی گورنمنٹ سے دریافت کیا گیا ہے کہ وہ طلبہ کو نامزد کر دے۔

گرفتم کز حریفاں پیش یا کم میتواں گفتن
ز دستت تا چہ آید؟ آخر ایں ہم میتواں گفتن

مسٹر پربھت چندر سر بدھیکاری جو تین سال سے سائنس کالج لندن میں نباتات کی تعلیم پا رہے تھے، ابھی حال میں لندن یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی ہے۔ سند لینے سے قبل انھیں ایک سو پونڈ کا وظیفہ دیا گیا اور اس وقت سے انھیں ۱۱۵ پونڈ کا دوسرا وظیفہ ملا ہے تاکہ وہ اور ایک سال تک اپنے فن میں تحقیق جاری رکھ سکیں۔

تعلیم کے اغراض و مقاصد اور علم و فن کے فضایل و مکارم علمار فضلا کی زبان سے تو ہم نے بہت سنے ہیں لیکن ذرا یہ بھی دیکھیں کہ یورپ کا ایک سیاسی مدبر یعنی وزیر انگلستان نے اس موضوع پر کیا کچھ کہا ہے۔

"اب جبکہ ہم ایک شہری بننے کی غرض سے تعلیم دینا چاہتے ہیں تو ہم کو چاہیئے کہ ہم خواہ تاریخ و معاشیات، ریاضی یا اور کسی دوسرے علم کی تعلیم پاتے ہوں، ایک مقصد اپنے پیش نظر رکھیں (۱) یہ کہ اپنے دماغ کو لاف زنی سے پاک رکھیں (۲) یہ کہ منطقی طرز دلائل کو سمجھ کر مغالطہ کی گرفت کر سکیں۔"

اس ضمن میں مسٹر بالڈوین نے ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک لیڈی نے ایک بار ریبے ایک دوست سے پوچھا کہ "کیا یہ جدید وزیر اعظم تعلیمیافتہ شخص بھی ہے؟" یہ فقرہ اس امر کے لیے کافی ہے "یہ تعلیمیافتہ شخص" کا تصور اس شخص کے لیے کس قدر بلند ہے اور یہ کہ وزارت کے لیے تعلیمیافتہ شخص کی ضرورت ہے۔

کسی قوم میں انقلاب کے بعد سب سے پہلا تعمیری کام جو شروع کیا جاتا ہے وہ تعلیم کا ہوتا ہے۔ روسی قوم نے بھی ۱۹۱۹ء کے انقلاب کے بعد اب جو ذرا دم لیا تو سب سے پہلے قومی تعلیم میں ہاتھ لگایا۔ اور اس کے لیے دامے درمے قدمے ہر ممکن ذریعے سے کام کر رہے ہیں۔

جمہوریہ روس (سوویٹ کانگریس) کے دسویں اجلاس نے یہ طے کر لیا ہے کہ تعلیم عامہ کے لیے انتہائی کوشش اور موثر ترین ذرائع عمل میں لائے جائیں گے چنانچہ آجکل حسب ذیل فقرے تمام بڑے بڑے مقامات پر چسپاں نظر آئیں گے۔

"ایک بہت ہی اہم مسئلہ آجکل ہمارے سامنے ہے۔ اپنی تمامتر کوششوں سے ہم کو اپنی تعلیم کو عام بنانا اور ترقی دینا ہے۔"

"ہماری جمہوریہ میں اسکولوں کا کام آجکل رو بہ زوال ہے۔ مدارس کی تعداد دن بدن گھٹ رہی ہے۔"

"روس کی مجلس انتظامی تمام مرکزی و مقامی جماعتوں سے یہ اپیل کرتی ہے کہ وہ اپنی قابلیت اپنے تجربے، اپنی معلومات اور اپنے مادی ذرائع اسکولوں کو تباہی سے بچانے میں صرف کر دیں اور آیندہ ان میں استقلال اور نشو و نما پیدا کریں۔"

"اسکولوں کے کارکنان خود بھی ہماری جمہوریہ کے علمی و تمدنی ترقی میں حصہ لیں۔ اسکول کا ایک تعلیمیافتہ کارکن ہی جو سوویٹ حکومت کا ہوا خواہ ہو، اسکول کی تعمیر کا بہترین ذریعہ بن سکتا ہے۔"

"ہمارے اسکول کب تک غلام بنے رہیں گے؟ انہیں لڑکے کی طرح نہیں رکھنا چاہیئے بلکہ

بنیں اراکین حکومت (سوویٹ) اور مزدور پیشہ جماعتوں کے حقیقی فرزند کی طرح ہونا چاہئے۔"

غرض یہ کہ اب ان کا تکیہ کلام ہوگیا ہے کہ

"دشمن حالات کے مقابلہ میں صرف بستہ ہوکر بڑھو سوشلسٹ جمہوریہ کو بالاتر یہ کہ علمی جمہوریہ بنی چاہیئے۔"

یوں تو تعلیم عامہ کے لحاظ سے ریاست میسور ہندوستان میں ایک نمایاں خصوصیت رکھتی ہے لیکن اس لحاظ سے بھی خاص طور پر قابل داد ہے کہ اس کے ہاں اندھوں اور بہروں کی کے لیے بھی ایک مخصوص درسگاہ ہے۔ حکومت اور پبلک دونوں کی عدم توجہی و غفلت کے باوجود یہ درسگاہ جو ایک عرصہ سے قائم ہے اپنا کام نہایت مستعدی اور انہماک کے ساتھ برابر انجام دے رہی ہے۔ ۱۹۲۲-۲۳ء میں طلبہ کی مجموعی تعداد ۶۱ تھی جن میں سے ۲۳ بہروں کی اور ۳۶ اندھوں کی اور ۲ صحیح و سالم لڑکوں کی تھی۔ ان میں ایک اندھی اور ۲ بہری لڑکیاں بھی شامل ہیں۔ درسگاہ کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ سال مذکور میں ۳ طالب علم احاطۂ بمبئی اور ۶ احاطۂ مدراس کے موجود تھے۔ بہروں کو بُننے وغیرہ کا کام سکھایا جاتا ہے۔ اندھوں کو موسیقی مثلاً ہارمونیم اور بانسری وغیرہ بجانے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اندھوں کو پڑھانے کے لیے ایک طرح کے اُبھرے ہوئے حرفوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس قسم کا ایک پریس بھی اب کھولا گیا ہے جس میں کمپوزنگ کا کام وہ لڑکے خود کرتے ہیں اور اس طریقے سے ان کی کتابوں کے دشواری کا مسئلہ بھی حل ہوگیا۔

اس دور جدید کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر طرف علوم و فنون کی گرم بازاری نظر آئیگی تعلیم کے متعلق ہمیشہ نئے نئے اصول و مبادی مرتب ہوتے رہتے ہیں جس سے رفتار تعلیم میں روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے۔ ذیل کے چند اصول جو مختلف کچھڑوں۔ کتابوں اور تعلیمگاہوں کے

مطالعہ و معائنہ کے بعد جمع کئے گئے ہیں۔

۱۔ یہی نہیں کہ طلبہ تک معلومات صرف پہنچا دی جائیں بلکہ انہیں خود کتابوں اور اصلی ذرائع معلومات سے فراہم کرنے اور تحقیق و تفتیش کرنے کا موقع دو۔

۲۔ حتی الامکان باقاعدہ جماعتوں کی پابندی سے پرہیز کرنا چاہیئے اور اس کی بجائے ہر متعلم کو ایک مخصوص کام دیا جائے جسے وہ خود اپنی تلاش و سعی سے کرے۔

۳۔ بعض تعلیمگاہوں میں ایسے علمی کام ایک فرد کی بجائے جماعت کے سپرد کئے جاتے ہیں جو مسئلہ مخصوص پر ایک مشترکہ رپورٹ پیش کریں۔

"معلم"

مطبوعات جدید

المومن

از مولوی محمد اسلم صاحب جیراجپوری

یہ ایک سہ ماہی رسالہ ہی جو مولوی محمد یحییٰ صاحب مومن کی ادارت میں دفتر المومن نمبر ۲۳ بنیا پوکھر روڈ کلکتہ سے شائع ہوتا ہی۔ اب تک تین پرچے نکل چکے ہیں۔ ضخامت ڈھائی جز۔ اور لکھائی چھپائی کاغذ وغیرہ پسندیدہ ہی۔ قیمت سالانہ مع محصول ڈاک ۱۲؍ ہی۔

یہ رسالہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہی خصوصیت کے ساتھ قوم مومن یعنی نوربافوں کی اصلاح اور ترقی کے لیے ہی نیز بالعموم مسلمانوں کی بہبود بھی اس کے پیش نظر ہی۔

قوم مومن ہندوستان میں کثیر التعداد ہی۔ اور دینداری۔ عبادت اور تقوے میں نہایت ممتاز۔ ہم نے ان میں سے بہت سے ایسے مسلمان دیکھے ہیں جو ہندوستان کی دوسری قوموں میں ہم کو نہیں مل سکے۔ علوم اسلامیہ میں اس قوم کے بہت سے لوگوں نے نمایاں شہرت حاصل کی ہی۔ اب بھی علماء دین اس میں بکثرت ہیں۔ اور تاریخ اسلام میں تو بہت سے ائمہ حدیث و علماء دین ایسے ملتے ہیں جن کا یہی پیشہ تھا۔ مگر ہندوستان کے اہل اسلام پر یہ رونے کا مقام ہی کہ نسلی عصبیت نے ان کے اوپر ایسا غلبہ پا لیا۔ اور ہندوؤں کے اثر سے خاندانی شرافت کا خیال اس طرح ان کے اوپر مسلّط ہو گیا کہ وہ اس قوم کو جو ہندوستان کی جماعت اسلامیہ کا ایک نہایت صالح جزو ہی اور دینی و دنیوی ہر لحاظ سے مفید تر ہی پست اور ادنی سمجھتے ہیں یہاں تک کہ یہ رسالہ جو اس قوم کی طرف سے نکلا ہی اس میں اس کے تمام مقاصد میں سے سب سے اول مقصد یہ ہی کہ

"مسلمانو! ہم کو ذلیل اور رذیل نہ سمجھو"

افسوس صد افسوس۔ کیا مسلمانان ہند باوجود اس کے دعویٰ کر سکتے ہیں کہ وہ اسی نبی برحق

کے پیرو ہیں جس نے فخر بالانساب کو فتح مکہ کے دن پاؤں سے روند ڈالا۔ اور فرمایا۔

لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر۔ الناس کلھم من آدم وآدم من التراب

نہ عربی کو عجمی پر فضیلت ہے۔ نہ عجمی کو عربی پر نہ گورے کو کالے پر نہ کالے کو گورے پر سارے آدمی آدم کی نسل سے ہیں۔ اور آدم مٹی سے بنے تھے

اسلام ہر قسم کی نسلی تفریق کو مٹا کر تمام مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی بناتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ مشت خاک جس کا نام گوشت۔ پوست اور استخواں ہے ہرگز فخر کے قابل نہیں ہے۔ بلکہ بزرگی کا مدار صرف تقوے پر ہے۔ قرآن میں ہے۔

یا ایھا الناس انا خلقنا کم من ذکر و انثی وجعلنا کم شعوبا و قبائل لتعارفوا۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم

لوگو۔ ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ اور تمہارے خاندان اور قبیلے بنا دیئے تاکہ آپس میں پہچان رکھو حقیقت یہ ہے کہ سب سے زیادہ بزرگ اللہ کے نزدیک وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

نسب کو جس کے اوپر بعض لوگ گھمنڈ رکھتے ہیں قرآن محض دنیاوی شئے قرار دیتا ہے۔ قیامت میں یہ سارے جسمانی تعلقات فنا ہو جائیں گے چنانچہ اس میں ہے۔

فاذا نفخ فی الصور فلا انساب بینھم یومئذ ولا یتساءلون فمن ثقلت موازینہ فاولئک ھم المفلحون ۝ ومن خفت موازینہ فاولئک الذین خسروا انفسھم فی جھنم خالدون ۝

جب صور پھونکا جائیگا تو ان میں کسی قسم کا نسب ہوگا نہ وہ ایک دوسرے کو پوچھیں گے جن کا میزان عمل (پلہ) بھاری ہوگا وہ نجات پا جائیں گے۔ اور جن کا ہلکا ہوگا۔ اُنھوں نے اپنے آپ کو خسارہ میں رکھا وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

الغرض جو شخص نسب پر فخر کرے اور اس گھمنڈ میں اپنے کو شریف اور دوسروں کو رذیل سمجھے وہ ابھی جسمانیت کی جہالت اور جاہلیت کے آب و گل میں ہے۔ نہ اُسے روحانیت کی ہوا لگی ہے نہ اسلام کی روشنی اس نے دیکھی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار میرے والد مولانا سلامت اللہ صاحب مرحوم وزیر تعلیمات ریاست بھوپال کے یہاں مولانا حافظ عبداللہ صاحب مرحوم غازی پوری جو قوم مومن سے تھے مہمان تھے۔

میں بہت نوعمر تھا۔ ایک دن غصہ میں کسی نوکر کو "جلاہا" کہہ بیٹھا۔ والد مرحوم نے ایسی غضب آلود نگاہ سے میری طرف دیکھا جس نے اس جاہلیت کے دلدل سے نکال کر مجھے کوسوں فاصلہ پر پھینک دیا اور ہمیشہ کے لیے میری اصلاح کر دی۔

میں المومن کے اڈیٹر صاحب کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس مقصد کو اپنے رسالہ سے خارج کر دیں۔ کیونکہ جو مسلمان فخر بالانساب میں مبتلا ہیں وہ حقیقت میں خود ہی ذلیل وخوار اور مجرم و گنہگار ہیں۔ ان کی اصلاح کی ضرورت ہے نہ کہ ان سے اس استدعا کی کہ وہ آپ کو شریف سمجھیں۔ ان کے سمجھنے یا کہنے سے ہوتا ہی کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وللّٰہ العزۃ ولرسولہ وللمومنین ولکن المنافقین لایعلمون ؀ | عزت اللہ اور اُس کے رسول اور مومنین کے لیے ہے۔ لیکن منافق نہیں جانتے۔

جماعت نورباف کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی قوم کی دینی اور دنیوی ترقی کے لیے ہر ممکن کوشش کرے۔ اس قوم میں جیسا دینی اثر اور باہمی اتحاد ہے اس سے ہم کو توقع ہے کہ انکی ترقی جلد اور آسانی کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد جو لوگ اس قوم پر تحقیر کی نظر ڈالتے ہیں وہ اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر خود اپنی جہالت پر افسوس کریں گے۔

اپنی ہر آبادی میں پنچایت قائم کرنا۔ ہر مقام پر مدرسے کھولنا۔ دینی علوم کے ساتھ صنعت و حرفت کی تعلیم دینا۔ خاصکر اپنے پیشہ کی۔ معاشرت اور تمدن کو خالص اسلامی تعلیم کے مطابق کرنا۔ قرب جوار میں دین کی تبلیغ۔ مشترکہ سرمایہ سے تجارتی کاروبار کو بڑھانا۔ جو لوگ اعلیٰ تعلیم کے قابل ہوں اُن کو وظائف دینا وغیرہ۔

یہ اجمالی مقاصد ہیں جن کو پیش نظر رکھنا چاہیئے اور فوراً پوری توجہ سے تمام جماعت کو کوشش میں لگ جانا چاہیئے۔ قوم نورباف میں حسن معاملت۔ جفاکشی۔ باہمی محبت۔ اور اپنے سرداروں کی اطاعت وغیرہ ایسے بے نظیر صفات ہیں جن کے ہوتے ہوئے ان کی ترقی بالکل مشکل نہیں ہے۔ صرف ان کے رؤسا کو ہمت اور کوشش کی ضرورت ہے۔

رسالہ المومن بے شک ہو اور ہونا چاہیئے۔ لیکن اس کے ساتھ سستے داموں کا اگر روزانہ نہیں تو کم سے کم ہفتہ میں دو بار یا ہفتہ وار ہی سہی ایک اخبار بھی ہونا چاہیئے۔ فقط

بصائر القرآن۔ مرتبۂ محمد مہدی صاحب۔ مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

فرمانروائے بھوپال کے قدر دانی علم اب محتاج تعارف نہیں۔ اکثر مطبوعات دفتر تاریخ سے شائع ہوتی رہتی ہیں۔ بصائر القرآن اسی قسم کی ایک کتاب ہے جس کو محمد مہدی صاحب نے نہایت محنت سے ترتیب دیا ہے۔ یہ دو سو آٹھ صفحہ کی کتاب ہے۔ بڑی تقطیع کاغذ معمولی سفید اور طباعت نہایت صاف اور روشن ہے۔

مرتب صاحب نے جلیل القدر پیغمبروں کے حالات اور قرآن کریم کے مشہور قصص و حکایات کو ایک جگہ نہایت سادہ اور مختصر الفاظ میں جمع کیا ہے اور ہر قصہ یا بیان کے بعد نتیجہ کے عنوان سے بچوں کی ہدایت کے لیے کچھ الفاظ اس بیان یا واقعہ کے متعلق اضافہ کیئے ہیں۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ نتیجہ کے عنوان سے جو کچھ اضافہ کیا گیا ہے وہ اگر بالکل نہ ہوتا تب بھی کتاب کی خوبی پر کوئی اثر نہ پڑتا۔ بعض جگہ نتیجہ اخذ کرنے میں بچوں کی استعداد کا بھی لحاظ نہیں کیا گیا۔

کتاب اس قابل ہے کہ بچوں کو مدارس اور گھروں میں پڑھائی جائے۔

کلام جوہر

"مولانا کے برادر مکرم ذوالفقار علی خاں صاحب گوہرؔ سے مولانا اور نیز شوکت علی صاحب کو اپنے زمانہ نظربندی اور بیتول جیل میں کچھ شکایات پیدا ہو گئی تھیں۔ ذوالفقار علی خاں صاحب نے اُن شکایات کا جواب ایک غزل میں دیا تھا جس کا مطلع یہ ہے

جورِ اعدا کے گلے تیری جدائی کے گلے
اس دلِ تنگ میں ہیں۔ ساری خدائی کے گلے

(گوہر)

مولانا نے گلے شکوؤں کا جواب بڑے مزے سے اپنے انداز میں لکھا ہے"

(مدیر)

کبھی چکھے ہی نہیں آبلہ پائی کے مزے — خضر کیا جانے بھلا راہ نمائی کے مزے
کثرتِ شوق سے تھا ہجر بھی ہم رنگِ وصال — ہم نے لوٹے ہیں بہت تیری جدائی کے مزے
کشش شوق تھی اور لذتِ بُعدِ منزل — سب طرف خار تھے اور آبلہ پائی کے مزے
طبعِ آزاد، اسیری میں بھی پابند نہ تھی — قید میں ہم نے اُٹھائے ہیں رہائی کے مزے
سمجھے ہر سجدے کو معراج جو زاہد چکھ لے — درِ تو بہ پہ مری ناصیہ سائی کے مزے
آ گئی وادیِ پرخار بڑھاؤ تو قدم — پھر نہ کہنا نہ ملے راہ نمائی کے مزے
میری مرضی ہوئی گم جب سے تری مرضی میں — بندگی ہی میں ملے ساری خدائی کے مزے
درگہِ حسن پہ سب ایک ہیں محمود و ایاز — بادشاہوں کو بھی ملتے ہیں گدائی کے مزے

شعر جوہرؔ کی ہو کیا قدر سخن سازوں کو
ہم سے پوچھے کوئی اس ہرزہ سرائی کے مزے

جزیرۃ العرب

مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری

"مولانا اسلم صاحب کے نتائج فکر کا دوسرا ہدیہ ناظرین جامعہ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے،
یوم جزیرۃ العرب عنقریب تمام ہندوستان میں منایا جائے گا، مولانا نے ذیل کی پُر اثر
نظم اسی موقعہ کے لئے تحریر فرمائی ہے۔" مدیر

وہ عرب کہ دینِ برحق۔ ہوا جس سے آشکارا
کہ مٹا جہاں سے باطل۔ کیا کفر نے کنارا

حرمِ خدا ہے اُس میں۔ حرمِ نبی ہے اُس میں
کہ ملائکہ کی فوجیں جہاں رہتی ہیں صف آرا

ہے اُسی میں گھر خدا کا۔ کہ جو چشمہ ہے ہدیٰ کا
کہ جہانِ تیرہ میں ہے وہی حق کا اِک منارا

وہ کتابِ آسمانی۔ کہ ہے نورِ جاودانی
اُسی سرزمیں میں رب نے اُسے عرش سے اُتارا

وہ رسولؐ فخرِ آدم کہ ہے رحمتِ دو عالم
اُسی خاک میں ہے پنہاں۔ وہیں تھا وہ جلوہ آرا

حرمین جانے والے - قدم ادب سنبھالے!!

کہ وہاں کا ذرّہ ذرّہ - مری آنکھ کا ہے تارا

کفِ پائے شاہ دیں کے - یہ ہونگے اُس نے بوسے

مجھے سنگپارہ بطحا کا ہے لعل سے بھی پیارا

مُتولّیِ حرم سے کوئی کاش جا کے کہہ دے

کہ ہے آبروئے ملّت کا یہ آستاں سہارا

یہ حرم کی سرزمیں ہے - یہ متاعِ مسلمیں ہے

نہ کسی کی ہے تجارت - نہ کسی کا ہے اجارا

یہاں مُلحدی[۵۱] کا شیوہ کوئی چل نہیں سکے گا

کہ تجھی کو پھونک دے گا ترے فتنہ کا شرارا

یہ حریمِ کبریائی - کہ ہے قلعۂ خدائی

یہاں غیر کی رسائی - نہیں مطلقاً گوارا

یہ جزیرۃ العرب ہے - یہاں آستانِ رب ہے

کہ ہم اُس کے پاسباں ہیں وہ ہے پاسباں ہمارا

---

۵۱ اس آیت پاک کی طرف اشارہ ہے۔ "وَمَن يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ" "ظلم سے اسمیں جو الحاد کا ارادہ کرے گا اُس کو ہم دردناک عذاب چکھائیں گے"

سیر بہشت

مولانا آزاد عظیم آبادی

کل سیر خلد کو جو مجھے لے گیا خیال — وہ نہر و باغ و نعمت الوان و حور عیں
کیا ذکر خورد و نوش کہ خود بھوک تھی پیاس — حوریں تو تھیں سرے مرے کام کی نہیں
حیراں ہوا کہ کیجئے کیا اس بہشت کو — کچھ خوبیاں تو ہو نہ سکیں اس کی دل نشیں
لیکن ملا یہ نکتۂ نایاب بیدرنگ — شایان شکر مائدہ نعمت آفریں

یک گردہ نان تازہ و یک جام آب سرد
بر وقت ہاتھ آئے تو جنت یہی بس ہیں

العلم عند اللہ

اے محو جلوہ ہائے طلسم تصورات — کیا حاصل تصور میلاد ممکنات
جس پر کوئی دلیل نہیں وہ قیاس کیا — کچھ بھی چلا کسی کی خلقت کا جب پتا
اے آزر بتان خیال خدا تراش — کس واسطے معارج تکوین کی تلاش
عاجز ہے ہیں جسکی ذات سے سب حکیم — صبح ازل کے صدق صفا کا خدا علیم

آزاد عظیم آبادی

شذرات

عالم اسلامی میں جو عظیم الشان انقلاب اس وقت ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ اُن کی اہمیت کا صحیح اندازہ تو ابھی نہیں کیا جا سکتا لیکن آل عثمان کی جانبازی و حق پرستی کے جو ثمرات اولین اب قسطنطنیہ و سلطنت ترکی میں نظر آ رہے ہیں اُن کو البتہ دنیا دیکھ رہی ہے۔

نومبر ۱۹۱۸ء میں اتحادی افواج نے قسطنطنیہ پر قبضہ کیا تھا اور اُس وقت واقعات کا رُخ ایسا تھا کہ ہمدردان اسلام مایوس ہو چلے تھے اور اُمید نہ تھی کہ ۲ اکتوبر ۱۹۲۳ء ہی آئیگی جبکہ ان قبضہ کرنے والوں نے غالباً ہمیشہ کے لیے قسطنطنیہ کو الوداع کہا اور اس طرح ترکی فتح و لازین کی عظیم الشان کامیابی پر گویا مہر ثبت ہو گئی۔ غالباً ترکی قوم کے لیے اپنی جنگی کامیابیوں سے فائدہ اُٹھانے کا گزشتہ پچاس سال میں یہ پہلا موقع ہے اور اس اعتبار سے جس جوش مسرت کا اظہار اس وقت تمام ممالک اسلامی میں ہو رہا ہے وہ ذرا بھی غیر متوقع نہیں کہا جا سکتا۔

ترکوں نے اپنی آزادی کا پہلا عملی ثبوت انسداد مے نوشی کے قابل قدر قانون سے پیش کیا ہے جس کا نفاذ اب قسطنطنیہ و حدود ترکی میں نہایت سختی سے ہو چکا ہے۔ اہل یورپ و یورپ پرست ترک آپ انگور کے اس طرح دفعتاً غایب ہو جانے سے اپنی تشنہ کامی کو اس امید موہوم سے تسکین دے رہے ہیں کہ غالباً مے پرستوں پر یہ جبر و تشدد زیادہ عرصہ قائم نہ رہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ میخانہ ہستی کے جن بادہ خواروں نے اس رسم کہن کو پھر تازہ کیا ہے وہ اپنے نکتہ چینوں سے کہیں زیادہ سرشار و مدہوش ہیں اور یہ نشہ تا سانی اُتر ہی نہیں سکتا اس لیے کہ موجودہ دور قسطنطنیہ کے عہد قدیم سے بالکل مختلف ہے۔

بادہ آشام نئے بادہ نیا خم بھی نئے!

حکومت انگورہ نے اپنا جدید نظام اساسی طیار کیا ہی اور سلطنت ترکی کے لیئے جمہوری
طرز حکومت کا اعلان ہوچکا ہی۔ دار السلطنت بھی بجائے قسطنطنیہ کے انقرہ تجویز کیا گیا ہی
ہر چند کہ ترکی قوم کو حق حاصل ہی کہ وہ اپنے لیئے جو طرز حکومت مناسب سمجھے اختیار کرے
اور نہ جمہوریت موجودہ تمدن و آئین اسلام کے خلاف ہی لیکن آل عثمان کا جو تعلق اب تک
عالم اسلامی سے رہا ہی اور منصب خلافت کی وجہ سے جو اقتدار اُن کو صدیوں حاصل رہا
اُس کے اعتبار سے اس فیصلہ کو ہندوستان کے بعض حلقوں میں اک گونہ تعجب کی نظر سے
دیکھا گیا ہی۔ بعض حضرات کے نزدیک مسئلہ خلافت کی صورت اب بالکل نئی ہوگئی، کچھ
لوگ خلافت و حکومت کی اس تقسیم سیاسی کو مذہباً ناجائز اور مصلحتاً نامناسب تصور فرماتے ہیں
حکومت ہند گو بظاہر خاموش ہی لیکن ہمدردان حکومت اس واقعہ کی تاویل کچھ اس انداز سے کر رہے
ہیں کہ گویا آتش خاموش کے لیے سامان اشتعال کی تلاش میں ہیں۔ بہر حال اس حقیقت سے
انکار نہیں ہوسکتا کہ اس اہم اور نہایت نازک مسئلہ کے متعلق مسلمانان عالم کے متفقہ فیصلہ
کی ضرورت ہی اور اکابرین قوم کو جلد اس طرف متوجہ ہونا چاہیئے ہم نے مسئلہ کی اہمیت
کا خیال کر کے جامعہ میں اک سلسلہ مضامین شائع کرنے کا قصد کیا ہی لیکن اس مقصد میں کامیابی
کی صرف یہی صورت ہی کہ بزرگان قوم بھی ہماری اعانت فرمائیں اور اپنے خیالات کے اظہار
میں جامعہ کے صفحات کی طرف متوجہ ہوں۔

مسئلہ کینیا کے متعلق سر تیج بہادر سپرو کے مساعی جمیلہ کا ذکر ہمارے صوبہ کے بعض
اخبارات اور رایٹر کے تاروں میں نہایت تفصیل سے رہتا ہی کاش برٹش امپایر کانفرنس کی
بجائے کسی زیادہ مفید و با اثر ذریعہ کو سر تیج بہادر اپنی کوششوں کا وسیلہ بناتے تا کہ اُسمیں
کامیابی کی کوئی امید ہوسکتی۔ موجودہ صورت میں اگرچہ اُنھوں نے اپنا فرض نہایت
قابلیت کے ساتھ ادا کیا، لیکن غریب ہندوستان کے لیے وہ کچھ زیادہ سود مند نہیں ہوسکتا

اس لیئے کہ جس انجمن سے وہ حق پرستی و دادرسی کی توقع فرماتے تھے اُس کا حال یہ ہی کہ خود اُس کی متفقہ قراردادوں کو جو گزشتہ سال منظور کی جا چکی ہیں آج جنرل اسمتس جو امپائیر کانفرنس کے رکن رکین ہیں طاق نسیاں کے نذر فرما چکے ہیں اور اس تجاہل عارفانہ کی تلافی بھی نہیں کرنا چاہتے۔ اُن کے نزدیک اُس تجویز پر جس کے تسلیم کرنے والوں میں ایک وہ بھی تھے اب عمل ہی نہیں ہو سکتا! ایسی حالت میں ڈاکٹر سپرو کی "کامیابیاں" واقعیت اور حقیقت کے اعتبار سے کیا حیثیت رکھتی ہیں؟ کیا کینیا کے معاملہ پر دوبارہ غور کرنے کی امید موہوم اُن غریب ہندوستانیوں کے درد دل کی دوا ہو سکتی ہی جو اپنے وطن سے دور سرمایہ داری کی بے پناہ تلوار اور نسلی تعصبات کی کند چھری سے ذبح کیئے جا رہے ہیں

انگلستان کے بلند پایہ مصنفین میں نارمن اینگل کا نام جو عظمت و اقتدار حاصل کر چکا ہی وہ محتاج تشریح نہیں۔ صرف انگلستان ہی نہیں تمام عالم میں "گریٹ الیوژن" کے مصنف نے دسمبر سنہ ۱۹۱۹ء میں جو ہل چل پیدا کر دی تھی وہ آج بھی کہ یورپ کا سیاسی مطلع تیرہ و تار ہی اور ایشیا کی سرزمین ہیجان و اضطراب کی بجلیاں اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہے، فراموش نہیں کی جا سکتی۔

حال ہی میں نارمن اینگل نے انگلستان کے مقتدر اخبار "نیشن" میں ایک سلسلہ مضامین شروع کیا ہی جس میں پریس کا روزافزوں اقتدار اور ہیئت اجتماعی و سیاسی زندگی پر غیر معمولی اثر دکھانے کے بعد اُنھوں نے اُن خطرات کا تفصیل سے ذکر کیا ہی جو خود غرض و تاجر صفت مالکان اخبار کے وجہ سے ملک میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہی کہ شراب نوشی کا عام رواج اور دیگر مسکرات کی حکومت کی طرف سے اشاعت اس درجہ خطرناک نہیں، ڈاکٹر اگر مریضوں کے لیئے غلط علاج تجویز کریں تو وہ اس قدر اندیشہ ناک نہیں، لیکن جو زہر کہ اخبارات کے ذریعہ سے ملک میں پھیلایا جاتا ہی اور جو نہ بجھنے والی پیاس غلط خبروں کے ذریعہ پیدا کی جاتی ہی

اُس کے نقصان کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ اُس کی تلافی بآسانی ممکن ہے۔
دوران جنگ میں ایک اخبار نے جرمنی میں ایک ایسا کارخانہ دریافت کیا تھا جہاں لاشوں
کو ضائع کر کے اُن سے تجارتی فائدہ حاصل کیا جاتا تھا۔ آج کل بھی بجائے امن و سکون کی
کوشش کے پریس آئے دن ہوٹل کے نوکروں، کارخانہ کی لڑکیوں، اسکول کے بچوں
میں انقلاب، اضطراب پیدا کرنے کی فکر میں مبتلا ہے۔ اور یہ زہریلا اثر رفتہ رفتہ تمام ملک میں پھیلتا
جاتا ہے۔

اسی مضمون کی تائید انگلستان کے دوسرے نامور صحافی و ادیب مسٹر چیسٹرٹن کی طرف
سے ہوئی ہے جنھوں نے کیمبرج یونیورسٹی کے مباحثہ میں ایک معرکۃ الآرا تقریر فرمائی۔
مسئلہ زیر بحث یہ تھا کہ پریس کا غیر معمولی اثر ملک کے لئے مضر اور اس لیے قابل افسوس
ہے مسٹر چیسٹرٹن نے دوران تقریر میں پریس کی جس حیثیت کو سب سے زیادہ قابل افسوس و
مضرت رساں ثابت کیا وہ "اجارہ داری" ہے۔ یعنی بعض دولتمند افراد کا مقتدر و با اثر اخبارات
کو تجارتی اصول پر قائم رکھنا اور چلانا۔ اس اجارہ داری کی تازہ مثال بلٹن پریس کی
ہے اور لارڈ راتھمیر اور لارڈ نارتھ کلف کا وہ خطرناک اثر ہے جو برطانوی حکومت
کے علاوہ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی یکساں محسوس کیا جاتا ہے۔ لیکن باوجود
'ڈیلی میل'، 'دی ٹائمز' جیسے اخبارات نہ ہونے کے ہندوستان خداوندان صحافت
کے ہاتھوں جس مصیبت میں گرفتار ہے اُس کے مظاہر نہایت عبرت خیز و درد انگیز ہیں۔
پنجاب، مدراس، صوبہ متحدہ، بنگال کسی صوبہ کو لے لیجئے اور وہاں کے سیاسی
مذہبی و اجتماعی اختلافات و مناقشات پر غور فرمائیے تو حیرت ہوتی ہے اور کسی طرح
سمجھ میں نہیں آتا کہ عقل و دانش کے طویل دعاوی کے باوجود تعصب و جہالت کی
گرم بازاری کیوں ہے؟

مکتبہ جامعہ ملیہ کی خاص کتابیں

تاریخ الامت۔ مصنفہ مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری۔ آغاز اسلام سے آخر زمانہ سلاطین بنی امیہ و بنی عباس تک مکمل تاریخ اسلام اس سے قبل اردو میں موجود نہ تھی۔ تاریخ الامت نے اس ضرورت کو پہلی مرتبہ پورا کیا ہے اور اسی وجہ سے وہ علمی حلقوں میں خصوصیت سے مقبول ہوئی۔ تاریخ اسلام پر اس سے بہتر جامع مختصر اور مسلسل کتاب موجود نہیں۔ قیمت حصہ (سیرۃ) عہ حصہ دوم (خلافت راشدہ) ۶ر حصہ سوم (بنی امیہ) عہ حصہ چہارم (بنی عباس) ۶ر

ترکوں کی کہانیاں آل عثمان کے جنگی کارناموں اور ترکی بہادروں کی جوانمردی اور اسلامی اخوت و ہمدردی کی سچی تصویریں (جو موجودہ واقعات سے لی گئی ہیں) کہ اس کتاب میں نظر آتی ہیں۔ قیمت ۴ر

مبادی معاشیات پروفیسر ذاکر حسین خاں صاحب کی معرکۃ الآرا کتاب ہے جو علم المعیشت کے تمام اصول نہایت خوبی کے ساتھ سہل اور عام فہم طریقہ سے ذہن نشین کر دیتی ہے۔ قیمت مہ

مجموعہ کلام جوہر رئیس الاحرار مولانا محمد علی صاحب جوہر کی تمام جدید و قدیم کلام کا مجموعہ جس کا زیادہ حصہ بیجاپور جیل میں تصنیف ہوا ہے مع مقدمہ از مسٹر عبدالماجد بی۔ اے و تازہ فوٹو مولانا صاحب۔ قیمت ۶ر

ازہار العرب مولانا محمد سورتی صاحب نے ادب عربی حصہ نظم کا ایک مختصر انتخاب فرمایا ہے جو عام طور پر طلبہ و اہل علم میں مقبول ہوا۔ قیمت ۸ر

ضروری تصحیح اس نمبر میں صفحہ ۲۱۴ کے بعد ۲۲۵ غلطی سے لکھا گیا ہے ۲۱۵ ہونا چاہیے اسی طرح ۲۲۴ تک صفحوں کے سب نمبر بدل جائینگے اس غلطی سے مضمون کے تسلسل میں کوئی فرق نہیں ہوتا ہے ناظرین تصحیح فرمالیں۔ منیجر

مکتبہ جامعہ ملیہ علیگڑھ

مشہور مصنفوں کی مشہور کتابیں

اور اُردو زبان کی تازہ ترین مطبوعات

آسانی اور کفایت سے صرف مکتبہ ہذا سے مل سکتی ہیں

المدینة والاسلام

(مترجمہ مولوی رشید احمد صاحب مرحوم)

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہی جو بار بار شائع ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئی۔
اب تازہ اڈیشن پھر شائع ہوا ہی جو صرف مکتبہ جامعہ سے مل سکتا ہی۔ قیمت عہ/

خواجہ عبدالحی صاحب کی تصانیف

خواجہ صاحب کی تصانیف میں تفسیر القرآن نے خاص مقبولیت حاصل کی ہی جس کے
دو حصے شائع ہو چکے ہیں۔ کاغذ عمدہ، اور طباعت و کتابت نفیس ہی۔

الخلافۃ الکبریٰ جو تمام تر سورۂ بقر کی تفسیر ہی غیر مجلد للعہ/ مجلد صہ/

الصراط المستقیم سورہ توبہ وانفال کی تفسیر ہی غیر مجلد عہ/

بصائر حضرت موسیٰ و فرعون کے واقعات پر قصص قرآنی سے
نہایت دلآویز تشریح کی گئی ہی۔ قیمت ۶/

دیوان غالب اردو

جس طرح نظم اردو کی بہترین کتاب تسلیم کی جاتی ہی اسی طرح جو اڈیشن ہم نے خاص اہتمام سے جرمنی سے چھپوا کر منگایا ہی اُس کے متعلق بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہی کہ اس سے بہتر اُردو زبان میں آج تک کوئی کتاب طبع نہیں ہوئی نہایت نفیس ملائم سُرخ جلد پر سُنہرا کام ہی اندر مرزا صاحب کی رنگین تصویر ہی اور پھر مکمل دیوان مع قصائد و غزلیات رباعیات اور اس کے بعد بیاض کے لیے سادہ اوراق دئیے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ قابل قدر خود مرزا غالب مرحوم کا لکھا ہوا مقدمہ ہی جو شروع میں درج ہی اس اڈیشن کی مقبولیت کی یہ حالت ہی ہم کو کسی طرح امید نہیں کہ شائقین تک پہونچ سکے بہرحال درخواست خریداری بھیج دیجئے تاکہ نام درج رجسٹر ہو جائے اور اس وقت نہیں تو دوسرے اڈیشن پر مایوسی نہو۔ قیمت صرف تین روپیہ ہے

المشتہر

مہتمم مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ

اللہ اکبر

جامعہ

جامعہ ملّیہ اسلامیہ علیگڑھ

کا

ماہوار علمی رسالہ

مرتبہٗ نور الرّحمٰن

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

قیمت سالانہ للعہ ر

فہرست مضامین

جلد ۲ | ماہ ربیع الثانی سنہ ۱۳۴۲ھ مطابق نومبر سنہ ۱۹۲۳ء | نمبر ۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

جلد ۲	ماہ ربیع الثانی سنہ ۱۳۴۲ھ مطابق نومبر سنہ ۱۹۲۳ء	نمبر ۵

تاریخ تصوف کا ایک ورق

کشف المحجوب

(شیخ علی بن عثمان ہجویری رح)

"تصوف کا اثر ہندوستان پر اس قدر شدید و وسیع ہے کہ اُردو زبان باوجود اپنی کم عمری کے قدم قدم پر تصوف کی ممنون ہے، فن شعر جو ایشیائی ادب کا جزو اعظم ہے تصوف ہی کے سہارے اوج رفعت پر پہونچا ہے، حتیٰ کہ روزمرہ کی زندگی میں بھی مسائل تصوف بر دار و مدار ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اُردو میں تصوف کے متعلق کوئی مفید و مستقل تصنیف تو درکنار، فارسی کتابوں کا معقول و قابل فہم ترجمہ بھی موجود نہیں ہے۔ ہمارے مکرم جناب عبدالماجد صاحب بی۔ اے نے جب سے رمز شناسی کو فلسفہ دانی پر ترجیح دی اُن کے قلم سے اس مسئلہ پر متعدد مضامین شائع ہوئے، لیکن آج جس مضمون کے شائع کرنیکا فخر ہمیں حاصل ہے وہ محض ایک آرٹیکل نہیں بلکہ مستقل تصنیف

"تاریخ تصوف" کا ایک باب ہی جو باقساط جامعہ میں شائع ہوگا۔

مدیر

عربی میں تصوف کی قدیم ترین موجود کتاب کا نام کتاب اللمع ہی۔ جس سے ہم روشناس ہو چکے۔ فارسی میں تصوف کی قدیم ترین موجود کتاب کشف المحجوب ہی۔ کتاب اللمع آج سے چند سال قبل دنیا کے لیئے معدوم تھی، اور اب بھی مشرق کے لیئے اُس کا عدم اس کے وجود سے کچھ ہی بہتر ہی۔ خوش قسمتی سے کشف المحجوب اس حجاب گمنامی میں نہیں۔ داتا گنج بخش لاہوریؒ کا نام اکثروں کی زبان پر ہی، بالائی ہند کے بہ کثرت گھرانے ان ذات کے ساتھ عقیدتمندی کے مسکن ہیں۔ لاہور میں مدت ہوئی اصل فارسی نسخہ طبع ہو چکا ہی۔ اُردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہی۔ چند سال ہوئے سینٹ پیٹرسبرگ یونیورسٹی (روس) کے پروفیسر ژوکوفسکی کے زیر اہتمام کتاب یورپ میں چھپنے والی تھی، ممکن ہی چھپ چکی ہو۔ یہ سب کچھ ہی تاہم استفادہ کرنے والوں کا حلقہ اب بھی محدود ہی اور تصنیف و مصنف کے تعارف کرانے کی ضرورت باقی ہی۔

(۱) مصنف

مصنف علیہ الرحمۃ کا پورا اسم گرامی ابوالحسن علی بن عثمان بن علی الغزنوی الجلالی الہجویری اللاہوری ہی۔ ہندوستان میں عرف عام داتا گنج بخش مشہور ہی وطن غزنین تھا۔ مضافات غزنین میں ہجویر و جلاب دو قریہ ہیں۔ دونوں میں قیام رہا، آخر عمر میں لاہور میں سکونت اختیار فرمائی تھی۔ یہیں انتقال کیا۔ اور یہیں مدفون ہوئے۔ اس ساری نقل و حرکت کے اظہار کے لیئے نام کے ساتھ غزنوی۔ جلابی ہجویری لاہوری کا ضمیمہ لگا ہوا ہی۔

سید حسنی نے شجرۂ نسب بعض تذکروں میں یوں دیا ہی۔ علی بن سید عثمان بن سید علی بن عبدالرحمٰن بن شاہ شجاع بن ابوالحسن علی بن حسن اصغر بن سید زید شہید بن امام حسن بن علی مرتضیٰ۔ بیعت شیخ ابوالفضل بن حسن سے تھی۔ جو شیخ ابوالحسن حصری کے مرید تھے۔ شجرۂ طریقت سید الطایفہ جنید بغدادی تک پہونچتا ہی۔ متعدد دیگر مشائخ کبار سے بھی استفادہ کیا تھا

کشف المحجوب میں جابجا ان مشائخ کا ذکر کرتے ہیں۔ اور اپنے اور اُن کے تعلقات پر روشنی
ڈالتے جاتے ہیں، مثلاً امام ابوالعباس شقانی کے تذکرہ میں کہتے ہیں:۔

"مرا با وے اُنسے عظیم بود، ووی را بر من شفقت صادق، و اندر بعضے علوم استاد من بود"

(کشف المحجوب، مطبوعہ لاہور، ص ۱۲۱)

شیخ ابوالقاسم گرگانی اور اپنے تعلقات کے تذکروں میں ایک دلچسپ واقعہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"روزے من اندر پیش شیخ نشستہ بودم، و احوال ہا و نمودہائے خود را بر وی شمردم، بحکم آنکہ
روزگار خود بروے سرہ (؟) کنم، کہ ناقد وقت است، و وے بہ رغبتے آں از من می شنید
و مرا نخوت کودکی و آتش جوانی بر گفتار آں حریص می کرد، و خاطر بے صورت می بست کہ مگر
ایں پیر را در ابتدار دریں کوے گزرے نہ بودہ است کہ چندیں خضوع می کند اندر حق من
و نیاز می نماید۔ اندر باطن من آن بدید، و گفت اے دوست پدر (؟) بہ آنکہ ایں خضوع
من نہ با تراو حال تر است کہ محول احوال بر محل محال آید (؟) بلکہ ایں خضوع من محول احوال
را می کنم، و ایں عام باشد مر ہمہ طلاب را نہ خاص ترا۔ چوں ایں بشنیدم از دست بیفتادم،
وے اندر من بدید، و گفت اے پسر آدمی را بدایں طریقت نسبت بیش ازاں نبود کہ چوں وے را
بہ طریقت باز بندد۔ پندار یافت آں بگردد، چوں ازاں معزول کنندش بہ عبارت پندارش برسد۔ پس نفی و اثبات،
فقد و جود وے ہر دو پندار باشد، و آدمی ہرگز از بند پندار نرہد۔ وے را باید کہ درگاہ بندگی گیرد و
جملہ نسبتہا را از خود دفع کند بجز نسبت مردی و فرمانبرداری۔ و از بعد آں مرا با وے اسرار بسیار بود،
اگر بہ اظہار آیات وے مشغول گردم از مقصود بمانم۔" (ایضاً، ص ۱۲۲)

ایک جگہ خواجہ ابو احمد مظفر سے اپنی ملاقات کا حال لکھا ہے، وہ بھی ارباب حال کے لیے
اسی قدر دلچسپ ہے:۔

"روزے من اندر گرمائے گرم بہ نزدیک وے اندر آمدم با جامہ راہ و ژولیدہ موے، مرا گفت
یا ابا الحسن، ارادت حالے مرا گوے تا چیست۔ گفتم مرا سماع می باید۔ اندر حال کس فرستاد

تا قوالے یا در وند جالے تحرار از اہل حضرت - و آتش کودکی و قوت با دے و حرکت ابتدا مرا اندر سماع کلمات مضطرب کرد - چوں زمانے برآمد و سلطان و علیان آں طاقت اندر من کثر شد مرا گفت چگونہ بود مر ترا ایں سماع گفتم ایہا الشیخ سخت خوش بودم گفت وقتے بیاید کہ ایں و بانگ کلاغ ہر دو مر ترا یکساں شود - قوت سماع تا آنگاہ بود کہ مشاہدہ نہ باشد - چوں مشاہدہ حاصل آید ولایت سمع ناچیز شود - ذکر د ۹) تا ایں را عادت نہ کنی تا طبیعت نہ شود و بال ریداں بمانی'' (ایضاً ۱۲۳)

اسی طرح سلطان ابوسعید ابوالخیر، شیخ ابوالقاسم قشیری وغیرہ دیگر مشاہیر صوفیہ سے اپنی ملاقات کے تذکرے لکھے ہیں :-

حنفی المذہب تھے - امام ابوحنیفہ سے خاص عقیدت تھی - اُن کا نام "امام امامان و مقتدائے سُنیاں، شرف فقہا، و عز علما" کی حیثیت سے لیا ہے، اور اُن کے کمالات کا بیان تفصیل سے کیا ہے (ورق ۶۱) اس ضمن میں اپنا ایک خواب بھی تحریر فرماتے ہیں، جس کا اقتباس لطف و نفع سے خالی نہ ہوگا - فرماتے ہیں - کہ

"میں ملک شام میں تھا - ایک مرتبہ حضرت بلالؓ (موذن) کے مزار کے سرہانے سو گیا - خواب میں دیکھتا ہوں، کہ مکہ میں حاضر ہوں، اور پیغمبر خدا صلعم باب بنی شیبہ سے اندر داخل ہو رہے ہیں - اور اس طرح کہ کوئی کسی بچہ کو گود میں لیئے ہو، ایک مسن شخص کو اپنی گود میں لیئے ہوئے ہیں - میں دوڑتا ہوا حضور میں پہونچا، پاے اقدس کو بوسہ دیا، اور دل میں سوچنے لگا، کہ یہ مرد مسن کون ہیں - حضور صلعم کو میرے مضمر قلب پر اطلاع ہوگئی - ارشاد ہوا، کہ یہ شخص تیرا اور تیری قوم کا امام ہے، یعنی ابوحنیفہ - اس سے مجھے اپنے اور اپنی قوم کے حق میں بہت کچھ امیدیں ہوگئیں - اور اس خواب سے مجھ پر یہ بھی منکشف ہوگیا کہ ابوحنیفہ ان لوگوں میں ہیں جو اپنے صفات ذاتی سے خالی ہو چکے ہیں، اور محض احکام شرعی کے لیئے باقی ہیں، اس لیئے کہ اُن کے حامل رسول خدا صلعم تھے - اگر میں انھیں خود چلتے ہوئے

دیکھا معلوم ہوتا کہ وہ باقی بصفت ہیں۔ اور باقی الصفت کے لیئے خطا و صواب دونوں کا امکان ہے لیکن چونکہ انھیں رسول خدا صلعم کی گود میں دیکھا، اس سے معلوم ہوا کہ اُن کا وجود ذاتی فنا ہو چکا ہے اور اب جو ان کا وجود قائم ہے وہ رسول خدا صلعم کے وجود سے قائم ہے اور چونکہ رسول خدا صلعم کے لیئے کسی طرح کی خطا کا امکان نہیں اسلیئے جس کا وجود اُن میں فانی ہو چکا ہے وہ بھی امکان خطا سے پاک ہے (ایضاً ص۲۵۹)

سفر و سیاحت میں اکثر رہا کرتے تھے۔ شام سے لے کر ترکستان، اور ساحل سندھ سے لے کر بحر قزوین تک یعنی اپنے زمانہ کی تقریباً ساری اسلامی مملکت کی سیاحی کا ذکر کیا ہے۔ آذربائجان، بسطام، دمشق۔ رملہ۔ بیت الجن۔ طوس۔ ختنہ اور جبل السلام کے نام اپنے سفرناموں کے ذیل میں تصریح کے ساتھ لیئے ہیں۔ ایک مرتبہ دوران قیام عراق میں، معلوم ہوتا ہے کہ دولت بہت جمع ہو گئی تھی، اور اُس کے اسراف سے قرضداری کی نوبت آ گئی تھی۔ فرماتے ہیں:-

"وقتے من اندر دیار عراق اندر طلب دنیا و فنا کردن آں تاباکے می کردم (؟) و وام بسیار برآمدہ بود، ہر کسے راکہ بایستے بودے (؟)، رشے بمن آوردہ بودند، و من در رنج حصول ہوائے شان ماندہ بودم" (ص۲۶۸)

عرصہ تک پریشانی رہی۔ بالآخر ایک درویش کی موعظت کے اثر سے فراغت نصیب ہوئی۔ قید ازدواج سے غالباً ہمیشہ آزادی رہی۔ البتہ ایک مقام پر آپ بیتی یوں بیان کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید ایک مرتبہ کسی کے خدنگ نظر سے بسمل ہو گئے تھے، اور ایک سال تک اس زخم کی تڑپ نے بیتاب رکھا، بالآخر فضل ایزدی نے زخم کا مرہم بھی پیدا کر دیا عبارت اس قدر مبہم ہے کہ تفصیلات کا پتہ بالکل نہیں چلتا:-

"من کہ علی بن عثمان الجلابی ام از پس آنکہ مرا حق تعالےٰ یازدہ سال از آفت تزویج نگاہ داشتہ بود، ہم تقدیر کرد تا بفتنہ اندر افتادم۔ و ظاہر و باطنم اسیر صفتے یا شد کہ بامن کردند (؟) بے آنکہ رویت بودہ، و یکسال مستغرق آن بودم چنانچہ نزدیک بود، کہ دین برمن تباہ شود۔

تاحق تعالے بہ کمال لطف وتمام فضل خود، عصمت را بہ استقبال دل بیچارہ من فرستاد، وبہ رحمت خلاصی ارزانی داشت" (ص۲۸۵)

استعداد علمی کی تفصیل کسی تذکرہ میں درج نہیں۔ لیکن کشف المحجوب کی تصنیف خود اس امر کا واضح ثبوت ہے، کہ اُس کا مصنف علوم ظاہری میں تبحر رکھتا ہے بعض تذکروں میں اجمالاً صرف اس قدر ہے "جامع بود میاں علوم ظاہر و باطن" اور یہ یقیناً صحیح ہے۔

بعض تذکروں میں ہے، کہ لاہور اپنے مرشد کے حکم سے آئے۔ اور حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاؒ کے ایک ملفوظ میں تو ورود لاہور کی تفصیل بھی ملتی ہے۔ فوایدالفواد میں ہے کہ شیخ علی ہجویریؒ و شیخ حسین زنجانیؒ دونوں ایک ہی مرشد سے بیعت رکھتے تھے۔ شیخ حسین زنجانیؒ عرصہ سے لاہور میں سکونت رکھتے تھے۔ ایک روز شیخ علی ہجویری کو مرشد کا حکم ملا کہ لاہور میں سکونت اختیار کرو۔ عرض کیا کہ وہاں تو شیخ حسین پیشتر سے موجود ہیں" مکرر ارشاد ہوا کہ "تم جاؤ" تعمیل کی۔ شب میں لاہور پہونچے، اُسی شب میں شیخ حسین نے انتقال فرمایا، اور صبح اُن کا جنازہ اُٹھایا گیا[۱]۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ لاہور کو مرشد کے حکم سے اپنا مسکن بنایا تھا۔ لیکن خود کشف المحجوب کی ایک عبارت سے کچھ ایسا مترشح ہوتا ہے، کہ لاہور کا قیام مرضی کے خلاف کسی مجبوری سے تھا۔ فرماتے ہیں، کہ

"کتب من بہ حضرت غزنین ماندہ بود و من در دیار ہند در بلدہ لاہور کہ از مضافات ملتان است درمیان ناجنسان گرفتار شدہ بودم (ص۶)	میری کتابیں غزنین میں چھوٹ گئی ہیں اور میں ہندوستان میں شہر لاہور میں ناجنسوں کے درمیان گرفتار ہوں۔

اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ "گرفتاری" کا لفظ فقرہ بالا میں مجازاً استعمال کیا ہے، یا واقعۃً۔

عام لقب گنج بخش مشہور ہے، اس کی بابتہ یہ روایت ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ نے آپ کے مزار پر آکر چلہ کیا، اور اکتساب فیوض و برکات کے بعد جب رخصت ہونے لگے تو

---

[۱] فوایدالفواد، مرتبہ امیر حسن علاء سنجریؒ، ص۳۵ (مطبوعہ نولکشور)

مزار کے پاس کھڑے ہو کر یہ شعر پڑھا سے

گنج بخش ہر دو عالم مظہر نور خدا　　　کاملاں را پیر کامل ناقصاں را رہنما

اُس وقت سے گنج بخش کا لفظ عام زبانوں پر چڑھ گیا[۱]

سنہ وفات کے متعلق اختلاف ہے۔ صاحب نفحات الانس خاموش ہیں۔ صاحب سفینۃ الاولیا نے دو روایتیں دی ہیں۔ ایک ۴۵۶ھ اور دوسری ۴۶۴ھ کی بابت[۲]۔ آزاد بلگرامی نے ایک ضمنی موقع پر ۴۶۵ھ درج کیا ہے[۳]۔ نکلسن کا قیاس ہے کہ ۴۶۵ھ و ۴۶۹ھ کے درمیان وفات ہوئی[۴]۔ مزار پر جو قطعہ تاریخ کندہ ہے، اُس سے بھی ۴۶۵ھ ہی نکلتا ہے۔ راقم سطور کے نزدیک بھی اسی کو صحیح ماننا چاہیئے۔ مزار شہر لاہور کے باہر سمت غرب میں واقع ہے۔ ہر جمعرات و جمعہ کو زایروں اور حاجتمندوں کا ہجوم رہتا ہے۔ عام عقیدہ یہ ہے کہ چالیس روز متصل، یا چالیس شبہائے جمعہ کو طواف مزار کرنے سے ہر مشکل آسان اور ہر حاجت روا ہو جاتی ہے[۵]

اس قدر یقینی ہے کہ تصوف پر متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ لیکن آج ان تصانیف کا وجود تو الگ ہے ہا ان کے نام تک کسی تذکرہ میں محفوظ نہیں۔ صاحب سفینۃ الاولیا اس سے زیادہ نہ لکھ سکے کہ

"حضرت پیر علی ہجویری را تصانیف بسیار است"

البتہ خود کشف المحجوب میں مصنف نے جابجا اپنی دوسری تصانیف کے حوالے دیئے ہیں۔ ان عبارتوں کے یکجا کرنے سے تصانیف ذیل کا پتہ چلتا ہے ممکن ہے کہ ان کے علاوہ کچھ اور بھی ہوں۔ اس قدر تو بہرحال قطعی ہیں :۔

نام کتاب	عبارت کشف المحجوب
۱۔ دیوان	یکے آنکہ دیوان شعرم کسے بہ خواست (ص۱)

[۱] خزینۃ الاصفیا، غلام سرور لاہوری، جلد دوم ص۲۳۲　[۲] سفینۃ الاولیا، ص۱۶۵

[۳] مآثر الکرام ص۱ (نسخہ شائع کردہ عبداللہ خاں، حیدرآباد دکن)　[۴] مقدمہ ترجمۂ انگریزی کشف المحجوب

[۵] سفینۃ الاولیا، ص۱۶۵

۲۔ منہاج الدین

"دیگر کتابے تالیف کردم اندر طریق تصوف نام آں منہاج الدین (ص۔)، نیز "پیش ازیں کتابے ساختہ ام مرآں را منہاج الدین نام کرد اندر وے مناقب [اہل صفہ] یکےیک بتفصیل آوردہ" (ص۔)

نیز "اندر کتابے کہ کردہ ام بجز ایں منہاج نام" (ص۱۱۱)

۳۔ کتاب الفناء و البقا

"مرا ازیں جنس سخن است اندر کتاب فنا و بقا" (ص۔)

۴۔ اسرار الخرق و المؤنات

"مرا اندریں باب کتابے ست مفرد کہ نام آں اسرار الخرق و المؤنات (ص۔)

۵۔ کتاب البیان لاہل العیان

"من اندریں معنی تا حال ہدایت کتابے ساختہ ام و آں را کتاب البیان لاہل العیان نام کردہ شد (ص۱۹۵)

۶۔ بحر القلوب

"اندر بحر القلوب اندر باب جمع فصولے گفتہ ام" (ص۱۹۵)

۷۔ الرعایۃ لحقوق اللہ

"طالب ایں علم را ایں مسئلہ از کتاب دیگر باید طلبید کہ کردہ ام، و آں را الرعایۃ لحقوق اللہ نام کردہ" (ص۲۱۱)

ذیل کی عبارتوں میں دو کتابوں کے حوالے آتے ہیں، خدا معلوم اِن سے مراد کتب بالا ہی ہیں، یا یہ تصانیف ان کے علاوہ ہیں۔ نکلسن کا خیال ہے کہ یہ علٰحدہ تصانیف ہیں۔ اس حساب سے دو کتابوں کا اور اضافہ سمجھنا چاہیئے۔

۸ ۸۔ "پیش ازیں اندر شرح کلام وے [منصور حلاج] کتابے ساختہ ام" (ص۱۱۱)

۹ "من اندر بیان ایں (ایمان) کتابے کردہ جداگانہ (ص۲۱۵)

آج یہ سب کتابیں عنقا ہیں۔

مخدوم موصوف علیہ الرحمۃ کے مرتبہ کمال کا اعتراف سب کو رہا ہے۔ خواجہ خواجگان حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ اور شیخ المشائخ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ جیسے مسلم اکابر نے آپ کے مزار پر چلّے کھینچے ہیں، اور فیوض و برکات حاصل کیئے ہیں۔ باقی آئندہ

نامۂ "جوہر"

(۱)

بزرگانِ قوم کی بعض خصوصیات جو دلیل بزرگی اور وجۂ عظمت ہیں قوم کے سامنے اُن کی حیات میں نہیں آتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اکثر اکابر ملت کی زندگی میں ان کے کارناموں کا صرف ایک ہی رُخ نظر آتا ہے اور موت کے بعد لوگوں کو جستجو ہوتی ہے کہ کسی طرح اس بزرگ کی زندگی کے متعلق جس قدر معلومات حاصل ہو سکے فراہم ہو جائے۔ مکتوبات شائع کیے جاتے ہیں، احباب و رفقاء کی یادداشتوں سے کام لیا جاتا ہے، تصنیفات اور تالیفات کی اشاعت کی فکر ہوتی ہے، لیکن جن بزرگوں کی حیات میں علاوہ دیگر کارناموں کے متعلق اس قسم کی معلومات بھی فراہم ہو جائے تو اس کو اُن کی اور قوم دونوں کی خوش قسمتی سمجھنا چاہیئے۔ اگلی اس لیے کہ ان کی زندگی کے متعلق غلط فہمی کی گنجائش نہیں رہتی اور قوم کی اس لیے کہ وہ ان سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتی ہے:۔

"ہم اس مکتوب گرامی کی اشاعت اپنے مکرم جناب عبدالماجد صاحب بی۔ اے کی عنایت سے کر رہے ہیں اور امید ہے کہ یہ سلسلہ کچھ دنوں جاری رہے گا۔" مدیر

چھندواڑہ ۱۶ اگست ۱۹۱۶ء

مکرمی۔ السلام علیکم۔ عنایت نامہ مورخہ ۹ اگست چند روز ہوئے ملا۔ مجھے تو خوف تھا کہ کہیں آپ میری تنقید سے ناراض نہ ہو جائیں[۱] مگر نیت بخیر تھی اور جانبین کو صرف اصلاح مطلوب تھی نہ کہ

---

[۱] مکتوب الیہ کا انگریزی رسالہ سائی کالوجی آف لیڈر شپ ۱۹۱۵ء کے آخر میں انگلستان میں شائع ہوا ہے، جون ۱۹۱۶ء میں حضرت جوہر کی نظر سے زمانۂ نظر بندی چھندواڑہ میں گزرا ہے، اور انھوں نے اس پر ایک مبسوط اور پُر زور تنقید اپنے عنایت نامہ میں لکھ کر مصنف کو بھیجی ہے، جس میں زیادہ تر گرفتیں مذہبی نقطۂ نظر سے ہیں۔ مکتوب الیہ نے اس کے لیے شکریہ لکھ کر بھیجا ہے، اور ضمناً بعض مسائل کی مزید توضیح کی ہے۔ یہ مکتوب گرامی اسی کے جواب میں ہے، اس کے قبل کے عنایت نامہ افسوس ہے کہ انگریزی زبان میں ہیں، مکتوب الیہ کے پاس اب تک محفوظ ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ترجمہ میں ان کا پورا لطف باقی نہیں رہ سکتا۔

افساد اس لیے میرا خیال صحیح نکلا کہ آپ کو ایک سچی اور دلسوزی کی تنقید محض تقلیدی تعریف و
توصیف سے زیادہ پسند ہوگی۔ عریضہ نہایت ہی مفصل تھا مگر پھر بھی اگر ہم دونوں ساتھ ہوتے
تو جزئیات کے متعلق بھی بہت کچھ عرض کرسکتا اس زمانہ میں استبداد و استعباد نے جن کا آپ نے
ذکر کیا ہے دو لفظ گھڑ لئے ہیں (Construotive اور Destructive) یعنی تعمیری و تخریبی) اور اس میں سے
موخر الذکر کو تو ہر سچی تنقید کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور مقدم الذکر کو اُس عنقا صفت تنقید کے لئے
سینت کر رکھا ہے جو آج تک نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کبھی کانوں نے سُنا اور جو نہ کسی متنفس کے دل و دماغ
میں کبھی ایک لمحہ کے لیئے بھی جاگزیں ہوا حالانکہ اگر فن نقادی کو صحیح طور پر دیکھا جائے تو اس کا
اولین فرض ہوتا ہے کہ اس قصر سر بفلک کی تعمیر کے لیے جس کا نقشہ اس کے تصور ہی میں ہوتا ہے
(یا کہیں کہیں کسی شاعر یا فلسفی یا ادیب کے کلام میں بھی کوئی محراب یا گنبد نظر آجاتا ہے) زمین کو صاف
کرے اور آس پاس کے بوسیدہ مکانات بدنما جھونپڑے اور تنگ و تاریک بے قاعدہ گلیاں
وہاں سے دور کردے بہرحال تعمیر سے پہلے تخریب تیغ زنی بہت کرنا ہی پڑتی ہے اگر استبداد کے عام
اعتراض میں کوئی اصلیت ہے تو محض اس قدر کہ تخریب صرف تخریب کی غرض سے نہ ہو بلکہ تعمیر کا
پیش خیمہ ہو سو میں نے جو کچھ بھی لکھا اسی غرض سے لکھا تھا کہ جب کبھی نظر ثانی کا موقع آئے تو آخری
فیصلہ کرتے وقت میرے پراگندہ خیالات میں سے جو ضروری اور مفید معلوم ہوں پیش نظر رکھے جائیں،

پیغمبر اسلام (روحی فداک یا رسول اللہ) کے متعلق ظاہر ہے کہ آپ ان کو اتنا بڑا پیشوا مانتے
ہیں اور کتاب کے ہر پڑھنے والے سے بھی منوانا چاہتے ہیں جتنا کہ کوئی پیشوا ہو گزرا ہو جس کی نظیر
کتاب میں موجود ہے[1] ورنہ ایک مسلمان کو کچھ بھی ضرورت نہ تھی کہ جہاں نپولین وغیرہ کا موازنہ کیا گیا
ہو وہاں ذکر حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم بھی کیا جائے آج کل کی سیاست بین الاقوامی کی اصطلاح

ے[1] کتاب مذکور میں جہاں جہاں قائدین عظام یعنی بڑے بڑے لیڈروں کی مثالیں درج کی گئی تھیں وہاں مصنف نے
اپنی جہالت سے حضور سرور عالم صلعم کا اسم پاک بھی درج کیا تھا اور اگرچہ حضورؐ کی ذات گرامی کو سب سے افضل قرار دیا
گیا تھا تاہم اسی طبقہ میں نپولین، سکندر وغیرہ دنیوی سرداروں کا بھی ذکر تھا۔

یہ آپ کا رہنا بھی ایک ایسی کتاب کے لکھنے میں جسے ہر ملت و مذہب والا پڑھے قرین مصلحت
تھا میں نے اس خیال (Conception) پر ہرگز اعتراض نہیں کیا ہے اگر اعتراض ہے تو محض طرزِ عمل
(Execution) پر۔ اب چونکہ خود آپ کی تحریر سے واضح ہو گیا کہ آپ ہی چاہتے تھے جو میں سمجھا تھا
کہ آپ چاہتے ہونگے اس لئے میری تنقید کی نوعیت بھی واضح تر ہو گئی اور وہ اسی طرح باقی ہے یعنی
ایک عام پڑھنے والے پر آپ کے الفاظ اور جملوں کا اور نیز ان موقعوں کا جن پر تذکرہ آنحضرت صلعم
کیا گیا ہے ایک حد تک ضرور یہ اثر پڑتا ہے کہ وہ باربار غور کرے کہ کہیں آپ آنحضرت صلعم کو مارگولیتھ
(یہ میری بدنصیبی تھی کہ آکسفورڈ میں جب میرا ارادہ تحقیق (Research) کی ڈگری لینے کا تھا تو
یہ میرے رہنما مقرر کئے گئے تھے اس کے علاوہ پیشتر بھی کچھ عربی ان سے پڑھی تھی) وغیرہ کی طرح
ایک چلتا ہوا لیڈر تو ثابت نہیں کرنا چاہتے۔ چونکہ یہ کام آپ کا نہ مفہوم ہو سکتا تھا نہ ہے اس لئے
میری یہ توقع بھی بیجا نہیں کہ آپ اپنی تصنیف کو ایک بار اس شبہ کو دل میں جگہ دے کر پڑھیں کہ مصنف
کوئی غیر مذہب والا ہے جو مسلمانوں کو یا کم از کم غیر مسلموں کو تو ضلالت کی طرف آہستہ آہستہ لے جانا
چاہتا ہے تا کہ وہ عظمت جو ایک وحی پانے والے رسول کی ان کے دل میں ہو وہ دور ہو جائے اور
اس طرح دور ہو کہ خود پڑھنے والوں کو بھی اس تبدیلی خیالات کا احساس نہ ہونے پائے اور اس لئے
بطور ایک "بئس البدل" کے خلعت نبوت اُتار کر لیڈری کی گون (Gown) پہنا دی ہے یہ ہرگز
آپ کا خیال نہ تھا نہ ہے نہ ہو سکتا ہے مگر جس طرح سے حساب میں بچے اپنے سوالوں کے جوابات کی جانچ
کرتے ہیں کہ تقسیم کا ہے تو ضرب دے کر دیکھتے ہیں اور تفریق کا ہے تو جمع کر کے اسی طرح ایک پڑھنے
والے کے جذبات اور اس کے دل پر جو اثرات پیدا ہو سکتے ہیں ان کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ
اس سلسلۂ تاثر کو اولٹ دیا جائے اور جو تنقید کہ ایک نقاد پیش کرتا ہو اس کو صحیح تسلیم کر کے اور
جو اثر کہ آخر کار پڑھنے والوں کے دل پر بقول اُس کے پڑنا ممکن یا اغلب ہو اُسے قبول کر کے
پھر کتاب کو پڑھا جائے اور دیکھا جائے کہ جو نقوش پڑھنے سے پیشتر ہی دل پر منقش ہو گئے تھے
باقی رہتے ہیں یا مٹ جاتے ہیں یہ بھی یاد رہے کہ گھڑی ساز جو گھڑی کے کسی ٹوٹے ہوئے پرزے کو

سنبھالنا چاہتا تو خوردبین شیشہ لگا لیتا ہے جس سے نقص اصلیت سے کہیں بڑا معلوم ہوتا ہے یہ اس غرض سے کہ باریک سے باریک نقص بھی صاف نظر آجائے اور اصلاح کی جاسکے۔ اچھے سے اچھا نقاد بھی اکثر اسی غرض سے مبالغہ سے کام لیتا ہے اور عوام سے کہیں زیادہ اُسے لطیف اور باریک بین بننا پڑتا ہے چونکہ غرض اصلاح ہے نہ کہ افساد اس لیئے یہ بال کی کھال نکالنا اُس کے لیئے جائز ہی نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ اس کے لیئے اصرار کرنا چاہیئے اسی وجہ سے میں نے بھی اس تنقید میں مبالغہ سے کام لیا ہے اور مصر ہوں کہ آپ خود اس سے بھی زیادہ مبالغہ سے کام لیں جوہری جب نگین تراشنے میں مصروف ہوتا ہے تو زیادہ وقت اس کا اس تراشش خراش میں صرف نہیں ہوتا جو عوام کو نظر آسکے بلکہ ایسے باریک اصلاح میں جس کا نظر آنا تقریباً ناممکن ہے اور جو کچھ وہ گھنٹوں کی محنت میں تراشتا ہے وہ نہایت باریک خاک کے چند ذرّے ہوتے ہیں جو تراشتے تراشتے ہی ہوا سے اُڑتی ہے مصنف کسی طرح جوہر فروش سے کم نہیں اور اس سے زیادہ باریک بین نقاد اُس کی تصنیف کا اور کوئی نہ ہونا چاہیئے فلسفۂ اجتماع کب تیار ہوئی؟ افسوس ہے کہ انجمن ترقی اُردو اپنی طرف سے شائع کردہ کتابوں کا کافی اشتہار نہیں دیتی، اُسے چاہیئے کہ اگر کسی کتاب پر ایک ہزار روپیہ صرف کرے تو کم از کم ۲۵۰ روپیہ اس کے متعلق اشتہاروں پر بھی صرف کرے۔ اخبار والے اُس کے ساتھ ضرور رعایت کریں گے میں نے خود ہمدرد میں یہی کیا تھا مگر خود انجمن کے کارکن اس معاملہ میں تساہل برتتے تھے آپ بیسویں صدی کی اس ضرورت اور Psychology of the Advertise پر عبدالحق صاحب کو ضرور کچھ لکھیے۔

نفسیات القرآن[۲] پر آپ نے جو لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے اُس کے متعلق کیا پوچھ سکتا ہوں کہ

---

[۱] مکتوب الیہ کی اردو کتاب کا نام ہے، جو اسی قسم کی مزخرفات سے لبریز تھی، اور جس کی اشاعت اب اس نے دو تین سال سے روک دی ہے۔

[۲] مکتوب الیہ کا ارادہ اُس وقت انگریزی میں ایک دوسری کتاب Psychology of the Quran تیار کرنے کا تھا، بلکہ اس کا ابتدائی حصہ تحریر بھی ہو چکا تھا۔

"علم کا نقطہ" اور "تخمینہ" (بہ اصطلاح تعبیرات) کیا ہی میں جانتا ہوں کہ آپ مجھ سے ناراض ہونگے
زیادہ سے زیادہ سیاسی ریڈیکل کے جسم میں ایک مذہبی دقیانوسی کی روح رکھنے والا سمجھیں گے اگر میں
عرض کروں کہ بقول حالی؎ "یاں جنبشِ لب خارج از آہنگ خطا ہی" جو کچھ بھی لکھا جائے
وہ یہ سمجھ کر کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں۔ محاورہ انسانی ہی مگر اس کی تمام (Psychology) خلاق زمین و
آسمان کی ہی غالباً آپ نفسیات القرآن سے یہ ثابت کرنا چاہیں کہ بڑے سے بڑا Psychologist
بھی اس طرح انسانی نفسیات کے اسرار و نکات سے نہ واقف ہو سکتا ہی نہ اُن کے املا کے لیئے الفاظ
اور ترکیبیں اور فقرے کسی زبان میں پا سکتا ہی جس طرح خود اُس ذات پاک نے قرآن کریم میں ظاہر فرما دیا
عالم الغیب والشہادہ اور انسان کا پیدا کرنے والا ہی اگر آپ کا یہ خیال ہی تو میدان نہایت وسیع ہی
مگر رہرو کو ہر قدم پھونک پھونک کر اُٹھانا پڑتا ہی میں ہرگز اُن لوگوں کے طرفداروں میں نہیں ہوں
جو کلام ربانی سے اس قدر خائف ہو جائیں کہ نہ اُسے کبھی سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کریں نہ اس کے
متعلق کچھ سوچیں نہ پوچھیں گچھیں، کلام پاک ریشم کے جزدانوں میں اور الماری کے بالاترین حصوں
میں اور وہاں کی گرد و غبار کے لیئے آسمان سے نازل نہیں ہوا تھا میں چاہتا ہوں کہ قرآن پاک کا
ہر ایک نسخہ اس کثرت سے مستعمل ہو کہ پنسل کے نشان۔ کاغذ کی پٹیاں بین الاوراق یہاں تک کہ انگوٹھے
اور انگلیوں کے نشان ہر جگہ نظر آئیں اور ثابت کر دیں کہ اس کتاب سے زیادہ اس کے ماننے والے
کسی کتاب کو نہیں پڑھتے نہ اس سے زیادہ کسی کتاب کے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر مجھے اُن لوگوں
سے ہمدردی ضرور ہی جو قرآن کو نہایت احتیاط و اہتمام کے ساتھ چھوتے ہیں گو برس دو برس میں
ایک ہی دفعہ کیوں نہو، یہ اُمّ الکتاب ہی اور اس کا ادب باقی رکھنا اس لیے لازم ہی کہ اگر اتنی احتیاط
نہ برتی جائے تو تحریف کا اندیشہ ہی اور تمام صحف ماقبل اس خطرہ کے بیجا نہ ہونے کا کافی سے زیادہ
اور سخت دلخراش ثبوت ہیں اس لیئے ایک صاحب نے جب ایک ترجمہ بلا متن میرے پاس ریویو
کے لیئے بھیجا تو میں نے انہیں اطلاع دے دی کہ مجھے ایندھن کی آج کل ضرورت نہیں ہی کیا مسلمانوں
کے لیے یہ بات مایۂ ناز نہیں کہ تیرہ سو برس سے زیادہ عرصہ گزر گیا مگر مسلمانوں نے اس اُمّ الکتاب

کو اس احتیاط سے رکھا کہ آج تک ایک نقطہ یا حرف تو کجا ایک زیر و زبر کا بھی فرق نہیں ہونے پایا اور تمام فرقے اس پر اتفاق کلّی کرتے ہیں قرآن پاک تو قرآن پاک دوسرے صحائف ہمارے کتب حدیث کی تحقیق و تدقیق اور صحت و حفاظت کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے قصہ مختصر مجھے اُمید ہے کہ جو کچھ بھی آپ لکھیں گے وہ آداب قرآن کو ہر طرح ملحوظ رکھیں گے مگر لکھیے ضرور اس سے ہرگز نہ خائف ہوجئے یہ تو ایسی سیدھی سادی کتاب (غیرِ ذی عوج) ہے کہ عرب کے گنوار مدینۂ منورہ جاتے اور نبی اکرمؐ سے اسے سُنتے اور ہم سے کہیں زیادہ سچے مسلمان بن کر اپنے بالوں والے خیموں اور اپنے ریگستان اور گلّوں میں واپس آجاتے مفسرین کا جہاں شکریہ ادا کرنا ہے وہاں یہ شکایت بھی باقی ہے کہ باوجود سچی محبت اور احترام کے انھوں نے بھی ایک حساب سے داب قرآن پاک قائم نہ رکھا جو کچھ لکھا وہ زیادہ تر اس نیت سے کہ اپنا کمال تمام اس صحیفۂ اکرم پر صرف کر دیں مگر بعض اوقات یہ بھول گئے کہ کہیں حاشیہ متن کو اپنے بوجھ اور پھیلاؤ سے چھپا اور دبا نہ لے یہی حال شیکسپیر کے جرمن شارحین کا ہے ان کا ساری دُنیا پر احسان ضرور ہے کہ شیکسپیر کو خود اس کے ہموطنوں کے تغافل سے نجات دی مگر اب تو بعض نے شیکسپیر کو محض اپنی مضمون آفرینی کا آلہ بنا لیا ہے خدا مسلمانوں کو قرآن پاک متعلق اس شر سے بچائے[۱] آمین۔

"آپ میری شاعری کا کیا پوچھتے ہیں۔ بچپن میں تو بہت سے سامان ایسے بہم ہوگئے تھے کہ میں آج زلف و ابرو کی تعریف میں خاصے شعر نکال لیا کرتا رام پور میں اُس زمانہ میں پیدا ہوا تھا۔ جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا، داغ، امیر، تسلیم، جلال، عروج، دہلی اور لکھنؤ کے آسمانوں کے ٹوٹے ہوئے ستارے سب رام پور کے آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے، خود میرے خاندان میں بھی شعر گوئی کا ذوق ہوا تین چار عزیز اُستاد داغ کے شاگرد ہوئے جن میں ایک میرے حقیقی بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر اور میرے چچا زاد بھائی اور خسر عظمت علی خاں صاحب

---

[۱] ان اشارات و مواعظ عالیہ کی قدر مکتوب الیہ کو ان کے وقت تحریر سے ۱۰-۲۰ سال بعد جا کر ہوئی۔

اور ان کے بھائی حافظ احمد علی صاحب شوق شامل تھے گھر پر بارہا مشاعرہ ہوا، پھر داغ کو
نواب کلب علی خاں صاحب مرحوم نے جن کی نظر ہمیشہ کفایت شعاری پر رہتی تھی ازراہ پرورش
سرکاری اصطبل کا داروغہ بھی کر دیا تھا، تاکہ وظیفہ محض کار بیکاران کی نذر نہ ہو، یہ میرے مکان
کے عقب میں تھا، اس لیئے روز ان کی زیارت یوں ہی ہو جاتی تھی، اور اب اُس بذلہ سنج
کے شعر کا لطف اٹھاتا ہوں۔ جس نے داغ کے اس تقرر پر کہا تھا (ممکن ہے کہ تاریخ بھی ہو)
آیا دہلی سے ایک مُشکی خر ؏ آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا، داغ کی غزل دیکھئے ؎

آج رخصت جہاں سے داغ ہوا ؏ خانۂ عشق بے چراغ ہوا

اس پر مستزاد یہ کہ ذوالفقار روزانہ داغ کے گھر جاتے تھے جو ہمارے مکان سے دور
تھا، اور مجھے بھی لے جاتے تھے۔
داغ نے پہلے دن پوچھا کہ کچھ شعر بھی یاد ہیں میری عمر بہت ہی کم تھی، مگر بھائی نے
کچھ شعر یاد کرا دیئے تھے، جنھیں میں نہایت زور اور شان سے کڑک کر پڑھا کرتا تھا، میں نے
داغ ہی کے چند شعر انھیں سنا دیئے سُن کر پھڑک اُٹھے۔ اور اُس کے بعد ہمیشہ اصرار رہا، کہ
اُس بچہ کو ضرور لایا کرو۔ جناب والا اس کے بعد اگر میں یہ دعویٰ کروں۔ کہ شعر و سخن کی گود
میں پلا ہوں۔ تو بیجا نہ ہوگا۔ مگر میرا دعویٰ تو اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے، سُنیئے، میں نہ صرف شعر و
سخن کی گود میں پلا ہوں۔ بلکہ اُس کی توند پر کودا ہوں۔ اُسے ہاتھی بنا کر پیٹھ پر سوار ہوا ہوں۔ غرض
کوئی بے ادبی یا گستاخی باقی نہیں رہی ہے جو میں نے شعر و سخن کی شان میں نہ کی ہو۔
میری پیدائش ۱۸۸۱ء کے اواخر کی ہے۔ میں نے دس برس ہی کی عمر میں بہت سے لغو و
فضول شعر مگر بامعنی اور موزوں کہے تھے اور اچھا ہوا کہ اب کسی کو یاد نہیں ورنہ جب میرے
Official Biography (یعنی گورنمنٹ کی طرف سے نہیں بلکہ بقول آپ کے میری "امت"
کی طرف سے) لکھنے کا وقت آتا۔ تو میرے سیرۃ نگار کو سخت مشکل کا سامنا ہوتا کہ اس لچر پوچ کو ردی وال

بلکہ آتشدان کے نذر کیا جائے۔ یا سیرۃ چھوڑے قوم و ملک میں جگہ دی جائے۔ ہمدرد کے ایڈیٹر جن کا چند ماہ کے بعد ہی انتقال یکایک ہو گیا، تو ہمدرد میں سے ایک چڑیا چڑوسنٹے کی کہانی کو بھی (جو محض امتحاناً درج کی گئی تھی) خارج کر دیا تھا اور اعتراض کیا گیا تو لکھا کہ بھائی یہ تو چڑیا چڑوسنٹے ہی کی کہانی اور مطلب بھی صاف معلوم ہوتا ہے، مگر ہمدرد والوں سے ڈر ہی لگتا ہے۔ اور روٹی کا معاملہ ہے، نہ معلوم اس میں بھی کچھ زہر پھیر دیا ہو، اور جوابدہی ہمارے سر آ پڑے۔

آپ نفسیات کے ماہر ہیں، کیا ممکن نہیں کہ میرا لچنے والا سیرۃ نگار باوجود نقادِ سخن ہونے کے محض بطل پرستی کے باعث یہ خیال کرنے لگتا۔ کہ نہ معلوم کیا کیا اسرار اس بظاہر لچر پوچ میں پوشیدہ ہیں۔ اور آنے والی نسلیں ممکن ہے کہ اس سے بھی زیادہ روشن ضمیر ہوں اور ان اسرار سے واقف ہو کر دنیا کو نئے نئے معلومات اور عجیب عجیب انکشافات سے مالا مال کر دیں۔ اس لیئے بہتر ہے کہ انہیں داخل ہی کر دو۔ اور اسی طرح ہمیشہ کے لیئے میری پوچ گوئی باقی رہتی اور قیامت کے دن اُستاد و تیغ میرا دامن پکڑتے کہ خود بھی بدنام ہوئے اور ہمیں بھی بدنام کیا۔ خیر اب سُنیئے کہ گیارہ برس کی عمر میں میں علیگڑھ گیا۔ ایک بڑے بھائی نے میری موزوں گوئی کا ذکر مولانا شبلی مرحوم سے کیا۔ دوسرے نے میرے حافظہ کی تعریف کی کہ "المامون میز پر رکھا تھا۔ اُٹھا کر پڑھنے لگا اور ایک دن میں نے امین کے قتل پر جو مرثیہ ہے۔ اُس کا ایک شعر عربی کا پڑھا۔ تو اُس کا مجھے ترجمہ سُنا دیا۔ حالانکہ عربی سے بالکل ناواقف ہے۔" مولانا کو یقین نہ آیا۔ اور امتحان کی غرض سے ہم بلائے گئے پہلے مامون کی اولاد کی فہرست مانگی۔ پھر اُس کا حلیہ پوچھا۔ جب اس میں پاس ہو گئے تو ایک مصرعہ طرح اُسی وقت دیا۔ اور کہا کہ شعر لکھو۔ چیزے از قسم لچر پوچ اُسی وقت تیار ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ مولانا مرحوم پر تو جو سکہ بیٹھ گیا تھا وہ اسی لچر پوچ کا تھا۔ میں اسکول ہی میں تھا کہ ایک نظم انعامی میں نے بھی لکھی۔ اور مولانا حکم ٹھہرے۔ انعام تو ایک کہنہ مشق بزرگ کو ملا۔ مگر ہمارے لچر گوئی کا بھی خاصہ شہرہ ہوا۔ اکثر ایسا ہوا کہ ذوالفقار بھائی نے کوئی نظم لکھ دی۔ اور ہم نے اپنی طرف سے پڑھ دی۔ مگر جب عمر ذرا زیادہ ہوئی۔ تو امتحانوں نے فرصت نہ دی۔ کالج میں

البتہ دونوں سال سجاد حیدر کی صحبت میں شعر و سخن کا چرچا رہا۔ پہلے بھی جب ہم لوگ انٹرنس میں تھے
تو ایک نظم تین شعرائے باکمال نے حاجی اسمٰعیل خاں صاحب (تربیت الدجاج و یونین جیک والے)
کی دعوت کے شکریہ میں تیار کی تھی' ان میں سے ایک یہ خاکسار تھا۔ ایک سجاد حیدر صاحب اور
ایک سید وزیر حسین صاحب آنریبل و آزمودہ کار سکرٹری مسلم لیگ کے برادر "اصغر" خیر
یہ سال آخری کالج میں خوب گزر گیا۔ اور وہ مشاعرہ جسے بعدہ حسرت نے رونق بخشی ہم لوگوں
ہی کا ایجاد کردہ تھا۔ چودہویں کو ہوا کرتا تھا۔ اور شمع پیش نہ کی جاتی تھی' کرکٹ کا لان جائے
مشاعرہ تھا۔ ایک بار چودہویں کو بارش ہوگئی تو تین چار دن مطلع صاف ہونے کی راہ دیکھ کر
ڈائننگ ہال میں کیا گیا۔ اس وقت میں نے اپنی ایک غیر طرح میں اس شعر کا بھی اضافہ کر دیا ہے

فرش پر مر دیں ہیں وہ چاندنی نہیں
لطف مشاعرہ تو گیا چودہویں کے ساتھ

علی گڑھ کالج میں شاعری تو کچھ کی مگر وہی فرضی معشوق۔ اگر کچھ اصلیت تھی بھی تو اتنی ہی جتنی ایران
کی شاعری کو اور "سبزۂ خط" وغیرہ کو ایک حد تک بامعنی کر دیتی ہے۔ کالج چھوڑا تو ولایت جانا ہوا
یہاں البتہ شاہدان اصلی کی کمی نہ تھی۔ مگر ذوق نظارۂ جمال لاکھ سہی اور گرہ میں مال بھی سہی تاہم
طبیعت کا میلان خلاف دستور عام زہد و تورع کی طرف تھا۔ دو برس کے قریب تو ہندوستان
کے کچے دھاگے نے باندھے رکھا۔ دو برس کسی اور کے خیال نے مگر یہ آخری خیال بھی باعصمت
تھا اور محض حالات گرد و پیش کا تقاضا اس کا محرک تھا۔ جب ان سب تجربوں کے بعد "کیڑے بچائے
گھر کو آئے" تو تاہل کی زندگی بال بچوں کے خیال نے شاعری سے مستغنی نہیں تو غافل ضرور کر دیا
گزشتہ چند سالوں میں اگر کچھ ترشح شاعری کا ہوا۔ تو وہی قومی مرثیہ مگر زیادہ تر رسمی۔ البتہ پچھلے
دو تین برس میں عشق حقیقی رنگ لایا ہے۔ اور تغزل کا زور ہے۔ یہ اپنی تنگ آبی ہے کہ سوائے چار پانچ
غزلوں کے اس فرصت کے زمانہ میں بھی کچھ نہ لکھ سکا۔ لکھنے کے لئے نہ بیٹھتا ہوں نہ کوشش کرتا ہوں
مگر جب طبیعت پر خود ہی کسی بیرونی تحریک کا غلبہ ہوتا ہے۔ تو بغایت مجبوری کہہ لیتا ہوں۔ اور یہی
ایک ذریعہ (علاوہ تلاوت قرآن پاک کے) تسکین قلب کا رہ گیا ہے۔ چونکہ آپ کا اصرار ہے۔

کہ پوری غزلیں لکھ بھیجوں۔ اس لیے یہ لکھے بھیجتا ہوں Touch stone کی معشوقہ سے
زیادہ قابل قدر نہیں A poor thing but mine own اب رخصت ہوتا ہوں اور
تضیع اوقات کی معافی کا خواستگار ہوں (غزلیں درج ہیں) یہ چند اشعار ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ
بقول آپ کے میری "امت" ان سے کچھ تسکین پائے۔ بہرحال خود مجھے ضرور کچھ نہ کچھ تسکین ہو جاتی
ہے۔ مگر ان کو لٹریچر سے کیا تعلق یہ صرف اپنی دست افشانی اور پاکوبی کے لیئے ہیں۔"

دولت موریہ

دولت موریہ کا آغاز کیونکر ہوا

۱۔ سکندر رومی کے حملے سے جو بے ربطی و توزیت کے عناصر پیدا ہو گئے تھے وہ ایک زبردست شہنشاہی کے بال و پر بن گئے جس نے دو سو برس تک ہندوستان پر نہایت سطوت و جبروت سے حکومت کی۔ دولت نندہ کا غیر مستقل اور زوال آمادہ نظام اُس طوائف الملوکی کی تاب نہ لا سکا جو رومی حملے سے پیدا ہوئی تھی اور بدنظمی کے پھیلتے ہی خاندان نندہ خیال باطل کی طرح منتشر رہ گیا لیکن قدرت نے اس عام بدنظمی اور بے ربطی میں ایک ایسا بے وطن مشکل پسند شخص پیدا کیا جس نے منتشر قوم کی شیرازہ بندی کی اُس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُس نے سکندر کی فوج میں رہ کر مرتب و مستعد لشکر کے فائدے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اُس نے محمد علی پاشا کی طرح محسوس کیا تھا کہ بڑی سلطنتیں جن کا نظام بے ربط ہو آسانی سے دشمن کا شکار بن جاتی ہیں۔ خوش قسمتی سے اس کا وزیر چانکیا۔ دور اندیش اور ہوشیار مدبر تھا جسکی مدد سے اس اولوالعزم نوجوان نے ایک لشکر ترتیب دے کر شاہان نندہ کے دارالامارت پٹالی پتر پر قبضہ کر لیا۔ سلطنت موریہ کے قیام سے (یعنی ۳۲۲ء ق۔م سے) ہندوستان کی سیاسی تاریخ حقیقی معنوں میں شروع ہوتی ہے۔

چندر گپت

۲۔ چندر گپت معمولی بادشاہ نہ تھا سکندر کے حملے کے نتائج اُس کے ذہن سے محو نہ ہوئے تھے بادشاہ ہوتے ہی اُس نے ایک زبردست لشکر تیار کر کے شمال ہند پر قبضہ کر لیا۔ اُس کی کامیابی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ ۳۰۵ء ق۔م میں جب سلوکس نیکاتار

سلوکس کا حملہ اور اسکی شکست

(فاتح) نے جو سکندر کے ممتاز افسروں میں تھا اور جس نے سکندر کے ایشیائی مقبوضات کو بآسانی فتح کر لیا تھا اپنے نامور آقا کے نقش قدم پر چلنے کے ارادہ سے دریائے سندھ پار کیا تو ایک جرار ہندی لشکر اُس کے مقابلہ کے لئے دریائے سندھ کے دوسرے کنارے پر موجود تھا جس نے اچھی طرح اُسے اس گستاخی کی سزا دی اور بالآخر

سلوکس کو اریانہ (دریائے سندھ کا مغربی علاقہ) ہاتھ اُٹھا لینا پڑا اور پانچسو ہاتھیوں کے حقیر معاوضے میں کابل قندہار اور ہرات کے صوبے ہندی تاجدار کے نذر کرنا پڑے مزید براں سلوکس کو مجبوراً اپنی لڑکی کا عقد چندر گپت کے ساتھ کرنا پڑا۔ چندر گپت کے بلند دماغ ہونے کی یہ دلیل کیا کم ہے کہ بائیس برس کی قلیل مدت میں جو سکندر رومی اور سلوکس کے حملوں کا فصل ہے اس نے شمالی ہند کا نظام سیاسی ٹھیک کر لیا اور ایسی فوج تیار کر لی جس سے سلوکس کی یونانی فوج پیش نہ پا سکی۔

ہندی شہنشاہی کے حدود اربعہ

۳۔ یہ امر قابل غور ہے کہ پہلی ہندی سلطنت کے حدود قندہار اور ہرات تک پھیلے ہوئے تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہان ہند کی خواہش جہاں ہندوستان کے عقلی و فطری حدود پر ختم ہوتی تھی جیسا کہ شاہان مغل اور موریہ کے عہدوں میں کابل اور قندہار کے سرحدی صوبے ہونے سے ثابت ہوتا ہے۔

چندر گپت کا تدبر اور سیاست

۴۔ خوش قسمتی سے چندر گپت کے عہد کی دو تصنیفیں موجود ہیں جن سے اس کے تدبر و سیاست کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ان میں سے ایک اس کے ہوشیار برہمن وزیر اور گرو کی عجیب و غریب تصنیف ہے۔

ارتھا شاستر

یہ کتاب ارتھا شاستر کے نام سے موسوم ہے اس میں علم سیاست پر بحث کی گئی ہے اور اس عہد کے مروجہ حالات درج ہیں دوسری تصنیف یونانی سفیر میگاس تھینز کی ہے یہ سفیر عرصہ دراز تک پٹالی پتر میں مقیم رہا اس لیئے جو کچھ اس نے لکھا ہے ذاتی مشاہدہ سے لکھا ہے ان دونوں کتابوں میں متفق الخیالی پائی جاتی ہے کہ اُن سے چندر گپت کے عہد کے سیاسی حالات صاف صاف معلوم ہو جاتے ہیں اور تخیل پر زور دینا نہیں پڑتا۔ ان کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ چندر گپت ایک مستقل اور مرتب لشکر طیار رکھتا تھا فوج کو شاہی خزانہ سے ماہوار تنخواہیں تقسیم ہوتی تھیں فوج کے لیئے ہتیار بھی شاہی خزانے سے مہیا کیئے جاتے تھے چندر گپت کے لشکر میں چھ لاکھ پیدل تیس ہزار سوار اور نو ہزار جنگی ہاتھی تھے۔

صوبہ نظارت حربیہ میں تیس رکن ہوتے تھے یہ تیسوں ارکان چھ چھ کی جماعتوں میں پیدل سوار، رتھ (ہاتھی)، ہاتھی بری اور بحری فوج کے پانچوں صیغوں کے ساز و سامان کی بہم رسانی کا انتظام کرتے تھے۔

سلطنت کا بطنی نظام | ۵۔ سلطنت کا بطنی نظام اس نہج پر تھا کہ شخصی حکومت تھی بادشاہ اوتار سمجھا جاتا تھا مختلف صوبوں پر بادشاہ کے نائب حاکم ہوتے تھے صوبیداروں کی نگرانی جاسوسوں کے سپرد تھی اور جاسوسوں کا محکمہ اعلیٰ درجہ کا تھا شاہی خزانے سے نئی سڑکیں نکلوائی جاتی تھیں اور پرانی سڑکوں کی مرمت ہوتی تھی شاہی محاصل کا بڑا جزو غالباً اس عہد میں بھی لگان ہی ہوگا تجارت کے مال کو محصول سے بچانے اور تاجروں کے دوسری قانونی خلاف ورزیوں کے لیئے محکمہ علیحدہ تھا آبپاشی پر جیسا کہ ایک ہمدرد حکومت کا فرض ہے۔ چندرگپت کے عہد میں خاص توجہ کی گئی تھی آبپاشی کا محکمہ بالکل الگ تھا اور بادشاہ کو اس سے خاص دلچسپی تھی کیونکہ کاٹھیاواڑ کے دور افتادہ علاقہ میں چندرگپت نے نہایت اہتمام سے رقم کثیر خرچ کرکے نہریں اور تالاب بنوائے تھے۔ یونانی سفیر میگاستھنیز تعجب کے ساتھ رقم طراز ہے۔ کہ شاہی افسر مصریوں کی طرح نشیب فراز کی پیمائش کرکے پانی کے بہاؤ کا اندازہ لگاتے ہیں تاکہ پانی متعدد نہروں میں بہے اور ہر شخص حصہ رسدی سے بہرہ اندوز ہو سکے۔

چندرگپت کے دارالامارت کا بلدی نظام | ۶۔ چندرگپت کے دارالامارت کا بلدی نظام حیرت انگیز تھا نظارت حربیہ کی طرح دارالامارت کا بلدی نظام ایک مجلس کے سپرد تھا اس مجلس میں تیس رکن ہوتے تھے یہ ارکان چھ چھ آدمیوں کی چھوٹی جماعتوں میں تقسیم ہوتے تھے اور ہر جماعت کے سپرد ایک خاص صیغہ بلدی نظام کا ہوتا تھا۔ شہر کی غیر معمولی وسعت اور آبادی نے از خود بلدی نظام کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔ مجلس بلدی غیر ممالک والوں کی فہرست طیار رکھتی تھی اور اوزان و پیمانوں وغیرہ کی دیکھ بھال رکھتی تھی۔ اگر یہ صحیح ہے تو پٹالی پتر کسی طرح شاہان فارس کے قدیم دارالسلطنت اصطخر (پرسی پولس) سے کسی طرح آن بان میں کم نہ ہوگا۔

چندر گپت کا حکومت سے دستکش ہونا ۷۔ جن روایات کے مطابق ۲۹۸ ق م میں چندر گپت سلطنت سے دستکش ہو کر خانقاہ نشین ہو گیا اور اُس کا بیٹا بندوسار تاج و تخت کا مالک قرار پایا بندوسار نے یونانیوں سے دوستانہ تعلقات برقرار رکھے اُس کے دربار میں میگاس تھنیز کے بجائے ڈیمی ماکیو یونان کا سفیر تھا یونانی سفیر کے علاوہ شاہ مصر کا سفیر بھی اس فرماں روا کے دربار میں رہتا تھا کیونکہ چندر گپت کے بادشاہ ہوتے ہی ہندوستان دنیا کے بین الاقوامی سلسلے میں داخل ہو گیا تھا (پرانی دنیا کا یہ بین الاقوامی سلسلہ مصر سے آسام تک پھیلا ہوا تھا)

بندوسار ۸۔ بندوسار کے عہد میں چندر گپت کی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا اور دکن کا علاقہ مگدھ کی قلمرو میں شامل کر لیا گیا اس بادشاہ کی سیاست داخلی کی شہادتیں موجود نہیں اور بجز اس کے ہم اُس کی تعریف میں کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اُس نے اپنے باپ کا نظام حکومت کامیابی کے ساتھ قائم رکھا بندوسار کی عظمت کے لیئے اتنا بس ہے کہ وہ ایک جلیل القدر تاجدار کا نور نظر تھا اور ایک عظیم القدر بادشاہ کے باپ ہونے کا فخر اُسے حاصل تھا۔ بندوسار نے ۲۷۳ ق م میں وفات پائی اُس کے بعد اُس کا بیٹا پیاداسی تخت سلطنت پر متمکن ہوا جسے تاریخ اشوکھ کے نام سے یاد کرتی ہے۔

اشوک ۹۔ عنفوان شباب میں شاہ اشوکھ کو ولیعہدانِ سلطنت کی طرح ملکی و انتظامی مسائل طے کرنا پڑتے تھے کیونکہ باپ ہی کے زمانے میں وہ ٹیک سیلا اور اُجین کی صوبے داریوں کا عامل م[illegible]ر ہو چکا تھا یہ دونوں صوبے سلطنت مگدھ کے عظیم ترین صوبہ شمار کیئے جاتے تھے شہنشاہ اشوکھ باپ کے تخت پر بغیر کسی مخالفت کے جلوہ افروز ہوا اور چالیس برس تک سلطنت مگدھ کا انتظام کر و فر کے ساتھ کرتا رہا اس کے عہد کا پہلا قابل ذکر واقعہ ریاست کالنگا پر فوج کشی کرنے کا ہے یہ لڑائی غالباً خاندانی روایات کی تقلید میں حدود سلطنت کی توسیع کی غرض سے چھیڑی گئی تھی لیکن جنگ و جدال کے خونریز ہنگاموں کا اشوکھ کے نرم دل پر یہ اثر پڑا کہ اُس نے عہد کر لیا کہ آیندہ پھر وہ کبھی لشکر کشی نہیں کرے گا۔ شاید اسی نرم دلی نے اُسے بدھ مذہب

اصول کا پیرو بنا دیا اور انھیں خیالات کی وجہ سے ہم اُس کے ایک جبلی کتبہ میں یہ فرمان دیکھتے ہیں (فرمان نمبر ۱۳) "انسان کی سب سے بڑی کامیابی وہ ہے جو زہد و تقوے سے حاصل ہو"

اشوک کے بدھ مذہب اختیار کرنے سے سلطنت پر اثر پڑا

۱۰۔ بادشاہ کے خیالات کی تبدیلی امورِ سلطنت میں بھی ظاہر ہونے لگی آج تک اُس کے کتبہ لافانی پہاڑوں اور چٹانوں پر کھدے ہوئے ملتے ہیں ان کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اشوک کی زندگی تمام تر بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود میں صرف ہوئی شاہ اشوک کے کتبوں کی تعداد تیس سے زیادہ ہے ان میں چودہ جبلی کتبے ہیں جن میں اشوک کے اصولی سیاست کا ذکر ہے۔ آخر۔آخر میں اُسنے سات عمودی کتبے کھدوائے تھے جن میں کم و بیش لگلے کتبوں کی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔ ان تمام کتبوں میں ساتواں کتبہ بہت مشہور ہے ان میں وہ سب تدبیریں ایک ایک کرکے گنائی گئی ہیں جو شہنشاہ اشوک نے دھرم پھیلانے کے لیئے اختیار کیں۔ شہنشاہ اشوک کے کتبوں کی حیثیت فرامین سلطنت کی ہے جو مواعظ حسنہ سے لبریز ہیں۔

اشوک اور دوسرے بادشاہوں میں فرق

۱۱۔ اشوک کے عہد حکومت میں اور دوسرے بادشاہوں کے عہدوں میں بین فرق یہ ہے کہ اشوک کی فتوحات کالنگا کی مستثنیٰ مثال چھوڑ کر خالصۃً صلح کل اور پُرامن تھی جن میں جنگ و جدال کا عنصر داخل نہ تھا بحیثیت بادشاہ کے اشوک اپنی مثال آپ ہے۔ اس کا معیار زندگی بہت بلند تھا کیونکہ ایک کتبہ میں وہ کہتا ہے "مجھے کاروبار سلطنت کی انجام دہی اور عام بہبودی کی جد وجہد سے کبھی اطمینان نہیں ہوتا" وہ کہتا ہے کہ امیر و غریب سب کو ذاتی جد و جہد کرنا چاہیئے۔ فرامین کی زندہ مثال بادشاہ کی ذات ہمایوں صفات ہے۔ اِس تاجدار کو اپنی قوم سے بڑی محبت تھی۔ کیونکہ کتبوں میں اکثر یہ فقرہ نظر آتا ہے کہ رعایا بمنزلہ میری اولاد کے ہے۔ اس کی ہمہ گیر محبت میدانوں کے متمدن باشندوں تک ختم نہ ہو جاتی تھی۔ بلکہ پہاڑوں کے وحشی قبایل کے لیئے اس نے اپنے افسروں کو خاص ہدایات دے رکھی تھیں۔ اس کا حکم تھا کہ شاہی فرمان تینوں موسموں کی ابتدا میں۔ بآواز بلند عام شاہراہوں پر

پڑھ کر سنائے جائیں۔ تاکہ جہلا بھی فائدہ اُٹھا سکیں۔

اشوک کی انتظامی قابلیت | ۱۲۔ رفاہ عام کے لیے شاہ اشوک نے متعدد شفاخانے تعمیر کروائے تھے۔ سڑکیں بنوائی تھیں۔ انتظامی امور میں وہ اپنے نامور جد کا ہم آہنگ تھا۔ اس کے عہد میں امن وامان ایک طرح سے قائم رہا۔ شاہ اشوک روشن ضمیر بادشاہ تھا اور تمام عمال سلطنت پر اس کی نظر رہتی تھی۔ کیونکہ انہی پر احکام شاہی کے نفاذ کا مدار تھا۔

اشوک نے متعدد وفود ممالک غیر میں بھیجے | ۱۳۔ عہد اشوک کا خاص واقعہ یہ ہے کہ اس زریں عہد میں متعدد وفود ممالک غیر میں بھیجے گئے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ شاہان موریہ کے تعلقات۔ خاندان سلوکس (شاہان شام) اور خاندان بطلیموس (مقوقان مصر) سے تھے۔ شہنشاہ اشوک نے جبلی کتبوں میں یہ ارادہ ظاہر کرنے کے بعد کہ وہ قانونی مسایل کی طرف زیادہ اعتبار نہیں کرے گا ان ممالک میں جن سے اس کے تعلقات دوستانہ تھے متعدد وفود روانہ کیے تاکہ ان ممالک میں بدھ مذہب اصول کی اشاعت و ترویج ہو۔ اس سے قبل محکوم ریاستوں اور سرحدی قبایل میں وفود بھیجے جا چکے تھے۔ لیکن اس سے اس کی پیاس کب بجھنے والی تھی۔ اب ایک وسیع تر میدان کی تلاش ہوئی۔ اور اس نے شریف جوشیلے بدھ مبلغین مصر۔ شام۔ (طرابلس) مقدونیہ اور اپایرس روانہ کیے۔ ان وفود کی کامیابی کے بارے میں مشکل سے کچھ کہا جا سکتا ہے۔ گو سرندیپ کے وفد کو کامیابی ضرور ہوئی۔ اشوک نے اپنے حقیقی بھائی مہندر کو جس نے مذہبی فقیری اختیار کی تھی ایک عظیم الشان وفد کے ساتھ سرندیپ بھیجا تھا۔ اس وفد کی کوششوں سے سرندیپ کا راجہ ٹیا مع تمام درباریوں کے بدھ مذہب میں داخل ہو گیا راجہ اور اعیان سلطنت کی تبدیلی مذہب نے پورے جزیرہ کو بدھ مذہب کا حلقہ بگوش بنا دیا۔ سرندیپ کے وفد کی کامیابی کو پیش نظر رکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اشوک آریہ راجہ رام چندر سے زیادہ کامیاب رہا۔ کیونکہ رام چندر جی کی کامیابی محض جنگی کامیابی تھی۔

کے شہر تھا۔

شمالی ہند کے۔ دارالامارت کے علاوہ اور بہت سے شہر شمالی ہند میں تھے جن میں ٹیکسلا
مشہور شہر۔ اُجین۔ ہرا پلی ۔ بنارس۔ متھرا اور سانچی زیادہ مشہور تھے یہ بڑے بڑے
تجارتی شہر تھے اور ان کی آبادی بھی خاص تھی سری نگر کشمیر کے علاقہ میں شاہ اشوک نے
عارب گاہ کے طور پر آباد کیا تھا پاٹلی پتر کے تفصیلی بیان کے بعد ان شہروں کی عظمت کا ذکر
حوالت سے خالی نہ ہوگا یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ شہر کم و بیش دارالامارت ہی کی وضع پر ہوں گے
اور ان میں بھی غالباً مجالس بلدی قائم ہونگی۔ اس دور کی طرز عمارت پر ہم تحقیق کے ساتھ
کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کی یادگار سانچی کے پھاٹک کے سوا اور کوئی باقی نہیں رہی
سانچی کے باقی آثار سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندی فن تعمیر حد کمال کو پہونچ چکا تھا موریہ عہد تک
زیادہ تر مکانات لکڑی کے بنائے جاتے تھے۔ ایم۔ فاؤشر کی تحقیق کے مطابق تیسری
صدی قبل مسیح سے لکڑی کے بجائے پتھر استعمال ہونے لگا بدھ گیا اور بھارت کی سنگی جالیاں
اسی قرن کی یادگار ہیں ساتاکرمی اور سوریہ خاندان کے حوالے اس کا قطعی ثبوت ہیں کہ یہ
جالیاں دوسری صدی۔ ق۔ م۔ میں بنائی گئی ہوں گی اس میں شبہ نہیں کہ شاہان موریہ کو
فن تعمیرات سے بڑی دلچسپی تھی شہنشاہ اشوک نے بہت سے خوبصورت محل تعمیر کروائے تھے
اور اگر وہ محلات نہ بنواتا تب بھی اُس کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے وہ عمودی کتبہ کافی تھے جو ہندوستان
کے اطراف و اکناف میں پھیلے ہوئے ہیں فن تعمیر کے علاوہ دوسرے فنون جنھیں سنسکرت میں
کلا کہتے ہیں کمال کو پہونچ چکے تھے منجملہ اُن کے رقص کی تعلیم شاہی محلوں میں دی جاتی تھی
جیسا کہ کالیداس کی مالاوی گنگنا متر سے معلوم ہوتا ہے۔ موسیقی اور مصوری عام طور سے
پسند کی جاتی تھیں، یونانی سفیر کا بیان ہے کہ چندر گپت کے محل کے مذہب ستون سنہری منبت کاری
روپہلی چڑیوں سے مزین تھے علم موسیقی ہندوستان کا نہایت قدیم فن ہے اور عہد موریہ سے
بہت پہلے ہندوستان اس فن میں کامل ہو چکا تھا۔

ہندی زندگی سیاسیات سے کم متاثر ہوتی ہے

۸۔ تجربہ شاہد ہے کہ ہندوستان کی حقیقی زندگی سیاسی انقلابات سے بہت کم متاثر ہوتی ہے۔ چنانچہ زراعت جس طرح عام بسر اوقات کا ذریعہ ابھی تک بنی ہوئی ہے۔ اُس زمانے میں بھی اسی پر عام زندگی کا مدار تھا۔ زراعت کے ساتھ ساتھ دوسرے پیشے اور دست کاریاں بھی رائج تھیں۔ شاہانہ لباسوں میں عمدہ سے عمدہ ململ استعمال ہوتا تھا۔ نہایت قدیم زمانے سے ہندوستان بیش قیمت کپڑوں کے لیئے مشہور ہے۔ کپڑوں کے علاوہ مٹی کے برتنوں کا کام۔ سونے اور چاندی کا طرح طرح کا کام۔ اور دوسری دستکاریاں شاہان موریہ کے عہد میں فروغ پر تھیں۔ ہر پیشے کے لحاظ سے پیشہ وروں کی جماعتیں علحدہ علحدہ قائم کی گئی تھیں۔ جماعت کے افراد پر جماعت کا پورا قابو ہوتا تھا۔ پیشہ وروں کی جماعتیں شاہان موریہ سے پہلے قائم ہو چکی ہونگی کیونکہ ارتھاشاستر میں ان کا ذکر جابجا پایا جاتا ہے۔ ان جماعتوں کے داخلی نزاعات کا فیصلہ پنچایت کے ذریعہ سے ہوتا تھا۔

ہندی تمدن

۹۔ یہ امر مسلم ہے کہ حضرت مسیح کی ولادت کے وقت ہندوستان تمدن کے اعلیٰ مدارج طے کر چکا تھا۔ یہ تمدن عرصہ دراز کی تدریجی نشو و نما اور فطری ارتقاء کا نتیجہ تھا۔ ہندوستان کی سیاسی زندگی فارس میں اور باختر کے یونانی حکومت کے اثر سے شہنشاہی کے درجہ پر پہونچ چکی تھی اور اجتماعی زندگی نہایت گھرے اور شریف تمدن کا پرتو تھی آیندہ دوسو برس تک یہ فطری ترقی سیاسی جھگڑوں کی وجہ سے رکی رہی۔ جس کا ذکر ہم دوسرے باب میں کریں گے۔

بنیں کی۔ موریا سلطنت کے تباہ ہوتے ہی ہندو مذہب کی تجدید ہونے لگی۔ کیونکہ سوریا۔ کانوا اور اندھرا خاندان جو یکے بعد دیگرے سلطنت موریا کے جانشین ہوئے مذہباً ہندو تھے۔ کانوا برہمن خاندان تھا۔ پشیامترا نے اسوامیدھ (گھوڑے کو قربان) کرنے کی قدیم رسم کو ادا کیا تھا یہ راجہ ہندو مذہب کا حامی تھا۔ اسی کے عہد سے ہندو مذہب کی وہ تحریک شروع ہوئی جس نے بارہ سو برس کے طویل عرصہ میں بدھ مذہب والوں کو پھر ہندو مذہب کا حلقہ بگوش بنا دیا۔ ہندو مذہب کے ساتھ سنسکرت بھی از سر نو زندہ ہوئی۔ تین سو برس پہلے پننی اشٹادھیا تصنیف کر چکا تھا۔ اشٹادھیا سنسکرت کی سب سے بڑی قواعد ہے اور اسی کی بدولت سنسکرت کو علمی زبان بننے کا فخر حاصل ہوا ہے۔ پتان جلی سنسکرت کا مشہور قواعد داں جس نے پننی کی شرح لکھی ہے پشیامترا کا ہمعصر تھا۔

عہد موریہ کا تمدن موریہ عہد کے تمدن کی شہادتیں یونانی سفرا کی تصنیفوں اور نیز کینیلیہ کے ارتھا شاستر میں بکثرت موجود ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی تمدنی حالت پرانی دنیا کی متمدن قوموں سے کسی طرح گھٹ کر نہ تھی یہ ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے کہ تیسری صدی قبل مسیح میں متمدن اقوام جزیرہ صقلیہ سے چین کے شہر پیکین تک پھیلی ہوئی تھیں اور یونانی تہذیب کا اثر ہندوستان کے حدود تک پہونچ چکا تھا روم اور مصر حامل تہذیب کے سرچشمہ تھے ۲۲۰ سنہ ق۔م۔ میں چین کے پہلے شہنشاہ نے اس ملک کو متحد کر دیا تھا ۲۰۶ سنہ ق۔م سے خاندان ہان کی شاندار حکومت کا آغاز ہوا یہ خاندان چار سو برس تک چین پر حکمراں رہا۔ ہندوستان اس بین الاقوامی جماعت کا رکن تھا پٹالی پتر کی مجلس بلدی میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ ایک صیغہ غیر ملک والوں کے اعداد و شمار رکھنے کے لیئے مخصوص تھا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ممالک غیر سے آمد و رفت بکثرت تھی اور تعلقات بہت زیادہ تھے اگرچہ اس زمانہ میں باربرداری اور درازی مسافت کی دقتیں

ایسی تھیں کہ بین الاقوامی تعلقات سے کوئی بڑی تحریک دوسرے ملکوں میں پھیلائی نہیں جا سکتی تھی لیکن باوجود ان مشکلات کے اور کوہ ہمالیہ کی دشوار گزار حد فاصل کے بدھ مذہب جس کی نشو و نما ہندوستان میں ہوئی تھی چین کے دور افتادہ ملک میں سرعت کے ساتھ عہد موریہ ہی میں پھیل گیا تھا۔

پٹالی پتر بابل ہیدان اور نینوا سے کم نہ تھا

۲۔ سلطنت موریہ کا دارالامارت پٹالی پتر۔ تجارت۔ نظم و نسق۔ کی خوبی اور شان و شوکت میں بابل ہیدان اور نینوا سے کم نہ تھا۔ دریائے گنگا اور سون کے سنگم پر یہ شہر آباد تھا شاہان موریہ کے درباروں کی عظمت جلالت شہنشاہان مغل کے درباروں کی ہم پلہ تھی پری چہرہ خواصوں کے جھرمٹ میں بادشاہ کی سواری نکلا کرتی تھی یہ خواصیں غالباً باختر اور یونان سے آتی ہوں گی اگنی متر کے دربار کی حشمت کا ذکر کالیداس نے ایک ناٹک میں کیا ہے۔ کالیداس کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس راجہ کا دربار صحیح المذاق اور اعلیٰ تہذیب سے مزین تھا۔ اگرچہ اور درباروں کی طرح اس دربار میں بھی سازشیں ہوتی تھیں۔ لیکن ادب اور فنون لطیفہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ درباریوں کی دلچسپی کے لئے گوئیے کنچیاں اور ناٹک والے بھی رکھے جاتے تھے ان کے رکھنے سے محض درباریوں کی اخلاقی اصلاح مقصود ہوتی تھی کنتلیا نے ارتھا شاستر میں جو اصول سیاست بیان کئے ہیں وہ مشیا ولی کے اصول سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں ارتھا شاستر کا مصنف ان اصول کے موجد ہونیکا دعویٰ نہیں کرتا وہ ایسی باتیں لکھتا ہے جو راجگان سلف برت چکے تھے اس دعوے کے ثبوت میں متعدد شہادتیں ارتھا شاستر میں پیش کی گئی ہیں جو بدقسمتی سے ہم تک نہیں پہونچ سکیں۔ اس قدیم زمانہ میں حکومت کی بنیاد جاسوسوں پر تھی حکومت کو خوفناک سازشوں کے بے رحمی سے فرو کرنے میں پس و پیش نہ ہوتا تھا اشوک کے عہد کو مستثنیٰ کرکے حکومت کا کوئی خاص سیاسی منشا بجز حاکم کے خود نمائی اور ہمسایوں کی تسخیر

دوسرا باب

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پیشتر ہندوستان کی اجتماعی و معاشرتی حالت کیا تھی

عہد موریا بعد قرون ابعد کی سب سے بڑی خصوصیت

۱۔ عہد موریا اور قرون ابعد کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان کی اجتماعی زندگی میں نمایاں انقلاب پیدا ہوا اگرچہ سکندر اعظم کی آمد تک برہمنوں کے رسوخ میں فرق نہ آیا تھا۔ لیکن شہنشاہ اشوک کے مذہبی تبلیغی جوش نے ایک غیر معروف فرقہ کو عالمگیر مذہب میں تبدیل کر دیا تھا۔ گو بدھ مذہب ہندو مذہب کی اصلاح شدہ اور ترقی یافتہ صورت تھی۔ بایں ہمہ اس کی ترویج سے جو اجتماعی انقلاب ملک میں ایک سرے سے دوسرے تک پھیل گیا وہ معمولی نہ تھا۔ ہندو مذہب میں قربانیاں بکثرت تھیں جن کی ادائیگی بغیر برہمنوں کے ناممکن تھی۔ کیونکہ یہی گروہ مذہبی باریکیوں کا جاننے والا سمجھا جاتا تھا۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ہندو مذہب کی خصوصیات گوتم بدھ سے کہیں پہلے پیدا ہو چکی تھیں۔ دراصل ہندو مذہب کا بدترین پہلو یہ تھا کہ اس میں ادنیٰ طبقہ کی مادی و روحانی فلاح کا مطلق خیال نہ رکھا گیا تھا۔ یہی حالت اب تک چلی آتی ہے۔ بدھ مذہب کے رواج نے ادنیٰ طبقوں میں تمدن کی روح پھونک دی جس کی وجہ سے بدھ مذہب ایک جمہوری و ہر دلعزیز تحریک بن گیا۔ جس میں ادنیٰ و اعلیٰ بلا تفریق ذات دوش بدوش تھے۔ اگلے باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ پیاداسی وحشی قبائل میں گوتم بدھ کا پیغام پھیلانے کا اسی قدر مشتاق تھا جس قدر میدانوں کے متمدن باشندوں میں۔ بدھ مذہب کے عروج کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس مذہب کی تبلیغ عام رائج الوقت زبان میں کی گئی۔ چنانچہ اسی زمانہ سے پالی اور پراکرت مقدس زبانیں سمجھی جانے لگیں۔

بدھ خانقاہیں تعلیمگاہیں بن گئیں

۲۔ بدھ مذہب کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس مذہب میں دو گروہ

شامل تھے۔ ایک عام لوگوں کا دوسرا خانقاہ نشین راہبوں کا۔ راہبوں میں مرد اور عورتوں کی تفریق نہ تھی۔ شاہان موریہ کے عہد میں نیکدل بادشاہوں اور امیروں نے ملک میں بکثرت خانقاہیں تعمیر کرائیں۔ یہ خانقاہیں رفتہ رفتہ تعلیم گاہیں بن گئیں جن سے ہندوستان کو پہلی مرتبہ تعلیمی بیداری کا سبق حاصل ہوا۔ سنگھا آشرم میں راہب امراء وغرباء کو مساوی طور پر ان انوار حقیقت کی تعلیم دیتے تھے جو ساکیا شاہزادہ پر کئی صدی پیشتر منکشف ہو چکی تھی۔ شاہ اشوک کے عہد میں دور دور تک خانقاہوں کا سلسلہ قائم تھا۔ سات سو برس تک خانقاہوں کے بےنفس خادمین نے ایسی جدوجہد کی کہ ہندوستان کے مدارس اور جامع ایشیا میں مشہور ہو گئے اور تحصیل علم کے دلدادہ پرانی دنیا کے ہر گوشہ سے جوق در جوق ہندوستان کا دور و دراز سفر طے کرنے لگے۔

بدھ مذہب نے طبقۂ اناث کا پایہ بلند کر دیا

۳۔ بدھ مذہب نے صنف ضعیف کا پایہ بھی بہت بلند کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے دیرالراہبات کا عام رواج ہو گیا جن میں شریف گھرانوں کی عفت مآب خواتین فقر و ریاضت کی قسم کھا کر داخل ہوتی تھیں۔ راہبات کے زمرہ میں شہنشاہ اشوک کی بیٹی بھی شامل تھی۔ جسے جزیرہ سرندیپ میں بدھ مذہب پھیلانے کے صلہ میں سنگھامترا (سنگھا کی دوست) کا کبھی نہ مٹنے والا لقب عطا ہوا تھا اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ویدک دور میں یا اس کے بعد عورتوں کا رتبہ ہندو مذہب میں نیچا نہ تھا تاہم بدھ مذہب نے طبقۂ نسواں کو ہندو مذہب سے کہیں زیادہ آزادی بخشی اور ان کا پایہ اتنا بلند کر دیا کہ وہ فلسفیانہ اور اجتماعی کاموں میں نمایاں حصہ لینے لگیں۔

بدھ مذہب کے عروج سے ہندو مذہب پر کیا اثر پڑا

۴۔ بدھ مذہب کے عروج سے ہندو مذہب کا عالمگیر اثر فنا نہ ہو سکا شہنشاہ اشوک باوجود مذہباً بدھ ہونے کے ہمیشہ برہمنوں کی قدر و منزلت کرتا تھا اور انہیں بیش بہا عطیوں سے سرفراز کرتا رہتا تھا۔ اس نیکدل بادشاہ کو گو بدھ مذہب سے بیحد محبت تھی لیکن اس نے قدیم مذہب میں کسی طرح کی دراندازی

اشوک کے حدود سلطنت

۱۴۔ اشوک کے حدود سلطنت جنوبی ہند کے انتہائی سرے تک پھیلے ہوئے تھے۔ ہم ان کا تعین صحت کے ساتھ کرسکتے ہیں۔ مغرب میں ہرات اور قندھار۔ مشرق میں آسام۔ سلطنت اشوک کے سرحدی صوبے تھے۔ کشمیر اور نیپال بھی شہنشاہ اشوک کے صوبہ جات میں تھے۔ جنوب میں اس کی سرحد موجودہ ریاست میسور کی جنوبی سرحد پر جاکر ختم ہوتی تھی۔

اشوک کے عہد میں بدھ مذہب والوں کا جلسہ

۱۵۔ شہنشاہ اشوک نے اپنے آخری عہد میں بدھ مذہب والوں کا ایک بڑا جلسہ پاٹلی پتر میں کیا تھا۔ تاکہ بدھ مذہب والوں کے باہمی اختلافات مٹ جائیں۔ ۲۳۲ ق۔م۔ میں اس جلیل القدر شہنشاہ نے وفات پائی۔ سیاست و تدبر میں شاہ اشوک جولیس سیزر اور شہنشاہ اکبر کے ہمدوش نظر آتا ہے۔ مذہبی و تبلیغی الوالعزمی میں وہ کنفوشس۔ پالوس اور جرجیس اعظم سے رتبہ میں کسی طرح کم نہیں معلوم ہوتا۔ میدان جنگ سے پرہیز کرنے اور کسی قسم کا ہتھیار استعمال کرنے کی قسم کھانے میں اس کی نظیر شاہان عالم میں نہیں مل سکتی۔ وہ ان معدودے چند بادشاہوں میں ہے جو عمر بھر انتہائی بے نفسی کے ساتھ قوم و ملک کی خدمت میں مستغرق رہے۔ بلاشبہ قدیم تاریخ ہند میں اشوک کا بزرگ ترین و شریف ترین نام ہے۔ اور دنیا کی عظیم الشان ہستیوں میں یہ ہندی تاجدار صف اول میں رہنے کے قابل ہے۔

اشوک کے بعد سلطنت موریہ دو حصوں میں تقسیم ہوگئی

۱۶۔ شہنشاہ اشوک کے بعد اس کے دو پوتوں نے سلطنت کو مشرقی و مغربی حصوں میں تقسیم کرلیا۔ ان میں سے ایک کا نام دسرتھ تھا اور دوسرے کا سمپرتی۔ اسی طرح پچاس برس تک سلطنت موریا زندگی کے دن پورے کرتی رہی یہاں تک آخری موریا تاجدار کو جس کا نام برہدرتھ تھا اس کے رئیس العسکر پشیامترا نے قتل کر ڈالا پشیامترا سے دوسرے خاندان کی ابتدا ہوئی جو تاریخ میں خاندان سوریہ کے نام سے مشہور ہے۔ پشیامترا کے عہد میں یونانی بادشاہ مینندر نے حملہ کیا جسے بدھ روایات میں ملیکا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ واسومترا نے جو پشیامترا کا پوتا تھا یونانیوں کو سخت شکست دی۔ اس شکست نے یونانیوں کی

حوصلہ مندیوں کا ہمیشہ کے لیئے خاتمہ کر دیا۔ خاندان موریا شونگوں کے دونوں ہی خاندان کے باہمی نزاعات سے تباہ ہوگیا۔ شاہان کانوا اس خاندان کے جانشین ہوئے راجگان کانوا ۲۸ قبل مسیح تک حکمراں رہے۔ پھر آندھرا خاندان نے اس خاندان کا ورق الٹ دیا۔

دولت موریہ کی سیاسی اہمیت

۱۷۔ اگرچہ چندرگپت اور اشوک کی سیاسی تعمیر ڈیڑھ سو برس کے عرصہ میں خاک میں مل گئی۔ لیکن شہنشاہی کا خیال سلطنت کے ساتھ مٹنے والا نہ تھا۔ دولت موریہ کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ اس کے سایہ میں پہلی مرتبہ ہندوستان نے متحد ہو کر سیاسی زندگی کا ثبوت دیا۔ آنے والی صدیوں میں شہنشاہی کے دور بلندی تاریخ میں بار بار آتے رہے۔ تقریباً ہر صدی میں کسی نہ کسی خاندان نے کوشش ضرور کی کہ کوہ ہمالیہ سے لے کر راس کمورن تک ایک ہی پرچم کے زیر سایہ کرلے۔ گو شہنشاہی کا تخیل اس زمانہ کو دیکھتے ہوئے قبل از وقت ضرور تھا۔ لیکن ہمیں فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ یہ خیال سلطنت موریہ کے اولوالعزم فرمانرواؤں نے بلندی تہذیب میں پیدا کیا تھا۔ اس حیثیت سے چندرگپت۔ بندوسار۔ اشوک نہ صرف سمدرگپت اور ہارشا وردھن ہی کے اسلاف ہیں بلکہ بابر۔ اکبر اور اورنگ زیب کے بھی ہیں۔

مسئلہ کینیا

ہندوستان کے موجودہ سیاسی مسائل میں سب سے زیادہ اہمیت مسئلہ کینیا کو دی جاتی ہے۔ اعتدال پسند جماعت جو ابتک برطانوی رحم و انصاف پر اعتماد رکھتی تھی اور اُسکے زیر سایہ ہندوستان کے پھلنے پھولنے کی توقعات میں اپنے ہموطنوں کو شوریدہ سر اور قابل ملامت سمجھنے میں باک نہ رکھتی تھی، بہ فیصلۂ کینیا کے بعد انہیں "شوریدہ سر" اور قابل ملامت لوگوں کے ہم آہنگ ہو کر حکومت کے لطف و کرم سے بے نیازی کا اظہار کر رہی ہے چنانچہ شاستری صاحب جو کل تک امپیریل کانفرنس کی شرکت اور باوجود اپنے سیاہ رنگ ہونے کے وزراء نوآبادیات کے ساتھ ہمنشینی کا مطلب یہ سمجھتے تھے کہ برطانوی سلطنت میں امتیاز نسل و رنگ اٹھ جائیگا آج سپرو صاحب کو مشورہ دیتے ہیں کہ امپیریل کانفرنس میں شرکت سے انکار کریں۔ برطانوی نمائش میں ہندوستانیوں کی شرکت قومی بھی خودداری کے خلاف سمجھتے ہیں حکومت کے طریق عمل پر اظہار ناراضگی کے لئے شاستری صاحب سے استعفے کی درخواست کرتے ہیں اور پھر برطانوی مال کے بائیکاٹ کو اپنے مقاصد کے حصول کا واحد ذریعہ تسلیم کرتے ہیں۔

اعتدال پسند جماعت کے رکن اعظم کے خیالات میں یہ انقلاب کیوں پیدا ہوا کہ آخر کار وہ بھی ترک موالات پر آمادہ ہوئے؟ ان سوالات کے جواب کے لئے کینیا کی صورت حال اور اس کا طرز حکومت قابل غور ہے۔

کینیا مشرقی افریقہ میں ایک چھوٹی سی نوآبادی ہے، جس کا رقبہ ۲۴۵۰۶۰ مربع میل ہے اور گزشتہ مردم شماری کے مطابق کل آبادی ۲،۴۸۳،۹۲۵ ہوتی ہے جس میں ۹۶۵۱ یورپین ہیں ۲۲،۰۰۰ ہندوستانی ہیں ۱۰۱۰۲ عرب ہیں اور بقیہ تعداد افریقہ کے دیسی باشندوں کی ہے۔ ہندوستان اور مشرقی افریقہ سے پرانے تجارتی تعلقات ہیں جس کا پتہ پندرھویں صدی سے چلتا ہے، چنانچہ گذشتہ دو تین صدیوں کے اندر ہندوستانیوں کی کثیر تعداد اپنے مفاد نیز افریقہ کے وحشی باشندوں کی فلاح و بہی خواہی کے خیال سے ہندوستان کو چھوڑ کر افریقہ میں آباد ہو گئی ہے اور وہاں انہوں نے اپنی قدیم زندہ تہذیب کو اپنی مثال سے ہر دلعزیز

بنایا اور اپنی کوششوں سے تجارت و عام اقتصادی حالات کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔
لیکن خداوندان آراضی کو یہ کب گوارا ہوتا کہ ایشیا و افریقہ کا کوئی گوشہ اُن کی حکومت سے باہر ہے اور ہندوستان کے غلام افریقہ میں جاکر آزادی کا دم بھر سکیں چنانچہ برطانیہ نے اپنی حکمت عملی کے ذریعہ سے ہندوستانیوں کو اپنا رفیق کار بنا کر رفتہ رفتہ کینیا پر اپنا تسلط قایم کر لیا۔ اور جنگ کے بعد سنہ ۱۹۲۰ء میں باقاعدہ طور پر یہ نوآبادی کینیا کے نام سے برطانوی نوآبادیات میں شمار ہونے لگی۔
"مسئلہ کینیا" کا آغاز اسوقت سے ہوا جب باشندگان ہندوستان کینیا میں آکر آباد ہوگئے یوں تو سنہ ۱۸۹۵ء سے کچھ یورپین کینیا میں آباد ہونے لگے تھے لیکن سنہ ۱۹۰۲ء سے انکی آبادی میں برابر اضافہ ہوتا رہا سنہ ۱۹۰۴ء میں کینیا کا وہ مرتفع حصہ دریافت کیا گیا جس کو ہائلینڈ کہتے ہیں آب و ہوا، زمین کی زرخیزی اور چراگاہوں کے لحاظ سے یہ حصۂ ملک کینیا والوں کے لئے جنت تھا، لارڈ الگن اسوقت وزیر نوآبادیات تھے، اُنھوں نے ایک خاص قانون کے ذریعہ سے "ہائلینڈ" کو یوروپین کیلئے مخصوص کردیا یہ موقع تھا جب مشرق کی مغلوبیت اور مغرب کی قومیت ثابت کرنیکے لئے ہندوستانیوں کو ایک حق سے محروم کیا گیا، چنانچہ اُسی وقت سے ہندوستانیوں اور یورپین باشندوں میں کشمکش شروع ہوئی حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانیوں کی بائی میندس برحق اوّنی تک انہوں نے صدیوں تک اپنی جان پر کھیل کر افریقہ کے دشت و صحرا کا ایک ایک چپہ چھانا اور غیر معلومہ مقامات کی تلاش کی، وحشیوں کو سب سے پہلے تہذیب و تمدن کی ابجد سکھائی، کینیا پر برطانیہ کا تسلط بھی انھیں کی مدد سے ہوا جس کا اعتراف سرمان کرک نے جو مشرقی افریقہ میں سب سے پہلے کونسل جنرل تھے ان الفاظ میں کیا ہے "اگر ہندوستانیوں کی مدد نہ ہوتی تو برطانیہ کا اقتدار کبھی مشرقی افریقہ میں قائم نہ ہو سکتا تھا سر ہنری جانسن بھی افریقہ میں برطانوی کامیابی کا سہرا سکھ اور پٹھان سپاہیوں کے سر رکھکر فرماتے ہیں کہ ہندوستانی تاجر جن کوششوں سے یوگنڈا کو ترقی کی شاہراہ پر لا رہے ہیں وہ تعریف سے باہر ہیں، جن مقامات پر تجارت کا نام و نشان تک نہ تھا وہاں کاروبار قائم کر رہے ہیں اور نیروبی وغیرہ آباد مقامات پر ہوٹل بنا رہے ہیں" اس کے بھی

ذیل کی عبارت مسٹر چرچل کی ہے جو ہندوستانیوں کے حقوق کی پاسداری میں اپنی کتاب
[illegible] میں ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں۔

"ہندوستانیوں کے کیا کیا حقوق ہیں؟ پہلا حق بحیثیت انسان کے اور دوسرا جانی
رعایا کے۔ یہ سکھ سپاہی جنہوں نے مشرقی افریقہ کو فتح کرنے میں طرح طرح کی مصیبتیں
اٹھائیں اور پھر وہاں امن قایم کیا۔ یہ ہندوستانی تاجر تھے جو غیر معلوم مقامات میں
بلا خوف گھستے چلے گئے جہاں کوئی سفید رنگ انسان جانے کی ہمت نہ کرسکتا تھا نہ وہاں
اپنی روزی کمانے کا کوئی ذریعہ نکال سکتا تھا یہی ہندوستانی تاجر تھے جنہوں نے جنگلی
مقامات میں تجارتیں قایم کیں اور آمد ورفت کے لئے راستے نکالے ہندوستانیوں کی
محنت ومزدوری کی بدولت ایک ریلوے کی تعمیر ہوئی جس پر آج کل تمام ترقی کا دارو
مدار ہے، وہ سرمایہ آج مختلف کاموں میں لگا ہوا ہے اس میں زیادہ حصہ ہندوستانی
ساہوکاروں کا ہے اور اس سے یورپین بھی بلا تکلف مستفید ہوتے ہیں، (مشرقی افریقہ
میں) برطانوی دفاتر کے قیام سے بہت پہلے ہندوستانی وہاں موجود تھے،
جنوبی افریقہ کے سفید رنگ کے باشندے مشرقی افریقہ میں اپنی بود وباش کے
جتنے سال شمار کرسکتے ہیں ہندوستانیوں کی اتنی نسلیں وہاں گذر چکی ہیں پھر
یہ کیونکر ممکن ہے کہ کوئی حکومت جو ذرہ برابر بھی ایمانداری کا دعویٰ کرتی ہو وہ
ہندوستانی باشندوں کو ان مقامات سے نکال دینے کی پالیسی اختیار کرے جہاں
وہ ایک عرصہ سے آباد ہی نہیں ہیں بلکہ جس کی داغ بیل بھی انہی کے ہاتھوں پڑی
ہے لیکن اس سے بھی بڑھکر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا حکومت برطانیہ کیلئے
اس پالیسی کا اختیار کرنا ممکن بھی ہے جبکہ وہ ہندوستان کے تیس کرور باشندوں
پر کچھ بھی حکومت کرنا چاہتی ہو"

غرض ہندوستانیوں کے صاف اور صریح حقوق کے سامنے یوروپین باشندوں کا

کوئی وجہ قابل تسلیم نہیں ہو سکتا تھا، لیکن اس پر عملدرآمد کیا گیا۔ مقامی گورنمنٹ نے وزیر آبادیات کے فیصلہ سے کسی قدر اختلاف کیا اور بعض نام یک ترمیم کے بعد یہ قانون منظور کیا گیا۔ ہائی لینڈز میں ہندوستانیوں کو جاگیریں نہ دی جائیں۔ اس قانون کی رو سے ایک راستہ ہندوستانیوں کیلئے کھلا رہ گیا تھا جس سے ہائی لینڈز کے خطے تک داخل ہو سکتے تھے یعنی اگر موقع ملے تو یورپین جاگیرداروں سے زمین خرید سکتے تھے چنانچہ ۱۹۱۵ء میں ایک اور قانون مقامی کونسل میں پاس کر دیا گیا کہ اگر ہندوستانی ہائی لینڈز میں کوئی جاگیر خریدیں تو گورنر کو اس بیع کے منسوخ کرنے کا پورا حق ہوگا" اس قانون کے خلاف ہندوستانیوں کی طرف سے حکومت میں گویا صدائے احتجاج بلند کی گئی جس کا جواب بھی فوراً اسی وہائٹ ہال سے مل گیا کہ ہندوستانیوں کی ناداری اور اطاعت کیشی کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہوئے حکومت برطانیہ ان کو یقین دلاتی ہے کہ جو کچھ کیا گیا وہ امتیاز نسل و رنگ اور قومیت کی بنا پر نہ تھا (بقول شخصے) "سلطنت برطانیہ میں تمام باشندوں کے مساوی حقوق ہیں"۔

۱۹۱۳ء میں پروفیسر ولیم سمپسن صاحب نے ایک رپورٹ شائع کی تھی اور اس میں یہ دکھلایا کہ طبی اصول پر یہ ضروری ہے کہ مختلف اقوام کے باشندے آپس میں مل کر نہ رہیں، ہر قوم کے لئے علیحدہ علیحدہ حلقے ہوں اور بازار بھی علیحدہ ہوں۔ حکومت اس تجویز کو فوراً اختیار کرنا چاہتی تھی لیکن چونکہ جنگ شروع ہونے والی تھی اسلئے اسپر فوراً عمل درآمد مناسب نہ سمجھا گیا اور اختتام جنگ پر ۱۹۱۹ء میں حکومت نے اس طرف توجہ کی۔

کینیا کی مقامی کونسل میں پہلے جتنے ممبر ہوتے تھے وہ گورنر مقرر کرتا تھا لیکن جب جنگ ختم ہو گئی تو لارڈ ملنر نے گیارہ غیر سرکاری اور منتخب شدہ یورپین نمائندوں کو کونسل میں جگہیں دیں، ہندوستانی اور عرب جن کی تعداد یورپین باشندوں سے دوگنی تھی ان کا حق نمائندگی بالکل فراموش کر دیا گیا۔

چنانچہ اس کے خلاف ہندوستان میں بھی اور کینیا میں بھی کچھ شورش کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لارڈ ملنر نے مجبور ہو کر ہندوستانیوں کو مقامی کونسل میں دو جگہیں دیں اور میونسپل بورڈ

میں [illegible] مطالبات ایسے نہ تھے جو قابل تسلیم ہوتے اور اس کے خلاف شورش بڑھتی جا رہی تھی۔ حکومت ہند نے ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو لارڈ لو کی خدمت میں ایک مراسلہ روانہ کیا جس میں کینیا کے معاملات اور سیاسیات کے علاوہ ہندوستان کی سیاسی حالت پر بھی تبصرہ کیا گیا تھا۔ اس مراسلہ کا اثر یہ ہوا کہ تمام مسائل پھر ایک بار ۱۹۲۲ء میں ایک کمیٹی کے سامنے غور و بحث کے لئے پیش کئے گئے چنانچہ ارل ونٹرٹن نائب وزیر ہند اور مسٹر وڈ نائب وزیر نو آبادیات نے نہایت کد و کاوش کے بعد حسب ذیل تجاویز پیش کیں۔

۱۔ کونسل میں گیارہ منتخب شدہ نمائندے ہوں جس میں چار ہندوستانی ہوں اور سات یورپین

۲۔ انتخاب عام ہو جس میں ۲۱ برس کے مرد و عورت دونوں رائے دینے کے مستحق ہونگے

۳۔ اس کے علاوہ بھی حق رائے دہندگی کے لئے ایسی قیود رکھی جائیں کہ صرف ۱۰ فیصدی باشندے رائے دے سکیں۔

۴۔ اگزیکیٹو کونسل میں ایک غیر سرکاری ہندوستانی نمائندہ لیا جائے۔

۵۔ نسل و قومیت کی بنا پر باشندوں کی تفریق اور علیحدہ علیحدہ حلقوں میں تقسیم کرنے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن مقامی کونسل کو حق ہوگا کہ صحت عامہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے حسب ضرورت قواعد و ضوابط بنائے۔

۶۔ چونکہ ہندوستانیوں کی تعداد روزافزوں ترقی پر تھی اس لئے یورپین آبادی کا یہ مطالبہ تھا کہ قانون کے ذریعہ سے مزید مہاجرین کا داخلہ کینیا میں روک دیا جائے ورنہ کم تعداد یورپین باشندے مغلوب ہو جائینگے، یہ مطالبہ طرح طرح سے پیش کیا جاتا تھا کبھی اقتصادی اور معاشرتی نقطہ نظر سے کبھی کینیا کے دیسی باشندوں کی ہمدردی میں، لیکن وڈ ونٹرٹن کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ اس معاملہ میں حکومت کا طرز عمل برقرار رہے۔

۷۔ ہائی لینڈز کے متعلق گذشتہ معاہدوں کو پیش نظر رکھکر اس کمیٹی نے فوراً گورنمنٹ

تبدیلی کرنا مناسب نہ سمجھا لیکن اسکے ساتھ نائب وزیر ہند نے یہ تجویز منظور کی کہ وہ اس بارہ خلاف ہیں اور آئندہ وزیر ہند کو اختیار ہوگا کہ پھر اس مسئلہ کے متعلق کوئی کاروائی کر سکیں۔

یہ تجاویز اسی زمانہ میں شائع ہوئیں جب امپیریل کانفرنس کے اجلاس منعقد ہو رہے تھے اور شاستری صاحب نے اپنے نزدیک علاوہ جنوبی افریقہ کے تمام وزراء نو آبادیات سے ہندوستان کے مساوی حقوق تسلیم کرائے تھے مسٹر چرچل اب وزیر نو آبادیات تھے انہوں نے یہ تجاویز حکومت ہند نیز گورنر کینیا مسٹر نارتھلے کے پاس بغرض مشورہ یا محض انکی رائے دریافت کرنے کیلئے بھیجیں۔ حکومت ہند نے رضامندی کا وعدہ کیا، لیکن مسٹر نارتھلے جو کینیا کے یورپین باشندوں کے حامیوں میں سے تھے کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے۔ ہندوستان میں ترک موالات کا زور ہو رہا تھا اور حالت روز بروز نازک ہوتی جاتی تھی جس کا احساس تمام وزراء سلطنت کو تھا اسلئے مسٹر چرچل نے مسٹر نارتھلے کو موقوف کر دیا اور ان کی بجائے سر رابرٹ کارنڈن کو کینیا کا گورنر مقرر کر دیا۔ اور انھیں حکم دیا کہ حکومت کی پالیسی کا اب اعلان کر دیں۔ سر رابرٹ کارنڈن صاحب نے اعلان سے پہلے ایک مراسلہ مسٹر چرچل کی خدمت میں روانہ کیا اور اس پر یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس پالیسی کے اعلان سے بڑے خطروں کا اندیشہ ہے۔ خطرے کیا تھے؟ یہ بھی آگے چل کر ظاہر ہو جائیگا۔ غرض یہ کہ اس عرصہ میں برطانوی وزارت میں تبدیلیاں ہوئیں اور مسٹر چرچل کے بجائے ڈیوک آف ڈیونشایر ملاوہ فائز ہوئے آپنے بھی مسٹر چرچل کی پالیسی کو مناسب خیال کیا اور سر رابرٹ کارنڈن کو تاکید کی ہے کہ وہ اس پالیسی کا اعلان کریں۔ چنانچہ گورنر نے مجوزہ پالیسی فریقین کے حوالہ کر دی گیا ہندوستانیوں کے مطالبات کا ایک حصہ بھی اس سے پورا نہ ہوتا تھا مگر بصد اصرار و مجبوری کچھ عرصہ کے لئے اسکو منظور کرنے پر طیار تھے، لیکن یورپین آبادی کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئی وہ لارڈ ملنز کی پالیسی میں کسی قسم کی ترمیم نہیں چاہتے تھے غرض ان کی طرف سے انتہائی شورش شروع ہوئی اور انہوں نے اپنی کانگریس میں یہ فیصلہ کیا کہ اگر وزراء نے ان کے حسب منشاء فیصلہ نہ کیا تو کینیا کی حکومت وہ اپنے ہاتھوں میں لے لیں گے اور

برطانیہ سے علی [illegible] کر دیا - نیز یہ کہ اگر حکومت نے [illegible] تو وہ تلوار سے بھی مقابلہ
کریں گے [illegible]
یہ خطرہ تھا جس سے لارڈ [illegible] خائف تھے اور پالیسی کے اعلان سے جھجکتے تھے کاش
یہ بھی [illegible] سے کہ جن لوگوں نے یہ اعلان جنگ دیا تھا اور حکومت ہند کی زبان میں جن لوگوں
نے علم بغاوت بلند کیا تھا وہ کس سزا کے مستحق سمجھے گئے؟ انکی کانگریس پر یا ان کے جلسوں پر بھی
دفعہ ۱۴۴ کا کبھی نفاذ ہوا؟ ان کے لئے بھی کبھی جیلوں کے دروازے کھولے گئے؟ لیکن یہ ستم
آرائیاں [illegible] مشرق کے لئے ہیں جو اگر اپنی مظلومیت پر کبھی آہ سرد بھی کھینچتے ہیں تو
توپوں کے دہانے کھل جاتے ہیں ہوائی جہاز سے گولے برسائے جاتے ہیں جیلوں میں بند کئے
جاتے ہیں غرض دفعات تعزیرات اور مارشل لا کی رو سے ایک ایک خطا پر سینکڑوں جرم عائد
کئے جاتے ہیں اور ہر سزا کے مستحق سمجھے جاتے ہیں۔

کینیا میں باشندگان یورپ کی باغیانہ شورش کا نتیجہ یہ نکلا کہ وزیر نو آبادیات نے فریقین
کے چار چار نمائندے اس غرض سے مدعو کئے کہ بالمشافہ گفتگو کر کے کوئی فیصلہ کیا جائے، گورنر کینیا
بھی اس کانفرنس میں شریک کئے گئے ہندوستان سے مسٹر شاستری کی زیر سرکردگی ایک وفد
اپریل سنہ ۱۹۲۳ء میں انگلستان روانہ ہوا تا کہ ہندوستانیوں کے مطالبات ذیل پیش کرے:-

۱- تمام متمدن اقوام کے لئے مساوی حقوق ہوں۔
۲- لارڈ چیمسفورڈ کے اعلانات سنہ ۱۹۲۰ء کی پابندی۔
۳- فہرست رائے دہندگان سب باشندگان کے لئے ایک سی ہو اور قیود ایسے
عائد کئے جائیں کہ جن لوگوں کے پاس تھوڑی سی جائداد بھی ہے اور کوئی ایسی زبان
جانتے ہیں جو سلطنت برطانیہ کے ہائی کورٹ میں رائج ہے وہ بھی رائے دے سکیں۔
۴- یورپین نمائندوں کے برابر ہندوستانی نمائندے لیجسلیٹیو کونسل اور اکزیکٹیو کونسل اور
میونسپل کونسل میں لئے جائیں۔

۵- ہائی لینڈز میں ہندوستانی جاگیریں خرید سکتے ہیں۔
۶- ہندوستان کے جو باشندے کینیا میں جاکر آباد ہونا چاہیں اُن کے لئے کسی قسم کی رکاوٹ نہو۔
۷- تمام سرکاری دفاتر میں ملازمت کی راہیں ہندوستانیوں کیلئے بھی کھلی رکھی جائیں۔
۸- جو قوانین قومیت اور نسل کی بنا پر نافذ کئے گئے تھے منسوخ کر دیئے جائیں۔

ان مطالبات پر غور وخوض کرنیکے بعد جو فیصلہ خداوندان آہنی نے صادر فرمایا وہ ۲۴ر جولائی ۱۹۲۳ء کو صحیفہ یعنی ہوائٹ پیپر میں شائع کیا گیا اور اُسکی تفصیل ذیل میں درج ہے۔

۱- ہندوستانیوں کے پانچ نمایندے لیجسلیٹو کونسل میں لئے جائینگے اور ان نمایندوں کا انتخاب ملی اُصول پر عمل میں آئیگا یوروپین باشندوں کے گیارہ نمایندے برقرار رہینگے۔ سرکاری نمایندوں کی کونسل میں اکثریت رکھی جائیگی۔ عربوں کا ایک ایک منتخب نمایندہ لیجسلیٹو کونسل میں ہوگا اور ایک ممبر ایگزیکٹیو کونسل میں خود حکومت مقرر کریگی۔

۲- ایگزیکٹیو کونسل میں کوئی تبدیلی فی الحال نہوگی علاوہ اس کے کہ ایک ممبر کا اور اضافہ کیا جائیگا، لیکن اس جگہہ پر عیسائی مبلغین کی جماعت میں سے کسی شخص کو ترجیح دیجائیگی تاکہ وہ افریقہ کے دیسی باشندوں کی نمایندگی کر سکے۔

۳- شہروں میں ایشیائی اور یوروپین باشندوں کو علیحدہ علیحدہ رہنے کے لئے قانون نافذ کیا گیا تہا اب منسوخ کر دیا جائیگا۔

۴- ہائی لینڈز میں جاگیروں کا عطایا اور اُس کے بیع کے متعلق جو طریقہ عمل ابتک رہا ہے آیندہ بھی وہی رہیگا، لیکن دوسرے مقامات پر کچھہ آراضیاں ہندوستانیوں کے لئے بھی مخصوص کر دیجائینگی اور صرف اُن لوگوں کو ایک مقررہ زمانہ کیلئے دیجائیں گی جو اُس زمین کو بہتر بنانے کا وعدہ کریں لیکن اگر اس عرصہ میں کوئی شخص اپنی زمین کو پیداوار کے قابل نہ بنا سکا تو حکومت اُس زمین کو واپس لینے کی مجاز ہوگی۔ باقی آیندہ

آفتاب انگورہ

شہید حریت احمد جمال پاشا

رجال انگورہ کو آج استقلال و حریت کے جو حیات افروز لمحات نصیب ہوئے ہیں اور معظم الخلافت کے حصولِ استقلال کی جو افتخار اندوز ساعت عالم اسلام کو میسر آئی ہے وہ بڑا کسی امیر البحر مارشل جمال پاشا لفٹنٹ گورنر شام کی بہت زیادہ مرہونِ منت ہے، ممدوح نہ صرف حکومت انگورہ کے موسسین میں ایک ممتاز مرتبہ لیڈر تھے بلکہ آپکی آخری خدمات نے اناطولیہ و ترکستان سے لیکر تاشقند و افغانستان اور شمالی ہندوستان کو جن بیدار کن طریق پر متاثر کیا اس سے اسلامی تاریخ کے صفحات ہمیشہ جگمگاتے رہیں گے ترکی قوم کا یہ جلیل القدر شاہ سپاہی انگورہ گورنمنٹ سے وہی تعلق رکھتا تھا جو خود بانی انگورہ گورنمنٹ شوکت پناہ مصطفےٰ کمال پاشا کو حاصل ہے، وہ ابتدائی اسکیم جو آخر ۱۹۱۸ء میں مقام "حلب" انگورہ گورنمنٹ کی تاسیس کے لیے طیار ہوئی تھی احمد جمال پاشا کے قیمتی مشورے سے مزین تھی، اور یہ امر واقع ہے کہ قہرمان ترکی مارشل مصطفےٰ کمال پاشا کو حلب سے اناطولیہ جانے کے لیے احمد جمال پاشا نے جو سہولتیں بہم پہونچائیں یہ اُنھیں کا نتیجہ تھا کہ کمال ممدوح اناطولیہ میں "تحریک انگورہ" کو فروغ دینے میں کامیاب ہو گئے۔

احمد جمال پاشا کا وطن "مدلہ" اور سال پیدائش ۱۸۷۲ء ہے آپ ترکی فارسی، عربی، اور روسی، زبانوں کے ماہر اور زبردست قانون داں تھے آپ فوجی تعلیم سے فارغ ہو کر ترکی سپاہ میں داخل ہوئے کچھ عرصہ بعد آپ کو ترکی گورنمنٹ نے "اسکوار" کا حاکم اعلیٰ مقرر کیا، پھر آپ "ارنہ" کے حاکم مقرر ہوئے پھر "بغداد" کے لفٹنٹ گورنر مقرر ہوئے کچھ عرصہ بعد قسطنطنیہ کے ڈپٹی مقرر ہوئے، اس سلسلہ اعتبار سے کہ ترکی لیڈر جامع کمالات ہوتے ہیں احمد جمال پاشا ڈپٹی پن کے عہدہ سے پھر فوجی لائن میں

بدل دیئے گئے اور آپ پہلی ترکی اسکواڈرن کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے، احمد جمال پاشا مشہور حکمران ترکی جماعت "انجمن اتحاد و ترقی" کے اُن مخصوص بلند مرتبہ ارکان میں سے تھے جو انجمن کی جان کہے جاتے ہیں، ممدوح الصدر انجمن اتحاد و ترقی کے سیکرٹری اور پریسیڈنٹ بھی رہ چکے تھے، حضرت جمال پاشا کی یہ اُن خدمات کا نہایت ہی مختصر اجمال ہے جو جنگ یورپ سے پہلے آپ نے انجام دیں، اور جن کی شرح ایک طویل داستان ہے۔

۱۹۱۶ء ترکی قوم کے ابتلاء و آزمائش، آلام و مصائب کا نہایت صبر آزما سال تھا جبکہ ترکی حکومت جنگ فرنگ کے نازک ترین دور سے گزر رہی تھی، روسی محاذ کی حوصلہ شکن مصروفیت کے باوجود ترکی مقبوضات عراق کی حفاظت و صیانت، اور ولایت شام و فلسطین کا تحفظ ایک عقل سوز مہم تھی جہاں اندرون ملک جاہل عربوں بدوؤں کے گروہوں اور متفرق قبائل کو ترکی گورنمنٹ کا وفادار رکھنا اور محاذ جنگ پر فوجوں کی ترتیب و ترسیل وغیرہ مہمات مسائل تھے جن کی رُو براہی ایک فاضل و پختہ کار جنگی و سیاسی لیڈر ہی کر سکتا تھا، چونکہ ترکی گورنمنٹ جمال پاشا ممدوح کی سیاسی و جنگی بلند پائیگی سے اچھی طرح واقف تھی اس لیئے آپ کو شام و فلسطین کی ترکی سپاہ کا کمانڈر انچیف بنایا گیا اور جمال پاشا دمشق میں آ گئے، آپ نے نہر سویز عبور کرنے کے لیئے جو جد و جہد فرمائی وہ مہمات جنگ کی ایک لاجواب نظیر ہے، جمال پاشا ممدوح نے باوجود ریلوے لائن اور ریلوے ذرائع کے فقدان کے ترکی سپاہ اور ترکی محاذوں کا جو انتظام فرمایا اُس کی تفصیل جمال پاشا کی جنگی مہارت کا حیرت انگیز کارنامہ ہے، شام و فلسطین اور عراق کے متعلق خود جمال پاشا مرحوم نے "تذکرہ" کے نام سے ایک جامع "تاریخ" لکھی ہے اور جس کا اُردو ترجمہ شاید ہندوستان میں شائع ہو گیا ہے اور جس کے چند حصے مصر کے مشہور عربی رسالہ "الہلال" نے شائع کیئے

یہیں سے دیکھنے سے جمال پاشا کی خداداد فراست و جنگی تدبر کا کافی اندازہ ہو سکتا ہے جہاں
محصور باوجود گوناگوں مشکلات کے "انتظام و انصرام" اور سیاست و مآل اندیشی کے حکمت
آمیز نمونے پیش کئے ہیں، یہ جمال پاشا ہی کی مقتدر اور سیاست شناس ہستی تھی جس نے
باغی عربوں سے ترکی حکومت کے مفاد کو عرصہ تک محفوظ رکھا، آپ نے "عربی بغاوت" کی
روک تھام میں جن مساعی اور ذرائع سے کام لیا وہ "مجلۂ الہلال مصری" یا آپ کے خود نوشت
"تذکرہ" ہی کے دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں، یہ آپ ہی کا تدبر پناہ اور حقیقت آگاہ دماغ تھا
جس نے عربی ہیجان کو قبل از وقت محسوس فرما کر ترکی فوجوں کو صحیح سالم روسی محاذ پر منتقل کرنے
اور سرکاری قیمتی اشیاء کو قسطنطنیہ پہونچانے کی تدابیر اختیار کیں۔

مذکورہ حالات کے بعد ترکی حکومت کا وہ پُرآشوب دور شروع ہوا جس نے کئی صدی کے
بعد ترکی قومیت کو تباہ کن مصائب کے عمیق گڑھے میں ڈال دیا، ترکی فوجوں کے ہتیار ڈالتے
ہی ملک میں عام ہیجان و برہمی کے مہلک اثرات پھیل گئے، التوائے جنگ کی درخواست پیش ہوتے ہی
ترکی کے ممتاز مرتبہ لیڈروں نے وطن عزیز کو خیرباد کہنا شروع کر دیا، حضور دانش پناہ
احمد جمال پاشا مین اوس دن (۱۰ اگست ۱۹۱۸ء) جبکہ معاہدۂ التوائے جنگ پر دستخط ہوئے
ایک جرمن جہاز پر مع اہل و عیال قسطنطنیہ سے بندرگاہ "باسٹیول" چلے گئے اور یہاں چند
قیام کے بعد آپ "برلن" جا پہونچے، جب قسطنطنیہ پر اتحادی غلبہ مستحکم ہو گیا تو اتحادیوں نے
قسطنطنیہ کی نام نہاد ترکی گورنمنٹ کی وساطت سے "انجمن اتحاد و ترقی" کے سربرآوردہ ارکان
کو گرفتار کرانا چاہا، اور اس سلسلہ میں احمد رفعت پاشا ترکی سفیر مقیم برلن نے جرمن گورنمنٹ
سے جمال پاشا کی حوالگی کی درخواست کی، چونکہ جرمن گورنمنٹ ارکان اتحاد و ترقی کی طرفدار
تھی اس نے فوراً جمال پاشا کو جرمنی حدود چھوڑ دینے کا اشارہ کیا اور اس طرح جمال پاشا کو
اتحادیوں کے ہاتھ پڑنے سے بچا لیا، حضور جمال پاشا جرمنی سے "سوئزرلینڈ" چلے گئے جہاں

آپ نے قصبہ "کوہن ترس" میں مستقل اقامت اختیار فرمالی، قصبۂ کوہن ترس ہی میں آپ نے اپنا نام "خالد بے" رکھ لیا اور ایک تاجر کی حیثیت اختیار فرمالی [illegible] قصبہ کوہن ترس واقع سوئیٹزر لینڈ میں آپ کامل آٹھ ماہ مقیم رہے اور اسی اقامت کے [illegible] آپ نے اپنی یادداشتیں مرتب کیں، یہ وہ معرکۃ الآرا سیاسی یادداشتیں ہیں [illegible] یورپ کی تمام زبانوں میں شائع ہو چکا ہے، غرض جب جرمنی میں امن و امان قائم ہو گیا تو آپ سوئیٹزر لینڈ سے "فوننگ" میں تشریف لے آئے اور مستقل قیام اختیار فرما لیا، مگر [illegible] میں آپ [illegible] میں سالار ملت دین پناہ غازی مصطفٰے کمال پاشا کی تحریک کا آغاز ہوا، جس کی طرف مشرق کی نگاہیں اُٹھنے لگیں، اور تاڑنے والوں نے تاڑ لیا کہ انا طولی رہنماؤں کی یہ تحریک ایک دن سارے مشرق کو بیدار کر دے گی لہذا ناممکن تھا کہ جمال پاشا ایسا عظیم الشان مدبر اس وقت خاموش بیٹھا رہتا، آپ فوراً جرمنی سے روس تشریف لے گئے، مخالفین تو آج تک یہی کہتے ہیں کہ انور و جمال کو "انگورہ تحریک" سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن جو لوگ ترکوں کی قوم پرستی اور "وحدت خیال" سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ انور، طلعت، اور خلیل و جمال نے "انگورہ تحریک" کو کامیاب بنانے کے لیے کیسی گران قدر خدمات انجام دی ہیں؟

مارشل جمال پاشا جب ماسکو پہونچے تو آپ نے کوشش کی کہ کسی طرح انگورہ اور ماسکو گورنمنٹ میں اتحاد عمل پیدا ہو جائے اور مشرق کی یہ دونوں طاقتیں متحد ہو کر دشمنوں کے مقابل آجائیں، چنانچہ آپ ابھی ماسکو میں سرگرم عمل ہی تھے کہ انگورہ گورنمنٹ کے ذی مرتبہ نمایندہ ڈاکٹر بکر سامی بے ماسکو پہونچے ڈاکٹر بکر سامی اور جمال پاشا کی متفقہ کوششوں سے انگورہ و ماسکو گورنمنٹ میں ایک معاہدہ اتحاد ہو گیا، ڈاکٹر صاحب تو انگورہ واپس آ گئے لیکن جمال پاشا روس ہی میں رہے جہاں آپ نے وسطی ایشیا کو بیدار و آزاد کرنے کے لیے ایک زبردست لائحہ عمل تیار کیا، یہ وہ وقت تھا جبکہ ماسکو گورنمنٹ انگریزوں کے خلاف اپنے اثرات کی اشاعت چاہتی تھی اور اس کا ارادہ تھا کہ [illegible]

[illegible] تحریک اثرات وسعت پذیر ہو جائیں تاکہ کسی مناسب موقع پر وہ ہندوستان
[illegible] کے قابل ہو سکے، ادھر ترکی لیڈر بھی چاہتے تھے کہ جس طرح ممکن ہو
[illegible] پہونچایا جائے لہٰذا ماسکو میں جمال پاشا کو ان خدمات کا
[illegible] کیا گیا اور آپ کو ماسکو کے محکمہ خارجہ میں "معاملات شرقیہ" کا چیف ڈائرکٹر
مقرر کیا گیا [illegible] تھا کہ جمال پاشا بالشویک گورنمنٹ کی زیر نگرانی میں کوئی حقیقتاً نشانہ رکھیں گے
لیکن جمال پاشا کے پیش نظر ایک دوسری اسکیم تھی اور آپ چاہتے تھے کہ وسط ایشیا میں
مسلمانوں کی متعدد متفرق جماعتوں اور ریاستوں کا ایک زبردست "جامعہ" بنا دیا جائے،
جس کا مرکز "تاشقند" ہو، لہٰذا اس خیال سے آپ نے "تاشقند" میں اپنا ہیڈ کوارٹر مقرر
کرکے کام شروع کر دیا، گو بظاہر کچھ عرصہ تک آپ یہاں بالشویک مقاصد کو تقویت
پہونچاتے رہے لیکن یہ صرف اس لیے کہ آپ کو بالشویک ذرائع سے اسلامی مصالح کو استوار
کرنا تھا، تاشقند میں جمال پاشا کے ساتھ ترکی جنرلوں اور ترکی لیڈروں کی ایک
طاقتور جماعت تھی جس کے ذریعہ انگورہ تحریک کو فروغ دیا جاتا تھا، البتہ ابتداء میں اس
تحریک پر بالشویک رنگ چڑھایا گیا تھا، جب جمال پاشا نے انگورہ تحریک کو فروغ دینا شروع
کیا تو بالشویک گورنمنٹ جمال پاشا سے بدظن ہو گئی اور آپ کو دوبارہ ماسکو طلب کیا گیا،
اس طلبی کے موقع پر آپ کو بالشویک سفیر "ایم سورٹز" سے ملایا گیا جو اصل میں جمال پاشا
کا نگراں تھا، اور اسی موقع پر آپ کے عملہ تبلیغ میں مشہور انقلابی علامہ برکت اللہ بھوپالی کا
بھی اضافہ کیا گیا علامہ برکت اللہ بھوپالی کی شرکت سے جمال مشین میں زبردست اضافہ ہو گیا،
کیونکہ موصوف میں "تحریک اتحاد اسلامی" کے خیالات یکساں موجود تھے، اور دونوں "پان اسلام ازم"
کے زبردست مؤید تھے، علامہ برکت اللہ بھوپالی ایک راسخ العقیدہ اور متبحر ہندی عالم ہونے کے
ساتھ ہی نہایت معروف انقلابی ہیں، جب سے آپ نے ہندوستان کو خیرباد کہا ہے آپ
"تبلیغ اسلام" و "تحریک پان اسلام ازم" کے سرگرم کارکن رہے ہیں، ممالک مغربی خصوصاً

چین و جاپان میں علامہ برکت اللہ بھوپالی نے اسلام و اسلامیت کی تبلیغ و اشاعت میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں، وہ سیاسی نقطۂ نظر سے علامہ جمال الدین افغانی کے تبع ہیں، وہ ۱۹۰۹ء میں جاپان ٹوکیو یونیورسٹی میں ہندوستانی زبانوں کے پروفیسر اور اخبار "اخوۃ اسلام" کے چیف ایڈیٹر و مالک تھے، تو انھوں نے افغانی قوم کو اسلامی مرکزیت میں جذب ہونے کے لیے "سراج الاخبار کابل" کے ذریعہ پرجوش دعوت دی تھی، وہ ۱۹۱۵ء میں برلن کے محکمہ شرقی میں ہندی قیدیوں کو انقلابی خیالات کی تعلیم دیتے تھے اور پھر ایک طاقتور جرمن مشن لے کر وہ افغانستان گئے تھے، غرض اب جمال پاشا اور علامہ برکت اللہ بھوپالی کا اتحاد عمل بخارا و افغانی قوم کی بیداری کا ایک مبارک ذریعہ تھا، جمال پاشا نے تاشقند و بخارا میں ایک تبلیغی مدرسہ قائم کیا جس کے ذریعہ بالشویک پروپیگنڈا کیا جاتا تھا اور اس تمام پروپیگنڈا کے مصارف بالشویک گورنمنٹ برداشت کرتی تھی، یہ وہ وقت ہے جبکہ جمال پاشا کے متعلق نہایت غلط اور مبالغہ آمیز خبریں شائع ہوتی رہتی تھیں، تھوڑے عرصہ بعد یعنی اکتوبر ۱۹۲۰ء میں وہ افغانی حدود میں داخل ہوئے چونکہ افغانی قوم اور تاجدار افغانستان آپ کی بلند مرتبہ شخصیت سے پہلے ہی واقف تھے اس لیے آپ کا نہایت شاندار استقبال کیا گیا، اس میں شک نہیں کہ آپ افغانستان میں بالشویک ذرائع سے داخل ہوئے تھے لیکن چند ماہ بعد ہی تاجدار افغانستان نے آپ کی خدمات کو افغان گورنمنٹ کے لیے حاصل کر لیا، اور آپ کو افغانی کیبنٹ میں "وزیر جنگ" کا عہدہ سپرد کیا گیا، اس وقت افغانی فوجیں نہ تو جدید قواعد و ضوابط سے واقف تھیں اور نہ ان کے پاس جدید قسم کے آلات حرب تھے لیکن جمال پاشا نے اپنی ممتاز جنگی مہارت کے ذریعہ اس کمی کو بہت جلد پورا کر دیا، اور تمام افغانی فوجوں کو ایک نئی ترتیب کے ساتھ آراستہ کر دیا، آپ نے اس عرصہ میں سرحدی قبائل کی اصلاح میں بھی نمایاں اصلاحات فرمائیں اور بعض تجربہ کار ترکی جرنلوں کو ان کا نگراں مقرر کر کے انہیں افغانستان کی مرکزی فوجوں سے متعلق کر دیا، جس وقت

جمال پاشا قبائل کی اصلاح میں سرگرم تھے اُن کے خلاف ہندوستان میں پروپیگنڈا کیا
جارہا تھا اور سرحدی علاقہ میں ہر وقت ایک نئی جنگ کا خطرہ محسوس کیا جاتا تھا حضرت محترم
جمال پاشا نے ترکستان و تاشقند، اور افغانستان و شمالی ہند تک جن اسلامی مصالح کو
تقویت بہم پہونچائی اُن کی تفصیل سے چونکہ اخبار بیں طبقہ اچھی طرح واقف ہے اس لئے اب
صرف یہ بتا دینا کافی ہے کہ آپ سنہ ۱۹۲۲ء میں افغان گورنمنٹ کے لئے جدید اسلحہ اور سامان
حرب و ضرب خریدنے کے لئے جرمنی و فرانس تشریف لے گئے، جہاں سے وہ انگورہ اور
اپنے وطن عزیز تشریف لے جانے والے تھے، اُس وقت آپ کے اہل و عیال "طفلس" میں
تھے، جب آپ جولائی سنہ ۱۹۲۲ء میں "طفلس" پہونچے اور ایک دن بازار میں اپنے جنگی ایڈی کانگ
"ثریا بے" اور "نصرت بے" کے ساتھ "جو فکروسکی اسٹریٹ" کے گوشے پر پہونچے تو یکایک
آپ پر گولی چلائی گئی اور جمال پاشا تین گولیاں کھا کر گر پڑے اسی طرح نصرت بے پر پانچ
گولیاں چلائی گئیں اور وہ بھی گر پڑے، ثریا بے یہ دیکھ کر فرار ہونا چاہتے تھے کہ
"سولولاک اسٹریٹ" پر پہونچتے ہی اُن پر حملہ کیا گیا اور اس طرح اسلام و اسلامیت اور ملت غرا
کے یہ تابان و درخشندہ تارے طفلس میں ہمیشہ کے لئے ڈوب گئے۔ انا للہ الخ

حلیہ و خصائص | مارشل جمال پاشا متوسط القامت اور نہایت وجیہ آدمی تھے چہرا ابھرا ہوا
آنکھیں بڑی بڑی، اور نہایت خوشنا گھنی داڑھی مونچھیں جرمنی طریق کی اوپر کو چڑھی
ہوئیں، یورپین لباس پر اناطولی ٹوپی زیب سر فرماتے تھے، مزاج کے نہایت حلیم اور
بُردبار آدمی تھے، گو غصہ بہت کم آتا تھا لیکن چہرہ سے جنگی شہامت و تدبر کے پُرجلال آثار
ہویدا تھے۔

ملا توحیدی،

جاپان اور زلزلے

جاپان چینی لفظ نیفن کی بگڑی ہوئی صورت معلوم ہوتی ہے۔ نیفن کے معنی The Land of Rising Sun کے ہیں۔ چونکہ جاپان چین کے مغرب میں ہے اور صبح کو اسی طرف چینی آفتاب کو طلوع ہوتے دیکھا کرتے تھے۔ اسی مناسبت سے وہ ان جزائر کو نیفن پکارنے لگے۔
اور خدا کی عجیب قدرت کہ جاپان نے دورِ جدید میں مغربی اقوام کے ساتھ ساتھ تہذیب و تمدن میں جو مقابلہ کیا تو اس کی ترقی کا آفتاب اس طرح طلوع ہوا کہ چینیوں نے جو نام رکھا تھا وہ صادق آیا۔ جاپان سے مراد وہ تمام حصہ ہے جو ایشیا کے مغربی ساحل پر شمال میں جزیرہ سکھالین سے لے کر جنوب میں جزیرہ فارموسا تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ تمام جزائر شمار میں کم و بیش ایک ہزار ہیں۔ اس میں سب سے بڑا ہانشیو یا ہانڈو کہلاتا ہے۔ یہ جاپان کا اصل حصہ ہے۔ اسی جزیرہ میں دار السلطنت ہے۔ اہم تعلیمگاہیں مختلف کارخانے دفاتر سرکاری اور سفارتخانے وغیرہ بھی اسی جزیرے میں ہیں۔ جاپان کا مشہور آتش فشاں پہاڑ فوجی یامہ بھی اسی حصہ میں ہے۔ اور یہی حصہ ہمیشہ سب سے زیادہ زلزلوں کی زد میں رہا ہے۔

بیسویں صدی سے قبل جاپان کا دروازہ غیر اقوام کے لیئے بالکل بند تھا۔ خود جاپانی کسی دوسرے ملک میں نہیں جایا کرتے تھے۔ البتہ ہندوستان بطور جاترا کے اکثر آتے تھے اور چند یوم کی سیاحت کے بعد واپس ہو جاتے تھے یہی وجہ تھی کہ جاپانی تہذیب پر آئینی اثر بالکل نہ پڑا تھا۔ شوگن جماعت جو اس وقت حکمراں تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کی حرص و آز کو خوب سمجھ گئی تھی۔ یہ جماعت سپاہیوں کی ایک چھوٹی سی جماعت تھی جو حکومت کرتی تھی جس طرح سے فرانس کے Mayors of Palace تھے یہ جماعت بھی اسی طرح بنی تھی اور اپنا نام شوگن قرار

دیا تھا جس سے قدیمی شہنشاہ کو جو مکاڈو کہلاتا ہے معزول کر دیا اس جماعت نے مغربی اقوام کو
سوائے ڈچ کے (وہ بھی صرف ایک بندرگاہ سے) جاپان میں داخل ہونے کی ممانعت کر دی
تھی۔ اور اگر کوئی اس حکم کے خلاف ورزی کرتا تھا تو اُسے موت کی سزا ملتی تھی ۱۸۵۳ء
میں ایک امریکن مسمی کموڈور پیری ایک بیڑہ لے کر جس کی تاب جاپان نہ لا سکتا تھا خلیج یڈو
میں آ پہونچا اور جاپان کو ایک تجارتی صلحنامہ کرنے پر مجبور کیا۔ اس صلحنامہ کی ماتحت امریکہ
کے لیئے جاپان کے کئی بندرگاہ کھل گئے اور سلسلۂ تجارت آمد و رفت شروع ہو گئی۔ اس کے بعد
یورپ کی بحری اقتدار رکھنے والی سلطنتوں نے بھی ہمت کی اور جاپان نے مثل چین کے بالآخر
اپنے تمام بندرگاہ کھول دیئے ان آہنی اقوام خصوصاً یورپین قوموں کے جاپان میں داخل ہونیکا
نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۶۸ء میں ایک انقلاب ہوا اور شوگن جماعت معزول اور حکومت پھر قدیم شاہی
خاندان مکاڈو کو مل گئی۔ غرضیکہ بیسویں صدی کے اوائل سے جاپان نے مغربی تہذیب کو
قبول کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اب اُس کے شہر تقریباً تمام مغربی آسائشوں سے پُر ہیں
یورپ کے طرز کی پارکیں، ہوٹل، ریسٹوران، سینما، تھیٹر، ٹرموے، ٹیلیفون، برقی روشنی
گیس پائپ، یہ تمام چیزیں اب ہر بڑے جاپانی شہر میں پائی جاتی ہیں۔

باوجودیکہ جاپان زلزلوں اور کوہ آتش فشاں پہاڑ کی تباہیوں کا ہمیشہ آماجگاہ رہا ہے
مگر پھر بھی کوئی قوم اپنی حکمراں شاہی خاندان کی قدامت پر اتنا نازاں نہ ہوگی جتنا کہ جاپانی۔
مکاڈو خاندان پورے پچیس صدی سے چلا آرہا ہے گو درمیان میں شوگن جماعت نے اس خاندان
کو حکومت سے معزول کر دیا تھا مگر جاپانی قوم ہمیشہ اس خاندان کے ارکان کو عزت و احترام
کی نگاہ سے دیکھتی رہی۔

جاپان اپنی صناعی، اپنی مخصوص طرز معاشرت کے علاوہ اپنے زلزلوں کی وجہ سے
زیادہ مشہور ہے جاپان میں جس کثرت اور تسلسل سے زلزلے آئے ہیں اور جس قدر جانی و مالی
نقصانات جاپان نے اس ہیبت ناک عذاب سے اُٹھائے شاید بہت سی قوموں نے لڑائیوں

میں بھی نہ اٹھائے ہوں گے۔ جاپان کی تاریخ دیکھنے سے پتہ لگتا ہے کہ ہر زلزلے میں سیکڑوں جانیں تلف ہوئی ہیں اور بڑی بڑی بربادیوں کا جاپان کو سامنا کرنا پڑا ہے۔

یکم ستمبر ۱۹۲۳ء کی دوپہر بھی جاپان کے لیے عجیب و غریب ماتم خیز دوپہر تھی کہ صرف دو منٹ کے اندر ٹوکیو کا خوبصورت شہر اور اس کا وسیع بندرگاہ یاکوہاما نیز شہر شاگامی، آوا اشموسا وہ اطراف کے بہت سے مواضعات اپنی تمام چہل پہل کے ساتھ اس طرح زلزلے سے تباہ و برباد ہو گئے کہ اس کی یاد سے انسانی خیال لرزتا ہے۔ دنیا کے اکثر حصوں میں زلزلے آئے ہیں خود جاپان کے تمام گزشتہ زلزلوں سے بڑھ کر یہ زلزلہ اپنی تباہ کن اور بربادخیز نوعیت میں یکتا تھا۔ ٹوکیو کا قدیمی نام یڈو تھا۔ شوگن حکومت کے انقلاب کے بعد جب مکاڈو خاندان پھر برسرِ حکومت ہوا تو اس نے دارالسلطنت کا نام بدل دیا اور ٹوکیو رکھا۔ جس کے لفظی معنی "مغربی دارالسلطنت" کے ہیں۔ موجودہ عہد کے تمام شہروں میں یہ عظیم الشان شہر شمار کیا جاتا تھا۔ یہ شہر اپنی وسعت میں یکتا تھا۔ شہر کے اندر کئی نہریں اور بہت سی پارک و باغات تھے۔ اس کا رقبہ ۳۰ مربع میل تھا۔ اس کی آبادی ۲۸۶۰۰۰۰ نفوس کی تھی۔ شہر کی خاص سڑک گسنزا پر ٹرموے اور یورپ کی وضع کی دکانیں تھیں۔ تین ہزار عبادتگاہیں تھیں۔ اساکوسہ حصہ میں ایک اتنا عظیم الشان اور وسیع مندر تھا کہ اس کے احاطہ کے ساتھ کئی تھیٹر گاہیں۔ تیراندازی کے لیے کافی جگہ، چائے خانے ہوٹل وغیرہ وابستہ تھے جن سے عبادتگاہ کے اردگرد شام کو ایک عجیب تماشا لگ جاتا تھا۔ اسی طرح سے یاکوہاما جاپان کا سب سے وسیع بندرگاہ تھا۔ جو بیس میل سمندر پر واقع تھا اس بندرگاہ سے ۲۲۸۲۷۰۰۰۰ روپیہ کی قیمت کا مال سالانہ جاپان میں آتا تھا۔ اور اسی طرح ۲۰۷۵۶۰۰۰۰ روپیہ کی قیمت کا مال سالانہ باہر جایا کرتا تھا۔ اس بندرگاہ سے سالانہ ۲۲۶۳۰۰۰ ٹن کا سامان اتارا جاتا تھا۔ ان اعداد سے بندرگاہ کی وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یاکوہاما میں جاپانی تمدن بہت کم تھا۔ کیونکہ یہاں زیادہ تر یورپ کے باشندے آباد تھے جو مختلف کاروبار کے سلسلے سے یہاں آ کر آباد تھے۔

انھیں کے مذاق کے مطابق یہ شہر تعمیر ہوا۔ یاکوہاما کی آبادی ۴۲۶۰۲۵ تھی۔ جاپان کے یہ دونوں شہر اپنی تمام شان و شوکت کے ساتھ یکایک منہدم نظر آنے لگتے ہیں۔ ایک خاک کا تودہ بادل کی طرح اُمنڈ آتا ہے۔ اور جاپان کا مایۂ ناز شہر اور عظیم الشان بندرگاہ اس طرح تباہ ہو جاتا ہے کہ جو حصے زلزلے کی زد سے بچ جاتے ہیں اُن میں گیس کے نلوں کے پھٹ جانے سے آگ لگ جاتی ہے اور لکڑی کا تمام حصہ جل کر خاک سیاہ ہو جاتا ہے۔ ذرا اُس شہر کی حالت کا خیال کرو جو ابھی چند لمحہ قبل ایک تجارتی منڈی، ایک چلتے پھرتے لوگوں کی بستی، زندہ انسانوں کی آبادی تھی یکایک خاک کا ڈھیر، راکھ کا انبار اور جلے ہوئے مکانات کے ڈھلیچے میں تبدیل ہو جائے، اور جہاں اب سوائے لاشوں کے اور کوئی زندہ جسم نظر نہ آئے۔ انسانی جانوں کی بربادی کی یہ کیفیت تھی کہ ایک معمولی سی بنک کی عمارت میں آگ لگ جانے سے ستر جانیں فوراً تلف ہو گئیں۔ کوئی گھر نہیں بچا کہ جس میں کئی کئی جانیں نہ ضائع ہوئی ہوں۔

جاپان نے گزشتہ تہائی صدی میں بڑی ترقی کی اور قریب قریب ہر شعبہ میں اُس نے مغربی اقوام کے ہم پلہ ہونے کی کامیابی کے ساتھ کوشش کی تھی۔ جاپان پر گزشتہ کسی زلزلے سے اتنی تباہی و بربادی نہ آئی تھی جتنی کہ اس آخری زلزلہ سے۔ انسانی جانوں کی بڑی تباہی کی وجہ یہ ہوئی کہ ٹوکیو اور یاکوہاما میں لنڈن کی طرح گیس کے نل لگا دیئے گئے تھے۔ جو زلزلے کے دھکوں سے پھٹ گئے، اور جن کی وجہ سے مکانات میں آگ لگ گئی۔ اگر جاپان کے شہر ان مغربی تعیشات سے آراستہ نہ ہوتے تو شاید گزشتہ زلزلوں کی طرح اس قدر جانیں تلف نہ ہوتیں جاپان کی مغرب پرستی کا اس وقت ایشیا، کی سادہ زندگی اور حسن معاشرت سے مقابلہ کرو تو دونوں کا فرق نہایت ہی عبرت انگیز نقشہ پیش کرتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ جاپانی قوم کو قدرت نے زلزلوں اور آتش فشاں پہاڑوں کی مصیبتوں کو برداشت کرنے کی کچھ ایسی قوت ودیعت کی گئی ہے کہ وہ اس سے ذرا ہراساں نہیں

ہوسکے۔ اور تباہی کے بعد فوراً ہی تعمیر میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ گزشتہ زلزلہ کے بعد ہی فوراً ٹوکیو کو از سر نو تعمیر کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنادی گئی جس کے ساتھ اتحاد عمل کے لئے رعایا سے ایک شاہی پیام میں درخواست بھی کی گئی ہے۔ یہ کمیٹی جلد سے جلد اسکیم اور خاکہ تیار کرنے کے بعد تعمیر کا کام شروع کرے گی۔ جاپانی گورنمنٹ ایسے تباہی کے موقعوں پر اپنی رعایا کے ساتھ جس قدر مراعات اور آسانیاں بہم پہونچا سکتی ہے کبھی دریغ نہیں کرتی چنانچہ گزشتہ زلزلہ کے بعد سے حکومت نے جہاز اور ریل کے سفر کو مفت کر دیا ہے۔ اور تباہ شدہ حصہ سے کوریا فارموسا، یا چین جانے والے کو کچھ نہیں خرچ کرنا پڑتا۔ اسی طرح سے مصیبت زدہ حصوں میں تمام ذرائع باربرداری کا مفت انتظام ہے۔ ڈاک خانہ، تار، ٹیلیفون وغیرہ بھی پبلک کے استعمال کے لئے عام کر دیئے گئے ہیں اور کسی قسم کا محصول یا معاوضہ نہیں دینا پڑتا۔ تمام سرکاری ٹیکس اٹھا لئے گئے ہیں۔ گورنمنٹ نے ۹۵ لاکھ ین جو قریب ڈیڑھ کروڑ روپیہ کے ہوتا ہے امداد کیلئے منظور کئے ہیں۔ شاہی خاندان نے بھی اپنی جیب خاص سے ایک کروڑ ین بدیں غرض عطا کئے ہیں۔ دوسرے ممالک سے بھی برابر امداد پہونچ رہی ہے خصوصاً اس موقعہ پر برطانیہ اور امریکہ اپنی ہمدردی اور فیاضی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ امریکہ نے تو چالیس کروڑ ڈالر کی امداد منظور کی ہے۔ اور برطانیہ کی خاطر غریب ہندوستان سے بھی لارڈ ریڈنگ صاحب بالعتابہ جاپان ریلیف فنڈ میں روپیہ وصول کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت جاپان پر ہمدردی کا جادو چلانا مقصود ہے۔ اور یہ "سیاسی" ہمدردیاں آیندہ کی کسی تجارتی مراعات کی پیشنگوئی کر رہی ہیں ورنہ برطانیہ اور امریکہ کو تو ایک پیسہ بھی کسی ایسی "قوت" کی امداد کے لئے خرچ کرنا گوارا نہ ہوتا جو کم سے کم ایشیائی تجارت پر اپنا اقتدار چاہتی رہی ہو۔

جاپان میں زلزلے اسی قدامت کے ساتھ سُنے جاتے ہیں جس قدامت پر جاپانی قوم نازاں ہے۔ تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ سب سے پہلا زلزلہ جاپان میں ۲۸۶ء قبل مسیح میں آیا تھا اسی زلزلے کے بعد کوہ فوجی یامہ اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ سطح زمین پر نمودار

ہوا۔ چھپل ہوا بھی جس کا اس سے قبل کہیں نام و نشاں بھی نہ تھا صفحہ زمین پر پائی گئی۔ تاریخ قدیم میں یہ واقعات نہایت ہی اہمیت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ دوسرا زلزلہ غالباً بست و صد کے بعد یعنی سنہ [illegible]ء میں آیا۔ اور اُس کے بعد پندرہ صدی کے عرصہ میں یعنی سنہ ۱۵۹۶ء جاپان میں کل ۱۲۹ زلزلے آئے جن میں ۵۲ سنہ ۱۵۰۰ء کے قبل آئے۔ ان زلزلوں کا خاص شکار ہمیشہ شہر کیوٹو رہا ہے جو ہر مرتبہ بالکل مسمار ہو گیا ہے۔ برخلاف اس کے یڈو ٹوکیو، اس عرصہ میں صرف ایک دفعہ زلزلہ محسوس کیا گیا۔ اور ناگاساکی میں دو مرتبہ۔ ناگاساکی کے یہ دونوں زلزلے صرف تین سال کے عرصہ میں یعنی ایک سنہ ۱۸۲۳ء میں اور دوسرا سنہ ۱۸۲۵ء میں آیا۔ اور ہر مرتبہ شہر بالکل برباد ہو گیا اور ہزاروں جانوں کا نقصان ہوا۔

بارہویں صدی میں صرف ایک مرتبہ سنہ ۱۱۸۰ء میں زلزلہ آیا۔ کیوٹو میں کثیر نقصانات ہوئے اور لاکھوں انسان فنا ہو گئے اور سطح حصے غاروں میں تبدیل ہو گئے۔

تیرہویں صدی میں کل سترہ زلزلے محسوس کیے گئے۔ جس میں سے سنہ ۱۲۹۳ء میں جو زلزلہ آیا اُس میں اکیس ہزار آدمی ضائع ہوئے۔ چھ سال بعد سنہ ۱۲۹۹ء میں دوسرا زلزلہ پھر آیا اور اُس میں بھی دس ہزار انسانوں کی جانیں گئیں۔ اسی طرح اسی صدی میں ایک معمولی سے زلزلہ میں ایک مندر کے گر جانے سے پچاس پوجاری دب کر مر گئے۔

چودہویں صدی میں آٹھ زلزلے آئے۔ جو قریب قریب اپنی بربادکن نوعیت میں ایک دوسرے سے سبقت لے گئے۔

سمندر کا پانی ان زلزلوں کی وجہ سے چڑھ آتا تھا ساحل پر جو شہر آباد تھے اُن میں ایک عجیب طوفان خیز حالت ہو جاتی تھی۔

پندرہویں صدی میں پندرہ زلزلے آئے۔ اور مثل سابق کے کثیر نقصانات کے باعث ہوئے۔

سولھویں سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں کل ۲۶ زلزلے آئے۔ اور یہ سب

نہایت ہی تباہ کن تھے۔ ۳۰ر اگست ۱۵۹۶ء کا زلزلہ عجیب و غریب تھا زلزلہ کے ساتھ بارش بھی شروع ہو گئی تھی۔ ابھی لوگ سنبھلے بھی نہ تھے کہ چار روز بعد پھر یعنی ۴ر ستمبر کو دوبارہ زلزلہ آیا۔ جاپانیوں کا خیال ہے کہ یہ زلزلے ہیدے یوشی کی جو اُس وقت حکمراں تھا۔ بد اعمالیوں کے عذاب تھے۔ ہیدے یوشی ایک ٹیلہ پر جا کر پناہ گزیں ہوا اور دنیاوی زندگی چھوڑ کر راہبانہ زندگی بسر کرنے لگا۔

جب ہم اٹھارہویں صدی کے زلزلوں کو شمار کرتے ہیں تو چودہ زلزلے صرف ۱۷۸۰ء تک آ چکے تھے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ قریب قریب ہر پانچ سال کے بعد ایک زلزلہ آیا۔ ان میں ۱۷۰۷ء کا زلزلہ سب سے زیادہ مہیب تھا۔ جبکہ زلزلہ کے بعد ہی فوجی یامہ نے آگ اور دھوئیں کی بارش شروع کر دی، جو ۱۶ر دسمبر ۱۷۰۷ء سے ۲۲ر جنوری ۱۷۰۸ء تک برابر جاری رہی۔ یہ ایک عجیب و ہولناک عذاب الٰہی تھا۔ جس کی تپش میلوں تک جاتی تھی۔ گرم راکھ جلتے ہوئے کوئلوں اور لاوے کا طوفان کئی میل رقبہ کو محیط کئے ہوئے تھا۔ اس کے بعد ۲۲ر دسمبر ۱۸۵۴ء کو پھر ایک زلزلہ آیا جس کی وجہ سے کیوتو کے کئی بڑے بڑے کارخانے اور بہت سی عمارات کا نقصان ہوا اور ہزارہا آدمی مر گئے۔

اس کے بعد پھر ۱۸۵۵ء میں دوسرا زلزلہ آیا۔ جس کا سب سے زیادہ اثر اس مرتبہ ٹوکیو پر پڑا۔ گو ٹوکیو ایک سال قبل کا تباہ شدہ تھا تاہم سال بھر کے اندر دوبارہ تباہ ہونے کیلئے بہت کچھ تعمیر ہو چکا تھا۔ چنانچہ چودہ ہزار مکانات، چھ سو فائر پروف گودام اور ایک لاکھ چار ہزار نفوس پھر زلزلہ کی زد میں آ گئے۔ اس کے بعد پندرہ سال تک کوئی زلزلہ نہیں آیا۔ مئی ۱۸۷۰ء میں پھر آیا۔ اس کے بعد ۱۸۸۰ء تک تین زلزلے اور آئے جس میں سے ۱۲ر فروری ۱۸۸۰ء کا سب سے زیادہ سخت تھا۔ جس نے یاکوہاما کو بالکل تباہ کر دیا تھا۔ ۱۸۹۰ء میں ایک معمولی سا زلزلہ محسوس ہوا۔ جس سے شہر کوبے اور ساحل کے دوسرے شہروں میں نقصانات ہوئے۔ ۲۰ر جون ۱۸۹۴ء کا آخری زلزلہ

تھا۔ اس نے بھی یاکوہاما اور ٹوکیو کو سب سے زیادہ برباد کیا۔ ان دونوں شہروں نے اس زلزلے کے بعد سے نئی مغربی صورت اختیار کرنی شروع کی۔

جاپان کی سرزمین پر نظر ڈالنے سے پتہ لگتا ہی کہ مسلسل زلزلوں کی وجہ سے جاپان نے بڑے بڑے ملکی نقصانات اُٹھائے ہیں۔ سطح زمین پہاڑ بن گئی۔ کہیں جھیلیں پیدا ہوگئیں۔ غرضیکہ اس قسم کی تبدیلیوں کا بہت کچھ سراغ ملتا ہی۔ تاہم جاپان نے ان زلزلوں سے فائدے بھی اُٹھائے ہیں۔ ۱۶۹۰ء میں جب زلزلہ آیا تو اُس کے بعد اسوشما (Asoshima) کا خوبصورت جزیرہ سطح آب پر نمودار ہوا۔ جو آج کل یورپین باشندوں کے لیئے ایک نہایت ہی دلچسپ فرحت افزا تفریح گاہ بنا ہوا ہی۔ اسی طرح سے جزیرہ ہانگو کو بھی ایک زلزلے کے بعد جاپان کو قدرت نے عطا کیا اور سمندر سے اوپر نکال دیا۔ تواریخوں میں ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہی کہ کسی ٹیلہ پر ایک کسان کی جھوپڑی تھی۔ شب میں زلزلہ آیا۔ ٹیلہ سطح زمین بن گیا۔ صبح کو کسان اُٹھتا ہی تو اپنی جھوپڑی کو بجائے ٹیلہ کے ایک میدان میں پاتا ہی متعجب ہوتا ہی۔ مگر جب اُسے معلوم ہوتا ہی کہ شب میں زلزلہ آیا تھا تو اُسے یقین ہوتا ہی کہ اُس کی جھوپڑی اپنی اصلی جگہ پر ہے۔

جاپان کا یہ آخری زلزلہ جو یکم ستمبر ۱۹۲۳ء کی دوپہر کو ۲۹ برس کے بعد نمودار ہوا اور جس نے یکایک وہ تمام کوششیں ملیامیٹ کر دیں جو جاپان نے اپنے شہروں کو مغربی رنگ میں لانے کے لیئے کی تھیں، تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا اس غیبی بربادی نے دو منٹ کے اندر اُن تمام عشرت گاہوں، عیش و نشاط کے محل خانوں، تفریحی مقامات، تھیٹروں، بڑے بڑے کارخانوں اور گوداموں کو اس طرح خاک سیاہ کر دیا کہ جہاں ہزارہا انسانوں کی چہل پہل رہتی تھی آج سوائے بیجان لاشوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا! یہ خدا کی کرشمہ سازیاں ہیں، اور اُس کے جبروت و ملکوتیت کی بدیہی مثال۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

۱۰۔ اکتوبر ۱۹۲۳ء
محمد جعفری

رفتار تعلیم

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا چھتیسواں اجلاس آیندہ ماہ دسمبر ۱۹۲۳ء میں بمقام علی گڑھ ہوگا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب اس کے صدر ہوں گے۔ ہندوستان کے اطراف و اکناف سے علم دوست حضرات دعوت کئے گئے ہیں مختلف مضامین پر شاید لکچر بھی ہونگے اسی سلسلہ میں کچھ نمائش کا انتظام بھی کیا گیا ہے جس میں پرانے کتبات، قلمی نسخے اور شاہی فرامین دکھائے جائیں گے۔ مسلمانوں کی تعلیمی حالت پر غور کیا جائے گا۔ کانفرنس کے گزشتہ کارنامے بیان کئے جائیں گے۔ آیندہ ترقی بھی پیش نظر ہوگی۔ تعلیم نسواں اور تعلیم ابتدائی کے وسائل اور ذرائع بھی زیر بحث ہوں گے۔ مختلف تجاویز و ترمیمات بھی پیش ہونے سے نہ رہیں گی، غرض اس چند روز کے عرصہ میں بہت کچھ ہونے کی امیدیں بندھی ہیں۔ "مسلم قوم" منتظر ہے کہ اس کے مرض کی دوا یہیں سے ملے گی۔ ہر شخص آنکھیں اٹھائے ہوئے ہے کہ شاید آیندہ کے لئے کوئی سامان پیدا ہو، خود حضرات شرکا بھی سمجھتے ہوں گے کہتے ہیں تو کچھ کر کے ہی جائیں گے۔ فی الحال تو ہم بھی انھیں کے ساتھ اپنی امید وابستہ کرتے ہیں اور نتیجے کے منتظر ہیں۔ دسمبر کے پرچہ میں ہم انشاء اللہ کانفرنس کی کارروائیوں اور ان کے آیندہ نتائج پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کر سکیں گے۔

کہا جاتا ہے کہ نپولین اور واشنگٹن کو فوج میں ہزارہا سپاہیوں کے نام یاد تھے۔ روزولٹ اور لنکن (ہر دو امریکہ کے پریسیڈنٹ رہ چکے ہیں) کو ہر بات جو انھوں نے کبھی پڑھی یا سنی، زبانی یاد تھی۔ پاسکل مشہور سائنس داں کو پوری انجیل بر زبان تھی۔ شیکسپیر کو ۱۵ ہزار الفاظ اور ملٹن کو ۸ ہزار الفاظ یاد تھے، غرض ہر بڑے شخص کے ساتھ قوت حافظہ ایک مخصوص عنصر رہا ہے اور جیسا کہ بیکن نے کہا ہے "علم کیا ہے؟ فقط اشیار کی یاد داشت ہے"

لیکن اس سے یہ نہیں لازم آتا کہ حافظہ صرف بڑے اشخاص کا حصہ ہے، جو عام آدمی کو میسر نہیں آتا ۔ ہزاروں اشخاص عام طور پر ایسے ملیں گے جو اپنی غیر معمولی یادداشت کا ثبوت دے سکتے ہیں۔ غرض اکتسابی طور پر بھی کوئی شخص چاہے تو اپنی قوت حافظہ کو بڑھا سکتا ہے۔ ڈاکٹر ڈکنسن نے آٹھ چھوٹے قاعدے بتائے ہیں جن کی مدد سے قوت حافظہ بڑھائی جا سکتی ہے۔

قاعدے یہ ہیں۔

۱۔ اپنے خیال میں یکسوئی پیدا کرنے کی عادت ڈالو۔

۲۔ کسی چیز کا خیال قائم کرنے کے لئے جتنے حواس کام میں لا سکتے ہو، لاؤ۔

۳۔ جو قوت دماغی کمزور ہو، اُس کو رفتہ رفتہ باقاعدہ مشق سے بڑھاؤ۔

۴۔ کسی چیز کے متعلق جو پہلا خیال قائم ہو، اُسے مستحکم کرو۔

۵۔ اپنے قائم کردہ خیالات کو بار بار دُہراتے رہو (ایکٹروں کو جو کھیل وہ کئی بار کھیل چکے ہوں انھیں کچھ کچھ عرصہ کے بعد دہرانا چاہیئے۔

۶۔ اپنی یادداشت پر اعتماد رکھو۔ نوشتہ چیزوں اور دوسروں کی یادداشت پر بھروسہ نہ کرو۔

۷۔ اشیاء کے خیال قائم کرنے میں جو جو صورتیں اور جن جن طریقوں سے ہو سکے، قائم کرو۔ کسی چیز کے یاد رکھنے میں: کیا ہے؟ کہاں سے آئی؟ کہاں، کب، کیسے، اور کیوں آئی؟ اور کہاں جا رہی ہے؟ اس قسم کے جتنے سوالات ہوں پیش نظر رکھو۔

۸۔ اپنی اس مشق کو عملی اور مفید بناؤ۔

اس کے متعلق خود راقم الحروف کا ایک تجربہ ہے ایک شخص نے انھی اصولوں کی بنا پر دعویٰ کیا کہ "بیس مختلف چیزوں کے نام ایک ساتھ لو اور میں اسی ترتیب کے ساتھ انھیں یکے بعد دیگرے بتا دوں گا"۔ چنانچہ بیس نام جنھیں باہم کوئی ربط نہ تھا اور اکثر ان میں سے نامانوس اور مشکل تھے ان میں سے ایک لفظ 'عاقر قرحا' بھی تھا لیے گئے اس پر مستزاد یہ کہ

شخص مذکور اس ملک کا باشندہ نہ تھا بلکہ یوریین تھا لیکن فوؤ منٹ تک آنکھیں بند رکھنے کے بعد اس نے اسی ترتیب سے تمام نام یکے بعد دیگرے سُنا دیئے۔ بعد میں اس نے اسی راز کو افشا کیا اور کہا کہ میں ہر چیز کی ایک تصویر اپنے ذہن میں قائم کرتا تھا اور دوسری چیز سے اُسے اسی خیالی تصور کی بنا پر جوڑتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ میرے ذہن میں سب اشیاء کا ایک کامل تصور سلسلہ بن گیا۔ اور اس فومنٹ میں آنکھ بند کر کے میں نے اس پر ایک نظر دوڑائی اور پھر ان قائم کردہ ذہنی تصویروں کی بنا پر اس سلسلہ کی مدد سے تمام اشیاء کے نام یکے بعد دیگرے بیان کر گیا۔"

اس طویل گفتگو سے صرف یہ بتانا منظور تھا کہ "تعلیم" نہ صرف محسوس طریقہ اور مرئی اشیاء کے ذریعہ ہو سکتی ہے بلکہ غیر محسوس طریقہ سے بھی ممکن ہے اور "رفتار تعلیم" میں بہت کچھ ترقی کی جا سکتی ہے۔

یوں تو ہندوستان میں کم و بیش ساڑھے تین سو زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن ان میں چند ایسی ہیں جن پر علمی زبان کا صحیح معنوں میں اطلاق ہو سکتا ہے۔ انہی میں سے ایک مرہٹی زبان بھی ہے جسے ہندوستان کی تمام دیسی زبانوں میں انسائیکلوپیڈیا شائع کرنے کا فخر حاصل ہے۔ علاوہ اس کے زبان مذکور نظم و نثر کے لحاظ سے بھی دوسری زبانوں میں خاص مرتبہ رکھتی ہے اس زبان کے متعلق جتنی انجمنیں اور مجالس کام میں برابر مصروف ہیں ان میں سے ایک مجلس تراجم دکن بھی ہے۔ اس کی تاریخ یوں بیان کی جاتی ہے کہ جس زمانہ میں دکن میں پیشوا کی حکومت تھی، اس وقت پنڈتوں اور علمی اشخاص کو حکومت کی طرف سے قریباً ایک لاکھ روپئے بطور وظائف (جنھیں "دکشنا" کہتے تھے) ملا کرتے تھے۔ جب انگریزوں نے مرہٹی علاقہ برطانوی ہند کے ساتھ ملحق کر لیا تو ماؤنٹ سٹورٹ الفنسٹن (جو غالباً ہندوستان کی مشہور "الفنسٹن ہسٹری" کے مصنف ہیں) نے وہ رقم مشرقی علوم کی ترقی کے لیئے وقف کر دی چنانچہ دکشنا پرائز کمیٹی کے نام سے ایک مجلس قائم کی گئی جو مصنفین و مترجمین کو اس رقم سے معاوضہ دے کر

کام کرانی تھی کچھ عرصے کے بعد ہماری "انجمن ترقی اُردو" کی طرح یہ کمیٹی بھی بیکار ہوگئی لیکن مرہٹی لٹریچر کی خوش نصیبی سے ۱۸۹۴ء میں مجلس تراجم دکن نے اس کی جگہ لے لی۔ آیندہ خیال ہے کہ اس مجلس کے ساتھ مزید علمی حضرات کا اضافہ کرکے اس کا نام اکاڈیمی آف مرہٹی لٹریچر رکھ دیا جائے تاکہ مرہٹی زبان میں تصنیف و تالیف کا کام مستقل طور پر ہو سکے۔

امید ہے کہ قدر شناسان ریختہ اور حامیان اُردو اس کے پڑھنے کے بعد اپنی زبان کی "رفتار ترقی" پر بھی غور فرمائیں گے۔

کچھ عرصہ قبل ترک منشیات کی جو تحریک امریکہ نے اُٹھائی تھی، اس کے خلاف سب سے بڑا عذر جو پیش کیا گیا، وہ کوئی اخلاقی یا مذہبی نہ تھا بلکہ سراسر دنیوی پہلو لیے ہوئے تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اس کی آمدنی سے جو معقول رقم آتی ہے وہ تعلیم پر صرف کی جاتی ہے اور اس بنا پر ان کو اندیشہ تھا کہ اس لعنت کے دور ہو جانے سے ایک بڑی برکت ہاتھ سے چلی جائے گی۔

اسی طرح تحریک ترک موالات کے سلسلہ میں جب ترک منشیات کی کوشش کی جا رہی تھیں، ہندوستان کے بعض "حامیان تعلیم" نے بھی وہی سبق دُہرایا کہ "محکمۂ آبکاری کے بند ہو جانے سے ہندوستان کی تعلیم پر بُرا اثر پڑے گا لیکن شاید وہ یہ دیکھ کر کہ حکومت امریکہ نے قبل از تحریک اور اس کے بعد میں تعلیم پر کس نسبت سے صرف کیے، کیا جواب دیں گے؟ اس کے لیے اعداد حسب ذیل ملاحظہ ہوں:-

اس دو برس میں	سال	مصارف
اس دو برس میں شراب کی بکری کم ہوئی	سنہ ۱۹۱۶ء	۶۴،۰۷،۱۷۰،۵۳ ڈالر
	سنہ ۱۹۱۸ء	۷۶،۳۶،۷۸،۰۵۹ ڈالر
اس سال کم تھی	سنہ ۱۹۲۰ء	۱،۰۳،۶۱،۵۱،۲۰۹ ڈالر

یہ تو ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا حال ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے اخراجات کا اندازہ اعداد

ذیل سے کیجئے۔

	سال	اخراجات	عطیات
اس دو برس میں شراب	سنہ ۱۹۱۶ء	۱۱۳۸۰۵۰۸۴۸	۱۹۷۷۶۳۴۳ ڈالر
کی بکری کم ہوئی تھی	سنہ ۱۹۱۸ء	۱۳۷۰۵۵۰۴۱۵	۱۲۶۷۴۶۱۴۰ ڈالر
اس سال کم نہ تھی	سنہ ۱۹۲۰ء	۱۸۹۲۲۳۵۲۴۲	۵۰۹۰۶۷۵۲ ڈالر

سر جے، سی بوس کی شخصیت ہندوستان کے دور حاضر میں اپنی مثال نہیں رکھتی نہ صرف یہی بلکہ آپ کا شمار دنیا کے مشہور ترین ماہرین سائنس میں ہوتا ہے۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں جب آپ یورپ تشریف لے گئے تو رائل سوسائٹی نے آپ کو اپنا فیلو بنانا فخر سمجھا۔ پیرس میں مشہور سائنس دانوں نے آپ کا شاندار استقبال کیا۔ وائنا اور برلن میں آپ کے علمی کاموں کو نہایت پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا گیا۔

آپ کا سب سے بڑا کارنامہ بوس انسٹیٹیوٹ ہے جو چھ سال سے پیشتر آپ نے کلکتہ میں قائم کیا۔ اس میں کوئی ایک درجن اشخاص تحقیق و تفتیش کا کام نہایت محنت و سرگرمی کے ساتھ کرتے ہیں۔ سر مائیکل سیڈلر نے اس انسٹیٹیوٹ کے متعلق ایک بہت اچھا فقرہ کہا ہے "یہ وہ چراغ ہے جس سے ہزاروں اشخاص نشان راہ پائیں گے"۔

ان دونوں کے تعارف کے بعد ہم سر جے۔ سی بوس کی ایک تازہ ترین تحقیق ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہیں جو آپ نے گزشتہ ہفتہ یونیورسٹی کالج میں پیش کی ہے۔ آپ نے بسلسلہ تحقیق نباتیات ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے جس کے ذریعہ سے پودا اپنی خوراک از خود لے سکتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس جدید آلہ کی اختراع سے آیندہ طب پر جو اثر پڑے گا اس پر طبی رائل سوسائٹی کے کسی خاص اجلاس میں غور کیا جائے گا۔

مطبوعات جدیدہ

افادات مہدی | یہ کتاب دور جدید کے مشہور انشا پرداز ایم مہدی حسن (جنھوں نے ابھی حال میں وفات پائی ہی) کے مضامین کا ایک مجموعہ ہی جو ان کی بیگم صاحبہ نے مقدمہ، سوانح مصنف اور چند ضمیموں کے اضافہ کے ساتھ شائع کیا ہی۔ یہ مجموعہ چونکہ خود کوئی مستقل کتاب نہیں ہی۔ اس لیئے مضامین کے انتخاب اور ان کی ترتیب تالیف میں کما حقہ لحاظ نہیں پایا جاتا ہی لیکن "حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک"۔ "ادب اردو کے عناصر خمسہ"۔ "فلسفۂ حسن و عشق"۔ اور "اردو لٹریچر کا نفس واپسیں" نیز دیگر مضامین جو اپنی وقتی اور ہنگامی اہمیت کے علاوہ آج بھی ذوق سلیم کے لیئے خاص لطف اور دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس مجموعہ میں کچھ مضامین ایسے ہیں گے جن کی زبان علمی حیثیت سے نہایت پاکیزہ اور سلیس ہی۔ مصنفین کے گزشتہ دور اور جدید انگریزی داں طبقہ کے متعلق لکھتے لکھتے تحریر فرماتے ہیں:-

> "یہ ایک کھلا ہوا راز ہی کہ جو ب ما ابھی دیکھتے دیکھتے اٹھ گئی یعنی لٹریچر کے جو حقیقی مالک تھے وہ قریب قریب ایسے تھے جنھیں مشرقی تعلیم نے پیدا کیا تھا اور جن کو مغربیت کچھ یونہی چھو گئی تھی لیکن ان کی قوت اجتہادی کا منظرہ معرکۃ الآرا اسٹریئہ ادب ہی جو ورثہ میں وہ ہمارے لیئے چھوڑ گئے ہیں بہر حال نوجوان طبقہ کی بیگانہ وشی بہت ہی لائق افسوس ہی"

اور جو مضامین خالص ادبی ہیں وہ اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ "فلسفۂ حسن و عشق" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

> "آہ عورت! تو فسانۂ زندگی ہی۔ تو جس طرح ایک جھونپڑے کو اپنی صاف شفاف ہستی سے شیش محل بنا سکتی ہی، بڑے سے بڑے ایوان عیش کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک تیری موجودگی کے آثار اس میں نہ پائے جائیں!"

گنجائش نہیں اس لیئے علمی اور ادبی رنگ ہے یہ اقتباسات بطور مشتے نمونہ از خروارے مختصراً پیش کیئے ہیں اور سچ تو یہ ہی کہ مصنف ایک دلکش اسٹائیل کے موجد تھے جو اپنے ساتھ لائے اور لیتے گئے۔ نئی اصطلاحات مثلاً "قاموس الاسلام" (Encyclopaedia) اور "تنقید عالیہ" (Higher Criticism) اختراعی ترکیبیں جیسے "پنجتن آمعنی" (اردو کے عناصر خمسہ کے لیے) "خاتم المصنفین" (مولینا شبلی کے لیئے) نیز انگریزی ترکیبیں مثلاً "شائقین ترقی کو اپنی سب سے پہلی فرصت میں توجہ کرنی چاہیے" یا "آدھ گھنٹہ علامہ شبلی کے ساتھ" یہ چیزیں مصنف کی خصوصیات میں سے تھیں جنھیں وہ اپنے ساتھ لائے اور لیتے گئے۔ بہرحال یہ مجموعہ اب بھی اخلاف کے لیئے شمع راہ کا کام دے سکتا ہے۔ بیگم صاحبہ نے اسے جلد شائع کرکے اردو زبان کی ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔ کتابت وطباعت نہایت عمدہ، کاغذ اعلیٰ قسم کا، شروع میں مصنف مرحوم کا ایک فوٹو بھی ہی۔ ملنے کا پتہ،

مہدی بیگم، محلہ بسنت پور، گورکھ پور

ماہ نو: یہ کتاب ڈاکٹر ٹیگور کی "شِشُو" کا اردو ترجمہ ہی جسے حامد اللہ افسر صاحب بی۔ اے نے کیا ہی۔ اصل کتاب مختصر نظموں کا ایک مجموعہ ہی اور یہ لحاظ مضمون بچوں کے جذبات وحسیات اور ان کے خیالات کا ایک مرقع ہی۔ یوں تو ٹیگور کی نظر میں ع

ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

لیکن خدا کا جلال اور اس کی معرفت اسے جتنا ایک بچے میں نظر آتی ہی شاید اور کسی چیز میں مشکل سے معلوم ہوتی ہو۔ یہی سبب ہی کہ اس کے اکثر قصے اور افسانے بچوں کے متعلق اور انھیں کے مذاق کے مطابق ہوتے ہیں۔ اصل زبان یعنی بنگالی بھی جہاں تک معلوم ہوا ہی، بہت سلیس اور عام فہم ہوتی ہی۔ ایسی کتاب کا ترجمہ بلاشبہ اردو زبان میں ایک قابل قدر اضافہ ہی۔ خود مترجم نے بھی سلاست زبان اور عام فہمی کی کوشش کی ہی

گو بعض بعض جگہ یہ رشتۂ خیال ہاتھ سے چھوٹ بھی گیا ہو جس کا نتیجہ یہ ہو کہ ایک طرف "اگر" "پیٹر" "تالی" (بمعنی کنجی)، "مسکراہٹ" "بٹنا" "چڑائی"۔ اور "کونے" جیسے سادہ الفاظ پائے جاتے ہیں تو دوسری جانب "مضطرب" "مستعار" "موسیقیت" "پرواز" "طلائی مشجر" "اسرار معنی خیز" اور بزرگ خورد سال" جیسے الفاظ اور ترکیبیں بھی نظر آتی ہیں۔ ہمیں امید ہو کہ مترجم صاحب آیندہ تالیفات میں اس کا لحاظ رکھیں گے کتاب کی لکھائی چھپائی معمولی قسم کی ہو۔ قیمت دس آنہ۔ ملنے کا پتہ، منیجر انڈین بک ڈپو۔ اندرکوٹ شہر میرٹھ۔

خنجر سمرنا | یہ کتاب خالدہ ادیب وزیر تعلیم انگورہ کے ناول "قمیص من نار" کا اردو ترجمہ ہو جسے مولوی غلام ربانی صاحب لودھی (علیگ) نے کیا ہو اور جسے "صوفی پبلشنگ کمپنی" نے شائع کیا ہو۔ سلسلہ عبارت میں کہیں کہیں اس قسم کے فقرے اور ترکیبیں آجاتی ہیں مثلاً "میں گھر کی طرف خط لکھ رہا ہوں"۔ "میری والدہ نے مکان کو یورپین طرز پر سجایا ہوا تھا" "البتہ تمھارے انتظار میں ہوں کہ تم آؤ اور اکٹھے ہجرت کریں" جس سے عام زبان میں ایک اجنبیت سی محسوس ہونے لگتی ہو۔ بہرحال نفس واقعہ ناظرین اردو کے لئے دلچسپی سے خالی نہیں اور کتاب اس لحاظ سے قابل قدر ہو کہ اس کو پڑھ کر ناظرین ترکی معاشرت و سیاست سے یک گونہ آشنا ہو جائیں گے۔

لکھائی، چھپائی اور کاغذ معمولی۔ صفحے ۱۰۶ قیمت ۸؍ ملنے کا پتہ

صوفی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ، پنڈی بہاء الدین، پنجاب

سپاہیانہ زندگی | اکبر شاہ خاں صاحب، نجیب آبادی کی یہ تصنیف ہو مصنف نے سپاہیانہ کے لفظ کو اس قدر وسعت دی ہو کہ انسانی زندگی کے تقریباً ہر پہلو یعنی سادگی لباس و طعام، ایثار نفسی اور ایفاء وعدہ کو اس میں شامل کر لیا ہو اور خود ایک "مورخ" ہونے کی حیثیت سے تاریخ عالم سے حوالے بھی دیے ہیں۔ ظہور اسلام سے قبل انبیاء کرام

اور دیگر ناموراشخاص اور بعد میں خود آنحضرت صلعم، خلفاء راشدین اور سلاطین کے سوانح سے شجاعت و بہادری کے واقعات پیش کیے ہیں۔ ایک باب میں قرآن سے بھی استدلال کیا ہی۔ آخر کے چند صفحات میں ہندوستانی سوسائٹی کے ہر طبقہ میں معائب گنائے گئے ہیں۔ پوری کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ یا تو مصنف کا مقصد مشہور اشخاص کے حالات زندگی اور واقعات تاریخی پیش کرنا تھے یا ہندوستانی سوسائٹی کے عیوب بیان کرنا۔ بہرحال عنوان کتاب کا لحاظ نہ کیا جائے اور تاریخی واقعات کی حیثیت سے دیکھا جائے تو کتاب فائدہ سے خالی نہیں۔ طباعت و کتابت معمولی صفحے ۱۲۶، قیمت ۸/ صوفی پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ پنڈی بہاء الدین پنجاب نے شائع کیا۔

شرحِ دردِ اشتیاق

(از جناب عابد حسین صاحب بی۔ اے۔ از برلن)

میں ربیعِ امکاں کا رنگِ سادہ ہوں
آفرینش کا دلِ پُر درد ہوں
زیست کے آئینۂ دل کا غبار
مرگ کے نقشِ قدم کی گرد ہوں
تھا عدم کی آنکھ میں اک قطرۂ خوں
سینۂ ہستی میں آہِ سرد ہوں
مجھ کو لائے ہیں مری مرضی بغیر
یعنی میں آمد نہیں آورد ہوں

چوں مرا در دارِ دنیا کردہ اند
پس پشیمانند عجب کردہ اند

اے خوشا روزے کہ میں معدوم تھا
بے نیازِ ہستیٔ موہوم تھا
نقش میرا سطحِ امکاں پر نہ تھا
لوحِ قدرت پر مگر مرقوم تھا
ہیں مشیت کے جو معنی دہر میں
میری ہستی کا وہی مفہوم تھا
رشکِ صد ایجاد تھا میرا عدم
سب سے پنہاں تھا اُسے معلوم تھا

از شرابِ شوق جامے داشتم
در دلِ ساقی مقامے داشتم

آ کے اس بازیچۂ اسباب میں
پڑ گیا ہوں سخت پیچ و تاب میں
بحر کی وسعت نظر سے چھپ گئی
موج کے ہمراہ ہوں گرداب میں
آنکھ کا پردہ ہی خود حدِ نظر
مبتدی ہوں معرفت کے باب میں
رکھ لیا محرابِ طاعت اس کا نام
سجدہ زن ہوں طاعتِ محراب میں

سوئے موجودات مائل گشتہ ام
از مآلِ کار غافل گشتہ ام

میرا مونس تھا ابد انجامِ عشق — اصل سے ہٹ کر ہوا بدنامِ عشق
تھا نواسنجِ سکونِ دائمی — دہر میں ہے موردِ آلامِ عشق
شورشِ تخیّل کو کہتے ہیں حسن — اضطرابِ قلب کا ہے نامِ عشق!
چشمِ بینا۔ اور یہ نادارِ حسن! — قلبِ صافی۔ اور یہ ناکامِ عشق

دردمندی را کہ سازد چارہ ساز
وائے بر گمراہیِ عشقِ مجاز

باعثِ تسکیں مگر ہے یہ خیال — عارضی ہے زیست کا رنج و ملال
اتحادِ نور و ظلمت تا بہ کے — چند لحظہ۔ چند ساعت چند سال
پھر وہی آہنگِ سیرِ لامکاں — پھر وہی سودائے حسنِ لازوال
قیدِ صورت سے ملے گی پھر نجات — شاہدِ معنی سے پھر ہوگا وصال

مرغِ جاں را آشیانے دیگر است
"ایں مکاں را ہم مکانے دیگر است"

عابد

قیدِ ناگزیر

(از نتائجِ فکر جناب مولوی فضل الحق صاحب آزاد عظیم آبادی)

شب کے اخیر حصۂ غفلت میں یک بہ یک   جب ساری کائنات ہے آغوشِ خواب میں
کھلتی کبھی ہے اور جھپکتی کبھی پلک   اک التہاب ہے دلِ پُر اضطراب میں

جس طرح آبدانِ بر آتش میں جوشِ آب   خمیازہ ہائے نشترِ عناصر لیے ہوئے
آنکھوں میں مستحیل کچھ آنسو ہیں یا گلاب   خونِ جگر سے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

کیوں؟ دل میں یہ کھٹک ہے کسی گلعذار کی   دل آب آب جس کے ہوائے فراق سے؟
یا آگئی ہے یاد کسی جاں نثار کی   یا آگئے ہیں آنکھوں میں اشک اتفاق سے؟

کچھ بھی نہیں وہ ہائے کہاں ہم کہاں وہ دل   کیسی کسی کی یاد یہ سب اک خیال ہے
ماضی کی حسرتیں غمِ آیندہ جاں گسل   اس قیدِ ناگزیر سے چھٹنا محال ہے

آزاد عظیم آبادی

غزل

از تازہ افادات مولانا محمد علی مدظلہ

گلہ اے دل! ابھی سے کرتا ہے؟ — عشق کا دم اسی پہ بھرتا ہے؟

جان دیتا ہے عیشِ فانی پر — بس اسی زندگی پہ مرتا ہے؟

راحتِ جاوداں کو بھول گیا — کوئی دنیا میں یہ بھی کرتا ہے!

عشق بن کر جیے تو خاک جیے — زندہ وہ ہے جو اُس پہ مرتا ہے

نام پر اُس کے سب جو دے بیٹھا — وہی اک ہے جو نام کرتا ہے

تعریفِ مومن ہے آزمائشِ عشق — اس میں پورا وہی اُترتا ہے

جس کو دنیا نے نامراد کہا — وہی ناکام کام کرتا ہے

ہے مسلماں کی بس یہی پہچان — کہ فقط اک خدا سے ڈرتا ہے

قولِ مومن ہے اُس کے فعل کی شرح — وہ جو کہتا ہے کر گزرتا ہے

مطمئن رہ، دلا، وہ جانِ جہاں — وعدہ کر کے کہیں مکرتا ہے

میرے رنگِ کفن کی شوخی دیکھ — یوں ہی عاشق ترا سنورتا ہے!

آج کر لو جو کر سکو، کل تک — کون جیتا ہے، کون مرتا ہے!؟

قلزمِ عشق میں گرا سو گرا — اس کا ڈوبا کہیں ابھرتا ہے؟

اِس قدر احتیاط، اے صیاد! — کہ قفس میں بھی پر کترتا ہے؟

وہی دن ہے ہماری عید کا دن — جو تری یاد میں گزرتا ہے

مےِ اسلام کا بھلا، جوہر!
نشہ چڑھ کر کہیں اترتا ہے؟

اگست سنہ ۱۹۲۲ء

غزل

(از مولانا حسرت موہانی)

نظر اس رُخ پہ ہے ادب کے خلاف
دل ہے اس فیصلہ میں سب کے خلاف

کچھ بھی ہم اُن سے کہہ سکے نہ کہیں
ناخوشیہائے بے سبب کے خلاف

شکرِ غم تابعِ خمار نہیں
مستیٔ بادۂ عنب کے خلاف

آج پر کیا وہ روز کرتے ہیں
بیرخیٔ وعدہائے شب کے خلاف

حُسنِ جاناں کے عہد میں حسرت
شوق ٹھہرا ہے ماوجب کے خلاف

تواریخ صلح لوزان کانفرنس

(نتائج فکر جناب مولوی حامد حسن صاحب قادری اڈیٹر اخبار "سعید")

۱

(در صنعت زبر و بینات غیر منقوط)

صلح کرده بکمالِ کامل
عادل - محمود عصر و ہمدرد
حامد را کرد ملہم الہام
صلح حاصل مراد دل کرد

۱۳۴۱

۲

(در صنعت زبر بقاعدهٔ معمولی غیر منقوط)

مالکِ ملکِ دو عالم کرد مسلم را عطا
صلح کامل، دارو درد دل و آرام دل
مصرعِ سالِ حصولِ صلح آمد در دلم
سرور و سالار صالح کرد حاصل کام دل

۱۳۴۱

۳

(در صنعت زبر و بینات بغیر صنعت غیر منقوط)

اے کمال اکملِ عصری لاریب
عادل و شیر دل و دریا دل
ناخنِ زیرکی و ہمت تو
حل کند عقدهٔ کارِ مشکل
صلح در مجلسِ لوزان کردی
بحقیقت شده فتحے کامل
حامد اندر زُبُر و بینہ گفت
کردهٔ فتح بیشنے حاصل

۱۳۴۱

تاریخ رہائی مولانا محمد علی

(در صنعت زبر و بینات)

آں محمد علی رہبر ہند
عزت قوم را علم بردار

کہ بر اسلام و مسلماں کردہ
وقف مال و متاع و جاہ و وقار

ہم بسر خویشتن بیعت دارد
کہ کند بہر دین خویش نثار

چوں ز قید فرنگ شد آزاد
گشت مسرور قلب حامد زار

گفت تاریخ بینات و زبر
باشد آزاد سرور سالار

۱۹۲۳

شذرات

'مغربی تہذیب' کہئے یا 'تمدن جدید' اس کے معائب و نقائص پر گزشتہ ربع صدی اندر مشرق میں بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے اور اب تک زبان و قلم اس تہذیب کی ہرزہ گوئی سے تھکے بھی نہیں۔ جنھوں نے مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھا، ان کی نظر میں مغرب 'بیگانہ از دین مذہب' اور 'مادیت کا مجسمہ' نظر آیا۔ جنھوں نے اخلاقی عینک لگا کر اس تہذیب پر نظر ڈالی انھیں اس کا ہر ہر جزو 'مخرب اخلاق' دکھائی دیا۔ جنھوں نے اس کی معاشی زندگی کا مطالعہ کیا انھیں سرمایہ و مزد باہم گردست و گریباں نظر آئے اور بعض نے اس کے سیاسی نظام کو دیکھا انھیں یہ تہذیب 'رو بہ زوال' اور اندر سے کھوکھلی معلوم ہوئی۔ غرض جس نے جس پہلو سے دیکھا، اُسے یہ تہذیب اور نظام سرتاپا عیب ہی عیب نظر آیا اور مشرق یہ سُن سُن کر خوش ہو رہا تھا اور بعض بہی خواہانِ مشرق تو اس حد تک پہونچ گئے کہ زوالِ مغرب خود عروجِ مشرق ہے! لیکن شاید مشرق اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ اطبائے مغرب ان امراضِ تہذیب کی تشخیص و علاج سے بھی غافل نہیں۔ ابھی حال میں جرمنی کے ایک فاضل مصنف نے "پان یوروپا" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جس میں وہ حسرت کے ساتھ کہتا ہے:-

> "جہاں بقیہ دنیا دن بدن ترقی کر رہی ہے، یورپ رو بہ تنزل ہے، صرف اسی قدر کہہ دینا ایک تفصیل سے کم نہیں"

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ

> "گزشتہ عالمگیر جنگ نے یورپ کے ہر شخص کی سیاسی حالت بدل دی لیکن وہاں کے سیاسی نظام میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا ہے۔ آج بھی یورپ میں طوائف الملوکی، جبر و تعدی، بغض و عداوت، معاشی حیثیت سے اختلافاتِ مراتب اور سیاسی

چالوں کا اسی طرح دار ومدار ہے جس طرح قبل از جنگ تھا۔ یورپ کی موجودہ پالیسی آئندہ کی بہ نسبت گزشتہ پالیسی سے زیادہ مشابہ ہے۔ یورپ تاریخ مستقبل کی بجائے ماضی کی طرف کئے ہوئے ہے۔ ہمارے علمی بازار میں بھی تزک سوانح کی زیادہ زور ہے۔ عام مباحثے بھی زیادہ تر گزشتہ جنگ کے اسباب و علل پر ہوتے ہیں نہ کہ آئندہ جنگ کے انسداد پر۔

"یورپ کا ہمیشہ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھنا ہی اس کے انحطاط اور اختلافات کا اصل باعث ہے۔ یہ اس کے نوجوانوں کا فرض ہے کہ اسے بدلیں۔ ان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ قدیم یورپ کے باقی ماندہ نشانات پر جدید عمارت کھڑی کردیں۔"

فاضل مصنف کے ان ارشادات میں کیا ہندوستان کے لئے کوئی سبق نہیں ہے؟ ہے اور بہت کچھ ہے بشرطیکہ گوشِ دل سے سنیں اور عمل کریں۔

لائق حکیم نے امراض اور ان کی تشخیص ہی بتا کر بس نہ کیا بلکہ ان کا علاج بھی سوچا ہے۔ اس کی تجویز یہ ہے کہ تمام یورپ اپنے اندرونی سیاسی و معاشی اختلافات کو مٹا کر ایک ہو جائے اور ایک دوسرے کی امداد و اعانت کے لئے تیار رہے۔ جو راہِ عمل وہ ملک کے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ "پان یوروپا" یعنی "اتحاد یورپ" کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

"لوگ یہ سمجھیں گے کہ "پان یوروپا" ایک خیال ہے۔ یہ اعتراض ٹھیک نہیں۔ کوئی قانون قدرت اس کے لئے مانع نہیں ۔۔۔ ہر بڑے تاریخی کارنامے کی ابتدا 'خیال' ہی سے ہوئی اور خاتمہ حقیقت پر ہوا ۔۔۔۔۔ "پان یوروپا" (اتحاد یورپ) کا مستقبل زیادہ تر ان ابتدائی ہزار اشخاص پر منحصر ہے جو اپنے اعتقاد اور عزم سے لاکھوں کو اس کا قائل بنادیں اور کل (گزشتہ) کے 'خیال' کو کل (آئندہ) حقیقت کر دکھائیں۔ میں یورپ کے نوجوانوں سے یہ اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس فرض کو

انجام دیں"
یہ سب سننے کے بعد ہم تو ان اطبا سے عرض کریں گے کہ آپ یہ ہیں جیتے۔ زخم کہنہ ہو کر ناسور کی حد کو پہونچ گیا اور اس پر صحت کی امید۔

ع ایں خیال است و محال است و جنوں

ایم امیل کوئی ایک فرانسیسی ڈاکٹر نے ایک جدید طریقۂ علاج ایجاد کیا ہے اور ہزار ہا مریض ہر روز ان کے شفا خانے پر آتے ہیں اور بے دوا شفا پاکر چلے جاتے ہیں۔ وہ یہ کرتا ہے کہ مریضوں کو تیس تیس، چالیس چالیس کے گروہ بٹھا کر ان سے کہتا ہے کہ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر خوب زور سے دبائیں یہاں تک کہ ہاتھ کانپنے لگتا ہے، پھر اس کے بعد ان سے یہ کہتا ہے کہ وہ خیال کریں کہ وہ اپنا ہاتھ ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے اور پھر ان سے کہتا ہے کہ اب چھڑالو لیکن وہ ناکام رہتے ہیں۔ اس کے بعد کوئی انھیں یہ سمجھاتا ہے کہ جہاں تم نے یہ سمجھا کہ "میں یہ نہیں کر سکتا" تو اس وقت تمھارے لئے ہاتھوں کا چھڑانا ناممکن ہے۔ اس کے بعد مریض آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور وہ ان سے کہتا ہے کہ اپنے اپنے دلوں میں اطمینان رکھو۔ تمھارے تمام اعضا درست ہو گئے اور تم اب بالکل اچھے ہو گئے اور چلتے وقت ان سے یہ تاکید کر دیتا ہے کہ وہ صبح و شام بیس مرتبہ یہ کہیں کہ "میں ہر روز ہر نقطۂ نظر سے اچھا ہوتا جاتا ہوں"۔

بعض وقت جب درد کی شکایت ہوتی ہے تو انھیں یہ نسخہ بتایا جاتا ہے کہ وہ جس قدر جلد ہو سکے یہ کہیں کہ "درد کم ہو رہا ہے، درد کم ہو رہا ہے"۔ اس سلسلہ میں یہ امر خاص طور پر ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ اس علاج کی طرف زیادہ تر امراء کا طبقہ رجوع کرتا ہے اور جو لوگ اس شفا خانے میں آتے ہیں، وہ ڈاکٹر اور اس کے طریقۂ علاج کی شہرت و اہمیت سے مرعوب ہو چکتے ہیں۔

یاد ہوگا قدیم ہندوستان میں اور آج بھی بکثرت قصبات و دیہات میں ہزارہا مریض
ایک منتر یا معمولی دعا و تعویذ سے شفایاب ہو جاتے ہیں۔ بہت سے امراض ایسے ہیں جن کے
علاج سے اکثر اطبا اور ڈاکٹر عاجز آجاتے ہیں لیکن کسی مقامی یا قریبی دیہات کے ایک معمولی شخص
کی "چھومنتر" اور جھاڑ پھونک سے وہ مریض فوراً اچھے ہو جاتے ہیں۔ مغرب اور مغربی تہذیب کے
مشرقی شیدائی اسے "توہم" اور "جہالت" سے تعبیر کریں گے اور حقارت کے ساتھ معالج
اور معالجہ دونوں کو "قرن وسطیٰ" سے منسوب کریں گے۔ لیکن کوئی اور اس کے طریقۂ علاج
کا ان کے پاس کیا جواب ہے؟ یہ ناآشنایانِ حقیقت اب تک ان معالجین اور ان کے طریقۂ
علاج کے پیچھے پڑے تھے لیکن وہ اس راز سے بے خبر تھے کہ یہ مریضوں کے "اعتقاد" اور
"یقین" کا نتیجہ تھا جس نے ان کو شفا بخشی۔ یا بعض ماہرین نفسیات کی اصطلاح میں یہ
(Sub-Conscious Mind) کا اثر تھا۔

مکتبہ جامعہ ملیہ علیگڑھ

مشہور مصنفوں کی مشہور کتابیں

اور اُردو زبان کی تازہ ترین مطبوعات

آسانی اور کفایت سے صرف مکتبہ ہذا سے مل سکتی ہیں

المدینۃ والاسلام

(مترجمہ مولوی رشید احمد صاحب مرحوم)

یہ وہ معرکۃ الارا، کتاب ہی جو بار بار شائع ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئی۔
اب تازہ اڈیشن پھر شائع ہوا ہی جو صرف مکتبہ جامعہ سے مل سکتا ہی۔ قیمت عہ/

خواجہ عبدالحی صاحب کی تصانیف

خواجہ صاحب کی تصانیف میں تفسیر القرآن نے خاص مقبولیت حاصل کی ہی جس کے
دو حصے شائع ہو چکے ہیں۔ کاغذ عمدہ، اور طباعت و کتابت نفیس ہی۔

الخلافۃ الکبریٰ جو تمام تر سورۂ بقر کی تفسیر ہی غیر مجلد للعہ مجلد صہ/

الصراط المستقیم سورۂ توبہ و انفال کی تفسیر ہی غیر مجلد عاً/

بصائر حضرت موسیٰ و فرعون کے واقعات پر قصص قرآنی سے
نہایت دلآویز تشریح کی گئی ہی۔ قیمت ۶/

دیوان غالب اردو

جس طرح نظم اردو کی بہترین کتاب تسلیم کی جاتی ہے اسی طرح جو اڈیشن ہم نے خاص اہتمام سے جرمنی سے چھپوا کر منگایا ہے اس کے متعلق بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس سے بہتر اردو زبان میں آج تک کوئی کتاب طبع نہیں ہوئی نہایت نفیس ملائم سرخ جلد پر سنہرا کام ہے اندر مرزا صاحب کی رنگین تصویر ہے اور پھر مکمل دیوان مع قصائد و غزلیات رباعیات اور اس کے بعد بیاض کے لیے سادہ اوراق دیئے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ قابل قدر خود مرزا غالب مرحوم کا لکھا ہوا مقدمہ ہے جو شروع میں درج ہے اس اڈیشن کی مقبولیت کی یہ حالت ہے ہم کو کسی طرح امید نہیں کہ شائقین تک پہونچ سکے بہر حال درخواست خریداری بھیج دیجئے تاکہ نام درج رجسٹر ہو جائے اور اس وقت نہیں تو دوسرے اڈیشن پر مایوسی نہ ہو۔ قیمت صرف تین روپیہ ہے،

المشتہر

مہتمم مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ

اللہ اکبر

جامعہ

جامعہ ملّیہ اسلامیہ علیگڑھ

کا

ماہوار علمی رسالہ

مرتبہٗ نور الرحمٰن

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ

قیمت سالانہ للعہ

فہرست مضامین

جلد ۲	ماہ جمادی الاول سنہ ۱۳۴۲ھ مطابق دسمبر سنہ ۱۹۲۳ء		نمبر ۶
نمبر شمار	**مضمون**	**مضمون نگار**	**نمبر صفحہ**
۱	تاریخ تصوف کا ایک ورق	مولوی عبدالماجد صاحب بی اے	۳۳۲
۲	دولت گیتا	مسٹر کے۔ ایم پانیکار اڈیٹر سوراجیہ	۳۴۸
۳	جمہور اور تصویت	مولوی محمد مسلم ایم اے	۳۵۸
۴	امید اور جاہ طلبی	مولوی سعد انصاری	۳۶۵
۵	جشن نوروز اور ایک محفل مذہبی	محمد مجیب صاحب بی۔ اے آکسن	۳۷۵
۶	مجلس اقوام	عبدالقادر صاحب متعلم جامعہ	۳۸۶
۷	مطبوعات جدیدہ	ناقد	۳۹۲
۸	برق بے جولاں	حافظ سید فضل حق صاحب آزاد عظیم آبادی	۳۹۷
۹	حیات	"صدائے خاموش"	۳۹۸
۱۰	رقص بسمل	مولوی محمد مسلم ایم اے	۳۹۹
۱۱	کلام فانی	جناب شوکت علی صاحب فانی	۴۰۰
۱۲	غزل	جناب اعزاز الدین صاحب ایم اے	۴۰۱
۱۳	شذرات	مدیر	۴۰۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

نمبر ۶	ماہ جمادی الاول ۱۳۴۲ھ مطابق دسمبر ۱۹۲۳ء	جلد ۲

تاریخ تصوف کا ایک ورق

کشف المحجوب

شیخ علی بن عثمان ہجویریؒ

(بسلسلہ اشاعت گزشتہ)

مخدوم موصوف علیہ الرحمۃ کے مرتبہ کمال کا اعتراف سب کو رہا ہے۔ خواجۂ خواجگان حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ اور شیخ المشائخ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ جیسے مسلّم اکابر نے آپ کے مزار پر چلّے کھینچے ہیں، اور فیوض و برکات حاصل کیے ہیں چنانچہ دونوں حضرات کے مکانات چلّہ کشی ابتک موجود محفوظ ہیں۔ ملا جامی ان الفاظ میں تصنیف و مصنف کی جلالت قدر کا اعتراف کرتے ہیں:۔

"عالم و عارف بودہ ۔ ۔۔ ۔۔ و بہ صحبت بسیارے از مشائخ دیگر رسیدہ است۔ صاحب کتاب

کشف المحجوب است، کہ از کتب معتبرہ مشہورہ دریں فن است و لطائف و حقائق بسیار در آں کتاب جمع کردہ است۔[1]

شہزادہ داراشکوہ کے نزدیک فارسی زبان میں تصوف پر کوئی کتاب کشف المحجوب کے ٹکر کی نہیں:-

"خانوادۂ ایشان خانوادۂ زہد و تقویٰ بودہ، و حضرت پیر علی ہجویری را تصنیف بسیار است۔ اما کشف المحجوب مشہور و معروف است و ہیچکس را بر آں سخن نیست و مرشدے است کامل، و در کتب تصوف بہ خوبی آں در زبان فارسی تصنیف نہ شدہ۔ و خوارق و کرامات زیادہ از حد و نہایت و بارہا بر قدم تجرید و توکل سفر کردہ اند"[2]

سب سے بڑھ کر قابلِ استناد و قابلِ افتخار قول حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاؒ کا ہے آپ کا ارشاد تھا، کہ "جس کا کوئی مرشد نہ ہو، اس کو کشف المحجوب کے مطالعہ کی برکت سے مل جائے گا۔" ایک غیر مطبوع ملفوظ دُررِ نظامی میں ہے:-

"می فرمودند کشف المحجوب از تصنیف شیخ علی ہجویری قدس اللہ اگر کسے را پیرے نہ باشد چوں ایں کتاب را مطالعہ کند او را پیدا (؟) شود ... من ایں کتاب را بہ تمام مطالعہ کردہ ام"[3]

مخدوم موصوف کی اس کرامت کا ذکر متعدد تذکروں میں ہے، کہ لاہور میں آپ نے جو مسجد تعمیر کرائی تھی، اُس کی محراب میں بہ مقابلہ دوسرے مساجد کے، سمت جنوب میں ذرا کجی تھی۔ علمار وقت نے اعتراض کیا، کہ سمت قبلہ نہیں رہی۔ آپ نے ایک روز سب کو جمع کر کے خود نماز پڑھائی، اُس کے بعد حاضرین سے کہا کہ "خود دیکھ لو کعبہ کدھر ہے" حجابات اُٹھ گئے۔ سب نے دیکھا کہ کعبہ مسجد کے ٹھیک مقابل ہے۔

---

[1] نفحات الانس جامی ص۳۵۵ (مطبوعہ کلکتہ) [2] سفینۃ الاولیا، داراشکوہ ص۱۶۴

[3] دُررِ نظامی، مرتبہ شیخ علی محمود جاندار۔ نسخہ قلمی

(۲) تصنیف

کشف المحجوب تصوف کی قدیم ترین کتابوں میں ہے، اور فارسی زبان میں تو اس سے قدیم تر کوئی کتاب تصوف پر دریافت نہیں ہو سکی ہے۔ مصنف رحمۃ اللہ علیہ اپنی متعدد ابتدائی کتابوں اور اپنی سکونت لاہور کا ذکر کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف آخر عمر میں فرمائی ہے یعنی پانچویں صدی ہجری کے وسط میں۔ اسی کتاب کے تقریباً ہمعصر شیخ ابو القاسم قشیری کا عربی رسالہ قشیریہ ہے۔ موضوع اُس کا بھی تصوف ہی ہے لیکن دونوں کی طرزِ تصنیف میں فرق یہ ہے کہ امام موصوف نے زیادہ تر متقدمین کے اقوال و حکایات کے نقل کر دینے پر اکتفا کی ہے بہ خلاف اس کے مخدوم ہجویری ایک محققانہ و مجتہدانہ انداز سے اپنے ذاتی تجربات، مکاشفات و مجاہدات وغیرہ کو بھی قلمبند کرتے جاتے ہیں، اور مباحث سلوک پر رد و قدح کرنے میں بھی تامل نہیں کرتے۔ اُن کی کتاب کی حیثیت محض ایک مجموعہ حکایات و روایات کی نہیں، بلکہ ایک مستند تصنیف کی ہے۔ صورت تصنیف یہ ہے کہ کوئی صاحب ابو سعید نامی فرضی یا واقعی سائل ہیں۔ انھوں نے حضرت مخدوم کی خدمت میں عرض کی ہے کہ

> "بیان کن مرا اندر تحقیق طریقت تصوف و کیفیت مقامات ایشان، و بیان مذاہب و مقالات آن، و اظہار کن مرا رموز و اشارات ایشان و چگونگی محبت خدای عز و جل و کیفیت اظہار آن بر دلہا و سبب حجاب عقول از کنہ ماہیت آن و نفرت نفس از حقیقت آن و آرام روح با صفوت آن و آنچہ بدین تعلق دارد از معاملت آن" (ص ۶)

ساری کتاب اسی سوال کا جواب اور انھیں مراتب کی تفصیل ہے۔

مضامین تصانیف کے سرقہ میں، معلوم ہوتا ہے، اس وقت کے لوگ بہت جری و بیباک تھے۔ مصنف رح کو دو بار ان لوگوں کے ہاتھوں تلخ تجربات ہو چکے تھے۔ ایک مرتبہ کسی صاحب نے مسودہ دیوان مصنف سے مستعار لیا، اور واپس کرنے کے بجائے اپنے نام و تخلص کے ساتھ اس کی اشاعت شروع کر دی۔ دوسری بار یہ اتفاق ہوا کہ ان کی ایک تصنیف فن سلوک

میں منہاج الدین کے نام سے تھی۔ اُسے کوئی شخص اُڑا لے گیا، اُن کا نام کاٹ کر عنوان پر اپنا نام لکھ دیا اور اُس کی تصنیف کو اپنی جانب منسوب کرنا شروع کر دیا۔ کشف المحجوب کی تصنیف ان تصنیفات کے بعد کی ہے۔ اُس کے آغاز میں اسم مصنف کی تصریح ضروری تھی۔ ان حالات کا ذکر ابتدای سخن میں خود ہی فرمایا ہے:۔

"آنچہ اندر ابتدائے کتاب نام خود ثبت کردم مراد اندر آں دو چیز بود، یکے نصیب خاص و دیگر نصیب عام۔ و آنچہ نصیب عام بود آن ست کہ چوں جہلا ایں علم کتابے بنید نو کر مصنف آں بہ چند جاے ثبت نہ باشد نسبت آں کتاب بہ خود کنند، و مقصود مصنف ازآں برنیاید کہ مراد از جمع و تالیف و تصنیف کردن بجز آں نہ باشد کہ نام مصنف بداں کتاب زندہ باشد، و خوانندگاں و متعلمان وے را دعاے نیکو کنند، کہ مرا ازیں حادثہ افتاد بدو بار۔ یکے آنکہ دیوان شعرم کسے بخواست و باز گرفت و اصل نسخہ جز آں نبود۔ آں جملہ را بہ گردانید و نام من از سرآں بیفگند و رنج من ضائع گردانید تاب اللہ علیہ۔ و دیگر کتابے تالیف کردم اندر طریق تصوف عمرہ اللہ نام آں منہاج الدین۔ یکے از مدعیاں رکیک کہ گراں گفتار نام او نکند، نام من از سرآں پاک کرد، و نیز دیک عوام چناں نمود کہ آں وے کردہ است، ہر چند خواص برآں قول وے خندیدندے تا خداوند تعالے لابے برکتی آں بدو رسانید، تا مش از دیوان طلاب درگاہ خود پاک گردانید" (ص۲) ۔

اس سرقے سے اتنا خائف تھے کہ اسی ایک تصریح پر اکتفا نہیں کی ہے، بلکہ درمیان کتاب میں بار بار اپنے پورے نام کی تصریح فرماتے گئے ہیں۔

لاہور کا جو مطبوعہ نسخہ پیش نظر ہے، اُس کا ہر صفحہ اغلاط طبع و کتابت سے لبریز ہے بعض مقامات پر عبارت بے معنی ہو گئی ہے۔ بعض مقامات پر حضرت مصنف کے بالکل خلاف منشا معنی نکلتے ہیں، اور اس سے بڑھ کر ستم یہ ہے، کہ اکثر مقامات پر اسما اشخاص مواضع بالکل مسخ ہو گئے ہیں۔ دوسرا تکلیف دہ امر پیش نظر نسخہ میں یہ ہے کہ کسی قسم کی فہرست مضامین وغیرہ درج نہیں۔ کتاب

متعدد ابواب فصول میں منقسم ہی۔ ہر باب فصل کے الگ الگ پیراگراف (بند) ہیں۔ لیکن کاتب صاحب نے بای بسم اللہ سے لے کر تا سے تمت تک ۲۲۸ صفحہ کی کتاب کا یکساں قلم رکھا ہی۔ نہ کہیں کوئی پیراگراف (بند) توڑا ہی، نہ ایک باب فصل کے اختتام اور دوسرے کے آغاز کو کوئی نمایاں امتیاز دیا ہی۔ راقم مضمون نے بطور خود ایک فہرست مضامین اور بعض دوسری فہرستیں مرتب کی ہیں۔ جن سے ناظرین کو مطالعہ کتاب میں شاید کچھ سہولیتں حاصل ہو سکیں۔

شروع کے چھ صفحہ (ص۱تا۶) بہ طور مقدمہ یا تمہید کے ہیں جس میں سبب تالیف، موضوع سخن، وغیرہ کی تصریح ہی۔ اس کے بعد ترتیب مضامین حسب ذیل ہی:-

(۱) باب الاول فی اثبات العلم (ص۶تا۱۴) اس میں علم کی ماہیت اس کے فضائل اور اس کے اقسام کا بیان ہی۔ مشہور صوفی حاتم اصم کا قول نقل کیا ہی کہ تمام علوم میں سے

حاتم الاصم گفت رضی اللہ عنہ کہ چار علم اختیار کردم، واز ہمہ علماے عالم برستم۔ .. .. یکے آنکہ بدانستم کہ مرا رزقی ست مقسوم کہ زیادت وکم نہ شود، از طلب زیادت برآسودم و دیگر آنکہ بدانستم کہ خدای را بر من حقے ست کہ جز من کسے دیگر نہ تواند گزارد، بہ ادای آں مشغول گشتم۔ سہ دیگر آنکہ دانستم کہ مرا طالبے ست یعنی مرگ کہ ازو نتوانم گریخت آنرا بساختم(؟) چہارم آنکہ دانستم مرا خداوندے ست مطلع بر من از وے شرم داشتم واز ناکردنی دست بازداشتم (ص۱۰)

چار چیزوں کا علم میں نے اختیار کر لیا ہی، اور باقی کی حاجت نہیں رہی .. .. اول یہ کہ رزق کی ایک مقدار مقسوم ہی، جس میں کمی وبیشی نہیں ہو سکتی اس لیئے اس میں اضافہ کی فکر سے نجات پا گیا ہوں دوسرے یہ کہ خدا کی جانب سے میرے اوپر جو حقوق عاید ہیں اُن کی بجا آوری میرے ہی ذمہ فرض ہی، اس لیئے اُن کی ادائی میں مصروف رہتا ہوں تیسرے یہ کہ میرے تعاقب میں موت لگی ہوئی ہی جس سے کسی طرح گریز ممکن نہیں، اس لیئے اُس سے ملنے کی طیاری کرتا رہتا ہوں۔ چوتھے یہ علم ہی، کہ خدا میرے حال کو دیکھتا رہتا ہی اس سے شرم کرتا ہوں۔ اور ممنوعات سے بچتا رہتا ہوں۔

علم صحیح کے لیئے علم ظاہر (شریعت) وعلم باطن (حقیقت) کی جامعیت ضروری ہی صرف

ایک کا وجود طالب کے لیے مضر ہوگا۔
ظاہر ورزش معاملت و باطنش تصحیح نیت۔ و
قیام ہر ایک ازیں بے دیگرے محال باشد
ظاہر بے حقیقت باطن نفاق بود و باطن بے
ظاہر زندقہ۔ و ظاہر شریعت بے باطن نقص
بود و باطن بے ظاہر ہوس۔ پس علم حقیقت
را سہ رکن است یکے علم بذات خداوند تعالےٰ و
وحدانیت وے و نفی تشبیہ از وے، و دیگر
علوم بہ صفات خداوند تعالیٰ و احکام آں،
و سہ دیگر علم بہ افعال و حکمت وے و علم شریعت را
نیز سہ رکن است۔ یکے کتاب۔ دیگر سنت
و سہ دیگر اجماع امت (ص۱۰)

.. .. ظاہر بغیر امتزاج باطن کے نفاق ہے
اور باطن بغیر امتزاج ظاہر کے زندقہ۔ شریعت
بلا حقیقت نقص ہے اور حقیقت بلا شریعت ہوس
علم حقیقت کے تین ارکان ہیں۔ علم ذات و توحید
و نفی تشبیہ خداوندی۔ علم صفات خداوندی
و علم افعال و حکمت افعال خداوندی۔ اسی طرح علم
شریعت کے بھی یہ تین رکن ہیں۔ قرآن، سنت رسول
و اجماع امت

علم ذات خداوندی کی تعلیم اس قسم کی آیات قرآنی میں بہ کثرت ملتی ہے:۔

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه۔ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰكُمْ۔ اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ۔ اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ۔ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ

نیز اس قسم کی احادیث نبوی میں کہ مَنْ عَلِمَ اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى رَبُّهٗ وَاَنِّىْ نَبِيُّهٗ حَرَّمَ اللّٰهُ تَعَالٰى لَحْمَهٗ وَدَمَهٗ عَلَى النَّارِ۔

علم صفات خداوندی کی جانب رہبری اس قسم کی آیات قرآنی کرتی ہیں۔ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ۔ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ۔ هُوَ الْحَيُّ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ وقس علی ہذا۔

علم افعال خداوندی کی بابت اس قسم کی آیات قرآنی میں اشارہ ہے۔ وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ۔ اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ وقس علی ہذا۔

علم شریعت کے رکن اول، کتاب اللہ سے اعتصام کی دلیل پر ارشاد حق تعالیٰ ہے فِیْہِ آیَاتٌ مُّحْکَمَاتٌ ہُنَّ اُمُّ الْکِتَابِ۔ رکن دوم سنت نبوی کی شاہد عدل یہ فرمان ربانی ہے۔ وَمَا آتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَہٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَہُوْا۔ رکن سوم اجماع امت کی دستاویز استناد یہ ارشاد حضرت رسالت ہے۔ لَا یَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلَالَۃِ عَلَیْکُمْ بِالسَّوَادِ الْاَعْظَمِ۔

علم بہ شمول علم شریعت کی اہمیت پر جتنا زور دیا ہے اُس کا مزید اندازہ اقتباس ذیل سے بھی ہوگا :-

محمد بن فضل البلخی گوید رحمۃ اللہ علیہ۔ اَلْعُلُوْمُ ثَلٰثَۃٌ عِلْمٌ مِنَ اللّٰہِ۔ وَعِلْمٌ مَعَ اللّٰہِ وَعِلْمٌ بِاللّٰہِ علم باللہ علم معرفت بود کہ ہمہ انبیاء و اولیاء اورا بدو دانستہ اند و تا تعریف و تعرف وے نبود ایشان ویرا ندانستند۔ .. .. وعلم من اللہ علم شریعت بود کہ آں از وے بما فرمان و تکلیف است و علم مع اللہ علم مقامات و طریق حق و بیان درجات اولیاست۔ پس معرفت بے پذیرفت شریعت درست نیاید و ورزش شریعت بے اظہار مقامات راست نیاید و ہر کرا علم معرفت نیست دلش بجہل مردہ است و ہر کرا علم شریعت نیست دلش بہ نادانی بیمار است (ص ۱۲)

محمد بن فضل بلخی کہتے ہیں کہ علم کی تین قسمیں ہیں۔ علم من اللہ۔ علم مع اللہ اور علم باللہ۔ علم باللہ علم معرفت ہے کہ انبیاء و اولیاء نے اُسی ذریعہ سے معرفت باری حاصل کی ہے اور بغیر اس کے انہیں معرفت باری حاصل نہ ہوسکی (یہ علم اکتساب سے نہیں آتا) علم من اللہ علم شریعت ہے یعنی احکام الٰہی و فرائض عبدیت کا علم۔ علم مع اللہ علم مقامات طریقت و درجات اولیاء کا نام ہے۔ معرفت بغیر علم شریعت کے قبول کیے درست نہیں ہوسکتی اور شریعت پر عمل بغیر مقامات کے ممکن نہیں۔ جس کو علم معرفت نہیں اُس کے قلب پر جہل کی موت طاری ہے اور جسے علم شریعت نہیں اُس کا قلب مرض نادانی میں گرفتار ہے۔

اسی تعلیم کی تائید میں بایزید بسطامیؒ کا قول ہے کہ "میں نے تیس سال تک مجاہدات کیے لیکن کسی مجاہدہ کو علم و تحصیل علم سے صعب تر نہیں پایا" (عملت فی المجاہدۃ ثلثین سنۃ فما وجدت شیئاً اشد علی من العلم ومتابعتہ)

اور خود مرشد ہجویریؒ کا بیان ہے کہ "طبع انسانی کے لیے آگ پر چلنا راہ علم پر چلنے سے آسان تر ہے اور ایک جاہل کے لیے پل صراط پر ہزار بار گزرنا اس سے آسان ہے کہ علم کا ایک مسئلہ حل کرے" (ص ۱۴)

(۲) باب الثانی فی الفقر (ص ۱۴ - ۲۲) اس باب میں فضائل فقر و مسکنت کا بیان ہے فضائل فقر میں متعدد آیات قرآنی وارد ہیں، مثلاً لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ (بقرہ ع) یا یہ مثلاً تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا۔ (سورہ سجدہ)

احادیث نبوی میں بھی بہ کثرت فضائل فقر بیان ہوئے ہیں۔ سرور کائناتؐ خود اپنے متعلق دعا میں یہ آرزو کرتے ہیں کہ "اے پروردگار مجھے مسکین بنا کر زندہ رکھ، مسکین بنا کر وفات دے اور حشر میں زمرۂ مساکین میں اٹھا" اور ایک حدیث میں آتا ہے، کہ قیامت کے روز ارشاد باری تعالیٰ ہوگا کہ میرے دوستوں کو حاضر کرو۔ فرشتے عرض کریں گے، کہ "تیرے دوست کون ہیں"؟ جواب ملے گا کہ "فقرا و مساکین" (ادنوا منی احبائی فیقول الملٰئکۃ من احبائک؟ فیقول اللہ فقراء والمساکین) عہد رسالت میں فقرا و مہاجرین تھے جو مسجد نبویؐ میں تمام اسباب دنیوی سے قطع نظر کرکے محض عبادت الٰہی کے لیے بیٹھ جاتے تھے، اور اپنی روزی کے لیے محض مسبب الاسباب پر تکیہ و توکل رکھتے تھے اُن کی خبر گیری اور اُن کی رفاقت کے لیے خود رسول اللہ صلعم کو بارگاہ رب العزت سے تاکید ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ۔ اور ایک دوسرے مقام پر فرمان ملتا ہے۔ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ

عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ ان تاکیدی احکام نے اُن فقرا و مہاجرین کو اس مرتبہ پر پہونچا دیا تھا کہ سرورِ کونین جہاں کہیں اُنھیں دیکھ لیتے، تو ارشاد فرماتے "میرے ماں باپ تم پر فدا ہوں، کہ خدا نے تمھارے حق میں مجھ پر عتاب کیا"۔ (ص ۱۵)

صفحات مابعد میں فقر کی حقیقت و آداب پر بحث کی ہے، اور غنا کے مقابلہ میں اس کی افضلیت بہ دلیل ثابت کی ہے۔

۳۔ الباب الثالث فی التصوف (ص ۲۲ تا ۳۱) تیسرا باب ماہیت تصوف پر ہے۔

حضرت مصنف، حسب عادت، اس باب کا بھی آغاز قول خدا اور قول رسولؐ سے کرتے ہیں۔ چنانچہ کلام الٰہی میں اُنھیں یہ آیت ملتی ہے۔ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا۔ اور احادیث میں سے اس کو پیش کرتے ہیں۔ مَنْ سَمِعَ صوتَ اهلِ التصوفِ فلا یؤمن علی دعائهم كُتِبَ عند اللهِ مِنَ الغافلین

اس کے آگے مصنف کتاب اللمع کی طرح، اُنھوں نے بھی تفصیلی بحث لفظ "صوفی" اور اُس کے اشتقاق پر کی ہے۔ لفظ صوفی کی تحقیق میں مختلف مذاہب ہیں۔ ایک گروہ

مردمان اندر تحقیق ایں اسم بسیار سخن گفتہ اند وکتب ساختہ۔ وگروہے ازاں گفتہ اندکہ کہ صوفی را برای آں صوفی خوانده اندکہ جامہ صوف دارد۔ وگروہے گفتہ اندکہ صوفی را از برائے آں صوفی خوانندکہ از صف اول باشد وگروہے گفتہ اند کہ بداں صوفی گویند کہ تولی بہ اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم کردہ اند۔ وگروہے گفتہ اندکہ ایں اسم از صفا مشتق است وہر کسے را اندریں معنی اندر تحقیق ایں طریقت

کے نزدیک، چونکہ یہ لوگ جامہ صوف میں ملبوس رہتے تھے، اس لیے صوفی کہلائے۔ بعض کا خیال ہے، کہ لفظ صوفی کا ماخذ صف اول ہے یہ حضرات چونکہ صف اول میں رہتے تھے۔ اس لیے صوفی کے لقب سے موسوم ہوئے۔ ایک گروہ کا مسلک ہے کہ صوفی، اصحاب صفہ سے مشتق ہے۔ اور ایک جماعت، اس لفظ کا اشتقاق لفظ "صفا" سے بتاتی ہے۔ اور ہر گروہ اپنی تائید میں دلائل و شواہد لاتا ہے، لیکن لغت سے کسی قول کی بھی

لطایف بسیار است۔ اما بہ مقتضائے لغت | تائید نہیں ہوتی۔
ازیں معانی بعید می باشد (ص ۲۲)

شیخؒ کے نزدیک "صوفی" وہ ہے جس کا قلب "صفا" سے لبریز ہے۔ اور "کدر" (گندگی) سے خالی۔ اور اس مرتبہ تک کاملانِ ولایت ہی پہونچ سکتے ہیں:۔

"صفا ضد کدر بود، و کدر صفت بشر بود، و بہ حقیقت صوفی بود آنکہ او را از کدر گزر بود" (ص ۲۳) "صوفی نامے ست کہ مر کاملاں ولایت را و محققاں اولیا را بدیں نام خوانند و خواندہ اند" (ص ۲۵)

چنانچہ متقدمین مشائخ طریقت میں سے ایک بزرگ کا قول ہے کہ

مَنْ صَفَاهُ الْحُبُّ فَهُوَ صَافٍ وَمَنْ صَفَاهُ الْحَبِيْبُ فَهُوَ صُوفِيٌّ (ص ۲۵) | جس کو محبت صاف کر دے اُسی پر "صاف" کا اطلاق ہوگا، اور جسے محبوب اپنے لیئے صاف کرلے اُسے صوفی سے موسوم کریں گے:۔

اہل تصوف کے تین درجے ہیں۔ صوفی، متصوف، اور مستصوف۔ تینوں کی تعریف شیخ ہی کے الفاظ میں سننے کے قابل ہے:۔

"صوفی آں بود کہ از خود فانی بود و بحق باقی و از قبضہ طبایع رستہ و بہ حقیقت پیوستہ و متصوف آنکہ بہ مجاہدہ ایں درجہ را ہمی طلبد و اندر طلب خود را بر معاملت ایشاں درست ہمی کند۔ و مستصوف آنکہ از برائے مال و منال و جاہ و حظ دنیا خود را مانند ایشاں کردہ و ازیں ہر دو چیز ہیچ خبر ندارد، تا حدے کہ گفتہ اند اَلْمُسْتَصْوِفُ عِنْدَ الصُّوْفِيَّةِ كَالذُّبَابِ وعند غیرہم کالذئاب۔ مستصوف بہ نزدیک صوفی از حقیری چوں مگس بود آنچہ کند نزدیک وے ہوس بود و نزدیک دیگراں چوں گرگ بے افسار بود کہ ہمہ ہمتش لختے مردار بود" (ص ۲۵)

صوفی صاحبِ وصول ہوتا ہے، کہ اُسے وصل مقصود حاصل ہو چکتا ہے۔ متصوف صاحب اصول

جو تا ہی کہ اصل پر قائم رہ کر احوالِ طریقت میں مشغول رہتا ہی۔ متصوف صاحبِ فضول ہوتا ہی، جس کی قسمت میں حقیقت سے محجوبی اور معانی سے محرومی ہی (ص ۲۵-۲۶)

بعض صوفیہ متقدمین نے 'صوفی' 'تصوف' کی جو تعریفات بیان کی ہیں شیخ نے انھیں بھی سنداً پیش کیا ہی (ص ۲۶-۲۹) مثلاً

(۱) الصّوفی اذا نطق بانَ نطقہٗ عن الحقایق وان سکت نطقت عنہ الجوارح بقطع العلایق (ذوالنون مصری)

حضرت ذوالنون مصریؒ کہتے ہیں، کہ صوفی وہ ہی کہ جب گفتار میں آتا ہی تو اُس کی زبان اُس کے حقیقتِ حال کی ترجمانی ہوتی ہی۔ اور جب خاموش ہوتا ہی تو اُس کے اعضا رشہادت دیتے ہیں کہ وہ علایق کو قطع کر چکا ہی۔

(۲) التصوف نعت اُقیم العبد فیہ قیل لنعت للعبد ام للحق فقال نعت الحق حقیقۃً ونعت العبد رسماً (جنید بغدادیؒ)

حضرت جنید بغدادیؒ کا ارشاد ہی، کہ تصوف نام اس صفت کا ہی جس میں بندے کی اقامت ہو لوگوں نے پوچھا، یہ صفت بندے کی ہی یا حق کی؟ جواب دیا کہ حقیقۃً وہ صفت حق کی ہی، یہ ظاہر بندہ کی ہی۔

(۳) التصوّف ترک کلّ حظ للنفس (ابوالحسن نوری)

حضرت ابوالحسن نوری کا قول ہی، کہ تصوف تمام حظوظِ نفسانی کے ترک کا نام ہی۔

(۴) الصّوفیۃ ہم الذین صفت ارواحہم فصاروا فی الصّفّ الاوّل بین یدی الحق (ایضاً)

انھیں بزرگ کا یہ قول بھی ہی، کہ صوفی وہ لوگ ہیں، جن کی ارواح آلائشوں سے پاک ہو چکی ہیں اور وہ رب العزت کے حضور میں صف اول میں حاضر ہیں۔

(۵) الصّوفی الذی لا یملک ولا یُملک (ایضاً)

انھیں بزرگ سے یہ بھی منقول ہے کہ صوفی

وہ ہے، جو نہ خود کسی کا مالک ہو اور نہ کوئی اس کا مالک ہو۔

(۶) التصوف رویۃ الکون بعین النقص بل غضّ الطرف عن الکون (ابو عمرو دمشقی)

ابو عمرو دمشقیؒ ارشاد کرتے ہیں کہ تصوف نام ہے کائنات کی جانب نگاہ عیب جوئی سے دیکھنے کا، بلکہ سرے سے نہ دیکھنے کا۔

(۷) التَّصَوُّفُ شِرکٌ لِاَنَّہٗ صیانۃ القلب عن رُویۃ الغیرِ ولا غیر (ابوبکر شبلی)

حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں کہ تصوف ایک طرح کا شرک ہے۔ اس لئے کہ یہ نام ہے قلب کو غیر سے محفوظ رکھنے کا، درآنحالیکہ "غیر" کا سرے سے وجود نہیں۔

(۸) التَّصَوُّف صَفَاءُ السِّرِّ من کدورۃ المخالفۃ (حصری)

شیخ حصریؒ کا مقولہ ہے کہ تصوف نام ہے قلب کو مخالفت حق کی کدورت سے پاک رکھنے کا۔

(۹) الصوفی لا یری فی الدارین مع اللہ غیر اللہ (شبلی)

شبلیؒ سے یہ ارشاد بھی منقول ہے کہ صوفی دونوں جہان میں بجز خدا کے کسی کو نہیں دیکھتا۔

(۱۰) التصوف اسقاط الرویۃ للحق ظاہراً وباطناً (علی بن نیشاپوری)

شیخ علی بن نیشاپوریؒ کا ارشاد ہے کہ تصوف یہ ہے کہ صوفی کو اپنا ظاہر و باطن نظر نہ آئے۔ سب حق ہی حق نظر آئے۔

اسی باب میں اہل تصوف کے مزید خصوصیات۔ اُن کے معاملات اور انبیاء علیہم السلام کی پیروی کو بیان کیا ہے۔

دولت گپتا

دولت گپتا | ۱۔ تیسری صدی عیسوی کے تاریک و نامعلوم دور کے بعد شمالی ہند پھر ایک زبردست حکومت کے زیرِ سایہ متحد اور متفق نظر آتا ہے۔ جس کا دارالامارۃ ہندی روم یعنی پاٹلی پتر میں تھا۔ یہ حکومت تاریخ میں دولت گپتا کے نام سے مشہور ہے۔ ہندی ادب، حکمت اور فنونِ لطیفہ کے ساتھ سلطنت گپتا کا نام ابدالآباد تک زندہ رہے گا۔ شاہانِ گپتا کا دور تاریخِ ہند کا بہترین زمانہ تھا۔ اس دور کو ست جگ کہنا بالکل حق بجانب ہوگا۔

مگدہ کا دوبارہ عروج | ۲۔ والی (ریاست) مگدہ چندر گپت کا عقد لیکاوی قبیلہ میں ہوا تھا۔ چندر گپت کے نسب کے متعلق ہماری معلومات بہت کم ہیں۔ بجز اس کے ہم کچھ نہیں جانتے کہ چندر گپت گھاٹوٹ کچھا کا لڑکا تھا۔ گھاٹوٹ کے باپ کا نام گپتا تھا۔ لیکاوی قبیلہ کی قرابت نے اس غیر معروف والی ریاست کو ہندوستان کی سیاسی دنیا میں زبردست بادشاہ بنا کر کھڑا کر دیا۔ چندر گپت معمولی آدمی نہ تھا۔ موقع پاتے ہی ایک معمولی ریاست کو سلطنت کے درجہ پر پہونچا دیا۔ اسی کے ایسے بلند دماغ راجہ کا کام تھا۔ چونکہ وہ جانتا تھا کہ لیکاوی قبیلہ کی قرابت نے اس کی قوت کو عالمگیر بنا دیا ہے۔ اس لئے اس کے سکوں پر لیکاوی شاہزادی کا نام اُس کے نام کے ساتھ نظر آتا ہے۔ سکوں پر راجہ اور رانی کا نام ایک ساتھ دیکھ کر عہد گپتا میں طبقہ نسواں کی منزلت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ۳۲۱ء سنہ میں چندر گپت نے مہاراج دیسراج کا لقب اختیار کیا۔ اس مبارک تقریب کی یادگار میں گپتا سنہ تاریخ کی ابتدا کی گئی۔ یہ سنہ عرصہ دراز تک ہندوستان میں رائج رہا۔ چندر گپت کی سلطنت کے حدود صحت کے ساتھ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکے ہیں۔ لیکن گمان غالب ہے کہ شمالی ہند کا بیشتر حصہ اس کے تحت میں آچکا تھا۔

سمندر گپت | ۳۔ چندر گپت کے بعد اس کا بیٹا سمندر گپت تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔

اسے ایک متبحر مورخ نے جو صفات کے صحیح استعمال سے اتنا نہیں معلوم ہوتا ہندی نپولین کا لقب دیا ہے۔ بادشاہ ہونے میں سمندر گپت نے شہنشاہی پر کمر باندھی۔ اس منصوبہ کی انجام دہی کے لئے پہلے شمالی ہند اور پھر جنوبی ہند کی تسخیر ضروری تھی۔ سمندر گپت کا سوانح نگار سری گنہ اُن ریاستوں کے نام گناتا ہے جو اس اولوالعزم بادشاہ کے ہاتھ پر فتح ہوئی تھیں۔ شمالی ہند سے فارغ ہو کر سمندر گپت نے جنوب کی طرف رخ کیا۔ اور ایسا عجیب غریب دھاوا مارا کہ بہت کم عرصہ میں جنوبی جزیرہ نما کی انتہائی حد پر پہنچ گیا۔ غالباً کالیداس کے دماغ میں جب اس نے "راگھو کے گھر میں" تصنیف کیا ہے سمندر گپت کے کارنامے ضرور ہوں گے۔ کالیداس کا سمندر گپت کے عہد میں ہونا تقریباً یقینی ہے۔ دکن پر فوج کشی کرنے سے سمندر گپت کا یہ منشا نہ تھا کہ وہ جنوبی ریاستوں کو مٹا کر قلمرو مگدھ میں شامل کرے۔ وہ صرف اپنی عظمت و جلالت کا سکہ پورے ملک میں جمانا چاہتا تھا۔ سمندر گپت کا عجیب غریب دھاوا جو پتالی پتر سے دکن کے مشہور شہر کانجی پورم پر اور کانجی پورم سے مہاراشٹر اپر کچھ ہی دنوں میں انجام دیا گیا تھا۔ دنیا کے قابل ذکر کارناموں میں شمار کیے جانے کا مستحق ہے۔ اس فوجی نقل و حرکت کی تمثیل ہنیبل اور نپولین اعظم کے ہاں مل سکتی ہے لیکن ان میں اور سمندر گپت میں اتنا فرق ہے کہ سمندر گپت ان دونوں سے زیادہ کامیاب رہا۔

سمندر گپت کی حکومت کے حدود اربعہ

۴۔ سمندر گپت کی سلطنت کے حدود اربع حسب ذیل قرار دیئے جا سکتے ہیں شمال میں کوہ ہمالیہ جنوب میں کوہ وندھیا مشرق میں دریائے برہمپتر اور مغرب میں دریائے سندھ اُس کی سلطنت میں گجرات۔ مالوہ اور دوآب کے علاقے شامل تھے شمالی ہند پورا اس کے قبضہ میں تھا اور جنوبی ہند کے راجہ اُسے شہنشاہ تسلیم کرتے تھے اُس کی عظمت ایران کے بادشاہوں کے ہم پلہ ہو چکی تھی۔ شاہان پیشین کی تقلید میں اس نے اسوامیدھا (گھوڑے کی قربانی) کی رسم ادا کی تھی تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہندوستان میں اس کی برابر کوئی دوسرا راجہ نہیں ہے اس تقریب کی شہادتیں اُس کے شاعر سوا [illegible] کی تصنیفات میں۔ سکوں میں اور ایک سنگی گھوڑے کی شکل میں جس پر حسب موقع عبارت کندہ

ہے۔ موجود ہیں یہ گھوڑا لکھنؤ کے عجائب خانہ میں تماشہ گاہ خلائق ہے۔

ممالک غیر سے سمندر گپت کے تعلقات

۵۔ آس پاس کی ہمعصر سلطنتوں سے جو ہندوستان کی جغرافوی حد سے باہر تھیں سمدر گپت کے دوستانہ تعلقات تھے۔ چنانچہ لنکا کے راجہ میگھاورندھ نے اُس کے پاس سفیر بھیجکر لنکا کے بدھ یاتریوں کے لیئے خانقاہ بنوانے کی اجازت طلب کی تھی پہلے اس خانقاہ کی عمارت نہایت شاندار تھی اور جب چینی سیاح یو وان چوانگ ہندوستان دیکھنے کی غرض سے آیا ہے یہ خانقاہ موجود تھی۔ کابل اور وسط ایشیا کے بادشاہوں سے بھی سمدر گپت کے سیاسی تعلقات دوستانہ تھے۔

سمندر گپت رزم و بزم دونوں کا مرد میدان تھا

۶۔ سمدر گپت رزم و بزم دونوں کا مرد میدان تھا وہ خود شاعر تھا موسیقی میں اُسے خاص مہارت تھی اور اہل علم کا سرپرست تھا بعض کیاب سکوں میں وہ تخت پر بیٹھا ہوا بین بجاتا دکھایا گیا ہے ایسے سکے اُس کی فن موسیقی کی مہارت زندہ رکھنے کے لیئے نکالے گئے ہوں گے۔ دوسرے گپتا بادشاہوں کی طرح سمدر گپت بھی مذہباً ہندو تھا اس کے سوانح نگار کا بیان ہے کہ اُسے وید پر عبور حاصل تھا افسوس ہے کہ اُس کے شاعرانہ تصنیفات میں سے ایک بھی باقی نہیں رہی۔

سمندر گپت کے سوانح نگار

۷۔ سمندر گپت کا سوانح نگار اور ملک الشعرا ہری شین علوم متداولہ میں ماہر تھا ہری شین پر اساشک طرز کا موجد ہے۔ باناس ہارشی چرتیا اس کی مشہور تصنیف ہے۔ یہ کتاب متاخر سنسکرت تصنیفات کی طرح کچھ نظم میں ہے اور کچھ نثر میں۔ اس کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ یہ سنسکرت زبان کی پہلی خالص تاریخی تصنیف ہے۔ لیکن باوجود ان تاریخی شہادتوں کے سمدر گپت کا نام فلیٹ کے کتاب گپتا نے دوبارہ زندہ کیا۔ ورنہ زمانہ اسے کب کا بھول چکا تھا۔

چندر گپت ثانی

۸۔ سمندر گپت نے ۳۷۵ء میں وفات پائی اور چندر گپت ثانی اس کا جانشین قرار پایا۔ چندر گپت کے عہد حکومت میں ہندو مذہب کا عروج شروع ہوا۔ اس بادشاہ نے وکرماجیت

کا لقب اختیار کیا تھا۔ وکرماجیت کو راجا ساترو کی طرح عزیز ترین ہندو شاہی نام ہونے کا فخر حاصل ہے۔ چندر گپت ثانی کی فتوحات میں مغربی صوبہ گجرات کی فتح بہت نمایاں ہے۔ ۳۹۵ء میں گجرات کا آخری (سٹرپ یا کھترایا) صوبیدار اور سنہا اس کے ہاتھوں سے قتل ہوا۔ گجرات زمانہ قدیم سے بحری تجارت کی منڈی بنا ہوا تھا۔ اس کی فتح سے بیشمار دولت چندر گپت ثانی کے خزانہ میں آئی ہوگی۔

دار الامارۃ کی تبدیلی

۹۔ حدود سلطنت کی توسیع سے دار الامارۃ تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ سمندر گپت کے عہد میں شاہان موریہ کا دار السلطنت چھوٹ چکا تھا۔ اور اس کی بجائے اجودھیا صدر مقام قرار پایا تھا۔ چندر گپت ثانی نے بھی اجودھیا ہی میں بود و باش اختیار کی۔ دار السلطنت منتقل ہوجانے سے پٹالی پتر کی رونق ضرور گھٹ گئی ہوگی مگر پھر بھی تذکروں سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت متمول اور آباد شہر تھا۔ پٹالی پتر کے بعد قدیم ہند کے قرون وسطی میں صوبہ مالوہ کا صدر مقام اُجین بہت بڑا شہر تھا۔ کیونکہ کالیداس نے جو چندر گپت ثانی کا ہمعصر تھا اُجین کی شان و شوکت کا ذکر کیا ہے۔

چندر گپت ثانی کا مذہب

چندر گپت ثانی اپنے آبا و اجداد کی طرح مذہباً ہندو تھا۔ لیکن اس میں مطلق تعصب نہ تھا۔ اس کی بے تعصبی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کے عہد میں بدھ مذہب پر کسی طرح کی زیادتی نہیں کی گئی۔ بلکہ برہمنوں کی طرح بدھ مذہب کے نام لیوا بھی شاہی عطیوں سے سرفراز ہوتے رہے۔ چندر گپت کے عہد میں مشہور چینی مسافر فاہیان سیاحت ہند کی غرض سے آیا تھا۔ سنسکرت کی کتابوں میں اس شاندار عہد کی سیاسی و اجتماعی ترقی کا جو تذکرہ ملتا ہے۔ اس کی مزید تصدیق فاہیان کے سفرنامہ سے ہوتی ہے۔ فاہیان ہندوستان میں ۴۰۵ء سے ۴۱۱ء تک رہا۔ اس عرصہ میں اس نے سنسکرت سیکھی۔ اور بدھ مذہب کی مقدس کتابیں قصص اور روایات جمع کیے۔

کمار گپت اول | ۱۱۔ ۴۱۳ء میں چندر گپت ثانی رہگزائے عالم فانی ہوا اور کمار گپت اول نے عنان حکومت سنبھالی۔ اس بادشاہ کے عہد کا صرف ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ وہ یہ کہ اس نے بھی اسوامیدھا (گھوڑے کی قربانی) کی تقریب ادا کی تھی جس سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ گپت فرمانروائی کشمیر سے راس کمورن تک مسلم ہو چکی تھی۔ کمار گپت کے آخر عہد میں قبیلہ پشامتر نے جو غالباً وادی نربدا میں آباد تھا بغاوت کی۔ اسکند گپت کمار گپت کے بیٹے نے جو ولیعہد سلطنت بھی تھا اس بغاوت کو بڑی زحمتوں کے ساتھ فرو کیا۔ ۴۵۵ء میں کمار گپت بیکنٹھ باشی ہوا اور اس کا بیٹا اسکند گپت تخت پر بیٹھا۔

اسکند گپت | ۱۲۔ بادشاہ ہوتے ہی اسکند گپت کو ہن (تاتاری یا مغول) حملوں کی مدافعت کرنا پڑی تھی۔ تاتاریوں نے (جنھیں مغربی مورخین قوم ہن کے نام سے موسوم کرتے ہیں) ایشیا اور یورپ میں ایک ہی وقت میں خروج کیا تھا۔ جس ملک میں ان کا گزر ہوا خاک اُڑنے لگی تباہی اور بربادی ان کے جلوس میں چلتی تھی۔ ان کی ایک شاخ نے سلطنت روم کی دھجیاں اُڑا دی تھیں۔ ہندوستان میں خاندان گپتا کا اقتدار قیاصرہ سے کم نہ تھا۔ اسکند گپت نے پہلے تاتاری سیلاب کو شکست دے کر کچھ دنوں کے لیے امن و امان کا سامان فراہم کر لیا۔ اس فتح کی یادگار کے طور پر اسکند گپت کا ستون بہتری ضلع غازی پور میں موجود ہے۔ اس ستون پر کچھ اشعار کندہ ہیں جن میں اسکند گپت کی فتوحات کا مضمون نظم کیا گیا ہے۔ ۴۶۵ء میں تاتاریوں کا دوسرا حملہ ہوا۔ اب کی مرتبہ اسکند گپت کافی مدافعت نہ کر سکا۔ کیونکہ تاتاریوں کے سفاک گروہ اس کے آخر عہد تک بلا خوف و خطر گپتا حدود سلطنت میں گھوما کیے۔ اسکند گپت نے ۴۸۰ء میں وفات پائی۔ اس کے ساتھ خاندان گپتا کا عروج بھی دنیا سے اُٹھ گیا۔

اسکند گپت کے اخلاف کی حکومت | ۱۳۔ اسکند گپت کے اخلاف کی حکومت سلطنت کے مشرقی حصہ تک محدود تھی۔ اس کے اخلاف میں بالادتیا کا نام جامع نلندا میں ایک مدرسہ

قائم کرنے کی وجہ سے مدتوں زندہ رہا۔ سلطنت گپتا کے مغربی ممالک تاتاریوں کے ہاتھ لگ چکے تھے۔ اور انھوں نے وسط ہند میں ایک زبردست حکومت قائم کر لی تھی۔ ان کے بادشاہ کا نام تورامانا تھا۔ تورامانا کا جانشین میراگولا ہوا یہ نہایت درجہ بیرحم خونریز اور سفاک تھا۔ اس کی دراز دستیوں سے عاجز آکر راجگان ہند بالا دتیا کے جھنڈے تلے جمع ہوئے۔ راجگان ہند کی اس متحدہ قوت نے ۵۲۸ء میں ہندی تاتاری حکومت کا قلع قمع کر دیا۔ بالا دتیا کے بعد کمار گپت ثانی اورنگ نشین ہوا۔ لیکن اس کے متعلق کوئی قابل ذکر بات ہمیں معلوم نہیں۔

سلطنت گپتا کا زوال

۱۴۱۔ کمار گپت ثانی کے ساتھ دولت گپتا بھی صفحۂ ہستی سے ناپید ہو گئی۔ اگرچہ کچھ دنوں تک گپتا خاندان مگدھ میں برسر حکومت رہا۔ لیکن پھر اس خاندان کو شہنشاہی کا دعویٰ کرنے کی جرأت کبھی نہ ہوئی۔ رفتہ رفتہ باقی رسوخ بھی جاتا رہا۔ اور یہ نامور خاندان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گیا۔ جن کی حیثیت محض مقامی تھی۔ ان ریاستوں کے والی آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ ان کے حریفوں میں قبیلہ مکاسر کا نام بہت نمایاں ہے۔ یہ قبیلہ اس عہد کے مشہور قبائل میں سے ہے۔ اور گو اس قبیلہ کو بادشاہت نصیب نہیں ہوئی۔ لیکن اس کا تعلق شمالی ہند کے حکمران خاندانوں سے ہمیشہ رہا اس طرح گپتا خاندان ۸۰۰ء تک چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر حاکم رہا لیکن ان خاندانوں کی مقامی تاریخ ملکی اہمیت سے خالی ہے۔

عہد گپتا کے علوم و فنون

عہد گپتا ست جگ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے

۱۔ شاہان گپتا ۳۲۰ء سے ۵۲۸ء تک ہندوستان میں کوس لمن الملکی بجاتے رہے۔ ان کا عہد ہند و تہذیب کے معراج کمال کا زمانہ تھا۔ یہی زمانہ ست جگ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ شاہان گپتا کی سرپرستی میں علم و حکمت نے ایسی ترقی کی کہ تاریخ ہند میں اس کی نظیر ملنا مشکل ہے چندر گپت ثانی راجہ بکرم کے دربار کی رونق۔ اس کی

نوشتی۔ اس کی علم دوستی اس اولوالعزم راجہ کی وسیع تر سلطنت اور عظیم الشان شہنشاہی سے کہیں زیادہ مشہور تھی۔ انہیں باتوں نے اس کا نام صدیوں تک ملک کے گوشہ گوشہ میں زندہ رکھا۔ زمانہ چندر گپت کی فتوحات بھول گیا۔ لیکن راجہ بکرم کے محبوب نام کا وظیفہ سولہ سو برس بعد بھی عوام و خواص کی زبان پر ہے۔

علم و حکمت کی غیر معمولی ترقی

۲۔ عہد گپتا میں علم و حکمت نے جو غیر معمولی ترقی حاصل کی تھی۔ اس میں سے اب کسی کو شبہہ نہیں رہا یہ متفق علیہ امر ہے کہ کالیداس چندر گپت ثانی کے عہد میں تھا۔ کالیداس ہندی شاعری کا ملک الشعراء۔ تغزل اور ناٹک میں لاثانی تھا۔ اس شاعر کی زندگی کے حالات بہت کم معلوم ہو سکے ہیں۔ کالیداس کے کلام میں الحاقی اشعار کثرت سے شامل ہو گئے ہیں۔ لیکن جس نے کالیداس کا کلام غور سے پڑھا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ خس و خاشاک پہلی ہی نظر میں نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ کالیداس کی تصنیفات میں سے تین ناٹک شکنتلا۔ مالویکا اگنی متر۔ وکرم واسیم دو افسانے رگھو اشرم۔ کمار اسمبھاوا اور دو عشقیہ غزلوں کے مجموعہ رگھیادتا۔ اور رتیو سام ہارا موجود ہیں۔ آخر الذکر نظم غالباً الحاقی ہے اور کالیداس کی تصنیف نہیں معلوم ہوتی۔ کالیداس کی تمام تصنیفات میں شکنتلا کا پایہ بہت بلند ہے۔ یہی اس کا بہترین ناٹک سمجھا جاتا ہے۔ شکنتلا کی خوبیوں کا اعتراف مشہور جرمن شاعر گوئٹے نے نہایت موثر اشعار میں کیا ہے۔ میگھا دتیا عاشقانہ رنگ میں مشہور نظم ہے۔ اس نظم میں ایک عاشق جو بادشاہ کی ناخوشنودی سے جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ اپنی محبوبہ کو پیغام بھیجتا ہوا اور تصور میں گفتگو کرتا ہوا دکھایا گیا ہے میگھا دتا سنسکرت کی بہترین عشقیہ مثنوی ہے۔ غالباً دوسری زبانوں میں بھی ایسی مثنویاں کم ہوں گی۔ مالویکا اگنی متر اور وکرم واسیم شکنتلا سے کم رتبہ ہیں۔ پھر بھی ان سے کالیداس کی قادر الکلامی معلوم ہوتی ہے۔ اور اس زمانہ کی کوئی دوسری نظم ان کی برابری نہیں کر سکتی۔ کالیداس ایک نئی طرز کا موجد ہے۔ اس کے بعد مدتوں تک اہل علم اس طرز کا تتبع کرتے رہے۔ اسی کی طرز پر میگھا نے سیو پالا وادھا اور ہارشا نے

نامی شاد عالکھا ہے۔ لیکن ان میں کالیداس کے رگھو اشرم کی نزاکت خیال۔ انداز بیان اور لطافت نام کو نہیں ہے۔ اور کالیداس کی نظموں سے انہیں کوئی نسبت نہیں دی جاسکتی۔

راجہ وکرم کا دربار

۳۔ پروفیسر سلوین سیوی کے تخیل نے راجہ وکرم کے دربار کا نقشہ ہمارے لیے مہیا کر دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جب شکنتلا پہلے پہل دربار میں پیش کیا گیا۔ علم دوست راجہ فرط خوشی سے بیخود ہو گیا۔ حاضرین مصرعہ مصرعہ پر واہ واہ احسنت و مرحبا کی صدائیں بلند کرنے لگے۔ حریف نکتہ چیں۔ متحیر۔ انگشت بدنداں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے کالیداس کامیابی کے آغوش میں انتہائی مسرت کے مزے اٹھا رہا ہے کہ حاضرین یکزبان ہو کر کہتے ہیں کہ شعرا میں کالیداس کا ہمسر کوئی نہیں اور کالیداس کے کلام میں شکنتلا سے بہتر نظم نہیں۔ ایسی کامیابی کسی ناٹک لکھنے والے کو کیوں کبھی نصیب ہوئی ہوگی" یہی رائے زمانہ کی جیلاً بعد جیلاً ونسلاً بعد نسل رہی۔ ہمیں شکنتلا کے اوصاف سے زیادہ تعجب اس امر پر ہے کہ پانچویں صدی میں ایسے لوگ موجود تھے جنھوں نے شکنتلا کی قدر کی۔ اس سے کم از کم طبقہ اعلیٰ کے تمدن و تہذیب کا حال معلوم ہوتا ہے کالیداس کا کلام شمال و جنوب میں ایک ہی نظر سے دیکھا جاتا تھا چھٹی صدی عیسوی تک عام مقبولیت کی بکثرت شہادتیں موجود ہیں۔ جس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ سارے ہندوستان میں ایک ہی تمدن جاری و ساری تھا۔ میگھا دوتا کا مصنف جنوبی ہند کے اکثر مقامات سے بخوبی آشنا نظر آتا ہے۔ اس کی واقفیت آریہ ورت کے تہذیبی اتحاد پر دلالت کرتی ہے۔

کالیداس کے علاوہ دوسرے ارباب علم

۴۔ کالیداس کی عظمت نے اس عہد کے بہت سے قابل شعرا اور ناٹک نویسوں کو پردہ خفا میں ڈال دیا ہے۔ منجملہ ان کے ایک مشہور شاعر بھاشا تھا جو کالیداس سے کچھ پہلے غالباً ۳۰۰ئہ میں یا اس سے بھی کچھ قبل گزرا ہے امانی سیمہا جس کی لغت نصاب سنسکرت میں ابھی تک رائج ہے۔ اس زمانہ کا مشہور عالم تھا۔ علاوہ ازیں مہابھارت کی آخری اصلاح شاہان گپتا کے عہد میں ہوئی تھی۔ اور بعض پر ان کے نسخہ بھی

اسی زمانہ کی تصنیف کئے ہوئے بتائے جاتے ہیں۔

شاہان گپتا فنون لطیفہ کے قدرداں تھے

۵۔ شاہان گپتا کو فن موسیقی سے خاص شغف تھا شاہ سمندر گپت تو اس فن کا ساحر ہی تھا۔ دربار میں گانے اور دوسرے فنون لطیفہ کی قدر ہوتی تھی۔ شاہان گپتا کو تعمیرات کا بھی شوق تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ زمانہ کی دستبرد سے اس عہد کی شاہی عمارتیں بچ نہ سکیں۔ غارہائے ایجنتا کی دیواروں پر اعلیٰ ترین مصوری کے نمونے اس عہد کی یادگار ہیں۔ غارہائے الورا کے بعض حصہ شاہان گپتا ہی کے عہد میں تیار ہوئے تھے۔ دنیا اس غاروں کی مصوری کو حیرت سے دیکھتی ہے۔ فن مصوری کا انتہائی کمال یہی ہو سکتا ہے جو ان میں موجود ہے۔ عہد گپتا میں محلات شاہی ہند و مندر اور بدھ خانقاہیں سب ایسی ہی سنگی اور قلمی تصویروں سے مزین ہوں گی۔ چینی مسافر یوان چوانگ لکھتا ہے کہ جامع ملندا کی عمارتیں اس قدر عالیشان تھیں کہ عام لوگ انہیں دیووں کی طرف منسوب کرتے تھے جملہ تاریخی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد گپتا میں سنگ تراشی۔ مصوری۔ موسیقی و نیز دیگر فنون لطیفہ حد کمال کو پہونچ چکے تھے۔

اس عہد کے اجتماعی حالات

۶۔ خوش قسمتی سے اس عہد کے اجتماعی حالات پر ایک چینی نکتہ شناس کی شہادت موجود ہے۔ جس کا نام فاہیان تھا۔ فاہیان ہندوستان میں بدھ تیرتھوں کی زیارت کرنے کی غرض سے آیا تھا۔ وہ ان مقدس مقامات میں رہ کر مذہبی معلومات بڑھانا چاہتا تھا۔ اس کا منشا اس ورود دراز سفر سے یہی تھا کہ مذہبی قصے اور روایات جمع کر سکے اور بدھ کتابوں کے نسخے فراہم کر سکے یہ چینی جاتری ہندوستان میں چھ برس رہا (از ۴۰۵ء تا ۴۱۱ء) اس کے سفرنامہ سے اس زمانہ کی حالت پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ فاہیان کو ہندوستان میں بکثرت شفاخانہ اور سرائیں دیکھ کر جو محض رفاہ عام کے خیال سے بنوائی گئی تھیں سخت حیرت ہوئی اس نے ہر چیز مذہبی عقیدت کی نظر سے دیکھی ہے۔ اس لیئے ہندوستان کا ذرہ ذرہ اُسے دھرم کے اثر سے متاثر

نظر آیا۔ گو واقعتاً ہندوستان کی یہ حالت نہ تھی۔ بدھ مذہب خانقاہوں اور مدرسوں میں ضرور فروغ پر تھا بدھ خیالات عام طور سے پسند بھی کیے جاتے تھے۔ ارباب علم زیادہ تر گوتم بدھ ہی کے پیرو تھے۔ لیکن عوام زیادہ تر ہندو مذہب پر تھے۔ گو بدھ مذہب کے بعض خواہ اصول عام پسندیدگی کے خیال سے ہندو مذہب میں داخل کرنے لگے تھے۔

فاہیان کے سفرنامہ میں ہندوستان کے تمدن کا ذکر

۷۔ سڑکیں اور شاہراہیں چوروں اور ڈاکوؤں سے محفوظ و مامون تھیں۔ کیونکہ چھ برس تک فاہیان ہندوستان میں چکر لگایا کیا اور اسے کبھی نقصان اُٹھانا نہیں پڑا۔ فاہیان کا بیان ہے کہ ہندوستان سرسبز اور متمول ملک تھا۔ یہاں کے باشندے عام طور سے خوش حال اور فارغ البال تھے۔ امن و امان اور اندرونی تحفظ کی وجہ سے جو عام طور سے موجود تھا۔ تجارت، صنعتیں اور حرفتیں ترقی پر تھیں۔ حکومت ہند کے چین۔ فارس اور کسی حد تک زوال آمادہ سلطنت روما سے تجارتی تعلقات تھے۔ غرضکہ شاہان گپتا کے عہد میں ہندوستان کی سیاسی وقعت پرانی دنیا پر چھائی ہوئی تھی۔

جمہور اور تصویت

(۱) مرضی عام لازوال ہوتی ہے

جب تک افراد کی ایک معتد بہ تعداد باہم مجتمع ہو کر اپنے آپ کو ایک واحد جماعت سمجھتی رہے اُس کی مرضی بھی واحد ہوگی اُس کی مشترک بقا و تحفظ، فلاح و رفاہ عام سے متعلق ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں ریاست کے تمام قولے زبردست اور سادہ اور اُس کے اُصول صاف اور روشن ہوتے ہیں۔ اس کے اغراض و مفاد میں کوئی برہمی و تناقض و تصادم نہیں ہوتا۔ ہر طرف نفع عام صاف نمایاں ہوتا ہے جس کے محسوس کرنے کے لیے صرف عقل سلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ صلح و امن اتحاد و مساوات سیاسی عیاریوں کی دشمن ہیں۔ سیدھے سادھے نیک دل لوگ اپنی سادگی کے سبب بمشکل دھوکا کھاتے ہیں۔ ترغیب و تملق اور حیلہ و وعدہ کے سبز باغ سے وہ متاثر نہیں ہوتے۔ ان میں اتنی چالاکی بھی تو نہیں ہوتی کہ کسی چالاکی کا شکار بن سکیں۔ جب دنیا کی سب سے زیادہ خوش نصیب قوموں میں ہم دہقانوں کی ٹولیوں کو ایک شاہ بلوط کے نیچے بیٹھ کر معاملاتِ ریاست کو سربراہ کرتے اور ان کو نہایت دانائی کے ساتھ نبھاتے دیکھتے ہیں تو کیا ہم دوسری اقوام کی تہذیب و شایستگی کی تحقیر کیے بغیر رہ سکتے ہیں جن کی تدابیر اور طلسم و کرشمہ ان کو مصیبت و فلاکت میں ممتاز بنا رہے ہیں۔

جو ریاست اس طرح چلائی جائے اُسے بہت کم قوانین درکار ہوتے ہیں اور اگر کبھی کسی نئے قانون کے نفاذ کی ضرورت ہوتی بھی ہے تو یہ ضرورت عام طور پر ملک میں محسوس اور تسلیم ہو چکی ہے۔ پہلا شخص جو کسی نئے قانون کی تجویز پیش کرتا ہے صرف اُس رائے کی ترجمانی کرتا ہے جو سب لوگ پہلے سے قائم کر چکے ہیں اور جس بات کا فیصلہ ہر شخص کر چکا ہے اس کو قانون کی صورت میں پاس کرنے کے لیے کسی سازش یا زبان آوری و سخن بافی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بشرطیکہ صرف یہ ہے کہ ہر شخص کو یہ اطمینان رہے کہ دوسرے بھی اسی کی طرح اس قانون

پر عامل ہوں گے۔

ہمارے مدبرین جس بات سے دھوکا کھاتے ہیں وہ یہ ہے کہ صرف اُن ریاستوں کو دیکھ کر جن کی بنا شروع ہی سے خراب ہوتی ہے۔ وہ اس قسم کی حکمت عملی ان کے حق میں ناممکن العمل سمجھ لیتے ہیں۔ ایک عیار سخن فروش، ایک کائیاں مقرر اہل پیرس اور اہل لندن کو جن بیہودگیوں پر آمادہ کرسکتا ہے ان کا خیال کرکے یہ حقارت سے ہنستے ہیں۔ ان کو یہ معلوم نہیں کہ اہل برن کراموِل سے زنداں کی کڑیاں اٹھواتے اور اہل جینوا ڈیوک آف بیوفورٹ سے چکی پسواتے۔

لیکن جب اجتماعی رشتہ ڈھیلا پڑنے لگتا ہے اور ریاست میں ضعف آجاتا ہے، جب شخصی اغراض و مفاد کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں اور ریاست چھوٹے چھوٹے فرقوں یا گروہوں سے متاثر ہونے لگتی ہے تو عام قوم کے اغراض و مفاد کو ضرر پہنچنے لگتا ہے اور ان کی مخالفت ہونے لگتی ہے، مجالس میں اتفاق آرا و اتحاد خیالات باقی نہیں رہتا، مرضی عام عام خلق کی مرضی نہیں رہتی، اختلافات و نزاعات شروع ہوجاتے ہیں اور بہترین تجویز بھی بلا بحث و حجت منظور نہیں ہوتی۔

جب ریاست آخر کار تباہی کے گڑھے کے کنارے پہنچ کر محض نمایشی صورت کے سوا حقیقۃً کوئی چیز نہیں رہ جاتی، دلوں کا اجتماعی رشتۂ اتحاد ٹوٹ جاتا ہے، ذلیل سے ذلیل مقصد بے باکانہ قومی بہبود کے مقدس نام میں ملبوس و مشتہر کیا جاتا ہے تو مرضی عام بے زبان ہوجاتی ہے۔ لوگ اپنے خفیہ اغراض کی رہبری میں اپنے خیالات شہری کے حیثیت سے نہیں بلکہ اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ گویا ریاست کا کبھی وجود ہی نہ تھا۔ اور وضع قانون کے نام سے وہ فریب سے نامنصفانہ احکامات صادر کرتے ہیں جن کی علت غائی شخصی مفاد ہوتے ہیں۔

کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ مرضی عام فنا یا خراب ہوسکتی ہے؟ نہیں۔ مرضی عام ہمیشہ ثابت اور قائم، غیر متغیر اور خالص رہتی ہے، البتہ یہ اور مرضیوں کے تابع ہوتی ہے جو

اس پر حاوی ہو جاتی ہیں۔ ہر شخص اپنے اغراض کو قوم کی اغراض سے جدا کرنے کے بعد بھی صاف مشاہدہ کر لیتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو قوم سے کلیۃً جدا نہیں کر سکتا۔ بات یہ ہے کہ ریاست کو نقصان پہنچانے میں انسان جو حصہ لیتا ہے وہ اس نفع کے مقابلہ میں جو وہ اپنے لئے مخصوص کرنا چاہتا ہو نہایت ہیچ معلوم ہوتا ہے۔ اس ذاتی نفع سے قطع نظر کر کے وہ اپنے اور دوسروں دونوں کے اغراض کے لحاظ سے عام بہبود و فلاح ہی کا طالب ہوتا ہے۔ اگر اپنی رائے (ووٹ) روپیہ لے کر بیچتا بھی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ مرضیٔ عام کو وہ دل سے بھلا دیتا ہے بلکہ دانستہ اس سے اغماض کرتا ہے۔ وہ قصور یہ کرتا ہے کہ مسئلہ کی صورت کو بدلتا ہے اور سوال کچھ ہوتا ہے وہ جواب کچھ دیتا ہے۔ چنانچہ اظہار رائے (ووٹ) کے ذریعہ سے جہاں اسے یہ کہنا چاہیئے کہ "یہ امر ریاست کے حق میں مفید ہے" وہ یوں کہتا ہے کہ "فلاں تجویز کی منظوری فلاں شخص یا فلاں گروہ کے حق میں مفید ہے"۔ غرض قومی مجالس کو جس اصول پر کاربند ہونا چاہیئے وہ چنداں مرضیٔ عام کا ثبات و قیام نہیں بلکہ زیادہ تر اس بات کا اطمینان و ایقان ہے کہ ان سے ہمیشہ مشورہ طلب ہوتا رہے گا اور وہ جواب دیتی رہیں گی۔

میں اس موقع پر استقلالیہ کے ہر فعل کے متعلق محض حق الرائے پر بہت کچھ خیالات کا اظہار کر سکتا تھا۔ (یہ وہ حق ہے جس سے کوئی چیز شہریوں کو محروم نہیں کر سکتی) اور تقریر، تجویز، تقسیم، بحث کے حق پر بھی جسے حکومت ہمیشہ نہایت احتیاط کے ساتھ صرف اراکین مجلس کے لئے مخصوص و محدود رکھتی ہے اپنے خیالات ظاہر کرتا مگر یہ اہم بحث ایک علحدہ رسالہ چاہتی ہے اور اس ایک رسالہ میں اتنی ساری باتیں قلمبند کر دینا ناممکن ہے۔

۲۔ تصویت[۱]

پچھلے باب سے ظاہر ہے کہ جس اسلوب سے معاملاتِ عمومی کا انصرام ہوتا ہے وہ ملت کی حالت اور قوت کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے بالکل کافی ہے۔ قومی مجالس میں جس قدر زیادہ ہم آہنگی ہوگی، یا دوسرے لفظوں میں تصویت میں جس قدر زیادہ اتحاد آرا ہوگا، مرضیٔ عام

[۱] ووٹ دینا

کہ اُتنا ہی زیادہ غلبہ ہوگا۔ لیکن علاوہ ان مباحث کے اختلافات دستور تشخیص ہونے کا غلبہ اور ریاست کے ضعف و انحلال پر دلالت کرتے ہیں۔

یہ حقیقت ایسی حالت میں چنداں نمایاں نہیں ہوتی جب کہ ریاست کے نظم و نسق میں دو یا زیادہ عنصر داخل ہو جائیں جیسے روبہ میں امراء اور عوام جن کی بنا پر آریوٹیگوں نے اکثر مجلس نظامیہ کو بہترین عہد جمہوریہ میں بھی پریشاں رکھا ہے۔ لیکن یہ استثنا محض ظاہری ہے واقعی نہیں۔ کیونکہ اُس زمانہ میں ملت کے ایک مجہول عیب کی بنا پر گویا دو ریاستیں ایک میں مدغم تھیں اور جو بات دونوں ریاستوں کے لئے ملا کر جائز نہیں وہ دونوں کے لئے علیحدہ علیحدہ درست ہے۔ فی الواقع پر آشوب سے پر آشوب زمانوں میں بھی طبقۂ عوام کو اگر مجلس الشیوخ چھیڑتی نہ تھی تو وہ ہمیشہ صلح و آشتی کا برتاؤ رکھتا تھا اور بکثرت آرا اس کی طرف جھکی تھی تمام شہریوں کے اغراض ایک تھے اس لئے تمام قوم کی مرضی ایک تھی۔

محیط الدائرہ کے مقابل نقطہ پر اتفاق و اتحاد دوبارہ عود کرتا ہے یعنی اُس وقت جب شہری غلامی میں مبتلا ہو کر حریت اور مرضی دونوں کھو چکتے ہیں۔ اس حالت میں خوف اور خوشامد سے ان کی رائے (ووٹ) نعرۂ تحسین و آفریں کی صورت میں بدل جاتی ہے۔ لوگ غور و فکر ترک کر دیتے ہیں اور صرف پوجنے یا کوسنے پر اُتر آتے ہیں۔ شہنشاہوں کے ماتحت مجلس الشیوخ میں متبذل طرز تقریر جاری تھا بعض اوقات یہ عجب قسم کی بیہودہ احتیاط کے ساتھ عمل میں آتا تھا ٹیسٹیس کا بیان ہے کہ اوتھو کے ماتحت ارکان مجلس الشیوخ جہاں ویٹیلیس پر لعنت و نفریں کی بوچھار نازل کر رہے تھے وہاں نہایت وحشت خیز شور و غوغا کرتے تھے جس سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ اگر وہ اتفاق سے ان کا حاکم ہو گیا تو اُسے یہ نہ معلوم ہو سکے کہ ان میں سے کس نے کیا کہا تھا۔

ان مختلف ملحوظات سے وہ اصول اخذ کئے جا سکتے ہیں جس کے مطابق اصوات (ووٹ) کے شمار اور رایوں کے مقابلہ کا طریقہ مقرر ہو سکتا ہے، اُسی نسبت سے جس سے مرضی عام کی

[illegible] یا اس میں جو ریاست زیادہ یا کم زوال پذیر ہو۔

صرف ایک ہی قانون ایسا ہے جو بالطبع متفقہ رضامندی کا محتاج ہوتا ہے اور وہ معاہدۂ اجتماعی ہے کیونکہ اجتماع مدنی دنیا میں سب سے زیادہ ارادی فعل ہے۔ قدرتاً ہر شخص آزاد اور آپ اپنا مالک و مختار پیدا ہوا ہے لہذا کوئی شخص کسی عذر یا بہانہ سے اس کی مرضی کے بغیر اسے غلام نہیں بنا سکتا۔ یہ قرار دینا کہ ایک غلام کی اولاد غلام ہوتی ہے گویا یہ قرار دینا کہ وہ آدمی کی اولاد نہیں۔

اجتماعی معاہدہ کے وقت اگر کچھ لوگ اس کے مخالف بھی ہوں تو ان کے اختلاف سے یہ معاہدہ باطل نہیں ہوتا بلکہ اس کے سبب سے صرف وہ چند نفوس اس میں شریک ہونے سے رہ جاتے ہیں وہ شہریوں میں اجانب ہوتے ہیں۔ جب ریاست قائم ہوتی ہے تو اس میں مجرد سکونت رضامندی کی دلیل ہوتی ہے۔ اس کی قلمرو میں رہنا اس کے استقلالیہ کو تسلیم کرنا ہے۔[۱۵]

اس اولین معاہدہ کو مستثنیٰ کر کے جمہور آرا کی پابندی باقی تمام قوم پر لازم ہے اور یہ خود معاہدہ کا لازمی نتیجہ ہے۔ مگر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک شخص آزاد بھی ہو اور غیر کی مرضی کی پیروی پہ مجبور ہو۔ ایک مخالف جماعت کے افراد کس طرح آزاد ہو سکتے ہیں جب کہ وہ ایسے قانون کے ماننے پر مجبور رہوں جن پر وہ دل سے راضی نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ سوال ہی غلط وارد کیا گیا ہے۔ شہری تو تمام قوانین پر راضی ہوتا ہے یہاں تک کہ ان قوانین پر بھی جو اس کی مرضی کے خلاف وضع ہوں بلکہ اُن پر بھی جو کسی

---

[۱۵] یہ صرف آزاد ریاستوں کے متعلق سمجھنا چاہیئے جہاں سے لوگوں کو اپنی مرضی سے اپنا مال و دولت لے کر رخصت ہو جانے کی آزادی حاصل ہو۔ کیونکہ دوسری ریاستوں میں اعزا و اقربا، مال و دولت، بے پناہی، احتیاج، ظلم و تعدی کسی باشندہ کو اس کی مرضی کے خلاف کسی ملک میں محصور رکھ سکتے ہیں۔ البتہ ایسی حالت میں اس کی مجرد سکونت نہ معاہدہ پر اس کی رضامندی پر دال ہوتی ہے نہ اس کی خلاف ورزی پر۔ (مصنف)

قانون کی خلاف ورزی پر اسے سزا دلوائیں۔ ریاست کے ممبروں کی غیر متغیر و مستقل مرضی ہی کا نام مرضیِ عام ہے۔ اسی مرضی کی بدولت وہ شہری اور آزاد ہیں۔ جب مجلس عوام میں کوئی قانون پیش ہوتا ہے تو قوم سے سوال یہ نہیں ہوتا کہ آپ اسے منظور کرتے ہیں یا نامنظور بلکہ یہ ہوتا ہے کہ آیا مرضیِ عام کے جو عین اُن کی مرضی ہے مطابق ہے یا نہیں۔ ہر شخص اپنی رائے دے کر اس مسئلہ کے متعلق اپنا عندیہ ظاہر کرتا ہے اور رایوں کے شمار سے مرضی عام دریافت ہو جاتی ہے اس لیے اگر میری رائے کے خلاف کوئی رائے مسلم قرار پا جائے تو اس سے صرف یہ نتیجہ نکلے گا کہ میں بر سر غلط تھا اور جس رائے کو میں نے مرضیِ عام سمجھ رکھا تھا وہ مرضیِ عام نہ تھی۔ اگر میری شخصی رائے مان لی جاتی تو یہ گویا خود میری مرضی کے خلاف ہوتا کیونکہ ایک شہری کی حیثیت سے میری مرضی وہی ہے جو مرضیِ عام۔ تو اس صورت میں میں آزاد نہ ہوتا۔

بے شک اس استدلال میں یہ مفروضہ مان لینا پڑے گا کہ مرضیِ عام کی تمام علامات کثرت آرا میں مضمر ہوتی ہیں۔ جب کبھی یہ نہیں ہوتا تو جو طریق بھی اختیار کیا جائے حریت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اس سے پہلے میں بتا چکا ہوں کہ قومی مجالس کے مباحثہ و مذاکرہ میں خاص افراد اور خاص خاص جماعات کی مرضی کس طرح مرضیِ عام کی جگہ لے لیتی ہے اس ضمن میں میں اس بے عنوانی کے دفعیہ کی عملی تدبیریں بھی واضح طور پر بیان کر چکا ہوں۔ اور میں آگے چل کر اس مسئلہ پر پھر بحث کروں گا۔ مرضیِ عام کے اعلان کے لیئے جس نسبت سے تعداد آرا

ف ۱ جینوا میں ہم زندانوں کے اوپر اور جفاکش غلاموں کی زنجیروں پر لفظ حریت لکھا ہوا دیکھتے ہیں۔ اس تحریر کا یہ استعمال نہایت موزوں ہے، کیونکہ در اصل کل ریاستوں میں جرائم پیشہ لوگ ہی باشندوں کی حریت کو غارت کرتے ہیں۔ واقعی جس ملک میں ایسے تمام لوگوں سے سخت سخت مشقتیں اُٹھوائی جائیں وہاں کامل ترین حریت نصیب ہو گی (منہ)

درکار ہو میں نے اس کے اُصول بھی قائم کیے ہیں۔ ایک صورت کا فرق بھی اتحاد و ہم آہنگی کے توڑ دینے کو کافی ہے لیکن اتحاد اور مساوات کے درمیان بہت سی غیر مساوی تقسیمیں ہیں جنمیں ہر ایک کے ساتھ عدالت کی حالت اور ضروریات کے مطابق یہ تعداد تعین ہو سکتی ہے۔

اس نسبت کا ضبط و تعدیل دو عام اُصولوں کے ماتحت ہو سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ مسئلہ زیر بحث جس قدر زیادہ اہم و وقیع ہو اُسی قدر زیادہ کثرت آرا کی ضرورت ہے۔ دوسرا یہ کہ مسئلہ زیر بحث جس قدر زیادہ عجلت کا محتاج ہو اُسی قدر کم کثرت آرا کی تلاش ہونا چاہیئے۔ جس موقع پر فوری فیصلہ کی ضرورت ہو ایک شے کی زیادتی کافی سمجھنا چاہیے۔ ان میں سے پہلے اُصول قوانین کے لیئے زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے اور دوسرا معاملات کے لیئے۔ خواہ کچھ بھی ہو اُن کی مناسبت ترکیب سے ضروری اکثریت کی دریافت کے لیے بہترین معلوم ہو جاتی ہے

امید اور جاہ طلبی

إِنَّهُ لَا يَيْأَسُ مِن رَّوْحِ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ
وَمَن يَقْنَطُ مِن رَّحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا الضَّالُّونَ

قرآن حکیم کی ان آیات کریمہ میں ایک بردست راز کا اظہار ہی، وہ راز جس کو خدا نے صرف انسان کے ساتھ مخصوص کیا ہی، وہ راز جس کی وجہ سے تمام عالم کون پر اس کو فضیلت دی ہی، وہ راز جس کے پانے کے بعد انسان بڑے بڑے مراتب اور کمال انسانی کے وہ اعلیٰ مدارج حاصل کرتا ہی جن کو عنایت الٰہی نے صرف اسی کے لئے مخصوص کئے ہیں، تم اپنے ضمیر سے مخاطب ہو، اور اس آواز کی طرف کان لگاؤ جو تمھارے اندر سے آرہی ہی، تم اپنے وجدان میں اس وقت ایک قوی میلان اور ایک زبردست جذبہ خواہش کا پاؤ گے جو تمھیں اپنے ابنا جنس کے قلوب میں طلب عزت اور علو منزلت کے لئے آمادہ کرے گا، اس کے بعد تم قوم کی مجموعی شکل پر نظر ڈالو، وہاں بھی افراد کی طرح تم کو یہ جذبہ ملے گا کہ ایک قوم دوسری قوم کے مقابل سب سے بلند مرتبہ کی مشتاق ہی، دلدادۂ عزت کے لئے اگرچہ اس مقصد کی کامیابی سہل نہیں، لیکن با اینہمہ وہ اس کی راہ میں تمام مشکلات کا خوشی سے استقبال کرتا ہی، اس کے سامنے ایسی دشوار گزار گھاٹیاں بھی آتی ہیں، جو اسے بڑھنے نہیں دیتیں، لیکن پھر بھی اس کی خواہش میں کوئی ضعف اور اس کے میلان میں کوئی کمی نہیں واقع ہوتی، وہ برابر ان گھاٹیوں کو طے کرتا ہوا، دشواریوں کو برداشت کرتا ہوا منزل عزت کی سمت بڑھتا چلا جاتا ہی، یہاں تک کہ وہ عزت کی سب سے بلند چوٹی کو پا لیتا ہی، جب اس کی راہ میں کوئی زبردست مانع پیش آتا ہی، جو اسے ٹھہرنے پر مجبور کرتا ہی، تو وہ اس طرح بیتاب و بے قرار ہوتا ہی، جیسے کوئی گرم چٹان پر لوٹتا ہو۔

اگر کوئی عاقل اور واقف کار حکیم انسانی اعمال کی تحقیق پر آمادہ ہو، اور اس کے

ہر فعل کی علت غائی معلوم کرنا چاہے، تو وہ اس نتیجہ پر ضرور پہونچے گا کہ اکثر اعمال انسانی کی غرض وغایت صرف حصول عزت وجاہ ہی، یہ وہ خصوصیت ہی جو ہر قوم کے تمام افراد میں باوجود اختلاف طبقات کے ادنی سے لیکر اعلی تک پائی جاتی ہی: ہر طبقہ میں لوگوں کی یہ باہمی کشمکش عزت کے لیے ہمیشہ جاری رہتی ہی، ہر ایک بلندی کے لئے جدوجہد کرتا ہی، اور اس بات کی حرص کرتا ہی کہ سب کے دلوں میں واقعی عظمت کا سکہ بٹھا دے، جب وہ اس منزل پر لوگوں کے معیار کے مطابق پہونچ جاتا ہی، تو اس پر بس نہیں کرتا۔ بلکہ دوسرے طبقہ کی طرف جست کرتا ہی، اور وہاں بھی سب سے مقابلہ کرتا ہی، یہاں تک کہ وہ زندگی کے آخری لمحوں تک اسی تگ ودو میں لگا رہتا ہی، یہ اس لئے کہ کمال انسانی کی کوئی مقرر حد نہیں، جہاں پہونچ کر انسان کا نفس قانع ہو جائے، اور یہ اعتقاد کرے، کہ یہ آخری سرحد ہی، اب اس کے آگے کوئی نہایت نہیں، سبحان اللہ، اس جذبہ نے انسان کے دل پر کیا جادو کر دیا ہی، کہ وہ اسی کو اپنا ثمرۂ حیات اور اسی کو اپنے وجود کی غایت شمار کرتا ہی، وہ اپنی زندگی کو بیکار سمجھتا ہی، جب اس عزت کے فقدان اور اس کی پامالی کا خطرہ بھی اس کے دل میں گزرتا ہی، کیا تم نے اس گدڑی پوش فقیر کو نہیں دیکھا؟ جس پر کسی نے ظلم کیا ہی، اور اس کی عزت وآبرو کو خاک میں ملانا چاہتا ہی، وہی فقیر جو اب تک عاجز بیبس نظر آتا تھا، غضبناک ہو کر مرنے اور مارنے کیلئے طیار ہو جاتا ہی، حالانکہ اس تذلیل نے نہ اس کے کھانے میں کوئی کمی کی، نہ اس کے آرام میں کوئی خلل ڈالا۔ ایک نہیں بلکہ ہر زمانہ میں ہزارہا افراد نے اس عزت کی حفاظت میں اپنے کو خطرات میں ڈالا، اور عزیز جانوں سے ہاتھ دھویا، خدا کی عجیب شان ہی، کہ انسان کا کھانا پینا حرام ہو جاتا ہی، نرم اور گدگدا بستر خارزار معلوم ہوتا ہی، جب تک اُس کو یہ یقین نہ ہو، کہ جو کچھ اسے مل رہا ہی، وہ دوسروں سے بڑھ کر ہی، اور یہ کہ وہ اس کی بلندی کا دل سے اعتراف کرتے ہیں، گویا کھانے پینے کی لذت بھی صرف فخر ومباہات کا وسیلہ ہی پھر امد لذتوں کا

کیا شمار کتنی ہیں وہ جسمانی مشقتیں جو انسان نے برداشت کیں ؟ کتنی ہیں وہ سفر کی صعوبتیں جو خوشی سے اس نے منظور کیں ؟ اور کتنے ہیں وہ جنگ جدال کے مواقع جہاں وہ سر کو ہتیلی پر رکھ کرنے گیا ؟ اور کتنے ہیں وہ حسرتناک مناظر جب انسان کو لذائذ دنیوی سے باوجود قدرت کے کنارا کرنا پڑا ہی ؟ یہ سب کس لیئے ؟ صرف اس لیے کہ وہ عزت و شہرت کا طالب ہی۔ انسان پر خدا کی کس قدر مہربانی ہی، کہ وہ صرف ناموس عزت کے لیئے زندہ ہی، اس کی عزت تمام عالم کی عزت ہی، دنیا کی تمام لذتیں صرف عزت ہی کے لیئے بنی ہیں، بلکہ یہ زندگی بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہی، کہ انسان اس کو شاہراہ عزت بنائے، انسان جب اپنی زندگی کو الوداع کہتا ہی، تو اس کی آنکھیں ان چیزوں سے ٹھنڈی ہوتی ہیں، جن کو اس نے کر لیا، اور اس کا دل رنجیدہ ہوتا ہی اُن چیزوں سے جن کے انجام سے وہ قاصر رہا۔

وہ عزت کیا ہی ! جس کے لیئے انسان اس قدر دیوانہ وار کوشش کرتا ہی، بڑے بڑے خطرات میں اپنے کو خوشی سے ڈال دیتا ہی، اگر موقع پڑ جاتا ہی تو اپنی عزیز جان کو بھی اس عزت کی دیوی پر قربان کر دیتا ہی ! یہ عزت وہ انمول گوہر ہی، کہ جس کے نصیب میں یہ آتا ہی، لوگ اس کی سیادت اور حقیقی عظمت و بزرگی کا اعتراف کرتے ہیں، اس کے ہاتھوں میں اپنی عنان حکومت سپرد کر دیتے ہیں، یہ قدر و منزلت نہ صرف اس صاحب عزت کو حاصل ہوتی ہی، بلکہ ہر وہ ذات جو اس شخصیت سے متعلق ہی، اُس کے عزیز، اس کا خاندان اور اس کی تمام قوم، یہ درحقیقت ایک بہت بڑا اجر ہی، جو رب العزۃ کی طرف سے کسی انساں کو گوناگوں مصائب کے عوض ملتا ہی، عزت کا طالب جن باتوں میں اپنے لیئے نفع دیکھتا ہی، اُن کے لیے مدبر کائنات کا شکر گزار ہوتا ہی، جس کا خوشگوار نتیجہ اسکی ساری قوم کو ملتا ہی خدا کی یہ کتنی بڑی حکمت ہی، کہ اگر قوم کا ایک فرد بھی حقیقی عزت و حرمت حاصل کرتا ہی، تو ساری قوم کو سیادت کا فخر حاصل ہوتا ہی، اس میں شبہ نہیں

کہ جو کچھ وہ حاصل کرتا ہے، وہ تنہا اپنی کوششوں سے نہیں، بلکہ تمام افراد قوم کی مدد اس کے ساتھ ہوتی ہے، (ذالک تقدیر العزیز العلیم) ایک اکیلا محنت کرنے والا کیا کرسکتا ہے، اور اپنی سعی و کوشش کو کیونکر بارآور بنا سکتا ہے، تاوقتیکہ اس کے خاندان و قبیلہ کے لوگ اس کے لیے دست و بازو نہوں۔ لہذا جو عزت و شرف کے اعلیٰ درجات تک پہونچنا چاہتا ہے، اُس کو ازبس ضروری ہے کہ وہ خود مع اپنے ساتھیوں کے ہر کمال و فضیلت کے حاصل کرنے کے لیے بڑھے۔

انسان کے اس فطری میلان اور الہام الٰہی کی خدمت گزاری کس قدر دشوار ہے، کس قدر زبردست ہیں وہ مشکلات جو انسان اپنے بعض مقاصد کی خاطر اُٹھاتا ہے، اور کس قدر عظیم ہے وہ شے جو انسان کو کسی بلند مقصد کے حصول کے لیے گوناگوں مصائب اٹھانے پر آمادہ کرتی ہے، آخر وہ کونسی شے ہے، جو لوگوں پر ہر مشکل کو آسان، ہر دور کو نزدیک، ہر بڑے کو چھوٹا، اور ہر سخت کو ملائم کر دیتی ہے، مصائب کا خیال لوگوں کے دل سے یکقلم نکال دیتی ہے، اور ہر بڑی سے بڑی قربانی کے لیے جانی ہو یا مالی راضی کر دیتی ہے، یہ زبردست محرک، اور نفس کو ہر عمل پر برانگیختہ کردینے والی برقی قوت امید ہے۔

امید مصائب کی تاریکیوں میں ایک روشنی مشعل ہے، ہجوم مشکلات میں ایک حاذق رہنما ہے، ارادوں میں سستی کے وقت ایک قاہر حاکم ہے اور ٹوٹی ہوئی ہمتوں کو دوبارا تقویت دینے کے لیے ایک فرشتہ غیب ہے، امید اُن آرزوؤں اور بوالہوسیوں کا نام نہیں جو ذہن میں پے درپے داخل ہوتی رہتی ہیں، اور انسان ان کو ان الفاظ سے تعبیر کرتا ہے کاش میرے لیے سلطنت ہوتی، میرے لیے جاہ و منزلت ہوتی، حالانکہ وہ عیش و عشرت سے باز نہیں آتا، ملائم بستروں سے ایک گھڑی علحدہ ہونا نہیں چاہتا، اُن طفلی ملاعب کو ترک نہیں کرتا، جو ہر آن مقصد سے اس کو دور کر رہے ہیں، گویا یہ شخص چاہتا ہے کہ خدا انسانی اعمال و حرکات میں اس کی خاطر اپنی سنت کو بدل دے، اور اس کی دلی آرزو بغیر

محنت و مشقت کے پوری کرتے نہیں، بلکہ امید اس سچی اور حقیقی خواہش کا نام ہے، جس کے ساتھ ساتھ عمل ہو، اور انسان کو اس کی راہ مقصود میں آنے والی دشواریوں اور نازل ہونے والی مصیبتوں کے جھیلنے پر خوشی سے آمادہ کرتے، وہ امید جو انسانی قلب میں اس خیال کو راسخ کردے، کہ بغیر مقصود کے جینا بیکار ہے، وہ سر جو اس بادۂ امید سے سرشار ہے، اسکی قربانی کا پہلا قدم نقد جان ہے، دولت و زر کو تو وہ صرف حوادثات عالم سے زندگی کو محفوظ رکھنے کے لیئے ایک ذریعہ سمجھتا ہے۔

جس طرح بڑھنے کا میلان ایک فطری بات ہے۔ اسی طرح امید اور نفس پر یہ اعتماد کرنا، کہ اس کی کوششیں مقصد تک پہونچانے والی ہیں، قدرت کی ودیعتوں میں سے ہے، اگرچہ دونوں وجود عام فطرت انسانی میں مزاحمات و موانع سے خالی نہیں، تاہم ہر ایک اس ودیعت الٰہی کے مطابق ضرور عزت و مجد کی تلاش کرتا ہے، اور دوسروں کے دل میں اپنی جگہ کرنا چاہتا ہے گویا ہر ایک طالب و مطلوب دونوں ہے، عقل انسانی کی مساعی ابھی اس پائے تک نہیں پہونچی ہیں، کہ وہ ہر فرد کے اس عمل کی تائید کریں، جو وہ دوسروں کے نزدیک ہر دلعزیز ہونے کے لیئے کر رہا ہے، اور اس طرح سے سب کے سب معزز و محترم ہو جائیں، لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ وہ امید و خواہش کی طرح اعمال میں بھی متصادم ہوتے ہیں، اور اس طرح سے ہر ایک کی راہیں بیشمار مشکلات سے پُر ہیں، مگر نوع انسانی کی اس کشمکش میں بھی خدا کی ایک بڑی حکمت پوشیدہ ہے (لیعلم الذین جاھدوا ولیعلم الصابرین) جب کسی فرد یا قوم پر بہم مشکلات طاری ہوتی ہیں، تو اُس کی ہمت پست ہو جاتی ہے، ارادوں میں تزلزل واقع ہو جاتا ہے، اور انحطاط کا بادل چاروں طرف سے اس پر محیط ہو جاتا ہے، اُس وقت کیا ہوتا ہے؟ اُسوقت یہ ہوتا ہے کہ طبیعت انسانی کی ان دونوں شریف خصلتوں (امید و طلب عزت) میں فساد واقع ہو جاتا ہے، جس طرح اور عمدہ اخلاق و مکارم میں، اور انکی جگہ یاس و حرماں نصیبی لے لیتی ہے۔ نعوذ باللہ منہا۔

ان مایوس او رحسرت زدہ انسانوں کی کیا کیفیت ہوگی۔ جن کے رشتہائے امید ایک ایک کرکے سب منقطع ہوگئے ؟ وہ اپنی ذلت کا فیصلہ کرلیتے ہیں۔ ہر پلندی سے محرومیت اور عاجزی کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی ایسی دنائت اور ذلت باقی نہیں رہتی جس کو وہ اختیار نہ کرتے ہوں، اہانت و تحقیر کی ہر ادا انھیں محبوب ہونے لگتی ہے، ان کے تمام وہ احساسات و جذبات انسانی جو انسان کو انعام سے ممتاز کرتے ہیں، فنا ہو جاتے ہیں وہ ہر اس شے سے خوش ہوتے ہیں، جو حیوانات کو خوش کرتی ہے، ان کا سرمایہ حیات بجز کھانے پینے کی احتیاجات کے اور کچھ نہیں، کاش وہ جانور ہی ہوتے، ادھر ادھر چرا گاہوں میں پھرتے، اور سرسبز نباتات سے اپنا پیٹ پال لیتے، لیکن افسوس ایسا نہیں ہے، وہ اگر اپنے لئے کام نہیں کرتے، تو خدا ان پر بطور سزا کے ایسے لوگوں کو مسلط کر دیتا ہے، جو اپنے آرام کے لئے ان کو استعمال کرتے ہیں، بالکل اس جانور کی طرح جو اگرچہ اپنی پیٹھ پر ہزاروں من کا بوجھ اٹھاتا ہے، لیکن اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے آرام و راحت کے لئے، کسان چلچلاتی دھوپ میں دن بھر کھیتوں میں ہل چلاتے ہیں، مزدور کارخانوں میں ہر وقت لگے رہتے ہیں اور اس کے علاوہ سیکڑوں محنت و مشقت کے کام لوگ کرتے ہیں، اور اتنی تکلیفیں اٹھاتے ہیں کہ کوئی اپنے لئے بھی نہیں اٹھا سکتا، مگر اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے ؟ آیا ان کو بھی اپنے پسینہ بہانے کا کوئی عوض ملتا ہے ؟ نہیں بلکہ ان کی گاڑھی کمائی کا سارا فائدہ صرف انکی نذر ہو جاتا ہے، جو اپنی اولوالعزمیوں کی بدولت ان پر حکمراں ہیں، کاش جس قدر ایک ذلیل اپنی ذلت کے لئے اعمال شاقہ کی مصیبت گوارا کرتا ہے، اس کا کوئی حصہ بھی وہ عزت و شرف کے چاہنے میں گوارا کرتا تو یقیناً اسے خاطر خواہ ثمرہ ملتا، حقیقت یہ ہے کہ ان حرماں نصیبوں کا درجہ حکومت کرنے والوں کے نزدیک حیوانات سے بھی گیا گزرا ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ بداہتاً اس کو سمجھتے ہیں، کہ یہ وہ لوگ ہیں، جنھوں نے خود اپنے کو مقتضائے فطرت انسانی کے مرتبہ سے گرا دیا ہے، اور اس چیز پر راضی ہو گئے ہیں، جو ان کے حق سے کہیں کم ہے، بلکہ ایسی چیز جو

کبھی ان کی شایان شان نہیں، انھوں نے انسانی شکل میں پیدا ہو کر خدا کی نعمتوں اور ودیعتوں کا جو ہر فرد بشر میں اس نے ودیعت کی ہیں، صاف و صریح کفر کیا ہے، لہٰذا حکمران ان کے ساتھ وہ وہ روا رکھتے ہیں، جو جانوروں سے ان کے قاصر ہونے کے سبب روا نہیں رکھتے، اس کا مشاہدہ ہم آج ان قوموں سے کر سکتے ہیں جن کو مایوسی نے ہر طرف سے گھیر لیا ہے اور غیروں کی غلامی کا جوا ان کے کندھوں پر رکھا ہوا ہے۔

اب تک ہمارا گمان ہی تھا، کہ پہلے ایسی قومیں تھیں جن کے حکمران انکو طرح طرح سے ستاتے تھے، مگر اب ہم اپنی آنکھوں سے ایسی قومیں دیکھتے ہیں، جن کے حکمران ان کے ساتھ جانوروں سے بھی زیادہ بُرا سلوک کرتے ہیں۔

حیرت بالائے حیرت ہے، کہ طبیعت کے احکام کیونکر بدل جاتے ہیں، فطرت کے اثرات کیونکر محو ہو جاتے ہیں، کیونکر ایک نفس اس طرح ذلت پر قانع ہو جاتا ہے کہ اُبھرنے کی آرزو نہیں کرتا، اور کیونکر اس قدر مایوس ہو جاتا ہے کہ کوئی امید باقی نہیں رہتی، حالانکہ امید اور عزت کی محبت انسان کی طبیعت میں داخل ہیں، غور و تامل کے بعد اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے، کہ انسان نے یہ سمجھ لیا ہے، کہ اس کے تمام اعمال و افعال مستقل حیثیت سے صرف اسی کے قوت و ارادے سے صادر ہوتے ہیں، اس کی قوت ہی صرف اس کے تمام اعمال کی حاکم ہے، اس کے اوپر کوئی ایسی قوت نہیں، جو اس کی مدد کرے، یا اس کو بچیر رکھے۔ لہٰذا جب بار بار کسی عمل کے لیے اس کے سامنے مواقع پیش آتے ہیں، اور مقصود تک پہونچنے کے لیے بیشمار مشکلات سد راہ ہوتی ہیں، تو وہ اپنی قدرت کی طرف لوٹتا ہے، مگر اس کو مردہ پاتا ہے، قوت کی طرف پھر کر دیکھتا ہے، تو وہ بھی جواب دے نہیں سے، اس وقت وہ اپنی کمزوری کا اعتراف کر کے بے بس ہو جاتا ہے، اور مایوس و نا امید ہو کر بیٹھ جاتا ہے، یہی ہے وہ منحوس مقام جہاں سے انسان کی ذلت و رسوائی کا آغاز ہوتا ہے، اس لیے کہ اس وقت وہ اپنے دل میں اس امر کا اعتقاد کر لیتا ہے کہ بس ان

موانع کے لیئے کوئی روک نہیں، جب مانع کی قوت اس کی قوت سے بڑھ گئی، تو اب عمل کے رستے مسدود ہوگئے، لہٰذا اس کی تمام اُمیدیں یک لخت منقطع ہوجاتی ہیں، اور دائمی بدبختی کے جال میں پھنس جاتا ہی، لیکن کہیں اگر اسے یہ یقین ہو کہ کائنات کے پس پردہ ایک ور بھی زبردست مدبر ہی، جس کی عظمت و جبروت کے سامنے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سر جھکائے ہوئے ہی، زمین کے تمام سلاطین اس کے خراج گزار ہیں، اور وہ ایسا قادر مطلق ہی کہ تمام کائنات عالم اس کے (کن فیکون) کا ادنیٰ مظہر ہی، تو یہ ناممکن ہی کہ اس یقین کے ساتھ مایوسی اس پر قبضہ کرسکے، یا ناامیدی اس کی امیدوں کا خاتمہ کردے، اس لیے کہ ایک یقین کرنے والا جس وقت بھی اپنی کمزوری کا احساس کرے گا۔ یا اپنے ہاتھوں کو کسی عمل کے لیئے شل پائے گا۔ تو خدا کی اس قوت کو کبھی نہ بھولے گا، جو تمام قوتوں سے بالاتر ہی، ایسے ہی وقتوں میں وہ اپنے عمل کو جاری رکھنے کے لیئے، اس قوت کی طرف متوجہ ہوگا، اور مایوسی کو اپنے پاس نہ آنے دے گا، جب جب اس پر سختیوں کا ہجوم ہوگا، وہ اور جوش کے ساتھ اس کی مدافعت کو بڑھے گا، اس لئے کہ اسے اس ہستی کی قوت کا اعتقاد ہی، جس کا کوئی آسمان و زمین میں مزاحم نہیں، ایک دروازہ اگر اس پر بند ہوگا، تو صدہا دروازے خدا کی عنایت و مہربانی سے اس پر کھل جائیں گے، لہٰذا نہ کبھی وہ ملول ہوگا، اور نہ کبھی پست ہوگا، اور نہ کبھی کسی ناکامیابی کا خطرہ اس کے دل میں گزرے گا، وہ سمجھتا ہی کہ مدبر عالم اس پر یقیناً قادر ہی کہ پہاڑوں کو متزلزل کردے، دریاؤں کو شق کردے، شہنشاہوں کو گدا بنادے، اور ایک گدائے بینوا کو تخت شاہی پر سرفراز کردے، اور بارہا خدا کی قدرت نے اس طرح جلوہ کیا ہی، لہٰذا اس کا ارادہ اور مضبوط ہوجاتا ہی، اور کمال کے حاصل کرنے کیلیئے ہمہ تن مستعد ہوجاتا ہی جس کو کوشش کے بعد خدا نے مرحمت کرنیکا وعدہ کیا ہی، جو شخص خدا، اس کی قدرت، اس کی عزت، اور اس کی جبروت پر یقین کامل رکھتا ہی، وہ کبھی مایوس نہ ہوگا، اس لیئے خدا نے اصل حقیقت سے اس کو خبردار کردیا ہی جسمیں مطلق شک و شبہہ نہیں، وہ اصدق القائلین ہی، (انّہ لَا یَیْئَاسُ مِنْ رَّوحِ اللّٰہِ

اِلاّ القومُ الکافرُون) اپنے پیغمبر ابراہیم کی زبان سے اپنی تعلیم کی ان الفاظ میں ترجمانی کرتا ہے
(ومن یقنط من رحمۃ ربہ الا الضالون) پس بلا شبہ خدا نے یاس اور ناامیدی کو گمراہی
کی دلیل قرار دی ہے' اور اس دل میں کہاں سے یاس داخل ہو گی' جو دل خدا اور اس کی
قدرت کاملہ کے ایمان سے بندھا ہے' لہذا ہم بہانگ دہل یہ کہہ سکتے ہیں' کہ مسلمانوں کا خدا کے
ساتھ یقین' اور جو کچھ نبی صلعم لائے اس کی تصدیق کبھی اس کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنی گزشتہ
عزت وعظمت کے لوٹانے میں باوجود کثرت تعداد کے رحمت الٰہی سے مایوس ہوں' ان کا ایمان کبھی
یہ نہیں بتاتا' کہ وہ توہین کو قبول کریں' اور اپنی ذلت ورسوائی سے خوش ہوں' بلندی ورفعت
کے حاصل کرنے کے بجائے سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں' رب العزت کا شکر ہے کہ مسلمان ابتک
اس ابتلا وآزمائش سے محفوظ ہیں' جو اکثر قوموں کے ساتھ کی گئی' ان کے پاس ابھی سلطنت
بھی باقی ہے' اور انشاء اللہ ہمیشہ ایک بڑی سلطنت اس زمین پر مسلمانوں کی رہے گی' حق تو یہ ہے
کہ ان پر رحمت الٰہی کے دروازے اب بھی کھلے ہیں' ان کا کام صرف ان میں داخل ہو جانا ہے'
خدا کا ابر کرم ان پر گلاب پاش کر رہا ہے' اس کی خوشبوؤں سے معطر ہونے کے لئے بس
ایک سونگھنے والی ناک درکار ہے' فرصتیں ہمیشہ ان کو بیدار کرنے کے لئے ہاتھ بڑھاتی ہیں'
غافلوں کی تنبیہ کرتی ہیں' سونے والوں کو ہشیار کرتی ہیں' سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنی کھوئی
ہوئی عظمت کے حاصل کرنے کے لئے بجز اس بات کے اور کوئی بات ضروری نہیں کہ وہ متحد ہو جائیں'
اعزاز ملت کے لئے باہم ایک دوسرے کی اعانت کریں' اور اس کامیابی کا حقیقی راز اسی دینی
اتحاد ہی میں پوشیدہ ہے' پھر کونسی چیز اب یاس کا باعث ہے' اور کونسی چیز ناامیدی کی طرف
بلانے والی ہے' جبکہ ان کے سامنے صاف صاف خدا کی کتاب یہ کہہ رہی ہے' کہ مایوس ہونا
گمراہوں کی صفت ہے' کیا ہدایت وضلالت میں کوئی یگانگت ممکن ہے' اور کیا حق کے بعد صرف
گمراہی باقی نہیں رہ جاتی؟ کیا مسلمان ساری دنیا میں حکومت وسیادت کی عزت حاصل
کرکے آج اغیار کی غلامی میں آنے کے لئے خوش ہیں؟ وہ زندگی سے کس بات کی تو

گلاتے ہیں، اگر وہ ظالم دشمنوں کے قبضہ میں اس طرح ذلت واہانت، فقر و فاقہ اور بدبختی کی زندگی پر قانع ہیں؟ وہ مطمئن ہیں، حالانکہ اغیار ان کے داہنے بائیں سرکوبی کے لیے موجود ہیں، وہ اغیار جو جفا کار ہیں، ذلیل ورسوا کرنے والے ہیں، اور جنھوں نے اپنے غلاموں کے متعلق یہ قطعی فیصلہ صادر کر دیا ہے کہ وہ اقوام کی صف میں جگہ نہیں پا سکتے، کیا اس سے بڑھ کر انسانیت کی کوئی اور رسوائی ممکن ہے، اور کیا انسان جب تک اس کی انسانیت سلب نہ ہو، ایک لمحہ کے لیے بھی اس ذلت اور بدبختی کی زندگی کو پسند کرے گا، مسلمان کیا وہ زمانہ بھول گئے، جبکہ دنیا ان کو اپنی آنکھوں میں بٹھاتی تھی، حالانکہ ابھی زیادہ عرصہ اس کو نہیں گذرا، صفحات تاریخ کی روشنائی ہنوز تازہ ہے، دنیا کے پاس ان کی عظمت کے آثار باقی ہیں۔ اس وقت بھی زمین پر ان کا شوکت واقتدار بالکل معدوم نہیں ہوا ہے (بلکہ اب تو خدا کی مہربانی سے امید کی نئی کونپلیں تمام دنیائے اسلام میں پھوٹ رہی ہیں)

عوام اگر اس قانون الٰہی سے بے خبر ہیں، تو خیر مگر علماء کے لیے کیا عذر ہے؟ وہ علماء جو شریعت اسلامیہ کے محافظ ہیں، وہ علماء جو راسخون فی العلم کہلانے کے مستحق ہیں، کیوں وہ متفرق مسلمانوں کو متحد کرنے کی کوشش نہیں کرتے؟ کیوں وہ ان کے بکھرے ہوئے شیرازے کو ایک لڑی میں نہیں پروتے؟ کیوں وہ ان خرابیوں کی اصلاح نہیں کرتے، جو انمیں پیدا ہو گئی ہیں کیوں وہ اپنے امکان بھر مسلمانوں کو تقویت پہونچانے، اور رب العزت والجلال کے ان وعدوں کی بشارت دینے میں پہلو تہی کرتے ہیں، جو اطاعت شعاری اور ایمان بالجزم کے عوض ان سے کئے گئے ہیں؟ یقیناً اب ایک جماعت خدا نے ایسی پیدا کر دی ہے، جن کے سینوں کو ایمان کے لیے اس نے کشادہ کر دیا ہے، اور وہ اس عالمگیر مقصد کی تکمیل کے لیے زمین کے چپہ چپہ میں پھیل گئے ہیں، ان کا باہمی اتفاق ایک دن ضرور ان کو مرکز واحد پر کھڑا کر دے گا، باقی مسلمانوں سے ہمیں صرف اس قدر توقع ہے، کہ وہ ان سے اتفاق کر کے ان کی اعانت کریں تاکہ سب کو خدا کی فتح عظیم حاصل ہو (ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم) مترجمہ سعد انصاری۔ جلتہ

جشن نوروز اور ایک محفل عروسی

ترجمہ از دستائیفسکی

"دستائیفسکی کے نام سے ہمارے ملک میں بہت کم لوگ واقف ہیں اور اس پر کیا موقوف ہے کسی روسی انشا پرداز تک ہماری پہونچ ابھی نہیں ہوئی ہے۔ دستائیفسکی صرف روس ہی میں نہیں بلکہ تمام دنیا میں بحیثیت باکمال افسانہ نویس سحر نگار انشا پرداز اور نفس انسانی کے حقائق و اسرار کے ترجمان کے شہرت رکھتا ہے۔ اس چھوٹے سے افسانے سے اُس کے کمالات کا قرار واقعی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ آگے چل کر انشاء اللہ اس قصہ کے مترجم محمد مجیب صاحب بی۔ اے جو روسی ادب سے خاص مذاق رکھتے ہیں اور روسی زبان سیکھ رہے ہیں اس مصنف اور دوسرے روسی ادیبوں کی معرکۃ الآرا کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کریں گے"

کچھ دن ہوئے میں ایک شادی میں شریک تھا۔ مگر نہیں میں پہلے ایک نوروز کے جشن کا قصہ سُناؤں گا۔ شادی بہت دلچسپ تھی اور مجھے بہت پسند آئی مگر اُس پہلے واقعہ کا ذکر پہلے کرنا چاہیئے۔ عجب بات ہے کہ اس شادی میں شریک ہو کر مجھے وہ نوروز کا جشن یاد آگیا۔ اسکی وجہ یہ تھی۔

پورے پانچ برس ہوئے میں نوروز کے موقعہ پر ایک بچوں کے ناچ میں مدعو تھا۔ صاحب خانہ جنھوں نے مجھے دعوت دی تھی تاجروں کے طبقہ میں بہت ممتاز تھے اُن کے تعلقات بااثر لوگوں سے تھے اور اُن کی ملاقات کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ وہ اکثر طرح طرح کی مجلسیں منعقد کیا کرتے تھے اور لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بچوں کا ناچ محض ایک بہانہ ہے جس کی آڑ میں اُنھوں نے ایک معمول سے بڑی جماعت اکٹھا کی ہے تاکہ ہر طرح کی بے ضرر اور دلچسپ گفتگو سے دل بہلائیں۔

میں اس حلقے میں اجنبی تھا اور مجھے اس گفتگو سے بالکل رغبت نہ تھی۔ اس لئے اُس رات کو

کئی بار ایسا ہوا کہ میں اکیلا چھوڑ دیا گیا۔ وہاں ایک صاحب اور تھے جو معلوم ہوتا تھا کہ میری طرح یہاں کی صحبتوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے اور محض اتفاقاً بلائے گئے تھے۔ ایک لانبے دُبلے آدمی تھے سنجیدہ طبیعت کے معلوم ہوتے تھے اور صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھے مگر بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ دل بہلانے یا خاندان کی خوشی میں حصہ لینے نہیں آئے ہیں۔ جب کبھی وہ کونے میں ہٹ کر کھڑے ہو جاتے ہیں تو فوراً ہنسنا موقوف کر دیتے تھے اور اُن کی تیوری پر بل پڑ جاتا تھا۔ صاحب خانہ کے علاوہ وہ اس مجمع میں کسی سے واقف نہ تھے ظاہر ہے کہ اُن کی طبیعت اُکتا گئی تھی مگر اُنھوں نے اس کا ارادہ کر لیا تھا کہ آخر تک ایک شادان و فرحاں مہمان کے انداز کو نباہیں گے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایک صاحب تھے جو مفصلات سے ایک نہایت اہم معاملہ کے طے کرنے کے لئے آئے ہوئے تھے اور ہمارے میزبان کے پاس ایک سفارش کا خط لائے تھے جس کی وجہ سے موصوف نے اُنھیں اپنی حمایت میں لے لیا تھا، اگرچہ خالص محبت کے انداز سے نہیں اور ازراہ مہمان نوازی اُن کو اپنے بچوں کے ناچ میں بھی بلا لیا تھا۔ تاش کوئی کھیل نہیں رہا تھا سگار ان کو دئے نہیں گئے تو اُن سے باتیں کسی نے چھیڑی نہیں (شاید اس وجہ سے کہ لوگوں نے دور سے پر دیکھتے ہی ایک دیسی مثل کی طرف اشارہ ہے) چڑیا کو پہچان لیا تھا اور بیچارے کیا کرتے مجبوراً اپنے ہاتھوں کو کسی طرح مشغول رکھنے کے لئے ساری شام اپنے گلچھوں پر ہاتھ پھیرتے رہے اُن کے گلچھے دراصل بہت خوبصورت تھے مگر وہ ان پر اس قدر رجوع قلب کے ساتھ ہاتھ پھیر رہے تھے کہ دیکھنے والے کو یہ خیال ہوتا تھا کہ دنیا میں اُن کے گلچھے پہلے آئے تھے اور یہ حضرت بعد میں اُن پر ہاتھ پھیرنے کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ ان صاحب کے علاوہ میری نظر ایک اور صاحب پر پڑی مگر یہ بالکل ہی دوسری قسم کے آدمی تھے۔ وہ نہایت اہم شخصیت رکھتے تھے اور اُن کا نام دمیٹری پیٹرووچ نارکن تھا۔ پہلی ہی نظر میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بڑے آدمی ہیں اور ہمارے میزبان سے اُسی قدر برتر ہیں جتنے ہمارے میزبان

کھلونے والے صاحب سے ہمارے میزبان اور اُن کی بیوی دونوں ہر طرح کی میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے۔ بہت ادب سے پیش آتے تھے۔ بار بار شراب کے جام پینے پر مجبور کرتے تھے۔ غرض ہر طرح اُن کی دلداری کرتے تھے۔ دوسرے لوگوں کو لا کر اُن کے سامنے پیش کرتے تھے اور اُن کو کسی کے سامنے نہیں میں نے یہاں تک محسوس کیا کہ ایک موقعہ پر جب جناب نارکن نے فرمایا کہ اُنھوں نے اپنا وقت اتنی اچھی طرح نہیں گذارا تھا جتنا کہ اس بچوں کے ناچ میں تو ہمارے میزبان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس قدر عظیم الشان آدمی کے قریب بیٹھنے نے مجھ پر خوف طاری ہوا تھا اس لیے جب میں بچوں کو اچھی طرح دیکھ چکا تو ایک چھوٹے سے کمرے میں چلا گیا جہاں کوئی نہ تھا اور وہاں ایک پھول دار درختوں کے کنج میں جو آدھے کمرے کو گھیرے ہوئے تھا بیٹھ گیا۔

بچے غیر معمولی طور پر پیارے تھے۔ اور باوجود میاں اور اُستانی کی تاکید کے وہ اس پر راضی نہیں ہوتے تھے کہ ہر بات کو اپنے بزرگوں کی مرضی کے مطابق کریں۔ ان کے لیے جو مٹھائی بڑے دن کے درخت پر رکھی گئی تھی وہ اُنھوں نے ساری کی ساری لوٹ لی تھی۔ اور یہ معلوم کرنے سے پہلے کہ کونسا کھلونا کس کا ہے اُنھوں نے آدھے کھلونے توڑ ڈالے تھے۔ خاص طور سے پیارا ایک کالی آنکھوں اور گھونگھر والے بالوں کا لڑکا تھا جو مجھ کو اپنی لکڑی کی بندوق سے داغ دینا چاہتا تھا۔ مگر پھر بھی لوگوں کی توجہ اُس کی بہن کی طرف زیادہ تھی۔ وہ تقریباً گیارہ برس کی دلفریب خاموش اور سنجیدہ لڑکی تھی۔ اُس کے چہرے کا رنگ زردی مائل تھا اور اُس کی آنکھیں بڑی اور کشادہ تھیں جن پر غور و فکر کے آثار پائے جاتے تھے۔ دوسرے بچوں نے اُس کو کسی طرح سے خفا کر دیا تھا اس لیے وہ اُن کے پاس سے بھاگ کر اُسی کمرے میں چلی آئی جہاں میں بیٹھا تھا اور ایک کونے میں بیٹھ کر اپنی گڑیا سے کھیلنے لگی۔

یہاں میں چند باتیں کہنا چاہتا ہوں جو میں نے پہلے مشاہدہ کی تھیں۔ تمام مہمان ایک دوسرے

گویا بار ایک دولتمند شراب کے ٹھیکہ دار کی طرف متوجہ کر رہے تھے جو اس لڑکی کا باپ تھا کسی نے پکے سے کہا کہ اُس نے اپنی لڑکی کے جہیز کے لیے تین لاکھ روبل یعنی کوئی ملا کہ روپے علٰحدہ رکھ دیئے ہیں۔ میں اُس طرف مڑا کہ اُن لوگوں کو دیکھوں جنھیں اس معاملے سے دلچسپی ہے اور میری نظر نارگن صاحب پر پڑی۔ وہ اپنی کمر پر دونوں ہاتھ رکھے ہوئے اور سر کو ذرا سا ایک طرف جھکائے ہوئے نہایت توجہ سے اِن لوگوں کی بے مزہ گفتگو کو سُن رہے تھے۔

علاوہ اس کے بچوں کو کھلونے تقسیم کرنے میں۔ اپنے میزبان کی دانشمندی کی میں بغیر تعریف کیئے نہیں رہ سکتا۔ اُس چھوٹی لڑکی کو جس کا جہیز ابھی سے ۳ لاکھ روبل مقرر ہو چکا تھا سب سے خوبصورت گڑیا ملی۔ اس کے بعد اور بچوں کو اُن کے ماں باپ کی حیثیت کے مطابق کھلونے دیئے گئے۔ جو بچہ سب سے آخر میں آیا کوئی دس برس کی عمر کا لڑکا تھا۔ وہ دُبلا اور پستہ قد تھا اُس کے بال سُرخی مائل تھے اور چہرہ داغ دار تھا۔ اُس کو صرف ایک کتاب ملی جس میں قصے تھے مگر صرف ایسے جن میں قدرت کی شان و شوکت اور متاثر دل کے آنسوؤں وغیرہ وغیرہ کا ذکر تھا۔ اُس کتاب میں تصویروں کا نام بھی نہ تھا اور پھول پتیاں بھی نہیں تھیں یہ ہمارے میزبان کے بچوں کی اُستانی کا لڑکا تھا۔ وہ ایک غریب بیوہ تھی اور یہ ایک شرمیلا سہما ہوا بچہ تھا جس کا کوٹ سستے فین سکے کا تھا۔ اپنی کتاب لے کر وہ بہت دیر تک اور کھلونوں کے چاروں طرف گھومتا رہا۔ اُس کا بہت جی چاہتا تھا کہ اور بچوں کے ساتھ کھیلے مگر اُس میں اتنی ہمت نہ تھی۔ ظاہر تھا کہ وہ اپنی حیثیت کو محسوس کرتا تھا۔ مجھے بچوں کو غور سے دیکھنے میں بہت خوشی ہوتی ہے۔ اُن کا درجہ بدرجہ سمجھ دار ہونا بہت دلچسپ ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ سُرخ بالوں والا لڑکا اور لڑکوں کے کھلونوں سے اور خصوصاً ایک مصنوعی تھیٹر جس میں وہ خود ایک پارٹ کرنا چاہتا تھا کھیلنے کی اس قدر ہوس رکھتا تھا کہ وہ ایک خوشامدانہ حرکت پر بھی آمادہ ہو گیا۔ اُس نے اور بچوں کو دیکھ کر مسکرانا شروع کیا اُس نے دل لگی کرنے کی کوشش کی اور اپنا سیب ایک چھوٹے فربہ اندام بچے کو دے دیا جس کی کمر

سے ایک مٹھائیوں کا تھیلا لٹکا ہوا تھا۔ بلکہ یہاں تک کہ اور لڑکوں کو اپنی پیٹھ پر سوار کرنا
شروع کیا تاکہ وہ اس کو اُس تھیٹر کے پاس تک نہ بھگا دیں۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد ایک لڑکو
بچہ نے بے وجہ اُس کو خوب ٹھوکا۔ بیچارے میں اتنی ہمت نہ تھی کہ روئے اس پر اُس کی
ماں پہونچی اور اُس سے بہت سختی سے کہا اُس کو اور لڑکوں کو کھیلنے میں دق نہ کرنا چاہیے
اب یہ بچہ بھی اُسی چھوٹے کمرے میں پہونچا جہاں وہ لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کو اس کی صحبت
سے کوئی شکایت نہ تھی اور دونوں گڑیا کو کپڑے پہنانے میں مشغول ہو گئے۔

میں اپنے کنج میں آدھے گھنٹہ بیٹھا رہا اور اُس سرخ بالوں والے لڑکے اور اُس
۴ لاکھ روبل کے جہیز والی لڑکی کی باتیں سنتے سنتے اونگھ گیا تھا کہ ایکبارگی نارکن صاحب کمرے
میں وارد ہوئے۔ اُن کی چال بہت تیز تھی اور بچوں کے مجمع میں اُن کو جو سے اختیار کی گئی
تھی کہ بڑے کمرے سے گزرنے میں اُنھیں کوئی دیکھ نہ لے میں نے دیکھا تھا کہ اس سے کچھ دیر پہلے
وہ اُس ہونے والی دلہن کے باپ سے جن سے اُن کی ملاقات اُسی وقت ہوئی تھی دو عہدوں
کے ایک دوسرے پر ترجیح رکھنے پر گرما گرمی سے سخت بحث کر رہے تھے۔ یہاں پہونچکر وہ
کسی خیال میں محو ہو کر کھڑے ہو گئے اور اپنی انگلیوں پر کچھ حساب کرتے ہوئے معلوم
ہوتے تھے۔

"۴ لاکھ... ۴ لاکھ" اُنھوں نے چپکے سے کہا "گیارہ.. بارہ.. تیرہ... سولہ۔ یعنی
پانچ سال فرض کیجئے پانچ فی صدی کی شرح سے یہ بارہ ہزار ہوئے، بارہ پنجے ساٹھ۔ اچھا
اور اُن ساٹھ ہزار سے اوپر اور... اچھا فرض کیجئے پانچ سال میں چار لاکھ ہو جائیں گے۔
ہاں، مگر یہ بے ایمان اپنا روپیہ چار فی صدی کے حساب سے نہیں لگائے گا آٹھ یا دس
فی صدی لے گا۔ اچھا تو سمجھئے پانچ لاکھ کم از کم پانچ لاکھ ہوئے۔ یہ تو یقینی ہے۔ اچھا اور
پھر پاندان کا خرچ! ہونہہ

اپنے سلسلۂ خیال کو ختم کر کے اُنھوں نے ناک صاف کی اور کمرے سے باہر جانا چاہتے

تھے کہ یکبارگی اُن کی نظر اُس لڑکی پر پڑی اور وہ کھڑے ہو گئے۔ میں کنج کے اندر اُس کی کمائی
نہیں دیا تھا۔ وہ بہت گھبرائے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ یا تو یہ اُس حساب کا اثر تھا یا کوئی اور
وجہ تھی مگر وہ ہاتھ مل رہے تھے اور کسی ایک جگہ بے حس و حرکت نہیں کھڑے رہ سکتے تھے۔
یہ گھبراہٹ انتہا پر پہونچی جب اُنھوں نے اُس ہونے والی دلہن پر ایک دوسری گم نظر ڈالی۔
اُنھوں نے اُس کے پاس جانے کا ارادہ کیا مگر اُس سے پہلے اپنے آپ کو ہر طرف سے جھاڑ
پونچھ لیا، اور پنجوں کے بل چلتے ہوئے گویا کہ اُنھیں کسی جرم کے ارتکاب کا احساس ہو رہا تھا
اُس کی طرف بڑھے، مسکراتے ہوئے اُس کے پاس پہونچے اور جھک کر اُس کے سر پر بوسہ دیا
وہ بیچاری ایسے کسی حادثے کے لئے تیار نہ تھی اور گھبرا کر چلا اُٹھی۔

"کیوں پیاری تم یہاں کیا کر رہی ہو" اُنھوں نے چپکے سے پوچھا۔ اور اِدھر اُدھر دیکھ کر
اُس کے گالوں پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔ "کھیل رہے ہیں"

"اچھا؟ اس چھوکرے کے ساتھ؟" یہ کہہ کر نارکن صاحب نے اُس لڑکے کی طرف ترچھی
نگاہوں سے دیکھا اور فرمانے لگے۔

"پیارے لڑکے تو بڑے کمرے میں کیوں نہیں جاتا؟" وہ لڑکا کچھ نہیں بولا اور آنکھیں پھاڑ
پھاڑ کر اُن کو دیکھنے لگا۔ نارکن صاحب پھر چاروں طرف دیکھ کر بچی کی طرف جھکے۔ "اور
تمھارے پاس ہے کیا میری پیاری بچی؟ گڑیا ہے؟"

"جی ہاں" اُس نے کچھ شرما کر جواب دیا اور اُس کے چھوٹے سے چہرے پر خفگی کے آثار
نمایاں ہوئے۔

"گڑیا ہے۔ مگر تم کو معلوم بھی ہے کہ تمھاری گڑیا کس چیز سے بنی ہے؟"

"جی نہیں" بچی نے چپکے سے کہا اور اپنا سر نیچے جھکا لیا۔

"چھوٹے چیتھڑوں سے میری جان۔ لڑکے تجھ کو اپنے ساتھیوں کے پاس بڑے کمرے
میں جانا چاہیے۔" نارکن صاحب نے لڑکے کی طرف گھور کر کہا۔ لڑکے اور لڑکی دونوں کو بہت

غصہ آیا اور وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ اُن کا ایک دوسرے سے علٰحدہ ہونے کو بالکل جی نہیں چاہتا تھا۔

"اور تم کو معلوم ہی کہ تم کو یہ گڑیا کیوں دی گئی ہی؟" نارکن صاحب نے اور آہستگی سے پوچھا۔ "جی نہیں"

"اسی وجہ سے کہ تم تمام ہفتہ ایک بہت پیاری لڑکی رہی ہو۔"

یہاں پر نارکن صاحب نے جو کہ اب سخت اضطراب کی حالت میں تھے پھر چاروں طرف دیکھا اور اس قدر آہستگی سے کہ اُن کی آواز مشکل سے سُنائی دیتی تھی گھبراہٹ اور بے صبری کے انداز سے پھر سوال کیا۔

"لیکن، پیاری بچی جب میں ابکی مرتبہ تمھارے والدین سے ملنے آؤں گا تو تم مجھ سے خوشی سے ملوگی؟" یہ کہہ کر نارکن صاحب چاہتے تھے کہ اُس چھوٹی پیاری بچی کو ایک اَور مرتبہ اور پیار کریں۔ لیکن جب اُس سرخ بالوں والے بچے نے دیکھا کہ وہ بالکل رونے والی ہی تو اُس نے اُس کے ہاتھ پکڑ لیئے اور ہمدردی کے جوش میں خود زور سے رو دیا۔ اب نارکن صاحب دراصل خفا ہوگئے۔

"نکل جا یہاں سے" اُنھوں نے لڑکے سے ڈانٹ کر کہا "ہال میں اپنے دوستوں کے پاس جا کر بیٹھ، نکلتا ہی کہ نہیں؟"

"نہیں یہ نہیں جائے گا۔ آپ خود کیوں نہیں چلے جاتے ہیں" لڑکی بول اُٹھی "اس کو یہاں بیٹھا رہنے دیجئے۔ اس کو یہاں بیٹھا رہنے دیجئے" اور یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔

اس موقعہ پر شور اور لوگوں کی آوازیں دروازے سے سُنائی دینے لگیں اور نارکن صاحب نے گھبرا کر اپنے موٹے بدن کو سیدھا کیا۔ مگر وہ سرخ بالوں والا بچہ نارکن صاحب سے بھی زیادہ ڈر گیا تھا۔ اُس نے لڑکی کو چھوڑ دیا اور چپکے چپکے دیوار سے لگا ہوا اُس کمرے سے نکل کر کھانے کے کمرے میں چلا گیا۔ اس خیال سے کہ اُن پر کسی طرح بدگمانی نہ ہو نارکن صاحب بھی اُسی کمرے

میں چلے گئے۔ وہ ایک کیکڑے کی طرح سرخ اور سخت پریشانی کی حالت میں تھے۔ شاید اپنے جوش اور بے صبری کی وجہ سے وہ اپنے آپ سے خفا ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے انگلیوں پر جو حساب لگایا تھا اُس کی وجہ سے اُن کی طبیعت میں گھبراہٹ لالچ اور بے صبری ایک ساتھ زور کیا ہوگا۔ اور اسی وجہ سے اُنھوں نے باوجود اپنی سنجیدگی اور عظمت کے بچوں کی طرح ایک لمن کے گرفتار کرنے کے لیے حملہ کیا تھا۔ اور ایسی چھوٹی سی لڑکی پر جو پانچ سال سے قبل شادی نہیں کر سکتی تھی۔۔۔۔ میں بھی اُنھیں کی طرح کمرے میں پہونچا اور ایک بہت پر لطف نظارہ دیکھا۔ معزز نارکن صاحب غصہ سے لال اُسی سرخ بالوں والے لڑکے کی طرف لپک رہے تھے اور وہ ڈر کے مارے پیچھے ہٹتا جاتا تھا اور آخر کار اس کو کسی طرف بھاگنے کا موقعہ نہ ملا۔ "دور ہو یہاں سے"، وہ حضرت چلائے "تو یہاں کیا کر رہا ہے؟ نکل بدمعاش نکل! تو یہاں پھل چُرا رہا ہے کیوں بے؟ پھل چُرا رہا ہے۔ نکل بدمعاش! نکل۔۔۔۔ جا اپنے ساتھیوں کے پاس جا!"

بیچارہ سہا ہوا لڑکا جان بچانے کے لیے میز کے نیچے گھس گیا۔ نارکن صاحب نے جھلا کر اپنا کمرکہ کا رومال نکالا اور اُس سے مار مار کر بیچارے خوف زدہ لڑکے کو میز کے نیچے سے نکالنے کی کوشش کی۔ یہاں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ نارکن صاحب کسی قدر فربہ اندام واقع ہوئے تھے۔ وہ تندرست سرخ گالوں والے اور مضبوط آدمی تھے۔ اُن کے ایک چھوٹا سا توند بھی نکلا ہوا تھا اور موٹی موٹی رانیں تھیں اُن کے بدن کا ہر ایک حصہ اخروٹ کی طرح گول تھا۔ اس وقت اُن کے پسینہ بہ رہا تھا۔ ہانپ رہے تھے اور بے حد لال ہو گئے تھے۔ آخر کار ان کا غصہ (اور عجب نہیں کہ اُن کا حسد) اس قدر بڑھ گیا کہ وہ دیوانے سے ہو گئے۔ میں نے بڑے زور سے ٹھٹھا لگایا۔ نارکن صاحب نے مڑ کر مجھے دیکھا اور باوجود اس کے کہ وہ اتنے بڑے رتبے کے آدمی تھے بہت گھبرائے۔ اسی لمحہ میں ہمارے میزبان صاحب سامنے کے دروازے سے اندر آ گئے۔ وہ لڑکا میز کے نیچے سے نکل آیا اور اپنے گھٹنے اور بازو جھاڑنے لگا۔ نارکن صاحب جلدی سے

اپنے رومال سے ناک صاف کرنے لگے۔

ہمارے میزبان نے ہم تینوں کو کسی قدر تعجب سے دیکھا مگر ایک آزمودہ کار شخص کی طرح اُنھوں نے اس وقت کو اپنے مہمان کے ساتھ اکیلے میں بات کرنے کا موقع بنا لیا۔ لڑکے کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگے۔

"یہ لڑکا وہی ہے جس کے لیے میں نے آپ سے کچھ عرض کیا تھا۔

"اچھا.. ہاں" نارکن صاحب نے جواب دیا۔ اُن کو ابھی تک اپنی طبیعت پر قابو نہیں تھا

"یہ ہمارے بچوں کی اُستانی کا لڑکا ہے" ہمارے میزبان نے التجا کے لہجے میں کہا۔

"وہ ایک غریب عورت ایک شریف عہدہ دار کی بیوہ ہے۔ اور اسی لئے.. اگر ممکن ہو تو..... بیتری پیٹرووچ...."

"نہیں نہیں" نارکن صاحب نے جلدی سے کہا "فیلپ الیکسائوچ صاحب آپ بُرا نہ مانیے گا مگر یہ کسی طرح سے ممکن نہیں ہے۔ میں نے پوری طرح سے دریافت کر لیا ہے۔ کسی طرح کی کوئی جگہ خالی نہیں ہے اور اگر ہوتی بھی تو اُس کے لئے پہلے ہی سے دس آدمی موجود ہیں جن کا حق اُس پر اس لڑکے سے زیادہ ہے۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ مجھے بہت افسوس ہے مگر..."

"افسوس صد افسوس" ہمارے میزبان نے کہا "یہ تو اس قدر حلیم اور صلح پسند بچہ ہے"

"ہرگز نہیں" بلکہ ایک مخل در معقولات کرنے والا مربی ہے، جیسا کہ میں نے دیکھا ہے"

نارکن صاحب نے جواب دیا اور بے اختیار اپنے ہونٹ چبانے لگے اُنھوں نے لڑکے کی طرف مُڑ کر کہا "نکل یہاں سے چھوکرے، تو یہاں کیوں کھڑا ہے؟ اپنے ساتھیوں کے پاس جا!"

جیسا کہ معلوم ہوتا تھا وہ اُس وقت میری طرف بھی کنکھیوں سے دیکھنے سے باز نہ رہ سکے۔ مجھے بھی اپنے اوپر قابو نہ تھا اور ان کے سامنے ہنس دیا۔ نارکن صاحب نے فوراً دوسری طرف مُنہ پھیر لیا اور میں صاف سُن سکتا تھا کہ اُنھوں نے میزبان سے سے پوچھا کہ "یہ عجیب غریب جوان کون ہے؟" اور تب میں نے یہ دیکھا کہ نارکن صاحب میری طرف سے مایوسی ظاہر

کوسنے کے لیئے سر ہلانے لگے۔

جب میں جی بھر کر ہنس چکا تو میں ہال میں واپس آگیا۔ وہاں میں نے لال دولتمند صاحب (یعنی نارکن) کو ماؤں اور باپوں سے جن میں ہمارے میزبان اور اُن کی بیوی بھی شامل تھے گھرا ہوا پایا۔ نارکن صاحب ایک خاتون سے جن سے ان کی ملاقات اُسی وقت ہوئی تھی بہت گرمجوشی سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ خاتون اُسی چھوٹی بچی کا ہاتھ پکڑے ہوئے کھڑی تھیں جس سے اور نارکن صاحب سے اُس چھوٹے کمرے میں مختصر سی گفتگو ہوئی تھی۔ اس وقت وہ اُس کی خوبصورتی علم لیاقت اور تہذیب کی تعریف کے دریا بہا رہے تھے۔ اُس کی ماں کی رضاجوئی کے لیئے صاف صاف خوشامد کر رہے تھے اُن کی باتیں سُننے سے ماں کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو ٹپکنے لگے۔ باپ کے منہ پر سرور کی مسکراہٹ تھی۔ ان تین معزز شخصوں کی کیفیت دیکھ کر مالک مکان کو بھی خوشی ہوئی۔ باقی مہمانوں پر بھی اسی قسم کا اثر ہوا۔ لوگوں نے بچوں تک کو مجبور کیا کہ وہ اپنا کھیل تھوڑی دیر کے لیئے بند کر دیں، تاکہ اس گفتگو میں خلل نہ پڑے۔ ہر ایک میں ایک قسم کا جوش بھرا ہوا تھا۔ تب میں نے اُس دلچسپ بچی کی متاثر ماں کو نارکن صاحب سے بہت چیدہ الفاظ میں کہتے سنا کہ وہ اُس کے یہاں قدم رنجہ فرما کر اُس کو سرفرازی اور عزت بخشیں۔ اور اُس کے بعد میں نے سُنا کہ نارکن صاحب نے کیسی بیساختہ خوشی سے یہ دعوت قبول کی۔ اور اس پر تمام مہمانوں نے پہلے کی طرح پر اپنی گفتگو میں اُس شراب کے سوداگر اور اُس کی بیوی اور نارکن صاحب کے نام لے لے کر جوش و خروش سے تعریف کرنا شروع کی۔

"کیا ان نارکن صاحب کی شادی ہو چکی ہے؟" میں نے کچھ زور سے ایک صاحب سے پوچھا جن سے مجھے واقفیت تھی اور جو اُن کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔

نارکن صاحب نے مجھ پر ایک جگر دوز غصہ کی نگاہ ڈالی۔

"نہیں" اُن صاحب نے جواب دیا جن سے میں نے پوچھا اور جو میری بے شعوری پر

کچھ کم خفا نہیں تھے۔ مگر میں نے یہ حرکت جان بوجھ کر کی تھی۔

کچھ دن ہوئے میں . . . گرجا کے پاس سے گزر رہا تھا۔ وہاں پر آدمیوں اور گاڑیوں کا مجمع دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔ چاروں طرف ایک شادی کی باتیں ہو رہی تھیں جو یہاں ہونے والی تھی۔ اس وقت پالا پڑا تھا اور موسم بہت بے رونق تھا۔ میں مجمع میں گھستا ہوا گرجا کے اندر پہونچا اور وہاں دولہا کو دیکھا وہ ایک پستہ قد موٹا سا گول آدمی تھا جس کے تھوڑا سا توند بھی نکلا ہوا تھا اور جو حد سے زیادہ چہرے پر غازہ لگائے ہوئے تھا وہ بہت مشغولیت کے انداز سے اِدھر اُدھر دوڑتا اور انتظام کرتا پھرتا تھا۔ آخر کار شور ہوا کہ دُلہن آتی ہے۔ میں مجمع کو چیر کر آگے بڑھا اور میں نے ایک نہایت خوبصورت لڑکی دیکھی جس کے باغ جوانی میں تازہ بہار آئی تھی لیکن یہ حسین لڑکی زرد اور غمگین تھی۔ وہ کھوئی ہوئی سی نظر آتی تھی بلکہ مجھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی آنکھیں ذرا دیر پہلے رو چکنے کی وجہ سے سرخ تھیں اُس کے خط و خال کی کل شکل متانت سے اُس کے حسن میں ایک طرح کی عظمت اور وقار آگیا تھا۔ لیکن اس وقار و تمکنت اور اس رنج و ملال میں اب تک بچپن کی معصومیت کی جھلک نظر آتی تھی۔ اُس کے چہرے سے ایسا بھولا پن۔ بے بسی اور ہراس ظاہر ہوتا تھا جو الفاظ میں نہیں ظاہر ہو سکتا۔

میں نے مجمع میں لوگوں کو کہتے سُنا کہ وہ ابھی پوری سولہ برس کی بھی نہیں ہے۔ میں نے دولہا کو ذرا غور سے جو دیکھا تو پہچان لیا کہ وہ دمتری۔ پیٹرو وچ نارکن ہے جسے میں پچھلے سال نہیں دیکھا تھا۔ میں نے دلہن کو غور سے دیکھا۔ یا اللہ۔ میں نے مجمع کو چیرنا شروع کیا تا کہ جس قدر جلد ممکن ہو گرجا سے باہر نکل جاؤں۔ لوگوں میں یہ ذکر ہو رہا تھا کہ دلہن بہت امیر ہے اُس نے پانچ لاکھ روپیہ جہیز میں پایا ہے، اور پاندان کا خرچ اس کے علاوہ۔

ہزار دقت سڑک پر پہونچکر میں نے اپنے دل میں کہا، "تو وہ حساب پورا اُترا"۔

۱۵

مجلس اقوام

امتیاز رنگ و قوم اپنے دامن میں دنیا کے لیے تباہی و ہلاکت کا جو سامان پوشیدہ رکھتا ہے اُس کا ثبوت بیسویں صدی کی جنگ عظیم سے تمام اہل عالم کو مل چکا ہے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اقوام متمدنہ کو تجارت، فارغ البالی اور بین الاقوامی تعلقات کبھی اُس اتحاد باہمی کو صدمہ پہونچانے کی بھی اجازت دیں گے جس کی شکست امن عالم کے لیے پیام موت تھی۔ مگر اس زمین ہموار رنگ و نیرنگ نہ جم سکا، اور آخر کار ہیجان عظیم پیدا ہو گیا۔ کاغذ کے وہ چند پرزے، جن پر اتحاد کا عالیشان قصر تعمیر کیا گیا تھا، خود غرضی کے ہاتھوں سے مسل کر پھینک دیے گئے، اور عمارت منہدم ہو گئی، جس کے کھنڈروں کے نیچے امن کی اُمیدیں اور ترقی کے خواب، دنیا کی بیوفائی، اور اپنی بے ثباتی کی داستان زبان خاموشی سے دُہراتے ہوئے مدفون ہو گئے۔ دنیا طلبی کے سے جو فتنہ انگیز جذبات اندر ہی اندر فضا کو مسموم کر رہے تھے اُن کا یہ انجام ناگزیر تھا۔

مگر خون ناحق سے زمین لالہ رنگ کرنے کے بعد، زندگی کی خاموش فضا میں ہنگامہ برپا کرنے کے بعد، دنیا کے سمندر میں طوفان تلاطم پیدا کرنے کے بعد، تمدن جدید کے نونہالوں نے محسوس کیا کہ حقیقی راحت امن میں ہے نہ کہ جنگ میں۔ جس چیز کو وہ احیاء ملت کے لیے چشمۂ حیات سمجھ رہے تھے وہ سراب فانی تھا۔ کشمکش حیات کی روز افزوں ہلاکت آفرینی سے تنگ، اپنی زوال قوت سے مجبور، اور آئے دن کے مصائب سے خستہ و پریشان ہو کر امن کے لیے وہ بھی چلا اُٹھے۔ ہاں، بدترین گنہگار بھی اپنے عصیاں پر پشیمان ہوتا ہے، مگر اُس وقت جب آئندہ ارتکاب گناہ کی سکت باقی نہیں رہتی، اور دنیا ہی میں اپنے اعمال بد کے عبرتناک انجام کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔ کاش لوگوں کی آنکھیں کھلتیں، اور وہ دیکھتے کہ جنھیں بڑی سے بڑی دنیاوی طاقت نصیب ہے، جن کے ہاتھ دنیا کی تقدیر کے بظاہر عناں گیر ہیں، وہ بھی کسی فعل بد کے معمولی سے معمولی انجام کے بدلنے میں کتنے مجبور و بے بس ہیں۔

دنیا میں اگر شر نہ ہو تو خیر کی برکتیں قابلِ قدر نہ سمجھی جائیں۔ قدرت کے اسی اصول نے آہستہ آہستہ خلفشار میں سکون پیدا کر کے حالات میں ردِ عمل کی صلاحیت بخشی، اور لوگ کسی ایسی راہ کے متلاشی ہوئے جس پر گامزن ہو کے امن کی منزلِ مقصود تک رسائی یقینی ہو۔ تاکہ ایک بار پھر پُرسکون اور مطمئن زندگی نصیب ہو سکے۔ اس اہم ترین موقع پر ہماری نگاہیں کسی ایسی شے کی جستجو میں بیتابانہ اُٹھتی ہیں، جو ان مساعی کی کامیابی کا ثبوت بن کر اہلِ عالم کی اُن توقعات کے پورا ہونے کا یقین دلا سکے جن کے ساتھ اُن کا مستقبل وابستہ ہے۔ مگر ہر گوشہ سے مایوس ناکام واپس آتی ہیں۔ کیونکہ حالات میں حقیقی تغیر ہنوز نہیں ہو سکا۔ ارادوں میں وہی کمزوریاں ہیں، نیتوں میں وہی فتور ہے، ہوس ملک گیری کے شعلوں میں وہی لپٹ ہے، جس کی جہاں سوزی کا اثر ابھی تک زائل نہیں ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ کشاکش و بے چینی زبانِ حال سے اس امن و صلح کے زمانہ سے بھی اُتنی ہی بیزاری کا اظہار کر رہی ہے، جتنی دنیا زمانہ جنگ سے نالاں تھی۔ جو قومیں اس عالمگیر مصیبت کی ذمہ دار ہیں اُنھیں اپنے ذاتی اغراض کے مقابلہ میں بنی نوع انسان کی فلاح کی کچھ پرواہ نہیں۔ اُن کی دنیاوی طاقت، اُن کے مدبرین کے دماغ، اُن کے ملک کے تمام وسائل، ہزاروں لاکھوں ہم جنسوں کو جائز حقوق سے محروم کر کے اپنی قوم کے چند افراد کے دامنِ حرص کو پُر کرنے کے لیئے وقف ہیں۔ اُن کے تمام مساعی صرف اس مقصد کے لیئے صرف ہوتے ہیں۔ اُن کی تلواریں اسی سمت جھکتی ہیں، اُن کے ترکش کا ہر تیر کسی کمزور قوم کو اپنا نشانہ بناتا ہے۔ کاش انھیں احساس ہوتا کہ تمام بنی نوع انسان کے حقوق خود ساختہ حدود کے اندر رہنے والی جماعت سے کہیں زیادہ ہیں۔ اور اُن کی توجہ مصیبت زدہ دنیا کو مشکلات سے نجات دلانے کی طرف منعطف ہو جاتی!

اگرچہ صلح و آشتی کے اس اخلاقی پہلو کو بین الاقوامی تعلقات کے خوشگوار بنانے میں شمعِ راہ نہیں بنایا گیا، تاہم، جنگِ عظیم کے بعد، اقوامِ متحاربہ کے ہاتھ شل ہو چکے

تھے'' اور وہ اپنے ملک کے جانی و مالی نقصان کو برداشت نہیں کر سکتے تھے' چنانچہ جنگ کو کسی حد تک روکنے کے لیے مجلس اقوام معرض وجود میں آئی۔ اس کا قیام ایک معاہدہ کی رو سے عمل میں آیا' جو اتحادی اور اُن کی رفیق کار طاقتوں کے درمیان ۲۸ اپریل ۱۹۱۹ء کو بمقام پیرس' ایک کانفرنس میں باہم طے پایا تھا قبل از یں کہ اس کے اغراض و مقاصد اور اُن کی کامیابی یا ناکامی پر بحث کی جائے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا جائے۔

لیگ اقوام میں ایک اسمبلی ہے جس کے ممبر اُن ممالک کے نمائندے ہیں جنھیں لیگ کی رکنیت حاصل ہے۔ اور ایک کاونسل ہے جس کے اراکین بڑی بڑی اتحادی طاقتوں اور اُن کے رفقائے کار کے نمائندے ہیں۔ مزید براں اس میں چار اور اراکین ہوں گے جنھیں اسمبلی' ممبران لیگ کے درمیان سے وقتاً فوقتاً انتخاب کرے گی۔ اس کے علاوہ ایک صیغہ نظامت ہے' جو کاونسل مذکورہ کے غالب عنصر کی رضامندی سے مقرر شدہ ناظم اور ضروری اسٹاف پر مشتمل ہے۔ ایک عدالت کا قیام بھی عمل میں آیا ہے ''جو اُن بین الاقوامی نزاعات کی سماعت اور فیصل کرنے کی اہلیت رکھتی ہو' جو فریقین کی جانب سے وقتاً فوقتاً پیش کیے جائیں۔'' اس عدالت کے نظام کی ترتیب کا اختیار کاونسل کو حاصل ہے۔ لیگ کا صدر مقام جینوا ہے۔

اس کا مقصد' جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے' یہ ہے کہ آیندہ بڑی بڑی قوموں کو جنگ سے باز رکھنے کی ہر امکانی کوشش کی جائے۔ اس کی دفعات اس امر پر بہت زور دیتی ہیں کہ قیام امن کے لیئے یہ ناگزیر ہے کہ فوج اور اسلحہ میں جہاں تک مصالح ملکی' بین الاقوامی اجازت دیں' تخفیف کی جائے۔ انسداد جنگ کے مساعی صرف اراکین مجلس اقوام کی باہمی نزاعات ہی تک محدود نہ رہیں گے' بلکہ اُن ملکوں کو بھی اس کے قوانین کی پابندی پر مجبور کیا جائے گا جو کسی فرکن مجلس سے برسرِ پیکار ہوں' خواہ انھیں

اس کی مرکزیت نہ بھی حاصل ہو۔

اہل عالم کی بہبودی کے لیئے اس سے زیادہ امید افزا اور قابل مسرت اور کیا امر ہو سکتا ہے کہ ذمہ دار مدبرین اپنے حقیقی فرائض کو محسوس کر کے کسی ایسے نظام کو ترتیب دیں، جو کسی قوم کے جائز حقوق اور مفاد کو صدمہ پہونچائے بغیر قیام امن کے لیئے کامیاب کوشش کر سکے۔ اور بنی نوع انسان کو، جو محض خود ساختہ اُصولوں، اور بیجا تعصب کے باعث ایک دوسرے سے علٰحدہ ہو گئے ہیں تصادم سے باز رکھے، تاکہ وہ اُس مقصد عظیم کے حصول میں سرگرم سعی ہو سکیں جو آفرینش انسان کا تنہا سبب ہے۔ انسان کی فطرت بہت بلند ہے، اور اس میں ترقی کی لامحدود اہلیت موجود ہے۔ اگر کامیابی کی انتہا بہت سی جانوں کو تلف، بہت سے حقوق کو پامال، اور بہت سے دلوں کو شکستہ کر کے زمین کے چند قطعات کی ملکیت ہی نہ تصور کر لی جائے، بلکہ اس حقیقت کا احساس ہو جائے کہ انسان دنیا میں اعلیٰ ترین مقاصد اور اہم ترین فرائض کے ساتھ آیا ہے، تو ایسے اسباب کے بہت جلد پیدا ہو جانے کا امکان ہے، جو زمانہ کی حالت میں نہایت ہی مفید تغیر پیدا کر دیں، اور زندگی کا جام تہی بادۂ امن و سکون سے لبریز ہو جائے۔

کاش مجلس اقوام کی تعمیر ایسے دست و بازو سے ہوئی ہوتی، جن کے صدق و خلوص پر اعتماد کیا جا سکتا، تو یقیناً ہر گوشہ سے صدائے لبیک اُٹھتی۔ لیکن اس کے چند سالہ کارنامے کسی روشن مستقبل کی اُمید نہیں دلا سکتے، کیونکہ خود وہی اراکین جن کی کوششوں سے یہ عالم وجود میں آئی، اور اب تک قائم ہے، اپنے طرز عمل سے، اس کے اغراض و مقاصد کے ساتھ خاطر خواہ دلچسپی کا اظہار نہیں کرتے۔ اُن کے نزدیک قومی مفاد کے مقابلہ میں فلاح عام کی کوئی وقعت نہیں۔ اس سے زیادہ حوصلہ شکن، اور تاریکیٔ مستقبل کو نمایاں کر دینے والا اور کیا امر ہو سکتا ہے کہ خود امریکہ اس کی تائید نہ کر سکا، اور اس سے کنارہ کش ہونے لگا، حالانکہ یہ مجلس پریسیڈنٹ ولسن ہی کی

تخلیق ہی، اور اپنے نشو و نما میں انھیں کی دماغ سوزی و مساعی کی رہین منت۔ پھر بجز اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہی کہ اگر یہی حالت رہے تو کسی خوشگوار نتیجہ تک پہونچنے اور اپنے کسی ایک مقصد میں بھی کامیاب ہونے سے قبل اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔

حقیقت یہ ہی کہ مجلس اقوام چند طاقتور سلطنتوں کا کھلونا بن کر رہ گئی اور یہ کہنا غالباً بیجا نہ ہوگا، کہ وہ فتحمند قومیں، جن کو اُس کے سیاہ و سفید پر کامل قدرت حاصل ہی صرف اس لئے اس کے قیام کے موافق و مؤید ہیں، کہ بیرونی خطرات، اور آیندہ کسی امکانی جنگ سے محفوظ ہو کر اقوام مغلوبہ کو اطمینان کے ساتھ اپنی حرص و آز کا شکار بنا سکیں۔

بلا شبہ اس "مجلس امن و انصاف" کے اراکین اپنے ہی منظور کردہ قوانین کو شکست اور اپنے ہی مقرر کردہ اُصولوں کو پامال کر کے پُر فریب چالوں سے اس مقصد میں بہت کامیاب ثابت ہوئے۔ فرانس اور جرمنی کی باہمی کشمکش، اور اول الذکر کی سخت گیر پالیسی اس کی بین شہادت ہی۔ کیا فرانس کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ اپنے جابرانہ رویہ کو اس اطمینان و استقلال کے ساتھ برقرار رکھتا، اگر اُس کو حریف و حلیف قوتوں کے توازن سے اپنے پوزیشن کی مضبوطی کا یقین نہ ہو جاتا، اور کسی بیرونی حملہ کا خوف دامنگیر ہوتا؟ کیا فرانس اپنی حکمت عملیوں میں کامیاب ہو جاتا اگر روس اور جرمنی کو مجلس اقوام سے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر بین الاقوامی معاہدۂ حریت و مساوات کی حد شمولیت سے باہر نہ کر دیا جاتا؟ اگر مجلس اقوام دنیا کو پیام امن دیتی ہی، تو اقوام مغلوبہ کے لئے اُس کا دامن کیوں تنگ ہی؟ کیا قومیت کی تفریق مٹانے کے لئے یہی بہترین طرز عمل ہی؟ اس سے انکار نہیں، کہ برطانیہ فرانس کے اس رویہ کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتی، لیکن جرمنی سے ہمدردی کا حقیقی محرک وہ اخلاقی جذبہ نہیں ہی جس کا اعادہ بار بار ہوتا رہتا ہی، بلکہ ذاتی اغراض ہیں، کیونکہ جرمنی کی موجودہ حالت برطانوی تجارت کے لئے سخت مضرت رساں ہی۔

اٹلی اور یونان کے تصادم میں مجلس کا قوت سے مرعوب ہو کر اطالوی مطالبات کے آگے سر تسلیم خم کر دینا، اور کمزور یونان کی حمایت سے پہلو تہی کرنا حقیقت پر مزید روشنی ڈالتا ہے۔ ان واقعات میں دول حلفاء کے درمیان بھی نا اتفاقی کی صاف جھلک نظر آتی ہے۔ فرانس اور اٹلی ذاتی منافع کے لئے مجلس اقوام کے اصول اور اپنے معاہدہ برطانیہ کے مفاد کو نظر انداز کرنے میں چنداں تامل نہیں کرتے، اور اپنے اقتدار کی بدولت کسی الزام کے مستحق نہیں سمجھے جاتے۔ تنازعات کے بُرے نتائج سے بچنے اور جائز حقوق کی حفاظت کے لئے اب بھی فوجی طاقت کی اُتنی ہی ضرورت ہے جتنی مجلس اقوام کے قیام سے پہلے تھی۔ مساوات کے زبردست دعاوی کے بعد بھی اس میں تفریق قومی کی اسپرٹ ہنوز زائل نہیں ہوئی۔ پھر اس مجلس سے آزادانہ انصاف کی توقع کیونکر ہو سکتی ہے، جو قوت سے مرعوب ہو جائے، اور جماعتی تفریق کا مرکز بن گئی ہو۔

تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مجلس اقوام برکات امن کے احساس کا ثمر اولین ہے۔ اگرچہ موجودہ فضا اس کی نشو و نما کے لئے کچھ موزوں نہیں، لیکن جس وقت دنیا کی عنان سیاست زیادہ ایمان دار اور دانشمند مدبرین کے ہاتھوں میں ہوگی اُس وقت عالمگیر جمہوریت کا خیال شاید درس اخوت دینے میں کامیاب ثابت ہو۔ اگر دنیا اسلامی جمہوریت و اخوت سے آشنا ہو جاتی، تو اپنے مقصد کی تکمیل میں اُسے کسی آنے والے زمانہ کا منتظر نہ ہونا پڑتا۔ کاش مسلمان اپنے فرض تبلیغ کو محسوس کریں جس کی کامیابی ان مصائب کا تنہا علاج ہے۔ اسلام کی صداقت کے اظہار کا بہترین موقع یہی ہے جب زمانہ خود پیام امن سننے کے لئے گوش بر آواز ہے، اور موجودہ حالت سے بیزار ہو کر دوسری جانب پلٹا کھانے کے لئے بے قرار نظر آتا ہے۔ ؎

ہے سحر کا آسماں خورشید سے مینا بدوش

عبدالقادر

عبدا

مطبوعات جدیدہ

پیام امن - از مولوی عبدالماجد بی۔اے۔ مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ - قیمت عہر

جناب عبدالماجد صاحب کی مستقل تصنیفات میں "پیام امن" ایک جدید اضافہ ہے۔ جو اگرچہ مشہور فرانسیسی اہل قلم موسیو پال رچرڈ کے ترجمہ ہونے کی حیثیت سے اس مرتبہ کو نہیں پہونچ سکتا تھا لیکن جناب مترجم نے جو محنت اُس کے حواشی کی ترتیب، مقدمہ کے اضافہ، اور ضمیمہ جات کے ذریعہ سے کی ہے وہ بلا شبہ اس کتاب کو محض ترجمہ کہلائے جانے کے بجائے اک تالیف کہلانے کی مستحق قرار دیتی ہے۔

پیام امن ایسے وقت شائع ہو رہا ہے جب کہ تمام عالم لذت امن کو فراموش کرچکا ہے خصومات باہمی اور جنگ و جدال کا دور دورہ ہے، امن و سلامتی کی روحانی تعلیم تو بعض حلقوں میں ہذیان سرائی کے مرادف قرار دی جاتی ہے، اور یورپ کی جدید سیاسی تگ و دو انسانی جذبات، مذہبی معتقدات اور اخلاقی تعلیمات کو اس سنگدلی سے پامال کرنے پر آمادہ نظر آتی ہے کہ فی الواقع "امن و سلامتی" کا راگ بے وقت کی شہنائی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جس طرح ہندوستان میں مہاتما گاندھی نے مغربیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو اپنی حیرت انگیز اخلاقی قوت سے دفعۃً روک دیا اسی طرح یورپ کے بعض حلقوں میں بھی بے چینی کے آثار نظر آتے ہیں گو اس وقت تک کوئی زبردست آواز اس تعلیم کی حق و حمایت میں نہیں اُٹھی جس کو مسیح نے ان الفاظ میں پیش کیا تھا، "مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیونکہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے (متی - ۵)" اور سچ یہ ہے کہ اس کی توقع بھی عبث تھی اس لیے کہ مسیح کا دوسرا قول فیصل بھی موجود ہے۔

"یہ امت زبان سے تو میری عزت کرتی ہے۔ لیکن ان کا دل مجھ سے دور ہے، اور یہ بے فائدہ میری پرستش کرتے ہیں" (مرقس باب ۷)

ترجمہ کی خوبی کے لیئے خود عبد الماجد صاحب کا نام کافی ضمانت ہو کہ وہ زبان کی خوبی و دلکشی کے ساتھ اس فن میں خاص کمال رکھتے ہیں۔ کتاب ۱۸۱ صفحہ پر ختم ہوئی ہو اور اچھے سفید کاغذ پر بہت و صفائی کے ساتھ چھپی ہو۔

جدید دنیائے اسلام۔ مترجمہ محمد جمیل الدین صاحب بی۔ اے علیگ ڈپٹی کلکٹر مطبوعہ عثمانی پریس بدایوں۔ قیمت ؎ (۴)

ڈاکٹر اسٹاڈرڈ کی شہرۂ آفاق تصنیف "دی نیو ورلڈ آف اسلام" کا یہ ترجمہ ہو، جس کو جناب مترجم نے باوجود اپنے مشاغل ملازمت مکمل کرکے شائع فرما دیا۔ ہم ان کی اس خدمت کی دل سے قدر کرتے ہیں اس لیئے اور بھی کہ ان کی جماعت میں بہت کم ہیں جو ملک و قوم کی اس ممکن امداد کی سعی فرماتے ہوں جو وہ کسی نہ کسی حیثیت سے انجام دے سکتے ہیں۔ موجودہ سیاسیات اسلامی کو سمجھنے کے لیئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہو۔ اور یہی سبب ہو کہ کتاب کی اشاعت نے مصنف کو فوراً ممتاز ماہرین سیاست کی صف اول میں شامل کر دیا۔ مصنف نے ممالک اسلامی کے گزشتہ صدی کی زوال پذیر حالت کو وضاحت و خوبی سے بیان کرنے کے بعد جس قدر جدید تحریکات احیاء ملت کے لیئے ہوئی ہیں اور اکابر مصلحین مثلاً عبد الوہاب نجدی، شیخ جمال الدین افغانی، شیخ سنوسی، سید احمد خاں اور دوسرے بزرگوں کی جد و جہد کے تفصیلی حالات پیش کرکے موجودہ سیاسیات اسلامی پر تفصیل سے تبصرہ کیا ہو۔ اور آج جو عام تحریک انگورہ، ترکی، فلسطین، سوڈان، مصر اور دوسرے عربی ممالک اور ایران میں نظر آرہی ہو اس کے اسباب اور اس کی قوت کا نہایت صحیح اندازہ کیا ہو اور بالآخر پان اسلامزم یا عالم اسلامی کی ہیئت عظیمہ کے متعلق خوشگوار پیشگوئی ان الفاظ میں بطور "نتیجہ" پیش کی ہو "مشرق اونگھنے کے وسیلے پر ہمارا تبصرہ ختم ہو گیا۔ اس تبصرہ کی نمایاں صورت کیا ہو؟ انقلاب! بالآخر غیر متحرک مشرق اور کامل طور پر متحرک ہو گیا۔ آج مشرق کامل انقلاب، ہیجان اور ہیجان کی حالت

میں ہی اور یہ انقلاب، ہیجان، اور ہیجان جس قدر فوری و عمیق ہی اس قدر پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ دنیائے اسلام ایک ہزار سال تک جمود اور سکون کی حالت میں رہ کر اب پھر ایک سبب سرگرم تگاپو نظر آتی ہی" کتاب اس قابل ہی کہ ہر مسلمان بنظر غور مطالعہ کرے۔ اور ہم کو نہایت مسرت ہی کہ مولوی جمیل الدین صاحب کی عنایت سے وہ اردو خواں طبقہ تک پہونچ گئی ترجمہ نہایت صاف، صحیح اور برجستہ ہی۔ اور اسی وجہ سے اصل کتاب سے کم دلچسپ نہیں ہی۔ کاغذ معمولی سفید طباعت معمولی اور حجم ۴۲۶ صفحہ ہی۔

موریشس اور اسلام ۔ مؤلفہ مولانا قاری حکیم عبدالرشید صاحب نواب ارشد کی امام پورٹ لوئس۔ موریشس قیمت ۱۰ر

یہ تین جزو کی مختصر کتاب ہی جس میں اک جدت بھی نظر آتی ہی یعنی فہرست مضامین ختم کتاب کے بعد دی گئی ہی۔ صفحہ اول پر ماریشس کا نقشہ ہی اور انتساب و تعارف و بعض نظموں کے علاوہ جزیرہ ماریشس کے متعلق مفصل معلومات و تاریخی حالات کے علاوہ وہاں کی مسلمان آبادی کی موجودہ کیفیت اور ان میں تبلیغ اسلام کی اہم ضرورت پر توجہ دلائی گئی ہی۔ حکیم عبدالرشید صاحب کی کوششوں سے وہاں ایک تبلیغی انجمن۔ اور مدرسہ قائم ہی ہم کو مؤلف صاحب کی اس رائے سے اتفاق ہی کہ مسلمانان ماریشس کے لیے اگر عمدہ تعلیم کا انتظام ہو سکے تو ان کی اصلاح کی بہت کچھ امید ہی۔

یادِ وطن ۔ (مہینہ میں دو بار) باتصویر اخبار، مقام اشاعت نیویارک (امریکہ) رئیس تحریر سید حسین چندہ سالانہ صہ ر پتہ پوسٹ بکس ۲، اٹانمز اسکویر اسٹیشن

جذبہ وطن پرستی کی تازہ مثال ہندیان مقیم امریکہ کی وہ کوشش ہی جو انھوں نے ہندوستان اور ہندوستانیوں کی خاطر امریکہ میں اردو اخبار جاری کرنے سے کی ہے "یادِ وطن" جدید ہندوستان کی مساعی جمیلہ کا اک پرتو ہی اور اس عہد میں ہمارے نوجوانوں کے قابل فخر کارناموں میں شمار کیے جانے کے قابل ہی۔ اس کے اڈیٹر کا نام ہندوستان

کے لئے جس طرح مانوس ہے اسی طرح امریکہ میں بھی ہندوستان کے ہمدردوں سے پوشیدہ نہیں۔ مسٹر سید حسین نے اپنے قیام امریکہ میں خدمت ہند کا جو موقع نکالا ہے وہ ان کی جدت پسندی وذہانت کی دلیل ہے۔ ہم صحیح انداز نہیں کرسکتے کہ امریکہ میں اُردو خوان ہندوستانیوں کی کیا تعداد ہے، لیکن محض ہندوستان کی عظیم الشان آبادی کا لحاظ کرتے ہوئے اگر اس اخبار کے کامیابی کی توقع کی جائے تو بیجا نہیں۔

"یاد وطن" عام اخباری تقطیع پر آٹھ صفحے کے مضامین اور متعدد تصاویر دیتا ہے مضامین زیادہ تر ہندوستانی قومی تحریکات اور سیاسی جد وجہد سے متعلق ہوتے ہیں جو زبان کی خوبی، مطالب وبیان کی عمدگی کے لحاظ سے یورپ امریکہ کے دوسرے اخبارات سے جو مشرقی زبانوں میں شائع ہوتے ہیں کسی حیثیت میں کم نہیں بلکہ اکثر سے بہتر ہوتے ہیں۔ کاغذ وطباعت کی خوبی صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے "یاد وطن" اپنے نام کے ساتھ ہی یہ شعر لکھ کر ہندوستانی اخوت پر اس انداز سے ناز کرتا ہے کہ مذاق سلیم وجد کرنے لگتا ہے۔

بہ آں گروہ کہ از ساغر وفا مستند　　زما سلام رسانید ہر کجا ہستند

"یاد وطن" نے ہندیان مقیم امریکہ کے متعلق دو طویل مضامین شائع کیے ہیں اور ہندوستان ونیز امریکہ میں اک نظام تحفظ حقوق کے قیام پر زور دیا ہے۔ ہم کو اس حقیقت سے انکار نہیں اور نہ اس کی اہمیت کو گھٹایا جاسکتا ہے۔ امریکہ کے رہنے والے ہندوستانیوں کے متعلق زیادہ تفصیلی حالات اگر اس اخبار میں شائع ہوا کریں تو وہ اہل ہند کیلیے بہت زیادہ دلچسپ ہوجائے۔

حسن وعشق ۔ اڈیٹر ابو محمد مصلح ابو العلائی۔ ڈہری ضلع شاہ آباد (بہار) چندہ سالانہ ۳ر

یہ ایک ماہوار رسالہ ہے جس کا پہلا نمبر ہمارے سامنے ہے مضامین جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اسی عنوان کے ہیں۔ ادب لطیف کی خدمت کے خیال سے یہ رسالہ جاری کیا گیا ہے۔

علاوہ اور مضامین کے اک پورا مشاعرہ بھی نقل ہے۔

حور۔ مرتبہ بیگم صدیق انصاری۔ ساگر دت لین کلکتہ چندہ سالانہ سے ؍

یہ "زنانہ لٹریچر کا ماہوار صحیفہ" کلکتہ کی اک خاتون کی زیر ادارت تین ماہ سے نکل رہا ہے اور طباعت وتہذیب نیز تنوع مضامین کے لحاظ سے قابل تعریف ہے اس وقت تک جس قدر زنانہ پرچے شائع ہوئے ہیں ان میں "حور" غالباً زیادہ سلیقہ و محنت سے ترتیب دیا جاتا ہے علاوہ مردوں کے متعدد خواتین بھی مضمون نگاروں کے صف میں نظر آتی ہیں۔

الرفیق۔ مدیر سید عبدالوہاب استہانوی۔ مانکتلہ روڈ ڈاکخانہ شملہ۔ کلکتہ

کلکتہ سے یہ رسالہ بھی نیا جاری ہوا ہے۔ اگست و ستمبر کا مشترکہ نمبر ہمارے پیش نظر ہے جس میں مولوی کیفی چریاکوٹی اور حکیم رکن الدین صاحب دانا کے مضامین بھی ہیں۔ مضامین میں تصوف و حکمت علم و ادب سب ہی کچھ ہے۔ طباعت و کاغذ معمولی ہے۔ اگر دو چار نمبر اور شائع ہوں تو کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔

"ناقد"

برق بے جولان

از جناب آزاد عظیم آبادی

نمود برق بے جولاں کی ہستی کیا عدم کیا ہے
سمندر مشربی بازیچۂ طفلاں سے کم کیا ہے

مشیت کا بھلا ہو کیسی آسان ہو گئی مشکل
خوشی جینے کی جس کو کچھ نہیں مرنے کا غم کیا ہے

نہ کھانا غلطہ صاف اعتراف ضعف باطن ہے
جہاں ہے عزم راسخ حاجت قول و قسم کیا ہے

صدا ہے ناتوانوں کے شکست شیشۂ دل کی
کوئی سوچے تو یہ آوازۂ طبل و علم کیا ہے

یہ ہستی کیا ہے؟ خود اک خواب آشفتہ کی انگڑائی
جھپک ہے دیدۂ بے خواب کی خواب عدم کیا ہے

فلک کی دشمنی ہے اپنی ہستی پر قوی حجت
جہاں ہو زہر ہی امرت وہاں پروائے سم کیا ہے

ہزاروں سر بکف ہو کر نہ پہونچے تیری غایت کو
رموز زندگی! اللہ! تیرا پیچ و خم کیا ہے

فریب سادہ لوحاں اک نمائش ہے سراب آسا
نمود و نام کیا ہے شہرۂ جاہ و حشم کیا ہے

ہم اس باطل پرستی کی فسوں کاری سے حیراں ہیں
اگرچہ نقش باطل دلنشیں نقش درم کیا ہے

شرر سے کم نہیں ہر قطرۂ اشک اے حرم والو
شرر کو پھونک دینے کے لئے دیر و حرم کیا ہے

کہاں مرتے پھریں طول حیات خضر کے غم میں
کہ مرنے کو تھوڑی سی بھی قید عمر کم کیا ہے

فراغ طبع آخر مقصد سعی دو عالم ہے
اسی خرمن کا خوشہ ہے گلستان ارم کیا ہے

مصائب کی رفاقت میں بھی پہلو ہیں مصیبت کے
دو نیم اپنا جو دل ہے سینہ شق اپنا قلم کیا ہے

غضب ہے ایسے بیماروں کو ہے زعم مسیحائی
جو اس سے بے خبر ہیں خبر بھی کیا ہے دم کیا ہے

کرم بھی ہے تو بے روئی ریا کم ہے درم دم ہے
تہی مغزی کے پہلو میں کف اہل کرم کیا ہے

دل افسردہ جو ارج گشت آہ آزاد کی میری
بس اک زندہ دلی اس کے سوا حضرت میں دم کیا ہے

حیات

خموشی آشنا گویا زبانِ نکتہ داں اس کی
پہنچتی ہے دلوں تک داستانِ خونچکاں اس کی

بسا دیتے ہیں اُجڑے گھر کو اس کے رعدے کڑکے
ہرا کرتی ہیں باغِ دل کو گر کر بجلیاں اس کی

تبسم ہائے پنہاں اس کے ہوتے ہیں امید افزا
عزیمت خیز ہوتی ہیں دلوں میں چٹکیاں اس کی

بپا کرتی ہیں ہر ساعت نیا ہنگامہ عالم میں
دکھاتی ہیں بہارِ تازہ ہر دم شوخیاں اس کی

ضعیفوں کے دلوں میں پھونکتی ہیں روحِ رستم کی
جوانوں کو جھکاتی ہیں مگر اٹکھیلیاں اس کی

سبق دیتی ہے یہ افراد کو جب سرفروشی کا
تو ہوتی ہے بقائے نوع آکر ہم زباں اس کی

علو کے راز جب یہ منکشف کرتی ہے کانوں میں
بصد آہنگ ہوتی ہے شجاعت نغمہ خواں اس کی

تمناؤں کا دریا موجزن ہوتا ہے سینہ میں
غضب کی روح پرور ہے نوائے جاں ستاں اس کی

جسے سر کی نہیں پروا ہے کچھ، وہ اس کا ہمدم ہے
حمیت ہے دلِ درد آشنا کی پاسباں اس کی

منافی موت کی تکلیف سعیِ دمبدم اس کی
مبشر زندگی کی، دعوتِ تسلیمِ جاں اس کی

جو اس عالم میں رہنا ہے تو وقفِ جستجو رہنا
یہ آئے دن ہوا کرتی ہے، تلقینِ نہاں اس کی

مزہ سر چڑھ کے مرنے میں ہے کیسا تجربہ کر لو
سبق دیتی ہیں دل والوں کو یہ سرگرمیاں اس کی

"صدائے خاموش"

رقصِ بسمل

ہمارے مکرم دوست محمد مسلم صاحب ایم اے عظیم آبادی کو حال میں اک جگر دوز حادثہ پیش آیا ہے کہ اُن کے صاحبزادہ ہاشم نے اُن کو اپنی دائمی مفارقت کا داغ دیا۔ یہ چند اشعار اسی کیفیت قلبی کا اظہار ہے جو اس وقت نہ صرف مسلم صاحب بلکہ ان تمام احباب کی ہے جن کو ہاشم کی صورت اس کی خداداد ذہانت اور غیر معمولی متانت کے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا ہم اس موقع پر اگر تعزیت کا کافی حق ادا نہ کرسکیں تو اس کی وجہ وہی ہے جس کو اکبر مرحوم نے اسی موقع پر خود اپنے لیے لکھا تھا مرنے والا اُس وقت بھی ہاشم ہی تھا۔

بہت نہ رونے پہ یہ نہ سمجھو کہ کم ہے جوش سرشک دل میں
یہ آنسوؤں کی کمی نہیں ہے رعایتِ ظرفِ آستیں ہے!

مدیر

"سب کہاں۔ کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں!"

غالب

کل صبح صحن گلشن میں اک گلاب دیکھا
رنگ اُس کا باغِ عالم میں لاجواب دیکھا
اور مست بو میں اُس کی کیفِ شراب دیکھا
گل کی بہار دیکھی یا میں نے خواب دیکھا؟

تھا کیا وہ میرا پیارا؟ ہاں ہاں وہی تھا ہاشم

کل دوپہر کو دیکھی وادی میں اک تتلی
نازک پروں پہ سات رنگوں کی بیل بوٹی
کالی ہری سنہری لال اُودی زرد اُجلی
ہو کس کا تحمل ایسی کہاں تھی ترمی

وہ تھی مری دل آرا یعنی وہی تھا ہاشم

کل سہ پہر کو دیکھا، گردوں پہ اک دھنک تھی
جو رونقِ زمیں تھی جو زینتِ فلک تھی
حسنِ مئی نظارہ آنکھوں سے روح تک تھی
کس نے کہا دھنک تھی اک وہم تھا دھنک تھی

آنکھوں کا تھا وہ تارا، یعنی وہی تھا ہاشم

کل شام تک چمن میں اک طائرِ خوش الحاں — تھا شاخِ گل پہ رقصاں در جوشِ نغمہ خواں
شیرینیِ ترنم سے شاد کام تھی جہاں — خاموش ہو گیا لو وہ مطربِ گلستاں
ہاشم نہ ہو ہمارا بے شک وہی تھا ہاشم

شبِ ظلمت فضا میں تھا ایک کرمکِ نور — ایک اخترِ تابندہ، ایک اخگرِ مسرور
مسکیں کا ایک دینار، اک شمعِ بختِ دیجور — پو پھٹتے ہی ہوا وہ آنکھوں کا نور کافور
وہ مضطرب شرارہ! اُف اُف وہی تھا ہاشم

مستور

کلام فانی

دل ہمیں ہوا حاصل درد میں فنا ہو کر
عشق کا ہوا آغاز غم کی انتہا ہو کر

اور بندے ہیں جن کو دعویٰ خدائی ہے
تھی ہماری قسمت میں بندگی خدا ہو کر

عمر خضر کے انداز ہر نفس میں پاتا ہوں
زندگی نئی پائی آپ سے جدا ہو کر

کارگاہ حسرت کا حشر کیا ہوا یارب
داغ دل پہ کیا گزری نقش مدعا ہو کر

نامراد رہنے تک نامراد جیتے ہیں
سانس بن گیا ایک ایک نالہ نارسا ہو کر

بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے مرتے ہیں نہ جیتے ہیں
درد پر خدا کی مار دل میں رہ گیا ہو کر

عشق سے ہوئے آگاہ صبر کی بھی حد دیکھی
خاک میں ملا دو گے دیر آشنا ہو کر

اب ہوئی زمانہ میں شیوۂ وفا کی قدر
عالم آشنا ہے وہ دشمن وفا ہو کر

زندگی سے ہو بیزار فانیؔ اس سے کیا حاصل
موت کو منا لو گے جان سے خفا ہو کر

غزل

جناب اعزاز الدین صاحب ایم اے

روزے بمنِ دل شدہ ۔ ناکام بیاشام
وز وقت سحر تا بسر شام بیاشام

تا چند ہمیں نامہ و پیغام، بیاشام
وز بادۂ گلرنگ دو سہ جام بیاشام

گر جام صبوحی بزدی خیرہ بہ اغیار
با دلشدۂ خویش بیاشام بیاشام

از دست حنا بستۂ خود پرکن و در دہ
وز ناز نگاہے کہ "بیاشام! بیاشام؟"

ق

چوں مست شوم از سر الطاف دو یک جام
از دست منِ رعشہ بر اندام بیاشام

اے پیر مغاں بادۂ سرجوش نخواہم
با بندہ بگو دُردِ تہ جام بیاشام

دی واعظ بدمست چہ خوش گفت بہ مومن
"خواہی کہ نہ بینی غم ایام، بیاشام"

شذرات

رسالہ جامعہ نے اس ایک سال میں جو خدمت کی ہے اس کا صحیح اندازہ ممکن ہے کہ ناظرین وعلم دوست حضرات کرسکیں، لیکن جن لوگوں کے ذمہ ادارت کا بار ہے وہ اس کے اہل نہیں، اِک نمایاں خصوصیت اس رسالہ کی یہ رہی ہے کہ ابتدا ہی سے وہ اِک خاص مقصد کے ساتھ نکالا گیا، ترتیب وتہذیب، مضامین کی نوعیت، حجم اور ظاہری شکل وصورت میں وہ ہمیشہ یکساں رہا اور بڑی حد تک وقت کی پابندی کو بھی ہاتھ سے نہ دیا۔ ان کوششوں میں جس قدر کامیابی حاصل ہوئی اس کی بڑی وجہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا تعلق ہے جو ملک میں بہ اعتبار اپنے مقاصد تعلیمی کے اک خاص حیثیت رکھتی ہے۔

ہم کو نہایت افسوس ہے کہ اس عرصہ میں بعض ناگوار وناگزیر اسباب کی بنا پر رسالہ وقت پر شائع نہ ہوسکا اور غالباً ابھی اِک وہینہ اس قصور کی سزا اور بھی ملے گی۔ جن اصحاب نے ازراہ قدردانی رسالہ کے انتظار میں شوق ومحبت اور گلہ وشکوہ سے کام لیا ہے ان کا شکریہ الفاظ سے نہیں ادا ہوسکتا، اگر رسالہ اُن کے تقاضے کے ساتھ ہی اُن تک پہنچ جاتا تو ہم سمجھتے کہ ہم نے اپنا فرض ادا کردیا، لیکن اب بجز اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

رسالہ جامعہ کی اک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ جامعہ ملیہ کی علمی وتعلیمی زندگی کے متعلق بہت کم لکھتا ہے۔ خواہ اس کی وجہ کچھ ہی ہو، لیکن جامعہ کی اس ادا نے یہ ضرور ثابت کردیا ہے کہ اس کے صفحات نہ روزنامے کے کالم ہیں، اور نہ وہ کسی چیز کو محض اپنی ہونے کی خاطر پبلک میں پیش کرتا ہے۔ لیکن آج جبکہ مدعیان علم وماہرین تعلیم اس فن شریف کے لیے یورپ کے

بعض نہایت پس پا افتادہ تجربوں پر اپنی جدید تعلیمی ترقی کی بنیاد رکھنی چاہتے ہیں اور جن کی
کوششیں صرف تقلید کے اک خفیف و ناکام کوشش تک محدود ہیں ان کے لیئے جامعہ
ملیہ اسلامیہ کی فضا اور تعلیمی آب ہوا یا لیقین اک درس عبرت ہے۔ جامعہ کا نصاب تعلیم
اور قدیم روش میں جو خاص تبدیلیاں موجودہ نظام کرنا چاہتا ہے بارہا پبلک میں
عملی ہیں۔ ممکن ہے کہ کاغذ پر اور بھی بہت سی تجاویز و دستور العمل ہوں جو ہمارے
بعض ماہران تعلیم کے میزوں کے کسی گوشہ میں پڑے ہوں لیکن جامعہ نے ان تجاویز
کو جس جرأت کے ساتھ عملی جامہ پہنایا ہے اُس کا صحیح اندازہ صرف علی گڑھ ہی میں ہو سکتا
ہے۔ سیڈلر کمیشن نے کلکتہ یونیورسٹی کے اصلاح کے سلسلہ میں جو اصول تعلیمی ہندوستان
کے لیے قرار دیئے تھے وہ عام طور پر پسند کئے گئے اور توقع تھی کہ جدید یونیورسٹیاں اسی
نظام کے ماتحت عمل میں آئیں گی، مسلمان بھی اپنی یونیورسٹی کو اس ترقی یافتہ شکل میں
دیکھنا چاہتے تھے مگر

قریب دیر خضر آیا تھا لیکن
ہمیں رستہ نہ کعبے کا بتایا

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جدید وائس چانسلر جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب
اُن بزرگان قوم میں سے ہیں جنھوں نے سیاسیات کو ہمیشہ اس لیے ناقابل التفات سمجھا
کہ اُن کا رجحان طبیعت تعلیمی مسائل کی طرف تھا، نیز سیاسی حالت کی جس بلند سطح تک
اُن کی دور بیں نگاہ پہنچتی تھی اس کا اقتضا بھی یہ تھا کہ وہ اپنی قوم کو بجائے سیاسیات
کے تعلیم کی طرف متوجہ کریں۔ ممکن ہے کہ اُن کو اپنے خیال میں اس مقصد میں کامیابی ہوئی
ہو لیکن ملک کی موجودہ بے چینی اور مسلمانوں کا اس میں جو حصہ ہے وہ تو ہوا کا رخ کسی کے
دوسری ہی جانب بتا رہا ہے۔ بہرحال، باوجود ان موانعات کے وہ اپنی رائے پر قائم ہیں۔

اور اُمید ہے کہ یونیورسٹی بھی اُن کے مشوروں سے فائدہ اُٹھائے گی جس کے آثار نظر نہیں
آتے اس لیے کہ صاحبزادہ صاحب نے اپنے جدید عہدہ کی ذمہ داریاں قبول کرنے کے بعد
جس عنوان سے ذمہ دار ارا کین یونیورسٹی کو خطاب فرمایا ہے وہ تو اک نوحۂ درد
ہے جس کا آخری بند یہ ہے کہ جس یونیورسٹی کا خواب ہم نے دیکھا تھا وہ گورنمنٹ کی عنایت
کرنے سے بھی حاصل نہ ہوا۔

اس خواب کی تعبیر اگر کہیں نظر آتی ہے۔ تو وہ جامعہ ملیہ ہے جہاں درختوں کے نیچے
کھلی زمین پر طلبہ اور اساتذہ فلسفہ و حکمت، تفسیر و حدیث سے ہم آغوش نظر آتے ہیں۔
اور ان دلدادگان علم کے کارناموں کے دھندلے نشان ان کوششوں میں دکھائی
دیتے ہیں جو پریس کے ذریعہ سے کبھی کبھی کتابوں کے صورت میں نظر پڑتے ہیں لیکن جن کا
بڑا حصہ ہنوز مسودات کے ہی نام سے یاد کیے جانے کے لایق ہے۔

جامعہ کی زندگی کے دو پہلو ہیں ایک تعلیمی اور دوسرا اصلاحی، دارالاقامہ کے زندگی
اصلاح معاشرت کے لیے اور جامعہ کی درسیات ترقی تعلیم کی خاطر۔ جامعہ کی یہ
خوش قسمتی ہے کہ لائق اساتذہ و پرجوش کارکن اس کو ابتدا ہی سے مل گئے تھے۔
اور اُنھوں نے اپنی مخلصانہ کوششوں سے طلبہ کے لیے ہر قسم کی مفید تربیت کا انتظام
کیا۔ حال ہیں اک کوآپریٹو اسٹور یا مشترکہ سرمایہ کی دکان خود طلبہ ہی کے سرمایہ
اور انتظام سے قائم کی گئی ہے۔ جس کے حصوں کی فروخت اور فراہمی سرمایہ کے بعد اسباب
تجارت کی خرید و فروخت سب طلبہ کے ہاتھ میں ہے۔ حسابات خود طلبہ ہی رکھتے ہیں اور
طلبہ ہی ان کی جانچ کرتے ہیں۔ یہ تمام کام باقاعدگی اور پابندی کے علاوہ اس طرح
انجام پاتا ہے کہ دارالاقامہ کے اکثر طلبہ کو اُس میں تھوڑی مدت کے لیے شرکت
کا موقع دیا جاتا ہے تاکہ کاروبار کا عملی تجربہ ان میں سے ہر فرد کو حاصل ہو سکے۔ اس کو کان

میں جو سامان برائے فروخت رکھا گیا ہے اُس میں تعیشات و تکلفات کی تمام چیزوں کو علحدہ کر دیا گیا ہے اور اصل مقصد یہ ہے کہ طلبائے دارالاقامہ کے ضروریات روزمرہ کی تقریباً تمام چیزیں خود طلبہ ہی کی دوکان فراہم کرے۔

عرض جوہر

از

محمدؐ علی جوہر

مولانا محمدؐ علی مدظلہٗ کا تازہ ترین کلام جس میں زمانہ اسیری بیجاپور کی تمام غزلیں درج ہیں اور جو اس وقت ہاتھوں ہاتھ نکل رہا ہے۔

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ

سے مل سکتا ہے

فتح الحمید

مولانا فتح محمد خاں جالندھری کا یہ ترجمہ کلام مجید اردو زبان کے بہترین تراجم میں شامل ہونے کے لائق ہے علاوہ سلاست و صحت زبان کے طباعت و تقطیع نہایت دلفریب اور جلد بڑے اہتمام سے تیار کی گئی ہے۔ قیمت ۱۲؎

مطبع کاویانی برلن

سے فارسی جدید کی مقبول و مشہور کتابیں آگئی ہیں خریداری میں عجلت فرمائیے

فہرست ملاحظہ ہو۔

۱۔ تیاتر (ڈراما) مصنفہ مرزا ملکم خاں ناظم الدولہ ۱۲؎
۲۔ موش و گربہ۔ باتصویر عبید زاکانی کی مشہور نظم ۵؎
۳۔ تاریخ سنی ملوک الارض (عربی) مصنفہ حمزہ اصفہانی ۱۲؎

جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ

سے طلب فرمائیے

مکتبہ جامعہ ملیہ علیگڑھ

مشہور مصنفوں کی مشہور کتابیں

اور اُردو زبان کی تازہ ترین مطبوعات

آسانی اور کفایت سے صرف مکتبہ ہذا سے مل سکتی ہیں

المدینۃ والاسلام

(مترجمہ مولوی رشید احمد صاحب مرحوم)

یہ وہ معرکۃ الارا، کتاب ہے جو بار بار شائع ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئی۔
اب تازہ اڈیشن پھر شائع ہوا ہے جو صرف مکتبہ جامعہ سے مل سکتا ہے۔ قیمت عہ/ ۸ر

خواجہ عبدالحی صاحب کی تصانیف

خواجہ صاحب کی تصانیف میں تفسیر القرآن نے خاص مقبولیت حاصل کی ہے جس کے
دو حصے شائع ہو چکے ہیں۔ کاغذ عمدہ، اور طباعت وکتابت نفیس ہے۔

الخلافت الکبریٰ جو تمامتر سورۂ بقر کی تفسیر ہے غیر مجلد للعہ/ مجلد صہ/

الصراط المستقیم سورۂ توبہ وانفال کی تفسیر ہے غیر مجلد عہ/

بصائر حضرت موسیٰ و فرعون کے واقعات پر قصص قرآنی سے
نہایت دلآویز تشریح کی گئی ہے۔ قیمت ۶/

دیوان غالب اردو

جس طرح نظم اردو کی بہترین کتاب تسلیم کی جاتی ہے اسی طرح جو اڈیشن ہم نے خاص اہتمام سے جرمنی سے چھپوا کر منگایا ہے اُس کے متعلق بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس سے بہتر اُردو زبان میں آج تک کوئی کتاب طبع نہیں ہوئی۔ نہایت نفیس ملائم سُرخ جلد پر سنہرا کام ہے اندر مرزا صاحب کی رنگین تصویر ہے، اور پھر مکمل دیوان مع قصائد و غزلیات رباعیات اور اس کے بعد بیاض کے لیے سادہ اوراق دئیے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ قابل قدر خود مرزا غالب مرحوم کا لکھا ہوا مقدمہ ہے جو شروع میں درج ہے اس اڈیشن کی مقبولیت کی یہ حالت ہے ہم کو کسی طرح امید نہیں کہ شائقین تک پہونچ سکے بہر حال درخواست خریداری بھیج دیجئے تاکہ نام درج رجسٹر ہو جائے، اور اس وقت نہیں تو دوسرے اڈیشن پر مایوسی نہ ہو۔ قیمت صرف تین روپیہ ہے

المشتہر

مہتمم مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ